اُداس نسلیں

عبداللہ حسین

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　　　　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُداس نسلیں

ہر ادیب اور شاعر اپنی ہم عصر نسل کے لیے لکھتا ہے۔ یوں کبھی نہیں ہوا کہ کوئی ادیب قلم اُٹھائے اور کہے کہ ''اب میں آنے والی نسلوں کی خاطر ادب تخلیق کرتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔'' ہاں اگر ایک کے بعد دوسری نسل بھی اس کے ادب کو اسی شوق سے پڑھتی ہے اور اس کے ساتھ اپنے کو اسی قدر منسلک و مربوط محسوس کرتی ہے تو یہ بات ادیب کے لیے گویا بونس کے طور پر ہوتی ہے اور اس سے اُسے ...وہ جو کہ آخر قلم کا مزدور ہی ہوتا ہے، اتنی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے جتنی کہ کسی بھی محنت کش کو عید کے موقع پر ایک ماہ کی زائد تنخواہ کے ملنے کی ہوتی ہے اور وہ اس پر شکر گزار ہوتا ہے، گو کہ یہ کوئی عطیہ نہیں بلکہ اُس کا اپنا حق ہوتا ہے۔

عبداللہ حسین

لندن، یکم جنوری ۱۹۸۴ء

اُداس نسلیں

عبداللہ حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

ابّا جان مرحوم

کے نام

(۱)

And (the people) shall look into the earth; and behold trouble and darkness, dimness of anguish; and they shall be driven to darkness.

ISAIAH

(۱)

سارا گاؤں مشکل سے سو گھروں پر مشتمل تھا۔ اس گاؤں کا نام روشن پور تھا۔ یہ راستے سے ہٹ کر واقع تھا اور کوئی ڈاچی یا پکی سڑک کبھی یہاں تک نہ آتی تھی۔ اس طرف کے دیہات میں آمد و رفت کا سلسلہ اِکّوں، تانگوں پر یا پیدل چل کر طے ہوتا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں تھیں جو کثرت سے ایک دوسری کو کاٹتی تھیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کسی اجنبی گاؤں میں پہنچ کر پریشانی اٹھاتے تھے، مگر یہ روز کی بات تھی اور گاؤں والوں کو ایسے مسافروں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ بعض اوقات ان لوگوں کو پہر دو پہر ستانے کے لئے کھاٹ اور پیاس بجھانے کے لئے لسّی پانی بھی مل جاتا تھا۔

پگڈنڈیوں پر سارا دن سورج چمکا کرتا۔ دُھوپ کی ماری ہوئی وہ بڑی مسکین اور صاف ستھری لیٹی رہتیں، مگر ان کی کمینگی اس وقت ظاہر ہوتی جب کوئی سواری ان کے اوپر سے گزرتی۔ تب وہ پگڈنڈیاں گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھاتیں جو فضا میں دیر تک منڈلاتا رہتا اور دور و نزدیک جو بھی انسان، حیوان یا شجر اس کی زد میں آتا، یکساں سب کی دل آزاری کا سبب بنتا۔ کسان مسافروں کو غلط رستے پر ڈال دینا اور گرد اُڑا اُڑا کر آس پاس کے جانداروں کو تنگ کرنا ان پگڈنڈیوں کے پاس اپنی بدحالی پر خاموش احتجاج کرنے کے دو مؤثر طریقے تھے۔ روشن پور جانے کے لیے آپ کو رانی کوٹ کے چھوٹے سے قصباتی سٹیشن پر اتر کر ایسے ہی راستوں پر مغرب کی سمت دور تک چلنا پڑتا تھا۔ رستے میں آپ کو کتے ملتے۔ یہ ایسے ہی معمولی، آوارہ کتے تھے جو ہر گاؤں میں ہوتے ہیں اور گاؤں والوں کی رائے یا خواہش کے بغیر ہی اپنے اوپر سارے گاؤں کی حفاظت اور دیکھ بھال کا ذمہ لے لیتے ہیں۔ یہ کتے عموماً قریب سے گزرنے والے مسافر کو بیرونی حملہ آور اور گاؤں کی سلامتی کے لئے سخت خطرے کا باعث سمجھتے، اپنے خدشات کا اعلان اُونچی آواز میں بھونک بھونک کر کرتے اور اس طرح مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے اگلے گاؤں تک تعاقب جاری رکھتے جہاں وہ آپ کو اپنے جیسے ہی معمولی اور شکی المزاج کتوں کے حوالے کر کے بہ اطمینان واپس لوٹتے۔ کمزور دل و دماغ رکھنے والے مسافر اکثر طیش میں آ کر رُک جاتے، انہیں کوستے، پتھر اُٹھا اُٹھا کر مارتے، پیچھے بھاگتے اور طرح طرح کی حرکتوں سے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے، لیکن طبع سلیم کے مالک لوگ

کتوں کی نسبت اپنے وقار اور برتر حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے اور درگزر کر کے نکل جاتے۔ اس طرح چودہ کوس کی لمبی مسافت کے بعد گرد میں اَٹے اور اُکتائے ہوئے، تھک ہار کر آپ روشن پور پہنچتے۔ یہ گاؤں نہر کے کنارے آباد تھا۔ نہر کا پانی یہاں کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔

علاقائی طور پر اس گاؤں کی حیثیت، کم از کم رائے عامہ کے لحاظ سے غیر مسلّم تھی۔ ایک گروہ جس کا سربراہ گاؤں کا سب سے عمر رسیدہ کسان احمد دین تھا، مدعی تھا کہ گاؤں صوبہ دلّی میں، اور دوسرا گروہ جو سکھ کسان ہرنام سنگھ کی سربراہی میں تھا، دعویٰ کرتا تھا کہ گاؤں صوبہ پنجاب میں واقع ہے۔ اس بات پر اکثر چوپال میں مناظرے ہوا کرتے تھے۔ بہرحال یہ امر مسلّم تھا کہ گاؤں ہر دو صوبہ جات کی مشترکہ سرحد پر کسی جگہ واقع تھا۔ اس گاؤں کی تہذیب بھی اسی دوئی کا نمونہ تھی۔ جو سکھ قوم کے افراد یہاں آباد تھے وہ پنجاب کے سکھ کسانوں کی طرح پہنتے کھاتے اور پنجابی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان طبقہ یو۔ پی کے کسانوں کی معاشرت کا روادار تھا۔ اس کے باوجود گاؤں کے دو ڈھائی سو افراد بڑے امن اور صلح جوئی کے ساتھ اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے۔

روشن پور کی تاریخ مختصر اور رومانی تھی۔ اسے آباد ہوئے نصف صدی سے چند سال اوپر کا عرصہ ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اس علاقے کا سب سے کم عمر گاؤں تھا۔ یہاں ابھی اس نسل کے بھی کئی افراد بقید حیات تھے جس نے پہلے پہل آ کر یہ گاؤں آباد کیا تھا۔ جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت دوسری اور تیسری نسل اس کی زمینوں کی کاشت کر رہی تھی۔ تاریخ کا سب سے مستند ذریعہ بہرحال بوڑھا کسان احمد دین تھا جو عین جوانی میں یہاں آ کر بسا تھا اور ان چند کنبوں میں سے تھا جنہوں نے غیر آباد زمین میں سے روشن پور کا گاؤں آباد کیا تھا۔ یہ تاریخی کہانی وہ اس طرح بیان کرتا تھا:

جب سن ستاون کا غدر مچا تو نواب روشن علی خان ضلع رہتک کے کلکٹر کے دفتر میں معمولی اہلکار تھے۔ (ظاہر ہے کہ اس وقت وہ نواب نہیں رہے ہوں گے۔) مڈل تک تعلیم یافتہ تھے اور اپنی شرافت کی وجہ سے دوست و احباب اور گلی کوچہ میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں وہ اپنی والدہ اور نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ شہر کے ایک پرانے حصے میں رہتے تھے۔ جس روز شہر میں بغاوت کی آگ بھڑکی اور ہندوستانی سپاہی انگریز افسروں کے خلاف ہتھیار لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اس روز شہر کے عوام میں بھی خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ کئی جگہ لوگ گلی محلوں میں اکٹھے ہو کر چھاؤنی سے آنے والی خبروں پر کان لگائے بیٹھے تھے، گو یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ وہ سب کے سب انگریزوں کے جانی دشمن تھے۔ رات پڑی تو سب شہری اپنے اپنے مکانوں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔

شام کے قریب روشن علی خان نے اپنے ایک علیل دوست سے، جس کی مزاج پرسی کی خاطر وہ اس کے ہاں تشریف لے گئے تھے، اجازت حاصل کی اور گھر لوٹے۔ اپنی گلی سے پچھلی گلی کے اندر داخل ہوتے تھے کہ چند

قدم آگے ایک بھاگتے ہوئے شخص پر نظر پڑی۔ دیکھتے دیکھتے وہ سایہ لڑکھڑا کر گرا اور ساکن ہو گیا۔ انہیں تشویش ہوئی' تیزی سے بڑھ کر اس پر جھکے لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ پہچان نہ پائے۔ پھر آوازیں دیں' ٹٹولا' ناک کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس کی روانی کو محسوس کیا اور صرف اتنا جان پائے کہ کوئی مصیبت کا مارا غش کھا گیا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے اٹھا کر کندھے پر لادا اور چل پڑے۔ مضبوط آدمی تھے' ایک گلی آسانی سے چل کر پار کرلی۔ پر بے ہوش آدمی وزن دار ہوتا ہے' ایک جگہ جو کندھا بدلنے کو رُکے تو کوئی سخت سی شے محسوس ہوئی۔ ٹٹول کر دیکھا تو اس شخص کی کمر کے ساتھ بندھا ہوا طپنچہ تھا۔ ساتھ ہی ان کا ہاتھ خون سے لتھڑ گیا۔ وہ زخمی بھی تھا۔ ان کا ماتھا ٹھنکا لیکن اسے اُٹھائے ہوئے چلتے رہے۔

گھر پہنچ کر جو چراغ کی روشنی میں دیکھا تو یکلخت سرد پڑ گئے۔ ان کے سامنے سنہری بالوں والا ایک انگریز پڑا تھا جو ہندوستانی دکانداروں کے لباس میں تھا۔ اس کا چہرہ بے حد زرد اور سانس مدھم تھا۔ انہوں نے دوڑ کر دروازہ بند کیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ سب سے پہلے گھر کی عورتوں کو پردے میں کر کے اس کا لباس تبدیل کیا اور ٹانگ کے زخم پر' جو تیز دھار آلے سے لگایا گیا تھا' پٹی باندھی۔ پھر اپنی ماں کو بلایا۔ پہلے تو اس نیک بی بی نے مریض کے فرنگی ہونے کی رُو سے اس کے نزدیک آنے سے انکار کر دیا۔ مگر پھر روشن علی خان کے اور اس کی بیوی کے' جو اس خوبصورت جوان کو کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر کافی غمزدہ تھی' منت سماجت کرنے سے اس کی دیکھ بھال کرنے پر رضامند ہو گئی۔ اس نیک بی بی کا مرحوم شوہر' یعنی روشن علی خان کا والد چھوٹا موٹا حکیم تھا اور گو اس کی وفات سے خاندان میں یہ پیشہ ختم ہو چکا تھا۔ پر اس واسطے سے مرحوم کی بی بی کو' جو مرحوم سے زیادہ طویل العمر ثابت ہوئیں' کسی حد تک حکمت میں دخل تھا۔ بہر حال اس سفید فام مریض کے سلسلے میں ان لوگوں سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔

یکا یک گلی میں شور اُٹھا اور چند لمحوں کے اندر شورِ قیامت معلوم ہونے لگا۔ پھر روشن علی خان کے گھر کا دروازہ دھڑ ادھڑ کوٹا جانے لگا۔ گھر کے مالک نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ہندوستانی سپاہیوں کی ننگی تلواریں اور برچھیوں کے پھل مشعلوں کی روشنی میں چمکتے نظر آئے۔ گلی میں ہر طرف ہاہا کار مچی تھی اور سر ہی سر نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر تک اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو باغیوں نے دروازہ توڑنے کا فیصلہ کیا۔

اوّل اوّل تو محلے کے لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے رہے کہ جانے کس کی موت آئی ہے۔ پھر جب بات کھل گئی کہ اس غیض و غضب کا رُخ محض روشن علی خان کے گھر کی جانب ہے تو چند سربراہ دبکے دبکائے نکلے اور کسی نہ کسی طور اس دروازے تک پہنچے جس کے توڑے جانے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ وہاں پر انہیں جو بتایا گیا وہ یوں تھا: ''کرنل جانسن' چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر' بھیس بدل کر گھیرے میں سے بچ نکلے ہیں اور دلی پہنچنا چاہتے ہیں۔ رستے میں چند سپاہیوں سے ان کی مٹھ بھیڑ بھی ہوئی لیکن وہ ان میں سے تین کو موت کی نیند سلا کر اور خود تلوار کا زخم کھا کر نکل آئے ہیں۔ اب ان کے خون کی لکیر اس دروازے میں داخل ہوتی ہے۔ انہیں ہمارے حوالے کیا

جائے' ورنہ دروازہ توڑ کر گھر کے مکینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔'' محلے کے سربراہوں نے' کہ خود خوفزدہ تھے' ہر قسم کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور باغیوں کے غصے کو فی الوقت ٹھنڈا کر کے کسی نہ کسی راستے سے مکان میں داخل ہوئے۔ اب ہر ایک سربراہ اپنی اپنی پگڑی اتار کر روشن علی خان کے پیروں پہ رکھ رہا ہے' منتیں کر رہا ہے' دھمکیاں اور گھرکیاں دے رہا ہے پر ہمت کا دھنی روشن علی خان اپنے اٹل فیصلے پر قائم ہے کہ جان جاتی ہے تو چلی جائے' پر زخمی مہمان کو دشمنوں کے حوالے نہ کروں گا۔

اس کے بعد کے واقعات کے سلسلے میں داستان گو کے بیان میں بڑی گڑبڑ تھی۔ کبھی وہ کہتا کہ جب دروازہ توڑا گیا تو بہادر نوجوان نے ایک کندھے پر زخمی مہمان کو' دوسرے پر اپنی بیوی کو بٹھایا اور لڑتا بھڑتا ہوا صحیح سلامت نکال لے گیا۔ کچھ موقعوں پر اس نے یہ بھی بیان دیا تھا کہ چند مصلحتوں کی بنا پر باغی دروازہ توڑنے سے باز رہے مگر سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا اور رسد و رسائل کے تمام وسائل منقطع کر دیئے گئے۔ یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا' یہاں تک کہ اہالیان شہر پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ فرنگیوں کو فتح نصیب ہوئی اور محاصرین کو نجات ملی۔ ایک حکایت یہ بھی تھی کہ روشن علی خان نے جب کوئی راہ فرار نہ دیکھی تو گھر کے فرش میں سرنگ لگانی شروع کی جو چھاؤنی میں جا نکلی۔ اس راستے سے وہ کرنل جانسن اور اپنی بیوی کو نکال کر لے گیا اور بالآخر محلے کے سربراہوں کی رائے سے جب گھر کا دروازہ ایک دن توڑا گیا تو گھر میں صرف ایک بڈھی عورت کی لاش ملی۔ یہ گھر کے مالک کی ماں تھی جو پہلے روز ہی صدمے کی وجہ سے راہیٔ ملکِ عدم ہو گئی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ سربراہوں اور باغیوں کو سخت پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حکایات کی صحت کی طرف توجہ دینے کی کسی کو ضرورت یوں محسوس نہ ہوتی کہ اس کے بعد داستان گو کے خیالات کی لڑی پھر سلجھ جاتی اور وہ کمال یکسوئی سے یوں گویا ہوتا:

''جب غدر کا خاتمہ ہوا اور باغی کیفر کردار کو پہنچے تو کرنل جانسن نے' جو شاہ انگلستان کے قریبی عزیزوں میں سے تھا' روشن علی خان کو دلّی دربار میں بلا بھیجا اور اپنے دستِ خاص سے خلعت عطا کی اور کہا کہ جاؤ اور جا کر جتنی زمین' جہاں سے چاہو گھیر لو' تمہیں عنایت کی جائے گی۔ اس کے بعد اس فیاض انگریز حاکم نے' جسے اردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی' ایک عجیب و غریب تقریب کے دوران (جس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آئے گا) نواب روشن علی خان کو آغا کا لقب عطا کیا۔''

زمین گھیرنے کے متعلق دو روایتیں تھیں۔ ایک کے مطابق نواب صاحب نے گھوڑے پر سوار ہو کر چکر لگایا اور گھوڑے کی پونچھ کے ساتھ ایک شہد بھرا ٹین باندھ دیا جس کے پیندے میں سوراخ تھا۔ شہد ٹپکتا رہا اور کیڑے مکوڑے آ کر اس پر جمع ہوتے گئے۔ اس طرح قدرتی حد بندی زمین کی ہو گئی۔ دوسری کے مطابق انہوں نے پیدل بھاگنا شروع کیا اور بانس کی کھپچیاں راستے میں گاڑتے گئے۔ غروبِ آفتاب کے وقت جب واپس پہنچے تو سانس اُکھڑ گئی' پلٹ کر گرے اور مرتے مرتے بچے۔ اس سوال کے جواب میں بھی کہ رہائش کے لئے خاص طور پر اس علاقے کا انتخاب کیسے اور کیوں عمل میں آیا' کئی روایتیں مشہور تھیں جن کا بیان اس کتاب کے احاطے سے باہر ہے۔

اس ساری حکایت کے حرف بہ حرف صحیح ہونے کو یوں بھی عقلِ سلیم نہیں مانتی۔ پھر بھی مناسب کاٹ چھانٹ کے بعد اسے حقیقت سے قریب تر لایا جاسکتا ہے۔ یہ تو بہرحال سب کے دیکھے کی بات تھی کہ جب تک کرنل جانسن ہندوستان میں رہے ہمیشہ شکار کے لئے روشن پور آتے رہے اور جب روشن آغا یورپ گئے تو انہیں کے پاس ٹھہرے اور فیض پایا۔

اس طرح روشن پور کی جاگیر، جو پانچ سو مربعوں پر محیط تھی، قیام میں آئی۔ واحد مالک روشن آغا تھے۔

روشن آغا اپنے معمولی پس منظر کے باوجود اس عظیم ذمہ داری کے پوری طرح اہل ثابت ہوئے جو اس بیش بہا خلعت اور جاگیر کی نوازش سے ان پر آ پڑی تھی۔ آخر عمر میں انہوں نے یورپ کا سفر کیا اور اپنے بیٹے کو تعلیم کے لئے ولایت بھیجا۔ گو واپس لوٹ کر اس نے ایک ایسی حرکت کی جس سے انہیں سخت صدمہ پہنچا، یعنی اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ایسے گھرانے کی لڑکی سے شادی کرلی جس کے آبائی پیشے کو شرفاء میں قطعاً قدر کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے بعد سے ان کا لڑکا ہمیشہ دلّی کے روشن محل میں رہا۔ روشن محل وہ عالیشان مکان تھا جو روشن آغا نے رہائش کی خاطر دارالسلطنت میں تعمیر کرایا تھا۔

گاؤں کے وسط میں بڑی سی پکی حویلی تھی جس میں روشن آغا کئی برس تک رہے تھے۔ اس کے گرداگرد پچاس پچاس گز تک جگہ خالی پڑی تھی جہاں کسی وقت میں بڑا خوبصورت باغیچہ ہوگا، لیکن اب محض خشک پودے اور ٹنڈ منڈ درخت کھڑے تھے کہ حویلی مدت سے خالی پڑی تھی۔ زندگی کے آخری برسوں میں روشن آغا نے اپنے بیٹے کو معاف کردیا تھا اور جا کر روشن محل میں رہنے لگے تھے، جس سے کہ ان کے فرزند نواب غلام محی الدین خان کو دلی سکون اور مسرت میسر ہوئی تھی۔ اس حویلی کے علاوہ گاؤں کا دوسرا واحد پکا مکان گاؤں کے آخیر پر واقع تھا۔ یہ مغلوں کا گھر تھا۔ مغلوں کے گھرانے کی کہانی اس طرح بیان کی جاتی تھی:

مرزا محمد بیگ اور نواب روشن علی خان کا گمنامی کے زمانے سے گہرا یارانہ چلا آتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ملازمت کے دوران دونوں ایک جگہ کام کرتے اور رہتے سہتے تھے۔ جب خداوند تعالیٰ نے اپنی بے نیازی میں روشن علی خان کو نیک نامی اور دنیوی جاہ وحشمت سے نوازا تو وہ اپنے دوست کو نہ بھولے اور ملازمت چھڑوا کر اسے اپنے ہمراہ لیتے آئے۔ محمد بیگ کا خالص مغلوں کا خاندان تھا اور قدرت نے اس گھرانے کو وہ خوبصورتی عطا کی تھی جو خالص نسلوں میں پائی جاتی ہے اور بدقسمتی سے روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ بلکہ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ روشن علی خان محمد بیگ کی بیوی کے بے مثال حسن و جمال کے حد سے زیادہ مداح تھے اور یہی عقیدت تھی جس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنی ملکیت میں سے پچاس مربعے زمین کے الگ کر کے اپنے عزیز دوست کو تحفتاً دے دیں اور اپنی جیب سے گاؤں میں پکا مکان بنوا کردیں۔ افواہ تھی کہ محمد بیگ کا بڑا بیٹا نیاز بیگ بھی روشن علی خان کے واسطے سے تھا۔ لیکن افواہوں کا کیا ہے، کہنے والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ خود نواب روشن علی خان کی اکلوتی اولاد اس فیاض اور عالی نسب انگریز کرنل کی بدولت تھی جو زخمی ہو کر چند دن ان کے ہاں مہمان رہا تھا اور جس کی وجہ سے روشن علی خان

پر جان کی مصیبت آئی تھی۔ حالانکہ اس غیر ملکی کی عالی نسبی اور شرافت کو نظر میں رکھا جائے تو عقلِ سلیم آسانی سے اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ ہم یہ سوچ کر بھی ان افواہوں کی پرزور تائید کرنے سے باز رہنے پر مجبور ہیں کہ اس زمانے کے بزرگ قطعی طور پر مخلص، وضع دار اور شفیق ہوا کرتے تھے۔

جتنا عرصہ مرزا محمد بیگ زندہ رہے بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کرتے رہے، اور دونوں کنبوں کی آپس میں محبت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ محمد بیگ محنتی آدمی تھے اور صنعت و حرفت میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ زمینداری کے ساتھ ساتھ انہوں نے گھر میں لوہے کے کام کی دکان کھول لی کہ ان وقتوں میں ایسے پیشے اختیار کرنے کو عار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ گو مرزا محمد بیگ کے لئے یہ کام پیشہ کم اور ہنرمندی کے شوق والی بات زیادہ تھی۔ اسی طرح سلوک اور محبت کے ساتھ وقت گزرتا جا رہا تھا کہ اچانک محمد بیگ کو عین جوانی کے عالم میں، جبکہ وہ ابھی پورے پینتیس برس کے بھی نہ ہوئے تھے، موت نے آدبوچا اور انہوں نے ایک بڑی پُرسکون اور خوش نما زندگی گزارنے کے بعد جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ ان کی پُراسرار بیماری اور موت کے متعلق بھی کئی افواہیں مشہور ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا ہماری کہانی کے ساتھ کوئی براہ راست تعلق نہیں ہم اس طرف زیادہ توجہ نہ دیں گے۔

مرزا محمد بیگ کی وفات کے بعد ان کے بیوی اور بچے نواب صاحب کی خاص شفقت اور نگرانی میں پرورش پاتے رہے۔ بڑا لڑکا نیاز بیگ پورے قد کا، بڑا گھبرو خوبصورت جوان نکلا اور باپ کے زمینداری اور ہنرمندی کے شوق ورثے میں پائے۔ وہ عمر بھر گاؤں میں رہا اور یہی کام کرتا رہا۔ اس کی ماں نے اس کی شادی اپنے جیسے ایک خالص نسل مغل گھرانے میں کی اور بڑی خوبصورت اور خوب سیرت بہو بیاہ کر لائی۔ شادی کے پندرہ سال بعد خدا نے اسے بیٹا عطا کیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ نیاز بیگ کی ماں نے پوتے کی پیدائش کا اتنی شدت اور اتنے شوق سے انتظار کیا تھا کہ اتنے لمبے عرصے کے بعد اس اچانک خوشی سے جو صدمہ پہنچا اس سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ ماں کے مرنے کے بعد نیاز بیگ نے ایک اور عورت کو گھر میں ڈال لیا۔ یہ دوسری عورت کسی نیچ ذات سے تھی۔

چھوٹا بیٹا ایاز بیگ پانچ سال تک سکول میں پڑھنے کی خاطر جاتا رہا کہ اسے پڑھائی کرنے کا شوق تھا۔ پھر اچانک اس کا اس کام سے جی اٹھ گیا اور وہ گھر سے بھاگ کر ریلوے کے محکمے میں ملازم ہو گیا۔ اس کے کئی سال بعد وہ گاؤں لوٹا۔

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی وجہ سے اس گھرانے کے خوشگوار دن یکلخت غائب ہو گئے۔ نیاز بیگ کو حکومت کے خلاف کسی جرم کے الزام میں پکڑ لیا گیا اور چند روزہ عدالتی کارروائی کے بعد بارہ برس قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ وہ چند دن جب مغلوں کے اس باعزت کنبے پر بدقسمتی وارد ہوئی تھی ابھی تک گاؤں والوں کے حافظے میں محفوظ تھے اور اس کا ذکر کرتے ہوئے اب بھی لوگ آواز نیچی کر لیتے تھے اور رنج سے سر ہلانے لگتے تھے۔ حکومت نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ ان دونوں بھائیوں کی زیادہ تر زمین ضبط کر لی، اور تھوڑی سی جائداد، جس پر نیاز بیگ کی دونوں بیویوں کا بمشکل گزارہ چل سکتا تھا، چھوڑ دی۔ اب اکیلی رہتی ہوئی وہ دونوں عورتیں بڑی عسرت اور

تنگی میں بڑھاپے کا انتظار کرنے لگیں۔ اس طرح گاؤں کے اس اکلوتے آزاد گھرانے پر قدرت کی طرف سے بدبختی اور ذلت نازل ہوئی۔

چھوٹے بھائی ایاز بیگ نے اس واقعے سے بددل ہو کر گاؤں چھوڑ دیا۔ لیکن جاتے ہوئے وہ نیاز بیگ کے لڑکے نعیم کو' جو اپنے باپ کے جیل جانے کے وقت تین سال کا تھا' اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اسے اپنے بھتیجے سے بڑی محبت تھی۔ ایاز بیگ معمولی تعلیم و تربیت کے باوجود اس خداداد ذہانت اور صلاحیت کا مالک تھا جس کے بل پر بہت سے معمولی آدمیوں نے دنیا میں ناموری پائی ہے۔ اس کا اس نے پورا فائدہ اٹھایا اور عمارتی تعمیر کے کام میں کمال فن حاصل کیا۔ ہوتے ہوتے وہ کلکتے کی ایک مشہور تعمیری فرم میں انجینئر کے عہدے تک جا پہنچا۔ اس نے تمام عمر شادی نہ کی۔ تنہائی پسند اور ستھرے مذاق کا آدمی تھا۔ بہت روپیہ کمایا لیکن کبھی گاؤں نہ لوٹا۔ نعیم کو اس نے بہترین انگریزی سکولوں میں تعلیم دلائی اور ساری امیدیں اس کے ساتھ وابستہ کر دیں۔

روشن پور کا ہماری کہانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن ابتدائی چند یوم آپ کو دارالسلطنت دتی میں بسر کرنے ہوں گے کہ اس زمانے میں جس زمانے سے ہم نے کہانی کی ابتدا کرنے کا فیصلہ کیا ہے' سارے اہم افراد وہاں پر جمع تھے۔

اور یہ وہ زمانہ تھا جب نواب روشن علی خان آف روشن پور اسی برس کی عمر پا کر حال ہی میں فوت ہوئے تھے اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ ابتدائی مرحلوں میں تھی۔

(۲)

کوئینز روڈ کے آخر میں روشن محل تھا۔ یہ ایک قدیم وضع کی وسیع' دومنزلہ کوٹھی تھی۔ آگے کرزن روڈ شروع ہوتی تھی۔

ان کو دور ہی سے آج کے دن کی چہل پہل دکھائی دے گئی۔ پھاٹک پر کاغذی جھنڈیاں اور رنگ برنگ بجلی کے قمقمے لٹک رہے تھے۔ بہلی سے اُترے تو انہوں نے دیکھا کہ لمبی ڈرائیو پر' جو سامنے والے برآمدے تک جاتی تھی' تازہ سرخ بجری بچھائی گئی تھی اور دونوں اطراف چونے کی متوازی لکیریں لگی تھیں۔ برآمدے میں دو میزیں پڑی تھیں۔ ایک پر میز پوش تہہ کئے رکھے تھے' دوسری کے گرد بہت سارے لڑکے لڑکیاں کھڑے نیپکن بنا رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے وسیع لان میں میزیں اور کرسیاں لگائی جا رہی تھیں۔ دن کی روشنی ابھی باقی تھی مگر برآمدے اور باغ میں قمقمے جل رہے تھے۔ صرف برآمدے میں شور تھا جہاں میز کے گرد خوش پوش اور تندرست لڑکے لڑکیاں جمع کام کر رہے تھے۔ سبزے پر نوکر سفید وردیاں پہنے خاموشی سے ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے۔

ایاز بیگ اور نعیم جب برآمدے میں چڑھے تو سامنے سے بھوری آنکھوں والی ایک نوعمر لڑکی جارحانہ

انداز میں نکلی۔

''چچا.....'' وہ ٹھنک کر اُونچی آواز میں بولی ''تسلیم۔ بابا بیٹھے ہیں۔ آپ چلیے اندر، ہم لوگ نیپکن بنا رہے ہیں۔ ابھی تو.....'' وہ گھڑی دیکھتی ہوئی جا کر نوعمروں کے اس گروہ میں شامل ہو گئی۔

نعیم ان کی طرف متوجہ تھا۔ ان کی اوسط عمر نعیم کی عمر کے لگ بھگ تھی۔

''دیکھو عذرا، پرویز اُلٹی طرف سے بنا رہا ہے اور کہتا ہے کہ یہی سیدھا ہے۔'' پہلی لڑکی سے ایک دوسری لڑکی جو سرخ ریشمی لباس میں تھی، بولی۔

بھوری آنکھوں والی لڑکی نے جا کر اسی جارحانہ انداز میں سب سے لمبے اور بڑی عمر کے لڑکے کا نیپکن کھول دیا۔ ''غلط۔ بالکل غلط۔'' وہ بولی۔ اس کے بھورے رنگ کے لمبے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور گردن کی سفید جلد دکھائی دے رہی تھی۔ ''دیکھو بھئی سب لوگو۔'' اس نے چلا کر کہا ''پرویز یوں بناتا ہے۔'' اور رومال کو بے ترتیبی سے گول مول لپیٹ دیا جسے دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔

''یہاں تو مولانا سر پر باندھ کے نماز پڑھاتے ہیں۔'' ایک موٹا سا سفید رنگت والا لڑکا بولا۔ قہقہوں کا شور بلند ہوا۔ بھوری آنکھوں والی لڑکی سر پیچھے پھینک کر ہنس رہی تھی جس سے گردن کی پشت پر سفید، صحت مند جلد اکٹھی ہو کر اُبھر آئی تھی اور گلے پر تنگ فراک گوشت میں دھنسا جا رہا تھا۔ اس کا گہرا سرخ چہرہ ایک پاگل ہنسی میں تنا ہوا تھا۔ نرخرہ کپکپا رہا تھا اور آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔

پرویز متذبذب کھڑا سب کا منہ دیکھتا رہا، پھر بہت گہرا جھینپ گیا۔ ''میں کوئی لڑکی تھوڑا ہوں۔ یہ تو لڑکیوں کا کام ہے یا بیروں کا.....'' ہنسی تیز ہو گئی۔

اپنے آپ کو اجنبی فضا میں پا کر نعیم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا، مگر جی کھول کر ہنستے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بے تکلفی، سادگی اور برابری کا جو احساس ہوتا ہے اس کی وجہ سے اس کا جی چاہا کہ وہ بھی جا کر ان میں شامل ہو جائے۔ اسی وقت وہ ایاز بیگ کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

کمرۂ نشست میں داخل ہو کر جس پر سب سے پہلے نعیم کی نظر پڑی وہ گھر کا مالک تھا۔ نواب غلام محی الدین ایک کونے میں بڑی سی میز پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

''آیئے آیئے۔'' وہ بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر بولے۔ ''میں اتنی جلد آپ کا متوقع نہیں تھا۔ کب آئے؟''

''آج صبح'' ایاز بیگ نے بہت جھک کر مصافحہ کیا۔ اپنے چچا کو اتنی انکساری کے ساتھ کسی سے ملتے ہوئے نعیم نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ نواب صاحب کے چہرے پر سب سے نمایاں شے ان کی ناک تھی جو اونچی اور نوک دار تھی اور انہیں مردانہ شکل و صورت عطا کرتی تھی۔

''افسوس ہے روشن آغا کی وفات پر حاضر نہ ہو سکا۔ ملازمت کا سلسلہ ہے۔'' ایاز بیگ نے کہا۔

''آپ تو بڑے فرض شناس افسر ہیں۔ ٹھیک ہے، کام وام کرتا ہی آدمی اچھا لگتا ہے۔ ہماری بھی کوئی

زندگی ہے۔'' انہوں نے اس شرارت بھری معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو پرانے خاندانی لوگوں کا حصہ ہوتی ہے۔

''بجا فرمایا۔ بجا فرمایا۔'' ایاز بیگ ہاتھ ملتے ہوئے خوش دلی سے بولے۔ دونوں دوستوں کی آنکھوں میں چمک تھی۔ پھر وہ نعیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''یہ صاحب زادے......''

نعیم نے ایاز بیگ کی تقلید میں بہت جھک کر مصافحہ کیا جس سے اس کی ٹوپی کا پھندنا نواب صاحب کے ہاتھ کی پشت سے جالگا۔

''بھتیجا ہے۔''

''اوہ۔ میں سمجھا'' وہ غور سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ آہستہ آہستہ ان کے چہرے پر سنجیدگی کی سختی پیدا ہونے لگی۔ تینوں آدمیوں کے درمیان عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ایاز بیگ کا چہرہ بے حد اداس ہو گیا۔ نواب صاحب کے ماتھے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی رگ ابھر آئی۔ باریک ریشمی گاؤن پہنے وہ اپنے مضبوط چہرے اور وحشیانہ قوت سے بھرپور شبیہہ لئے سیدھے بیٹھے رہے، پھر اچانک انہوں نے پہلو بدلا اور آہستہ آہستہ کہنے لگے۔

''میں دیکھ رہا تھا۔ ان کی شکل نیاز بیگ سے بہت ملتی ہے۔ خوبصورت آدمی تھا۔ واپس آ گیا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کے سال بعد؟''

''بارہ۔''

''اوہ......'' وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ''پڑھتا ہے؟''

''کلکتے میں۔ اس سال سینئر کیمبرج کیا ہے۔'' ایاز بیگ نے بتایا۔

''ہوں۔ آپ نیاز بیگ سے ملے؟''

''نہیں۔''

''ملیں گے؟''

''نہیں۔''

دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر ایاز بیگ نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا ''آج تو کافی رونق ہو گی۔''

''امید تو ہے۔'' نواب صاحب کی سنجیدگی دور ہو گئی۔ ''چیف کمشنر آئیں گے۔ گوکھلے بھی شہر میں ہیں، شاید آ جائیں اور آپ کی اینی بیسنٹ بھی آ رہی ہیں، ذرا تیار رہیے گا۔ آپ بھی بڑے زوردار تھیوسوفسٹ ہیں۔'' پھر انہوں نے ایاز بیگ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر غور سے دیکھا۔

''بوڑھے ہو گئے ہو۔''

''وقت سب کو بوڑھا کر دیتا ہے۔'' ایاز بیگ نے مسکرا کر کہا۔ نعیم بہت بے چین بیٹھا تھا۔ اپنے باپ کا

ذکر اس نے بہت کم سنا تھا اور یہ منظر جو آج اس نے دیکھا' اور محسوس کیا' بالکل نیا تھا۔ موضوع کی تبدیلی سے اسے کافی تسکین ہوئی اور وہ غور سے اپنے میزبان کو دیکھنے لگا۔

نواب صاحب چالیس کے لگ بھگ اور بہت صحت مند تھے۔ چشمہ ان کی ناک میں گہرا پھنسا ہوا اور گال شیشے سے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں گہری اور جبڑے اور ٹھوڑی اور سر کی ہڈی مضبوط اور چوڑی تھی۔ ان کے ہاتھ نازک اور خوش نما تھے۔ معمولی ناک نقشے کے باوجود ان کے چہرے پر وہ نرمی اور خوش شکلی تھی جو پُر آسائش زندگی کا پتہ دیتی ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے وہ ایک ہاتھ کو بڑے دل کش انداز میں حرکت دیتے تھے۔

کمرہ بڑے قرینے سے سجا تھا۔ نعیم کے عین پیچھے ایک بھس بھرا شیر کھڑا تھا جو خطرناک حد تک زندہ دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں کونوں میں اونچے اونچے فرشی لیمپ روشن تھے۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے اور فرش پر دبیز بے آواز قالین پڑے تھے۔ برآمدے کے شور کے مقابلے میں اندر گہری خاموشی اور سکون تھا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ دروازوں کھڑکیوں کی درزیں فلالین کی تہوں سے بند کی گئی تھیں۔

پھر ان کا میزبان اٹھا اور تھوڑی دیر تک لان پر ملنے کا وعدہ کر کے اندر کے کمروں کی طرف چلا گیا۔

باہر آ کر نعیم نے دیکھا کہ نیپکن ساری میزوں پر رکھے تھے اور سفید وردیوں والے بیرے آخری انتظامات میں مصروف تھے۔ اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھاٹک کے بغل والے دوسرے لان میں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایاز بیگ نے کونے میں ایک کرسی گھسیٹی اور کیمرہ نکال کر رات کو تصویریں لینے کے لئے اسے تیار کرنے لگے۔

نعیم اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ اس وقت اندر سے وہی لڑکے لڑکیاں باتیں کرتے نکلے اور اِدھر اُدھر پھیل گئے۔

لمبے لڑکے نے تمیز سے جھک کر ایاز بیگ کو سلام کیا۔ پھر وہ نعیم کی طرف آیا۔

''آپ کلکتے سے آئے ہیں نا؟''

''جی ہاں۔''

''میں پرویز ہوں۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ''یہ...... ہمارا گھر ہے۔'' نعیم نے ہاتھ ملایا اور خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ ایک تنہا اور بے خطر پرورش کے طفیل یہ اس کا قدرتی' بے زبان اندازِ گفتگو بن چکا تھا۔

''آیئے اُدھر چلیں۔'' پرویز نے کہا۔

ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب انہوں نے کھلنڈروں والا لباس اتار کر تقریبی لباس پہن لیا تھا اور زیادہ ذمہ دار دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ...... یہ...... کلکتے سے آئے ہیں۔'' پرویز نے سٹپٹا کر کہا۔ ''اور یہ میری بہن عذرا ہے۔ یہ سب ہمارے بہن بھائی ہیں۔''

نعیم گھبراہٹ میں اپنی لمبی سرخ ٹوپی اور پھندنے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بیٹھیے۔'' سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

''آپ بولتے بالکل نہیں ہیں؟'' عذرا نے اپنی بھوری آنکھیں نچا کر اسی بے تکلفی سے پوچھا۔

''جی جی نہیں تو۔'' سب لوگ سادگی سے مسکرائے۔

''آپ نے نام نہیں بتایا اپنا۔''

''نعیم۔''

''اوہ...... کس قدر خوبصورت نام ہے۔'' ایک پتلے سے لڑکے نے انگریزی میں کہا۔

ان کا کھلنڈرا پن اور شور وشغب سب ختم ہو چکا تھا۔ گو ان کی آنکھوں میں تمسخر کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

صرف عذرا اسی جارحانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ اب اس نے سفید ریشم کی ساڑھی باندھ رکھی تھی اور دیکھنے میں کافی بڑی اور سمجھدار لگ رہی تھی۔

''آپ کو نیپکن بنانا آتا ہے؟''

''نہیں۔''

''دراصل آج ہمیں پتہ چلا کہ ہم میں سے آدھے لوگوں کو نہیں آتا۔''

''عذرا یہ تو غلط بات ہے۔'' پتلا لڑکا انگریزی میں بولا۔ ''اب تم کہو گی کہ ہمیں ساڑھی باندھنا نہیں آتا تو یہ بھلا کیا بات ہوئی۔'' سب لوگ چپکے سے ہنسے۔

کچھ دیر تک وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ پھر مہمان آنا شروع ہوگئے۔ ایاز بیگ نے نعیم کو پکارا اور وہ جا کر کیمرے میں فلم چڑھانے میں ان کی مدد کرنے لگا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد کیمرہ درست ہوا۔ اب کافی مہمان آچکے تھے۔ نواب صاحب اور ادھیڑ عمر کی ایک خوبصورت عورت دروازے میں کھڑے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ عذرا بھی پاس کھڑی تھی۔ پرویز اور گروہ کے دوسرے افراد مہمانوں کے درمیان اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ابھی تک جو لوگ آچکے تھے ان میں زیادہ تر غیر ملکی تھے۔ چند ایک نے اونچے سیاہ ہیٹ اور ٹیل کوٹ پہن رکھے تھے۔ باقی نے جو زیادہ تر نوجوان طبقہ تھا' شام کا سیاہ چست لباس پہن رکھا تھا اور سر سے ننگے تھے۔ تقریباً سبھی خاموش بیٹھے سگریٹ اور موٹے موٹے سگار پی رہے تھے۔ عورتوں نے بند گلے کے چست فراک پہن رکھے تھے۔ اب ہندوستانی مہمان آرہے تھے۔ وہ مختلف قسم کے لباس میں تھے۔ مسلمان پھندنے والی سرخ ٹوپیوں اور لمبے لمبے چوغوں میں تھے۔ کچھ لوگ شیروانیوں میں بھی تھے جن سے ان کے قوم و مذہب کا پتہ چلانا دشوار تھا کہ ہندوستان میں اب ہندو مسلم عیسائی سب نے شیروانیاں پہننی شروع کر دی تھیں۔ البتہ ہندو اپنی ڈھیلی اڑنگ دھوتیوں اور بڑی بڑی سفید پگڑیوں سے پہچانے جاسکتے تھے۔

وہ دو دو اور چار چار گھوڑوں والی بگھیوں میں آرہے تھے۔ صرف انگریز مہمان اور چند ہندوستانی موٹروں پر آئے تھے۔ وہ پھاٹک پر نواب صاحب اور ان کی ساتھی عورت کے ساتھ اخلاق سے جھک کر ہاتھ ملاتے یا دور

سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے اور جا کر خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ انگریز سب ایک طرف بیٹھے تھے' ہندوستانی دوسری طرف۔ غیر ملکیوں نے اپنی اپنی ٹوپیاں اور سکارف آتے ہی خادموں کے حوالے کر دیئے تھے۔ ہندوستانی ٹوپیاں پہنے' چھڑیاں ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔

ایک ہندوستانی زرق برق شیروانی اور پگڑی پہنے موٹر سے اترا۔ ساتھ ایک نوجوان انگریزی لباس میں تھا۔ نواب صاحب بہت نیچے جھک کر ملے۔ کسی نے کہا مہاراج کمار پرتاپ گڑھ ہیں; ہمراہ غالباً سیکرٹری تھے۔ وہ واحد ہندوستانی تھے جو آ کر انگریزوں میں بیٹھے۔ انہوں نے اپنی چھڑی بھی خادم کے حوالے کر دی۔

پھر گوکھلے آئے جس پر تمام ہندوستانی اور چند انگریز اٹھ کھڑے ہوئے اور جھک جھک کر ملے۔ ایاز بیگ نے جب ان کا نام لیا تو نعیم چونک کر اٹھا اور قریب جا کھڑا ہوا۔ گوکھلے کا نام اس نے بہت سن رکھا تھا مگر دیکھنے کا آج پہلی بار موقع ملا تھا۔ انہوں نے پتلون کے اوپر بند گلے کا بڑے بڑے کالروں والا ہاف کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر ٹوپی لئے ہوئے تھے (اس قسم کی ٹوپی نعیم نے کلکتے میں تلک کو بھی پہنے دیکھا تھا)' گلے میں لمبا سا مفلر تھا۔ سنہرے فریم کا چشمہ لگائے اکہرے جسم کا یہ آدمی خوبصورت کہلایا جا سکتا تھا' گو بہت کمزور تھا۔ نعیم نے اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے وقت عجیب سی کیفیت محسوس کی۔

پھر ڈاکٹر اینی بیسنٹ آئیں جن کا نام نعیم نے ایاز بیگ کی زبانی اکثر سنا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کے ایک گروپ میں جا کر بیٹھ گئیں۔ خدام مہمانوں کو پھلوں کا رس پیش کرنے لگے۔

انار کے ایک پودے کے نیچے نعیم کھڑا تھا۔ پتوں میں چھپے ہوئے بلب کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

''ہیلو...... آپ نے پھلوں کا رس پیا؟'' عذرا اس کے پیچھے سے نکل کر بولی۔

''نہیں۔''

''لیجئے۔'' اس نے گلاس نعیم کے ہاتھ میں تھما دیا جو اس نے فوراً لبوں سے لگا لیا۔

''سب مہمان آ گئے؟'' بہت سوچ کر اس نے بات کی۔

''تقریباً'' عذرا نے تمسخر اور سادگی کے عجیب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ نعیم نے محسوس کیا کہ سائے میں اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا سیاہ ہو گیا تھا۔ اس نے گلاس میں سے دو بڑے بڑے گھونٹ لئے۔

''آپ ٹوپی بالکل نہیں اتارتے؟''

وہ گھبرا کر ٹوپی اور پھندنے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''اتار دیجئے۔''

اس نے جلدی سے ٹوپی اتار دی۔

''یہ...... بٹن کھول دیجئے۔'' عذرا نے انگلی سے اس کے گلے کی طرف اشارہ کیا۔ جب وہ اوپر کے دو چار بٹن کھول چکا تو دفعتاً وہ بہت گہری جھینپ گئی ''میرا مطلب ہے صرف یہ کہ...... آپ کو گرمی محسوس نہیں ہوتی شیروانی میں؟''

''نہیں''

''یوں بھی...... دیکھئے یہ ہمارے مٹر پھول سوکھ گئے ہیں۔ آخر اپریل تک ان کی بہار ہوتی ہے۔'' اس کا چہرہ ابھی تک سرخ ہو رہا تھا۔ نعیم کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ وہ کوئی غیر معمولی شے نہیں بلکہ عام سی لڑکی تھی، بالکل جس طرح کا وہ خود تھا۔ جلد ہی اس کے سحر میں سے نکل آیا۔ عذرا نے ہاتھ بڑھا کر ہولی ہوکس کا ایک گلابی پھول توڑا۔

''آج کل ان کی بہار ہے۔ مجھے اندر جانا ہے، آپ بیٹھیے۔'' اس نے کہا۔ اندھیرے کی طرف جاتی ہوئی وہ ایک بڑی عمر کی سنجیدہ عورت کی طرح چل رہی تھی۔ نعیم نے اسے برآمدے میں غائب ہوتے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر چند خشک مٹر پھول توڑے۔ وہ کھڑکھڑا کر ٹوٹے اور بکھر گئے۔

مہمانوں کی ٹولیوں میں گفتگو بڑے زور شور سے شروع ہو چکی تھی۔ سامنے تین انگریز بیٹھے چوتھے کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ یہ چوتھا، جس کا سیاہ ہیٹ نیچے گھاس پر پڑا تھا، ادھیڑ عمر کا بڑے سے سر والا شخص تھا اور بڑی محویت سے ڈرامائی انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی قصہ بیان کر رہا تھا۔ نعیم آگے بڑھا۔ ایک لمبے صوفے پر مہاراجکمار پرتاپ گڑھ چیف کمشنر کے ساتھ بیٹھے تاش کے پتے بانٹ رہے تھے۔

''تاش کے لئے یہ موزوں وقت تو نہیں مسٹر...... پر میں آپ کو سکھانے کے لئے بہت بے تاب ہوں۔ ایسا عجیب و غریب کھیل ہے جو یہاں پر کسی کو نہ آتا ہوگا۔ گزشتہ ماہ میں نے پیرس میں ایک خاتون سے سیکھا تھا۔'' انہوں نے پتوں کی تقسیم سے غیر مطمئن ہو کر تاش اپنے سیکرٹری کو پکڑائے اور خود چیف کمشنر کو کھیل کے ابتدائی اصول سمجھانے لگے۔ ساتھ بیٹھی ایک انگریز خاتون بھی دلچسپی لینے لگی۔ سیکرٹری ماہر فن کی طرح تاش لگا رہا تھا۔

جب نعیم گملوں کی اس قطار کے ساتھ ساتھ، جن میں موسم گرما کے پھول کی پنیری لگی تھی، مہاراج کمار کے صوفے کے پیچھے سے گزرا تو وہ پتے ترتیب وار لگاتے ہوئے اچانک رک کر بولے:

''پیرس میں مَیں نے دیکھا مسٹر...... کہ جس ہوٹل میں میں ٹھہرا وہاں عجیب رواج تھا۔ وہ پیرس کا سب سے بڑا ہوٹل تھا، اور ہر ایک ''سوئٹ'' کے ساتھ دو دو غسل خانے تھے۔ کیا ہوا کہ صبح صبح جب میں نہانے کے لئے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے والے ''سوئٹ'' سے ایک صاحب ننگ دھڑنگ، کمر کو تولیے سے پونچھتے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا ''اوہ، معاف کیجئے'' اور واپس چلا آیا۔ وہ صاحب جواب دیئے بغیر نکل گئے۔

انگریز خاتون سرخ ہو گئیں۔ ''انگریزی بہت کم سمجھتے ہیں وہاں پر۔'' وہ جلدی سے بولیں۔

''جی ہاں۔'' راج کمار نے بے حد اخلاق سے کہا۔ ''بڑی دقت ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ فرانس کا ساحل آپ سے صرف تیس میل دور ہے۔''

''درست ہے...... بالکل درست ہے......'' خاتون نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ''حیرت کی بات تو ہے۔''

''اچھا تو مسٹر......'' مہاراج کمار نے بہر حال بات جاری رکھی ''دوسرے دن پھر یہی حرکت ہوئی۔ اب کے کوئی دوسرے صاحب تھے۔ میں بھی ڈھٹائی سے سامنے دیکھتا ہوا پاس سے گزر گیا۔ لیکن آگے نکلنے پر میں ایک

نظر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خاتون بڑی بے خبری اور لاتعلقی سے میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہیں۔ اس کے بعد میں پیرس کا عادی ہو گیا۔

چیف کمشنر ہولے سے مسکرائے۔ سیکرٹری کے پاس جو نوجوان انگریز بیٹھا تھا' آگے جھک کر بولا ''بھئی پیرس کی عورتیں ہندوستانی عورتوں کی طرح تھوڑا ہوتی ہیں۔''

''ہاں جی'' مہاراج کمار نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بڑی محنتی عورتیں ہوتی ہیں۔''

اس پر زبردست قہقہہ پڑا۔ سب جی کھول کر ہنسے۔ چیف کمشنر مسکرائے اور اپنے بے حد وسیع ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ مہاراج کمار پھر سے پتے تقسیم کرنے لگے۔ صرف وہی ایک شخص تھے جو انگریزوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔

آگے دو بڑی بڑی پگڑیوں اور دھوتیوں والے ہندو تاجر بیٹھے تجارت کی باتیں کر رہے تھے۔ مجمع کے اوپر سے نعیم نے دوسری طرف دیکھا۔ تین انگریزوں کو قصہ سنانے والا انگریز اب اُٹھ کر ان کرسیوں کے آگے اس طرح پھر رہا تھا جیسے جنگلی جانور پنجرے میں چکر لگاتا ہے' اور اسی انہماک سے بول رہا تھا۔ پھاٹک کے اندر جو کاریں کھڑی تھیں ان کا نظارہ کرنے کے لئے چند بچے اور نچلے طبقے کے لوگ سڑک پر جمع ہو گئے تھے۔ چیف کمشنر کے ہمراہ آئے ہوئے سپاہی انہیں بید مار مار کر بھگا رہے تھے۔ لیکن وہ ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جا کھڑے ہوتے۔ مئی کے شفاف آسمان پر اب مکمل تاریکی تھی' اور ستارے تھے۔ رات گرم تھی اور درختوں میں رنگین قمقمے روشن تھے۔ اگلے صوفے پر اسے ایاز بیگ دکھائی دیئے جو ڈاکٹر اینی بیسنٹ کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں ایک اور شخص' بہت صاف رنگت اور سیاہ بالوں والا' بھی شامل تھا۔ نعیم اپنے چچا کے پاس خالی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''لیکن مسٹر بیگ' اس بات پر میں میڈم بلیوٹسکی سے متفق نہیں ہوں۔'' اینی بیسنٹ کہہ رہی تھیں۔ ''وہ کہتی ہیں کہ ستاروں کی دنیا میں جو وجود ہیں وہ محض روحیں ہیں اور یہ کہ وہ مادی نہیں ہیں' اور وہ انہیں مابعدالطبعیاتی طور پر ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ میں کہتی ہوں کہ وہ باقاعدہ طور پر اجسام ہیں اور مادی ہیں اور طبعیاتی طور پر اس کا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ طبعیات کے اطلاق سے ''تھیوسوفی'' کی تھیوری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

''لیکن اس بات کا جواب پچھلی اپریل میں مَیں نے آپ کو خط میں بھی دیا تھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تھیوسوفی پر سائنس کو صادر کیا جا سکے۔'' ایاز بیگ بولے۔

''سائنس کے قانون کو 'صادر' کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اینی بیسنٹ نے اپنے دل کش لہجے میں کہنا شروع کیا ''صادر کرنا اور بات ہے اور......''

نعیم نے اکتا کر سننا چھوڑ دیا۔ اس کی سمجھ میں اس گفتگو کا ایک لفظ نہ آیا تھا' لیکن وہ مسز بیسنٹ پر سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ اس کے سر پر برف ایسے سفید بالوں کی ٹوپی سی بنی ہوئی تھی اور اس کی آواز' نعیم نے سوچا' شاید دنیا کی خوبصورت ترین آواز تھی۔ اپنی عمر کے باوجود وہ بڑی پُرکشش عورت تھی۔

دل میں وہ سوچا بیٹھا تھا۔ عذرا کے جانے کے بعد کسی نے اس سے بات نہ کی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ مختصر ملاقات اور اس کے جارحانہ انداز سے وہ جھلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل پر لڑکپن کی اُداسی اُتر آئی اور اردگرد باتیں کرتے ہوئے اور باتیں سنتے ہوئے تمام آدمیوں کو وہ خاموش رقابت کے احساس کے ساتھ دیکھنے لگا۔ دائیں طرف نواب صاحب' ان کی ساتھی ادھیڑ عمر خوبصورت عورت' دو انگریز اور ایک ہندوستانی چھوٹے سے دائرے میں بیٹھے تھے۔ ہندوستانی متواتر باتیں کر رہا تھا اور اس کے ساتھی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ جب وہ آیا تو لنگڑا کر چل رہا تھا اور سب لوگ بڑے تپاک سے اسے ملے تھے۔ چیف کمشنر اور مہاراج کمار کے بعد اس کی کار سب کاروں سے اونچی اور چمکدار تھی' اور اس کے پہیوں کے تار بجلی کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس وقت اس کی ٹانگ' جو خراب تھی' بالکل سیدھی' اکڑی ہوئی کرسی پر سے نیچے سبزے تک آرہی تھی لیکن اس کی باتوں کے ہلے میں کوئی اس کی ٹانگ سے دلچسپی نہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ نواب صاحب کے خاص ملازم نے ایک رائفل اور ایک بڑی سی پستول، جس کے پیچھے لکڑی کا دستہ لگا تھا، لاکر اسے پکڑائی اور وہ تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا کچھ کہنے لگا۔

نعیم نے جب دوبارہ اینی بیسنٹ کی طرف دیکھا تو وہ کہہ رہی تھیں: ''میں بھی گوکھلے سے ملنا چاہتی ہوں۔ بہت کمزور دکھائی دے رہے ہیں۔'' پھر وہ ایاز بیگ اور سیاہ بالوں والا شخص اٹھ کر لان پار کرنے لگے۔ نعیم بھی ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ جب وہ لنگڑے باتونی شخص کے قریب سے گزرا تو اس نے سنا وہ کہہ رہا تھا:

''افوہ' یہ جرمن۔ کمبخت ایسی مشین بناتے ہیں! اب دیکھئے اس ساری پستول میں آپ کو ایک بھی کیل (rivet) نظر نہ آئے گی۔ سارا ویلڈنگ کا کام ہے۔ یہ اصل مرد کا کھیل ہے۔ پارسال شیر کے شکار کو چیف کمشنر کے ساتھ جو میں بنگال گیا......''

نعیم گزر گیا۔ باتوں کا شور عروج پر تھا۔ جب وہ دوسری طرف پہنچا تو اس کے ساتھی جھک جھک کر گوکھلے سے مل چکے تھے اور خیریت پوچھ رہے تھے۔ وہ صوفے کے پیچھے جا کر اندھیرے میں کھڑا ہوگیا۔ گوکھلے آنے والوں کو جگہ دینے کی خاطر کھسک کو صوفے کے کونے پر چلے گئے' جس سے ان کا چہرہ اچانک روشنی میں آگیا۔

''ہم یہی بات کر رہے تھے۔ میں ان سے کہہ رہی تھی کہ مسٹر گوکھلے کی ''مجلس خدام ہند'' (Servants of India Society) خالص تھیوسوفیکل اصولوں پر بنائی گئی ہے۔'' اینی بیسنٹ نے کہا۔

''لیکن انہیں صرف لفظ 'ہند' پر اعتراض ہے۔ یعنی 'خدام انسانیت' کیوں نہیں؟'' ایاز بیگ بولے۔ ''یا خدام۔ تھیوسوفی!'' سیاہ بالوں والے شخص نے مسکرا کر کہا۔ اس کی بات کی سنی ان سنی کر کے اینی بیسنٹ پھر بولیں: ''اس سے' آپ مانیں گے کہ تحریک محدود ہو جاتی ہے۔''

گوکھلے سنبھل کر بیٹھے اور اپنے بوڑھے ہاتھوں میں چھڑی کو پھرانے لگے۔ ''تھیوسوفی......'' انہوں نے دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔ پھر چشمہ اتار کر صاف کیا اور دوبارہ لگالیا۔ ''تھیوسوفی' مسز بیسنٹ' نہ سائنس ہے نہ

سیاست ۔ محض فلسفہ ہے۔ سیاست چند مادی فوائد کا نام ہے' جیسے بہتر خوراک' بہتر لباس' بہتر رہائش' انہیں حاصل کرنے کا طریقہ اور تھیوسوفی یا کسی بھی غیر مادی یا غیر عملی فلسفے پر یقین کر کے ہم یہ چیزیں حاصل نہیں کر سکتے۔ مادے کا ایک حجم ہوتا ہے اور وہ ایک خاص جگہ گھیرتا ہے۔ وہی مادہ اس سے زیادہ رقبے کی جگہ نہیں گھیر سکتا' چنانچہ محدود ہے۔ ہم مادے یا سیاست کو غیر محدود نہیں کر سکتے۔ 'خدامِ ہند' کے اصول اور طریقہ کار گو خالصتاً مادی تو نہیں اور نہیں کسی حد تک روحانی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ جو لوگ مجلس میں شامل ہیں انہیں اپنے ہر آرام و آسائش کو ترک کر دینا پڑتا ہے، لیکن وہ کام کرتے ہیں دوسرے لوگوں کی بہتری کی خاطر، اور یہ دوسرے لوگ ہیں ہندوستان کے لوگ۔ یہی 'ہندوستان' کا لفظ مجلس کو ایک مادی شکل دے دیتا ہے۔'' اینی بیسنٹ کسمسائیں' مگر جب بولیں تو ان کی آواز کم دل کش نہ تھی: ''لیکن میں نہیں سمجھتی کہ آپ وسیع تر مقصد اور اصطلاحوں سے کیوں گھبراتے ہیں۔ کام جو بھی ہو' ایک بڑا نام کام اور مقصد کو وسعت بخشتا ہے۔''

''لیکن یہ عظمت اور وسعت تو آپ سمجھتی ہیں' یا نواب صاحب سمجھتے ہیں یا کرنل اولکاٹ سمجھ سکتے ہیں۔ میرے ملک کے یہ چھوٹے چھوٹے لوگ نہ ذہین ہیں نہ روحانی بزرگ۔ ان سے اگر کہا جائے کہ دنیا کی بہتری کے لیے آؤ' تو وہ اپنا گندم بونا جاری رکھیں گے۔ لیکن اگر کہا جائے کہ ہند کے لیے' اپنے فلاں بھائی' فلاں بہن کے لئے آؤ...... تو دیکھئے مسز بیسنٹ'' گوکھلے نے ایک ہاتھ سے چشمہ اتارا اور دوسرے ہاتھ کی انگلی ہلاتے ہوئے بولے۔ ''یہ لوگ جو کھیتوں میں اور سڑکوں پر اور گلیوں میں کام کرتے ہیں' گو ذہین اور روحانی نہیں مگر عقل مند ضرور ہیں۔ وہ اپنے گاؤں' اپنی زمینوں' اپنے ماں باپ اور بچوں کے نام پر ضرور آئیں گے اور اسی لیے کسی سیاسی تحریک کو غیر محدود نہیں کیا جا سکتا۔''

اس لمحے نواب صاحب جو قریب سے گزر رہے تھے' چونک کر رُکے۔ ''خوب۔ ہر طرف سیاسی تحریکات کی بات ہو رہی ہے۔ آپ بڑے کمزور نظر آ رہے ہیں۔ مسٹر گوکھلے آپ کی ذیابیطس کیسی ہے؟''

''خراب ہی جا رہی ہے۔ صحت یا موت کا غم تو نہیں' غم ہے تو محبت کا۔''

''محبت کا؟'' سیاہ بالوں والا آدمی مسکرایا۔ اینی بیسنٹ خوبصورتی سے چونکیں۔

''جب سے پیدا ہوا میٹھے سے محبت کرتا رہا۔ اب اِدھر دس برس سے میٹھا حلق سے نہیں اُترا۔'' وہ ہنسے۔

''مگر یہی کرسمس پر جب بانکی پور آپ آئے تو آپ صحت میں تھے۔''

''آپ کانگرس کے اجلاس پر بانکی پور میں تھے؟'' اینی بیسنٹ نے بات کاٹ کر کہا۔

''ہاں ہاں۔ میں تھا' گوکھلے تھے' مہاراج کمار تھے' مسٹر سنہا تھے۔'' نواب صاحب نے لنگڑے باتونی کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

''اوہ...... میں اس وقت ہندوستان میں نہیں تھی۔ اجلاس کیسا رہا؟''

''اچھا خاصا رہا۔ بہت لوگ آئے۔''

''بنگال کی تقسیم کے متعلق کوئی ریزولیوشن ہوا؟''

''ارر......'' نواب صاحب نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے سامنے دیکھا جہاں نعیم کھڑا تھا۔ وہ کھسک کر اندھیرے میں ہو گیا۔ ''ارر...... کیوں مسٹر گوکھلے؟''

گوکھلے ہنسے: ''بنگال تقسیم ہو یا متحد رہے' آپ کا رائل بنگال ٹائیگر کا شکار جاری رہے گا۔''

''میری یادداشت کچھ ٹھیک نہیں رہی کئی دنوں سے۔'' وہ کھسیانے ہو کر بولے اور اجازت لے کر چلے گئے۔

''آپ کا بانکی پور کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اینی بیسنٹ نے گوکھلے سے پوچھا۔

''خیال؟'' وہ طنز سے مسکرائے۔ ''بس ایسی ہی ایک پارٹی تھی جیسی آج ہے۔ بڑے شاندار لوگ تھے۔ خوبصورت اور اپ ٹو ڈیٹ' خوبصورت باتیں تھیں' خوش گپیاں تھیں۔''

''یہ تو زیادتی ہے' مسٹر گوکھلے میں بھی پریس کی طرف سے وہیں تھا۔ اچھی خاصی کانفرنس تھی۔'' سیاہ بالوں والا آدمی شستہ انگریزی میں بولا۔

پیچھے کھڑا نعیم اپنی ٹوپی کو بری طرح ہاتھوں میں مروڑنے لگا۔ گوکھلے یکلخت سنجیدہ ہو گئے: ''آپ کے اخبار کا کوئی نمائندہ جنوبی افریقہ میں بھی تھا؟''

''اوہ۔ ہاں ضرور تھا۔'' اخبارنویس نے روک کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''آپ جنوبی افریقہ سے آ رہے ہیں' میں جانتا ہوں۔ مگر وہاں کا مقابلہ آپ ہندوستان سے نہیں کر سکتے۔ یہاں تو...... سیاست' یعنی پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔''

''پڑھے لکھے لوگوں سے آپ کی مراد؟''

''یہی کہ...... تعلیم یافتہ ہیں۔ تاریخ سے واقف ہیں' اور......

دفعتاً نعیم آگے بڑھا' جس سے اس کا چہرہ' جو سرخ ہو رہا تھا' روشنی میں آ گیا۔ ذرا سا جھک کر نوعمری کے جوشیلے لہجے میں وہ بولا: اور یہ بھی کہ ساری کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔''

سب نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔ نعیم کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ اس نے ٹوپی کے پھندنے کو اس زور سے کھینچا کہ وہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ ایاز بیگ کا رنگ سفید پڑ گیا۔

''یہ کوئی بری بات نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی بڑی زبان سیکھنا معیوب نہیں' بلکہ اچھی تعلیم ہے۔'' اخبار نویس اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔

''اسی لیے کم پڑھے لکھے لوگ قید کر دیئے جاتے ہیں۔ اور آپ کیا توقع رکھتے ہیں۔ تلک جیل میں ہے۔ کیا؟'' اخبارنویس انگریز کا چہرہ ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس کے ماتھے سے نفرت ٹپکنے لگی اور وہ بار بار مٹھیوں کو کھولنے اور بند کرنے لگا۔ ''تو آپ اسے سیاست دان کہتے ہیں وہ......'' پھر اس نے ایک شریف انگریز کی تربیت کے مطابق' انتہائی کوشش سے اپنے آپ کو قابو میں کیا اور خشک لہجے میں بولا: ''اس کی سیاست کے متعلق تو چیف

کمشنر آپ کو بہتر بتا سکتے ہیں۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے میں کہتا ہوں کہ وہ اچھا اخبار نویس بھی نہیں۔''
ایاز بیگ اعصابی حالت میں دونوں پاؤں ہلا رہے تھے۔ انار کے پتوں میں چھپا ہوا قمقمہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ زور سے جھولا اور سایہ ان کے پاؤں پر ڈولنے لگا۔ اسی وقت سب لوگ کھانے کے لیے اٹھنا شروع ہوئے۔ گوکھلے اینی بیسنٹ سے کہہ رہے تھے:

''لیکن چند نوجوانوں سے میں ضرور متاثر ہوا۔ موتی لال نہرو کا لڑکا بھی آیا تھا۔ ابھی کیمبرج سے لوٹا ہے۔''

اخبار نویس انگریز دیر تک کھڑا چہرے سے ہر تاثر کو دور کرنے کے لیے ماتھے پر رومال پھیرتا ہوا۔ لنگڑا آدمی بڑی تندہی سے باتیں کرتا اور ہنستا ہوا قریب سے گزرا۔ نعیم نے دیر تک جیبوں میں رومال تلاش کرنے کے بعد ٹوپی کے ساتھ ماتھے کا پسینہ پونچھا اور ہجوم میں شامل ہو گیا۔

کھانے کی میزوں کی دو لمبی قطاریں لگی تھیں جن پر سب مہمان بآسانی بیٹھ گئے۔ سبزے کے اس قطعے پر رنگین قمقموں کا جال بچھا تھا۔ رکابیوں میں بھنے ہوئے سالم مرغ اور تیتر لکڑی کی ٹانگوں پر کھڑے تھے۔ پلاؤ ابھی نہیں آیا تھا پر خوشبو آ رہی تھی۔ دس سے زیادہ قسم کے کھانے میز پر آ چکے تھے۔ کھانوں کے درمیان چینی کی چھوٹی بے داغ پلیٹوں میں سیاہ چربی کی بھدی موم بتیاں کھڑی تھیں۔ یہ موم بتیاں درمیانی انگلی کے برابر موٹی اور خاصی بدشکل تھیں اور انہیں روشن نہیں کیا گیا تھا۔

ایک میز کے سرے پر دو بڑی کرسیاں پڑی تھیں جن پر نواب صاحب اور ایک دوسرے بزرگ آ کر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے شام کے کھانے کا لباس اتار کر اب سرخ چمکیلے ریشم کا لباس پہن رکھا تھا۔ یہ کچھ اس طرح کا لباس تھا جیسا مغل شہنشاہ یا ان کے درباری پہنا کرتے تھے' اور آج کل سرکس کے مسخرے پہنتے ہیں۔ کپڑا ایسا تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ ایک لمبا سا تنگ بلاؤز تھا جس پر گلے تک سفید چمک دار بٹن لگے تھے۔ آستین چست تھی۔ کمر سے نیچے بلاؤز کا گھیر بڑا تھا' اور نیچے اسی کپڑے کی بھاری سی تنگ پائینچوں والی شلوار تھی۔ جوتا بھی اسی کپڑے کا اور موزہ نما تھا۔ کمر کے ساتھ سنہری میان والی تلوار لٹک رہی تھی اور بلاؤز کی پٹی بھی سنہری تھی۔ ان کے ملازم خاص نے ایک بڑی سی سرخ ٹوپی جس پر سنہرا کام کیا ہوا تھا' لا کر ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔ قریب ہی ایک پلیٹ میں کالی چربی کی سب سے بڑی موم بتی رکھی تھی۔ ساتھ والے بزرگ نے عام ہندوستانی مسلمانوں کا لباس' شیروانی اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ان کے ساتھ دونوں طرف پرویز اور عذرا بیٹھے تھے۔ آگے وہ ادھیڑ عمر عورت تھی جو اب تیز روشنی میں خاصی معمر دکھائی دے رہی تھی۔ آگے چیف کمشنر' مہاراج کمار' اینی بیسنٹ' گوکھلے اور تقریباً سب انگریز مہمان تھے۔ میز کے آخر میں چند ہندوستانی تھے جن میں نعیم بھی بیٹھ گیا۔

دوسری میز پر بھی ہندوستانی تھے جن میں ایاز بیگ بھی تھے۔ ملازمین بے داغ لباس پہنے سرگرمی سے آ جا رہے تھے۔ سارے غیر ملکی نواب صاحب کا عجیب و غریب لباس دیکھ کر چہروں پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے تھے۔

جب سب لوگ بیٹھ چکے تو میز کے سرے والے بزرگ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ سب خاموش ہو گئے۔ ہوا

درختوں میں تھم گئی۔ چند لمحے تک خاموش کھڑے رہنے کے بعد انہوں نے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ خشک کیا اور بولے: ''آج یعنی 13 مئی 1913ء کو روشن آغا کو فوت ہوئے تین ماہ مکمل ہوئے ہیں۔ میں خاندانی روایات کے مطابق اور اس حیثیت کی رو سے جو مجھے سونپی گئی ہے' نواب غلام محی الدین خان آف روشن پور کے روشن آغا کے لقب کا صحیح حقدار ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔''

تقریر ختم کرکے انہوں نے جلدی سے سرخ ٹوپی اٹھا کر نواب صاحب کے سر پر رکھ دی' جس نے آنکھوں تک ان کا چہرہ چھپا لیا۔ پرویز اور عذرا اٹھ کر اپنے باپ کی طرف بڑھے۔ لیکن اس سے پہلے دوسرے بزرگ نے جلتی ہوئی تیلی ان کی طرف بڑھائی جس کی مدد سے انہوں نے اپنے آگے کی سیاہ موم بتی روشن کی۔ ''روشن آغا'' کہہ کر ان کے دونوں بچے ان سے لپٹ گئے۔

تالیوں اور مبارک بادوں کا شور برپا ہوگیا۔ غیر ملکی' جو اب تک ضبط کئے بیٹھے تھے' روشن آغا کی ہیئت کذائی پر اب دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ روشن آغا اپنے دونوں بچوں کو تھامے جھک جھک کر مبارک باد وصول کر رہے تھے۔ ایک دفعہ جھکتے ہوئے ان کی عجیب وغریب ٹوپی ٹھوڑی تک لٹک آئی۔ عذرا نے جلدی سے اسے پھر سے ان کی آنکھوں پر جمایا اور احتیاط سے جھکنے کی تنبیہ کی۔ ہر طرف قہقہوں' تالیوں اور ''روشن آغا...... روشن آغا'' کی چیخوں کا شور تھا۔ مؤدب بیرے ہاتھ پیچھے باندھے شرما کر ہنس رہے تھے۔ قمقمے ایک ایک کرکے بجھنے شروع ہوئے حتیٰ کہ صرف روشن آغا کی موم بتی روشن رہ گئی۔ چاروں طرف اندھیرا ہوگیا۔ سب سے پہلے پرویز اور عذرا نے اپنے اپنے آگے کی موم بتیاں لے جا کر اس سے جلائیں اور واپس لا کر رکھ دیں۔ پھر معمر خوبصورت عورت اور دوسرے بزرگ نے ایسا ہی کیا: اس کے بعد چیف کمشنر اور مہاراج کمار اپنی اپنی موم بتیاں اٹھا کر لے گئے اور بڑی موم بتی سے روشن کر کے واپس لے آئے' پھر اینی بیسنٹ اور گوکھلے اُٹھے' پھر اخبار نویس' پھر سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی موم بتی کے گرد دھاندلی پڑ گئی۔ بعض لوگ موم بتیاں جلانے گئے اور وہیں کھڑے ہو کر گپیں ہانکنے لگے۔ اخبار نویس ایک بڈھے انگریز کو' جس نے اس سے شکایت کی تھی کہ ساری کارروائی کو پہلے سے چھاپ کر سب مہمانوں میں بانٹ دیا جاتا تو وہ اس گڑبڑ سے بچ جاتے' سمجھا رہا تھا کہ یہ ساری تقریب ایک خاندانی راز ہے اور اسے پرنٹ میں لانے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاتی۔ بڈھا سنجیدگی اور اداسی سے موم بتی کو تکے جا رہا تھا۔ ہر طرف سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر موی شمعوں کی روشنی میں کھانا شروع ہوا اور خاموشی سے جاری رہا۔ اب چاند وسط مئی کے آسمان پر روشن اور گرم تھا اور ہوا درختوں میں تھم چکی تھی۔ مدھم چاندنی میں دلّی کی آدھی سے زیادہ آبادی سو چکی تھی اور روشن محل کے باغ میں مقدس چربی کی روشنی میں خاموشی سے کھانا کھایا جا رہا تھا۔ سفیدے کے اونچے درخت ساکت کھڑے تھے۔ میزوں سے پرے ایک فوارہ اندھیرے میں خاموشی سے پانی اچھال رہا تھا۔ نعیم نے کھانے پر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ ساری فضا طلسمی تھی۔ ایک سحر۔ جس میں صرف خوشبودار کھانا اور جبڑے ہلاتے ہوئے لوگ حقیقی

تھے۔ ساری دنیا' سارے لوگوں کا صرف ایک کام تھا' کھانا۔ لنگڑے باتونی کی مہذب' خوش گوار آواز اب بھی آ رہی تھی۔

''بھوک ...... چونکہ انتہائی وحشت ناک انسانی جذبہ ہے' چنانچہ کھانا انسان کا شریف ترین فعل ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ نعیم کے دائیں بازو پر جو شخص بیٹھا تھا پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے اس کی طرف جھکا۔ ''میں نے آپ کو بات کرتے سنا جب آپ تلک کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔''

اس نے دیکھا یہ وہی قصہ گو انگریز تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے ساتھیوں کے سامنے جنگلی جانور کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ وہ پھر بولا: ''کیا آپ کو پتہ ہے کہ تلک نے مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ کیا؟ وہ ذبیحہ گاؤ کے خلاف سوسائٹی اور مسجد کے سامنے باجا بجانے پر اصرار ...... اور وہ سب۔''

کوئی جواب نہ پا کر کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ گفتگو کی سعی کی: ''اس موم بتی کو دیکھ رہے ہیں۔ سنا ہے یہ چربی پچھلے سو سال سے اس خاندان کے پاس ہے۔ میں سوچتا ہوں جب یہ ختم ہو جائے گی پھر کیا ہوگا؟''

نعیم نے محظوظ ہو کر اسے دیکھا۔ ''آپ کو کیسے پتہ چلا میں مسلمان ہوں؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''اوہ......'' جنگلی جانور برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''آپ آج شام سرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔'' اس کے بعد اس نے کوئی بات نہ کی۔

کھانا کافی دیر تک جاری رہا۔ پھر لوگ اُٹھ اُٹھ کر جانے لگے۔ دوسرے لان میں جب وہ آرام سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے تو بیرے کافی کے خوبصورت پیالوں میں قہوہ پیش کرنے لگے۔ جب کھانے کی میزوں پر وہ اکیلے رہ گئے تو روشن آغا اٹھے۔ دیر تک وہیں کھڑے وہ بڑی موم بتی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ اپنے انوکھے لباس میں وہ بیک وقت بارعب اور مسخرے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر انہوں نے پھونک مار کر موم بتی کو بجھا دیا۔

''روشن آغا۔'' ان کے ملازمِ خاص نے دھیرے سے کہا اور سارے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ انہوں نے ایک لحظہ غور سے اسے دیکھا' پھر اپنی چھوٹی انگلی سے چمک دار انگوٹھی نکال کر اس کی طرف اُچھالی جسے زمین پر گرنے سے بچانے کے لئے وہ دیوانہ وار ہوا میں ہاتھ چلانے لگا۔

جب وہ بجری کی سڑک پار کر کے دوسری طرف جا رہے تھے تو کونے والے درخت کے نیچے انہوں نے نعیم اور عذرا کو دیکھا اور ان کے مسرور چہرے پر فکر کی ایک پرچھائیں گزر گئی۔

نعیم قہوے کا پیالہ پکڑے پکڑے ایک عجیب و غریب درخت کے پاس جا نکلا۔ وہ گھنا سا پھیلا ہوا درخت تھا اور اس کی موٹی موٹی شاخیں نعیم کی چھاتی کے برابر آتی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ چھلانگ لگا کر اوپر چڑھ جائے۔ قہوے کا پیالہ شاخ پر رکھ کر اس نے اوپر دیکھا۔ شاخوں میں سرخ رنگ کا قمقمہ جل رہا تھا۔

''آپ اکیلے اکیلے کیوں پھر رہے ہیں؟'' عذرا نے قریب آ کر پوچھا۔ جواب دینے کی بجائے اس نے قہوے کا پیالہ اٹھایا اور گڑبڑا کر ایک جلتا جلتا گھونٹ بھرا۔

''یہ درخت ہماری محبوب جگہ ہے۔ ہم چھٹی کے روز سارا دن یہاں چڑھے رہتے ہیں۔'' وہ شاخ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ مدھم سرخ روشنی میں اس کی آنکھیں اور بال بھورے اور رنگ گندمی تھا۔ اس کا بازو جو شاخ پر رکھا تھا گول اور صحت مند تھا اور تنگ آستین میں سختی سے پھنسا ہوا تھا۔ بے اختیار نعیم کا جی چاہا کہ اس ابھری ہوئی جگہ کو چھوئے جہاں سے آستین نے جلد کو دبا رکھا تھا۔ وہ شاخ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''آپ کی کافی گرم ہے؟''

''کچھ زیادہ ہی گرم ہے۔'' نعیم نے کہا۔

''اوہ......'' وہ اسی طرح سر پیچھے پھینک کر ہنسی جیسے شام کے وقت برآمدے میں ہنس رہی تھی۔ اس کی گردن چوڑی ہوگئی اور نرخرہ تیزی سے کانپنے لگا۔ وہ بے حد جاندار ہنسی تھی۔ ''آپ کا منہ جل گیا؟'' نعیم برا سا منہ بنا بنسا۔

''یہ بہت اچھا ہوا۔'' وہ اسی جارحانہ انداز میں خوشی سے بولی اور دونوں ہاتھ اوپر باندھ کر شاخ کے ساتھ جھول گئی۔

''اررر......'' دفعتاً وہ جھینپ گئی۔ ''مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ روشن آغا ناراض ہوں گے۔ وہ ہمیشہ مجھے اس پر چڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ آپ خفا تو نہیں ہوئے' میں نے آپ سے مذاق کیا ہے۔'' وہ قہوہ پیتی ہوئی بولی۔

''نہیں۔ لیکن آپ میرا قہوہ پی رہی ہیں۔''

''ارے......اوہ۔'' وہ سادگی سے ہنس پڑی۔ ''لائیے' آپ کے لئے اور لا دوں۔''

''میں یہی پیوں گا۔''

''یہی؟'' اُس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

''ہاں۔ یہی''

حیرت کے مارے اس کی آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا: ''پیالے بالکل ایک جیسے ہیں۔''

وہ خاموشی سے کھڑے قہوہ پیتے رہے۔ سامنے سے باتوں کا شور آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ عذرا کے بال پیچھے کی طرف اڑنے لگے۔ نعیم خاموش کھڑا اس کے بازو اور گردن کو دیکھتا رہا۔ قہوہ پیتی ہوئی وہ اپنے موٹے سرخ ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

''میں اس ساری تقریب کا مطلب نہیں سمجھا۔ یہ جو آج ہوئی۔'' نعیم نے کہا۔

''آپ کو کسی نے نہیں بتایا؟ ارر...... یہ دراصل اس طرح ہے۔ روشن پور کا مالک روشن آغا کہلاتا ہے۔ یہ تقریب اسی سلسلے میں تھی۔ آج سے بابا روشن آغا کہلائیں گے۔ اس سے پہلے بڑے ابا تھے۔''

''بے حد دلچسپ تقریب تھی۔''

''یوں یہ خالص خاندانی تقریب ہے۔ بابا کا لباس بھی خاندانی ہے۔ صرف آج کے دن پہننے کے لئے ہے۔'' وہ احترام سے بولی۔

''جنہوں نے تقریر کی وہ کون ہیں؟''

''ہمارے خاندان کے سب سے عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔''

''اور وہ خاتون؟''

''میری خالہ ہیں۔ یہیں رہتی ہیں۔''

''آپ کی والدہ؟''

''ممی پردہ کرتی ہیں۔'' اس نے پیالہ خالی کر کے شاخ پر رکھتے ہوئے اچانک نعیم سے پوچھا۔ ''آپ انگریزی لباس پہنتے ہیں؟''

''ہاں''

''اتوار کو ہم پرویز کے بی۔اے۔ کرنے کی خوشی میں پارٹی کر رہے ہیں۔ آپ آئیں گے؟''

''آ جاؤں گا۔''

''ضرور یاد رکھیے گا۔ پانچ بجے شام۔''

''اچھا۔''

''ضرور۔'' اس نے پھر کہا۔ نعیم ہنس دیا۔

''شب بخیر۔'' وہ سبزے پر سے گزر کر روشن آغا کی طرف چلی گئی۔ وہ دوسرے کونے میں اونچی تکونی ٹوپی پہنے بیٹھے سر ہلا رہے تھے اور بار بار تلوار سنبھالتے جا رہے تھے۔ نعیم عذرا کو سبزے پر چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ اس لاابالی لڑکی سے بہت مختلف تھی جو شام کے وقت انگریزی لباس پہنے برآمدے میں دوڑ رہی تھی۔ بڑی شدت سے یہ خواہش نعیم کے دل میں پیدا ہوئی کہ وہ مڑ کر اس کے پاس چلی آئے اور وہ اس کے ہونٹوں، بازوؤں اور گردن کو قریب سے دیکھے۔

کچھ دیر کے بعد وہ جا کر ایاز بیگ کے پاس بیٹھ گیا جو لنگڑے باتونی کو کسی عمارت کے تعمیری نقائص کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اسے خاموشی سے ایاز بیگ کی باتیں سنتے ہوئے پا کر نعیم کو دکھ ہوا۔

آدھی رات کے قریب مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے۔ روشن آغا کو ''شب بخیر'' کہہ کر جمائیاں لیتے اور ڈکاروں کو روکتے ہوئے وہ اپنی اپنی سواریوں میں جا کر بیٹھنے لگے۔ نچلے طبقے کے چند لوگ ابھی تک شور مچا کر روانہ ہوتی ہوئی موٹر کاروں کو دیکھنے کے لئے باہر کھڑے تھے۔

جب نعیم ایاز بیگ کے ساتھ آخر میں 'شب بخیر' کہہ کر اپنی بہلی کے قریب آیا تو اسے نیند آ رہی تھی اور زیادہ کھا جانے سے پیٹ بھاری ہو رہا تھا۔ سوار ہونے سے پہلے ایک طاقتور خواہش کے تحت مڑ کر اس نے سارے

روشن محل پر نظر دوڑائی۔ باغ میں صرف نوکر خاموشی سے پھر رہے تھے اور برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ درختوں میں سرخ قمقمے زور زور سے جھول رہے تھے۔ وہ بے دلی سے اچک کر ایاز بیگ کے برابر بیٹھ گیا۔

''عذرا نے اتوار کی شام کو دعوت دی ہے چائے کی۔'' اس نے کہا۔

جواب کی بجائے چند مچھر اس کے چہرے سے ٹکرائے۔ اس نے چچا کی طرف دیکھا۔ ان کا کھلا' سپاٹ' معمولی خدوخال کا چہرہ تھا جیسا عام کام کرنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔ اس پر کوئی گہرائی نہ تھی' اس پر ہر تاثر صاف واضح ہو جاتا تھا۔ وہ چونک اُٹھا۔

''تم تقریر کرنے کے لئے وہاں نہیں گئے تھے۔'' ایاز بیگ نے غرا کر کہا۔ ''تمہیں پتا ہے تلک کا نام لینا ہی دہشت پسندی میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو تمہیں گرفتار کرلیا جاتا۔ روشن محل کی تقریب تھی اس لئے......'' نعیم بیٹھا سوچتا رہا' پھر آہستہ سے بولا ''مجھے افسوس ہے چچا وہ ہمارا سب کا ایسا ہیرو ہے۔ ورنہ......''

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے بہلی کے چلنے کے ساتھ ہلکورے کھاتے رہے۔ پھر ایاز بیگ نرم لہجے میں بولے۔ ''ہمارا خاندان انہی باتوں کی وجہ سے تباہ ہو چکا ہے۔ میں نے تمہیں تعلیم دلوائی۔ ساری امیدیں...... تم میری ساری زندگی ہو۔ ایک روز تمہیں پتہ چلے گا کہ میں نے کتنا دکھ سہا۔''

نعیم کو خیال ہوا کہ وہ رو رہے ہیں۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھا۔ ان کی خشک' چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کو خوشی ہوئی۔ بہلی دیر تک سنسان سڑکوں پر چلتی رہی۔

(۳)

جب نعیم روشن محل میں داخل ہوا تو پارٹی شروع ہو چکی تھی۔ پھاٹک پر ایک اونچی سی سیاہ موٹر گاڑی کھڑی تھی۔ قریب ہی پرویز کھڑا اس کے مالک سے باتیں کر رہا تھا۔ نعیم سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ صاحبزادہ وحید الدین' کالج میں پرویز سے دو سال سینئر رہا تھا' محکمہ تعلیم میں افسر اعلیٰ منتخب ہوا تھا۔ یہ سب باتیں اسے اسی تعارف کے دوران معلوم ہوئیں۔ پھر مصروفیت سے ایپرن کے ساتھ ساتھ پونچھتی ہوئی ایک انگریز لڑکی کو ٹھہرا کر نعیم سے تعارف کرایا گیا۔

''معاف کیجئے' میرے ہاتھ کالے ہیں۔ ہم نے خود ہی چائے بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔'' اس نے بے حد اخلاق سے کہا اور بجری کی سڑک کو پار کر کے لان پر اتر گئی۔ وہاں برگد کے پرانے درخت کے نیچے ہنگامہ بپا تھا۔ آج وہاں کوئی کرسی نہ تھی اور نہ میز۔ دو تین سٹول پڑے تھے جن پر دو لڑکیاں اور ایک لڑکا اکڑوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پاس ہی دو بچے سبزے پر لیٹے ایک تصویر دار رسالے کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ ان سے پرے عذرا ایک بڑے سے سٹوو کو جلانے میں جتی ہوئی تھی اور آٹھ دس لڑکے لڑکیاں اسے گھیرے ہدایات دے رہے تھے۔

سامنے سے دو لڑکیاں چلی آ رہی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں چائے کے برتنوں سے بھری ہوئی بید کی ٹوکری تھی، دوسری پانی کی کیتلی اٹھائے ہوئے تھی۔

انگریز لڑکی سٹوو کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل سبزے پر جھکی اور ہولے سے بولی: ''وہ تمہارا خوبصورت دوست آ رہا ہے۔''

عذرا نے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتی رہی۔

''لیکن آج شریف آدمی لگ رہا ہے۔''

''ہشت۔'' عذرا نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک لمحے کی سراسیمگی جو اس پر طاری ہوگئی تھی بے ساختہ مسرت میں تبدیل ہوگئی۔ ''سلام لیکم'' اس نے کہا اور اپنے تیل اور کالک لگے ہاتھوں میں نعیم کا ہاتھ پکڑ کر کالا کر دیا۔ قہقہوں کے درمیان وہ سرخ ہو گیا۔

''لڈیا نے آج مشورہ دیا کہ چائے خود ہی بنائی جائے۔ اب مزا آ رہا ہے سب کو۔ دیکھئے۔'' اس نے سٹوو کی طرف اشارہ کیا جس کے ساتھ اب آدھے درجن لڑکے لڑکیاں کشتی لڑ رہے تھے۔ ان سب کے چہرے پسینے سے تر تھے اور بے حد انہماک سے وہ اسے جلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

عذرا آج بے حد صحت مند اور چاق چوبند نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ اور آنکھیں چمک دار تھیں۔ گو ہنستے ہوئے اس کا دہانہ بہت پھیل جاتا تھا لیکن بھرے ہوئے ہونٹوں میں عجیب کشش تھی اور اس کا وجود اڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ نعیم کے سارے بدن میں مسرت کی سنسنی دوڑ گئی۔

کیتلی سٹوو پر رکھ کر وہ باتیں کرنے لگے۔

''وحید' اپنی نوکری لگنے کی نہ تم نے ہمیں کوئی پارٹی دی ہے نہ کچھ۔'' کھڑے پاجامے اور قمیض دوپٹے والی ایک لڑکی نے کہا۔

''ہاں ہاں۔'' انگریز لڑکی بات کاٹ کر چلائی۔ ''اب تم برسرروزگار ہو۔ چلو پارٹی دو ہمیں فوراً' کنجوس ٹام......''

''اتنی پارٹیاں تو کھا چکی ہو اور ابھی کنجوس ٹام ہوں......''

''پر روزگار ملنے کی خوشی میں کوئی نہیں ہوئی۔''

بات کو بیچ میں چھوڑ کر وہ قہقہے لگانے لگے۔

''وحید یہ بتاؤ'' عذرا بولی ''سکول میں لڑکوں کو کیسے پڑھاؤ گے۔'' پھر قہقہہ بلند ہوا۔

''اچھا بھئی' ٹھہرو سب لوگ۔'' پرویز بولا۔ ''وہ مسز ملن کی کیا بات ہے وحید؟ تم تو سول کلب جاتے ہو۔''

''کیا؟''

''وہ سنا ہے کہ ملن صاحب کو اس نے مجبور کیا واپس جانے پر۔ اس لئے وہ استعفیٰ دے کر چلے گئے۔''

''ارے ہاں......وہ......پتہ نہیں کیا ہوا کہ ارر......لیکن یہ درست ہے کہ اسی نے ملن صاحب سے استعفیٰ دلوایا۔''

اس گفتگو سے اُکتا کر لڑکیاں واپس سٹوو کی طرف چلی گئیں۔ چند لڑکے برگد پر چڑھنے کی مشق کرنے لگے۔ جب وہاں پر وحید کے ساتھ بس پرویز اور نعیم رہ گئے تو وہ آواز نیچی کر کے بولا:

''یار قصہ یہ تھا اصل میں کہ وہ جنے کیا سمجھنے لگی تھی خود کو۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی تو تھی ہی اور کافی خوبصورت بھی تھی، اور اوپر سے اس پٹیل پارٹی نے یہ سر پہ چڑھا رکھا تھا اسے کہ گھر پہ سلام کرنے کو حاضر ہو رہے ہیں باری باری، اور برج کھیل رہی ہے تو جناب پارٹی کی پارٹی اردگرد گھٹنے ٹیکے مدد کو حاضر ہے، تو بس۔''

''تو بس کیا۔''

''ہونا کیا تھا، اب ہر کوئی چغد رام تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ وہ مجھے حاصل نہ کر سکی، نواب زادہ آفتاب کو حاصل نہ کر سکی، اے۔ ایس۔ پی کو حاصل نہ کر سکی، تو دل برداشتہ ہو کر خاوند سے استعفیٰ دلوا دیا۔'' صاحب زادہ وحید الدین نے فاتحانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ پرویز نے مرعوب ہو کر سنجیدگی سے سر ہلایا۔

عذرا بار بار کیتلی کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ تین چار لڑکیاں مختلف قسم کے کیک اور مٹھائیوں کو ڈبوں میں سے نکال نکال کر پلیٹوں میں لگا رہی تھیں۔ وہ لڑکا جو سٹول پر بیٹھا دو لڑکیوں کے ہاتھ دیکھ رہا تھا، اٹھ کر درخت پر چڑھنے والی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ وہاں پہلے سے ہی پانچ چھ لڑکے اوپر شاخوں میں بیٹھے آرام کر رہے تھے اور بعد میں آنے والوں کو ٹہنیاں توڑ توڑ کر مار رہے تھے۔ قیامت کا شور تھا۔

اس وقت کیتلی کے پاس سے عذرا کی آواز آئی۔ ''آؤ بچو چائے تیار ہو گئی۔''

پرویز کا گروہ فرمانبرداری سے کیتلی کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔

''ہمیں یہاں پر چائے بھیج دو۔'' درخت پر سے ایک لڑکے نے چلّا کر کہا۔

''ہمارے پاس کوئی ہوائی جہاز نہیں جو آپ کو رسد پہنچائے۔ جو نیچے آئے گا اسے چائے ملے گی۔''

''ہم نیچے نہیں آئیں گے۔ یہاں پر آب و ہوا اچھی ہے۔'' دو تین آوازیں آئیں۔

''تم اپنا پروگرام شروع کرو۔'' مٹھائیوں کے پاس کھڑے پاجامے والی لڑکی نے تیزی سے کہا۔

عذرا نے جلدی سے بالوں کی پنیں ٹھیک کرتے ہوئے شرافت سے دوپٹہ اوڑھا اور قمیض کا دامن کھینچ کر ٹھیک کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''معزز حضرات!'' اس شور میں اس کی آواز گم ہو کر رہ گئی۔

''وحید لوگوں کو چپ کراؤ۔''

وحید ہڑبڑا کر چلّایا: ''پیاری خواتین و معزز بچو، ارر...... لاحول ولاقوۃ۔ معزز خواتین و پیارے بچو۔''

اب سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''عذرا بیگم کچھ فرماتی ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے مطلع کیا۔ نعیم کو ہنسی آ گئی۔

''تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را۔ گاہے گاہے باز خواں۔'' عذرا نے افتتاحی شعر پڑھا۔

''تقریر فارسی میں نہیں ہوگی۔ اردو میں ہوگی۔'' درخت پر سے آواز آئی۔

''نہیں انگریزی میں ہوگی۔'' انگریز لڑکی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''انگریزی میں ہوگی۔ انگریزی میں ہوگی۔ دھاندلی مت کرو۔'' پرویز نے چپ کراتے ہوئے کہا۔

''آج...... آج''

''اتوار ہے۔'' ایک لڑکی نے چپکے سے کہا۔

''ہیئر ہیئر......'' وحید نے تالی بجائی۔ تالیوں اور قہقہوں کا ایک شور اٹھا۔ پرویز اور نعیم بھی دل کھول کر ہنسے۔ درخت پر کوئی گانے لگا۔

''خاموش رہو۔'' عذرا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''خاموش...... خاموش''

''آج بتاریخ سولہ مئی 1913ء کو نواب زادہ پرویز محی الدین کے بی۔ اے۔ پاس کرنے کی خوشی میں چائے کا افتتاح کیا جاتا ہے۔''

''تالیاں بجاؤ۔'' وحید نے کہا۔ تالیاں بجائی گئیں۔

پھر عذرا نے ایک پیالی اس کے سامنے رکھی اور چائے دانی اٹھا کر پکڑائی۔ پرویز نے چائے انڈیلی۔ وحید نے دودھ دان پکڑایا۔ اس نے دودھ ڈالا' پھر ایک چمچہ چینی ڈالی' اس کی تقلید میں عذرا نے اور وحید نے ایک ایک چمچہ چینی کا ڈالا' پھر نعیم نے ایک چمچہ اور انگریز لڑکی نے اور قمیض دوپٹے والی لڑکی نے ایک ایک چمچہ چینی کا بھر کر ڈالا' پھر درخت سے لڑکے اتر کر آئے اور اپنے اپنے حصے کی چینی ڈالی حتیٰ کہ چائے باہر گر گئی اور پیالی چینی سے بھر گئی۔

ایک ایک پیالی چائے انہوں نے سبزے پر بیٹھ کر قہقہے لگاتے ہوئے ختم کی۔ پھر صاحب زادہ وحید الدین نے' جسے ایک سے ایک انوکھے کھیل سوجھتے تھے' اعلان کیا:

''جو شخص بغیر چائے گرائے پیالی لے کر پیڑ پر چڑھے گا اسے موٹر کی سیر کرائی جائے گی۔''

اس کی نئی نئی موٹر میں بیٹھ کر پوری رفتار سے دوڑانے اور نعرے لگانے میں بھی بے پناہ کشش تھی۔ چنانچہ مقابلہ شروع ہوا۔

سب سے پہلے ایک لڑکی غزالہ نام کی آگے بڑھی۔ وہ سکول میں جمناسٹک کرتی تھی اور باسکٹ بال ٹیم کی کپتان تھی۔ لبالب بھری ہوئی پیالی پر نظریں گاڑے ہوئے' احتیاط سے جما جما کر پیر رکھتے ہوئے اس نے چڑھنا شروع کیا۔ چند فٹ تک وہ کامیابی سے چڑھتی گئی' اس کی ہمت بندھانے کے لئے نیچے سے عجیب و غریب نعرے لگائے جا رہے تھے۔ نعروں کے اس شور میں دفعتاً اس کی چائے چھلکی' پھر پاؤں پھسلا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ پیالی بہرحال نیچے آ رہی۔ وہ وہیں پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ نیچے مصنوعی یاس و حسرت کی 'آہ' اور 'اُف' بلند ہوئیں۔ اب دوسرا امیدوار بڑھا۔ جلد ہی اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ پھر پیالیاں ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں۔

پرویز اُکتا کر پنیری کے گملوں کے ساتھ ساتھ ٹہلتا ہوا دوسری جانب چلا گیا۔ جدھر خالہ کھڑی باغبان سے

باتیں کر رہی تھی۔ نعیم اور عذرا قریب قریب بیٹھے اپنی اپنی پیالیوں میں چائے بنانے لگے۔ انگریز لڑکی قمیض دوپٹے والی لڑکی سے کہہ رہی تھی:

''یہ ہندوستان کے نواب۔ اگر ان کو کچھ عرصے کے لیے انگلستان بھیج دیا جائے تو کیا اچھا ہو۔ جمیلہ تم نہیں سمجھتیں۔ میرے والدین کی بھی سکاٹ لینڈ میں جاگیر ہے' اور چائے کا ایک سیٹ ٹوٹنے سے ہمارا بھی اتنا کچھ ہی نقصان ہوتا ہے جتنا عذرا کا۔ لیکن ہمیں اس کی سزا میں سارا دن چائے نہیں ملتی۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ جب ہمارے گاؤں کی جھیل پر برف جمی ہوئی تھی اور میں چھوٹی سی تھی تو...... اوہ' تم نہیں سمجھتیں۔''

مغرب کی طرف سے بادل اُٹھ رہے تھے اور فضا گہری ہوتی جا رہی تھی۔ نعیم پیالی ہاتھ میں پکڑے دور اس عجیب وغریب درخت کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے چند روز پیشتر اس کی دوستی ہوئی تھی۔

''تم نے کہا تھا وہ تمہاری محبوب جگہ ہے۔''

''ہاں۔'' عذرا نے جواب دیا۔ پھر وہ دونوں اٹھ کر اس طرف چل دیئے۔

عذرا نے پیالی مخصوص جگہ پر ٹکائی اور ہاتھ شاخ پر باندھ کر جھول گئی۔ ''آج کی تقریب کا مطلب آپ سمجھ گئے؟''

''اس کا کوئی مطلب ہی نہیں۔'' وہ ہنسا۔ عذرا کود کر شاخ پر بیٹھ گئی۔

''آج پیالے پھر ایک جیسے ہیں۔'' نعیم نے کہا۔

''ہاں۔ عجیب اتفاق ہے۔''

''اتفاق نہیں ہے۔''

''پھر؟''

''پہلے مجھے دوسرا پیالہ ملا تھا۔''

''تو؟''

''پھر میں نے جمیلہ سے یہ پیالہ لیا۔''

''کیوں؟''

''شاید آج پھر تبدیل ہو جائیں۔''

عذرا سر پیچھے پھینک کر ہنسی: ''عجیب منطق ہے۔''

''مگر نہیں ہوئے۔''

''ہاں۔''

''جمیلہ نے پوچھا تھا اس میں کوئی خاص بات ہے۔''

''آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا: ''نہیں۔''

''آپ نے جھوٹ بولا؟''

''ہاں۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

''جمیلہ بڑی پیاری دوست ہے۔ وہ ہمارے سگے رشتہ داروں میں سے ہے۔''

''یہ اچھا لگتا ہے؟'' اچانک نعیم نے پوچھا۔

''کیا؟''

''تم نے کہا تھا انگریزی لباس پہن کر آنا۔''

''اوہ......'' وہ ایک دم جھینپ گئی۔

بھورے رنگ کے بادل اب سارے آسمان پر گرج رہے تھے اور ہوا تیز ہو گئی تھی۔ مہین پھوار ان کے چہروں پر پڑنے لگی۔ ''بارش شروع ہو گئی۔'' عذرا نے کہا۔ پھر اس نے جوتا اتار کر پھینکا اور اوپر چڑھنے لگی۔ نعیم بھی اس کے پیچھے پیچھے چڑھا۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر آہستہ آہستہ شاخ پر چل رہی تھی۔ گول' سرخ ایڑیاں نعیم کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ایک مختصر سے لمحے کے لئے اس کی ایڑی نعیم کے منہ سے ٹکرائی۔ وہ رک گیا اور سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کے ٹخنے بھرے ہوئے' گول اور گلابی تھے۔ ہوا اس کے جسم سے رگڑ کھا کر درخت میں گم ہو رہی تھی اور اودے ریشم کا لباس جسم کے ساتھ چپکا ہوا پھڑ پھڑا رہا تھا' جس سے اس کی فربہ' صحت مند ٹانگیں' کولہے اور کمر واضح ہو گئے تھے۔ آٹھ دس گز اوپر جا کر وہ بیٹھ گئی اور تیز تیز سانس لینے اور ہنسنے لگی۔ تاریکی چاروں طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

''اگر بارش تیز ہو گئی؟'' نعیم نے پوچھا۔

''تو بھاگ جائیں گے۔''

''میں نے ابھی کچھ پوچھا تھا۔''

''کیا؟''

''یہ لباس۔''

عذرا نے ایک لحظے کو اندھیرے میں غور سے اسے دیکھا۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''تم جب روشن آغا کی پارٹی پر آئے تھے تو بڑے عجیب لگ رہے تھے۔''

''کیسے؟''

''تمہاری ٹوپی کا پھندنا۔''

''چپ رہو۔'' نعیم نے اندھیرے میں خود کو سرخ ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

وہ ہنسی۔ یہ وہی بے ساختہ' نوجوان' بھاری ہنسی تھی جو اتنی مانوس' اتنی پاگل کر دینے والی تھی۔ بجلی چمکی اور

انہوں نے پتوں میں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور نعیم جو بات اتنے دنوں سے سوچ رہا تھا دفعتاً جان گیا۔ روشن آغا کے چہرے پر جو مانوسیت تھی عذرا کی وجہ سے تھی۔ دونوں کے چہروں پر ایک سا وحشیانہ پن تھا جس نے ان کے ہونٹوں اور آنکھوں کو خفیف سی درندگی عطا کی تھی اور جس سے نعیم روشن آغا کی طرف بھی اسی طرح کھنچ گیا تھا جیسے عذرا کی طرف۔ اس نے ایک پتلی سی ٹہنی توڑی اور ہوا میں ہلانے لگا۔ شام کی گہری نیلگوں بارش سارے میں بھری ہوئی تھی اور پتوں پر سے قطرے ان کے سروں پر ٹپک رہے تھے۔ وہ ایک ساتھ اٹھے اور اسی طرح چلتے شاخ کے آخر تک چلے گئے۔ یہاں پتے گھنے تھے۔

''کیوں ہنستے ہو؟'' عذرا نے پوچھا۔

''ہم بندروں کی طرح چل رہے ہیں۔'' نعیم نے کہا۔ وہ پاؤں لٹکا کر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

برگد کے درخت تلے سے غول کا غول ''بارش بارش'' کا شور مچاتا ہوا برآمدے کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ وہاں روشنی تھی اور پرویز کے کمرے میں لڈیا پیانو کے سٹول پر بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ بارش کا اور پیانو کے اِکا دُکا سُر کا اور باتوں کا شور دور تک آرہا تھا۔

''تم سر پیچھے پھینک کر کیوں ہنستی ہو؟''

''کیوں؟''

''یونہی۔'' وہ رُکا۔ ''اچھا لگتا ہے۔''

دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر نعیم بولا: ''تمہارے ہونٹ ربڑ کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ میرا جی کرتا ہے ہاتھ لگاؤں۔'' وہ دم سادھے بیٹھا انتظار کرتا رہا' پھر مصنوعی ہنسی ہنسا۔

''تم بھی روشن پور میں رہتے ہو؟''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''خالہ نے بتایا تھا۔''

''خالہ نے اور کیا بتایا؟''

''کچھ نہیں...... روشن پور جاؤ گے؟''

''شاید''

''کب؟''

''پتہ نہیں۔''

نعیم نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں اس کے ہونٹوں کو چھوا اور ان پر انگلی پھیرتا رہا۔ پھر اس کی ناک اور آنکھوں کو چھوا' پھر گالوں کو دبا کر محسوس کیا' پھر جبڑے اور ٹھوڑی پر سے پھسلتا ہوا اس کا ہاتھ عذرا کے گول' مضبوط کندھے پر آگرا اور وہیں پڑا رہا۔ گیلے جسموں اور ہرے پتوں کی بو ان کی ناک میں داخل ہو رہی تھی۔

برآمدے میں سے خالہ کی تیز آواز گونجی جو عذرا کو بلا رہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ بارش دفعتاً تیز ہوگئی۔ پھر وہ چونک کر اٹھی اور نعیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے نیچے کی طرف دھکیلنے لگی۔

''یہیں بیٹھتے ہیں۔'' نعیم نے بھاری آواز سے کہا۔

''چلو...... '' وہ خفت اور برہمی سے دانت پیس کر چیخی۔ وہ دونوں بڑے بڑے سیاہ چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے نیچے اتر آئے۔

نعیم کو دیکھ کر خالہ کے ماتھے پر ہلکی سی شکن آئی۔ لیکن اس نے نرمی سے کہا: ''پانی پڑ رہا ہے بی بی۔ آپ کیوں بھیگتی رہیں؟''

پرویز کے کمرے میں ہڑبونگ مچی تھی۔ سب وہاں جمع تھے اور اپنے اپنے کھیلوں اور باتوں میں لگے تھے۔ صرف صاحب زادہ وحید الدین برآمدے میں کھڑے اپنے دلکش، فاتحانہ انداز میں انگریز لڑکی سے باتیں کر رہے تھے۔ برآمدے پر جھکی ہوئی بیل پر سے پانی ٹپک رہا تھا۔

(۴)

سویرا ہونے والا تھا اور ستارے تیزی سے جھلملا رہے تھے۔ نعیم نے مسہری کا پردہ اٹھایا اور باہر نکل آیا، منڈیر پر جھک کر نیچے تھوکا اور اکتاہٹ سے اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ اس کے منہ میں صبح کی مخصوص بو اور پھیکا پن تھا۔ رات وہ بڑی دیر میں روشن محل سے لوٹا تھا۔

اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملیں اور ساتھ والی مسہری میں اپنے چچا کو ہلتے ہوئے دیکھا۔ رات کس قدر گرم تھی۔ اس نے سوچا۔ لیکن اب اس کا ذہن صاف اور تر و تازہ تھا اور وہ بڑی وضاحت اور کاہلی کے ساتھ سوچ سکتا تھا۔ کلکتہ، سینٹ زیویئرز، دلّی، روشن محل، عذرا، روشن آغا، اینی بیسنٹ، گوکھلے، عذرا، پرویز، عذرا، جمیلہ، عذرا، عذرا، عذرا، ہونٹ گرمی، مچھر، ہونٹ، بارش، ہونٹ۔ وہ منڈیر پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا، حتیٰ کہ دن کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا۔ پھر ایاز بیگ نے آہستہ سے اسے کندھے پر چھوا اور پیچھے آنے کا اشارہ کر کے سیڑھیاں اتر گئے۔

ناشتہ ختم کر کے انہوں نے سگار سلگایا۔ نعیم چائے کی دوسری پیالی بنا رہا تھا۔

''تم ایک ہفتے سے روشن محل جا رہے ہو۔''

نعیم نے ان کے چوڑے، سپاٹ چہرے کو دیکھا جہاں کوئی تاثر نہ تھا۔ 'ہاں' اس نے کہا۔

''میں نہیں گیا۔''

''اچھا''

''کیوں؟''

نعیم خاموش رہا۔

''کیونکہ روشن پور میں ہمارا خاندان ذلیل ہو چکا ہے۔''

کافی دیر کے بعد نعیم نے کہا: ''میں روشن آغا سے تو نہیں ملا۔''

''مجھے علم ہے۔ عذرا۔ ایں؟ جانتے ہو اس کی ماں بری عورت ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ زرد پڑ گئے۔ پھر بڑی کوشش سے انہوں نے اپنی آواز کو قابو میں کر کے کہا: ''اور اس کی بہن بھی۔ ان دونوں کے باپ کا کسی کو علم نہیں۔ لیکن ان کی ماں بڑی ہوشیار عورت تھی۔ اس نے انہیں بڑی اچھی تربیت دلائی اور اونچے گھرانوں میں بیاہا۔'' وہ اُٹھے اور کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ دھوپ ان کے زرد اور بے تاب چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ''ہم باعزت لوگ تھے۔ اب کچھ بھی نہیں ہیں۔ تمہارا باپ میرا بڑا بھائی ہے۔''

پھر کھڑکی میں سگار کو مسل کر وہ نعیم کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ ''تمہیں اب پتہ چل جانا چاہیے۔ اب تم بچے نہیں ہو۔ گاؤں میں ہمارا واحد گھر ایسا تھا جو روشن پور کی جاگیر کا مزارع نہیں تھا۔ ہمارا باپ جاگیردار کے گھر جا کر کرسی پر بیٹھتا تھا' ایسا ہم نے سنا ہے۔ وہ دلیر اور محنتی شخص تھا۔ لیکن تمہارا باپ۔ اوہ......'' انہوں نے دونوں ہاتھ میز پر پھیلائے جو مضبوط اور زرد تھے اور تمباکو سے رنگی ہوئی موٹی انگلیوں میں کپکپاہٹ تھی۔ ''وہ بھی دلیر آدمی تھا۔ لیکن ضدی تھا۔ اس کو اسلحہ بنانے کا خبط تھا۔ وہ عجیب وغریب دماغ کا مالک تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کاریگری سے ولایت والے بھی بندوقوں کی نالیاں نہیں بناتے ہوں گے جیسی وہ بناتا تھا۔ وہ انہیں بچوں کی طرح سنبھال کر رکھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے اور وہ دن بھی جب پولیس آئی۔ سارے گاؤں کے لوگ گھروں میں چھپ گئے اور کواڑ بند کر لئے گئے۔ گلیاں سنسان ہو گئیں اور مویشی اکیلے اکیلے گلیوں اور کھیتوں میں پھرنے لگے۔ انہوں نے ہمارے گھر کی تلاشی لی اور اسلحہ برآمد کر لیا۔ جب وہ اسے اکٹھا کر رہے تھے تو مجھے یاد ہے نیاز بیگ ان کی منتیں کرنے لگا۔ لیکن ایک سپاہی نے اس کی داڑھی پکڑ کر منہ پر طمانچے مارے اور وہ گھسیٹتے ہوئے اسے ساتھ لے گئے۔'' ان کے ہاتھ اب مردہ پرندوں کی طرح میز پر رکھے تھے اور وہ اپنی چکنی اور اداس آنکھیں آہستگی سے جھپک رہے تھے۔ ''چند دن بعد تمہارا باپ واپس آ گیا۔ اس کے گالوں کی ہڈیاں سیاہ ہو گئی تھیں اور داڑھی کے آدھے بال جھڑ چکے تھے۔ لیکن اس کا سوداء اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس سے اس کی ہنرمندی کا فخر نہ لے سکے۔ کوئی بھی نہ لے سکا۔ روشن آغا نے دلّی بلا کر اس سے کہا: ''نیاز بیگ تم سارے گاؤں پر تباہی لاؤ گے' مگر نیاز بیگ بھوسے والے کمرے میں دروازہ بند کر کے اپنے کام میں مشغول رہا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا ہنر تھا۔ اس نے دس دس گولیوں والی ایسی ایسی پستولیں بنائیں جو گاؤں میں کسی نے نہ دیکھی تھیں۔

''اب کی دفعہ پوری گارد آئی۔ انہوں نے سب کچھ قبضے میں کر لیا۔ بھوسے والے کمرے کو انہوں نے آگ لگا دی اور سارے کواڑ توڑ کر میدان میں ڈھیر لگا دیا۔ پھر اس پر انہوں نے تمہارے باپ کے اور اس کی بیویوں کے اور میرے تمام نئے خوبصورت کپڑے پھینکے اور آگ لگا دی۔ گورے سارجنٹ نے پستول نکال کر آگ

میں فائر کیا اور چیخ کر بولا '' تمہاری ماؤں کے سر مونڈ کر اس میں جلاؤں گا ' اگلی دفعہ۔ '' پھر پستول لہراتا ہوا ہماری دکان پر گیا۔ گلیوں میں ہُو کا عالم تھا۔ گاؤں کی سب سے بڑی دکان ہماری تھی اور نیاز بیگ بڑا ماہرانہ کام کرنے والا تھا۔ اس نے کسانوں کی ضرورت کی تمام چیزوں کے علاوہ تاروں اور سلاخوں سے سمندری جہازوں کے ماڈل بھی بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ سارجنٹ نے تالے میں گولی ماری اور دروازہ توڑ کر بازار میں ڈالنے کا حکم دیا۔ پھر اس پر انہوں نے دکان کے سارے اوزار اور بیلوں کے نعل اور ہل اور کنوؤں کی چکلیاں اور جہازوں کے ماڈل ڈھیر کئے اور آگ میں لوہے کی چیزیں مکھن کی طرح پگھلنے لگیں۔ اس نے آگ میں یکے بعد دیگرے تین فائر کئے اور جانوروں کی طرح چیخ مار کر بولا: ''ایک تمہاری بندوقوں کے واسطے ہے۔ اور یہ سارے گاؤں کے واسطے ہے۔ اور یہ تمہاری بیویوں اور بیٹیوں کے واسطے ہے جو بیوہ ہو جائیں گی ' اگر تم باز نہ آئے۔ '' نیاز بیگ ' جس کی ہتھکڑیوں کی زنجیر اس کے گھوڑے کی زین سے بندھی تھی ' کہتا رہا: ''میری بندوقوں سے ایک بھی گولی کبھی نہیں چلی۔ یہ میری نمائش کی چیزیں ہیں۔ لیکن اس نے وحشیوں کی طرح گھوڑے کی پسلیوں میں ایڑیاں مارنا شروع کیں اور میں نے گنے کے کھیت میں بیٹھے بیٹھے دیکھا کہ نیاز بیگ گھوڑے کے پیچھے بھاگتا بھاگتا ' اوہ...... ''

وہ خشک ' وزنی آواز نعیم کے دل پر پتھر کی طرح بیٹھتی جا رہی تھی۔ دوبارہ بولنے سے پہلے ایاز بیگ نے جھک کر فرش پر تھوکا۔ لعاب سگار کے تمباکو کی وجہ سے سیاہی مائل تھا۔ ''بارہ سال ہو گئے میں اس سے نہیں ملا۔ میں نے اپنی محنت سے اتنی ترقی کی۔ اگر سرکار کو آج بھی کوئی خبر کر دے کہ میں اس سے ملتا ہوں تو مجھ پہ سارے دروازے بند ہو جائیں۔ اس نے خاندان کو تباہ کر دیا۔ ''

''تمہارے ماں باپ اب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ گاؤں آ چکا ہے۔ مگر تمہیں جلد واپس آ جانا چاہیے۔ میں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ میں پڑھ سکتا ہی نہ تھا۔ لیکن ہمارے خون میں ہنر ہے اور تمہیں میں نے تعلیم دلوائی ہے۔ تم دنیا میں ترقی کر سکتے ہو۔ ''

وہ اُٹھے ' کونے میں جا کر تھوکا اور ٹھگنے بوڑھے جانور کی طرح دھیمی متوازن رفتار سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

نعیم شام تک سوتا رہا۔ تین دفعہ اس کی آنکھ کھلی لیکن نیند کے غلبے کی وجہ سے پھر سو گیا۔ ایاز بیگ نے کئی بار دروازے میں آ کر دیکھا اور خاموش پلٹ گئے۔ جب کمرے میں اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ اندر داخل ہوئے ' لیمپ جلایا اور نعیم کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''باہر چلو گے؟''

وہ آنکھیں بند کئے چارپائی پر بیٹھا رہا۔ پسینے سے تکیہ گیلا ہو گیا تھا اور قمیض اس کی پشت پر چپکی ہوئی تھی۔

''نہیں ......'' اس نے بھاری آواز سے کہا۔

لیمپ کی بتی اونچی کر کے ایاز بیگ باہر نکل گئے۔ کمرے میں اس نے گیلی قمیض اتاری ' چہرے اور گردن

کا پسینہ پونچھا' اور اسے دور کونے میں پھینک دیا۔ پھر وہ چارپائی پر بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا۔ اس حالت میں اس نے بہت سے ملے جلے' مختصر خواب دیکھے۔ جب اس کا سر نیند میں دیوار سے جا ٹکرایا تو وہ جھنجھلا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک کمرے کے وسط میں باہیں لٹکائے کھڑا دیوار پر اپنے سائے کو دیکھتا رہا' پھر پتلون ٹانگوں پر چڑھائی' نئی قمیض پہنی اور بھاگتا ہوا باہر نکل آیا۔

''شاید گرمی کی وجہ سے ہے۔'' کھلی ہوا میں آ کر اس نے سوچا۔ لیکن غصہ سست رفتار بادل کی طرح اس کے دماغ پر منڈلا رہا تھا۔

دور سے اس نے عذرا کو دیکھا۔ وہ فوارے کے پاس کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس وقت اس نے ٹھٹک کر سوچا کہ وہ سلیپر پہنے پہنے چلا آیا ہے۔ سبزے پر آہستہ آہستہ چلتا وہ عذرا کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''میں آج شام کو نہیں آ سکا۔'' جمائی روکتے ہوئے وہ میز کے کونے پر بیٹھ گیا۔

''کیوں؟''

''سویا رہا۔''

''کیوں؟''

''گرمی کی وجہ سے۔''

''کیوں؟''

''کیوں......'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بجلی کی روشنی' سرسبز گھاس اور عذرا کی موجودگی سے اس کا مزاج کھل گیا۔ ''تم انتظار کرتی رہیں۔''

''ہم سب انتظار کرتے رہے۔''

''کون کون؟''

''پرویز...... جمیلہ......''

''تم نے بھی کیا؟''

جواب دینے کی بجائے عذرا نے ہاتھ بڑھا کر پانی کی پھوار کو محسوس کیا۔

''تم نے نہیں کیا؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''کیوں؟''

''کیوں؟'' وہ خفگی سے چلایا۔ وہ دونوں ہنس پڑے اور ندامت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یہ دھیمی' خطاوار ہنسی تھی جو ان کے لبوں پر تھی اور جس نے دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی سے بے حد آگاہ کر رکھا تھا۔

''تم نے آج منہ نہیں دھویا۔ فوارے پر دھو لو۔'' عذرا نے کہا۔

نعیم نے پھوار میں ہاتھ گیلا کر کے چہرے پر پھیرا۔ بھیگی پلکوں کو تیز تیز جھپکتے ہوئے بچوں کی سی ہنسی اس

کے سارے چہرے پر پھیل گئی۔ ایک لمحے کا چور' جو آنکھوں میں ظاہر ہوا تھا' غائب ہو گیا۔

سلیپر اتار کر وہ سبزے پر بیٹھ گیا۔ ''گھاس خنک ہے۔'' اس نے کہا۔

شام کی گرم ہوا اس کے رخ تیز ہو گئی اور فوارے کے مہین قطرے اس کے جسم کو بھگونے لگے۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اس کا ذہن پہاڑی جھیل کی طرح شفاف تھا۔ اس نے پھوار کو گرتے' ہوا کو تیزی سے چلتے' سبزے کو ہاتھوں کے نیچے سے اٹھتے اور پانی کو زمین میں جذب ہوتے ہوئے واضح طور پر دیکھا اور محسوس کیا۔

''یہاں آ جاؤ'' آنکھیں کھول کر اس نے بھاری آواز سے کہا۔

عذرا ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے اداس نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ ننھے قطرے اس کے گندمی گالوں پر گر رہے تھے۔ نعیم کو محسوس ہوا کہ اس کا گلا سوج گیا ہے۔ اس نے بے تابی سے گلے پر ہاتھ پھیرا۔

''آؤ......'' اس کی آواز بھاری' خشک اور غیر مانوس تھی۔

عذرا قلم سے ناخن پر لکیریں کھینچنے لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔

''میں نے آج تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔''

''ہم سب خواب دیکھتے ہیں۔'' وہ ایک کے بعد ایک سارے ناخن کالے کر رہی تھی۔

نعیم ننھے قطروں کو دیکھتا رہا جو اس کے گال' ٹھوڑی' ناک' ماتھے اور ہونٹوں پر چمک رہے تھے' گویا ہزاروں قمقمے اس کے چہرے پر جل رہے ہوں۔ اس نے سوچا وہ بندرگاہ پر کھڑا ہے اور جہازوں کی ان گنت روشنیاں پانی میں جھلملا رہی ہیں۔ اس نے بولنا چاہا لیکن اس کا حلق پھر سوج گیا۔ پھر اس کی دو انگلیاں عذرا کے گال پر پھسلیں۔ کئی ننھے ننھے قطرے ٹوٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ ملے اور ایک بڑا قطرہ اس کی ٹھوڑی پر جا کر لٹک گیا۔ وہ مڑ کر ہنسنے لگا۔

''تم نے کوئی بندرگاہ دیکھی ہے؟''

''نہیں۔''

''جہازوں کی روشنیاں سمندر میں اسی طرح تیرتی ہیں۔''

عذرا منہ پھیرے اندھیرے میں دیکھتی رہی۔

''میرا جی چاہتا ہے سمندری فوج میں چلا جاؤں۔''

''اچھا؟''

''ہاں۔ یہ ایسا شاندار ہوتا ہے۔ جہاز ایک شہر کی طرح ہوتا ہے جس میں گھر بنے ہوتے ہیں اور دکانیں' کھانے کے ہال کمرے' کھیل کے میدان اور روشنیاں' جو رات کے وقت پانی میں جھلملاتی ہیں۔''

''اچھا؟'' اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ''میں نے یہ سب سن رکھا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے سمندر کا سفر کروں۔''

''جب میں نیوی میں جاؤں گا تو تم بھی ساتھ چلنا۔''

''اچ چ چ چھا......'' وہ میز پر جھک گئی۔

''چلو گی؟''

وہ خاموشی سے ناخن کھرچتی رہی۔

''چلو گی عذرا؟''

''کیا تم جا سکتے ہو؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

''میں کوشش کروں گا۔''

اسی وقت روشن آغا برآمدے میں ظاہر ہوئے اور باغ کی طرف دیکھے بغیر دوسرے بازو کی طرف چلے گئے۔

''آج روشن آغا ناراض ہیں۔'' عذرا نے کہا۔

''کیوں؟''

''پرویز کے بیاہ کی بات ہو رہی تھی۔''

''پھر؟''

''سب کا خیال ہے کہ اسے جمیلہ سے شادی کر لینی چاہیے۔ وہ نہیں کرتا۔''

''کیوں نہیں کرتا؟''

''وہ اس بات کا جواب نہیں دیتا۔''

رات پڑنے پر سرس کے درخت کے پتے بند ہو کر لٹک گئے تھے۔ سڑک پر ایک بیل گاڑی روں روں کرتی گزر رہی تھی اور بیلوں کو چلاتے ہوئے دو جاٹ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ سبزے پر چلتی ہوئی ہوا گرم اور خوش گوار تھی۔ نعیم نے میز پر انگلیاں پھیلائیں۔

''کیا یہ ممکن ہے' عذرا...... میں نے پوچھا تھا' کیا یہ ممکن ہے؟''

اس نے رک رک کر روز کی معمولی' غیر جذباتی آواز میں کہا۔

''روشن پور کب جاؤ گے؟''

''تم نے پہلے بھی پوچھا تھا۔ کیوں پوچھتی ہو؟''

''تم اپنے والدین سے ملنے جاؤ گے۔''

نعیم کا رنگ سفید ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ بہت سی طاقت اس کے گھٹنوں میں سے گزر کر نیچے زمین میں جا رہی ہے۔ وہ آہستہ سے گھاس پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

''لیکن خالہ نے مجھے بتایا تھا کہ تم سرکاری نوکری میں نہیں جا سکتے۔'' عذرا نے کہا اور نعیم کی انگلیوں کو دیکھنے لگی' جو سبزے پر بہت سفید لگ رہی تھیں۔ وہ دو زانو بیٹھا ہوا سفید پتھر کے مجسمے کی طرح خوبصورت اور نازک نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ اٹھی اور بات کئے بغیر برآمدے کی طرف چلی گئی۔

جب نعیم پھاٹک سے نکل رہا تھا تو چوکیدار نے بڑھ کر کوئی بات کی جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بند مٹھی کی طرح کوئی وزنی' بدمزہ سی شے اس کے معدے میں پڑی تھی۔ سڑک پر چند قدم چلنے کے بعد دفعتاً دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا غصہ اس کے سر میں چڑھا۔ اس نے چھلانگ لگا کر نالی پار کی اور باڑ میں سے منہ نکال کر چیخا: ''لیکن تمہاری ماں...... وہ بری عورت ہے اور خالہ بھی۔''

چوکیدار نے قریب آ کر پھر کوئی بات کی۔

''جاؤ......'' وہ آنکھیں نکال کر دھاڑا اور سڑک پر بھاگنے لگا۔

(۵)

چند روز کے بعد نعیم روشن پور کے لئے روانہ ہوا۔ ریل کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ سوائے ایک ناگوار واقعے کے جو رانی کوٹ سے ایک سٹیشن ادھر پیش آیا۔

علی پور سے گاڑی چلی تو وہ جس سے گھبرا کر ڈبے کے دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ پلیٹ فارم پر بھاگتا ہوا ایک بوڑھا آدمی گاڑی پکڑنے کے لئے بدحواسی میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کے کندھے پر لاٹھی میں اڑسی ہوئی گٹھڑی جھول رہی تھی اور اس کا چہرہ لو میں کام کرتے رہنے کی وجہ سے جھلسا ہوا تھا' جیسے عام کسانوں کا ہوتا ہے۔ نعیم نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر گاڑی تیز ہوگئی۔ آخر ''مر جائے گا۔ کٹ جائے گا'' کے شور میں اس نے لپک کر ساتھ والے درجہ اول کا ہینڈل پکڑا اور کسانوں کی طرح ٹانگیں پھیلا کر چھلانگ لگائی۔

جب وہ جم کر پائیدان پر کھڑا ہوگیا تو شرمندگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کئی خشمگیں چہرے گردنیں بڑھا بڑھا کر اسے گھور رہے تھے۔

''اگر مر جاتا تو؟'' نعیم نے غصے سے چلا کر کہا۔

بڈھے کا بے دانت کا منہ اچانک سادہ' شرمیلی ہنسی میں پھیل گیا۔ ''میری بیوی گاڑی میں ہے۔''

''بے وقوف!''

جواب دینے کی بجائے اس نے لاٹھی سے دروازہ کھٹکھٹایا اور گٹھڑی کی گانٹھ کسنے لگا۔ دروازہ کھلا اور ایک سفید فام چہرہ اور ننگا بدن ظاہر ہوا۔ گورے کی آنکھیں نیند سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ڈبے میں خنک اندھیرا تھا۔

''کیا مانگتا...... کیوں آیا؟'' گورا آنکھیں نکال کر چیخا۔

جواب میں کسان اسی طرح سادگی سے ہنسا۔ ''میں نیچے بیٹھ جاتا ہوں۔ اگلے سٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ میری بیوی گاڑی میں ہے۔'' اس نے کہا اور اطمینان سے دروازے میں بیٹھ کر گٹھڑی کسنے لگا۔

''نیچے جاؤ مانگتا...... آں؟ سنتا؟'' پاؤں سے وہ اسے نیچے دھکیلنے لگا۔

''گاڑی بھاگ ری اے صاب۔ کہاں جاؤں؟''

''آں؟ نائیں جاؤ؟ آں؟'' اس نے پیر کی ٹھوکر سے کسان کی گٹھڑی باہر اچھال دی جو اڑتی ہوئی زمین پر گری اور لوگوں نے اس میں سے باجرہ اور گڑ بکھرتے ہوئے دیکھا۔ 'جاؤ'۔

''ہا...... میرا باجرہ۔'' بڈھے کا منہ کھل گیا۔ پھر دفعتاً غصے سے بھنا کر وہ اُٹھا اور لاٹھی گورے کی ٹانگوں پر مارنے لگا۔ ''مجھے مار دو۔ پھینک دو باجرہ...... میرا گڑ' میں تمہارے باپ سے بھی لوں گا۔ گورے سؤر...... اب میں اپنی لڑکی کے لئے کیا لے کر جاؤں؟ ہیں؟'' چیخنے سے رال اس کی داڑھی پر بہنے لگی۔ انگریز نے اس کی لاٹھی چھین کر نیچے پھینک دی اور بڑے بڑے بوٹوں والے پاؤں اندھا دھند اس کے چہرے اور چھاتی پر مارنے لگا۔

''اپنی لڑکی کے لئے ایک سؤر لے جاؤ۔'' اس نے انگریزی میں کہا۔ پھر وہ گالیاں بکنے اور بے تحاشا ٹانگیں چلانے لگا۔ اس کا ایک بوٹ ایڑی تک اکھڑ گیا۔ کسان کا سر لٹک گیا اور آنکھیں بند ہوگئیں۔ لیکن اس کا بازو ابھی تک ہینڈل کے گرد کسا ہوا تھا۔ لُو سے جھلسے ہوئے چہرے پر خون کی دھاریاں بہہ رہی تھیں اور اس کی داڑھی خون' پسینے اور رال سے لتھڑ گئی تھی۔

جب رانی کوٹ کے سٹیشن پر دو گورے سارجنٹوں نے آ کر اسے ہینڈل سے علیحدہ کیا تو وہ گندم کی بوری کی طرح زمین پر گرا اور مر گیا۔ سارجنٹوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گورے کا چہرہ کھڑکی سے باہر آیا۔ پولیس والوں کے جواب میں اس نے کچھ کہا جس پر دونوں سارجنٹوں نے مستعدی سے فوجی سلام کیا اور بولے: ''لیکن آپ زیر حراست ہیں۔''

''باہ......'' گورے نے گال پھلا کر کہا اور کھڑکی گرا دی۔ سارجنٹ دونوں ہینڈل پکڑ کر پائیدان پر کھڑے ہوگئے۔

''وہ گرفتار کرلیا گیا ہے۔ پر بوڑھا مر گیا۔'' مجمعے میں سے کسی نے بات کی۔

''تو کیا ہوا؟'' سنہری چشمے اور بڑے سے ماتھے والے ایک آدمی نے کہا۔

''وہ عدالت میں تو پیش ہوگا۔'' نعیم نے خفگی سے کہا۔

''ضرور ہوگا۔ ضرور ہوگا۔'' وہی آدمی بولا۔ ''یہ لوگ بڑے قانون دان ہوتے ہیں۔ لیکن جیوری میں کون ہوگا؟ ...... تمہارا کوئی چچا جیوری میں ہے؟'' وہ جانے کے لئے مڑا' پھر پلٹ کر نعیم کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''یہ سؤر' میں تمہیں بتاتا ہوں برخوردار' آج ہی رات کو اپنی بیوی کے ساتھ جا کر سوئے گا۔ میں نے اپنی عمر میں ایسے پچاس سے اوپر واقعات دیکھے ہیں۔ ایسے مقدموں کے لئے سفید جیوری ہوتی ہے۔ بالکل سفید۔''

نعیم اس کے لہجے کی تیزی سے گھبرا گیا۔ جب وہ پلیٹ فارم کے باہر جا رہا تھا تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک بھدی سی بوڑھی کسان عورت لاش کے ساتھ لپٹ کر رو رہی تھی۔

چودہ کوس کا سفر نعیم نے ایک مریل سی سیاہ گھوڑی پر طے کیا۔ گاؤں کا ایک کمین، جو اسے لینے آیا تھا، ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پگڈنڈیوں کے دو رویہ جھڑبیریاں اور خودرو جھاڑیاں کثرت سے اگی ہوئی تھیں۔ اس کا راہبر مستقل باتیں کر رہا تھا!

''اس سال چوہدری نیاز بیگ نے خود غلہ کاشت کیا۔ بڑی بھاری فصل ہوئی۔ تین من تو مجھ کو دیئے اور یہ گھوڑی خریدی۔ بڑا اول نسل کا جانور ہے۔'' اس نے گھوڑی کی پیٹھ پر ہاتھ مارا جو ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ''مگر یہ جاٹ نگر کے جولاہوں کے پاس تھی۔ انہوں نے اس کا ناس مار دیا۔ کمبخت کمین۔ جانور پر ظلم کرنا اپنی جان پر ظلم کرنا ہے بھائی۔ چوہدری نیاز بیگ کے بعد تو زمین ویران ہوگئی تھی۔ ہت تمہارے کی، کم ذات کتو۔ ہم تمہارے گاؤں میں نہیں ٹھہرتے، فکر نہ کرو۔ اب دفع ہو جاؤ۔ اب کی بار پانی کی تنگی رہی، چاول کی کاشت نہیں ہو سکی مگر......''

شام پڑ رہی تھی جب دھند لکے میں انہیں روشن پور کے پیڑ دکھائی دیئے۔ ''کتوں کی پروا نہ کرو۔ ان کی بھونکنے کی پرانی عادت ہے۔ ہمیں پہچان کر خاموش ہو جائیں گے۔ نیاز بیگ آ گیا......''

نیاز بیگ ایک بڑے سے کیکر کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی اٹھا اور باہیں پھیلا کر دوڑتا ہوا آیا۔ پتلی چھڑی، جو پکڑے ہوئے تھا، پرے پھینکی اور نعیم سے لپٹ گیا۔ پہلے اس نے اپنے بیٹے کو چھاتی پر چوما، پھر چہرہ کھینچ کر قریب لایا اور منہ ہی منہ میں ناقابل فہم الفاظ بڑبڑاتا ہوا اس کے ماتھے، گال اور کانوں کو چومنے لگا۔ لپٹنے اور چومنے کے دوران وہ حلق سے خوشی کی عجیب وغریب آوازیں نکالتا جا رہا تھا۔ نعیم نے محسوس کیا کہ اس کی داڑھی سخت کھردری تھی اور جسم سے پسینے اور سبز چارے کی بو آ رہی تھی۔

پھر نعیم سے جدا ہو کر وہ اس کے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا: ''اتنی دیر لگائی؟ پیدل چلاتا لایا؟ یا باتیں کرتا رہا ہوگا۔ باتونی میراسی۔ میں تم کمین لوگوں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔'' اس نے ہوا میں انگلی نچا کر کہا اور گھوڑی کی باگ پکڑ کر چلنے لگا۔ میراسی اس کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش میں بحث کر رہا تھا۔ لیکن اس نے کچھ نہ سنتے ہوئے نعیم کی کمر میں ٹہوکا دیا۔ ''دیکھا کیسے باتیں کر رہا ہے؟ میں خوب سمجھتا ہوں۔ کمین کی ذات کو خوب سمجھتا ہوں۔ تمہارا دل کالا اور زبان روشن ہوتی ہے۔ اب تم فصل پر آنا۔ تمہیں چونٹی کا فضلہ دوں گا۔ پورا تین من۔'' اس نے ہوا میں مکّہ چلایا اور مصنوعی غصے سے اُچھل اُچھل کر چلنے لگا۔

گھر کے باہر دو عورتیں کھڑی اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ نیاز بیگ لال پیلا ہو کر ان سے مخاطب ہوا: ''دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا اس باتونی میراسی کو مت بھیجو۔ جا دفع ہو جا۔''

پھر وہ اچھل کر گھوڑی پر سوار ہوگیا اور عورتوں کے گرد ایک چکر کاٹا، پھر کود کر اُترا اور چھڑی سے بے تحاشا اسے پیٹنے لگا۔ ''جولاہوں کمینوں نے تجھے کچھ نہیں کھلایا۔ ہیں؟ مکڑے کی طرح چلتی ہے...... کمینی......'' گھوڑی ٹانگیں پھیلائے خاموش کھڑی رہی۔

بوڑھی عورت روتی ہوئی نعیم سے لپٹ گئی اور اسے سارے جسم پر چومنے لگی۔ اس کے بالوں سے گھی کی بو

آ رہی تھی۔ ''میرے بچے...... میرا بچہ۔'' وہ کہے جا رہی تھی۔ دوسری نسبتاً جوان عورت پاس کھڑی ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی اور روتی ہوئی کچھ بڑبڑاتی جا رہی تھی جو نعیم کے لئے ناقابل فہم تھا۔ دو کتے ان کے پاس آ کر لڑنے لگے۔ نیاز بیگ گھوڑی کو چھوڑ کر گالیاں دیتا ہوا بھاگا اور دور تک ان کے پیچھے دوڑتا ہوا چلا گیا۔ آس پاس کے گھروں سے مرد اور عورتیں دیئے اور لالٹینیں لے کر نکل آئے۔ نیاز بیگ نے اسے اندر کی طرف کھینچا۔

''انہیں چھوڑو۔ یہ بے وقوف عورتیں ہیں۔ تمہارا باپ مر گیا جو رو رہی ہو؟''

گلی کی نکڑ پر سے ایک نوجوان سکھ لڑکے نے پکار کر پوچھا: ''چچا تیرا بیٹا آ گیا؟''

''ہاں' ہاں آ گیا۔'' اس نے جلدی سے نعیم کو بے کواڑ کے دروازے میں سے اندر کھینچا۔ ''یہ غیر تعلیم یافتہ آوارہ لونڈے ہیں۔ تمہیں ان سے دوستی رکھنے کی ضرورت نہیں۔''

مویشیوں کے احاطے میں دو بھینسیں بیٹھی جگالی کر رہی تھیں' دو بیل چارہ کھا رہے تھے۔

''یہ میں نے اس سال تیسرے مہینے میں خریدا تھا۔'' نیاز بیگ نے اپنے خشک' مضبوط ہاتھ سے بیل کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ ''چار من غلے میں آیا۔ پچھلی منڈی میں اسے کاغذ ملا تھا۔ بہترین نسل کا جانور ہے۔ کیوں چوہدری؟''

''ہاں چوہدری۔'' میراسی نے جواب دیا۔ ''بیس بیس کوس میں اس کا جواب نہیں۔ جاٹ نگر کے چوہدریوں کا بیل بھی مر کے ایک کھیت تیار کرتا ہے۔ اس ہیرے نے سورج سر پر آنے سے پہلے پہلے ڈیڑھ کھیت تیار کیا ہے۔ میرے سامنے کی بات ہے چوہدری۔''

''سچ ہے۔ بالکل سچ۔'' نیاز بیگ نے فخر سے کہا۔ پھر وہ عورتوں کو مخاطب کر کے بولا: ''ہُو ہُو بند کرو بے وقوف عورتو' تم نے چاول نہیں نکالے۔ آؤ چوہدری بیٹھو۔ چاول کھاؤ......''

اس نے دوستانہ انداز میں میراسی کا کندھا تھپکا۔

جب وہ کھانے پر بیٹھے تو اس کی ماں بھاگ کر سٹول لے آئی اور اصرار کر کے نعیم کو اس پر بٹھلایا۔

''بیٹھو بیٹھو۔ یہ سٹول میں نے خود بنایا ہے۔'' اس کے باپ نے کہا۔

ایک بڑے سے تھال میں سفید ابلے ہوئے چاول نکال کر بڈھی نے ان پر سرخ شکر چھڑکی اور گرم گرم مکھن انڈیلا جو شکر اور چاولوں میں جذب ہو گیا۔ پھر احتیاط سے اٹھا کر اسے کمرے کے وسط میں لا رکھا۔ گھر کے تینوں مرد اس کے گرد بیٹھ گئے اور اپنے اپنے آگے سے کھانے لگے۔ سٹول پر بیٹھے بیٹھے نعیم نے جھک کر دو چار نوالے لئے' پھر جھلا کر اسے پیچھے لڑھکا دیا۔

''یہ فضول ہے۔''

اسے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اس نے آدھا تھال خالی کر دیا۔ حتیٰ کہ اس کی خالی کی ہوئی جگہ بڑھتی بڑھتی اس کے باپ اور چھوٹے لڑکے کے آگے کی خالی جگہوں کی حدود سے جا ملی۔ نعیم نے ہاتھ کھینچ

لیا۔ اس کی ماں نے بڑی احتیاط سے کُرتے کے دامن میں پکڑ کر اس کا ہاتھ صاف کیا۔ پھر اس نے چھوٹے لڑکے کی گردن میں پنکھے کی ڈنڈی چھبوئی۔

''کم کھا۔ پھر تیرا پیندا دو دو گھڑی پر کھلنے لگے گا۔'' لڑکا خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''یہ کون ہے؟''

''یہ بڑھیا کا بھتیجا ہے۔ اس کے ماں باپ بڑے بیٹھے میں مر گئے۔''

''یہ تمہارے ماموں کا لڑکا ہے۔'' بڑھیا نے بتایا۔ ''اس کی بیوی کم ذات نے اس پر جادو کر دیا تھا۔''

''جھوٹ مت بول۔ بے وقوف۔ وہ بیس گاؤں میں سب سے خوبصورت عورت تھی۔'' نیاز بیگ نے ہاتھ روک کر کچھ سوچا' پھر خیال ہی خیال میں مسکرایا اور تھال پر جھک گیا۔ اس کی بیوی نے سارے چاول اس کے آگے سمیٹے' پھر مکھن والا برتن اوندھا کر کے انگلی سے پونچھ کر آخری قطرہ تک ان پر ٹپکایا اور تھال اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ لالچیوں کی طرح چاولوں پر پل پڑا۔

دیوار پر لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی اپلوں کے دھوئیں میں اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔ نیاز بیگ کی آنکھوں کے حلقے آدھے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں سیاہ تھیں۔ گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے اور جبڑے کی ہڈی مضبوط اور ننگی تھی۔ وہ ایک فاقہ زدہ بوڑھے بیل کی طرح چہرے کی تمام ہڈیوں اور پٹھوں کی نمائش کرتا ہوا کھا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا خلا تھا اور چہرہ کبھی گئے گزرے ہوئے وقتوں میں خوبصورت رہا ہوگا۔ نعیم یہ سوچ کر لرز گیا کہ اس کی اپنی شکل اپنے باپ سے کس قدر میل کھاتی ہے۔

''وہ چڑیل تمہیں دکھانے کو رو رہی تھی۔'' بڑھیا نے پنکھا نیاز بیگ کے کندھے میں چھبویا۔

''ہیں؟''

''وہی...... اب رات کو ٹونا کرے گی۔''

''بھونکو مت۔'' وہ یوں چاولوں پر جھک گیا گویا ان پر خفا ہو رہا تھا۔

''وہ کون تھی' جو رو رہی تھی؟'' نعیم نے پوچھا۔

''وہ دوسری عورت ہے۔'' اس کی ماں نے بتایا۔ ''تمہیں اس کے گھر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جادوگرنی ہے۔''

جب چاول تھوڑے سے رہ گئے تو نیاز بیگ نے برتن اپنی بیوی کے آگے سرکایا اور انگلیوں سے داڑھی اور سر کے بال چکنے کئے۔

''آپ کب آئے؟''

نیاز بیگ نے خالی خالی نظروں سے نعیم کو دیکھا۔ ''پار سال چھٹے مہینے۔''

گو رات بے حد گرم تھی اور صحن کی زمین گوبر کے مچھروں سے اَٹی پڑی تھی' پر نعیم بے سدھ ہو کر سویا رہا۔

جب وہ اُٹھا تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور گھر میں کہرام برپا تھا۔ دونوں عورتیں صحن میں اپنے اپنے دروازے پر کھڑی جھگڑ رہی تھیں' بازو بڑھا بڑھا کر اشارے کر رہی تھیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھیں۔

نعیم چارپائی سے اٹھا تو بھینس نے پیشاب کرنا شروع کر دیا' اس سے بچنے کے لئے اچھل کر پرے ہوا تو ٹخنوں تک گوبر میں گھس گیا' وہاں سے اچھلا تو پیشاب کے ایک چھوٹے سے تالاب میں جا گرا جہاں وہ گھٹنوں تک بھیگ گیا۔ دل ہی دل میں کوستا ہوا وہ نلکے کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ چھوٹا لڑکا بھاگتا ہوا نلکا چلانے کے لئے آیا۔

عورتیں چیخ رہی تھیں۔

''پرسوں میں' نے اسے کھلایا اور لے کے آج تو اسے گھس گئی۔ گرم کتیا۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔

''اور پچھلے مہینے کھلا پلا کر میں میکے چلی گئی تھی تو تُو نے گل چھرے نہیں اُڑائے میرے مال پر۔''

''تمہارا یار جو مر گیا تھا' تیرا جانا تو ضروری تھا۔ اور کھا پی کر کیا وہ تیری ماں کے پاس جا کے سوتا۔''

''زبان بند کر چڑیل۔ میرا مال مفت میں نہیں آیا۔ تیرا جوان بیٹا کل آیا ہے۔ آج ہی رات کو۔ آج ہی رات کو تو نے ...... ہیں؟''

''تجھے شرم نہیں آتی کم ذات۔ نو مہینے ہوئے نہیں اسے لوٹے اور لے کے بچہ باہر پھینک دیا۔ استغفراللہ۔''

''بدمعاش ...... تیرے سفید بالوں کا لحاظ ہے ورنہ میں تیرے بیٹے سے ڈرتی نہیں ہوں۔'' چھوٹی عورت نے عمداً سر ننگا کر کے اپنے سیاہ بال بڈھے کی طرف جھٹکے۔

کچھ دیر پہلے نیاز بیگ کھسیانا چہرہ لے کر چھوٹی عورت کے کمرے سے نکلا تھا اور دونوں عورتوں کے درمیان آ کھڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد غصے میں آ کر وہ بھی چیخنے لگا:

''چپ رہو ...... بے وقوفو ...... تم دونوں کو باہر نکال دوں گا۔ دونوں کو مار دوں گا۔ دونوں کو پیٹوں گا۔ دونوں کو ......'' اس کی داڑھی ہوا میں ہل رہی تھی اور دونوں بازو ہوا میں لہراتا ہوا وہ تیزی سے گھوم رہا تھا۔ دور سے دیکھنے والوں کے لئے وہ کسی دیہاتی ناچ کا منظر پیش کر رہا تھا۔

''بھونکنا بند کرو۔ کتیو۔ دونوں کو کتے خرید دوں گا۔ دونوں کو گدھے خرید دوں گا۔ دونوں کو سؤر خرید دوں گا۔ پھر ٹھیک ہے؟'' ناچتے ہوئے اس نے بازو سے دونوں عورتوں کے درمیان کی ہوا کاٹی' مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ دونوں میں سے ایک بھی اس کے قریب نہ آنے پائے۔ یوں بچا بچا کر اس نے دو چار ہاتھ ہوا میں چلائے اور گردن لمبی کر کے دھمکاتا رہا۔ ''زمین میں گاڑ دوں گا۔ زندہ۔ جانتی ہو؟ سؤر خرید دوں گا۔''

مگر جب دونوں عورتیں چمٹے پکڑ کر پھنکارتی ہوئی بڑھیں اور گتھم گتھا ہو گئیں تو وہ شرمندگی سے ہنستا ہوا نعیم کی طرف آیا: ''تم باہر جاؤ۔ یہ سب اجڈ گنوار عورتیں ہیں۔ میں انہیں کچا چبا جاؤں گا۔'' اس نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔

دروازے کے باہر دو کتے چہلیں کر رہے تھے۔ ایک پلی ہوئی بھینس اطمینان سے جگالی کر رہی تھی۔ ایک کوا اس کے سر پر بیٹھا چونچ مار رہا تھا اور دو باتونی چڑیاں اس کے گوبر کو کرید رہی تھیں۔ رات والا سکھ لڑکا چھینٹ کی بنیان پہنے کتوں کے پاس کاہلی سے کھڑا جمائیاں لے رہا تھا۔ سامنے کھاد کے ڈھیر پر ایک کتیا اپنے متعدد بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ سکھ لڑکے نے لاپروائی سے نعیم کو دیکھا اور جمائیاں لیتا رہا۔

''تم چوہدری نیاز بیگ کے بیٹے ہو؟'' پھر اس نے پرے دیکھتے ہوئے گنواروں کی طرح پوچھا۔

''ہاں۔''

''ہاں۔''

سکھ نے ایک نوعمر کتے کو کان سے پکڑ کر اٹھایا اور گھما کر جوہڑ میں پھینک دیا۔ کتا چیختا ہوا بھینسوں کی پیٹھ پر جا چڑھا جو وہاں نہا رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے جو بھینسوں کی دُمیں پکڑے تیر رہے تھے کتے کی نقل میں چیخنے اور اس پر پانی پھینکنے لگے۔

''آج پھر بڈھیاں لڑ رہی ہیں۔'' سکھ لڑکا سادگی سے ہنسا۔ ''روز لڑتی ہیں۔''

''کیوں؟'' نعیم نے غصے کو دبا کر کہا۔

''تین دن ایک چوہدری کو مکھن کا پیڑا اور مرغا کھلاتی ہے' تین دن دوسری۔ ساتویں دن چوہدری کھیتوں میں جا کر سوتا ہے۔ مگر جب ایک کا کھا کر دوسری کے پاس چلا جاتا ہے تو لڑائی ہو جاتی ہے۔''

نعیم کی گردن پر بال کھڑے ہو گئے۔ سکھ لڑکا پھر خوش دلی سے ہنسا۔

''روز چوہدری کہتا ہے 'مار دوں گا۔ گاڑ دوں گا۔' پر اس نے آج تک ہاتھ نہیں اٹھایا۔''

نعیم انتہائی غصے کی حالت میں اپنے باپ کا حلیہ یاد کر کے ہنس پڑا۔

''لیکن بارہ سال ان کا بڑا سلوک رہا۔ جب چوہدری جیل میں تھا تو دونوں بہنوں کی طرح رہیں اور ایک ہی تھالی سے کھاتی رہیں اور کسی غیر مرد کی ران نہیں دیکھی۔''

نعیم نے دل میں اسے گالی دی۔

''بڈھے کا انہوں نے عورتوں کی طرح انتظار کیا۔'' سکھ پھر بولا۔ ''چھنالوں کی طرح نہیں۔''

کچھ دیر تک آنکھیں سکیڑ کر مشرق کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ ایک طرف چل پڑا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''گندم لادنی ہے۔''

''میں بھی چلوں گا۔'' نعیم نے کہا۔ سکھ لڑکا بے دھیانی سے چلتا رہا۔ جوہڑ کے آخیر پہ جا کر وہ دائیں طرف مڑ گئے۔ سامنے وسیع اور ننگے کھیت تھے۔ بائیں طرف گاؤں کے چھوٹے چھوٹے کچے مکان تھے۔ سورج کافی اٹھ آیا تھا اور گرم چمک دار دھوپ کھیتوں میں پھیل گئی تھی۔ فصل کاٹ لی گئی تھی اور کہیں کہیں سبز گھاس کے قطعے

نمودار ہو رہے تھے۔ باقی جگہ پر بھوسے کی ناڑیں اور خشک، سخت جڑیں بکھری ہوئی تھیں۔ تازہ تازہ کٹائی کے بعد جگہ جگہ کبوتروں اور دوسرے پرندوں کے پرے بیٹھے چگ رہے تھے۔ درخت صرف گاؤں کے اردگرد اور جوہڑ کے کنارے پر تھے۔ زیادہ تر شیشم اور آم کے گھنے پیڑ تھے جن کے سائے میں مویشی بندھے تھے اور چارپائیوں پر اِکا دُکا کسان سو رہے تھے۔ دور مغرب میں گھنے درختوں کی قطار تھی اور کسی کسی کھیت میں پکی ہوئی فصل کھڑی تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے گاؤں سے نکل آئے۔

''کٹائی کی یہ کون سی رت ہے؟''

''ہم نے دیر میں بیائی کی تھی۔ ہماری وہ سامنے کچھ فصل کھڑی بھی ہے۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ٹھاکر مہندر سنگھ۔''

چلتے چلتے وہ گیہوں کے کھیت کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں کی زمین نم اور گھاس سرسبز تھی۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟'' مہندر سنگھ نے پوچھا۔

''دہلی سے۔''

''وہاں رہتے ہو؟''

''نہیں۔ میں کلکتے میں رہتا ہوں۔''

''کلکتہ۔'' مہندر سنگھ رک کر سوچنے لگا۔ پھر اس کے چہرے پر وہی بچوں کی سی ہنسی پھیل گئی۔ ''کلکتہ بنگال میں ہے۔ مجھ کو پتہ ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ ہے؟''

''میرا بھاپا وہاں تھا۔''

''وہاں کیا کرتا تھا؟''

''تمہیں اس سے کیا؟''

عجیب جاہل لوگ ہیں۔ نعیم نے سوچا۔ چوری کرتا ہوگا۔

وہ ایک خشک برساتی نالہ پار کر رہے تھے جس کی ریت تپنا شروع ہوگئی تھی۔

''تم نے میرا نام نہیں پوچھا؟''

''تم چوہدری نیاز بیگ کے لڑکے ہو۔ میں جانتا ہوں۔'' سکھ سامنے دیکھتا ہوا معتبری سے بولا۔ جیسے ہی انہوں نے نالہ پار کیا وہ گندم کے کھیت کے کنارے کھڑے تھے۔ سونے کے رنگ کی فصل تیز دھوپ میں چمک رہی تھی۔ ہوا بالیوں میں سرسرا رہی تھی۔ فصل کی اوٹ میں چند کسانوں کے باتیں کرنے کی کرخت آوازیں آرہی تھیں۔ ایک بڑا سا لکڑی کا کانٹا تھوڑے تھوڑے وقفے پر فصل کے اوپر لہراتا۔ وہ گیہوں الگ کر رہے تھے۔ نعیم نے چن کر

ایک خوبصورت بالی کو توڑا، ہتھیلی میں مسل کر دانے نکالے اور ایک دانہ منہ میں ڈال کر باقی کو پھینک دیا۔

''تمہیں فصل کی قدر نہیں، تم نے ایک سٹہ خراب کر دیا۔ تم شہر سے آئے ہو۔'' مہندر سنگھ نے نفرت سے کہا۔

سامنے سے ایک لڑکی آ رہی تھی۔ وہ لمبے قد کی صحت مند لڑکی تھی اور سر پر چنگیر اور چھاچھ کا منکا اٹھائے لاپروائی سے چل رہی تھی۔ اس نے کترا کر نکلنا چاہا تو مہندر سنگھ رستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پیشانی پر بل ڈال کر مسکرائی۔

''کہاں سے آ رہی ہو؟''

''بھاپے کو روٹی دے کے۔''

''مجھے بھی بھوک لگی ہے۔''

''تمہاری ماں مر گئی ہے؟'' لڑکی نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''تم اپنے بھاپے کی ماں ہو؟'' وہ ہنسا۔

''دانت مت دکھاؤ۔ مجھے جانے دو۔''

مہندر سنگھ نے چھاچھ کا منکا اس کے سر سے اچک لیا۔ وہ خالی تھا۔

''تیرا بھاپا بڑا پیٹو ہے۔ ساری لسی پی گیا۔'' وہ منکا لڑکی کے پیٹ میں مار کر بولا۔ وہ ذرا سا جھکی اور منکے کو اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

''چنگیر نہیں دکھاؤں گی۔'' وہ پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

''تیری ماں بھی دکھائے گی۔'' اس نے گالی دی اور کندھا لڑکی کے سینے میں چبھویا۔ وہ چھاتی اور ہاتھوں کے زور سے دھکیلتی ہوئی اسے دور تک لے گئی۔ اس پر مہندر سنگھ نے کچکچا کر زور لگایا اور الٹے پاؤں اسے واپس لے آیا۔ دونوں کے چہروں سے پسینہ نکل رہا تھا۔ ہوا سے لڑکی کی دھوتی کا ایک پلو اڑ رہا تھا اور اس کی مضبوط، گندمی ران دکھائی دے رہی تھی۔

''چلو۔'' مہندر سنگھ نے ٹھوڑی سے کھڑی ہوئی فصل کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں۔ سئور۔'' لڑکی نے ناخن اس کے کندھوں میں گاڑ دیے۔

''مجھے جانے دو۔''

لیکن وہ اسے دھکیلتا ہوا فصل کے اندر لے گیا اور بے شرمی سے ہنستے ہوئے دو دفعہ ''چلو۔ چلو'' کہا۔

''تمہارا بھاپا بیٹھا ہے۔ اسے بلاؤں؟'' لڑکی نے رُک کر کہا۔

''وہ کیا کرے گا؟''

''تمہاری ہڈیاں توڑے گا۔''

''وہ ہمیں نہیں ڈھونڈ سکتا۔''

تبھی فصل کے پیچھے سے ایک کسان کی بھاری، خشک آواز آئی جو کسی کو پکار رہا تھا۔ مہندر سنگھ نے سیدھے

ہو کر بدمزگی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور گالیاں دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ ''کل تمہاری ساری لسّی پیوں گا۔''

''کل بھاپے کے ساتھ جاٹ نگر جارہی ہوں۔ بیائی پر لوٹوں گی۔'' لڑکی ابرو اٹھا کر شرارت سے مسکرائی اور نالے میں اتر گئی۔ مہندر سنگھ نے بڑی سی گالی دی اور نعیم کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

''یہ کون تھی؟''

''تھی ایک چھنال۔''

''چھنال تو نہیں لگتی تھی۔''

''بکومت۔''

''اور کیا لگتی تھی؟''

نعیم کے سارے بدن میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ''سؤر، تمہاری ماں تھی۔''

سکھ رک گیا۔ آنکھیں سکیڑ کر نعیم کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے آہستگی اور مضبوطی کے ساتھ تہبند میں اڑسی ہوئی لکڑی کی پتلی بانسری نکالی۔ ''اکڑو مت۔ مجھے جانتے ہو۔''

''جانتا ہوں۔ تمہارے پاس صرف ایک بانسری ہے۔''

''یہ تم لے لو۔'' اس نے بانسری نعیم کی طرف اچھالی۔ ''اب بھی تمہارا سر توڑ دوں۔''

''آؤ۔''

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے۔ کئی لمحوں تک خاموشی اور کھچاؤ بڑھتا گیا۔ مہندر سنگھ نے بے دھیانی سے گیہوں کی چند بالیاں اکھیڑیں اور انگلیوں میں مروڑنے لگا۔ اس کی پگڑی میں سے گندے بالوں کی ایک لٹ گردن پر لٹک رہی تھی اور نئی نئی داڑھی میں بھوسے کے تنکے اٹکے ہوئے تھے۔

پھر اس نے سٹہ زمین پر پھینک دیا اور مخصوص ہنسی اس کے بڑے سے چہرے پر پھیل گئی۔ ''تم کل آئے ہو۔ ابھی کچھ روز چوہدری کی بڈھیوں کا دودھ پیو۔ پھر لڑنا۔''

''بزدل۔'' نعیم نے بانسری گرادی۔

''میں تم سے نہیں لڑتا۔'' مہندر سنگھ ہنسا اور بانسری اٹھا کر لبوں سے لگالی۔

اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے نعیم نے دیکھا کہ اس کے کندھے' جو بنیان سے باہر رہتے تھے' سیاہ ہو چکے تھے اور باقی پشت پر' جو گندمی رنگ کی تھی' بنیان کے مستقل نشانات پڑ گئے تھے۔

''تم قمیض نہیں پہنتے؟'' نعیم نے پوچھا۔ مہندر سنگھ نے مڑ کر دیکھا اور بانسری بجاتا رہا۔

چلتے چلتے وہ دائیں ہاتھ مڑ گئے۔ سامنے چند کسان تیز دھوپ میں جھکے ہوئے گندم سے بھوسا الگ کر رہے تھے۔ ان کے جسم سیاہ اور چمک دار تھے۔

کئی مہینے گزر گئے۔ نعیم نے باپ کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ باقی سارا وقت وہ سویا رہتا۔ وہ بہت زیادہ کھانے اور سونے لگا تھا۔ اس کا ذہن گڈ مڈ سا رہتا اور ایک نامعلوم سا بے وجہ غصہ ہر وقت اس پر چھایا رہتا۔ بھاری بھاری قدموں سے چلتے ہوئے وہ حیرت اور خوف سے دیکھتا کہ وہ موٹا ہو رہا ہے' اس کا پیٹ بڑھ رہا ہے اور ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت لٹکنے والا ہے۔ اس خیال سے وہ ہر وقت جھنجھلایا رہتا کہ وہ انتہائی کاہل اور پیٹو ہوتا جا رہا ہے' گو اس کا باپ کہتا رہتا کہ گرمیوں کے موسم میں نیند عموماً زیادہ آتی ہے اور یہ صحت کے لیے مفید ہوتی ہے۔

کبھی کبھی وہ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے باپ سے کہتا: ''تم اپنی دکان شروع کیوں نہیں کرتے ہو بابا؟ یہ کام بہت سخت ہے۔ میں بھی دکان پر کام کروں گا۔''

نیاز بیگ کے گال سیاہ ہو جاتے۔ خوف ایک واحد جذبہ تھا جو ایسے وقتوں میں اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا۔ پھر جلد ہی وہی مستقل' پاگل خلاء اس کی جگہ لے لیتا اور وہ کھیت میں جھک جاتا۔ ''ہاں ہاں۔ ہم کسی روز دکان شروع کریں گے۔ مگر زمین کا کام بھی اچھا ہے۔ ہم زمین کا ہی کھاتے ہیں۔''

پھر کبھی وہ بڈھے کو سمجھاتا: ''یہ ہر وقت لڑتے رہنا بھی اچھا نہیں۔ لوگوں کی نظر میں عزت جاتی رہتی ہے۔ عورتوں کے ساتھ سلوک سے رہا کرو۔ اور گالیاں مت دیا کرو۔''

اس وقت نیاز بیگ غصے میں آ کر چیخنے لگتا: ''اور تم مجھے سبق دینے کے لیے آئے ہو؟ تم میرے نطفے سے ہو' تمہیں پتہ ہے؟ اپنی عقل اپنے پاس رکھو۔ میرا سر میرے لیے کافی ہے۔''

رات کو وہ کھانے پر بیٹھتے۔ ہفتے میں تین دن بڈھا ان کے ساتھ کھاتا' تین دن دوسری عورت کے ساتھ۔ ساتویں دن نعیم یا چھوٹا لڑکا اس کا کھانا لے کر کھیتوں میں جاتے۔ صرف وہی تین روز' جب گھر کا مالک مہمان ہوتا' کھانا اچھا پکتا' باقی دنوں میں روکھا سوکھا کھانے کو ملتا۔ ظاہر ہے۔

ایاز بیگ کے کئی خط آئے' جن کا نعیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک روز وہ مہندر سنگھ کے ساتھ گھوڑ دوڑ کا مقابلہ کر کے لوٹ رہا تھا کہ جوہڑ کے کنارے اسے ایاز بیگ کا معتمد خاص ملا جو دہلی میں رہتا تھا۔ وہ سوکھے چہرے اور سیاہ دانتوں والا وضع دار بڈھا تھا۔ نعیم کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی اور وہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

''میں آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں' بھیا۔ میں آپ کے گھر بھی گیا تھا۔''

نعیم نے گھوڑا روک لیا۔ ''پھر؟''

''چوہدری نے مجھے گالیاں دیں' جناب اور جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔''

نعیم خاموش رہا۔

''آپ کے چچا نے آپ کو بلایا ہے' بھیا۔ وہ بہت متفکر ہیں۔ چھ بار دلی آ چکے ہیں اس دوران میں۔''

نعیم نے بے دھیانی سے گھوڑے کی ایال پر ہاتھ پھیرا۔ ''صحت کیسی ہے چچا کی؟''

''یوں صحت تو ٹھیک ہے مگر آپ نہ گئے' بھیا تو خراب ہو جائے گی۔''

وہ انہماک کے ساتھ ایال نوچتا رہا۔ سورج چھپ رہا تھا جب اس کے سینے میں کوئی بھاری' بدمزہ سے شئے تیرتی ہوئی نیچے کی طرف اتری اور اس نے پوچھا''اور سب لوگ کیسے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہیں' بھیا۔ ٹھاکر درشن سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ روشن محل کے پرویز میاں ولایت چلے گئے۔''وہ بتانے لگا۔ نعیم گھوڑے کی پشت پر بیٹھا بے خیالی سے اس کے غیر دلچسپ' مشینی چہرے کو ہلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر ایک خیال' بڑا تیز اور واضح' اس کے ذہن میں اُبھرا: ''کیا فائدہ!''

دفعتاً نفرت اور غصے کا طوفان اس کے اوپر سے گزرا۔''جاؤ۔'' وہ بازو سے پیچھے کی طرف اشارہ کر کے چیخا۔''میں نہیں جاؤں گا۔''اور گھوڑے کی پسلیوں میں ایڑیاں مارنے لگا۔

وہ ابھی زیادہ دور نہ گیا تھا کہ پیچھے سے نیاز بیگ کی آواز سن کر رک گیا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا اور مخصوص انداز میں' ایک ٹانگ پر' ناچ رہا تھا۔''جا حرام زادے نوکر۔ میرا بیٹا نہیں جائے گا۔ جا کر اسے کہہ دے کہ وہ میرے باپ کے نطفے سے نہیں ہے۔ وہ جولاہا ہے اور تو جولاہے کا نوکر ہے' چنانچہ جولاہا ہے۔ دفع ہو جا۔''

معتمد خاص' جو مسکین اور وضع دار آدمی تھا' پہلے ششدر کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر اپنی ذلت کا خیال کر کے ایک دم گرم ہو گیا اور رک رک کر بولا''تم ...... تم اس کی زمین میں سے نہیں کھاتے؟ تمہاری کہاں ہے؟ کہاں ہے آپ کی؟ حساب کیجئے۔''

نعیم نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور معتمد کے سر پر جا چڑھا۔ معتمد گرا' پھر اٹھا اور پوری قوت سے بھاگنے لگا۔

''جولاہے...... نوکر......'' چیختا ہوا نیاز بیگ دور تک اس کے پیچھے بھاگتا گیا۔ دھندلکے میں گاؤں پر اپلوں کے دھوئیں کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

(۶)

بیائی زوروں پر تھی۔ پچھلے چند دنوں میں نیاز بیگ اور نعیم نے بہت محنت کی تھی۔ ان کے پاس بیلوں کی صرف ایک جوڑی تھی۔ گومہندر سنگھ کئی بار انہیں ایک اور جوڑی مہیا کر دینے کی پیشکش کر چکا تھا مگر باپ بیٹا جانتے تھے کہ یہ بیل چوری کے ہوں گے۔ چنانچہ وہ اپنے دو بیلوں پر قانع رہے اور آٹھ ایکڑ زمین بیائی کے لیے تیار کر کے باقی پانچ ایکڑ ساؤنی کے لیے چھوڑ دی۔ کل تیرہ ایکڑ ان کی ملکیت تھی۔

ابھی بہت رات باقی تھی جب نیاز بیگ نے اٹھ کر حقے میں پانی ڈالا' چولہے میں سے رات کا دبایا ہوا' دھمکتا ہوا اپلا نکالا' تمباکو سلگایا اور حقہ پینے لگا۔ بڑھیا اور چھوٹا لڑکا زمین پر سو رہے تھے۔ کونے میں نعیم کی چارپائی تھی۔

''آج آخری رات ہے اِدھر۔''اونگھتے ہوئے اس نے سوچا اور اپنی بیوی کے ڈھیلے ڈھالے' سوکھے جسم

پر ہاتھ پھیرنے لگا۔عورت نیند میں کسمسائی۔ کمرے میں سوتے ہوئے انسانی جسموں کی مخصوص بوتھی' اور گرم' خواب آلود بھاری سانسوں کی آواز آ رہی تھی۔ آنگن میں پھیلی ہوئی سفید خنک چاندنی دروازے کے راستے اندر آ رہی تھی اور کمرے میں رکا ہوا اپلوں کا دھواں دودھیا دکھائی دے رہا تھا۔ نیاز بیگ وہیں بیٹھا بیٹھا ساتھ والے کمرے میں سوتی ہوئی چھوٹی عورت اور آنے والی شب کے تصور سے دل ہی دل میں لطف لینے لگا۔

پھر اس نے اٹھ کر کمرہ پار کیا اور حقے کی نے نعیم کی گردن میں چبھوئی۔'' کیسے سوتے ہو؟ جاڑا سر پر آگیا اور بیائی ابھی اتنی باقی ہے۔''

نعیم نے اندھیرے میں آنکھیں کھولیں اور کروٹ بدل کر سوگیا۔ نیاز بیگ چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا۔نعیم کی نیند اچاٹ ہوگئی۔

''میں ہل لے کر کیکر والے کھیت میں جا رہا ہوں۔ بیج لے کر آجاؤ۔'' نے منہ سے الگ کیے بغیر اس نے کہا اور بڑھیا کے پاس جا کر رک گیا۔ ایک پاؤں اٹھا کر اس نے سوتی ہوئی عورت کے پیٹ پر رکھا اور ہولے سے دبایا' پھر اس کے سینے پر' پھر گردن پر' پھر ٹانگوں پر' کچھ دیر تک وہ اسی طرح اپنے تلووں میں بوڑھے جسم کی حرارت محسوس کرتا رہا' پھر اندھیرے میں ہنسا اور باہر نکل آیا۔

''اٹھو۔ کسانوں کے بیٹے لڑکیوں کی طرح نہیں سوتے۔'' دروازے پر سے ہل اٹھاتے ہوئے اس نے کہا اور بیل کھول کر کھیتوں کی جانب چل پڑا۔

کاتک کا چاند جیسے بالکل سامنے کھڑا تھا' اور آخیر خزاں کی خنک اور سفید لٹھے کی سی کھڑکھڑاتی ہوئی رات چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جوہڑ کے کنارے چند کتے اس پر کاہلی سے بھونکے۔ درختوں کے نیچے سوئے ہوئے کسانوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور کروٹ بدل کر پھر سوگئے۔

''اتنے سویرے کہاں جاتے ہو چوہدری۔'' ایک کسان نے خواب آلود آواز میں پوچھا۔

''بیائی کو۔''

''اللہ کرم کرے۔''

''اللہ کرم کرے۔'' ایاز بیگ نے اکتاہٹ سے دہرایا۔

''لونڈے کو محنت کرایا کرو۔ شہر میں رہ کر نازک ہوگیا ہے۔''

وہ نعیم کے دیر کرنے پر غصے سے بھنا گیا۔ مگر بیلوں کی رسیاں تھامے' حقہ گڑگڑاتا ہوا چلتا رہا۔ خاموش' سفید فضا میں بیلوں کی گھنٹیاں سحر خیزی سے بج رہی تھیں۔

کیکر کے نیچے پہنچ کر وہ ہل جوتنے لگا۔ پھر کھیت میں گھس گیا اور زمین کو محسوس کرنے لگا۔

''بالکل تیار ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور خوشی کے مارے کھیت کا لمبا چکر کاٹا۔ زمین سہاگا پھرا کر ہموار کر دی گئی تھی اور اندر سے نرم اور نمدار تھی۔ اس میں بس اتنا پانی تھا کہ مٹی ہاتھ میں بھر بھی جائے اور انگلیوں

پر نمی بھی چھوڑ جائے۔

''پانی پورا ہے۔ بالکل پورا ہے۔'' اس نے بار بار مٹی کو ہاتھ میں لے کر ملتے ہوئے کہا۔ پھر جا کر بیلوں کو تھپتھپایا اور جیسا کہ بعض کسانوں کو عادت ہوجاتی ہے' ان کا مزاج پوچھا۔ چاندنی رات میں ایک سایہ اس کے قریب آ کر رک گیا۔

''کس سے باتیں کر رہے ہو؟'' یہ ایک لمبا تڑنگا سکھ کسان تھا۔

''زمین میں بالکل پورا پانی ہے۔'' نیاز بیگ بھاگ کر گیا اور مٹھی بھر مٹی لا کر خوشی سے اسے دکھانے لگا۔ سکھ کسان نے مٹی کو انگلیوں میں ملا اور گرا دیا۔

''بالکل پورا پانی ہے۔'' سکھ نے دہرایا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''پانی لگانے۔''

''پانی لگانے؟ اب؟''

''باری اب آئی ہے۔''

''ہت...... تو بیائی کب کرو گے؟''

''پانی اب ملا ہے۔'' سکھ نے دوبارہ تأسف سے کہا۔

''اچھا تو اواو۔ اب تم پانی دو گے تو بیائی ماگھ میں کہیں جا کر ہوئی۔ ایں؟''

''ہاں۔''

''تمہیں جلدی کرنی چاہیے۔ تم ہمیشہ دیر کر دیتے ہو۔ پار سال تم نے فصل چھٹے مہینے میں جا کر اٹھائی تھی۔ یاد ہے؟''

''واہگرو کی مرضی۔''

''تمہیں سستی نہیں کرنی چاہیے۔''

''اور تم سمجھتے ہو کہ میں عورت کے ساتھ سویا رہتا ہوں؟ میری صرف ایک عورت ہے۔'' سکھ کسانوں کی موٹی' خام آواز میں ہنسا۔

اس کے جانے کے بعد نیاز بیگ نے غصے سے اِدھر اُدھر دیکھا اور گھر کی جانب دوڑ پڑا۔ نعیم ابھی تک سو رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں اسے پکارا:

''ہم جب جوان ہوئے تو ہمارے باپ نے لسّی پانی ہمارا سب بند کر دیا کہ سو سو کر پوتی نہ ہو جائیں۔'' اس نے کہا۔ نعیم نیند سے بوجھل جسم لیے چارپائی کے کنارے پر بیٹھا رہا۔ ''چلاتے کیوں ہو۔ ابھی اتنی رات باقی ہے۔'' وہ جھنجھلایا۔ رات کے کھانے سے ابھی تک اس کا معدہ بھی بھاری تھا۔ آنکھیں بند کیے کیے اس

نے پتلون ٹانگوں پر چڑھائی۔

دونوں نے مل کر گندم کی بوری گھوڑی کی پیٹھ پر رکھی اور باہر نکل آئے۔ ہاتھ سے بوری تھامے وہ گھوڑی کے برابر کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتا رہا۔ نیاز بیگ' جو پیچھے پیچھے آرہا تھا' کبھی کبھی تیز' بے سُری آواز میں گانے لگتا۔ چاندنی اس قدر صاف تھی کہ چیونٹی تک نظر آرہی تھی۔ پچھلی رات کی بوجھل' نمدار ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی اور وہ چلتے چلتے اونگھنے لگا۔

کیکر کے نیچے ایک گیدڑ منہ اٹھائے کھڑا غور سے بیلوں کو دیکھ رہا تھا۔ نیاز بیگ نے دور سے اسے دیکھ لیا۔ اس نے فوراً نعیم کو روکا' چکر کاٹ کر دبے پاؤں پیچھے سے گیا' قریب جا کر گھٹنوں کے بل ہوگیا' پھر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ گیدڑ آہٹ پا کر چونکا اور بھاگ گیا۔ نیاز بیگ نے گالی دی۔

''لالو کی گھوڑی پالے سے جڑ گئی ہے۔ اس کے لیے چاہیے تھا۔''

''گیدڑ؟'' نعیم نے پوچھا۔

''ہاں۔ اس کا گوشت گرم ہوتا ہے۔''

بوری اتروا کر وہ فوراً کھیت میں گھس گیا۔ ''آؤ۔ میرے ساتھ چلو۔'' دوسرے چکر پر گزرتے ہوئے وہ پکارا: ''دیکھو یہ ہل پھیرنے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں تم ہتھی پر بوجھ نہیں ڈالو گے۔ صرف نالی کو زمین میں ڈبوئے رکھنا ہے۔ ہوں؟ لو کرو۔ اور بیج نالی میں ڈالے جاؤ۔ اسے نل بیائی کہتے ہیں۔''

اس نے نالی نعیم کے حوالے کی' بیج کی جھولی اس کی پشت پر کس کر باندھی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تیسرے چکر پر وہ کھیت سے باہر نکل آیا اور کیکر کے نیچے کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔

''ہوں ہوں ہوں۔ لکیر ٹیڑھی جارہی ہے۔'' وہ وہیں سے چیخا۔ نعیم اُلٹے سیدھے قدم رکھتا' نالی سے کشتی کرتا' زیرِلب گالیاں دیتا ہوا بیلوں کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

''ہواووں۔'' اس کا باپ پھر چلایا۔ ''اندھے ہو؟ بیج باہر گر رہا ہے۔''

''تمہاری نظر بڑی تیز ہے۔'' نعیم نے جل کر کہا۔ ''چاند کی روشنی میں دانے دیکھتے ہو۔''

وہ بے حد احتیاط کے ساتھ بیائی کر رہا تھا' لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے پر اسے برابر ڈانٹ کھانی پڑ رہی تھی۔ لکیر سیدھی رکھنے کی کوشش میں بیج باہر گرنے لگتا' اور اس کی طرف دھیان دیتا تو نالی باہر نکل آتی۔ خنکی کے باوجود اس کے سارے جسم میں سے پسینہ نکل رہا تھا۔

''نیلے کی دم مروڑ' اوپر والے کی۔ دبتا ہے کمین کا بیل۔ کھانے کو تو تین مرلے بھی کھا جائے۔'' اس کا باپ چیخا۔ وہ بغیر سنے کام میں مصروف رہا۔ جب دوبارہ نیاز بیگ چلایا: ''نیلے کو چلاؤ نیلے کو۔'' تو اس نے جھنجھلا کر بیل روک دیے اور خالی جھولی پشت پر سے اتار کر اس کے پاس لا کر پھینکی۔

''جب میں نے پہلے دن بیائی کی تھی تو ایک سو چالیس کیکر کی چھڑیاں مجھے پڑی تھیں۔ اتنی بیلوں کو نہیں

ماریں جتنی باپ نے مجھ کو ماریں۔'' ایاز بیگ نے جھولی بھر کر نعیم کی کمر پر کستے ہوئے کہا۔

''تو تم اب بدلہ اتارنا چاہتے ہو؟''

''کام کرو۔ چلاؤ نہیں۔ سویرا ہونے والا ہے۔''

''دادا جب مرا تو تم چھوٹے سے تھے۔ مجھے پتہ ہے۔''

''جرح مت کرو۔ سویرا ہونے والا ہے۔''

صبح کا ستارا تیزی سے چمکنے لگا۔ پھر دوسرے ستارے ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے۔ اجالا پھیلا اور چاند سفید ہو گیا۔ سورج نکلنے تک نعیم کا جسم اتنا نہیں تھکا تھا جتنا اس کا مزاج نیاز بیگ کی جھک جھک سے بگڑ چکا تھا۔ مگر آخر اس نے بیائی کرنا سیکھ لی تھی۔ آخری کھیت اس نے مکمل صفائی سے بویا تھا۔ دو گھڑی دن گزر چکا تھا جب اس نے بیل کھولے، انہیں کیکر تلے باندھا اور لسی کا منکا اٹھا کر منہ سے لگالیا۔ اس کی چھوٹی ماں آج اپنی باری پر چھاچھ اور روٹی لے کر آئی تھی۔ دستر خوان پر دو باجرے کی روٹیاں پڑی تھیں۔ ایک پر مکھن چپڑا تھا جسے اس کا باپ کھانے لگا۔ خشک روٹی اس کے حصے میں آئی۔ اس کی ماں بیٹھی چند ماہ کے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ وہ معمولی شکل کی ایک سیدھی سادی عورت تھی اور اس کے سنولائے ہوئے چہرے پر کسان عورتوں کی عام جلدی بیماری کے سفید دھبے تھے۔

''ابھی ایک تہائی بیائی ہوئی ہے۔'' نیاز بیگ نے کھاتے ہوئے کہا۔

''باقی کل کریں گے۔''

''کل؟ کل؟'' پھر وہ طنز سے ہنسا۔ ''کلکتے میں بیائی پھاگن تک کرتے رہتے ہیں؟ آج شام تک بیائی ختم ہو جانی چاہیے۔ سنا؟'' ''ہُنہ اہُنہ ہُنہ۔ کل!''

''کل کیوں نہیں؟'' نعیم نے غصے سے کہا۔

''جو دو سیر آج رات کو ہم بیج میں سے کھالیں گے کل وہ کہاں سے آئے گا؟''

وہ خاموشی سے کھاتے رہے۔ اس کے باپ کے جبڑوں کی آواز دور تک جا رہی تھی۔ کئی کسان ہل پکڑے ہوئے پاس سے گزرے۔ سورج اونچا ہو گیا تھا اور دھوپ میں سفیدی اور سختی آچلی تھی۔ تازہ تازہ بچھائے ہوئے بیج پر کبوتروں کے غول کے غول آرہے تھے جنہیں نیاز بیگ گالیاں دیتا ہوا اڑاتا جا رہا تھا۔

''نعیم کو بھی مکھن دو۔'' عورت نے نیاز سے کہا۔

''ہاں ہاں لو کھاؤ۔ آج تم نے محنت کی ہے۔''

نعیم اپنی روٹی ختم کر کے باپ کی روٹی کھانے لگا۔

''میں تو تمہیں بھی علی کی طرح سمجھتی ہوں۔'' چھوٹی ماں نے اس سے کہا۔ نعیم نے خاموشی سے کھانا ختم کیا اور لسی کا کٹورا بھر کے پیا۔ پھر وہ سوئے ہوئے بچے کے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ نیاز بیگ نے باقی لسی ایک

سانس میں چڑھائی اور حقہ گڑگڑانے لگا۔

''لو حقہ پی لو۔ پھر تمہیں کام کرنا ہے۔''

''میں نہیں پیتا۔'' نعیم نے زمین پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے اب بیائی نہیں ہوگی۔'' نیاز بیگ نے ٹیڑھی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر غصہ دکھانے کو ہوا میں بازو پھینک کر کبوتروں کو گالیاں دینے لگا۔ جب سارا تمبا کو جل گیا تو وہ اٹھا۔ ''اسی لیے بیائی کے دنوں میں ہمیں مکھن نہیں ملتا تھا۔'' اس نے اپنے آپ سے بات کی اور جھولی کمر پر لاد کر کھیت میں چلا گیا۔

دھوپ تیز ہوگئی۔ کیکر کے نیچے کی زمین بیک وقت نیم گرم' ٹھنڈی اور نمدار تھی۔ نعیم کو چھاچھ اور باجرے کی خماری چڑھنے لگی۔

''تمہاری ماں سمجھتی ہے میں تمہاری دشمن ہوں۔'' چھوٹی ماں نے بات شروع کی۔ ''اب ایلی ہوگیا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ وہ کہتی ہے میں نے ٹونا کیا ہے۔''

نعیم بچے کے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ وہ چھوٹا سا صحت مند' گندمی رنگ کا بچہ تھا اور اس کے سوتے ہوئے منہ سے دودھ کی بو آرہی تھی۔ ''ہاں تمہیں لڑنا نہیں چاہیے۔ میں نے ماں سے بھی کہا تھا۔'' اس نے کہا۔ بچے کی پکی ہوئی فصل کی طرح سنہری جلد کو تھپکتے ہوئے اسے بہت پیار آیا۔ لیٹے لیٹے منہ آگے بڑھا کر اس نے اسے پیار کیا۔ وہ پہلی دفعہ اس بچے کو پیار کررہا تھا اور شاید پہلی بار اس اجنبی' دشمن عورت سے مخاطب تھا۔

''آج میں نے تین کھیت بیائی کی ہے۔ علی کو خوب دودھ پلاؤ۔ پھر ہم مقابلے پر ہل چلایا کریں گے اور باپ یہاں بیٹھ کر گالیاں دیا کرے گا۔''

لڑکا ہلا اور آنکھیں بند کیے کیے رونے لگا۔ ماں نے گریبان کھول کر بڑی سی' گندمی' دودھ سے بھری ہوئی چھاتی اس کے منہ میں دے دی۔ ''تم بھی میرے بیٹے ہو۔ ایلی بھی۔ تم دونوں کا ایک خون ہے۔''

نعیم بچے کا پاؤں دانتوں میں لے کر دبا رہا تھا۔ عورت نے پہلی بار غور سے اس جوان' اجنبی آدمی کی طرف دیکھا اور رونے لگی۔

''بارہ سال تک ہم بہنوں کی طرح رہیں۔ میرے باپ نے' جب میرا پہلا خاوند مرگیا تو' مجھے یہاں پر دے دیا۔ مجھے آئے ہوئے بیس دن ہوئے تھے کہ تمہارا باپ چلا گیا۔ ہم ایک چھت کے نیچے رہیں اور کسی دوسرے مرد کی ران نہ دیکھی۔ اب وہ میری دشمن ہے۔'' وہ دیر تک باتیں کرتی رہی۔ نعیم لیٹا لیٹا سوگیا۔

سارا پچھلا پہر نیاز بیگ بیائی کرتا رہا۔ دھوپ میں کام کرنے سے اس کا رنگ سیاہ ہوگیا اور پسینے سے داڑھی اور چھاتی کے بال بھیگ گئے۔ مگر جب وہ واپس آیا تو بیج کی بوری خالی ہوچکی تھی اور دو کھیت ابھی باقی تھے۔ وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا:

''ادھار لینا پڑے گا۔ بیلوں کو گھر لے جاؤ۔''

جاگیردار کا منشی، جو حویلی کے ایک حصے میں رہتا تھا، ادھیڑ عمر، موٹا تازہ سرخ رنگت کا آدمی تھا اور آنکھوں پر چشمہ لگاتا تھا جس سے اس کی حیثیت گاؤں میں یوں بھی مسلّم ہو جاتی تھی۔ جب یہ باپ بیٹا نہا دھو کر اس کے پاس پہنچے تو وہ دور سے دیکھ کر پکارا:

''آؤ چوہدری۔ کیسی گزار رہے ہو؟ قرض کے بغیر؟''

''ہاں قرض کے بغیر، قرض کے بغیر۔'' نیاز بیگ نے اس کے پاس دیوان پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''پر اب نہیں۔''

''جان مانگ لو چوہدری پر بیج نہ مانگو۔ ایک دانہ جو ہو بھائی، قسم ہے......''

''قسم نہ کھا گنہگار، رک جا۔ میں ایک قدم بے بوئی زمین کے لیے جان دے دوں گا۔ تم جانتے ہو، کمین۔'' وہ ہنسا۔ منشی نے زور سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور گالی دی۔ پھر وہ کھسر پھسر کرنے لگے۔

''ایک دس، بس بس۔ زیادہ مت بکو۔ ایک دس ٹھیک ہے۔'' نیاز بیگ نے کہا۔

''میں تیری داڑھی کا ایک بال نہ چھوڑوں گا، یاد رکھ۔'' منشی ہنسا۔ ''ایک بارہ۔''

''بس بس ایک دس......ایک دس......'' نیاز بیگ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایک بارہ......ایک بارہ......'' منشی نے دہرایا اور نیچے بیٹھے ہوئے ایک کسان کو اشارہ کیا۔

''اللہ کرم کرے۔''

''اللہ کرم کرے۔''

دونوں نے منشی کے گودام سے آدھی بوری گندم کی لی اور اسے گھوڑی پر لاد کر واپس ہوئے۔

''ہمیں اب دس بوریاں دینی پڑیں گی؟'' نعیم نے بوری تھام کر چلتے ہوئے پوچھا۔

''پانچ۔ یہ آدھی بوری ہے۔''

''بہت زیادہ ہے۔ تم فصل میں سے کیوں نہیں رکھتے؟''

''اس دفعہ تو بہت تھا۔'' وہ رکا۔ ''ایک اور منہ جو آ گیا۔''

''کون؟'' نعیم نے بے خیالی میں پوچھا۔ پھر دفعتاً وہ بے حد جھلا گیا۔ ''تو میں چلا جاؤں؟''

نیاز بیگ چپ چاپ سر جھکائے چلتا رہا۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس کے چوڑے جسم کا خفیف سا جھکاؤ اور ڈھلکے ہوئے کندھے ایک سن رسیدہ دیو کے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے بھاری قدموں کی مستقل مسلسل آواز گلی میں اٹھ رہی تھی۔ بے کواڑ کے دروازوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہیں عورتیں اور مرد چولہوں کے گرد بیٹھے کھاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اپلوں کا تیز گھنا دھواں گلی کو لپیٹ میں لیے تھا اور وہ بار بار آنکھیں پونچھ رہے تھے۔

پھر اس نے سر اٹھایا اور جب وہ بولا تو اس کی بھاری، کرخت آواز میں کسانوں کے خام جذبات کی نرمی

اور کپکپاہٹ تھی۔

''نہیں۔ تم ابھی اپنا ہی خون اور گوشت ہو۔ پر تمہیں کام کرنا چاہیے۔''

جاڑوں کی ایک شام کو مہندر سنگھ کے گھر چند لوگ جمع ہوئے۔ مجمع زیادہ تر گاؤں کے نوجوانوں پر مشتمل تھا جو اس کے بھائیوں کے دوست تھے اور مختلف ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ ہر ایک ٹولی کا سرغنہ مہندر سنگھ کا ایک بھائی تھا جو اپنے دوستوں کے حلقے میں بیٹھا ڈینگیں مار رہا تھا اور بڑی انکساری کے ساتھ دودھ کے گلاس پیش کرتا جا رہا تھا۔ سب نوجوان نہا دھو کر، کھیتوں کی مٹی اتار کر، آنکھوں میں سرمہ اور سر میں تیل ڈال کر آئے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے بہترین بھڑ کیلے لباس اور رنگے ہوئے کچے چمڑے کی جوتیاں پہن رکھی تھیں۔

سکھوں کا گھر گاؤں سے باہر جوہڑ کے کنارے پر تھا۔ دالان میں، جہاں لوگ جمع تھے، چند چارپائیاں پڑی تھیں اور دیوار کے ساتھ دو لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ کچھ لوگ چارپائیوں پر بیٹھے تھے، باقی چٹائیوں پر، جو نیچے بچھی تھیں۔ کمرہ دھوئیں، مٹی کے تیل کی بو، قہقہوں اور باتوں کے شور سے بھرا ہوا تھا۔ مہندر سنگھ کا بڑا بھائی اس رات کا دولہا تھا۔ اس نے سفید ریشم کا لباس پہن رکھا تھا اور سر سے ننگا تھا۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا لیکن اپنے اپنے لباس دکھانے کے شوق میں سب نوجوانوں نے لوئیاں اور کمبل اتار کر کونے میں ڈھیر کر دیئے تھے اور اب کچے دودھ کے نشے میں قہقہے لگا رہے تھے۔

''میری گندم میں تو گھٹنے نظر نہیں آتے، مہندرو۔'' فقیر دین نے، جو منشی کا خاص جاں نثار تھا، گنجی آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

''ہاں بے۔ تمہاری فصل میں تو منشی اور اس کی بیوی نے ایک ایک پودے پر پیشاب کیا ہے۔ کل کو تمہارا پسینہ بھی نظر نہ آئے گا۔'' مہندر سنگھ نے کہا، جو اکیلا اکیلا پھر رہا تھا۔

جوگندر سنگھ کو مہمانوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں بار بار جانا پڑ رہا تھا، لیکن کیکر کی شراب کے نشے میں اسے سردی کا احساس نہ تھا اور وہ تیز ہوا میں خالی قمیض پھڑ پھڑاتا ہوا اندر باہر پھر رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں، جہاں بھوسہ بھرا تھا، خالی جگہ پر چٹائی بچھا کر شراب کی مٹکی دھری تھی اور پسینے والے کسان اردگرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''میرا نیلا بیماری کی حالت میں بھی چھ گھنٹے متواتر ہل کے آگے چل سکتا ہے۔'' منجھلے بھائی کرم سنگھ نے کہا۔

''اور آسانی سے دو مرلے زمین تیار کر سکتا ہے۔'' ایک بوڑھا، جو بھوسے کے ڈھیر کے ساتھ لیٹا تھا، بولا۔

''او کبڑے بوڑھے۔ تیری ماں۔'' کرم سنگھ نے شراب سے بھرا ہوا مٹی کا پیالہ زمین پر دے مارا۔ ''تین مرلے تو میں خود ہل کے آگے لگ کے تیار کر دیتا ہوں، جولا ہے۔''

ساتھ بیٹھے ہوئے تین آدمیوں نے، جو دیر سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے، شراب کے پیالے زمین پر رکھے اور کسی بات پر ہنسنے لگے۔ وہ سر پیچھے پھینک کر کرخت آوازوں سے ہنس رہے تھے اور اپنے کھردرے بڑی

بڑی گانٹھوں والے ہاتھوں سے تالیاں بجا رہے تھے۔ ان کے سیاہ چہروں پر شراب اور ہنسی کی وجہ سے موٹی موٹی رگیں ابھر آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کرم سنگھ ہنسنے لگا اور بوڑھے کی ران پر ہاتھ مار کر بولا:

''دیکھ کبڑے جولا ہے' ان کی ماں کو کچھ ہو گیا ہے۔''

بوڑھا مسخرہ چیخیں مار کر ہنسنے لگا۔ تھوڑی سی شراب چھلک کر اس کی چھاتی کے سفید بالوں میں جذب ہو گئی۔ جوگندر سنگھ دروازے پر نمودار ہوا۔

''چھ ماہ بعد میں نے یہ مٹکی نکالی ہے آج کے لیے۔ اور یہ تیرے دادے سے بھی بڈھے کیکر کی ہے کبڑو۔ دو گھونٹ تیری عقل کے لیے بہت ہیں۔ تھوڑی پی۔'' وہ ہنس کر آگے چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد جب ایک موٹی تازی جوان لڑکی جو جوگندر سنگھ کی بیوی تھی' دروازے کے سامنے سے گزری تو اس کے منہ سے خوف کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ہوا کے زور سے بوڑھے کی چلم میں سے چند چنگاریاں اڑ کر بھوسے پر جا گری تھیں اور وہ جگہ جگہ سے سلگ رہا تھا۔ لڑکی نے بدحواسی کے ساتھ اپنے خاوند کو آوازیں دے کر بلایا' جس نے گالیاں دیتے ہوئے بھاگ بھاگ کر پانی کی چند بالٹیاں بھوسے پر ڈالیں۔

''سارا نشہ خراب کر دیا سسرے نے۔ اس واہگرو کے دشمن کو یہاں کیوں لائے۔'' وہ بڈھے سے حقہ چھینتے ہوئے بولا۔

''دیکھ او جوگندرے۔ بھوسے کی ماں کو آگ لگ جائے۔'' کرم سنگھ نے بڑے بھائی سے کہا۔ ''ٹھاکر بلدیو سنگھ میرا مہمان ہے۔ تو حقہ یہاں رکھ دے۔''

جوگندر نے اپنے چھوٹے بھائی کے نشیلے چہرے کی طرف دیکھا اور حقہ چھوڑ دیا۔ ''دروازے تو بند کرو پھر۔'' وہ آنکھیں نکال کر بولا۔

''اب پہلے گیلا بھوسہ جانوروں کو ڈالنا' ورنہ سارا سڑ جائے گا۔''

اس کی بیوی کلدیپ کور نے کہا۔

''کتیا کی اولاد۔ سارا نشہ خراب کر دیا ماں کے یار نے۔'' وہ کنڈی چڑھا کر چلا گیا۔

کلدیپ کور' جس نے شادی کے بعد پہلی دفعہ اتنا بڑا مجمع دیکھا تھا' بغیر پیے نشے میں تھی۔ وہ مستعدی سے کھانے کا انتظام کرتی ہوئی' بھاری کولہے ہلا ہلا کر اور چھاتی آگے نکال کر چلتی ہوئی ادھر اُدھر آ جا رہی تھی۔ مضبوط جسم کی ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر معصومیت تھی اور سکھ عورتوں کے خوبصورت نقوش اس کے حصے میں آئے تھے۔

نعیم جوہڑ کے کنارے چلتا ان کے گھر میں داخل ہوا۔

''شادی ہو رہی ہے؟''

''نہیں دستار بندی ہے۔'' مہندر سنگھ نے کہا۔ نعیم گاؤں بھر میں اس کا واحد دوست تھا۔ دونوں دالان کی طرف چلے گئے۔ اندر جو لوگ بیٹھے تھے سب جاگیردار کے مزارعین تھے' اور نعیم غریب ہونے کے باوجود کاشت کار

کا بیٹا تھا' چنانچہ سب نے اسے اپنی اپنی طرف بلا کر پاس بیٹھنے کے لیے کہا۔

''کل تو نے جو گھڑ دوڑ میں مہندرو کو ہرایا' جوان' تو چوہدری کا نام رکھ لیا۔'' ایک پکی عمر کے آدمی نے کہا۔

''چوہدری بھی بڑا دلیر آدمی تھا۔ پر اس کا بیٹا نمبر لے گیا۔ وہ جو لاہوں کی گھوڑی کس گھوڑے سے ملائی ہے چوہدری؟'' ایک اور آدمی نے پوچھا۔

''مشکی کے گھوڑے سے۔'' نعیم کی بجائے فقیر دین نے جواب دیا' اور حقہ نعیم کی طرف بڑھایا ''لو حقہ پیو۔''

''میں نہیں پیتا۔'' نعیم نے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو نکما گھوڑا ہے۔ پوتی ہے۔'' پیچھے سے ایک کمزور آواز والا کسان بولا۔

''کون سا؟ مشکی؟'' فقیر دین گنجی آنکھیں پوری طرح کھول کر مڑا۔

''اچھا مشکی۔ مشکی۔ میں سمجھا وہ جو منشی کے بیٹے کی دستار بندی پر آیا تھا۔'' کمزور آواز والے نے معذرت کی۔

''دارو پیو گے؟'' مہندر سنگھ نے پوچھا۔

''نہیں۔''

کیکر کی شراب سے مدہوش ہو کر بھوسے کے کمرے والے باہر نکل آئے تھے اور آنگن میں اوٹ پٹانگ قسم کا ناچ ناچ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر دالان میں بیٹھے ہوئے چند لڑکے' جو بہت اچھا ناچتے تھے' لوگوں کے اصرار پر اٹھے اور آنگن میں نکل آئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو چند ہدایات دیں اور قطار میں کھڑے ہو کر ایک دیہاتی ناچ شروع کر دیا۔ کبڑا بوڑھا کان پر ہاتھ رکھ کر گانے لگا۔ وہ اونچی' کرخت اور پتھر کی طرح کی بھاری آواز میں گیت کے بے معنی بند گا رہا تھا اور ناچنے والے قطار سے نکل کر دائرے میں ہو گئے تھے اور تیزی سے گھومتے ہوئے' جھک کر ایک ساتھ تالی بجاتے ہوئے اور اچھل کر بازو ہوا میں پھینکتے ہوئے ناچ رہے تھے۔ یہ بے ہنگم' وحشیانہ قوت اور خوشی کا مظہر' جنگلیوں کا ناچ تھا۔

''دستار بندی کیا ہے؟'' نعیم نے مہندر سنگھ سے پوچھا۔

''بھائیے نے جھگی توڑی ہے۔''

''ایں؟''

''ہاں۔ نہیں سمجھتے؟ تمہاری عقل میں نہیں آئے گا۔ یہ شیروں کی دنیا ہے۔''

''بکومت۔ تم نشے میں ہو۔''

''میں نشے میں نہیں ہوں' چودری صاب۔ ہم میں سے جب تک کوئی دوسرے کا کوٹھا نہ توڑے پگڑی نہیں باندھ سکتا۔''

''پگڑی تو جوگندر پہلے بھی باندھتا تھا۔''

وہ تو وابگرو کی پگڑی تھی۔ یہ عزت کی پگڑی ہے۔ دستار نہیں سمجھتے؟ دلیری اور مردانگی کی۔''

نعیم ہنسا: ''کوٹھا کیسے توڑا؟''

''رات علی پور گئے۔ مگر وہ لوگ جاگ گئے بلونگڑے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا۔ تھوڑی سی لڑائی ہوئی اور ایک بھینس لے آئے۔ ایک کو مارنا بھی پڑا۔'' مہندر سنگھ نے گالی دی۔

''یہ تو چوری ہوگئی۔''

''بزدلوں کے اپنے نام ہوتے ہیں۔'' پھر یکلخت اس نے اپنی شرابی آنکھیں پھرائیں۔ ''اور ایک لفظ بھی جو تو نے کہا تو واہگرو کی قسم۔ واہگرو کی قسم یاد رکھنا۔''

نعیم خاموش کھڑا ناچنے والوں کو دیکھتا رہا۔ گانے والے کی اداس بھاری آواز کے ساتھ ناچ کی خاموش تال نے مل کر سرد چاندنی کو طلسمی بنا دیا تھا۔

پھر کھانا دیا گیا۔ بھنے ہوئے آٹے کا حلوہ جس میں گڑ اور بے تحاشا گھی ڈالا گیا تھا اور تنور کی روٹیاں تھیں۔ سب کسان لڑکے نیچے بیٹھ کر انگلیوں پر تول تول کر حلوہ کھانے لگے اور گھی ان کی داڑھیوں پر بہنے لگا۔ ایک ساتھ کئی جبڑوں میں سے چکنے حلوے کی 'چپ چپ' سنائی دے رہی تھی۔

''یہ لوگ کٹائی تک گندم کھاتے رہتے ہیں۔ محنتی لڑکے ہیں۔'' کسی نے کہا۔

کلدیپ کور بار بار دروازے پر آ کر دودھ کے بھرے ہوئے کٹورے جوگندر سنگھ کو پکڑاتی جا رہی تھی۔ اس کے سرخ گالوں پر پسینے کے قطرے رکے ہوئے تھے۔

کھانے کے بعد ایک بڑی سی سرخ ریشمی پگڑی جوگندر سنگھ کے سر پر رکھی گئی اور سب لوگوں نے باری باری اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور 'سردار جوگندر سنگھ مبارک ہو' کہا۔

کسانوں کے پاس باتیں کرنے کو بہت کچھ نہیں ہوتا وہ بے علم' آنکھوں والے' سیدھے سادھے غیر دلچسپ اور قناعت پسند لوگ ہوتے ہیں جن کی زیادہ تر زندگی محض عمل اور حرکت سے عبارت ہوتی ہے۔ ان کے پاس وہ ذہانت نہیں ہوتی جس کی بدولت انسان مکمل طور پر مطمئن ہونے کے باوجود گفتگو کرنے کی خواہش محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ ناچ' کھانے اور مبارک باد کے بعد جب انہوں نے حقہ پینا شروع کیا اور تھوڑی دیر کے بعد دالان میں صرف گھر کے لوگ رہ گئے۔ باہر چولہے کے پاس کلدیپ کور اور اس کی ساس بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔

تیسرے دن گاؤں میں پولیس آئی۔ انہوں نے جوگندر سنگھ' کرم سنگھ اور خشونت سنگھ کو پکڑ لیا اور پنچایت والوں کو بلا کر گواہیاں لینے لگے۔ تینوں بھائیوں کو الف ننگا کر کے پیٹھ پر ڈنڈے مارے گئے اور پنچایت والوں کو گالیاں دی گئیں لیکن ایک بھی گواہی نہ مل سکیں۔

نیاز بیگ کے گھر دونوں عورتیں دھوپ میں کام کر رہی تھیں۔ ایک چرخہ کات رہی تھی اور دوسری لحاف تگند رہی تھی۔ چھوٹا لڑکا بھینس کو نہلا رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہو کر کانپتا ہوا آ کر ان کے پاس بیٹھ گیا تو بڑی عورت بولی:

''چھوٹی بھینس کو بھی نہلا دو۔ وہ بھی تمہاری پھوپھی کی ہے۔''

چھوٹی عورت نے چرخے پر نظریں اٹھا کر نرمی اور محبت سے اسے دیکھا۔ لڑکا جا کر چھوٹی بھینس کو نہلانے لگا جو حالانکہ بڑی تھی مگر چھوٹی عورت کی تھی اس لئے چھوٹی کہلاتی تھی۔ صبح کا سورج کمزور اور سرد تھا۔ سردی کی وجہ سے انسان چرند پرند سب دھوپ میں نکل آئے تھے اور فضا پُر رونق تھی۔

نیاز بیگ گھر میں داخل ہوا اور بات کئے بغیر بھوسے والے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے اور وہ معمول سے پہلے چلا آیا تھا۔ دونوں عورتیں کام چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے گئیں۔

''جاؤ...... کوئی پوچھے تو مت بتانا۔'' اس نے چہرہ بھوسے میں گاڑ دیا۔ ''جاؤ دروازہ بند کر دو۔'' اس کے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں اور سودائی آنکھوں میں سہم آ گیا تھا۔

چھوٹا لڑکا بھاگتا ہوا داخل ہوا۔ ''پولیس آئی ہے۔''

دونوں عورتوں نے جھٹ سے دروازہ بند کر دیا اور آگے چارپائی کھڑی کر کے اس پر لحاف پھیلا دیا۔ پھر دونوں صحن میں خاموش بیٹھ کر انتظار کرنے لگیں۔ ان کے گھر کا سارا کام رک گیا۔ صحن میں مرغیاں خوش دلی سے دانہ چگ رہی تھیں۔

نعیم نے کھیتوں کی طرف سے لوٹتے ہوئے مہندر سنگھ کو دیکھا جو فصل کی اوٹ میں کسی شئے پر کود رہا تھا۔ جب وہ فصل سے باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ مہندر سنگھ ایک بھینس کے ساتھ کشتی لڑ رہا تھا۔ وہ ہنسا۔

''آج کوئی لونڈیا نہیں ملی؟''

مہندر سنگھ نے کشتی جاری رکھی۔ وہ ہاتھ میں ایک اینٹ پکڑے اس مہیب الجثہ جانور سے زور آزمائی کر رہا تھا۔

''یہ اینٹ سے نہیں مرے گی۔'' نعیم نے کہا۔

''چپ رہو۔ سؤر۔'' وہ دانت پیس کر بھینس سے جٹ گیا۔ وہ بار بار اس کی گردن کو بازو میں لے کر اس کے ہونٹ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بھاری' سست اور طاقتور جانور ایک ہی زوردار جھٹکے سے اسے دور پھینک دیتا۔ وہ اٹھ کر دوبارہ اس پر لپکتا۔ اس کے سیاہ جسم کا ایک ایک پٹھا نمایاں ہو جاتا اور چہرے پر جنگلی جانوروں کی وحشت پھیل جاتی۔ اس کے کودنے سے پانی کی نالی ٹوٹ گئی تھی اور پانی کھیتوں میں جانے کی بجائے وہیں پر پھیل رہا تھا۔

آخر مہندر سنگھ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور بھینس کا منہ کھول کر اینٹ کی ایک زوردار ضرب سے اس کا دانت آدھا توڑ دیا اور چھلانگ لگا کر دور جا گرا۔

''پاگل ہو گئے ہو؟''

''تمہارے باپ ادھر آ رہے ہیں۔'' مہندر سنگھ گاؤں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''کون؟''

وہ صرف موٹی موٹی گالیاں دیتا رہا۔ ''ساری بھٹی میں سے ڈھونڈ کر یہ کھنگر نکالا۔ لوہے سے زیادہ مضبوط

ہے۔'' اس نے اینٹ کو کھڑی فصل میں پھینک دیا۔

اسی وقت فصل کے پیچھے سے دو سپاہی نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ آتے ہی انہوں نے بھینس کو کھولا اور مہندر سنگھ اور نعیم کو ڈنڈے مارتے ہوئے آگے لگا کر لے گئے۔

جوہڑ کے کنارے سکھوں کے سارے مویشی جمع جمع تھے اور تینوں بھائی اوندھے لیٹے جوتے کھا رہے تھے۔ اس قافلے کو آتے دیکھ کر تھانیدار کے پاس سے ایک سان اُٹھ کر بھاگا۔

''یہ میری بھینس۔ میری بھینس۔ یہی ہے۔ انہوں نے ہی میرے نوکر کو مارا ہے۔ میری بھینس قاتلو...... چورو...... سکھو۔''

مہندر سنگھ بھاگ کر بھینس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ''خبردار! تیری ماں کی زبان کھینچ لوں گا۔ یہ دیکھ...... یہ تیری ماں بوڑی میں نے منڈی سے خریدی تھی پوس میں۔ تیری بھینس بوڑی تھی؟'' اس نے ہونٹ اٹھا کر بھینس کا ٹوٹا ہوا دانت دکھایا۔

''یہ بدمعاش ہے' صاف۔'' کسان چلایا۔ ''ابھی اسے چھوڑ دو تو سیدھی میرے ڈیرے پر جائے گی۔ ابھی......''

''اور یہ میرا بیل لنڈا۔'' مہندر سنگھ نے دُم کٹے بیل کی ذرا سی دُم ہوا میں اٹھا کر سب کو دکھائی۔ پھر وہ بھاگ بھاگ کر سب مویشیوں کی خصوصیات بیان کرنے لگا۔ ''اور یہ میرا بیل کانا۔ اور یہ لیری مشکی۔ اور یہ گائے چوگان۔ اور یہ میری جھوٹی۔''

جب وہ تھانیدار کے قریب سے گزرا تو اس نے گھما کر ڈنڈا مہندر سنگھ کے کندھوں کے بیچ میں مارا۔

''لٹا دو اسے......''

سپاہیوں نے اسے ننگا کر کے اوندھے منہ لٹایا اور ڈنڈے مارنے لگے۔ دوسرے بھائیوں کے برعکس' جو خاموش تھے یا آہستہ آہستہ کراہ رہے تھے' اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ پھر چند منٹ کے بعد سپاہی مارتے مارتے رک کر پوچھتے تو جواب گالیوں میں ملتا۔

''اسے دھونی دو......'' تھانیدار گرجا۔

انہوں نے درخت کی ٹہنی سے اس کے پاؤں باندھ کر الٹا لٹکا دیا۔ پھر سرخ مرچ کو آگ دکھا کر اس کی ناک کے قریب لے گئے۔

''میں بتاتا ہوں۔ مجھے کھولو۔'' وہ گھبرا کر چلایا۔ جب انہوں نے دھواں پرے کیا تو وہ چھینکیں مارنے لگا۔ چھینکیں ختم کر کے خاموش ہوگیا۔ تھانیدار کے بار بار پوچھنے پر بھی چپکا لٹکا رہا۔ پھر اچانک اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر چیخا۔

''میں نہیں جانتا تیری ماں کو کون لے گیا......''

چند کسان لڑکے' جو کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے' ہنسنے لگے۔ اسے دوبارہ دھونی دی گئی۔ وہ لگاتار چھینکیں

مارنے اور بچوں کی طرح اونچی آواز سے رونے لگا۔

''مجھے اتارو...... میں بتاتا ہوں۔'' اس نے دہرایا۔ جب اتارا گیا تو وہ ناک اور حلق صاف کر کے روتا ہوا بولا: ''مجھے کچھ پتہ نہیں۔ کچھ پتہ نہیں۔''

تماش بین لڑکے پھر ہنسنے لگے۔ ''تھوڑا سا دارو پی لو۔ دھونی کچھ نہ کہے گی۔'' ایک نے کہا۔ مہندر سنگھ نے پلٹ کر اسے گالی دی۔

اسے پھر دھونی دی گئی اور وہ چلاّ تا چلاّ تا بے ہوش ہو گیا۔ شام کے وقت پولیس کوئی ثبوت برآمد کئے بغیر واپس چلی گئی۔

رات کو کچھ لوگ مزاج پرسی کی خاطر سکھوں کے ڈیرے پر گئے۔ کرم سنگھ کے دوستوں نے اس کی زخمی پیٹھ پر تیل کی پٹیاں رکھنی شروع کر دیں۔ باقی آس پاس بیٹھ کر حقہ پینے اور گپیں مارنے لگے۔ کلدیپ کور دالان کے کونے میں دہکتے ہوئے اپلے پر تیل اور لونگ کڑکڑا رہی تھی۔

''ہنہ...... عورت کی عورت۔'' جوگندر سنگھ داخل ہوا اور بیوی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ''ہمیں مار نہیں پڑی؟ تو جو بچہ جننے والی کی طرح ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا ہے۔''

ایک کسان نے ابلتے ہوئے تیل میں بھگو کر سوت کی پٹی جو کرم سنگھ کی پیٹھ پر رکھی تو وہ بلبلا اٹھا اور پٹی دیوار پر کھینچ کر ماری۔ ''لے جا اسے ماں کے پاس۔ میں نہیں لگواتا'' وہ بیٹھ کر کراہنے لگا۔

''ہنہ...... عورت کی عورت۔'' جوگندر نے دہرایا۔

''سئور......'' کرم سنگھ نے دانت پیسے۔ چند کسان ہنسنے لگے۔

چھریرے بدن کا ایک کسان گھٹنوں تک کیچڑ میں لتھڑا ہوا داخل ہوا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لمبوترے سیاہ چہرے والا آدمی تھا اور اس کے جسم پر صرف جانگیہ اور بنیان تھی۔ جوگندر سنگھ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''واہگرو کی فتح۔ رام سنگھ کیسے آئے؟''

جواب دینے کی بجائے رام سنگھ دیوار کے ساتھ گھسٹ کر بیٹھ گیا۔ جوگندر سنگھ اٹھ کر اس کے قریب گیا اور دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ یکبارگی جوگندر سنگھ کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہوئے اور وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا ''کب؟''

''کل۔ آدھی رات۔'' رام سنگھ نے کہا۔ مہندر سنگھ نعیم کے پاس سے اور کرم سنگھ چارپائی سے اٹھ کر ان سے جا ملے اور آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ سب کے رنگ سفید اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ مزاج پرسی کے لئے آئے ہوئے کسانوں نے اپنے اپنے حقے اٹھائے اور رخصت ہونے لگے۔

''آج رات کو...... آج ہی......'' جوگندر سنگھ نے کھڑے ہو کر گالی دی اور اعصابی انگلیوں سے پگڑی

ٹھیک کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

''کیا ہوا؟'' نعیم نے وہیں بیٹھے بیٹھے مہندر سنگھ سے پوچھا۔

''قتل ہو گیا۔''

''کون؟''

''ہمارا بھائی...... پچھیرا۔''

''کیوں؟''

''پانی لگا رہا تھا۔''

''پھر؟''

''زیادہ باتیں مت کرو۔ ہم آج ان کا صفایا کر دیں گے۔''

''کیسے؟''

''جیسے انہوں نے کیا۔ سمجھتے نہیں ہو؟''

''یہ تو مشکل ہے۔ نہیں؟''

''مشکل ہے؟'' مہندر سنگھ شرابی آواز میں چیخا۔ پھر چھاتی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا ''چلو گے؟ ہم اپنے دوستوں کے ساتھ ان کا بدلہ لینے جایا کرتے ہیں بزدل۔''

''بکو مت۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔'' نعیم نے کہا اور باہر نکل آیا۔

رکھوالی کے لئے فصل میں سونے کی آج اس کی باری تھی۔ وہ شیشم کے پیڑ پر مچان میں دبکا ہوا لحاف کے اندر گھٹنے سینے سے لگائے سو رہا تھا کہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک سایہ نیچے کھڑا اس کی پسلی میں بلم کی نوک چبھو رہا تھا۔

''کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم جا رہے ہیں۔''

وہ نیچے اتر آیا۔

''تمہارے پاس کچھ ہے؟''

''نہیں۔''

''آؤ۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔'' مہندر سنگھ نے بھاری آواز میں کہا۔ کیکر کی شراب کی تیز بو نعیم کی ناک میں گھسی۔ اندھیرے میں بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے انہوں نے دوسروں کو جالیا۔ یہ مہندر سنگھ کے تینوں بھائی کلدیپ کور اور اس کی ساس تھے۔ مردوں کے بدن پر ایک ایک لنگوٹ تھا اور ان کے تیل ملے ہوئے سیاہ جسم اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ عورتوں نے سروں پر ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں۔

''عورتوں کو لے کر لڑنے جا رہے ہو۔'' نعیم نے پوچھا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔

وہ خاموشی سے سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ مغرب کی سمت بڑھتے رہے۔ فصلوں کو پانی دیا جا رہا تھا۔ پچھلی رات کی سرد' بوجھل ہوا کے ساتھ ہی تیل' شراب اور گیلی مٹی کی ملی جلی بو بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ گندم کی نوعمر بالیوں میں نرم' ریشمیں دودھ بھرے دانے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ نہر کی پٹڑی پر چڑھ آئے۔ بادلوں کی تاریکی میں صرف بہتے ہوئے پانی کا دھیما شور سنائی دے رہا تھا۔

ایک جگہ مہندر سنگھ رُک گیا۔ ''یہاں......'' اس نے بلم کے پھل سے کھیت کے ٹوٹے ہوئے کنارے کو چھوا جہاں پانی ایک چھوٹے سے گڑھے میں جمع ہو گیا تھا۔ ''یہاں پر وہ پانی لگا رہا تھا۔''

''انہوں نے پانی کیوں توڑا؟'' نعیم نے پوچھا۔

''انہیں نہیں ملا تھا۔''

''یہ تو کوئی وجہ نہیں۔''

''سئور۔ ایک بیلچے سے مر گیا۔''

''چپ رہو۔'' جوگندر سنگھ دانت پیس کر نیچی آواز میں چیخا۔

وہ دریا پر کھڑے تھے۔ تین آدمی کنارے پر سے ہٹ کر گھاس پر لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ تینوں سکھ بھائیوں نے ایک ساتھ ان کے لحاف جھٹک کر دور پھینکے اور بلموں کے پھل سوئے ہوئے آدمیوں کے سینوں میں اتار دیئے۔ مہندر سنگھ نے بلم نعیم کو پکڑایا' لپک کر ماں کی ٹوکری سے تلوار نکالی اور ایک ایک وار میں ان کے سر جدا کر دیئے۔ وہ آواز نکالے بغیر مر گئے۔ نعیم بلم پکڑے دریا کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور حلق میں سے گرمی نکل رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے کپکپاہٹ جو اس پر طاری تھی سارے بدن پر پھیل گئی۔

مردوں نے چارہ کاٹنے والے ٹوکوں سے مرے ہوئے آدمیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کئے اور عورتوں نے ٹوکریوں میں بھر بھر کر انہیں دریا میں بہا دیا۔ پھر انہوں نے لالٹین جلائی اور خون آلود زمین کو کدال سے کھودا۔ پھر کلدیپ کور اور اس کی ساس نے بڑی پھرتی اور صفائی سے مٹی ٹوکریوں میں لاد لاد کر دریا میں بہا دی۔ زمین کو ہموار کرنے کے بعد وہ خاموشی سے واپس لوٹے۔ نعیم کو اپنے منہ میں خون کا مزا محسوس ہونے لگا۔ اس نے کھنکار کر تھوکا اور اسے لگا کہ اس نے بہت سے پتھر کھا لئے ہیں جو اس کے معدے میں جا کر بیٹھ گئے ہیں۔

آخری تاریخوں کا کمزور سا چاند بادلوں میں سے ظاہر ہوا اور مہندر سنگھ کی آنکھیں' جو شراب اور خون کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں' نظر آنے لگیں۔ اس نے چلتے چلتے ہاتھ بڑھا کر کلدیپ کور کے سینے پر پھیرا۔ لڑکی ہونٹ چبانے لگی۔ نیم تاریک رات میں وہ سایوں کی طرح سبز ریشمی فصلوں کے بیچوں بیچ چلتے رہے۔

چارے کے ایک کھیت پر پہنچ کر مہندر سنگھ رک گیا۔

''بوڑی کے لئے چارہ نہیں ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''اور تیرا کیا ارادہ ہے اب' ہیں؟'' جوگندر سنگھ غصہ دبا کر بولا۔

''چارا کاٹوں گا۔''

''بے وقوف مرے گا؟ تیری عقل کہاں گئی ہے؟''

''اور تیری ماں بوڑی بھوکی مر جائے؟'' مہندر سنگھ بلم کا پھل گیلی زمین میں گاڑ کر بولا۔

''آہستہ بول' جانور۔ چاروں طرف لوگ کھیتوں کو پانی لگا رہے ہیں۔ چل''

''جاؤ......'' مہندر سنگھ چلاّیا۔ ''میں چارہ لے کر آؤں گا۔''

اس کی آواز بند کرنے کے لئے سب جلدی سے روانہ ہوگئے۔

''تو کہاں جارہی ہے؟'' مہندر سنگھ بلم کا چوبی دستہ کلدیپ کور کے پیٹ میں گاڑ کر بولا۔ ''خاوند کے ساتھ سونے کے لئے اب کوئی وقت نہیں۔ چل' چارہ کٹوا۔''

جوگندر سنگھ کھیت کے کونے پر جا کر رکا' چند منٹ تک اندھیرے میں اپنی بیوی اور بھائی کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا' پھر زیرلب گالیاں دیتا ہوا چلا گیا۔

پگڑی میں اڑسی ہوئی درانتی نکال کر مہندر سنگھ نے کھیت کے درمیان سے چارہ کاٹنا شروع کیا اور مشین کی سی تیزی سے بہت سی جگہ خالی کردی۔ کلدیپ کور گٹھے باندھ باندھ کر ٹوکری میں بھرتی گئی۔ سبز نمدار چارے کی بو ان کے اردگرد منڈلا رہی تھی۔ رات تاریک اور سرد تھی۔ بادلوں نے ہوا تقریباً بند کر رکھی تھی اور ساری کائنات ایک بہت بڑے سیاہ گولے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ دریا کا ہلکا شور دور سے ان کے کانوں میں آ رہا تھا۔ ایک سایہ کھیت کے کونے پر نمودار ہوا اور مہندر سنگھ لیٹ گیا۔

''لیٹ جا۔'' اس نے سرگوشی کی۔ کلدیپ کور لیٹ گئی۔ نیم تاریکی میں اس کا ابھرا ہوا سینہ مہندر سنگھ کو نظر آ رہا تھا۔ سایہ' جو کوئی پانی لگانے کو جاتا ہوا کسان تھا۔ ہاتھ میں کدال پکڑے خاموشی سے گزر گیا۔

''تیرا سینہ چارے کے اوپر دکھائی دے رہا تھا۔ اوندھی لیٹا کر۔'' مہندر سنگھ نے کہا ''اگر دیکھ لیتا ماں کا یار تو......''

''تو ایک اور سہی۔'' کلدیپ کور نے کہا۔ ''تمہارا بلم تو ابھی ثابت ہے۔''

''بک بک مت کر...... اِدھر آ۔''

وہ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''چلو چلیں۔ سویر ہونے والی ہے۔''

مہندر سنگھ نے اس کے سخت سینے پر ہاتھ رگڑا۔

''جانور......'' وہ اندھیرے میں چیخی۔

''تھک گیا ہوں۔'' اس نے باہیں پھیلا کر سرد چارے پر لوٹ لگائی۔

''مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''اِدھر آ''

وہ اس کے برابر لیٹ گئی۔

''اب بھی سردی لگتی ہے؟'' مہندر سنگھ نے اسے کس کر اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ ''بتا۔ اب بھی لگتی ہے؟''

''نہاتے نہیں ہو۔''

''نہیں......''

''تمہارے سر سے بو آرہی ہے۔''

''حرام زادی۔''

''مت دبا۔'' وہ دانتوں کے درمیان سے چیخی۔ ''میری سانس رک رہی ہے۔''

وہ ہنسا۔ ''میں اور بھی زور سے دبا سکتا ہوں۔''

''سؤر۔ تم مجھ سے زیادہ زور آور نہیں ہو......''

''میں سب سے زیادہ زور آور ہوں۔'' وہ ہنسا اور ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں پھنسا کر چارے پر لوٹنے لگا۔ ایک دوسرے سے جڑے دونوں دور تک لوٹتے ہوئے چلے گئے۔ نرم سبز چارہ ان کے نیچے دبتا اور سر اٹھاتا رہا۔

''جانور۔ بیل کی اولاد۔ چھوڑ مجھے۔'' وہ رک رک کر بولی۔

''میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوں۔''

''جوگندر تم سے زیادہ زور آور ہے۔''

''تیری ماں کا یار وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے؟''

''اس نے آج سب کاٹے ہیں۔''

''حرام زادی۔'' اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

''غلط ہے یہ؟''

''سؤرنی، تیرے باپ تجھے جوان کا رونا روتی ہے؟'' تھوک اس کے نرخرے میں اٹک گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''رات حرام کردی۔''

اس نے بلم اٹھا کر چارے کے ڈھیر پر مارا۔ پھل دوسری طرف نکل گیا۔ کلدیپ کور نے بال سمیٹ کر جوڑا بنایا، بلم نکال کر اسے پکڑایا اور ٹوکری اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ کافی دیر تک خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد مہندر سنگھ نے اونچی آواز سے گانا شروع کردیا۔

''کوئی سن لے گا۔'' کلدیپ کور نے کہا۔ وہ گاتا رہا۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو صبح کا ستارہ منڈیر کے پاس چمک رہا تھا اور اس کی ساس لکڑی کی بالٹی اٹھائے گائے دوہنے کے لئے جا رہی تھی۔

''اتنی دیر لگا کر آئی؟''

''اپنے بیٹوں کو تھوڑا دیا کرنا کھانے کو۔ کتے کی طرح ہر وقت تنگ کرتے ہیں۔'' اس نے کہا اور سیدھی کھاٹ پر چلی گئی۔

(۷)

کٹائی شروع تھی۔ روشن پور کا ہر فرد اور ہر جانور کام میں مصروف تھا۔ صرف پرندے اسی طرح آوارہ نکمے اڑ رہے تھے۔ کڑکتی دھوپ اور لُو کی وجہ سے کسانوں کے جسم سیاہ ہو گئے تھے اور عورتوں کی مٹکیوں میں گھی ختم ہو چلا تھا کہ ہر کٹائی کرنے والے کو پاؤ سیر مکھن روٹی پر لگانے کو چاہیے تھا۔ چوپایوں کی پسلیاں نکل آئی تھیں۔ عورتوں کے چہروں اور ہاتھوں پر خشکی کے سفید دھبے پڑ گئے تھے اور ان کے بال کھردرے ہو چکے تھے۔ بچوں کی ٹانگیں پتلی اور پیٹ بڑھ گئے تھے اور یہ حالت ہر جاندار کی مشقت اور زندگی کی سختی کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔

لیکن کسان اپنے گہرے شکن آلود چہروں اور دھنسی ہوئی آنکھوں اور گالوں کے باوجود ایک سو بیس درجے کی گرمی میں کام کرتے ہوئے خوش تھے کیونکہ سامنے ان کی بھاری' پکی ہوئی فصل کھڑی تھی۔ وہ درانتیاں چلاتے ہوئے' اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے مذاق میں گالیاں دیتے ہوئے سنہری میٹھی گندم کاٹ کاٹ کر ڈھیر کرتے جاتے تھے۔

کٹائی کے تیسرے دن زیادہ تر کھیت صاف کئے جا چکے تھے اور جگہ جگہ کاٹی ہوئی فصل کے انبار لگے تھے۔ گاؤں کا ہر بشر کام کرنے کو کھیتوں میں نکل آیا تھا۔ عورتوں کے رنگ برنگ کپڑوں اور مردوں کے کالے جسموں کا سیلاب ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور ایک اندرونی مسرت کا دھارا تھا جو کسانوں کی آنکھوں اور ہاتھوں سے پھوٹا پڑتا تھا کہ یہ ان پڑھ لوگ قہقہہ لگا کر ہنسنا نہیں جانتے۔ ان کی خوشی حرکت اور عمل سے واضح ہوتی ہے۔

مہندر سنگھ کے کھیت پر پہنچ کر نیاز بیگ نے رسیوں پر جسم کا سارا بوجھ پھینک کر بیلوں کو روکا اور گاڑی پر بیٹھا بیٹھا بولا۔

''میں کل بھی آیا تھا۔''

مہندر سنگھ کھیت میں سے اٹھ کر آیا اور گاڑی کی ہتھی پر کہنی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''واہگرو چوہدری' کیا بات ہے؟''

''اللہ کرم کرے۔ تمہاری آنکھ کیوں سرخ ہو رہی ہے؟''

''پسینہ پڑ گیا ہے۔ پسینہ تو مادر چود لسی کی طرح بہتا ہے۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ فضا میں مٹیالے رنگ کی دھوپ اور میلا سا غبار بکھرا ہوا تھا۔ آسمان پر چیلیں زبانیں نکالے اڑ رہی تھیں اور چاروں طرف سے امڈتی ہوئی گرمی اور حبس زمین پر مرکوز تھا۔

''طوفان کے آثار ہیں۔'' اس نے گالی دی اور درانتی کے دستے سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ''میں مطلب

سے آیا تھا۔'' نیاز بیگ نے کہا اور داڑھی کھجانے لگا۔ پھر اسے چھوڑ کر بیلوں کی پشت پر انگلیاں بجانے اور سر اٹھا کر چیلوں کو دیکھنے لگا۔

''واہگرو۔ چوہدری کیا بات ہے؟''

''تمہارے جگہ ہے؟''

''کیسی جگہ؟''

''ہمارا غلہ شاید کچھ بچ رہے۔''

مہندر سنگھ نے پگڑی میں سے لٹکتی ہوئی بالوں کی لٹ کو پکڑ کر درانتی سے کاٹا اور انگلیوں میں مسل کر نیچے گرا دیا۔

''پتہ نہیں۔ ہماری اپنی فصل بہت ہے اس بار۔ پتہ نہیں۔''

''میں منشی کے پاس گیا تھا۔ وہ آدھے پر رکھتا ہے۔ تم میرے بیٹے کے دوست ہو۔ تمہارا دالان بڑا ہے۔''

''رکھ دینا۔ رکھ دینا۔ میں بھوسے پر سو جاؤں گا جاڑے میں۔'' مہندر سنگھ نے کہا۔

''ہاں ہاں میرا بیٹا تمہارا دوست ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

نیاز بیگ نے رسیوں کو ڈھیل دی' پھر کھینچ لیا۔ ''جب میں سزا پر گیا تو تمہارے باپ کو ایک بیل دے گیا تھا۔ تمہارا باپ مر گیا۔ بیل کا پتہ نہیں کیا ہوا۔'' وہ رکا' پھر شرمندگی سے ہنسا۔ ''میں کوئی واپس تو نہیں مانگتا۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ میرا دوست تھا آخر۔'' وہ رسیاں بیلوں کی پیٹھ پر مارنے لگا۔

''یہ نہیں چلیں گے چوہدری۔'' مہندر سنگھ ہنسا۔ ''انہیں تھوڑی سی دارو پلا۔''

نیاز بیگ غصے میں آ کر بیلوں کو بے تحاشا پیٹنے لگا۔

اگلے کھیت میں ڈھول بج رہا تھا اور کٹائی کی دھن پر کسان درانتیاں چلا رہے تھے۔ دو میراثی ننگے بدن پسینے سے شرابور کھیت کے وسط میں کھڑے ڈھول پیٹ رہے تھے۔ یہ کٹائی کی مخصوص دھن تھی۔ اس سے بجانے والے اور سننے والے کا خون ابل کر بازوؤں میں آ جاتا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر درانتی چلاتا جاتا تھا۔ میراثی آنکھیں میچے دو دو گھنٹے تک ڈھول بجاتے رہتے اور کسان اس کی دھن پر مست بغیر سانس لئے ہاتھ چلاتے جاتے۔ یہ ایک اور تین کی تال تھی اور درانتی کے چلاؤ کے لئے مخصوص تھی۔ درانتی تین بار چھوٹے چھوٹے جھٹکے کھاتی اور چوتھی بار بڑا جھٹکا کر ررر...... اور خشک تڑ تڑ کرتے پتلے نازک گندم کے پودوں کا گٹھا ہاتھ میں آ جاتا اور پھر تال کا چکر شروع ہوتا۔ دھم دھم دھم دھما دھم۔ کرر کرر کرر کررر...... کسان پاؤں پر بیٹھے بیٹھے چلتے جاتے اور چھوٹے چھوٹے گٹھے چھوڑتے جاتے۔ پسینہ ان کے ماتھے سے' گردن سے' بغلوں سے ٹپکتا اور زمین میں جذب ہو جاتا۔ بھوکی اور کمزور زمین پسینے سے سیراب ہوتی اور فصل ان کے حوالے کر دیتی۔ چھ ماہ پہلے یہی زمین سیاہ' طاقتور اور گیلی تھی اور ننھے ننھے سبز پودوں کو مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھی۔ پانچ ماہ بعد پھر یہ سیاہ اور طاقتور ہو جائے گی لیکن اس وقت

کسانوں کے بدن سیاہ تھے اور زمین سفید اور کمزور تھی اور اپنے بچوں کو پال کر مالک کے حوالے کر رہی تھی۔

''در در در سئور...... ست ہوگیاہ...... ہلا پوتی کا ہلا لا لا لا......'' وہ جانوروں کی بولی بول بول کر ایک دوسرے کو اکساتے اور دھم دھم دھم دھما دھم...... کر کر کر ررر...... شریف' محنت کش ہاتھوں میں درانتیوں کی قطار ایک تال پر جھولتی فصل کی جڑوں پر ناچنے لگتی۔

جب سورج سر پہ آیا تو گاؤں کی طرف سے رنگ برنگے کپڑوں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ بوڑھی جوان سبھی عورتیں سر پہ لسی کے مٹکے اور گھی سے تر بتر باجرے کی روٹیاں اٹھائے گھروں سے نکل پڑیں۔ وہ اکیلی دکیلی اور غولوں میں آئیں اور مختلف کھیتوں میں پھیل گئیں۔ ان کے باریک کُرتے پسینے سے کمر' پیٹ اور چھاتیوں پر چپٹے ہوئے تھے۔ بال اکٹھے کر کے انہوں نے جُوڑے باندھ رکھے تھے اور بڑی جوان چال چلتی' لالچی نظروں سے اپنے مردوں کو دیکھتی چلی آ رہی تھیں۔ اپنے اپنے کھیتوں پر پہنچ کر انہوں نے کھانا رکھا اور جگہ جگہ سے چھوٹے گٹھے اٹھا کر جمع کرنے لگیں۔ میراثیوں نے ڈھول بجانے والی سونٹیوں سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور درختوں کے ٹھنڈے سائے کی طرف لوٹے۔ کٹائی کرنے والے دکھتے ہوئے گھٹنے اور دھنسے ہوئے پیٹ لے کر اٹھے اور بھوکے جبڑوں کے ساتھ روٹی پر پل پڑے۔

''تو بنا سر چپڑے نہیں رہ سکتی۔'' مہندر سنگھ نے دونوں گالوں میں روٹی بھر کر کھاتے ہوئے کلدیپ کور سے کہا۔

''تجھے کیا۔ تجھے تو پورا گھی ملتا ہے۔''

''اور تو اپنی ماں کا گھی سر پر لگاتی ہے؟'' وہ چیخا۔

''چپ رہ۔ بھیڑیے۔'' جوگندر سنگھ نے کہا۔''سب اپنی اپنی ماں کا گھی کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مت لڑو۔'' تینوں ہنسنے لگے۔

پھر انہوں نے کٹورے بھر بھر کے لسی کے پیے اور واپس کام میں جا کر جٹ گئے۔

سورج ڈھل رہا تھا تو مغرب کی طرف سے بادل اٹھے اور تیزی سے آسمان پر پھیل گئے۔ کسانوں کی فکر مند نگاہیں آسمان پر بھٹکنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں دن بھر کی مسرت اور سکون کی بجائے خوف کی جھلک لہرا گئی۔ بیل گاڑیاں بھگا کر وہ گاؤں سے تمام بوریاں اور ترپالیں لائے اور ان سے کٹی ہوئی فصل کو ڈھک دیا۔ جو بچ رہی اسے گاڑیوں پر لاد کر گھر لے چلے۔

''اسے قصائی کو دے دو۔ آج یہ نہیں چلتے۔'' مہندر سنگھ بیلوں کو چلاتے ہوئے پکارا۔

''نہیں چلتے؟ ان کی ماں......'' فقیر دین نے پورے زور سے رسیوں کو کھینچا جس سے اس کے بیلوں کی آنکھیں ابل پڑیں۔ پھر ڈھیل دی' وہ آگے کو جھول گئے۔ پھر کھینچا' پھر ڈھیل دی۔ بیلوں کے نتھنے پھڑ پھڑائے' مونچھیں ہوا میں لہرائیں' پٹھے اکڑے اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ دوڑ پڑے۔

''الا لا لا لاہ۔'' فقیر دین برابر پہنچ کر للکارا۔ مہندر سنگھ نے بھی اسی آواز میں جواب دیا اور بیلوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کچی سڑک پر دونوں کی گاڑیاں بھاگنے لگیں۔ بغیر اعلان کے دوڑ شروع ہوگئی۔ دیہاتوں میں ایسے مقابلے روز مرہ کی بات تھی اور ان میں بہت کم باقاعدہ اعلان جنگ کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ اب دونوں طرف سے ''الا لا لاہ......'' کی مخصوص رٹ اُٹھ رہی تھی۔ یہ اونچی' کرخت بھیڑیوں کی سی آواز تھی جو دونوں فریق جوش اور غصے میں آ کر نکال رہے تھے اور چھڑیاں اور رسیاں اور گیہوں کے ناڑ بیلوں کی پسلیوں پر مارتے جارہے تھے۔ راستے میں جاتے ہوئے کسان انہیں دیکھتے اور رستہ چھوڑ دیتے۔ جوشیلے لڑکے ایسی ہی آوازیں نکال کر ان کی ہمت بڑھاتے۔ گاڑیاں کچی سڑک کے گڑھوں اور پتھروں پر اچھلتی' بیٹھتی' چرچراتی' گرد وغبار کا طوفان اٹھاتی ہوئی بھاگ رہی تھیں اور اوپر ہر دو فریق کے بہی خواہ گاڑی کے ڈنڈوں سے لپٹے ہنکارے مار رہے تھے۔

''اوپر برکھا آرہی ہے اور لونڈوں کو مستی سوجھی ہے۔'' جلدی سے رستہ چھوڑتا ہوا ایک بڈھا کسان بھوؤں میں جھلایا۔ گاڑیاں کھڑکھڑاتی ہوئی اس کے پاس سے نکل گئیں اور وہ سر سے پاؤں تک گرد میں اٹ گیا۔

جوہڑ کے کنارے پہنچ کر مہندر سنگھ نے گاڑی ٹھہرائی اور مڑ کر تہبند نکال دیا۔

''الا لا لاہ۔ واہگرو......'' فتح اور غرور کے نشے میں وہ فقیر دین کے رستے میں کھڑا ہو کر ناچنے لگا۔ فقیر دین نے گنجی آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور نفرت سے اس کی طرف تھوکتا ہوا نکل گیا۔ کلدیپ کور اندر سے نکلی اور شرم سے لال ہو کر واپس چلی گئی۔

رات بھر وہ جاگتے اور فصلوں کے گرد پھرتے رہے۔ پچھلی رات مطلع صاف اور پُرسکون ہوگیا۔ طوفان خاموشی سے گزر چکا تھا۔ کسان اگلا دن شروع کرنے سے پہلے دو گھڑی آرام کرنے کی خاطر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ سویرے ایک اور طوفان ان کی راہ دیکھ رہا تھا۔

سورج ہاتھ بھر بھی اوپر نہیں آیا تھا لیکن دن میں دوپہر کی تپش آ چلی تھی۔ صبح کی تازہ' سبک ہوا کے ساتھ دھوپ کچی منٹیوں اور بھورے وسیع کھیتوں پر پھیل چکی تھی۔ نیلے رنگ کا غبار جو تین روز تک گاؤں پر منڈلاتا رہا تھا بادل اور ہوا کے گزرنے کے ساتھ چھٹ چکا تھا۔

فضا پہاڑی جھرنے کی طرح کھنکتی ہوئی شفاف تھی اور آخر مئی کے سفیدی مائل نیلے آسمان پر پُرشکم پرندے آزادی سے اڑ رہے تھے۔ دھوپ بڑی آہستگی سے گلیوں میں داخل ہوئی اور بیلوں کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ انہیں کھیتوں کو لے جاتے ہوئے کسان ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ گھنٹیوں کی کھنک اور کسانوں کی آوازیں صبح کی دھوپ کی طرح گرم' شفاف اور جاندار تھیں۔ نکھری نہائی ہوئی فضا میں آک کی سفید روئی کی ''بڑھیاں'' اڑ رہی تھیں اور چند بچے شور مچاتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

جوہڑ کے کنارے پہنچ کر ساری آوازیں یک بیک رک گئیں۔ صرف بچوں کے چلّانے کا شور دور سے آتا رہا۔ نیاز بیگ باہر نکلا اور گھبرا کر واپس گھر میں گھس گیا۔ بھوسے کے ڈھیر میں چہرہ گاڑ کر وہ عورت سے بولا:

’’کواڑ بند کردو۔ تالا لگا دو۔ چھپر پر پڑا ہے۔ کسی کو مت بتانا۔ یہاں پر کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔ سنا؟ جاؤ......‘‘ پسینہ اس کی سیاہ گردن پر دھاریاں بناتا ہوا گندے کالر میں جذب ہو رہا تھا۔

نعیم باہر نکلا۔ شیشم کے بڑے پیڑ کے نیچے دس بارہ فوجی ٹرک اور لاریاں کھڑی تھیں۔ تین گورے سارجنٹ اور دو گورے فوجی افسر کسانوں اور بیلوں کے ہجوم کے سرے پر حرکت کر رہے تھے۔ ان کے پاس مہندر سنگھ کی بیل گاڑی دونوں ڈنڈے آسمان کی طرف اٹھائے کھلی کھڑی تھی۔ پولیس کے سپاہی ہر طرف سے کسانوں کو گھیر کر لا رہے تھے۔

ایک انگریز سارجنٹ نے شستہ اردو اور بھاری‘ کرخت فوجی لہجے میں ہجوم کو مخاطب کیا۔ ’’اپنے ملک‘ اپنی حکومت کی حفاظت کرنے کا فرض ہر فرد پر عائد ہوتا ہے۔ جنگ تمہارے ملک اور تمہاری حکومت کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔‘‘

ہجوم پر سناٹا طاری تھا۔ کبھی کوئی بیل سینگ جھٹک کر پھنکارتا اور اس کی گھنٹی کی آواز ایک لمحے کے لئے سکوت کو توڑ دیتی۔ سارجنٹ نے اپنے زرد چہرے پر آہستگی سے ہاتھ پھیرا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

’’جنگ جیتنے کے لئے ہمیں جوانوں کی ضرورت ہے۔ جس کے پاس زیادہ جوان ہوں گے وہ حکومت جنگ جیتے گی۔ ہمارے ملک میں لاکھوں جوان ہیں۔‘‘ اس نے رک کر ہاتھ پھیلایا۔ ’’ان کی مدد سے ہم ضرور فتح حاصل کریں گے۔ جوانوں کو چاندی کے سات شاہی سکے ماہوار دیئے جائیں گے اور راشن وردی کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔ جنگ ختم ہونے پر جوان واپس آ جائیں گے۔‘‘ ’’واپس آ جائیں گے......‘‘ بڈھا رحمت طنز سے ہنسا۔ ’’جنگ میں اب خون ہونا بند ہو گیا ہے۔ ہم تماشے پر جا رہے ہیں ایں؟‘‘

سارجنٹ کے ہونٹ کانپے۔ ’’ہم بوڑھوں کو نہیں لے جائیں گے۔ جوان اپنا نام دیں۔‘‘

مجمعے میں سے شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ اٹھی۔ درمیان میں دو لڑکے باتیں کرنے لگے۔

’’لڑائی کہاں ہو رہی ہے؟‘‘

’’پتہ نہیں۔‘‘

’’لڑائی ہو کہاں رہی ہے۔ ہاں۔‘‘

اگلی صف میں کھڑے ہوئے مہندر سنگھ نے سارجنٹ کو مخاطب کیا۔ ’’ہاں لڑائی کہاں ہو رہی ہے؟‘‘ بھنبھناہٹ تیز ہو گئی۔

’’خاموش۔‘‘ سارجنٹ نے ہاتھ پھیلایا۔ ’’جنگ انگلستان کو دھمکی دے رہی ہے۔ انگلستان کو دھمکی دے رہی ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کی حکومت۔ حکومت برطانیہ کو بچانے کے لئے آپ کی ضرورت ہے۔ جوان اپنا نام دیں۔‘‘

’’ہم کٹائی پر جا رہے ہیں۔‘‘ بیچ میں سے آواز آئی۔

’’کٹائی ختم کر کے جائیں گے۔‘‘

''فصل باہر پڑی ہے ابھی۔'' مہندر سنگھ اگلی صف میں سے بولا۔

سارجنٹ نے ایک نظر مڑ کر انگریز فوجیوں کو دیکھا' پھر مضبوط آواز میں بولا: ''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں سارے ضلع میں جانا ہے۔ اپنے نام دو۔''

ہجوم میں جنبش پیدا ہوئی۔ کسان اپنے اپنے بیلوں کے ساتھ جسم رگڑنے لگے۔ مختلف جگہوں سے چند دبی دبی آوازیں آئیں۔ ''ہم کیا کھائیں گے؟'' ''فصل کو گیدڑ اُٹھائیں گے۔ ہیں؟'' ہم نہیں جائیں گے۔''

''سارے برس ہم نے سوروں کے لئے محنت کی؟''

''دیکھو۔ ہمارے ہاتھ دیکھو۔'' پیچھے کھڑے ہوئے ایک کسان نے سیاہ' خشک تڑ کا ہوا ہاتھ پھیلایا۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے اس کا گانٹھ دار' پرانے سوکھے ہوئے چمڑے والا ہاتھ دیکھا لیکن سارجنٹ مڑ کر فوجیوں کو دیکھ رہا تھا۔

لمبے' پتلے چہرے والے فوجی افسر نے جیب سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا' الٹ پلٹ کر دیکھا' اور اپنے ساتھی کو پکڑا دیا۔ پھر وہ تیز تیز چل کر رکی ہوئی گاڑی پر جا چڑھا اور وزن قائم رکھنے کے لئے ایک بازو پھیلا کر تیز لہجے میں بولا۔

''اپنی فصلیں اب تم اس سے کاٹو گے۔ اور میدان جنگ میں کاٹو گے۔'' یہ کہہ کر اس نے سنگین ہوا میں لہرائی۔ چمکتے ہوئے فولاد پر سورج کا عکس پڑا اور بیلوں نے بدک کر سینگ جھٹکے۔ پھر اس نے ماہر فن کی طرح سنگین گاڑی کے فرش پر پھینکی جو جا کر لکڑی میں گڑ گئی۔

''سپاہیوں کو حکم دو جوانوں کو پیش کریں۔'' اس نے سارجنٹ سے کہا۔

سنگین لگی رائفلوں سے جوانوں کو ہانکا جانے لگا۔ بعض کسانوں کو پسلیوں میں رائفلوں کے دستے اور سنگینیں چبھو چبھو کر بیلوں سے علیحدہ کیا گیا لیکن وہ بچوں کی طرح ان کی گردنوں اور سینگوں سے لپٹے ہوئے دبی دبی زبان میں گالیاں دیتے رہے۔ نعیم خاموشی سے چلتا سارجنٹ کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''میرا نام لکھو۔'' اس نے انگریزی میں کہا۔

سارجنٹ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ''تم تعلیم یافتہ ہو؟''

''میں نے کلکتہ سے سینئر کیمبرج کیا ہے۔''

''اور اب کٹائی کو جا رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''جاؤ۔'' سارجنٹ کاغذات پر جھک گیا۔

''میں محاذ پر جاؤں گا۔''

سارجنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔ ''تم اس کے لئے موزوں نہیں ہو۔ جاؤ۔'' پتلے

چہرے والا افسر قریب آ کھڑا ہوا۔ نعیم نے غیر یقینی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ایک شدید اندرونی خواہش کے زیر اثر بولا۔ ''میں سواری کر سکتا ہوں۔ رائفل چلا سکتا ہوں۔ ان سب سے بہتر لڑ سکتا ہوں۔''

''ٹھہرو۔ بھرتی ختم ہونے دو۔'' افسر نے آہستہ سے کہا۔

وہ وہیں کھڑا سروں کے اوپر اوپر مغرب کی طرف دیکھنے لگا جہاں دھوپ میں چمکتے ہوئے کھیت تھے اور گیہوں کے بھاری خوشے شرابیوں کی طرح ہوا میں جھوم رہے تھے۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصل کے انبار بڑے بڑے مردہ کچھوؤں کی طرح سنسان کھیتوں میں پڑے تھے اور ایک اکلوتی سیاہ گھوڑی ان کے درمیان پھر رہی تھی۔ آسمان پر چیلیں زبانیں نکالے چیخ رہی تھیں اور دوپہر کی گرم ہوا کھیتوں میں، کھلیانوں میں، فصلوں میں اور کسانوں کے پسینے کی منتظر خشک نیالی زمینوں میں سرسرا رہی تھی۔ نعیم کا اپنا کھیت اس کی پشت پر تھا۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے مڑا، پھر رک گیا اور سوئی سوئی نظروں سے اچھلتے کودتے ہوئے، دھکم پیل کرتے اور گالیاں دیتے پسینے اور گرد میں اٹے ہوئے ہجوم کو دیکھنے لگا۔ دو گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد صرف دو نو عمر لڑکے جن کے ماں باپ مر چکے تھے، بھرتی کیے جا سکے۔ پتلے چہرے والا فوجی افسر جو نمایاں طور پر غصے میں تھا، نعیم کی طرف مڑا:

''ہمیں تعلیم یافتہ لوگوں کی نہیں، کسانوں کی ضرورت ہے۔ بہتر ہے تم یہیں ٹھہرو یا محکمہ تعلیم میں نوکری کر لو۔''

''میں کسی محکمہ میں نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسان ہوں۔'' نعیم نے کہا۔

افسر نے اُکتا کر اسے سارجنٹ کے حوالے کیا اور پرے چلا گیا۔ ایک ہندوستانی حوالدار نے اس کا نام، والدین، مذہب، پیشہ، عمر، قد اور شناختی نشان درج کیے اور کاغذات اس کے ہاتھ میں تھما کر دوسرے دو لڑکوں کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

وہ رات ان تینوں نے ملٹری ٹرک میں گزاری۔ رات گئے تک وہ بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ پھر نو عمری کی نیند ان پر غالب آ گئی اور وہ ایک ایک کر کے سو گئے۔ اگلی صبح انگریز افسر جو راتوں رات گاڑی لے کر کہیں چلا گیا تھا، لوٹا۔ اس کے ساتھ روشن آغا تھے۔ وہ فوجی گاڑی کی اگلی سیٹ سے اتر کر حویلی تک آئے اور وہیں کھڑے کھڑے جوانوں کو اکٹھا کرنے کو آدمی دوڑا دیے۔ ان کی آواز پر دیکھتے دیکھتے گاؤں کے تمام نوجوان، بوڑھے اور بچے حویلی کے میدان میں جمع ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد روشن آغا کی شکل دیکھ کر انھوں نے اپنی مسرور، گونگی، وفادار آنکھوں سے خوش آمدید کہا اور آ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ روشن آغا نے ایک اکتائی ہوئی سرپرستانہ نظر ان پر ڈالی اور کرسی پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر ایک مختصر سی تقریر کے دوران انھوں نے ہندوستانی کسانوں کی بہادری، حکومت برطانیہ سے ان کی وفاداری اور جنگ کی ہولناکیوں وغیرہ کا ذکر کیا۔ اس تمام دوران میں سارے فوجی افسر سینے پر ہاتھ باندھے بڑی متانت اور لاتعلقی سے کھڑے رہے۔ آخر میں روشن آغا نے جنگ پر جانے والوں کے خاندانوں کی دیکھ بھال کا ذاتی طور پر ذمہ لیتے ہوئے سرسری لیکن فیصلہ کن لہجے میں بھرتی کے لئے پیش ہونے کا حکم دیا۔ اب کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ فوجیوں نے اپنا کام شروع کیا۔ کسانوں کے مجمع میں

ایک خاموش ہلچل پیدا ہوئی لیکن وہ ایک ایک کر کے ننگے بدن ڈاکٹر کے آگے سے گزرتے رہے۔ ڈاکٹر نے چند ایک کو چھو کر دیکھا' باقی کو سر کے ہلکے سے اشارے کے ساتھ سارجنٹ کے حوالے کر دیا جوان کے کاغذات تیار کر رہا تھا۔ تین گھنٹے کے اندر اندر گاؤں کے زیادہ تر نوجوان جو تعداد میں چالیس تھے' بھرتی کر لئے گئے۔

لال دین سے حقہ رکھوانے کے لئے ایک سپاہی اس کی طرف بڑھا۔

''جاؤ......'' لال حقے کو بازوؤں میں چھپا کر چیخا۔ ''جا میں نہیں دیتا۔ مجھے مار دے' خون کر دے' پر اسے ہاتھ مت لگا۔ میں اس سے تیرا سر توڑ دوں گا۔''

سارجنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے سپاہی کو روکا اور اس طرح ایک حقہ جوانوں کے ساتھ چلا گیا۔ سب کو ٹرکوں اور لاریوں میں بھر لیا گیا۔ روشن آغا تھوڑی دیر رک کر اسی فوجی گاڑی میں واپس لوٹ گئے۔ گاؤں کی عورتیں اپنے بیٹوں' خاوندوں اور محبوبوں کو جنگ پہ جاتے دیکھ کر اونچی آواز سے رونے لگیں۔ بوڑھے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے امیر اور ویران کھیتوں کو تکنے لگے۔

نیاز بیگ اگلی صبح بھوسے والے کمرے سے نکلا۔ کم خوابی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کا خلا شدت اختیار کر گیا تھا۔

''نعیم چلا گیا؟'' اس نے پوچھا۔ سرد چولہے کے آگے بیٹھے بیٹھے بڑی عورت نے خاموشی سے اسے دیکھا اور سر جھکا کر راکھ کریدنے لگی۔ اس کی آنکھیں زرد اور خشک تھیں۔ نیاز بیگ جھک کر چلتا ہوا دیوار کے پاس گیا اور ایڑیاں اٹھا کر اگلے مکان میں جھانکنے لگا۔

''حسین چلا گیا؟''

''ہاں۔'' دیوار کے پرلی طرف احمد دین نے جواب دیا۔

''اور کون گیا؟'' دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

''فصل پر جا رہے ہو؟'' وہ دوبارہ آ چکا۔ اس طرف خاموشی رہی۔ کچھ دیر تک وہ صحن کے وسط میں کانپتی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا رہا۔ دو راتوں میں وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ پھر وہ چلم پر تمباکو اور گڑ رکھ کر چولہے کے پاس گیا۔

''آگ ہے؟''

''نہیں۔'' عورت اس کے غصے کا انتظار کرنے لگی۔

اس نے خاموشی سے چلم زمین پر رکھ دی اور کونے میں جا کر درانتی اور رسہ اٹھایا۔ جھکے ہوئے جسم اور کمزور چال سے صحن پار کرتے ہوئے اسے اس کی بیوی نے دیکھا اور رنج اور رحم سے خوف زدہ ہو گئی۔

''بوڑھے کے اب کتنے دن ہیں۔'' اس نے سوچا۔

نیاز بیگ نے رسہ کندھے پر پھینکا اور درانتی کو پگڑی میں اڑسنے لگا۔ دیر تک وہ اعصابی انگلیوں کے

ساتھ پگڑی، رسے اور درانتی کے ساتھ الجھتا اور بھوؤں میں جھلاتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر نعیم کی درانتی اور رسہ اٹھایا اور دروازے میں بیٹھے ہوئے چھوٹے لڑکے کے کندھے پر رکھا۔ ''آؤ......'' باہر نکلتے ہوئے وہ بولا۔

بچہ رسے کو سنبھالتا ہوا کود کر اٹھا اور خوش ہو کر چہکا۔

''میں کٹائی کر لیتا ہوں بابا۔ کل میں نے دو مرلے فصل کاٹی تھی۔''

دروازے کے پاس وہ بھینس کے پھولے ہوئے تھنوں کو دیکھ کر رک گیا۔

''اسے دوہا نہیں؟'' تھنوں کے نیچے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ بھینس ڈکرائی اور سفید گاڑھے دودھ کے چند قطرے اس کی ہتھیلی پر گر پڑے۔ چھوٹے لڑکے نے سہم کر اسے دیکھا۔ (یہ نیاز بیگ کے گھر میں بہت بڑا جرم تھا۔ اس لاپروائی پر وہ دو دو فٹ اچھلا کرتا اور کہتا ''جانور کو عذاب دے کر تم کبھی سکھی نہیں رہ سکتے۔ تمہاری گود کے بچے بھی مر جائیں گے اور تمہاری چھاتیوں سے دودھ ٹپکے گا، کتیو......'') عورت ہاتھ روک کر پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے گندی ہتھیلیوں میں دودھ مل کر سر کے بالوں سے پونچھا۔

''بھینس دودھ پھینک رہی ہے۔'' پھر اس نے بیمار آواز میں کہا اور باہر نکل گیا۔ لڑکا فصل کاٹنے کی خوشی میں اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا اور مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ دفعتاً بڑی عورت جو دو روز سے خاموش بیٹھی تھی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دھوپ کھیتوں اور کچے مکانوں کی ممٹیوں پر پھیل گئی تھی اور گلیوں میں سے بیلوں کی گھنٹیوں کی اِکا دُکا آوازیں آ رہی تھیں۔

(۸)

نمبر 129 بلوچی، ڈیوک آف کناٹس اون، فیروز پور بریگیڈ، لاہور ڈویژن۔ رجمنٹ دو ماہ تک ہیڈ کوارٹرز پر رکی رہی۔ اس عرصے میں رنگروٹوں کو انتہائی سخت ٹریننگ سے گزرنا پڑا۔ اٹھارہ گھنٹے جو وہ جاگتے ان میں سے بارہ گھنٹے مشقیں (Exercises) کرتے، پریڈ، دوڑ اور اسلحہ کا استعمال سیکھتے، چھ گھنٹوں میں کھانا کھاتے، کپڑے سیتے، جوتے اور بوٹ پالش کرتے اور گپ مارتے۔

درختوں، کبوتروں اور کھیتوں کی ہوا کی طرح آزاد، اپنی مرضی سے کام کرنے والے کسانوں پر یہ منظم، مشینی عمل بہت بھاری ہو گیا۔ کھیتوں اور باغوں میں وہ اس سے زیادہ سخت کام کرتے تھے لیکن اب بیلوں اور گھوڑوں کی بجائے رائفل اور خوراک و بارود کا تھیلا تھا اور جہاں وہ اپنی خفیف ترین مرضی کے مطابق گاؤں کی کسی بھی گلی، کسی بھی کونے پر مڑ سکتے تھے، رک کر باتیں کر سکتے تھے، اب خاص ہدایات کے تحت دائیں اور بائیں مڑنا اور

حکم ملنے پر رکنا چلنا پڑتا تھا۔ محنت کی اس پابندی سے ان کے جسم تھکاوٹ سے ٹوٹ گئے اور چاق و چوبند ذہن غبی اور سست ہو گئے۔

اگست کے پہلے دن نعیم پریڈ پر سے لوٹا۔ آسمان پر ساون کے سیاہ گھنے بادل گڑگڑا کر چمک رہے تھے۔ علی پور کا عبداللہ' جو ساری پلٹن میں نعیم کا واحد دوست تھا' بارک کے کونے میں بیٹھا کچھ سی رہا تھا۔ مغربی پنجاب کے چار سپاہی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کئے وردیاں اتار رہے تھے۔ اس بارک میں یہی چھ سپاہی تھے۔

''تم چاند ماری کے بعد کہاں غائب ہو گئے؟'' نعیم نے عبداللہ سے پوچھا۔

''میں آوارہ گردی نہیں کرتا۔ سیدھا گھر آتا ہوں۔''

''گھر......'' نعیم نے تمسخر سے دہرایا۔ بندھے ہوئے بستر کو بوٹ سے دھکیل کر اس نے دیوار کے ساتھ لگایا اور اس پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تھک گیا تھا۔ گھسیٹ کر ٹوپی اتارنے کے بعد اس نے اس کے ساتھ چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھا اور گھما کر اسے فرش پر پھینک دیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ بادل آسمان پر بہت نیچے جھک آئے تھے۔

''آج تم کسی نہ کسی کو مار دیتے۔'' اس نے بوٹ پٹیاں اتارتے ہوئے کہا۔

باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ دوسرے کونے میں ایک پنجابی سپاہی ساون کا کوئی گیت گانے لگا۔

''اگر پھر ایسا کیا تو گولی سے اُڑا دیئے جاؤ گے۔'' نعیم نے پھر کہا۔ عبداللہ خاموشی سے سوئی دھاگے پر جھکا رہا۔

''بعض لوگوں کے سر میں بیل کا دماغ ہوتا ہے۔''

''تم باؤلے ہو گئے ہو۔'' عبداللہ آنکھیں نکال کر چیخا۔

نعیم ہونٹوں میں ہنسا۔ وردی اُتار کر اس نے گول بستر بغل کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ عبداللہ نے آخری ٹانکا لگا کر دھاگا توڑا اور غور سے اسے دیکھ کر بولا۔

''پارسال انہی دنوں میں مَیں نے ایک مچھلی پکڑی تھی۔ بڑی خوب صورت......''

''پھر......؟''

''مجھے یاد ہے۔ میں سارا دن بیٹھا دھوپ میں جلتا رہا تھا مگر ایک کچھوے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تھا۔ شام کے وقت بادل آ گئے' خوب بارش ہوئی اور ایک مچھلی بھی لگ گئی۔ چھوٹی سی' بس یہ انگلی دیکھ لو۔ پر اتنی خوب صورت مچھلی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اس کے جسم پر ہزار رنگ کے دانے تھے اور ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں اسے کٹورے میں ڈال کر گھر لے آیا اور ناند میں پانی بھر کر اسے چھوڑ دیا۔''

بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ چاروں پنجابی سپاہی ننگے بدن باہر کھڑے نہا رہے تھے۔ اسی طرح سب بارکوں کے آگے ننگے' گندمی اور سیاہ جسم بھیگتے' کودتے اور شور مچاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جو نہیں نہا رہے تھے وہ برآمدوں میں کھڑے تمباکو پی رہے تھے اور گپ مار رہے تھے۔ بادل فیروز پور چھاؤنی پر بہت نیچے جھک

آ ئے تھے اور کمروں میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''آج بالکل ویسا ایک پتھر میری تھوڑی کے آگے پڑا تھا۔ اس پر ہزار رنگ کے دانے تھے اور عین مین اسی شکل کا تھا۔ میں نے اتنے عرصے سے مچھلی نہیں پکڑی۔ میرا دل چاہا اسے پکڑ لوں۔ یقین کرو میرا ارادہ نہیں تھا۔'' وہ رُکا۔ ''لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ مچھلی ہے اور بھاگ جائے گی۔ میں نے اس پر فائر کر دیا۔ میرا ارادہ نہیں تھا۔ خدا کی قسم' میرا کوئی خیال نہ تھا۔ پر اس وقت میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بس' پتہ نہیں۔''

بارش کا زور کم پڑ گیا تھا اور پارک میں اجالا بڑھنے لگا۔

''مضحکہ خیز!'' نعیم نے کندھے اچکائے۔ ''اور اس مچھلی کا کیا ہوا۔''

''وہاں کسی نے بیل لا کر باندھ دیئے۔ شاید وہ کھا گئے۔''

نعیم نے ہاتھ چوڑا کر کے عبداللہ کے کندھے پر مارا جس سے اس کا سارا بدن ہل گیا۔

''دانت مت نکالو۔ تم نے کبھی مچھلیاں نہیں پکڑیں۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ بعض لوگوں میں بیل کا دل بھی ہوتا ہے۔'' اس نے ٹرنک کھول کر پالش کا سامان نکالا اور بوٹ چمکانے لگا۔ برآمدے کے باہر مینہ تھم چکا تھا لیکن سپاہی ابھی تک ننگے بدن دوڑتے ہوئے خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔ ان کے جسم محنت کی وجہ سے ہلکے پڑ گئے تھے اور رگیں ابھر آئی تھیں۔ نعیم آہستہ آہستہ ایک دھن' جو اس نے روشن محل میں سنی تھی' گنگنانے لگا۔

''لیکن ایک بات میں تمہیں بتاؤں۔'' عبداللہ ہاتھ روک کر بولا۔

''بیلوں کا دل بالکل آدمیوں کی طرح ہوتا ہے۔''

''کیسے؟''

''وہ سب کچھ سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ روتے بھی ہیں۔'' نعیم گنگناتا ہوا ہنسا۔

''تم یقین نہیں کرتے؟ تم نے بیل کبھی دیکھے ہیں؟ میں تو بیلوں میں پیدا ہوا اور بیلوں میں پلا......''

نعیم کو بے دھیانی سے گنگناتے دیکھ کر وہ زور زور سے برش رگڑنے لگا۔

''گھوڑوں کا مجھے پتہ ہے۔ وہ سب سمجھتے ہیں۔'' اچانک نعیم نے کہا۔

''ہاں گھوڑے بھی سمجھتے ہیں اور بیل بھی۔ میں تمہیں بتاتا ہوں' جب میری پہلی بیوی مری تو لاٹھا' جو ہمارے گھر میں ہی پیدا ہوا تھا' دو روز تک بھوکا رہا۔ میری بیوی اسے چارہ ڈالا کرتی تھی۔ میں باہر گیا تو وہ بھی پیچھے پیچھے آ گیا۔ آم کے پیڑ کے نیچے میں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا تو وہ میری گردن چاٹنے لگا۔ پھر قریب ہی بیٹھ گیا اور میرے کندھے پر سر رکھ کر سانس لینے لگا۔ بڑی دیر بعد میں نے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک آم توڑ کر دیا تو نہیں کھایا' بس سر ہلا دیا۔ پھر آدھا میں نے کھایا تو اس نے بھی چکھ لیا۔''

کھانے کی پہلی گھنٹی ہو چکی تھی اور نہانے والے اندر آ کر کپڑے پہن رہے تھے۔

''گھوڑوں کے متعلق مجھے پتہ ہے۔'' نعیم نے کہا۔

''ہاں۔ گھوڑے بھی اور بیل بھی۔''

نعیم نے اٹھ کر تام چینی کا جگ اور تھالی ٹرنک میں سے نکالی اور ٹوپی کے ساتھ انہیں صاف کیا۔ ''چلو لنگر، سجنو۔'' ایک پنجابی سپاہی نے تھالی اور مگ بجاتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔

''چلو۔''

باہر آ کر عبداللہ نے اونچے ہوتے ہوئے بادلوں اور دھلی دھلائی ہوئی فضا کو دیکھا۔

''آج تو آم کھانے کا دن ہے۔ پتہ نہیں یہ ہمیں آم کیوں نہیں دیتے۔'' اس نے کہا۔

ہر طرف سے جوان برتن ہاتھوں میں لئے ایک ہی سمت میں جا رہے تھے۔ کھانے کے ایک گھنٹہ بعد وہ پھر پریڈ کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

''یہ بکلس لگانا بھائی۔'' عبداللہ نے دونوں ہاتھوں سے تھیلے کو پیٹھ پر تھامتے ہوئے کہا ''میں سارجنٹ کو بتاؤں گا۔''

''کیا؟''

''تم اپنی 'کٹ' بھی نہیں باندھ سکتے۔''

عبداللہ نے گالی دی: ''میں اس کا سر توڑ دوں گا۔ سور۔''

پھر جب وہ 'کٹ' باندھ چکا تو اس نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''جنگ کب شروع ہوگی نعیم؟''

''تمہیں مرنے کی جلدی ہے؟''

''میں اس پریڈ سے عاجز آ گیا ہوں۔ بہن چود وہاں پر آم تو ہوں گے۔ آموں کے درخت ہی ہوں گے۔ شاید مچھلیاں بھی ہوں۔''

''وہاں موت بھی ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے' لوگ مریں گے تو سہی۔ یہاں تو بھینچو بندوق ہے اور گولیاں ہیں اور...... قیدیوں کی طرح بند پڑے ہیں۔ ایک نہ ایک دن میں کسی کو گولی مار دوں گا۔''

''کیا کہا؟'' نعیم نے یکلخت پوچھا۔ عبداللہ نے سراسیمگی سے اسے دیکھا اور ہنسنے لگا۔

باہر آ کر اس نے نعیم کو کہنی پر چھوا۔ ''تم یقین نہ کرو چاہے' پر میں بندوق ہاتھ میں لیتا ہوں تو مجھے تاؤ آ جاتا ہے۔ میرا دل کرتا ہے کسی کا خون کروں۔ تبھی آج سویرے میں نے فیر کیا تھا۔ پر پتھروں میں خون کہاں سے آیا۔''

''فکر نہ کرو۔ جلد ہی موقع ملے گا۔'' نعیم نے کہا۔

عبداللہ کھسیانی، کھوکھلی آواز سے ہنسا۔

چار اگست 1914ء کو جنگ کا اعلان کیا گیا۔ پانچ دن کے بعد بریگیڈ کو کوچ کا حکم ملا۔ تمام صفوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے رگڑ رگڑ کر بوٹ پالش کیے' رائفل کی نالی اور دستہ چمکایا' وردی کے بٹنوں پر سوڈا گھسا' اور بالوں میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ جو تعلیم یافتہ تھے انہوں نے لمبے لمبے خط اپنے گھروں کو لکھے اور دوسروں کو لکھ کر دیئے۔ اتنے دنوں کی خشک بھاری ڈیوٹی کے بعد جب اصل جنگ کا لفظ چاروں طرف پھیلا تو اداس اور اکتائے ہوئے ذہن اور تھکن سے چُور اعضاء خون کی تیزی سے سنسنانے لگے۔

بارک نمبر 6 میں وہ تیار ہو رہے تھے۔

''تم گھر خط نہیں لکھو گے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''نہیں......'' عبداللہ کے ہاتھ مشین کی طرح رائفل کے ہڑکے پر چل رہے تھے۔ وہ اسے تیل دے کر رواں کر رہا تھا۔ پنجابی سپاہی اپنا اپنا سامان باندھ رہے تھے۔ بارک میں صرف رائفل کے ہڑکے کی ٹھک ٹھک اور ٹرنکوں کے گھسٹنے کی آوازیں تھیں اور لالٹین کی روشنی میں انسانی جسموں کے چھوٹے بڑے سائے دیوار پر ناچ رہے تھے۔ باہر شام کی تاریکی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ایک بھاری دھماکے سے پھٹنے والی خاموشی کمرے کی فضا پر طاری تھی۔ ان چھیوں میں سے ہر ایک یہ محسوس کر رہا تھا کہ ابھی وہ سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں گے' یا اچانک ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں گے یا پھر...... پتہ نہیں' لیکن کچھ ہوگا ضرور جس کے لئے وہ خاموشی اور پھرتی سے تیار ہو رہے تھے۔ ان کی طبیعت ہلکی پھلکی تھی اور ہر ایک یہ سوچ رہا تھا کہ اس کو کوئی بات کرنی چاہیے۔ لیکن اتنے دنوں کی اداس' غبار کی سی یکساں زندگی کے خاتمے اور جنگ کی سنسنی سے عارضی طور پر ان کی زبانیں گنگ ہوگئی تھیں اور دماغوں میں خون بھر گیا تھا۔

''میں خط نہیں لکھوں گا۔'' رائفل پر ہاتھ روک کر عبداللہ خوش دلی سے بولا۔

''کیوں؟''

''اگر میں مارا گیا تو خط کا کیا فائدہ؟ تین سو خط بھی میری بیوی کے پاس ہوئے تو بھی وہ دوسری شادی کرلے گی۔ خط کسی کو کچھ نہیں کہتے۔''

''اگر پنجاب میں کوئی ایسا کرے تو ہمارے بھائی اسے قتل کر دیتے ہیں۔'' ایک پنجابی سپاہی نے کہا۔

''پنجاب میں جنگلی رہتے ہیں۔''

بات کرنے والا پنجابی سپاہی بستر پر جھک کر ہنسا۔

''تو میں کیا کہہ رہا تھا' نعیم؟''

''کیا بے سرا نام ہے۔ نائیم......'' دوسرا پنجابی منہ میں بڑبڑایا۔

''تم خطوں کی بات کر رہے تھے۔''

''ہاں۔ خط جب ایک دفعہ پڑھا گیا تو پھر سمجھو وہ ناکارہ ہو گیا۔ پھر وہ گزرے ہوئے زمانے کی بات بن گیا۔ پھر وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ جیسے آدمی مر جائے۔ پتہ ہے مردہ آدمی اور خط میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ دونوں گزرے ہوئے وقت کی چیزیں ہیں۔ پرانے خط پڑھنا اور مردے پر رونا وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔''

نعیم ہونٹ بھینچ کر سیٹی بجا رہا تھا۔ گاؤں کی زندگی کے' جس نے اس کی روح اور جسم دونوں کا ستیاناس کر دیا تھا' خاتمے پر اس نے ایک بوجھ سینے پر سے اٹھتا ہوا محسوس کیا۔ چھاؤنی کی پابند زندگی' جہاں گاؤں گاؤں سے آئے ہوئے کسانوں نے پہلی بار زندگی میں شدید اکتاہٹ اور غنودگی دیکھی تھی' نعیم کے لئے خوش مزاجی اور لاپروائی لے کر آئی تھی۔ گو اس کا دماغ ابھی تک سلب تھا اور اس نے کبھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی' مگر اب وہ ایک معمولی' صحت مند آدمی کی طرح وقت گزار رہا تھا۔

آدھی رات کے قریب وہ فیروز پور چھاؤنی سے گاڑی میں سوار ہوئے۔ مال گاڑی کے خالی ڈبوں میں بھوسہ' گھاس اور باجرے کے ناڑ بچھا کر انہیں سفر کے قابل بنایا گیا تھا۔ سپاہی اپنے اپنے بستر دیواروں کے ساتھ رکھ کر ان کے اوپر بیٹھ گئے۔ ان کی نیند اڑ چکی تھی اور آنکھیں ان کے سگرٹوں کی طرح نیم تاریکی میں تیزی سے چمک رہی تھیں۔ صرف ایک سپاہی جس کے پیٹ میں درد تھا' بستر پر سر رکھے گھاس پر لیٹا تھا اور گلے میں' غرغر' کر رہا تھا۔ کونے میں ایک ادھیڑ عمر پنجابی سپاہی پرانے وقتوں کی کوئی کہانی سنا رہا تھا اور اس کے ارد گرد آٹھ دس نوجوان' دمکتے ہوئے مشتاق چہرے محو سماعت تھے۔ چھت کے ساتھ لٹکتی ہوئی دھندلی سی ہری کین ڈول رہی تھی۔ دیواروں پر آدمیوں کے سائے مستقل پھیل اور سکڑ رہے تھے۔

گاڑی سٹیشن پر رکتی تو ڈبے میں حبس ہو جاتا اور لوگ دونوں طرف کے دروازوں پر جمع ہو جاتے۔

''کون سا سٹیشن ہے؟''

''دھرم پاسا۔''

''ہیں؟ کون سا؟ زور سے بول۔''

''کہاں جا رہے ہو؟'' سٹیشن پر سے کوئی پوچھتا۔

''لڑائی پر۔''

''اللہ کرم کرے۔''

''اللہ کرم کرے۔''

''کہاں جاتے ہو سائیں؟'' آگے سے ایک اور آواز آئی۔

''لڑائی پر......'' اگلے ڈبے والے جواب دیتے۔

''کہاں؟''

''لڑائی پر''

''پر کہاں۔ کس جگہ؟''

''تیری ماں کے پاس۔'' ڈبہ قہقہوں سے بھر جاتا۔ ''کوئی پیغام؟'' مزید قہقہے۔

عبداللہ نے گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بوٹ سے نعیم کا گھٹنا ہلایا۔

''ہمیں گھوڑے ملیں گے؟''

''پتہ نہیں۔'' نعیم نے کہا۔

''میں نے اگلے ڈبوں میں کچھ گھوڑے دیکھے ہیں۔''

''وہ افسروں کے لئے ہیں۔''

''اگر وہ کہتے تو میں اپنا گھوڑا ساتھ لے آتا۔''

''اپنی بیوی کو لکھو لے آئے۔''

عبداللہ خاموش بیٹھا گھاس میں انگلیاں دوڑاتا رہا۔ مریض سپاہی کا درد بڑھ گیا۔ اس نے بہت سی گھاس اٹھا کر منہ میں ڈالی اور گرر گرر چبانے لگا۔

''اگلے سٹیشن پر تمہیں اتار دیں گے۔ صبر کرو۔'' تیمار دار سپاہی نے سگریٹ ختم کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو......'' عبداللہ نے گیہوں کی ایک پکی ہوئی بالی گھاس میں سے کھینچ کر نکالی اور چلایا۔ ''دیکھو۔ یہ یہاں سے نکلی ہے۔ حرامیوں نے پکی ہوئی فصل اٹھا کر ڈال دی ہے۔''

نعیم نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر بالی اس سے لے لی، ہتھیلی پر مسل کر دانے نکالے اور پھونک مار کر چھلکا اڑا دیا۔ ''ایک آدھ بالی تو بھوسے میں بھی چلی جاتی ہے۔''

''ایک آدھ بالی۔'' عبداللہ نے تیزی سے کہا۔ ''تمہاری فصل کا کیا بنا؟ اور میری کا؟ وہ ابھی کھیت میں تھی۔ ہم چلے آئے۔''

''ہنہ...... چلے آئے۔'' تاش کھیلتا ہوا ایک پنجابی طنز سے ہنسا۔

''تم اپنے پیروں پر آئے تھے؟ ہیں؟''

''وہ سوروں نے کھائی ہوگی یا گاڑیوں میں بچھی ہوگی۔'' عبداللہ نے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے بات ختم کی۔

''کل ہمیں بھی سوّر ہی کھائیں گے۔ لو کھاؤ۔'' نعیم نے چند دانے منہ میں ڈال کر باقی اس کی طرف بڑھائے جو اس نے ذرا تامل کے بعد لے کر پھانک لئے۔ اناج سیلا اور بے رس تھا لیکن ان کے گرم گرم لعاب کے ساتھ مل کر اس کا میٹھا، سفید گودا گاڑھے خوشبودار دودھ میں تبدیل ہوگیا اور انہوں نے گیہوں کی مخصوص طاقتور حرارت زبان پر، دانتوں میں اور حلق کے اندر اترتی ہوئی محسوس کی۔ دیر تک وہ خاموشی سے گیہوں کے دانے چباتے

اور باہر تیزی سے بھاگتے ہوئے سیاہ درختوں کو دیکھتے رہے۔ ان کے جڑے ایک ساتھ' ایک تال پر' پریڈ کرتے ہوئے سپاہیوں کی طرح چل رہے تھے۔

''یہ سارا خون ہے۔'' عبداللہ نے منہ میں زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' نعیم نے اتفاق کیا۔ عبداللہ نے ہوا میں گالی دی۔

تاش کھیلتے ہوئے چاروں سپاہی کسی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسے۔ ان کے ساتھ ہی پیٹ کے درد والے نے ایک چیخ ماری اور مٹھیاں پیٹ میں ٹھونس کر دانت گھاس میں گاڑ دیئے۔ سب لوگ اس کے گرد اکٹھے ہوگئے۔

''صبر کرو۔ سٹیشن آنے والا ہے۔'' کہانی سنانے والے دیوہیکل سپاہی نے کہا۔

''پانی پلاؤ......'' ایک اور نے کہا اور چھاگل بڑھائی۔ مریض نے منہ موڑ کر ایک اور چیخ ماری۔

''گاڑی روکو۔ منہ کیا دیکھ رہے ہو' گدھو' زنجیر کھینچو۔''

''ہاں زنجیر کھینچو۔ زنجیر کہاں ہے؟''

زنجیر کی تلاش شروع ہوئی۔ داستان گو نے لالٹین اتار کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ آدھے سپاہی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

''زنجیر نہیں ہے۔'' آخر اس نے اعلان کیا۔

''ہیں؟ زنجیر نہیں ہے؟''

''یہ جانوروں کا ڈبہ ہے' آدمیوں کا نہیں۔ دیکھتے نہیں ہو۔'' ایک نوعمر لڑکے نے گھاس پر ٹھوکر ماری۔ ''جانوروں کو زنجیر کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

مریض اب سیدھا لیٹ گیا تھا اور ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ گاڑی رکی تو سپاہی دونوں دروازوں پر جا کھڑے ہوئے۔

''کون سا سٹیشن ہے؟'' انہوں نے مخصوص سوال دہرایا۔

''اور تم جانوروں کی طرح دروازے میں کیوں کھڑے ہو؟ ہوا آنے دو۔'' عبداللہ بستر پر بیٹھے بیٹھے چیخا۔ دو ایک سپاہیوں نے پلٹ کر دیکھا اور سنی ان سنی کردی۔ وہ جھلا کر اُٹھا اور پوری قوت سے کہنی ایک کی پسلیوں میں ماری۔ ''ہٹو' مجھے باہر جانے دو۔''

نیچے زمین گیلی تھی اور مٹی میں سے تازہ ہل جتے ہوئے کھیت کی خوشبو آرہی تھی۔ بارش ابھی ہو کر تھمی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہاتی سٹیشن تھا جس کے دونوں سروں پر لالٹینیں ویرانی سے جل رہی تھیں۔ دوسری طرف سے آنے والی گاڑی کی روشنی نظر آرہی تھی۔ سپاہی کود کود کر باہر نکل رہے تھے اور سٹیشن پر پھر رہے تھے۔ جنہوں نے باہر آنا مناسب نہ سمجھا وہ ٹانگیں لٹکائے دروازے میں بیٹھے تھے۔

''مارو مارو مارو......'' اچانک ایک ڈبے میں شور اٹھا اور بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ کچھ دیر بعد ایک سپاہی

بینٹ کی نوک پر چھوٹا سا سانپ چڑھائے باہر نکلا۔ رائفلوں کی نالیوں سے اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا گیا۔ بینٹوں سے کچو کے لگائے گئے اور متفقہ رائے کا اظہار کیا گیا:

''بڑا زہریلا ہے۔'' پھر اس کا قاتل اسے بینٹ میں اٹکا کر آگے بڑھ گیا۔ چار ڈبے آگے جا کر وہ رکا اور اسے دروازے میں کھڑے سپاہیوں کی طرف بڑھا دیا۔

''لو' بھوپالیو۔ ایک تحفہ لایا ہوں۔''

''کیا ہے؟'' دروازے میں سے کسی نے پوچھا۔ وہاں پر اندھیرا تھا۔

''بلوچیوں نے بھیجا ہے۔''

ایک جا کر اندر سے لالٹین اٹھا لایا۔ دروازے میں کھڑا ہوا سپاہی اپنے چہرے کے اتنا قریب سانپ کی شکل دیکھ کر چونک کر پیچھے ہٹا۔ اوپر اور نیچے قہقہے بکھر گئے۔

''سوٗر۔'' اس نے بوٹ کی ٹھوکر سے سانپ کو دور اچھال دیا۔

''ہم بھی جلد ہی تمہیں ایک تحفہ بھیجیں گے۔''

'یہ کون سی رجمنٹ ہے۔'' عبداللہ نے چلتے چلتے پوچھا۔

''نمبر نو بھوپالی......''

آگے ایم۔ جی۔ ڈی ٹچمنٹ کے ڈبے تھے۔ مشین گنوں کی خول چڑھی نالیاں دروازوں سے باہر نکلی تھیں اور سپاہی ان پر ٹانگیں رکھے سو رہے تھے۔ آگے زخمیوں کو اٹھانے والی کمپنی تھی۔ وہ سٹریچروں کے انبار کے سہارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس سے آگے گھوڑوں کے دو ڈبے تھے جو منہ باہر نکالے گھاس کھا رہے تھے۔

''جانوروں کو زنجیر کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' عبداللہ نے ہنس کر زیرلب دہرایا۔

مخالف سمت سے آنے والی گاڑی سیٹی بجاتی ہوئی زن سے گزر گئی۔ اس کے زیادہ تر کمروں میں تیز روشنی تھی اور پنکھے چل رہے تھے۔ مسافر اخبار پڑھ رہے تھے' سو رہے تھے اور باہر دیکھ رہے تھے۔ ایک ادھ ننگی سفید فام عورت چمڑے کے بکسوں کے سہارے بیٹھی قہوہ پی رہی تھی۔ برف چوستا ہوا ایک موٹا آدمی حیرت سے فوجیوں کی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ پچھلی رات کی نشہ آور نم دار ہوا عبداللہ کے چہرے سے ٹکرائی اور وہ پلٹ آیا۔

''تم نے گاڑی دیکھی؟'' ڈبے پر لٹک کر چڑھتے ہوئے اس نے نعیم سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اس میں ایک عورت تھی۔''

''اچھا......؟'' نعیم نے مسکرا کر کہا۔

وہ اپنا اپنا بستر کھولنے لگے۔ کہانی سنانے والا پنجابی کان پر ہاتھ رکھ کر ہیر گا رہا تھا۔ باقی سپاہی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ چار بجے کے قریب زیادہ تر لوگ سو چکے تھے۔ جو نہیں سوئے تھے وہ نیند سے بھرائی ہوئی آواز

میں باتیں کر رہے تھے اور اپنا اپنا آخری سگریٹ پی رہے تھے۔

کراچی سے وہ ایچ۔ ایم۔ ایس۔ ویموتھ میں سوار ہوئے۔ جہاز کی اوپری منزل میں کمپنی کو جگہ ملی۔ ان کے ساتھ والے کمروں میں مشین گن ڈی ٹیچمنٹ تھی۔ نیچے کی منزل میں نمبر نو بھوپال کا آدھا بریگیڈ تھا۔ پہلا پڑاؤ عدن پر آیا جہاں چوبیس گھنٹے تک رکنا پڑا۔ وہاں ہندوستان کی دوسری بندرگاہوں سے فوجی جہاز آ آ کر جمع ہونا شروع ہوئے اور جب وہاں سے روانہ ہوئے تو وہ پینتالیس جہازوں کا ایک وسیع قافلہ تھے۔ بحیرہ قلزم میں داخل ہو کر تین جنگی حفاظتی جہاز ان کے ساتھ ہو لئے۔ نعیم اور اس کی کمپنی کے زیادہ تر جوانوں کو سمندری بیماری ہوگئی تھی اور وہ دن بھر لیموں کا عرق پیتے رہتے تھے۔

چند روز کے بعد سمندر پُرسکون ہوگیا اور کسان سپاہی اپنے پہلے سمندری سفر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے لگے۔ آسمان کے رنگ کے ساتھ پانی کا رنگ بدلتے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح حیرت زدہ ہو جاتے۔ حدنظر تک پانی جہازوں کا وسیع وعریض قافلہ، ان کی سیٹیاں اور بھونپو، سمندر کا شور اور اچھلتی کودتی ہوئی رنگ برنگ مچھلیوں کا نظارہ سادہ لوح دہقانوں کے لئے جن میں سے کئی تو پہلی بار اپنے گاؤں سے باہر نکلے تھے، عجیب کشش رکھتا تھا۔

پورٹ سعید پر وہ جہاز چھوڑ کر گاڑی پر سوار ہوئے اور قاہرہ پہنچے۔ راستے کا علاقہ اور قاہرہ کے بازار اور گلیاں دلّی اور اس کے علاقے سے مشابہ تھیں۔ صرف لوگوں کا لباس مختلف تھا۔ قاہرہ میں چند لوگ یورپی لباس میں دکھائی دیئے۔ شہر سے باہر پہلی پولس ریس کورس میں ان کا کیمپ لگا۔

کمپنی آدھ گھنٹے سے ''فال ان'' تھی۔ مصری آسمان پر سورج تیزی سے چمک رہا تھا اور زمین یوں خشک اور سخت تھی جیسی برسوں سے پانی کی شکل نہ دیکھی ہو۔ ریس کورس بہت بڑے دائرے کی شکل میں تھا جس کے تین چوتھائی رقبے پر کیمپ پھیلا ہوا تھا۔ جنوب میں بھورے رنگ کی خشک، پتھریلی پہاڑیاں تھیں جن کے پتھر سورج کی مسلسل تپش اور تیزی سے سیاہی مائل ہو چکے تھے اور ان پر اسی رنگ کی پہاڑی بکریاں جانے کیا چرا کرتی تھیں۔ شمال اور مغرب میں قاہرہ پھیلا ہوا تھا جس کی چوڑی خوش نما سڑکوں پر دیہاتی عربی لباس پہنے بدو گدھا گاڑیوں اور اونٹ گاڑیوں پر سبزیاں اور دودھ بیچتے پھرتے تھے۔ مشرق میں ریگستان تھا اور جا بجا چمکتی ہوئی ریت کے ٹیلے تھے جن کے پیچھے سے ہر صبح گرم چمکتا ہوا سورج قاہرہ پر، اور ریس کورس کے کیمپ پر اور تھکے ہوئے، گرد میں اٹے ہوئے، اکتائے ہوئے فوجی چہروں پر طلوع ہوا کرتا۔

دور سے کیپٹن میکلین کے گھوڑے کو آتے دیکھ کر حوالدار، جو ایک طرف کھڑا جمعدار سے باتیں کر رہا تھا، وہیں سے چلّایا ''اٹینشن۔''

انہوں نے رائفلیں کندھوں پر رکھیں اور تن کر کھڑے ہوگئے۔ کیپٹن میکلین کا سیاہ خوبصورت گھوڑا ان گھوڑوں میں سے تھا جو مصر اور سوڈان سے حاصل کئے گئے تھے۔ اس نے کمپنی کے دو چکر لگائے۔ حوالدار نے

کڑک کر دو 'کاشن' دیئے۔

''بالکل ایسا میرا گھوڑا پچھلے سال پھول کر مر گیا۔'' عبداللہ کے ساتھ کھڑے سپاہی نے اسے اطلاع دی۔

''چپ رہو۔''

''جوانو......'' گھوڑے کو قابو میں کر کے کیپٹن بولا۔ ''ہمیں چند حالات کی بنا پر کچھ دن اور یہاں رکنا پڑ گیا ہے۔ مگر امید ہے کہ جلد ہی ہم میدان جنگ میں پہنچیں گے۔'' اس نے رک کر بائیں ہاتھ کا سفید سواری کا دستانہ اتارا۔ ''اپنے آپ کو چست اور تازہ رکھو۔ حکومت تمہارے گھروں اور گھر والوں کی سلامتی کی ذمہ دار ہے اور وہ راضی خوشی ہیں۔''

گھوڑا پچھلے پاؤں پر دو بار ذرا ذرا اٹھا' پھر بیخ پا ہو گیا۔ سوار نے باگیں دانتوں میں پکڑ کر دستانہ پہننے کی کوشش کی مگر وہ نیچے گر پڑا۔ گھوڑا تیزی سے ناچنے لگا۔ ریت اڑ اڑ کر کیپٹن کے تر چہرے پر جمنے لگی۔

''حوالدار'' وہ گرجا۔

حوالدار نے مستعدی سے دستانہ اٹھا کر پکڑا یا۔

''کمپنی...... روٹ مارچ۔'' کیپٹن کے کرخت 'کاشن' کے ساتھ اس کا ہنٹر گھوڑے کی پیٹھ پر پڑا۔ وہ گھوڑے کی تندرست' چمکدار پشت پر رانیں جما کر ذرا سا اٹھا اور اپنے پیچھے ریت کے چھوٹے چھوٹے بلوریں ذروں کا غبار چھوڑتا ہوا غائب ہو گیا۔

''یہ جانور میرے نیچے ہو تو ایک دن میں ٹھیک کر دوں۔'' عبداللہ کے ساتھ والا سپاہی پھر بولا۔ عبداللہ نعیم سے کہہ رہا تھا:

''یہاں تو بھینچو علی پور سے بھی زیادہ گرمی ہوتی ہے۔''

روٹ مارچ کرتے ہوئے وہ ریس کورس سے باہر نکل آئے۔ دور پہاڑیوں کے دامن میں کسان ہل چلا رہے تھے۔ بیچ میں ریگستان پڑتا تھا اور ریت تپنی شروع ہو چکی تھی۔

حوالدار ہدایات دیتا ہوا انہیں پہاڑیوں کی طرف لے گیا۔ یہاں پانی کے آثار تھے اور کچھ سبزہ اگا ہوا تھا۔ ہل چلاتے ہوئے بدو کسانوں نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا اور کھجور کے درخت تلے رک کر پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کا رنگ سیاہ اور گہرا لکیر دار چہرہ تھا اور اس کے آہنی ہل کو خچر کھینچ رہا تھا۔ کھجور کے نیچے سے ایک مشک نما چھاگل اٹھا کر اس نے پانی کا گھونٹ بھرا اور آنکھیں پھاڑ کر پاس سے گزرتے ہوئے فوجیوں کو دیکھنے لگا۔

''یہاں بارش ہوتی ہے؟'' ایک سپاہی نے بھوری' خشک زمین کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

کسان چھاگل ہاتھ میں لٹکائے کھڑا رہا۔

''یا ان کا پیشاب کافی ہوتا ہے؟'' سپاہی نے خچر کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے قہقہے سن کر بدو نے چھاگل درخت کے تنے کے ساتھ رکھی اور سادگی سے ہنسنے لگا۔ اس کے اگلے دانت غائب تھے۔

''باتیں مت کرو۔'' حوالدار کڑکا۔

''سؤر......'' کسی نے زیرِلب کہا۔

وہ پہاڑیوں کا لمبا چکر لگا کر دوپہر کے وقت خیموں کی طرف لوٹے۔ عبداللہ نے ٹوپی اتار کر چہرہ اور بازو پونچھے اور اسے زمین پر دے مارا۔

''آج چار روز سے نہیں نہائے۔ دیکھو۔'' وہ کپڑے جھاڑنے لگا۔

''گرد مت اڑاؤ۔'' نعیم نے تنگ آکر کہا۔

میری ناک میں ریت بھر گئی ہے۔'' ایک پنجابی سپاہی نے جس کے چہرے پر پسینے اور ریت کی لکیریں بنی تھیں، گالی دے کر کہا۔

''افسروں کو روز پانی ملتا ہے۔''

''اور ہم جانور ہیں؟''

''تم جانوروں سے زیادہ بدبودار ہو۔'' ایک پٹھان سپاہی خیمے کے باہر قمیض پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہی اچھا ہو اگر تم باہر آ کر لیٹو۔''

انہوں نے وردیاں اتار کر رسیوں پر پھیلائیں اور سگریٹ لگا کر لیٹ گئے۔

''پردہ سارا اٹھا دو۔ ہوا اندر آنے دو۔'' کسی نے کہا۔

ایک صبح کو نعیم بریگیڈیئر میجر کے سامنے پیش ہوا۔ اس کا چھوٹا سا سبز رنگ کا خیمہ تھا جس میں اس کی اور اس کے حوالدار کلرک کی میز تھی۔

''تم تعلیم یافتہ ہو؟'' بریگیڈیئر میجر نے چشمہ اتارتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے سینئر کیمبرج کیا ہے۔''

''کہاں سے؟''

''کلکتہ سے۔''

''مشین گن کی ٹریننگ حاصل کی ہے؟''

''نہیں......''

''تمہیں ترقی دے کر لانس نائک کا عہدہ دیا جاتا ہے اور مشین گن ڈی ٹچمنٹ میں تبدیلی کی جاتی ہے۔''

''یس سر۔'' وہ ذرا سا پنجوں پر اٹھا۔

''کل تم سیکشن کمانڈر ایم۔ جی۔ ڈی ٹچمنٹ کو رپورٹ کرو گے۔ ڈس مس۔''

قاہرہ سے گاڑی میں بیٹھ کر وہ اسکندریہ پہنچے۔ وہاں بھی روٹ مارچنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ اسکندریہ سے پھر ایچ۔ ایم۔ ایس۔ ویموتھ میں سوار ہوئے اور بیس جہازوں کا قافلہ بحیرہ روم میں داخل ہوا۔ متلاطم سمندر کے باوجود بہت کم سپاہی بیمار پڑے۔ سمندری سفر میں نسبتاً بہتر خوراک اور نہانے کے لئے پانی عام ملتا تھا۔ نمبر 9 بھوپالی پیچھے رہ گئے تھے اور ان کی جگہ ایک انگریز بٹالین ان کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ جب مارسیلز کی بندرگاہ نظر آئی تو انگریز فوجی جہاز کے عرشے پر چڑھ کر ناچنے لگے اور بینڈ نے 'مارسلیز' بجانا شروع کر دیا۔

موسم چمکدار اور خوش گوار تھا۔ بہت سے بھونپوؤں اور سیٹیوں کے بعد جہاز نے لنگر پھینکا۔ سازندوں نے دھن تیز کر دی اور انگریز سپاہی 'مارسیلز' گاتے ہوئے بندرگاہ پر اترنے لگے۔ سفید براق وردیوں میں فرانسیسی ملاح تمباکو پیتے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ فرانسیسی عورتیں شوخ رنگ سکرٹ اور چھوٹے چھوٹے سفید ہیٹ پہنے کھڑی تھیں۔ انہوں نے گالوں پر چوم چوم کر فوجیوں کا خیر مقدم کیا۔ پھر ہندوستانی فوج کے افسر اترے۔ کیپٹن میکلین، کیپٹن اشر، لیفٹیننٹ براؤننگ۔ سب کے چہرے مسرت کی سنسناہٹ سے سرخ ہو رہے تھے اور وہ چلا چلا کر پوچھ رہے تھے:

''ہمیں دیر تو نہیں ہوگئی۔ کیا ہم دیر میں پہنچے؟''

فرانسیسی ملاح مسرور آوازوں میں چلا چلا کر جواب دیتے اور عورتیں سر پیچھے پھینک کر خوشی سے تالیاں بجاتیں۔ فرانس کے آسمانوں پر سے زرد خوش نما دھوپ سفید فام افسروں کے اونچے ماتھوں اور سنہری بالوں پر پڑ رہی تھی اور ان کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں اور نیلی دلکش آنکھوں سے صحت اور زندگی مترشح تھی۔ ان کے بے خوف قدم اور مستعد فوجی جسم دیکھنے والوں کو مرعوب کرتے تھے۔ ان کے دماغ فوجی سکیموں اور اپنے گھر والوں کی یاد سے پُر تھے۔ وہ ذہین، صحت مند اور پیارے انسان تھے۔ ایسے نوجوان جن کا بہت سے محبت کرنے والے دل انتظار کرتے ہیں اور جن کے گھروں کے دروازے ان کے لئے تمام عمر کھلے رہتے ہیں۔ جن کی تصویریں آتش دانوں پر سدا مسکراتی ہیں اور جن کی دی ہوئی انگوٹھیاں لڑکیوں کی انگلیوں پر ہمیشہ جگمگاتی ہیں۔ سورج نے اپنی خوب صورت ترین شعاعیں ان پر پھینکیں اور مسکرایا۔ ''تمہاری یادیں سدا جوان رہیں گی۔''

چھ ماہ کے اندر اندر یہ سب میدان جنگ میں کام آ چکے تھے۔

ہندوستانی فوجیوں کو گزرتا دیکھ کر فرانسیسیوں نے ہیٹ اتارے اور زور زور سے انہیں ہلانے لگے۔

''لاء انڈینز (Les Indians)۔'' انہوں نے ایک دوسرے کو بتایا۔

بورلے ریس کورس میں کیمپ لگا۔ تیسرے مشین گن سیکشن میں دو مشین گنیں، بارہ خچر، سولہ سپاہی، لانس نائک نعیم، حوالدار ٹھاکر داس اور سیکشن کمانڈر میک گریگر تھا۔ مارسیلز کا ریس کورس وسیع اور خوبصورت تھا۔ اس جگہ کی مٹی سیاہ اور زرخیز تھی اور یہاں پانی کی فراوانی تھی۔

''یہاں کا پانی میٹھا ہے۔'' حوالدار ٹھاکر داس نے سر پیچھے پھینک کر چھاگل سے پانی پیا۔''اور کھانا طاقت ور ہے۔''
''لوگوں کا لباس بھی خوش نما ہے۔'' نعیم نے چھاگل اس سے پکڑ کر منہ سے لگائی۔
''خاص طور پر عورتوں کا۔'' ٹھاکر داس بوٹ پٹیوں سمیت لمبا لیٹ گیا۔ وہ دس میل کے روٹ مارچ سے تھک کر لوٹے تھے۔ فرانسیسی طرز تعمیر' باغات کی فراوانی اور غیر ملکی پھول اور پودوں کو دیکھ کر وہ بچوں کی طرح مسرور تھے۔ اتنے دنوں تک اکتا دینے والے' یک رنگ ریگستان اور پتھریلی پہاڑیوں کے نظارے کے بعد فرانس کی کھلی سڑکوں پر خوب صورت خوش رنگ عورتیں اور بڑے بڑے ہیٹ پہنے خچر سوار مرد' جوان کو گزرتا دیکھ کر ہیٹ اٹھا کر سلام کرتے تھے' انہیں بہت بھلے معلوم ہوئے۔

''کل ہمیں نیا بارود ملے گا۔'' ٹھاکر داس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

''کتنا؟''

''کتنا وتنا نہیں۔ نیا فرانسیسی طرز کا۔ مارک نمبر 7 گولی۔''

''اور مارک نمبر 6......''

''یہ سب کنڈم۔ مارک نمبر 7 سیدھی جاتی ہے۔''

''کیسی ہوتی ہے......''

ٹھاکر داس نے لیٹے لیٹے پیٹی میں سے گولی نکالی۔''دیکھو۔ مارک نمبر 6 تو نوکدار ہے۔ وہ آگے سے چپٹی ہوگی اور یہ تو یوں جاتی۔'' اس نے انگلی سے ہوا میں کمان بنائی۔''اور وہ یوں تیر کی طرح سیدھی جائے گی۔ شوپ......''

''کیا فرق پڑے گا؟''

''فرق...... ہا ہا ہا۔ کہتے ہو کہ کلکتے میں پڑھتے رہے۔ ارے میاں ٹیڑھی جائے گی تو مار نزدیک کرے گی۔ سیدھی جائے گی تو مار دور کرے گی۔ سارا حساب کا سوال ہے۔ سمجھے؟...... اور بینٹ بھی ولایتی طرز کی ملے گی۔ لمبی والی...... اب پوچھو کیا فائدہ؟''

''چھوٹی ہوگی تو مار نزدیک کرے گی۔ لمبی ہوگی تو مار دور......''

اس کی آواز ٹھاکر داس کے مہیب قہقہے میں گم ہوگئی۔ اس نے ایک زور کے دھپ سے نعیم کا سارا بدن ہلا دیا۔

''شاباش بچے۔ شاباش......''

''تمہیں یہ کس نے بتایا......'' نعیم نے پوچھا۔

''سیکشن کمانڈر کے پاس میں نے دیکھیں۔'' وہ دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔

سرزمین فرانس پر وہ دن بڑا خوبصورت طلوع ہوا تھا۔ صبح صبح بارش ہوئی تھی جب وہ روٹ مارچ کرتے ہوئے بھیگے تھے۔ اس کے بعد سورج نکل آیا تھا۔ اب بھاری نمدار ہوا کی مخملیں لہریں خوش رنگ پھولوں پر سے گزرتی ' بڑی جان دار حدت لئے ہوئے یکے بعد دیگرے آ آ کر تھکے ماندے فوجی چہروں کو تھپکیاں دے رہی

تھیں۔ آسمان گہرے نیلے رنگ کا تھا۔ دور سڑکوں پر عورتیں اور بچے شوخ رنگ کپڑے پہنے' پھولدار چھاتے اور ہیٹ لے کر نکل آئے تھے۔ ان کی چال بڑی مسرور اور جوان تھی اور وہ تازہ دم رسالے کی طرح مختلف راستوں پر بڑھ رہے تھے۔

''جنگ کہاں پر ہو رہی ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔ وہ دیر سے ایک گیلی ماچس کو جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہم عنقریب جا رہے ہیں۔''

''کہاں؟''

''محاذ پر۔''

''کہاں؟ کس جگہ؟''

''تم کیوں اس کے پیچھے پڑے ہو؟'' ٹھاکر داس نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر یکلخت وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''لانس نائک نعیم احمد۔ اٹنشن۔''

نعیم تیزی سے اٹھا اور فوجی انداز میں تن گیا۔

''میکسم گن کی پٹی میں کتنے راؤنڈ آتے ہیں؟''

''دو سو پچاس۔''

''وزن ......؟''

''تقریباً ...... چھ پا......''

''میکسم گن کا وزن......'' ٹھاکر داس نے کڑک کر پوچھا۔

''ساٹھ پاؤنڈ۔''

''سٹینڈ ایٹ ایز......''

وہ لمبے لمبے قدم رکھتا خیمے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اس کی چوڑی پشت سارے دروازے پر پھیلی ہوئی تھی۔ باہر دھوپ ماند پڑنے لگی تھی۔ ''شاید بادل پھر آ گئے۔'' نعیم نے کھڑے کھڑے بے دھیانی سے سوچا۔

کچھ دیر کے بعد وہ نعیم کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

نعیم کھڑا رہا۔

''لڑائی کے میدان میں عورتوں کی طرح سوال مت کرو۔ جنگ کرنے نکلے ہو تو مرنے کا انتظار کرو' جینے کا انتظار مت کرو۔ کیوں' کہاں' کب' کیسے؟ سوالات بزدل بنا دیتے ہیں۔''

''غلط ہے۔ میں بزدل نہیں ہوں۔'' ایک نامعلوم سا غصہ اس کے دماغ میں ابال کھانے لگا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' ٹھاکر داس نے اس کا کندھا دبایا اور جیب سے ماچس نکال کر دی۔

دونوں سگریٹ جلا لئے۔ بادل پھر آسمان پر اکٹھے ہو رہے تھے اور پیلی سی مریل دھوپ خیمے کے

دروازے میں سے اندر آ رہی تھی۔

''تم سوال نہیں پوچھتے؟'' نعیم نے آنکھوں کے کونوں میں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر داس نے دھواں اس کے منہ پر چھوڑا۔ ''نہیں۔''

''تم مرنے سے نہیں ڈرتے؟''

''نہیں۔''

''اگر میں تمہیں ابھی قتل کر دوں؟''

ٹھاکر داس کے ہونٹ کپکپائے اور وہ زرد پڑ گیا۔ ''تمہارے دل میں کیا ہے سؤر۔ تم اتنی ہمت کرو گے؟'' اس نے تیزی سے کہا۔

نعیم اپنے بستر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا' وہیں پر کھسک کر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ ٹھاکر داس ابھی تک اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ وہ تیز تیز کش لگا رہا تھا اور اعصابی انگلیوں سے گھٹنا کھجا رہا تھا۔ کچھ دیر تک خیمے میں خاموشی رہی۔ ٹھاکر داس نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور تیزی سے ختم کر دیا۔ پھر اسے باہر اچھالتے ہوئے وہ بھاری آواز سے بولا:

''قتل دوسری چیز ہے۔''

''وہاں بھی لوگ اسی طرح مرتے ہیں۔'' نعیم نے چھت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ تم نے جنگ نہیں دیکھی' اس لئے کہتے ہو۔ وہاں ہر طرف موت ہوتی ہے۔ آدمی چوہوں کی طرح مرتے ہیں۔ وہاں مرنا اور مارنا بڑا آسان کام ہے۔ یوں۔ سڑک پر جاتے ہوئے ہم چیونٹیوں کے ایک قافلے پر پاؤں رکھ کر گزر جاتے ہیں اور سینکڑوں چیونٹیاں ہمارے جانے بغیر مر جاتی ہیں۔ لیکن اکلوتی چیونٹی اگر ہمارے بازو پر چل رہی ہو تو اسے مارتے ہوئے ہم ہچکچاتے ہیں' گھبراتے ہیں اور اسے اٹھا کر ہم نیچے رکھ دیتے ہیں۔ یا پھونک مار کر اڑا دیتے ہیں۔''

دھوپ اب آدھے فرش تک آ گئی تھی اور اس کی روشنی میں ٹھاکر داس غیر معمولی طور پر زرد اور بے تاب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تیسرا سگریٹ جلایا۔

''وہاں تم بے ضمیر ہو کر مار دیتے ہو۔ بالکل صاف' بے داغ، ضمیر کے ساتھ اور مر بھی جاتے ہو۔''

''میدان جنگ میں موت کی تکلیف نہیں ہوتی؟'' نعیم نے تمسخر کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں۔ شاید...... پتہ نہیں۔ پر میں نے لوگوں کو چوہوں کی طرح مرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ ختم کیا اور دروازے سے باہر اچھال دیا۔ اس کا ایک گھٹنا تیزی سے ہل رہا تھا۔ ''میں اپنی موت سے نہیں ڈرتا۔ لیکن میرے دو بچے ہیں۔''

لنگر پر کھانے کا پہلا بھونپو ہوا۔

''عورت کو دوسرا خاوند مل جائے گا' پر بچے۔ میری بیوی کا پہلے خاوند سے بچہ ہے' مجھے پتہ ہے میں کبھی اسے اپنے بچے کی طرح نہیں دیکھ سکتا۔''

''اچھا؟'' نعیم نے لیٹے لیٹے تمسخر سے کہا۔

ٹھاکر داس نے دل میں گالی دی اور دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ ''یا میں اپنی موت سے خوف زدہ ہوں؟'' اس نے سوچا۔ ''بدبخت اس کے دل میں کیا ہے۔''

دوسرے خیموں میں کھانے کے برتن کھنک رہے تھے اور سپاہیوں کی تیز' کرخت آوازیں آ رہی تھیں۔

تین دن تک رجمنٹ سفر میں رہی۔ گاڑی بالکل ویسی تھی جیسی فیروز پور سے ملی تھی; مال گاڑی جس میں گھاس بچھایا گیا تھا۔ رجمنٹ میں نو انگریز افسر' انیس ہندوستانی افسر اور سات سو نوے سپاہی تھے۔ دلفریب پہاڑی علاقے میں سے وہ تین دن اور تین رات تک گزرتے رہے۔ راستے میں وہ جنرل سیور یئرز کی فوج کے قریب سے گزرے جو پندرہویں ریجن کی کمان کر رہا تھا۔ سفر کے اختتام پر وہ سرکاٹ کیمپ' آرلینز پہنچے۔

سرکاٹ کیمپ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ تین اطراف سرسبز' کہنہ سال پائن کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑ تھے' نیلے برفانی چشمے جن کے بیچوں بیچ بہتے تھے۔ روٹ مارچ کرتے ہوئے جہاں چشموں پر رکتے' پیاس بجھاتے' تہہ میں چمکتے ہوئے رنگ برنگے پتھر اور سیپیاں چن کر جیبوں میں بھرتے' پائن کی خوشبو دار چھاؤں میں دم لیتے' پھر بڑی بڑی چٹانوں پر سے گھوم کر بوٹوں سے کنکر اڑاتے ڈھلانوں پر اُتر جاتے۔ پہاڑیوں پر اِکا دُکا مکان ملتے جو عموماً انگور کی بیلوں میں چھپے ہوتے اور آس پاس سفید' ریشمیں بھیڑوں کے ریوڑ چرا کرتے۔ کہیں کہیں کوئی مختصر سا گاؤں آ جاتا۔ رجمنٹ وہاں سولہ دن تک ہیڈ کوارٹرز کے احکام کے انتظام میں رکی رہی۔

ان کے قیام کے پانچویں روز ڈیوک آف کناٹ کے لڑکے ہزرایل ہائی نس پرنس آرتھر آف کناٹ نے رجمنٹ کا معائنہ کیا۔ سفید گھوڑے پر سوار' سفید اور سرخ شاہی وردی میں ملبوس وجیہہ شہزادے نے صبح کی ہلکی سرد دھوپ میں انہیں مخاطب کیا۔

''مجھے وہ راحت ابھی تک یاد ہے جو چند برس پیشتر رجمنٹ کو ہانگ کانگ میں دیکھ کر مجھ کو ہوئی تھی۔ اور آج آپ کو یورپ میں برٹش فوج کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لیے تیار دیکھ کر مجھے دگنی خوشی ہوئی ہے۔ میں آپ کی خوش قسمتی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ چند روز تک محاذ پر ہماری ملاقات ہوگی۔ میں اپنے والد' رجمنٹ کے کرنل ان چیف کو لکھوں گا کہ آپ بہترین حالت میں ہیں۔'' سپاہی دور تک' آنکھوں کے کونوں سے' شاندار سوار کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

سترہویں دن وہ آرلینز سے اسی گاڑی میں سوار ہوئے اور اگلے روز ایک نامعلوم مقام پر جا کر اترے جہاں پر چاروں طرف کاغذ سازی کے کارخانے تھے۔ روٹ مارچ کرتے ہوئے نمبر 57 فرنٹیئر فورس کے پاس سے

گزرے۔ لمبی لمبی مونچھوں اور چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں والے پٹھان سپاہی' جو خاردار تار کے اندر برتن دھو رہے تھے' اپنے دیس کے جوانوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلانے اور تیز' باریک آواز میں ''ہواو...... ہواو'' کرنے لگے۔ اگلے دن شام کے اندھیرے میں دور سے چیونٹیوں کی طرح رینگتی ہوئی فوجی بسوں کی قطار نظر آئی۔ نمبر 129 ڈیوک آف کناٹس اون بلوچ رجمنٹ والوں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور وہ تاروں پر ہاتھ رکھ کر دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ انتظار کرنے لگے۔

''ہمارا لاریوں کا حصہ آ گیا۔''

''کل ہم محاذ پر ہوں گے۔''

''میں توپ کی آواز یہاں سے سن سکتا ہوں۔''

دوسرا سپاہی ہنسا۔ ''پھر تم رستے میں ہی مر جاؤ گے۔ کبھی گولہ نہ دیکھ پاؤ گے۔ ہاہا......''

''دانت مت نکالو۔''

''محاذ یہاں سے دو سو میل پر ہے۔ سٹاف کیپٹن کہہ رہا تھا۔ بلجیئم میں۔''

''فرانس میں لڑائی نہیں ہو رہی کیا؟''

''اس طرف نہیں۔''

بسیں آ کر نمبر 57 فرنٹیئر فورس کے پاس رک گئیں اور رجمنٹ سوار ہونی شروع ہوئی۔ بلوچیوں کے ہاتھ نیچے آ پڑے اور آنکھیں ماند پڑ گئیں۔ اس رات چند یونٹوں کو کاغذ کے کارخانوں کے اردگرد ان مکانوں میں پوسٹ کیا گیا جو نمبر 57 ایف۔ ایف۔ کے جانے سے خالی ہو گئے تھے۔

(۹)

اگلے روز رجمنٹ کو اپنا گاڑیوں کا حصہ مل گیا اور وہ انتالیس گھنٹے کے سفر کے بعد بلجیئم کی سرحد پار کر کے میدانِ جنگ میں داخل ہوئے۔ گاڑیاں انہوں نے آرکس کے مقام پر چھوڑیں اور ہولی بیک میں قیام کیا۔

اصل محاذ ہولی بیک سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ سارے مکان اور دکانیں شہری آبادی سے خالی ہو چکے تھے۔ مکانوں پر گورے رسالوں' رجمنٹوں اور توپ خانے کا قبضہ تھا۔ جن میں تین یورپی اقوام کے لوگ بیلجیئن' فرانسیسی اور انگریز شامل تھے۔ دو منزلہ مکانوں کے تمام کمرے گورے سپاہیوں' اسلحہ بارود' باورچیوں اور راشن کے ڈبوں سے بھرے پڑے تھے۔ ہیڈ کوارٹر سٹاف الگ الگ مکانوں میں تھا۔ مکانوں سے ذرا فاصلے پر دکانیں تھیں جنہیں خالی کر کے فرش پر مکئی کے ناڑ بچھائے گئے تھے۔ ان میں رسالوں کے گھوڑے اور خچر بند تھے۔ جو دکانیں بچ رہی تھیں وہ ہندوستانی فوجیوں کے لئے مخصوص کی گئیں۔

اکتوبر کے آخری دن تھے۔ باہر تیز سرد ہوا چل رہی تھی اور رات ہولی بیک پر بہت نیچے جھک آئی تھی۔ سپاہی خشک گوشت کے ٹکڑے اور پنیر کھانے کے بعد سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ چند ایک سو بھی چکے تھے۔ پائن کے درختوں کی چوٹیاں دور اوپر اندھیرے میں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں اور ان کی بوڑھی انگلیوں کی طرح جھکی ہوئی جھری دار شاخیں اور تیز نوکیلے سبز پتے رات کے مخصوص اسرار میں سائیں سائیں کر رہے تھے۔ دکان میں تمباکو، پنیر اور مکئی کے ناڑوں کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک خالی الماری میں مدھم سی لالٹین جل رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ دو مشین گنیں جن کی نالیوں پر خول چڑھے تھے، کھڑی تھیں۔ بارود سیکشن کمانڈر کے پاس تھا۔

''خچر محفوظ ہیں؟'' حوالدار ٹھاکر داس نے کمبل تانتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......'' نعیم بستر لگا رہا تھا۔ اس نے چند ناڑ اکٹھے کر کے ان کا سرہانہ بنایا اور ہاتھ سے دبا کر دیکھا۔

''پہرے پر کون ہے؟''

''احمد۔''

''اس کے بعد۔''

''دو بجے ریاض بدلی کرے گا۔'

''سونے سے پہلے چیک کر لینا۔'' ٹھاکر داس نے گھٹنے اٹھا کر بستر کا خیمہ بناتے ہوئے کہا۔

ایک سپاہی نے کمبلوں میں کروٹ بدلی اور بھاری، خواب آلود آواز میں بڑبڑایا: ''یہ تو مکئی بھی سالی سرد ہے۔''

لیٹتے ہی نعیم کے نتھنوں میں خشک مکئی کی مانوس بو داخل ہوئی۔ خواب آلود سانسوں کی حرارت اور انسانی بو آہستہ آہستہ کمرے میں پھیل رہی تھی۔ جب بستر گرم ہو گیا تو اس نے اندر ہی ہاتھ بڑھا کر بوٹ اتارے اور باہر دھکیل دیئے۔ دور کسی مکان میں سے ایک اونچا، کرخت قہقہہ بلند ہوا اور گہری رات میں گم ہو گیا۔

''تمہارے پاس سگریٹ ہے؟'' ٹھاکر داس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......''

''ایک دو۔''

نعیم نے سگریٹ اسے پکڑائے۔ ''دروازے کے پاس چلے جاؤ۔ یہاں مت پینا۔''

''تمہیں نیند آ رہی ہے؟''

''نہیں۔ مگر میں خوب گرم ہو گیا ہوں۔''

''آؤ وہاں بیٹھیں۔''

دونوں کمبل اوڑھ کر دروازے کے پاس ننگے فرش پر جا بیٹھے اور خاموشی سے سگریٹ سلگا کر پینے لگے۔

''فرش بڑا ٹھنڈا ہے۔'' نعیم نے کہا۔

''تھوڑے سے ناڑ کھینچ لو۔ لگنے دو آگ (گالی) جب حملہ شروع ہو گا تو کس کو پتہ ہے اس جگہ کا کیا

حشر ہوگا۔''

نعیم نے ناڑ مروڑ کر فرش پر رکھے اور ان پر اکڑوں بیٹھ کر کمبل کی آرام دہ حرارت محسوس کرنے لگا۔

''محاذ تین میل پر ہے۔'' ٹھاکر داس نے بڑا سا ہاتھ بڑھی ہوئی داڑھی پر پھیرا۔

''خاموش کیوں ہے؟ صرف گیدڑ بول رہے ہیں۔''

''جرمنوں نے ابھی حملہ شروع نہیں کیا۔''

''ہماری لائنوں میں اس وقت کون ہے؟''

''گورا رسالہ۔''

''کیا ضروری ہے کہ جرمن حملہ کریں۔'' تھوڑی دیر کے بعد نعیم نے پوچھا۔

''پتہ نہیں...... '' ٹھاکر داس نے ناڑ چباتے ہوئے کہا۔ ''مگر ان کی فوج زیادہ ہے۔ ایک ڈویژن یا اس سے بھی زیادہ۔''

اس نے سگریٹ پھینکنے کے لئے لوہے کا کواڑ کھولا۔ بھیگی ہوئی سرد ہوا نعیم کے چہرے سے ٹکرائی۔ ایک گیدڑ نے بالکل سامنے آ کر آواز نکالی۔ اگلی دکانوں میں سے خچروں میں بھگدڑ مچنے اور ایک خچر کے مکئی کے ناڑوں پر پیشاب کرنے کی آواز آنے لگی۔ نعیم نے سر باہر نکالا۔

''سپاہی احمد خان۔''

اندھیرے میں سے احمد خان کے رائفل کے دستے پر ہاتھ مارنے اور جواب دینے کی آواز آئی۔

''شاباش......''

باہر ہلکی ہلکی خاموش بارش ہو رہی تھی اور پائن کی چوٹیوں میں بادل پھر رہے تھے۔ تھوڑے وقفے پر بجلی چمکتی۔

''یہ موسم جنگ کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔'' ٹھاکر داس نے تشویش سے کہا۔

نعیم نے خاموشی سے دروازہ بند کر دیا۔

''جب خاموش بارش ہو رہی ہو تو آواز دور تک جاتی ہے اور بجلی۔''

''اچھا ہے کہ آج حملہ نہیں ہوا۔''

''ہاں۔ سب سے زیادہ خطرناک تو برف باری ہوتی ہے۔''

دور مشرقی آسمان پر سے گرر گرر کی آواز آنی شروع ہوئی۔

''وہ...... آ رہا ہے۔'' ٹھاکر داس نے چونک کر کہا۔ وہ کان لگائے سنتے رہے۔ ہلکی گرج دار آواز قریب آ رہی تھی۔ نعیم نے جلدی سے اٹھ کر لالٹین پر بہت سے ناڑ پھینکے۔ واپس آتے ہوئے وہ اندھیرے میں ایک سوئے ہوئے سپاہی سے ٹکرا کر گر پڑا۔ سپاہی نے نیند میں گالی دی اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

باہر نکل کر انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ مہین پھوار سے لکڑی کا پائیدان گیلا اور پھسلواں ہو رہا تھا۔ سامنے اندھیرے میں پائن کے درخت بھاری' سیاہ بھوتوں کی طرح کھڑے تھے۔ خوف ناک آواز دفعتاً بالکل قریب آ گئی۔ ٹھاکر داس اور نعیم بے جان لکڑی کے تختوں کی طرح زمین پر گرے اور بے سدھ لیٹے رہے۔ درختوں کے اوپر ایک دھندلی سبز بتی نمودار ہوئی اور تیزی سے مغرب کی سمت گزر گئی۔

''بدبخت ہزار توپوں کی آواز ہے۔'' ٹھاکر داس نے سرگوشی سے کہا۔

نیم روشن' سفیدی مائل بادل دکانوں کی چھتوں پر آ گئے تھے اور تاریک پھوار خاموشی سے ان کے چہروں کو بھگو رہی تھی۔ وہ اٹھے اور واپس دکان میں داخل ہوئے۔

''یہ ہوائی جہاز تھا۔'' ٹھاکر داس نے اپنے آپ سے بات کی۔

''جرمنوں کا تھا؟''

''پتہ نہیں۔''

''ہری بتی تھی۔''

''سب کی ہری ہوتی ہے۔''

کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے انہوں نے دوبارہ سگریٹ سلگائے۔ ہوائی جہاز کے ساتھ ان کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

''سگریٹ یہیں ختم کر دو۔ مورچوں میں نہیں پی سکتے۔'' ٹھاکر داس بولا۔

''کیوں؟''

''سگریٹ پر گولی پڑے گی اور جبڑے صاف کر جائے گی۔ ہر بات پر کیوں۔ کیوں''

وہ خاموشی سے دھواں اڑاتے رہے۔ کمرے میں سونے والوں کے خراٹوں کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

''شاید کل ہم چلے جائیں۔''

''کہاں؟'

''فائرنگ لائن پر......ایں؟''

نعیم نے ایک لحظے کو اسے غور سے دیکھا۔ ''اب تم کیوں پوچھتے ہو؟''

ٹھاکر داس نے ابرو اٹھا کر کڑی' تمسخرانہ نظر اس پر ڈالی' پھر سگریٹ پر ایک لمبا کش لینے کے بعد نیم خفگی' نیم طنز سے ہنسا۔

''میں اس قدر اکتا گیا ہوں ...... یہاں سے۔''

نعیم خاموشی سے اندھیرے میں دیکھتا رہا۔

''مجھے اس وقت محاذ پر ہونا چاہیے یا گھر۔''

''کیوں؟''

''میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ اتنے مہینے ہو گئے۔ یہاں میری خچروں سے بھی بری حالت ہو گئی ہے۔''

''تمہیں اپنی بیوی سے محبت ہے؟''

''ہاں۔ شاید اسے مجھ سے بڑی محبت ہے۔''

''اچھا۔''

''ہم نے شادی عجیب طریقے سے کی تھی۔ میں عورتوں کا کاروبار کیا کرتا تھا۔''

''کاروبار۔ ایں؟''

''میں اور رام سنگھ۔ ہم لدھیانے' انبالے اور رہتک سے عورتیں اٹھایا کرتے اور پنجاب میں لاکر بیچا کرتے تھے۔ خاص طور پر لائل پور اور سرگودھا میں وہ اچھے دام دے جاتی تھیں۔ یوں ہمیں خود عورتوں کا کوئی چاؤ نہ تھا۔ ہم کبڈی کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے اور سب سے اول جسم اور جان کی رکھوالی کرتے تھے۔ جوانی کا زمانہ تھا۔ بیسیوں عورتیں آئیں اور بیسیوں گئیں۔ کبھی کبھار کوئی پسند آئی تو دو چار روز کے لئے رکھ لیا ورنہ ادھر سے لادا اُدھر بیچا.......لو پیو......''

''میں نہیں پیتا۔'' نعیم نے اس کا سگریٹ والا ہاتھ پیچھے دھکیل دیا۔

''ایک دن میں نے سنا کہ چک نمبر 30 کی ایک کمہاری نے آواز دی ہے چار طرف کے گاؤں میں کہ ہے کوئی ایسا جوان جو مجھے دن دن کو آ کر لے جائے۔ یہ آواز سن کر میری مونچھ کو تاؤ آ گیا۔ میں نے کہا چل رام سنگھ' مگر رام سنگھ دن دن کو جانے سے گھبرائے۔ میں نے ایک عورت بھیج کر پتہ کروایا تو معلوم ہوا کہ اس کا خاوند کمہار اپنے گاؤں کا شہ زور جوان ہے اور رات کے وقت اس کی ماں بیٹے اور بہو کو اندر بند کر کے تالا لگا دیتی ہے' چنانچہ رات کو نکلنا دشوار ہے۔'' اس نے گلا صاف کر کے زور سے فرش پر تھوکا اور بات جاری رکھی۔

''چنانچہ رات کو نکلنا دشوار ہے۔ خیر' بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ عورت کی پکار ضائع نہیں جانی چاہیے۔ میں نے پیغام بھیجا کہ فلاں دن تمہارے گاؤں سے تین مربعے باہر بڑے پیپل کے نیچے دوپہر کو آؤں گا۔ ہمت ہو تو آ جاؤ۔ سخت گرمیوں کے دن تھے۔ دس کوس چل کر میں پیپل کے نیچے بیٹھا۔ بیٹھے بیٹھے دوپہر ڈھل گئی' عورت کا نام و نشان نہیں ملا۔ میں وہیں پر سو گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر سویا تھا کہ چھڑی کی نوک سے کسی نے مجھے جگایا۔ آنکھ کھولی تو ایک بڑا جوان نظر پڑا۔ سر پر منڈاسہ' کمر میں پھولدار لاچا' ہاتھ میں چھڑی۔ میں نے پوچھا ''کیا بات ہے جوان؟'' کہنے لگا۔ ''اب اٹھ اگر چلنا ہے تو۔ مجھے سندیسہ بھیج کر اب سوتا ہے۔'' میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ غور سے دیکھا تو عورت تھی۔ پر نعیم' کیا عورت تھی کمبخت۔ یہاں سارے ولایت میں مَیں نے ایسی جوان اور جلال والی عورت نہیں دیکھی۔'' وہ پُرسرور تبسم کے ساتھ چند لحظے تک فضا میں دیکھتا رہا۔ ''ہم ساری رات اور سارا دن چلتے رہے اور تیس کوس پر جا کر پہلی رات گزاری۔ وہ میرے دوست کا گاؤں تھا۔ سویرے اٹھ کر عورت بولی۔ ''میں تجھ سے بیاہ کروں گی۔'' میں نے کہ ''بیاہ دیاہ کی بات چھوڑ' میں بیاہ کا قائل نہیں ہوں۔'' یہ سن کر وہ رونے لگی

اور رو رو کر برا حال کرلیا۔ خیر وہاں سے ہم گھوڑی لے کر دس دن میں امرتسر پہنچے۔ راتوں رات میں نے اس کے ساتھ سو روپے وصول کئے اور اسے سوتا چھوڑ کر چلا آیا۔

''کوئی دس دن نہیں گزرے ہوں گے اس بات کو ایک دن میں کھیت میں سویا پڑا تھا کہ وہ میری چھاتی پر آن چڑھی۔ میں نے چلاّنا چاہا لیکن اس نے ایک ہاتھ سے میرا منہ بند کیا اور دوسرے سے چھری کی نوک میری گردن پر رکھ دی اور بولی: ''میں سریندری ہوں۔ بول میرے ساتھ شادی کرے گا یا نہیں۔ میں تجھے قتل کر دوں گی۔'' جان کے خوف سے میں نے وعدہ کرلیا۔ راتوں رات اسی کی گھوڑی پر سوار ہو کر ہم گاؤں سے نکل آئے۔ اس نے مجھے اپنے آگے بٹھا کر باہوں میں کس رکھا تھا۔ صبح ایک گاؤں کے مندر میں جا کر ہم نے شادی کرلی۔ پتہ ہے کیسے؟ گھوڑی کی پشت پر اور کسی چوتھے آدمی کے بغیر۔ پنڈت کے سر پر سریندری کی چھری تھی اور وہ گھوڑی کی باگ پکڑے پھیرے دے رہا تھا اور اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔'' وہ اندھیرے میں آہستہ سے ہنسا۔ ''سریندری نے چند روپے کھول کر اس کی طرف پھینکے اور ہم لوٹ آئے۔ اس رات کو وہ مجھ سے لپٹ کر روتی رہی۔ میں نے کہا: ''روتی کیوں ہے۔ اگر میں شادی نہ کرتا تو تُو مجھے قتل کر دیتی۔'' کہنے لگی۔ ''وہ تو صرف دھونس تھی۔ اگر تم شادی نہ کرتے تو میں اپنے آپ کا خون کر لیتی۔ تم مرد ہو۔ تم کیا جانو عورت کے دل میں کیا ہے۔'' رات بھر وہ میرے ساتھ لپٹی چھوٹی سی کمزور چڑیا کی طرح روتی رہی۔ آج دس برس ہوگئے اس بات کو اور اس نے آج تک میرے سامنے آنکھ نہیں اٹھائی۔ اب وہ میری بیوی ہے۔''

وہ ایک لمبی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ لالٹین کی بتی جھلملا رہی تھی۔ اور فرش پر سوئے ہوئے سپاہیوں کی ٹانگیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ ساتھ والی دکان میں کوئی گا رہا تھا۔

''اب وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ جائے تو......؟'' نعیم نے کہا۔

''نہیں۔ وہ نہیں جائے گی۔ جس مرد کے ساتھ اس کا دل نہیں تھا اسے اس نے بول کر کہہ دیا تھا کہ تو مجھے لاکھ تالے میں رکھ' ایک نہ ایک دن میں چلی جاؤں گی۔ میرے گھر میں اس نے دو بچے دیئے ہیں اور اونچی آواز سے بات نہیں کی ہے۔ اب وہ کہیں نہ جائے گی۔ تم نہیں جانتے نعیم' عورت جب محبت کرنے پر آتی ہے تو ختم ہو جاتی ہے۔ محبت کرنے کے لئے اتنا بڑا دل چاہیے۔ وہ دلیر عورت ہے۔ میں جانتا ہوں۔ ورنہ میں نے ایسی بھی عورتیں دیکھی ہیں جو ایک گھر میں پانچ پانچ بچے جننے کے بعد دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔'' وہ رُکا۔ ''عورتیں بُری نہیں ہوتیں۔ یہ میرا یقین ہے' پر اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے۔ جس کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ اسے ساری عمر دھوکہ دہی سے کام لینا پڑتا ہے۔''

ٹھاکر داس نے اپنے نیچے سے ناڑ نکال کر سوئے ہوئے سپاہیوں پر پھینکے اور کمبل جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم پہلے شخص ہو جس کو میں نے یہ قصہ بتایا ہے۔''

نعیم نے سر باہر نکالا۔ ''سپاہی ریاض احمد...... شاباش۔'' اس نے دروازہ بند کر دیا۔

''بارش ہو رہی ہے؟'' ٹھاکر داس نے پوچھا۔ نعیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا بستر سیدھا کر رہا تھا۔ ساتھ کی دکان میں گانے والے سپاہی کی کرخت، غمگین، بھاری آواز چھوٹے چھوٹے سُر بناتی رات کے اتھاہ سناٹے میں گم ہو رہی تھی۔ بادل پھٹنے سے چاند سامنے آ گیا تھا اور گیلے پائن کی بوڑھی انگلیاں اور لمبے نوکدار پتے روشن آسمان کے مقابل سیاہ اور ساکت تھے اور ان پر سے پانی کے قطرے خاموشی سے نیچے پتھروں پر گر رہے تھے۔

ٹھاکر داس کمبلوں میں ہلا اور بولا: ''مگر میرے دو بچے ہیں۔''

''مت سوچو...... مت سوچو۔'' نعیم نے بستر میں دھنستے ہوئے کہا۔

''رات بہت گزر گئی ہے۔''

دوسرے دن وائپرس پر جرمن حملہ شروع ہوا جو آخیر نومبر تک رہا۔ آرکس سے نمبر 129 بلوچ رجمنٹ (ڈیوک آف کناٹس اون' 7th فیروز پور بریگیڈ) مارچ کر کے بیلول تک پہنچی۔ وہاں جنرل فرنچ اپنی سیاہ کار میں آیا اور فیروز پور بریگیڈ کو سیکنڈ کیولری ڈویژن سے جا کر ملنے کے احکام جاری کئے۔ اسی شام کو رجمنٹ موٹر لاریوں میں سوار ہو کر رات کے وقت سینٹ الوئی پہنچی اور بریگیڈیئر جنرل واہن کے حوالے کر دی گئی جو تھرڈ کیولری بریگیڈ (سیکنڈ کیولری ڈویژن) کی کمان کر رہا تھا۔

صبح سویرے وہ فائرنگ لائن پر پہنچے اور 16th اور 5th لانسرز نے مورچے سنبھالے۔ کیولری کے دستے وِتشت اور زندرورد کے درمیان کے سارے علاقے پر چھائے ہوئے تھے۔ دایاں بازو پلوگ سٹریٹ کے جنگل کے شمال مشرقی کونے کی آڑ میں تھا۔ یہ خوب صورت اور خاموش جنگل شمال کی طرف دور تک پھیلتا ہوا چلا گیا تھا۔ آگے جا کر سرسبز پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جس پر جنگل یوں چڑھ گیا تھا جیسے ہاتھیوں کا لشکر ہموار زمین پر چلتے چلتے ایک دم پہاڑ پر چڑھنے لگے اور چوٹی تک چلا جائے۔ گھاس جو کبھی کاٹا جاتا ہوگا' بے تحاشا اگا ہوا تھا اور اس میں جھڑے ہوئے زرد پتے اٹکے تھے۔ یہ خزاں کا موسم تھا۔

جنگل کے شمال مشرقی کونے سے پندرہ قدم ہٹ کر کھلی جگہ میں انہوں نے مشین گن نصب کیں۔ انہیں مورچوں میں ان سے پہلے 5th اور 16th لانسرز پڑے تھے اور ان کے چھوڑے ہوئے راشن کے خالی ڈبے' ٹوٹے ہوئے سخت بسکٹ' کاغذ کے ٹکڑے اور جلے ہوئے سگریٹ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ ٹھاکر داس اور نعیم نے اپنے سیکشن کو مورچوں میں جمایا' گنوں کو آہنی ٹانگوں پر باندھا اور آٹھ آٹھ جوان ہر دو مشینوں پر مقرر کئے۔ اسی خندق میں دو اور سیکشن بیس بیس گز کے فاصلے پر مورچے سنبھالے ہوئے تھے اور ان کی چار مشین گنیں پہلے سے کھدی ہوئی بنیادوں پر نصب تھیں۔ شمالی محاذ پر جرمن حملہ شروع ہو چکا تھا اور توپ خانے کے فائر کی مسلسل آواز جنوبی مورچوں تک آ رہی تھی۔ ان سے آگے زیریں سطح پر واقع خندقوں میں کیولری کے دستے تھے۔ سیکنڈ کیولری ڈویژن نہر کے پل اور ہولی بیک کے مشرقی بازو کے درمیان ساڑھے تین میل لمبے رقبے کو گھیرے ہوئے تھا۔

خندقیں ایک سے ڈیڑھ میل تک لمبی تھیں۔ تھرڈ بریگیڈ بائیں بازو پر تھا۔

سورج تمام دن ان کے آہنی خودوں پر چمکتا رہا اور وہ خندقوں میں سر چھپائے احکام کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ خندقیں گیلی اور سرد تھیں اور ان میں عجیب و غریب شکلوں والے ننھے ننھے کیڑے رینگ رہے تھے۔ ٹھاکر داس نے خود اتار کر گھٹنے پر رکھا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''حوالدار نور محمد کہاں ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''آؤٹ پوسٹ پر ہے۔'' ٹھاکر داس نے آہستہ سے ایک کیڑا اٹھا کر خود پر رکھتے ہوئے کہا۔

''کہاں پر؟''

''رجمنٹل ہیڈ کوارٹر سٹاف کی عمارت۔ چوٹی کی منزل۔''

''اگر مجھے مل جائے تو کچا چباؤں۔'' نعیم نے سخت غصے میں مشین گن کی ٹانگوں پر ٹھوکر ماری۔ ''کہہ رہا تھا آج صبح ہم ضرور حملہ کریں گے۔''

ٹھاکر داس خفگی اور طنز سے ہنسا۔ ''ہر کوئی اپنے کو بریگیڈیئر جنرل واہن سمجھتا ہے۔'' پھر وہ خود پر چلتے ہوئے کیڑے سے کھیلنے لگا۔ ''ہم حملہ نہیں کریں گے۔''

''پھر؟''

''جرمن پہلے کریں گے۔ شمال میں بھی انہوں نے ہی کیا ہے۔''

''تم بھی بریگیڈیئر جنرل واہن ہو۔''

''ایں؟ تمہاری طبیعت اب کھلنے لگی ہے' بچے۔''

سامنے اونچی نیچی زمین پر سورج غروب ہو رہا تھا اور غیر کاشت شدہ پتھریلی زمین مکئی کے رنگ کی تھی۔ خشک ٹہنیوں اور زمین کی ہم رنگ گھاس کی اوٹ میں خندقوں کے اندر ہزاروں سپاہیوں کے بیک وقت سرخ اور زرد' مشتاق اور مضطرب' اعصابی چہرے ساکن تھے اور خوف زدہ ہوشیار آنکھوں میں انتظار کی تھکن نمایاں تھی۔ ان سب کے کان شمال کی طرف لگے ہوئے تھے جہاں سے ہلکی ہلکی' بادل کے گرجنے کی سی' توپ خانے کی آواز آ رہی تھی۔ سامنے تقریباً ایک میل پر دشمن کے مورچوں میں حرکت ہو رہی تھی۔

''بھینچود......'' نعیم نے گالی دے کر بوٹ کی ایڑی سے کیڑوں کی پوری قطار کچل دی۔

ٹھاکر داس بسکٹ چبا رہا تھا۔ اس نے چند بسکٹ خود میں ڈال کر نعیم کی طرف بڑھائے۔

''مجھے بھوک نہیں۔'' اس نے خفگی سے کہا اور کمر سے چھاگل کھول کر پانی پینے لگا۔

''اپنا پانی مت ختم کرو۔ مورچے میں دو چیزوں کی بڑی قیمت ہے۔ بارود اور پانی۔ بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ دشمن کو ختم کرنے کے بعد سب سے پہلے اس کی چھاگل تلاش کرنی پڑتی ہے۔''

نعیم کا دماغ ایک بے وجہ غصے اور تکان کی گرفت میں تھا۔ اس نے جواب دیئے بغیر کیڑوں کو کچلنا جاری رکھا۔

ٹھاکر داس گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ ''ریاض پٹیاں لے آئے؟''

''لے آیا۔''

''گل محمد اب تم جاؤ۔'' اس نے حکم دیا۔ ''حملے کے اندر اسی طرح بارود کے لئے دوڑنا پڑے گا۔ ریاض اور رام لعل، تم انہیں خالی کر کے پھر سے بھرو۔ ڈھائی سو راؤنڈ تین منٹ میں نکلتا ہے۔ خالی مت بیٹھو، مشق کرو۔ خالی بیٹھے بیٹھے تم ایک دوسرے کو قتل کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگو گے۔''

اس نے کنکھیوں سے نعیم کی طرف دیکھا جو بینٹ کو چوڑا کر کے کیڑوں پر مار رہا تھا۔

''مت مارو انہیں۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''اپنے مورچے میں مت کسی کو مارو۔ میدان جنگ کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔''

نعیم نے بینٹ کی مدد سے مرے ہوئے کیڑوں کو چھوٹے سے ڈھیر میں اکٹھا کیا اور گھٹنوں کے بل اٹھ کھڑا ہوا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ خندق کی دیواروں اور مشین گنوں کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے سپاہیوں کے خود زمین کی سطح پر نظر آ رہے تھے۔ گل محمد گھسٹتا گھسٹتا توپ خانے کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس نے رک کر لیٹے لیٹے سیلوٹ کیا۔ سیکشن کمانڈر کیپٹن ڈل جواب دیتا ہوا قریب سے گزرا۔ آگے جا کر کیپٹن نے ایک لمبے اور پتلے انگریزی آرٹلری آفیسر سے کوئی بات کی اور پھر سیدھا ان کے مورچوں کی طرف آیا۔ باری باری اس نے ساری مشین گنوں پر رک کر بات کی۔

''شاباش جوانو۔ ڈٹے رہو۔ کل ہم حملہ کریں گے۔'' جاتے جاتے وہ ایک پیکٹ سگریٹ ٹھاکر داس کی طرف پھینک گیا۔

''کل حملہ کریں گے، سؤر...... یہ تیسری بار ہے۔ گپ مارنے یہیں آتا ہے۔'' ٹھاکر داس نے کہا۔

دونوں نے سگریٹ سلگائے۔ باقی پیکٹ ٹھاکر داس نے سپاہیوں کی طرف اچھال دیا۔ وہ آنکھیں چمکا کر سگرٹوں کی طرف لپکے۔

''پر اب سر نہ اٹھے لونڈو۔'' اس نے تنبیہاً کہا۔

''رات کے لئے ہمیں اور سگریٹ چاہیں۔'' نعیم نے کہا۔

''رات کے لئے تمہیں عورت بھی چاہیئیں، ایں؟'' وہ کھردرے پن سے ہنسا۔

''سگریٹ تو ہیں۔ اتنے خوش کیوں ہو رہے ہو۔''

وہ خاموش بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ ٹھاکر داس نے پیٹھ پر سے تھیلا اتارا اور سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ آسمان پر اِکا دُکا ستارے نکل آئے تھے اور مغرب کی طرف سے بادل اٹھ رہا تھا۔

''میری بات کا غصہ مت کرو۔'' ٹھاکر داس نے کہا۔ ''میں نے بڑی خندقیں دیکھی ہیں۔ میں سپاہی تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ سپاہیوں کو بھی سگرٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ خندق بڑی خطرناک جگہ ہے۔ یہاں سپاہیوں کی دیکھ

بھال پالتو جانوروں کی طرح کرنی پڑتی ہے۔ مجھے حکم دینا ہے اور انہیں لڑنا ہے اور مرنا ہے۔ لیکن جب حملہ شروع ہوگا تو وہ خود اپنے انچارج ہوں گے، اور گنوں کے اور میدان جنگ کے انچارج ہوں گے۔ اس بات کا انحصار کہ وہ کس طرح لڑتے ہیں اور کس طرح مرتے ہیں، اس وقت پر ہے۔ اس وقت پر نہیں۔ میں اپنی ڈیوٹی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' وہ گیلی، نرم دیوار میں ناخن چھوتا رہا۔ نعیم بڑھتے ہوئے اندھیرے میں غور سے اس کے چہرے کے مضبوط، کسی حد تک ظالمانہ نقوش کو دیکھتا رہا۔

''اور تمہیں پتہ ہے اس خندق میں ہمیں کب تک رہنا ہے؟ کسی کو پتہ نہیں۔ اگر تم ہنسو گے نہیں تو حملے سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔ سنا؟'' ٹھاکر داس نے کہا۔

نعیم بے دلی سے ہنسا۔ خندق میں گہرا اندھیرا تھا۔ دوسری مشین گن کے پاس ایک سپاہی باریک دھیمی آواز میں کوئی دیہاتی گیت گا رہا تھا۔ دوسرے اس کے گرد بیٹھے سن رہے تھے۔ دو سگریٹ سلگے ہوئے تھے اور وہ سپاہیوں کے دائرے میں باری باری گھوم رہے تھے۔ خندق کے اوپر تیز سرد ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بادل آدھے آسمان پر پھیل چکے تھے۔ شمالی محاذ کی طرف سے آنے والی توپ خانے کی آواز بند ہو چکی تھی۔

ٹھاکر داس نے مونچھ کو جھکا کر دانتوں میں چبایا: ''نعیم یہ موسم دیکھتے ہو؟''

''ہوں۔''

''اسی موسم میں میں اور وہ عورت شادی کرنے کے لئے گاؤں سے بھاگے تھے۔ حیرت کی بات ہے۔ ہُو بہو ایسا بادل تھا۔''

نعیم نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ چند لمحے کے اندر اندر نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہوگئی اور اس کے معدے میں ایک پرانا، مانوس، بدمزہ سا بھاری پن پیدا ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس شخص سے جو اس کا افسر ہے اور تاریکی میں خندق کی دیوار کے ساتھ لیٹا ہوا ہے، انتہائی نفرت کرتا ہے۔ یہ وہ احساس تھا جو کئی دن سے آہستہ آہستہ اس کے دل میں پیدا ہو رہا تھا اور جس کی خاطر اس کا دماغ مستقل غیر یقینی، سست حالت میں کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت دفعتاً وہ احساس، خطرے اور کرب کی وجہ سے جاگے ہوئے دماغ میں ایک مکمل جذبے، ایک بڑے واضح تعصب کی شکل میں ظاہر ہوگیا تھا۔ بہت عرصے کے بعد پہلی دفعہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو کسی نامعلوم قوت کے اثر سے چھڑا کر تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

اس نے نفرت سے خندق میں تھوکا۔ ''عورتوں کا ذکر کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔''

ٹھاکر داس بھاری گلے سے ہنسا۔ نعیم نے منہ میں بدمزگی محسوس کی اور دوبارہ تھوکا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟''

نعیم نے انتہائی کوشش سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ ''شاید تمباکو خراب تھا۔''

''ولایتی تمباکو تھا۔'' ٹھاکر داس نے کہا۔
دونوں خاموش بیٹھے اندھیرے میں جاگنے کی کوشش کرتے رہے۔

آدھی رات کے بعد بارش شروع ہوگئی اور متواتر چار گھنٹے تک ہوتی رہی۔ ترپالوں کے لئے سپاہی بھیجا گیا مگر وہ ختم ہو چکی تھیں۔ صرف توپ خانے والوں سے کینوس کے چند بستر بند حاصل ہو سکے جنہیں خیمے کی شکل میں خندق کے اوپر لگایا گیا اور پانی کو روکنے کے لئے بند بنائے جانے لگے۔ لیکن جب بارش تھمی تو خندق میں چھ چھ انچ پانی بھر چکا تھا۔ انہوں نے راشن کے خالی ڈبوں سے پانی نکالنا شروع کیا۔ سیکشن کمانڈر برساتی اور دستانے پہنے کنارے کنارے پھر رہا تھا۔ کبھی کبھی ٹھہر کر بات کرنے لگتا: ''شاباش جوانو۔ آواز نہ نکلنے پائے۔ شاباش۔''

چاروں طرف ڈبوں کے زیر آب ڈوبنے اور پانی کے بہنے کی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ صبح سے پہلے کی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور پانی کے جھپاکوں کی آواز تیز ہوا کے ساتھ دور تک جارہی تھی۔ سپاہیوں کے لمبے فوجی کوٹ بھیگ چکے تھے۔ ان کے بوٹوں میں پانی گھس گیا تھا اور وہ سردی سے کانپ رہے تھے۔ دشمن کے مورچوں کی طرف سے گرر گرر کی جانی پہچانی آواز آنی شروع ہوئی اور دور آسمان میں ننھی سی سبز بتی رینگنے لگی۔

''وہ آیا۔'' زیر لب بہت سی آوازیں آئیں۔ سارے سپاہی ایک ساتھ سر کے بل خندق میں گرے۔ ان کے کانوں اور نتھنوں میں کیچڑ گھس گیا اور انگلیاں نرم زمین میں دھنس گئیں۔ کچھوؤں کی طرح اوندھے منہ کیچڑ میں وہ اس وقت تک پڑے رہے جب تک کہ ہوائی جہاز خوف ناک آواز پیدا کرتا ہوا اوپر سے گزر نہ گیا۔

''اچھا ہے کہ ہمارے پاس خراب ہونے کو کچھ بھی نہیں۔'' اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے ٹھاکر داس ہنسا۔
''اوہ ٹھیک ہے۔'' کیپٹن ڈل اپنی نفیس برساتی پر سے کیچڑ صاف کرتا ہوا سادگی سے ہنسا۔ ''میرے اوپر مت ہنسو۔ ہوسکتا ہے میں تم سے پہلے مرجاؤں۔''

صبح ہونے تک خندقوں میں صرف کیچڑ رہ گیا تھا۔ پھونکیں مار مار کر گیلی لکڑیوں کو جلایا گیا۔ لیکن دھواں اٹھنے پر فوراً بجھا دیا گیا۔ جو پانی نیم گرم ہوا اسی سے سپاہی چائے بنا کر پینے لگے۔ بے خوابی اور دھوئیں کی وجہ سے ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

''تم نے الگ چولہا کیوں بنایا ہے؟'' ٹھاکر داس نے پوچھا۔
''ٹھیک ہے۔''
''دھواں اٹھ رہا ہے۔ اسے بجھا دو۔ اور کوٹ سوکھنے کو پھیلا دو۔ پھیپھڑوں کو سردی لگ جائے گی۔''
''ٹھیک ہے۔'' نعیم نے پتھریلے لہجے میں دہرایا۔
''ٹھیک ہے؟ کیا ٹھیک ہے؟'' ٹھاکر داس غصہ دباتے ہوئے بولا۔
نعیم پیٹھ موڑے گیلے ایندھن میں پھونکیں مارتا رہا۔

''لانس نائک نعیم احمد خان......''

نعیم ایک جھٹکے سے مڑا اور پاگلوں کی طرح دانت ننگے کر کے چیخا:

''مجھے چائے بنانے دو۔''

''میں تمہیں حکم دیتا ہوں......'' ٹھاکر داس گرجا اور آگے بڑھ کر اپنے بڑے بڑے بوٹوں سے مسل کر ادھ جلی لکڑیاں بجھانے لگا۔

نعیم نے کھینچ کر سر سے ٹوپی اتاری اور اس کی طرف پھینکی جو اڑتی ہوئی ٹھاکر داس کے کان کے پاس سے گزر گئی۔ پھر اس نے رائفل کو سلنگ سے پکڑ کر اس کی طرف اچھالا۔ وہ اسی طرح جا کر خندق کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

''لو۔'' وہ جانوروں کی طرح چیخا۔ ''لو۔'' کچھ دیر تک وہ بدنما چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا' پھر پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھاکر داس نے کندھے اچکائے اور بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

''لانس نائک کورٹ مارشل کروانے کی فکر میں ہے۔'' دوسری مشین گن کی ٹانگوں سے ٹیک لگا کر بیٹھے بیٹھے ایک سپاہی نے لاپروائی سے کہا۔ اس کے چہرے پر میل کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔

سورج پوری حدت اور چمک کے ساتھ اوپر آ رہا تھا اور بارش کے بعد فضا کے رنگ گہرے ہو گئے تھے۔ پلوگ سٹیرٹ کا جنگل سیاہی مائل سبز اور پُرسکون تھا۔ خندقوں میں بے خوابی اور تکان سے چُور غلیظ سپاہی' ٹیک لگائے بیٹھے' میلے برتنوں میں چائے پیتے ہوئے' سورج کی صحت بخش حدت کو اپنے سرد اور گیلے جسموں پر محسوس کر رہے تھے۔ باہر ڈھلوان زمین پر ان کے بڑے کوٹ پھیلے ہوئے تھے۔ گیلی' سیاہ زمین بھاپ چھوڑ رہی تھی۔ ٹھاکر داس دیر تک چائے کے ساتھ بسکٹ چباتا رہا۔ اس کے پتھریلے چہرے کی ایک ایک ہڈی اور پٹھا حرکت کر رہا تھا۔ کیچڑ کا ایک ننھا سا قطرہ اس کے ابرو پر جم گیا تھا۔ مگ خالی کر کے اس نے دوبارہ اسے چائے سے بھرا اور نعیم کی رائفل اٹھا کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''میدان جنگ میں پہلے ہی کیا کم دشمن ہیں۔ ایں؟'' اس نے رائفل اس کی طرف اچھالی اور مگ آگے بڑھایا۔ نعیم نے رائفل کو ہوا میں پکڑا اور بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

اس دن کیولری کے دستوں کو پیچھے ہٹا لیا گیا۔ تمام دن کوئی مزید احکام وصول نہ ہوئے اور تیز دھوپ نے گیلی خندقوں میں سے جو بھاپ اڑائی اس سے گھبرا کر سپاہی جھکے جھکے چلتے ایک سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے۔ رات کو بادل پھر جھوم کر اٹھا اور تھوڑی سی بارش کے بعد برف گرنے لگی۔ ہندوستان کے گرم ملک سے آنے والے سپاہیوں نے برف باری پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ خندقوں میں سے منہ نکالے اندھیرے میں گرتی ہوئی برف کو محسوس کر رہے تھے۔ مشین گن نمبر ایک کے پاس ادھ گیلی ٹہنیوں کی آگ جل رہی تھی اور ٹھاکر داس بینٹ کی مدد سے بوٹوں کے تلووں سے کیچڑ چھڑا رہا تھا۔ اوپر رائفلیں ایک دوسرے کے سہارے کھڑی کر کے بستر بند کا خیمہ بنایا گیا تھا۔

دوسری گن کے پاس سپاہی نیم غنودگی کی حالت میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ درمیان میں آگ جل رہی تھی۔ ایک سپاہی سنجیدگی سے بیٹھا آگ پر جرابیں سکھا رہا تھا۔ دیواروں پر ان کے چھوٹے بڑے سائے کانپ رہے تھے۔

نعیم دیر سے اپنی رائفل پر جھکا' منہ باہر نکالے دیوار کے سہارے کھڑا تھا اور برف کے ننھے ننھے پھوہے خاموشی سے اس کے چہرے اور بالوں پر گر رہے تھے۔ ''برف باری میں نے شملے میں دیکھی تھی۔ وہاں بھی پائن کے درخت تھے' شاید چیڑ کے تھے۔ یاد نہیں رہا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور جنگل جو ہمارے گھر کے اوپر اور نیچے اور ہر طرف تھا' اور پہاڑ کی ڈھلان پر ہمارا گھر تھا' فلاور۔ مے فلاور؟ ایسے کوئی نام تھا۔ پتہ نہیں۔ اور وہ لڑکا شاید میرا پہلا دوست تھا۔ وہ گھر کے دوسرے حصے میں رہتے تھے۔ لکڑی کے برآمدے میں ریلنگ پر جھک کر ہم برف باری دیکھ رہے تھے۔ ایسی ہی رات تھی۔ شاید وہی رات ہو اور پھر سے آئی ہو۔'' وہ دل میں ہنسا۔ ''اس کی سفید بلی پاؤں میں بیٹھی تھی اور برف چھتوں پر' درختوں پر' پتھروں پر اور دور دور چوٹیوں پر' جہاں صرف برف گرتی ہے' خاموشی سے گر رہی تھی۔ اور کمرے میں اس کی بہن منہ والا باجا بجا رہی تھی۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر تازہ گری ہوئی برف پر رکھا۔ ''وہ لڑکا اب کہاں ہے؟ دیپک۔ حیرت ہے وہ اب کہاں ہوگا؟ میرے اللہ میرا دوست کہاں ہے؟'' وہ آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا۔ ''شاید ڈاکٹر بن گیا ہو۔ جب بارش ہوئی تھی تو نالہ' جو ہمارے گھر کے پاس سے گزرتا تھا' اس میں کشتیاں چھوڑنے گئے تھے جو اس کی بہن نے بنائی تھیں' تب اس نے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر بننے والا ہے۔ وہ تمام دن رنگ برنگ پتھر جمع کرتا اور انہیں پیس پیس کر بلی کو کھلاتا رہتا تھا۔ جو اس کی مریض تھی۔ میرا پیارا دوست۔ برف باری رک گئی ہے؟ نہیں جاری ہے۔ صرف کم ہوگئی ہے۔ چھت پر' درختوں پر' دشمن کے مورچوں پر...... آج سارا دن میں نے اس سے بات نہیں کی۔ ٹھیک ہے میں اسے پسند نہیں کرتا۔ کیوں؟ پتہ نہیں۔ نہیں نہیں' یہ بات نہیں۔ اگر ہے بھی تو ٹھیک ہے۔ سؤر۔ خندق میں وہ اس قدر مطمئن ہے۔ بھیڑیا۔ جانتا ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا' پھر بھی ہنستا ہے۔ مکار۔ ہر وقت کھاتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں ان جانوروں کو خندق میں بھی اتنی بھوک لگتی ہے۔''

گہری' تیز نفرت رینگ کر اس کے دل میں داخل ہوئی اور اس کے سارے وجود کو گرفت میں لے لیا۔ برف باری کی اس رات میں انسانوں کے پھیلے ہوئے' پوشیدہ سمندر کے درمیان اس نے اپنے آپ کو بے حد تنہا محسوس کیا۔ دیر تک وہاں کھڑا وہ محبت' نفرت اور حسد کے جلتے ہوئے جذبوں کی اذیت سہتا رہا۔

برف باری تھم چکی تھی۔ بادل پھٹنے پر چاند ظاہر ہوگیا اور چاروں طرف ساری فضا برف کی سفیدی سے جگمگانے لگی۔ دشمن کے مورچوں میں کوئی گٹار کا ایک تار بار بار بجا رہا تھا اور اس کی گمبھیر' نرم آواز سفید اور گہری پُرسکوت رات کے سحر میں اضافہ کر رہی تھی۔

اس نے سر اندر کھینچ لیا۔ ایک کمزور سا نیلا شعلہ کوئلوں کے درمیان ناچ رہا تھا اور ٹھاکر داس دیوار کے ساتھ بیٹھا سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ غلیظ تھا اور ایک مونچھ ٹھوڑی پر لٹک آئی تھی۔ نیلے شعلے کا سایہ رخسار کے گڑھے میں کانپ رہا تھا۔ اس کے دونوں کھلے ہوئے ہاتھ زمین پر رکھے تھے۔ اور سر چھاتی پر جھکا ہوا تھا۔ جھکی ہوئی کمر دیوار

سے لگائے، ٹانگیں دہری کیے سویا ہوا وہ دیکھنے والے کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا کرتا تھا۔ اس کے بڑے سے، کرخت نقوش والے چہرے پر سادگی تھی۔

دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے نعیم کی ٹانگوں میں لرزش پیدا ہوگئی تھی۔ معدے میں سخت بھوک محسوس کر کے اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ چند بسکٹ کھائے گا۔

اگلے دن سہ پہر کے وقت حملے کا حکم ملا۔ ان کے ساتھ نمبر ایک نمبر دو اور نمبر تین کیولری بریگیڈ کے زیادہ تر حصے تھے۔ حملے کی تجویز یہ تھی:

نمبر دو ڈبل کمپنی، جو میجر ہمفری کی قیادت میں ہولی بیک کے سیکشن کی خندقوں پر قابض تھی، آگے بڑھے گی اور چھ سو گز کا محاذ گھیر لے گی۔ نمبر ایک کمپنی کیپٹن ایڈیئر کی کمان میں روز بک پر قبضہ کرے گی اور جونہی نمبر دو کمپنی ان کے برابر آ جائے چڑھائی شروع کردے گی۔ کمپنی کے دائیں بازو کا رخ فارم کی طرف کنٹور 30 پر ہوگا۔ نمبر تین کمپنی کے دو پلاٹون (کمپنی کیپٹن میکلین کی قیادت میں تھی) مشین گن سیکشن کے ہمراہ کیپٹن ڈل کی کمان میں اس فائر کی مدد کریں گی جو بازو کی طرف سے جارڈینز فارم کی خندقوں میں سے ہوگا۔ نمبر تین کمپنی (نفی دو پلاٹون) اور نمبر چار کمپنی جارڈینز فارم کے پیچھے ریزرو میں رہیں گی۔

تین بجے فائرنگ شروع ہوئی۔ رجمنٹ دشمن کے مشین گن اور رائفل فائر کے سامنے آ گئی۔

توپ خانہ ابھی دونوں جانب سے خاموش تھا۔ کیپٹن ڈل دوربین لگائے مشین گن کی خندقوں میں گھوم رہا تھا۔ سورج خندقوں میں جھکے ہوئے فولادی خودوں پر تیزی سے چمک رہا تھا اور اندھا دھند چلتی ہوئی گولیوں کی آواز مغربی پہاڑیوں میں سے لوٹ کر آ رہی تھی۔ ہوا میں بارود کی بُو تھی۔

''زاویہ نمبر 39۔ جنوب مشرق۔ فائر۔'' کمپنی کمانڈر چیخا۔

نعیم نے لبلبی دبا دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور دشمن کی خندق سے پچاس گز اُدھر زمین میں دھنس گئی۔ چھوٹے چھوٹے کنکر پتھر اور گیلی مٹی کے ڈلے ہوا میں اڑے۔

''ڈیول۔ (Devil)'' کیپٹن ڈل جھنجھلا کر مڑا اور دوربین سے او پی کی عمارت کو دیکھا۔ شیشوں کو آگے پیچھے پھراتے ہوئے وہ انگریزی میں گالیاں دینے لگا۔

''مجھے بے وقوف سمجھتا ہے۔ فائر سٹاپ۔'' اس نے مڑ کر دشمن کے مورچوں پر دوربین لگائی۔ ''زاویہ نمبر 43 جنوب مشرق فائر۔''

نالیاں اونچی ہوئیں اور خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ گولیوں کی دوسری بوچھاڑ نکلی۔ اب کے مٹی عین دشمن کی خندقوں پر سے اڑی اور چمکتے ہوئے سیاہ خودوں کی قطار یکلخت غائب ہوگئی۔ صرف ایک جگہ سے دو بازو ہوا میں اٹھے اور ایک سپاہی زبردست جھٹکے کے ساتھ خندق سے باہر جا پڑا۔ دوسری بوچھاڑ سے وہ دس گز لڑھکتا ہوا چلا گیا

اور ہموار زمین پر جا کر گرے ہوئے پائن کے بے جان تنے کی طرح ساکن ہوگیا۔

''شاباش ......'' ٹھاکر داس چیخا۔ ''فائر......''

نعیم کے جسم میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ ایک نامعلوم سی مسرت اور پھرتی کے ساتھ اس نے لبلبی پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔

''پیٹی لگاؤ......'' وہ چیخا۔

''گنوں کو گرم مت کرو۔ وقفہ دو شاباش۔ پگھلنے مت دو۔ مشین گن تمہارا بہترین ساتھی ہے۔''

کیپٹن ڈل دوربین میں دیکھتا ہوا بول رہا تھا۔

رائفل اور مشین گن کی گولیاں ہوا کو چیر رہی تھیں۔ فضا میں بارود اور گرد کی دھندلاہٹ پھیل گئی تھی اور سورج مردہ جرمن سپاہی کے خود پر چمک رہا تھا۔

سورج ڈھلنے لگا تو عقب سے توپ خانے نے ریپڈ فائر (Rapid Fire) شروع کر دیا۔ دشمن کا فائر چند منٹ کے لئے رک گیا۔ کیپٹن ڈل نے دوربین میں دیکھا اور حکم دیا۔

''کمپنی ایڈوانس......''

دو سپاہیوں نے خندق پر چڑھ کر مشین گن باہر نکالی' تیسرے کو ٹھاکر داس نے ٹانگیں پکڑائیں۔ نعیم کے سپاہیوں نے اپنی مشین اٹھائی اور جھکے جھکے دوڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ 'ساں' کر کے ان کے خودوں پر سے گزری۔ ٹھاکر داس کے ایک سپاہی نے بازو ہوا میں پھینکے اور پنجوں پر اٹھ کر تیز چکر میں گھوما۔ پھر وہ دھپ سے گیلی زمین میں گرا اور آواز نکالے بغیر مر گیا۔ ساری کی ساری کمپنی منہ کے بل زمین پر آ رہی۔ گولیوں کی دوسری بوچھاڑ آئی۔ تیسری ان کے جسموں سے دو انچ اوپر سیٹیاں بجاتی ہوئی گزری۔ انتہائی دہشت کے مارے پہلے انہوں نے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے پیچھے سر چھپانے کی سعی کی' پھر زمین میں سر گاڑے' لیکن دشمن کے صحیح اور بھاری فائر کے سامنے انہیں پسپا ہونا پڑا۔ مٹی اور کنکر ان کے نتھنوں میں گھس رہے تھے اور وہ زخمی سانپوں کی طرح لیٹے لیٹے الٹے پاؤں رینگ رہے تھے۔ خندق سے پانچ گز کے فاصلے پر نعیم کا ایک آدمی گولی کے زبردست دھکے سے کمانی کی طرح سیدھا پاؤں پر کھڑا ہوگیا اور لٹو کی طرح تیزی سے گھومتا ہوا خندق میں جا گرا۔ ایک گولی مشین گن پر لگی اور میگزین کو' جس سے نعیم اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا' تباہ کر دیا۔

خندق میں پہنچ کر انہوں نے مشین گنیں نصب کیں اور پیٹیاں چڑھا کر کیپٹن ڈل کی تیز' غصیلی آواز کے مطابق فائر کھول دیا۔ زخمی سپاہی دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ ''پانی۔'' اس نے خوفناک' غیر انسانی آواز میں کہا اور جھک گیا۔ اس کا سر زمین کو جا لگا اور سجدے کی حالت میں پڑا پڑا وہ کمزور' مردہ آواز میں کراہنے لگا۔ دو سپاہیوں نے اسے سیدھا لٹایا اور چھاگل منہ کے ساتھ لگائی۔ بمشکل ایک گھونٹ اس کے حلق سے اترا' باقی پانی باچھوں میں سے بہنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ بدنما ہوگیا تھا اور آنکھوں میں موت کا

خوف لئے وہ ٹکٹکی باندھے آسمان کو تک رہا تھا۔ جب نعیم نے آخری بار اسے دیکھا تو وہ آنکھوں سے پیٹ کی طرف اشارہ کر رہا تھا' جسے ابھی تک اس کے خون آلود ہاتھ جکڑے ہوئے تھے۔

حملے کے مقتولین کی فہرست: دو جوان' ایک مشین گن۔

کیپٹن ونسنٹ کی کمان میں جو کمپنی تھی اس کا ایک حصہ راستہ بھول گیا اور نمبر دو کمپنی کے دائیں بازو پر آ نکلا۔ شام کے وقت کیپٹن نے مدد مانگی اور نمبر چار کمپنی کی دو پلاٹون اسے بھیجی گئیں۔ کمک پہنچنے سے پہلے اس کے سر میں گولی لگی اور وہ گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا مر گیا۔

دائیں بازو کی طرف زیادہ اہم واقعات کے پیش نظر ڈویژن کو توڑنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اگلی صبح رجمنٹ وہاں سے ہٹا کر ہولی بیک کے شمال میں پوزیشن پر بھیجی گئی۔ شام کو دو کمپنیاں پھر اسی محاذ پر اے اور بی خندقوں میں واپس بلا لی گئیں۔ دو دن تک وہ اسی طرح لڑتے رہے۔ جانی نقصان زیادہ ہوتا گیا۔ دو دن میں ایک تہائی توپ خانہ تباہ ہو گیا۔ پرانی چھ انچ کی ہوٹزر توپیں اتنا ہی مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اس حالت میں انہیں جرمن حملے کا سامنا کرنا پڑا۔

سیکنڈ بیوبرین کارپس بھاری کورنگ فائر (Covering Fire) کے نیچے اس سیکشن پر جمع ہو رہی تھی جہاں پر تھرڈ کیولری بریگیڈ کا مورچہ تھا۔ یہ جگہ سیکنڈ کیولری ڈویژن کے بائیں بازو پر تھی۔ نمبر 129 کی دو کمپنیاں اگلی صفوں میں تھیں اور 5th اور 16th لانسرز کو صبح سات بجے ان سے مورچہ سنبھالنا تھا۔ جب کہ نمبر ایک کمپنی نے نمبر تین کمپنی کی خندقیں ابھی ابھی لی تھیں اور نمبر دو کمپنی ریزرو میں تھی۔ چنانچہ اس وقت دشمن کے حملے نے بے ترتیبی میں اضافہ کر دیا اور نمبر تین کمپنی کو بھاری توپ خانے کے فائر کے سامنے پسپا ہو کر جنگل میں ایک فارم کے پیچھے پناہ لینا پڑی۔

کیپٹن ڈل کی کمپنی ابھی تک مورچہ سنبھالے ہوئے تھی۔ ان کے آدھے جوان ختم ہو چکے تھے اور باقی تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ دشمن کی بیٹریاں بری طرح گولہ باری کر رہی تھیں۔ سیکشن کمانڈر دیر ہوئی آخری چکر لگا کر پیچھے جا چکا تھا۔ خندقیں آدھی سے زیادہ ٹوٹ چکی تھیں اور دشمن کی بگ برتھا اور دوسری توپوں کے جواب میں ان کی آرٹلری کے پاس پرانی اور چھوٹی چھ انچ دہانے کی توپیں تھیں۔ دشمن کی صفیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں اور غیر مانوس وردیوں والے سپاہی پانچ سو گز کے فاصلے پر حرکت کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ نمبر 129 رجمنٹ کی خندقوں میں چھ مشین گنیں تھیں اور ابھی تک تمام چل رہی تھیں۔

اندھیرا ہونے میں ابھی دو گھنٹے تھے اور ڈھلتے ہوئے سورج کی دھوپ گرد اور بارود کی وجہ سے زرد مٹیالے رنگ کی ہو گئی تھی۔ گزشتہ رات کی گری ہوئی برف پر چلنے والی تیز سرد ہوا کے ساتھ خون اور بارود کی بو اور زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں سب طرف پھیل رہی تھیں۔ بھاری آرٹلری فائر کی خوف ناک' مسلسل آواز سے سپاہیوں کے کان پک گئے تھے اور دن رات کی گولہ باری سے وہ ست اور بیزار ہو چکے تھے۔

''پیٹی لگاؤ۔'' ٹھاکر داس چیخا۔ دو سپاہیوں نے تیزی سے آخری پیٹی بھرنا ختم کی اور میگزین میں فٹ کرنے لگے۔

''بس؟'' ٹھاکر داس نے تشویش سے خالی پیٹیوں کے ڈھیر کو دیکھا۔

''رحم دین لینے گیا ہے۔''

''ابھی تک نہیں لوٹا؟''

''نہیں۔''

''تم جاؤ۔''

ریاض نے ہچکچاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''جاؤ۔ ایک گن رہ گئی ہے۔ چوہے کی طرح مرنا چاہتے ہو؟''

وہ پیٹ کے بل باہر نکل گیا۔

ٹھاکر داس اور نعیم نے مشین گن کی نالی کے اوپر سے آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی دشمن کی صف کو دیکھا اور ان کی پشت پر خوف کی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ جھک کر چلتے ہوئے وہ دوسری مشین تک گئے۔ اس میں آدھی چلی ہوئی پیٹی لگی تھی اور 'ٹرائی پاڈ' کے پاس چھ غلیظ' بدنما چہروں والے سپاہی مرے پڑے تھے۔ ٹھاکر داس نے لبلبی کو دبا کر دیکھا۔

''جام ہوگیا۔ ایک انچ نہیں ہلتا۔''

''ایک انچ تو کبھی بھی نہیں ہلتا۔''

''مذاق مت کرو۔''

اسی طرح چلتے ہوئے وہ اپنی جگہ پر لوٹ آئے۔

''ہم اسے نہیں لگا سکتے؟'' نعیم نے ادھ چلی پیٹی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ نہیں لگ سکتی۔ تمہیں پتہ نہیں؟ ایم جی کا تمہیں کیا پتہ ہے؟''

''پتہ ہے۔''

''پھر۔''

''یونہی پوچھا تھا۔''

ٹھاکر داس ایک خالی پیٹی اٹھا کر پھاڑنے لگا۔

ایک گولہ خندق سے تیس گز کے فاصلے پر گرا اور ڈائنامائٹ سے ریاض اڑی ہوئی مچھلی کی طرح پلٹ کر گرا اور چت ہوگیا۔ ان دونوں نے کھڑے کھڑے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ دوسرا گولہ ان کے منہ کے آگے تین فٹ پر آ کر پڑا اور مٹی کی اڑتی ہوئی دیوار نے ٹھاکر داس کو پاؤں پر سے اٹھا کر چار فٹ دور پھینک دیا۔ سرد گیلی مٹی اس کے منہ' ناک اور آنکھوں میں بھر گئی۔ چند سیکنڈ تک وہ سن پڑا رہا' پھر آہستہ آہستہ اٹھا' انگلی پھیر کر حلق صاف کیا۔

ناک سنکی اور آنکھیں مل کر کھولیں۔ نعیم اپنی جگہ پر مبہوت کھڑا تھا۔

''کیا حال ہے؟'' ٹھاکر داس نے پوچھا۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا۔''

''مجھے بھی کچھ نہیں ہوا۔ میں نے کئی بار مٹی چکھی ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''مگر ناک میں یہ تکلیف دیتی ہے بھینچوو۔'' اس نے انگلیوں سے دبا کر ناک صاف کی اور لاپروائی سے گولے کے بنائے ہوئے بارہ فٹ گول گڑھے کو دیکھتے ہوئے گھٹی آواز میں بولا: ''حیرت کی بات ہے۔ میدان جنگ میں بارود بعض دفعہ عجیب سلوک کرتا ہے۔''

''خندق تباہ ہوگئی۔'' نعیم نے بے زاری سے کہا۔

تیسرا گولہ ذرا دور آ کر گرا اور باریک مٹی کی بارش نے انہیں ڈھک دیا۔

''سوَر۔ بیٹھنے بھی نہ دیں گے۔'' ٹھاکر داس نے کاہلی سے بڑھ کر مشین گن اٹھائی اور مردہ سپاہیوں کے ڈھیر کے پاس جا کر رکھ دی۔

''بارود نہیں آئے گا۔ ریاض بھی گیا۔'' اس نے آنکھوں کے کونوں میں سے نعیم کو دیکھا۔

نعیم نے رائفل کا سلنگ کندھے پر جمایا اور اچک کر باہر نکل آیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور اس کے اوپر گولیوں کی چھت بنی ہوئی تھی۔ وہ گھٹنوں اور کہنیوں کی مدد سے آگے بڑھنے لگا۔ ریاض چھ فٹ گہرے گڑھے میں بازو اور ٹانگیں پھیلائے لمبا لمبا چت پڑا تھا۔ اس کی زرد ہتھیلیاں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں' پیٹ کھل گیا تھا اور باہر لٹکتے ہوئے انتڑیوں کے ڈھیر میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ نعیم نے رک کر جھانکا۔ گڑھے میں سے تازہ مٹی' بارود اور انتڑیوں کی بھاپ کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ جاتے جاتے آخری بار مڑ کر اس نے اس کے خوفناک طور پر اینٹھے ہوئے چہرے کو دیکھا جس کی ٹھوڑی' جبڑے کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے اوپر اٹھ آئی تھی۔ وہاں سے بیس قدم کے فاصلے پر رحم دین پڑا تھا۔ گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور خون بہہ بہہ کر اس گڑھے میں جمع ہو رہا تھا جو اس کے سر گڑنے سے زمین میں بن گیا تھا۔ وہ ابھی تک زمین میں آہستہ آہستہ ایڑیاں مار رہا تھا۔ نعیم نے کندھے سے پکڑ کر اسے سیدھا لٹا دیا۔ موت کا سایہ زرد' بے جان چہرے پر لہرا رہا تھا لیکن وہ بالکل درست حالت میں تھا اور اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر کسی کو خیال نہ آ سکتا تھا کہ یہ شخص مر رہا ہے۔ نعیم نے کان لگا کر سنا۔ وہ باریک' کمزور آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''لے چلو۔ چھوڑ کے نہ جاؤ...... آ آ ...... آ بھائی۔'' وہ کروٹ پر ہو گیا اور تیزی سے ایڑیاں رگڑنے لگا۔ ''چھوڑ کے نہ جاؤ۔ بھائی آ......'' اس نے زبان نکال کر شبنم آلود گھاس کو چاٹا۔

نعیم کا جی متلانے لگا۔ اس نے برف کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا اور اسے چوستا ہوا آگے روانہ ہوا۔

جنگل کی اوٹ میں اس پھونس کے جھونپڑے کے اندر تین سپاہی تیزی سے پیٹیاں بھر رہے تھے۔ ایک طرف گولیوں کے کریٹ اور دوسری طرف خالی پیٹیاں رکھی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ نعیم دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ جھونپڑا پائن کے تنوں پر کھڑا تھا اور چھت سے گھاس کی داڑھیاں لٹک رہی تھیں۔ اندر

گیلی گھاس اور مٹی کے تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ آہٹ سن کر تینوں سپاہیوں نے رائفلیں اٹھائیں اور گھٹنوں پر کھڑے ہوگئے۔

''فرینڈ۔'' نعیم نے کہا ''پیٹیاں تیار ہیں؟''

''بڑی دیر سے کوئی نہیں آیا۔ ہم جرمنوں کا انتظار کر رہے تھے۔''

''شاباش۔''

اس نے تین پیٹیاں اٹھا کر کندھے پر ڈالیں اور باہر نکل آیا۔

جب وہ خندقوں کے قریب پہنچا تو تین مشینیں خاموش ہو چکی تھیں۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے پکارا: ''فرینڈز بارود؟''

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ صرف ایک کے پاس سے آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ ''فرینڈ ...... فرینڈ آؤ۔''

''بارود؟'' اس نے پھر پوچھا۔

چوتھی مشین جو چل رہی تھی اس پر ایک سپاہی بیٹھا تھا۔ وہ مڑے بغیر برہمی سے بولا: ''اپنے مورچے پر جاؤ۔ ہمارے اندر کافی بارود پہنچ چکا ہے۔''

چاند کی روشنی سارے میں پھیل چکی تھی۔ مشین میں پٹی لگاتے لگاتے نعیم نے چونک کر اوپر دیکھا۔ ''یہ آگئے۔''

''کون؟'' ٹھاکر داس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

تین سو گز پر وہ رائفلیں ہاتھوں میں اٹھائے تیزی سے دوڑے چلے آرہے تھے۔

''سئور ......'' ٹھاکر داس دانت پیس کر چیخا اور لبلبی پر انگلی رکھ دی۔ گولیوں کی بارش صحیح مقام پر ہوئی۔ چاند کی روشنی میں ایک سپاہی بازو پھیلا کر اوندھے منہ گرا اور سیاہ جسم دور تک لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ ساری لائن نے سر کے بل زمین پر گر کر فائر کھول دیا۔

''جاؤ...... اور پیٹیاں ......'' ٹھاکر داس نے رک رک کر فائر کرتے ہوئے کہا۔

نعیم ایک لمحے کو ہچکچایا، پھر اچک کر خندق سے باہر نکل آیا۔ چند گز کے فاصلے پر جا کر وہ اچانک ٹھہر گیا اور گال زمین پر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ پھر مڑا۔

''حوالدار'' اس نے پکار کر کہا۔

''کیا ہے؟''

''حوالدار' ہمیں۔ ری ٹریٹ نہیں کرنا چاہیے؟''

ٹھاکر داس لبلبی پر انگلی رکھے مڑا۔ ''ہائیں؟ کیا کہا؟ یہ تمہارا گھر ہے۔ یہ۔ سنا؟ بھول جاؤ کہ تم واپس بھی جاسکتے ہو۔ بھول جاؤ۔ جاؤ۔''

نعیم نے دل میں اسے گالی دی اور آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ پیٹھ پر سے گزرتی ہوئی گولیوں کی ہوا اس نے گردن پر محسوس کی۔

جھونپڑے میں سے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ اونچی، بچوں کی سی بے ساختہ ہنسی۔ وہ آہستہ سے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ سامنے بیٹھا ہوا سپاہی سر پیچھے پھینک کر ہنس رہا تھا۔ اس کی گردن کی رگیں پھول گئی تھیں اور لمبے پٹے پشت پر لٹک رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے نعیم کا جی چاہا کہ وہ اسی طرح ہنستا رہے، بار بار ہنسے۔

ہنسنے والے نے اسے دیکھا۔ ''لانس نائیک، تم ابھی زندہ ہو؟ تمہاری مشینیں تو ساری خاموش ہو چکیں؟'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''اتنے خوش کیوں ہو رہے ہو؟'' نعیم نے تلخی سے کہا اور پیٹیاں اٹھانے کو جھکا۔

''یہ ہمیں اپنے بیل کا قصہ سنا رہا تھا جو لوگوں کی گائیں اغوا کر کے لایا کرتا تھا۔''

''فضول قصے بند کرو۔ وہ سر پر چڑھ آئے ہیں۔''

تینوں سپاہیوں کے چہرے منجمد ہو گئے۔

''ہمیں پتہ ہے۔ پتہ ہے۔'' ہنسنے والے نے گولیوں کا کریٹ اوندھا کرتے ہوئے سختی سے کہا۔ پھر یکلخت وہ مڑا اور پوری آواز سے چلایا۔ ''اور اب بھی ہم باتیں نہیں کر سکتے؟ اب بھی؟ ہمارے ہاتھ پک گئے ہیں۔ دیکھو۔ یہ دیکھو۔ ہم ایسے ہی مر جائیں گے؟''

دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلائے وہ پاگلوں کی طرح سب کو دیکھ رہا تھا۔ نعیم نے نظریں چرا کر پیٹیوں کا وزن ایک جھٹکے سے کندھے پر برابر کیا اور باہر اندھیرے میں نکل آیا۔

گولیوں کی زد میں پہنچ کر وہ پیٹ کے بل ہو گیا۔ چھ کی چھ مشینیں خاموش تھیں۔ اپنے پیچھے اسے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ اس نے رک کر دیکھا۔ ایک گولہ جھونپڑے پر آ کر گرا تھا جس سے وہ بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو گیا تھا اور دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ سانس روکے وہ انتظار کرتا رہا۔ کوئی متنفس باہر نکلتا دکھائی نہ دیا۔ پھر ایک زبردست دھماکے سے بارود کے کریٹ پھٹے اور پائن کے جلتے ہوئے تنے دور دور تک اڑ گئے۔ شمال کی طرف سے چلنے والی ہوا نے جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بو سارے میں پھیلا دی۔ نعیم کے سینے میں ایک بھاری، بدمزہ سی شے کلبلائی اور اس نے دھیرے دھیرے بے دلی سے رینگنا شروع کر دیا۔

چاند کی روشنی میں چمکتا ہوا ٹھاکر داس کا خود اس نے دور سے دیکھ لیا، ساتھ ہی اس کی پتلی، تیز سیٹی کی آواز اس کے کان میں آئی۔ دشمن کی طرف سے گولیاں آنا بند ہو گئی تھیں۔ صرف آرٹلری دونوں جانب سے مصروف تھی۔ وہ خندق سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جب اس نے جرمنوں کی پوری لائن کو دو سو گز پر تیزی سے اٹھتے اور چڑھائی کرتے ہوئے دیکھا۔

''پیٹیاں لے آئے؟'' دشمن سے بے خبر ٹھاکر داس نے پوچھا۔

خندق سے صرف دو لمحے کا فاصلہ تھا۔ نعیم نے بڑھنا چاہا لیکن جلتی ہوئی نفرت اور حسد کا جذبہ غالب آ گیا۔

''نعیم تم زخمی ہو؟''

وہ خاموش پڑا رہا۔ ٹھاکر داس اچک کر باہر نکلا اور اس کی طرف دوڑا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔ ٹھاکرداس کے دونوں پاؤں زمین سے اٹھ گئے اور وہ ہوا میں ایک لمبی جست لے کر زمین پر گرا اور لوٹتا ہوا زور سے اس کے ساتھ آ ٹکرایا۔

''آ آ...... آ'' مردہ، غیر انسانی آواز اس کے دانتوں کے بیچ سے نکلی اور وہ بے جان ہو کر سیدھا لیٹ گیا۔ خون کی ایک پتلی سی دھار نکل کر اس کی داڑھی میں جذب ہونے لگی۔ چاند اس کے ستے ہوئے غلیظ چہرے پر چمک رہا تھا۔

ایک لحہ انتظار کئے بغیر نعیم مڑا اور پیٹ کے بل سانپ کی سی تیزی سے پیچھے جھپٹا۔ جرمنوں نے خندق پر گولیاں برسائیں اور قبضہ کر لیا۔

زد سے باہر آ کر وہ اٹھا اور پوری قوت سے بھاگنے لگا۔ آگے ان کی بیٹریاں کورنگ فائر دے رہی تھیں۔ اس نے فرسٹ ایڈ کے تھیلے سے سفید پٹی نکالی اور زور زور سے سر کے گرد گھمانے لگا۔ آفیسر نے فائر روکنے کا حکم دیا۔ بیٹری کے ایک گھوڑے کے سینے سے خون بہہ رہا تھا اور چار سپاہی اسے تھامے ہوئے کھڑے تھے۔

''فرینڈز۔'' قریب پہنچ کر نعیم چلایا۔ ''لانس نائک نعیم احمد خان نمبر 139 بلوچ۔ مشین گن ڈی کمپنی سیکشن نمبر......''

''لانس نائک...... بولو۔''

''مورچے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا ہے۔ سب جوان ختم ہو گئے ہیں۔ مشینیں دشمنوں کے ہاتھ میں ہیں۔''

چاند کی روشنی میں آفیسر نے لرزاں انگلیوں سے اپنے سفید ماتھے کو چھوا۔ ''ایڈجوٹنٹ کو رپورٹ کرو۔'' اس نے کہا۔

نعیم نے بیٹری پار کی تو فائر پھر شروع ہو گیا۔ اس نے رک کر بیٹریوں کے اوپر سے میدان جنگ کو اور جلے ہوئے جھونپڑے کو دیکھا۔ دھندلی، زرد رات میں بارود کا دھواں اور منجمد ہوا کی دھند آہستہ آہستہ جنوب کی طرف چڑھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کی عمارت کی طرف چلا گیا۔

(۱۰)

وہ ایک سال تک بلجیئم اور فرانس کے علاقوں میں لڑتے رہے۔ نعیم بیسیوں حملوں میں شریک ہوا جن میں وہ کامیاب ہوئے اور بیسیوں جن میں انہیں شکست اٹھانا پڑی۔ جنگ میں وہ خوش قسمت رہا۔ صرف ایک گولی اس کی چھوٹی انگلی سے رگڑتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے علاوہ اور کوئی سکہ اس کے جسم سے نہ ٹکرایا۔ اپنے مورچوں میں اور

دشمن کے مورچوں میں اس نے ہزاروں سپاہی مرتے ہوئے دیکھے۔ کسی کو آسانی کے ساتھ، کسی کو اینٹھ کر مرتے ہوئے۔ کسی کے چہرے پر سفیدی اور معصومیت ہوتی، کسی پر موت کی نیلاہٹ اور تکلیف۔ کسی کی آنکھیں زندہ آدمی کی طرح جھانکتی ہوتیں۔ کسی کی اندھے شیشوں کی مانند ماتھے میں جڑی ہوتیں۔ کسی کی جیب میں خشک راشن اور چند گولیاں ہوتیں، کسی کے پاس بچوں اور خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں اور ان کے سیاہ بالوں کے گچھے بطور نشانی کے ہوتے اور ڈائریاں! وہ سب پتھروں پر، خندقوں میں، خشک جوہڑوں میں، برف پر، کیچڑ میں مرے پڑے ہوتے۔ وقت ہوتا تو نعیم کسی نوجوان، پُرسکون چہرے کے پاس رکتا، جیبیں ٹٹول کر تصویریں اور خط نکالتا، ان عورتوں کا خیال کرتا جو گاؤں کے باہر جوہڑ کے کنارے کھڑی اپنے محبوب چہروں کے لئے ترس گئی ہیں اور نہیں جانتیں کہ ان کے عزیز، خوبصورت ہونٹ سرد کر دیئے گئے ہیں اور جسم، جنہوں نے بے پناہ خوشی کی راتیں انہیں بخشیں ہزاروں میل دور خاک میں بکھرے پڑے ہیں اور وہ بے کار انتظار کرتی ہیں، ان کھیتوں کے بارے میں سوچتا جو نوجوان ہاتھوں کے بغیر ویران ہو گئے ہیں...... اور آگے بڑھ جاتا، بھول جاتا۔ وہ اب ان باتوں سے بے اثر ہو چلا تھا۔ اس کے باوجود اس تمام عرصے میں ایک خوف ناک بوجھ اس کے دل پر سوار رہا۔ یہ ٹھاکر داس کا خیال تھا، دردناک احساس جرم۔ گو بعد میں آ کر وہ بہت کچھ سنبھل گیا لیکن کبھی کبھی پورے چاند کی رات میں خندق میں بیٹھے ہوئے کسی حملے کے دوران ٹھاکر داس کا بھوت اس کے قریب آ کھڑا ہوتا: ''اپنی خندق میں کسی کو مت مارو۔ میدان جنگ کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔'' وہ اس خیال سے ہی خوف زدہ ہو جاتا۔ بڑی مشکل سے وہ ہتھوڑوں کی طرح پڑتے ہوئے الفاظ کو ذہن میں سے نکال پھینکنے میں کامیاب ہوتا۔ اس کے بعد کئی روز تک اس کے دماغ میں اُلو بولتے رہتے۔

سال کے وسط میں رجمنٹ کے مشرقی افریقہ جانے کے احکام صادر ہوئے اور ماہ جولائی کے ایک خوش گوار دن وہ واپس مارسیلز پہنچے۔ اگلے روز ان کو جہاز پکڑنا تھا۔

مارسیلز پر وہ دن اسی طرح خوش گوار اور چمک دار گزرا تھا۔ نعیم سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ لوگوں کے چہرے تر و تازہ اور مسرور تھے۔ عورتیں بڑے گھیر والے خوش رنگ لباس اور بچے سفید نیکریں پہنے پٹڑیوں پر آ جا رہے تھے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا، مگر ہوٹلوں پر بھیڑ لگ چکی تھی اور ان کے رنگ برنگ شیشوں والے دروازوں پر روشنیاں جل رہی تھیں۔ مرد بڑے بڑے ہیٹ، کھلی قمیصیں اور تنگ پتلونیں پہنے کھڑے باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ عقب سے ایک دو گھوڑوں والی بگھی سڑک پر بگٹٹ بھاگتی ہوئی آئی۔ عورتوں نے ٹھٹک کر اپنے بچوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور مرد راستہ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ بگھی سبزی کے ٹوکروں سے لدی تھی اور ان پر ایک بوڑھا کسان چھاج سا ہیٹ پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے نوجوان لڑکے کے ہاتھ میں باگیں تھیں۔ گھوڑے تندرست اور منہ زور تھے اور ان کے نعلوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ چند قدم پر جا کر ڈھلوان سڑک پر ایک گھوڑے کے پاؤں پھسلے اور وہ چاروں ٹانگیں پھیلا کر پیٹ کے بل کئی گز تک پھسلتا چلا گیا۔ راہ گیر ٹھٹک کر رک گئے۔ چند عورتوں

کی ہلکی ہلکی چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ کسان کا لڑکا نیچے اتر کر گھوڑے کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ چند راہ گیر کسان رک کر اس کی مدد کرنے لگے۔ بوڑھا کسان سڑک پر بکھرے ہوئے چقندر چن چن کر ٹوکرے میں ڈال رہا تھا۔ گھوڑے کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور اس کی گرم' نم دار سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

اچانک ہجوم کے اوپر نعیم کو ایک بھاری مانوس جسم دکھلائی دیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ وہ جسم ایک سکھ سپاہی کا تھا جو کندھے ڈھلکائے' جھولتا ہوا پٹڑی پر چلا جارہا تھا۔ اس کی وردی میلی اور شکن آلود تھی اور سپاہی کے بجائے وہ جیل سے بھاگا ہوا قیدی معلوم ہوتا تھا۔ چند قدم اس کے پیچھے پیچھے چلنے کے بعد نعیم نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ سکھ سپاہی نے پلٹ کر دیکھا۔ چند سیکنڈ تک وہ اپنی سوئی سوئی' بے حس آنکھوں سے نعیم کو تکتا رہا' پھر کسان فوجیوں کے مخصوص انداز میں بولا:

''نعیم......تم ابھی زندہ ہو؟''

''مہندر سنگھ۔'' نعیم نے صرف اتنا کہا۔ وہ دیر تک گرمجوشی سے مصافحہ کرتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے رہے۔

''رجمنٹ سے بھاگ آئے ہو؟'' اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نعیم نے تمسخر سے پوچھا۔

''نہیں۔''

''تم نے کتنے عرصے سے داڑھی صاف نہیں کی؟''

''ہم محاذ سے لوٹ رہے ہیں۔''

''رجمنٹ؟''

''نمبر 9 ہیڈسن ہارس۔ انبالہ بریگیڈ۔''

''میں نمبر 129 بلوچ میں ہوں۔ فیروز پور بریگیڈ۔ تم کس محاذ پر تھے؟''

''اُدھر......'' مہندر سنگھ نے بازو سے شمال اور مغرب میں غیر واضح سا اشارہ کیا۔

''کس سے؟''

''پہلے ترکوں سے۔ پھر جرمنوں سے۔''

وہ سڑک کے کنارے چلتے رہے۔ پٹڑی پر چلتے ہوئے بچے عجیب وغریب سکھ سپاہی کو دیکھنے کے لئے رک جاتے۔

''کھانا کھاؤ گے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''کہاں؟''

''ہوٹل میں۔''

مہندر سنگھ نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی اور داڑھی کھجا کر ہنسا۔ نعیم نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے سارے

چہرے کا جائزہ لیا۔ یہ کھوکھلی اور بے جان ہنسی تھی۔ وہ جس سے نعیم اس قدر واقف' اس قدر مانوس تھا۔ اس سے اتنی مختلف تھی۔

''میں رجمنٹ کو جا رہا ہوں۔'' مہندر سنگھ نے کہا۔ ''چلو وہاں بیٹھیں گے۔ پاس ہی ایک بڑی اچھی جگہ ہے۔'' وہ خاموشی سے چلتے ہوئے آبادی سے باہر نکل آئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور سرخی مائل زرد' کمزور دھوپ اونچے نیچے ٹیلوں' درختوں اور چھوٹے چھوٹے کنکروں پر سے کھنچتی ہوئی مغرب میں سمٹتی جا رہی تھی۔

''تم بہت بدل گئے ہو۔'' نعیم نے بوٹ کی ٹھوکر سے چند کنکر اڑاتے ہوئے آنکھوں کے کونوں میں سے مہندر سنگھ کو دیکھا۔ اس نے سڑک پر گرے ہوئے گھوڑے کی طرح پھنکار کے ساتھ سانس چھوڑا۔ ''میں؟ اوہ۔ نہیں۔ اتنی دیر کے بعد محاذ سے لوٹا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ آج نہاؤں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ دوبارہ کھوکھلی آواز سے ہنسا۔

''میرا خیال تھا جنگ تمہیں کچھ نہ کہے گی۔'' نعیم نے کہا۔ وہ خاموش رہا۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں وہ ایک قبرستان کی چار دیواری میں داخل ہوئے۔ چاروں طرف سیمنٹ اور اینٹوں کی قبریں تھیں اور اونچے اونچے کتبے' جن پر فرانسیسی زبان میں یادگاریں درج تھیں۔ سرخ اینٹوں کی دو تنگ پٹڑیاں قبرستان کے درمیان میں ایک دوسری کو کاٹتی تھیں۔ دونوں جانب خوبانی کے درخت تھے جو سفید پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سرخ راستوں پر ابھی ابھی کوئی جھاڑو دے کر گیا تھا۔

''پچھلے مہینے رمضان روشن پور سے بھرتی ہو کر آیا تھا۔'' مہندر سنگھ سر جھکا کر چلتے ہوئے بولا۔

''کیا سناتا تھا۔''

''ایں...... کچھ نہیں۔''

''روشن پور کی کوئی بات......''

''اس سال سیلاب آیا تھا۔ دریا نے بڑی تباہی کی۔ ساونی زیادہ تر تباہ ہوگئی۔'' اس نے چلتے چلتے ایک سفید پھول توڑ کر سونگھا۔ ''پھر جانوروں میں وبا پھیل گئی۔ خصوصاً 'موکھر' سے بہت جانور مرے۔ لیکن میری جوڑی جوگندر سنگھ نے پہلے ہی بیچ دی تھی۔ گھوڑی اور بھینس وبا میں مر گئیں۔ نیاز بیگ خوش قسمت رہا۔ اس نے سارے جانور بیماری سے پہلے بیچ دیئے تھے۔ اس کی فصل بھی بچ گئی۔

''رمضان کا کوٹھا بارشوں میں گر گیا اور اناج سارا بہہ گیا تو وہ فوج میں بھرتی ہوگیا۔ کرم سنگھ بمبئی چلا گیا تھا۔ سنا ہے مل میں کام کرتا ہے۔ فقیر دین کی بہو بھاگ گئی ہے۔ اس کا لڑکا ہمارے ساتھ محاذ پر تھا' تیسرے مہینے میں مارا گیا۔ وہ اور کیا کرتی۔''

وہ دیر تک تاریک راستوں پر چلتے اور باتیں کرتے رہے۔ گاؤں کی باتیں کرنے سے مہندر سنگھ کی آنکھوں میں نامعلوم سی چمک آ گئی تھی اور وہ اپنے پرانے' پھرتیلے انداز میں سنبھل کر چل رہا تھا۔

''ہمارے بعد پولیس بس دو ایک بار گاؤں میں آئی۔ پہلے چھ ماہ میں بہت سی لڑکیاں جاٹ نگر کے لونڈوں کے ساتھ بھاگ گئیں۔ اشتمال بھی ہوا۔ ہمارا جو کا کھیت تمہارے جوہڑ کے کھیت کے بدلے میں ہوگیا ہے۔ اچھا ہوگیا ہے نا؟ ایک جگہ پر بیائی کرنے سے بڑا بچاؤ رہتا ہے۔ ورنہ ایک سے دوسرے کھیت کا فاصلہ آدھے میل کا ہو تو جانور راستے میں ہی رہ جاتا ہے۔ اشتمال میں سب کا فائدہ ہوتا ہے۔ ہمارا جو کا کھیت برا نہیں ہے۔ تمہارے کھیت سے اچھا ہی ہوگا۔ فکر نہ کرو۔ سب کا فائدہ ہوتا ہے۔''

گاؤں کی باتیں ختم ہوگئیں تو وہ خاموش ہوگئے۔ قبرستان میں تاریکی تھی' اور سکون۔ وہ دونوں چپ چاپ' ہاتھ پیچھے باندھے' سر جھکائے سیدھے تاریک راستوں پر آتے اور جاتے رہے۔ کبھی کبھی چند خشک پتے اور پھل ہوا کے زور سے ٹوٹ کر اینٹوں پر آگرتے اور ان کے پاؤں تلے چرچرا کر ٹوٹ جاتے۔ کبھی وہ واپس آتے ہوئے پکا راستہ چھوڑ کر درختوں کے نیچے نیچے چلنے لگتے اور وہ پُراسرار آواز بڑھ جاتی۔ سیاہ تنوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے خوبانی کی جھکی ہوئی شاخیں ان کے چہروں سے ٹکراتیں اور سفید ہلکے پھول آدھی رات کی برف کی طرح اندھیرے میں آہستگی سے ان کے بالوں اور آنکھوں پر گرتے۔ اندھیرے' سایہ دار راستوں پر قبروں کے درمیان چپ چاپ چلتے ہوئے وہ پرانے زمانے کے دو بھوت معلوم ہو رہے تھے جنہوں نے رات کے مقررہ وقت پر اپنی اپنی قبروں سے نکل کر خاموشی سے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا تھا اور اب اپنے دوست درختوں' خشک پتوں' کتبوں اور سفید پھولوں کے درمیان چہل قدمی کر رہے تھے ور اپنے دلوں میں دوستی اور رفاقت کا وہ جذبہ محسوس کر رہے تھے جو سالہا سال کی ہمسائیگی کے بعد خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ نعیم نے رات کے اس سمے کے' قبرستان کے' سفید پھولوں کے اور اپنے وجود کے اس اسرار کو بے حد واضح اور شدید طور پر محسوس کیا۔ اسے لگا کہ ابھی کچھ دیر میں' وقت مقررہ پر' وہ اور اس کا رفیق بھوت خاموشی سے ایک دوسرے کو الوداع کہیں گے اور اپنی اپنی قبروں کو لوٹ جائیں گے۔

''تم زخمی ہوئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''نہیں؟'' دفعتاً رُک کر نعیم نے رات کی مدھم روشنی میں اس کے بھاری' ڈھلکے ہوئے جسم اور اندھے شیشے کی سی مری ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔ ''پھر کیا ہے۔ تم بیمار ہو؟ ایں؟''

مہندر سنگھ نے بیزاری سے اسے دیکھا اور کندھے اچکا کر بولا:

''میں ٹھیک ہوں۔''

''تم ٹھیک نہیں ہو۔ مجھے تکلیف پہنچی ہے دیکھ کر۔''

وہ ایک بوڑھے' شہ زور بیل کی طرح نعیم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

''دیکھو' مہندر سنگھ۔'' نعیم ایک تنے پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ''تم میرے دوست ہو۔ میں

تمہاری بات سنوں گا۔ مجھے بتاؤ تمہارے دل پر کیا ہے۔ بتاؤ تم مجھے ایک مردہ آدمی کی طرح دکھائی دے رہے ہو۔''

مہندر سنگھ نے بے تابی سے اِدھر اُدھر دیکھا' کچھ کہنا چاہا لیکن رک گیا' پھر بولنا چاہا اور رک گیا۔ وہ اس گھوڑے کی طرح تھا جو چھٹی حس کی مدد سے چند قدم پر چھپے ہوئے خطرے کو پہچان کر سوار کے بار بار چلّانے کے باوجود اپنی جگہ پر رکا رہتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر بے چینی سے سارے جسم کو جنبش دی اور خفگی سے بولا: ''کیا پوچھتے ہو۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ محاذ پر بہت سے خون دیکھے ہیں' صرف تھک گیا ہوں۔ بہت زیادہ۔''

وہ بھاری فوجی قدموں سے جا کر ایک بڑی سی قبر پر بیٹھ گیا۔ اس کی رائفل کی دھات کے پتھر کے ساتھ ٹکرانے سے قبرستان کی خاموش فضا میں ایک ناخوشگوار آواز پیدا ہوئی۔

''تم نے بہت خون کیئے ہیں؟'' نعیم نے پوچھا۔

''کیوں؟ تم نے نہیں کیئے؟''

''میں نے؟'' اسے اس سوال کی توقع نہ تھی۔ ایک تیسرا بھوت دور قبرستان کے تاریک کونے میں سے ابھرا اور ان کی طرف بڑھنے لگا۔ انتہائی کوشش سے نعیم نے اس پر سے نظریں ہٹائیں اور مہندر سنگھ کے سیاہ مہیب جسم کو دیکھنے لگا۔ وہ کمر جھکائے' قبر پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

''لیکن میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ تم اتنے بدل جاؤ گے۔'' نعیم نے کہا۔

''کیوں ...... تم نے خون محسوس نہیں کیا؟ اپنے اندر' یہاں۔'' اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا تم نے آسانی سے ......''

''لیکن' مہندر' تم اتنی آسانی سے قتل کر سکتے تھے۔ یاد ہے جب ہم......؟''

''وہ اور بات تھی۔ ایک چوہا بھی اپنے بھائی کا اور اپنے خاندان کا بدلہ لے سکتا ہے۔ یہاں پر بالکل دوسری بات ہے۔'' وہ اندھیرے میں نعیم کی طرف جھکا۔ ''قتل ......خون کا بدلہ خون۔ اس کے لئے ہمارا خون جوش مارتا ہے' ہم تیاری کرتے ہیں۔ مگر یہاں؟ ...... جیسے سؤر کو یا نیل گائے کو مار دیا۔ بس مار دیا۔ لیکن اس کی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر ہم تنگ آ جاتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں۔'' اس کی بھاری' بخار زدہ آواز سے نعیم کو اندازہ ہوا کہ وہ واقعی بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔

''تمہیں پتہ ہے ہم کیوں لڑ رہے ہیں؟'' اچانک مہندر سنگھ نے پوچھا۔

''جرمنوں نے حملہ کیا ہے۔''

''کہاں؟ روشن پور پر؟''

''یہاں......''

''پر ہم یہاں کیوں ہیں' ہم' کس لئے آئے؟''

''جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں اور انگریز ہمارے مالک ہیں۔ بس۔''

''ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں۔''

''انگریز روشن آغا کے مالک ہیں۔ چنانچہ۔''

''کل کتنے مالک ہیں۔ ایک دفعہ بتاؤ۔'' وہ ایک دم چڑ کر بولا۔ نعیم کے گلے میں کوئی چیز آ کر اٹک گئی۔ اس نے سگریٹ کا کش لیا اور فوراً دھواں اُگل دیا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں روشنی کی مدھم سی شعاع چھوڑتا ہوا جلتا رہا۔ رات کی سیاہی انہیں چاروں طرف سے ڈھانپے ہوئے تھی اور بیچ میں خوبانی کے پھولوں کی سفیدی دبی دبی جگمگا رہی تھی۔ جیسے اندھیری رات میں برف گری ہوتی ہے۔

''ہم یا تو مر جائیں گے یا واپس چلے جائیں گے۔ یہاں پر کوئی نہ رہے گا۔ ہم اپنی فصلیں کھیتوں میں چھوڑ کر اسی لئے آئے تھے کہ سینکڑوں آدمیوں کی جان لیں اور گندگی میں لوٹیں؟ مینڈک جو جاڑے آنے پر کیچڑ میں گھس کر سو جاتا ہے؟ مجھے اپنے آپ سے بو آ رہی ہے۔ جوؤں نے میرے سر میں سوراخ کر دیئے ہیں۔'' وہ کتبے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ''یقین کرو نعیم' میں تنگ آ چکا ہوں۔ ایک گاؤں ہم نے فتح کیا۔ وہاں ایک عورت میرے ہاتھ لگی۔ چار گھنٹے تک وہ میرے پاس رہی لیکن ڈر کی وجہ سے میں نے اسے ہاتھ تک نہ لگایا۔ اتنی دیر سے میں نے دودھ نہیں پیا' سواری نہیں کی' نہایا بھی نہیں۔ میں ختم ہو چکا ہوں۔''

وہ مرتے ہوئے آدمی کی آواز میں بھاری' ٹوٹی ہوئی کراہ کے ساتھ بول رہا تھا۔ نعیم کا حلق ابھی تک صاف نہیں ہوا تھا۔ تاریک سناٹے میں اسے بہت قریب سے مہندر سنگھ کے بھاری بھاری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جیسے پائن کے جنگلوں میں ہوا چلتی ہے' یا جیسے کان کے قریب سے گولیاں گزرتی ہیں۔

''پتہ ہے میں یہاں کیوں آتا ہوں۔ یہ جگہ مجھے پسند ہے۔ یہاں شریف اور دیانت دار لوگ دفن ہیں۔ یہ میں نے محسوس کیا ہے۔ ان کے کتبے' ان کے نام' ان کی تاریخیں۔ یہ چوہوں کی طرح' بد دیانتی کی موت نہیں مرے۔ وہ موت میں نے دیکھی ہے۔ اپنا اپنا مقدر ہے۔''

دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''لیکن ایک بات اچھی ہے۔ ان وقتوں میں ہم ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ کون کب مر جائے۔ کیا پتہ۔ خدا حافظ۔''

چند طویل لمحوں تک وہ نعیم کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کندھے پر رائفل کو ٹھیک کیا اور بھاری سیاہ جانور کی طرح جھول کر چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

(۱۱)

سر سے اوپر نکلتی ہوئی سرخ گھاس میں بینٹ لگی رائفل کی مدد سے راستہ بناتے ہوئے آخر کار وہ پانی کے کنارے پر آ نکلے۔ یہ ایک چھوٹی سی جھیل تھی جو جنگل کو دو حصوں میں جدا کرتی تھی۔ اس سے پرے پھر جنگل کا

سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

سیاہ اور سنہرے جنگل کے اوپر سورج غروب ہو رہا تھا اور سرخ دھوپ نے پانی میں آگ لگا رکھی تھی۔ جھیل کی سطح پر تین مرغابیاں تیر رہی تھیں۔ گھاس میں سے سپاہیوں کی قطار کو نمودار ہوتے دیکھ کر وہ پھڑ پھڑا کر اڑیں۔ ان کے پروں سے پانی کے قطرے چاندی کے دانوں کی طرح سطح آب پر برسے اور ڈوب گئے۔ سپاہیوں کے سروں پر ایک چکر لگانے کے بعد خوش وضع، مخملیں پرندوں نے آتشیں مغربی آسمانوں کی طرف رخ کر لیا۔

''ھاہ...... اوہ۔'' لانس نائک بجن نے گہرا' تھکا ہوا سانس چھوڑا اور ٹوپی اتار کر چہرہ پونچھنے لگا۔ اس کے ماتھے اور گالوں پر بے شمار ننھی ننھی خراشیں آ گئیں تھیں اور ان پر خون کے باریک سیاہی مائل قطرے جمے ہوئے تھے۔ اس نے اونچی آواز میں گالی دی۔

''نشتر کی طرح تیز ہے......''

نعیم آنکھیں سکیڑ کر سامنے والے جنگل کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک بے حد خوف زدہ ہو کر اس نے اپنے پاؤں پر نظر ڈالی جو آہستہ آہستہ دلدل میں اتر رہے تھے۔ دو تین چھوٹے چھوٹے جھٹکوں کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو باہر نکالا اور پوری قوت سے چلایا۔

''ری ٹریٹ۔''

جوان کودے' گرے' بکھرے' فوراً ہی ترتیب میں ہو کر گھاس میں غائب ہو گئے۔

''گھاس کے قانون کا خیال رکھو۔'' نعیم اونچی کرخت آواز میں چلایا۔ چہرے کو بچانے کے لئے اس نے ٹوپی آنکھوں پر کھینچ رکھی تھی۔

''عجیب ملک ہے۔'' بجن نے پھر گالی دی اور سخت بیزاری سے لمبی' تیز دھار گھاس کو دیکھا جو بلا درد اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھی۔ ''یہ میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔ اسے کیا کہتے ہیں؟''

''دلدل'' نعیم نے بتایا۔

سپاہیوں کی قطار رائفلیں سنبھالے پھونک کر قدم رکھتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ گھاس نے چاروں طرف اندھیرا کر رکھا تھا اور زمین میں سے گیلے پتوں کی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ بجن نے انگلی سے ابرو پر لٹکتا ہوا خون کا قطرہ پونچھا اور آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا۔

''میرا خون سیاہ ہو گیا ہے۔''

''ایں؟''

''یہ دیکھو۔''

''کیا دیکھوں؟'' نعیم آگے آگے چلتا ہوا بولا۔ ''رات میں سب چیز سیاہ ہو جاتی ہے۔''

''نہیں' میں نے دن میں بھی دیکھا ہے۔ پار سال فرانس میں مَیں زخمی ہوا تھا تو سرخ خون نکلا تھا۔ اب کالا ہو گیا ہے۔''

نعیم زیر لب ہنسا۔

''پتہ ہے' یہ مچھروں کا خون ہے۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' نعیم نے خشک لہجے میں کہا۔

''کل میں نے ایک مچھر مارا تھا۔ اس کا اسی طرح کا کالا خون تھا۔ پھر مجھے پتہ چلا یہ مچھروں کا خون ہے جو دن رات کاٹتے رہتے ہیں۔'' وہ ہنسا' کھوکھلی' زبردستی کی ہنسی جو زیادہ دیر تک میدان جنگ میں رہنے سے اکثر مرد ہنسنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

دائیں جانب سے گھاس میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور زرد اور کالی دھاریوں والا ایک لمبا جسم ان کے سامنے سے نکل کر بھاگا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی فائر ہوتا درندے نے بجلی کی سی تیزی سے جست بھری اور ایک جوان کو دبوچ لیا۔ اس کی پشت پر شانوں کے درمیان دانت گاڑے وہ کئی طویل' کربناک لمحوں تک اسے نوچتا رہا۔ کئی سپاہیوں نے ایک ساتھ شست باندھی لیکن گولی چلائے بغیر تذبذب کے عالم میں کھڑے رہے۔ ان کا ساتھی بھی خطرناک حد تک گولی کی زد میں تھا۔ شیر کے نیچے وہ ناتوانی سے جھرجھرایا اور زخمی بھیڑیے کی طرح چیخا۔

''فائر......'' آخر کار نعیم چیخا۔ ''فائر۔''

چند گولیاں چلیں اور درندے نے اپنے شکار کے اوپر ہی دم توڑ دیا۔

شام پڑ چکی تھی جب تھکے ماندے' بیزار' غلیظ سپاہیوں کی قطاریں جنگل میں سے برآمد ہوئیں۔ یہ ایک چھوٹا سا ریگستان تھا جو جنگل کو دو حصوں میں جدا کرتا ہوا میلوں تک چلا گیا تھا۔ یہاں ان کا کیمپ لگا تھا۔ جرمنوں کے مورچے مغربی جنگل کے پار کسی نامعلوم مقام پر تھے۔ مشرقی افریقہ میں Exercises کرتے ہوئے انہیں دو ماہ ہو چلے تھے۔ یہ مشقیں انہیں خاص طور پر 'افریقی جنگ' سے واقف کرانے کے لئے کی جا رہی تھیں۔ افریقہ کی خصوصی گھاس کی جنگ۔ گھاس جو نیلی اور سرخ اور زرد اور ہر رنگ کی تھی اور تیز دھار اور دشوار گزار تھی۔ گھاس کی جنگ کا اصول ''پہلے گولی مارو' بعد میں معافی مانگو۔'' سپاہیوں کو ذہن نشین کرایا جا رہا تھا۔ آب و ہوا شدید گرم اور مرطوب تھی اور انگریز اور فرانسیسی بٹالینوں کی حالت جلدی بیماریوں کی وجہ سے بہت خراب تھی۔ رات کو بے شمار' بڑے بڑے اور زہریلے مچھر نکل آتے جو کسی سپاہی کو ایک وقت میں پانچ منٹ سے زیادہ سونے نہ دیتے۔ جوان واضح طور پر کمزور ہو رہے تھے۔ حملے کے غیر معین مدت کے لئے ملتوی ہو جانے سے ان کے اعصاب مستقل کشیدگی کی حالت میں تھے۔ ہر قسم کی بیماریاں سپاہیوں اور جانوروں میں پھیل رہی تھیں اور ان کا ''موریل'' تباہ ہو چکا تھا۔ اتحادیوں کو بڑی مدد ان افریقی یونٹوں سے ملی جو مقامی لوگوں کو بھرتی کر کے بنائی گئی تھیں۔ حبشی بے حد جفاکش' بظاہر موسم اور مچھروں سے بے اثر' اور گھاس کی جنگ کے ماہر تھے۔ ان کے ساتھ اسی جنگل میں حبشی پلٹنوں کے علاوہ نمبر 29 پنجاب' نمبر 25 رائل فیوزلرز اور ایک بٹالین کیپ کور (Corps) کی تھی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ جب بھی یونٹ کا کوئی سپاہی بیمار ہو کر سانپ کے کاٹنے سے یا درندوں کے ہاتھوں مرتا تو وہ دیر تک جاگتے رہتے۔

''جاگ رہے ہو؟'' نعیم نے تاریکی میں کروٹ بدل کر پوچھا۔

''مچھروں کی مدد سے۔'' بجن نے مخصوص' کھوکھلے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

''تم نے قمیض سی لی ہے؟''

''ہاں۔ اب تھوڑی سینے کی فکر میں ہوں۔''

''کس قدر بدبودار ہے۔'' نعیم نے دل میں مچھر کے تیل کو کوسا۔

وہ اندھیرے میں چپ چاپ آنکھیں کھولے لیٹے تھے۔ مچھر ہزاروں کی تعداد میں ان کے کانوں پر چکر لگا رہے تھے۔ بجن نے پیٹھ پر اس گانٹھ کو محسوس کیا جو قمیض سینے سے بن گئی تھی۔

''حوالدار......'' وہ ہولے سے پکارا۔

''ہوں......''

''یہ فضول موت نہ تھی؟''

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر نعیم نے کہا: ''عام موتوں کی طرح تھی۔''

''تو سب موتیں فضول ہوتی ہیں؟''

''نہیں۔ اررر...... شاید۔ لیکن موتیں فضول نہیں ہوتیں۔ موت سے آدمی مر جاتا ہے۔''

کافی دیر کے بعد بجن نے بھاری، مغموم آواز میں صرف اتنا کہا: ''ہاں۔''

پھر اس نے سگریٹ سلگایا اور دیر تک جلتی ہوئی تیلی کو ہاتھ میں پکڑے بڑے بڑے مچھروں کو جل کر گرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ''یہ ہوا کی مانند ہیں جو کونے کونے میں بھری ہے۔'' اس نے سوچا۔

''لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔'' نعیم نے کہا۔ ''کہ ہم اس کا ماتم کرنے بیٹھ جائیں۔''

''نہیں۔'' بجن نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ''پتہ نہیں نعیم، مجھے لگتا ہے کہ...... یوں میں بزدل نہیں ہوں، مگر اس طرح جب کوئی مرتا ہے تو میرا دل رونے کو چاہتا ہے۔''

''اچھا!''

''یہ قدرت کی برتر طاقتیں ہیں، پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ جانے کیوں۔'' وہ بے چینی سے اپنی جگہ پر ہلا۔

''بجن۔'' نعیم اس کی طرف جھکا۔ ''تم نے کتنے آدمی مارے ہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے بازو ہوا میں ہلایا اور اونچی، بے چین آواز میں بولا۔ ''اس کا کوئی سوال نہیں۔''

گشت والے سپاہی نے سر خیمے کے اندر داخل کر کے کہا: ''آرام کرو...... آرام کرو......'' اور آگے بڑھ گیا۔

''حوالدار۔'' بجن اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں جانور ہوں۔ میں نے ساٹھ آدمی مارے ہیں۔ مگر یہ سب جنگ میں گزرا ہے۔ جنگ میں سب مارتے ہیں۔ اپنے بچاؤ کے لئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں محسوس نہیں کرتا۔ کوئی کم، کوئی زیادہ، میں نے ہر موت محسوس کی ہے۔'' اس کی آواز ٹوٹ گئی اور وہ بیٹھے ہوئے خشک گلے سے بولنے لگا۔

''ہر وہ آدمی جسے میں نے مارا میں نے محسوس کیا۔ اس کا خون میں نے اپنے حلق میں...... لیکن یہ موت۔''

نعیم کو محسوس ہوا کہ اس کا گلا بند ہو گیا ہے۔ وہ گھبرا کر تیز تیز بولنے لگا۔ ''ہم شاید جلد ہی حملہ کریں۔ دشمن کا کیمپ مغرب میں ہے جہاں دو دفعہ ہوائی جہاز نظر آیا تھا۔ اس جگہ ان کی طاقت سولہ ہزار ہے۔ انٹیلی جنس یہی

بتاتی ہے۔ دو ہزار گورے اور چودہ ہزار افریقی۔ دو دو سو جوانوں کی کمپنی ہے۔ ساٹھ بڑی توپیں اور اسّی مشین گنیں ہیں۔ یہ مچھر...... ''اس نے دل میں گالی دی۔

''حوالدار' جرمنوں کے مورچوں میں بھی مچھر ہوں گے۔''

''ہاں۔''

باہر رات جنگل پر اور ان کے خیموں پر بہت نیچے جھک آئی تھی اور مدھم سی چاندنی میں ریت کے ذرے ناتوانی سے مہک رہے تھے۔ شمال کے رخ کی ہوا سارے میں چل رہی تھی۔ نعیم اور بجن اور دوسرے خیموں میں دوسرے سپاہی دیر تک آنکھیں کھولے' آنکھیں بند کئے اپنے اپنے سینوں میں موت کے خلا کو محسوس کرتے رہے۔

انہی مشقوں کے دوران ایک روز انہیں اصل دشمن کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ تیز دھوپ میں وہ لومڑیوں کی طرح ہوشیاری سے' ہتھیار تھامے چل رہے تھے کہ چند قدم کے فاصلے پر گھاس میں سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ کمپنی پاؤں پر ہی رک گئی۔ ایک دو تین چار...... خاموشی۔ ''بلیک برڈ۔'' کمپنی کمانڈر نے ''کوڈ ورڈ' دہرایا۔ جواب میں گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ کمپنی سر کے بل زمین پر آ رہی۔ دونوں طرف سے فائر جاری ہوگیا۔ پتلی گھاس کٹ کٹ کر ہر طرف اڑنے لگی اور گولیاں ان کے اوپر سے گزر کر جڑوں میں سے مٹی اڑاتی ہوئی زمین میں دھنسنے لگیں۔ فائروں کی خشک' پٹاخے دار آوازیں جنگل کے سناٹے میں ہر طرف پھیل گئیں اور جانوروں نے شور مچا کر بھاگنا شروع کر دیا۔

چند منٹ کے بعد سامنے سے گولی چلنی بند ہوگئی اور وردیوں والے سپاہیوں کی ایک قطار گھاس میں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑی۔ اب دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ نعیم نے لیٹے لیٹے سامنے سے آتے ہوئے ایک سپاہی کے دل پر شست باندھ کر گولی چلا دی۔ جرمن جو سرخ چہرے والا موٹا تازہ جوان آدمی تھا' ٹانگیں سمیٹ کر گھٹنے ٹھوڑی سے لگا کر' گیند کی طرح ہوا میں اچھلا اور گھنی اُگی ہوئی گھاس میں جا پڑا۔ دائیں جانب بجن نے یکے بعد دیگرے دشمن کے دو سپاہیوں کو سنگین بھونکی۔ جب نعیم نے اسے دیکھا' وہ ایک کے سینے میں سے سنگین نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور مرتا ہوا سپاہی سنگین کو مضبوطی سے تھامے اس پر جھکا ہوا تھا۔ دو ایک بار جھٹکے دینے پر بھی جب سنگین نہ نکلی تو اس نے گھوڑا چڑھا کر لبلبی دبا دی۔ سکے کے جھٹکے سے مردہ سپاہی نیچے گر پڑا اور خون سے چمچماتی ہوئی سرخ سنگین ہوا میں کھڑی رہ گئی۔ بجن کے چہرے پر جنگلی جانوروں کی سی وحشت تھی۔ وہ بھاگتا ہوا جا کر ایک دشمن پر پیچھے سے ٹوٹ پڑا۔

ایک ادھیڑ عمر کا کسانوں کے سے چہرے والا جرمن بھاگتا ہوا نعیم کے سامنے سے گزرا۔ اس کی سنگین کا رخ کمپنی کمانڈر کے پیٹ کی طرف تھا جو پستول ہاتھ میں لئے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ مشین کی طرح نعیم بڑھا اور سنگین اس کی پسلی میں گاڑ دی۔ جرمن کسان کے میلے زرد دانتوں کے بیچ سے ایک کربناک آواز بلند ہوئی اور وہ سنگین پر جھک گیا۔ ایک لمحے کے بعد اس نے چہرہ اٹھا کر اپنے حملہ آور کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ معاً نعیم کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے درخت کے تنے پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ جب اندھیرا دور ہوا تو وہ رائفل اٹھانے کے لئے جھکا۔ اس وقت بے تحاشا خوف زدہ ہو کر اس نے دیکھا کہ بایاں

بازو صرف دو تپلی پتلی نسوں کے سہارے لٹک رہا تھا۔ بیہوش ہونے سے پہلے اس نے صاف طور پر لڑنے والوں کو اپنے ارد گرد دوڑتے ہوئے، گرتے ہوئے، تیز تیز گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے سنا۔

دائرے، دائرے۔ چہرے، چہرے، چہرے۔ ستارے۔ ہزاروں لاکھوں ستارے۔ کبھی دور مغرب میں ایک اکلوتا سبز ستارہ جگمگاتا۔ چکر۔ جیسے ہوا کے طوفان میں ایک چکردار سیڑھی۔ چڑھائی، اڑان، دونوں بازوؤں کی جگہ دو پر۔ اوپر، اوپر، بہت اونچی اڑان۔ پھر خوبصورت جنگل آئے جن کے راستوں پر زرد پتے گر رہے تھے اور دونوں پر پھیلائے کوئی درختوں کے نیچے نیچے پرواز کر رہا تھا۔ چہرہ، چاند کی روشنی میں ستا ہوا، غلیظ چہرہ۔ آگے سمندر آئے، اور شکستہ ساحل جن پر سفید بادبانی کشتیاں سکون سے کھڑی تھیں۔ پھر وادی۔ بہت طویل وادی اور سائے جن پر آہستہ آہستہ بارش ہو رہی تھی۔ چہرہ، موٹے ہونٹ اور بھوری آنکھیں۔ گہرے سائے اور خاموش، نرم بارش۔ پھر ہونٹ ایک دم پھیل گئے اور سر پیچھے پھینک کر کوئی ہنسا۔ مزید چکر۔ چاند پر برف گرنے لگی۔ ایک جہاز تیزی سے پرواز کرتا ہوا پاس سے گزرا اور چاند پر چلا گیا۔ ستارے لمبی لمبی روشن لکیریں بناتے ہوئے آسمان پر لٹکنے لگے، برف باری تیز ہوگئی۔ لکڑی کی میز اور اس پر جھکے ہوئے چند اجنبی چہرے۔ اوزار۔ کافور کی بو، چیخیں۔ ایک سمندری جہاز بادلوں پر کھڑا سیٹیاں بجا رہا تھا اور خالی کمروں میں ستارے لٹک رہے تھے۔ سفید پروں والا پرندہ آہستہ آہستہ پر ہلاتا بادلوں میں غائب ہوگیا۔ چکر۔ چکروں کا تسلسل۔ سیٹیاں۔ اندھیرا۔ چکر چکر چکر۔

اس نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا تو چھت اور دیواریں ہل رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت دیر سے آنکھیں کھولے پڑا تھا۔

دو سپاہی 'ریڈ کراس' کے بیج بازوؤں پر باندھے اس کے پاؤں کے قریب بیٹھے تھے اور گاڑی تیزی سے تارکول کی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے میں نرم دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جھکی ہوئی سیاہ فام عورتیں شاید چاول کی پنیری بو رہی تھیں۔

''چاول بونے کا موسم ہے؟'' اس نے دل میں سوال کیا۔ سڑک کے کنارے فوجیوں کے خیمے تیزی سے گزرنے لگے۔ اس نے گردن موڑی۔ بازو کہنی پر ختم ہوگیا تھا اور بہت سی سفید پٹیوں میں لپٹا سٹریچر کے ساتھ جکڑا ہوا تھا۔ خوف اور نقاہت سے وہ پھر بے ہوش ہوگیا۔

صبح کی ہلکی سرد دھوپ کھڑکی کے راستے اس کے چہرے کے نچلے حصے پر پڑ رہی تھی اور بڑھی ہوئی داڑھی میں سے جلد کا زرد رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ کمبل کو ٹانگوں پر کھینچ کر وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ نمایاں طور پر کمزور ہو چکا تھا۔ اس کے جبڑے اور رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں، اور تیکھے، خوب صورت نقوش میں کرختگی اور جماؤ آ گیا تھا۔ دہانے کی مضبوطی سے ایک پورے جوان آدمی کی پختگی ظاہر ہوتی تھی۔ سب سے نمایاں تبدیلی بہر حال اس کی آنکھوں میں آئی تھی، بڑی بڑی سیاہ، چمکدار اور بے چین آنکھیں جو بڑی گہرائی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ہسپتال ایک سکول کی عمارت میں تھا۔ لمبا ہال کمرہ زخمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ زمین پر، بڑھی ہوئی داڑھیوں والے مریض شانے سے شانہ بھڑائے ایک دوسرے کی ٹانگوں میں سر دیئے پڑے تھے۔ ڈاکٹروں اور تیمارداروں کے گزرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ ان کی ٹانگوں اور بازوؤں کے درمیان قدم رکھتے، مریضوں کی کراہوں اور گالیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھتے۔ باقی تمام کمرے اور برآمدے اور صحن زخمیوں سے اٹے پڑے تھے۔ صحت یاب ہوتے ہوئے مریض اپنی جگہوں پر بیٹھے بیٹھے نئے آنے والوں کی چیخ و پکار کو بڑی مانوسیت اور لاتعلقی سے دیکھتے رہتے، جیسے تندرست بھینسیں بچہ جنتی ہوئی بھینس کو دیکھتی ہیں۔

نعیم کے ساتھ والے بستر پر کچھ دیر ہوئی ایک پٹھان سپاہی کو لایا گیا جو ایک روز قبل زخمی ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دی گئی تھی اور وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھوں کے بال کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اور قمیض کے گندے کف پر جوئیں چل رہی تھیں۔ ڈاکٹر کچھ دیر پہلے راؤنڈ کرتا ہوا اس کے پاس سے گزرا تھا۔

''کیا حال ہے، جوان؟'' اس نے رک کر اپنے مخصوص بےحس لہجے میں پوچھا تھا۔

''خرکس کا بچہ۔ کیا حال ہے؟ ہیں؟'' وہ سوجی ہوئی آنکھیں کھول کر چلایا، پھر دفعتاً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''میں لنگڑا ہو گیا ہوں۔ میں......''

''جمعے کے روز تمہاری آخری ڈریسنگ ہوگی، حوالدار نعیم احمد خان۔''

ڈاکٹر نے اس کے کاغذ دیکھ کر کہا اور پھلانگتا ہوا گزر گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے ادھیڑ عمر کی خوب صورت، اداس، خاموش سسٹر ڈورس پانی کا برتن اٹھائے زخمی پٹھان کے پاس آئی۔ وہ کمبل میں منہ دے کر رنج اور تکلیف کی وجہ سے داڑھی نوچ رہا تھا۔

''مت نوچو داڑھی۔'' سسٹر ڈورس نے پیار سے دھمکایا اور اس کا منہ دھونے لگی۔

نعیم گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کس قدر مستعد عورت ہے، اس نے سوچا۔

''مت روؤ۔'' وہ زخمی کو مصنوعی غصے کے ساتھ جھڑک رہی تھی۔

''سسٹر، ہم سب تمہارے بچے ہیں۔'' نعیم نے خوشدلی سے کہا۔

سسٹر نے اسے سیاہ، گہری آنکھوں سے دیکھا اور اداسی سے مسکرائی۔ ''یاد ہے پچھلے مہینے جب تم آئے تھے تو اسی طرح رو رہے تھے۔''

''تم جھوٹ کہتی ہو۔ میں کبھی نہیں رویا۔''

''تمہیں اب یاد بھی نہیں رہا۔ اس وقت تم بہت چھوٹے سے تھے۔''

وہ ہنسا۔ ''سسٹر، تم بڑی محنت کرتی ہو۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے ایک لحظے کے لئے رک کر نعیم کو دیکھا، پھر کپڑے سے پٹھان کا چہرہ خشک کرنے لگی۔ اس سے فارغ ہو کر واپس جانے کی بجائے وہ نعیم کے پاس آ کھڑی ہوئی اور شستہ انگریزی میں بولی۔

''زخمیوں سے مجھے بہت کم ہمدردی ملتی ہے، حوالدار۔ میرے دو بچے ہیں اور میرا خاوند پاگل خانے میں

ہے۔ اس تمام عرصے میں مَیں نے غلیظ اور بدبودار انسانوں کی خدمت کی ہے' اس لئے کہ میرے بچے نفیس' صاف ستھری فضا میں پل سکیں۔'' وہ رکی۔ ''اس جگہ محض بیماری اور موت ہی نہیں ہوتی' حوالدار۔ سات دن کے بعد تم چلے جاؤ گے' لیکن اگلی بار جب تم زندگی کی خوبصورتی اور محنت اور اچھائی کو دیکھنا چاہو تو یہاں آ جانا۔'' وہ گندے پانی کا برتن اٹھا کر بچتی بچاتی' رستہ بناتی باہر نکل گئی۔ وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھا اور اپنے ہمسائے کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''امیر خان۔''

''گھر؟''

''کاکا خیل۔ پشاور۔''

''کہاں زخمی ہوئے تھے۔''

''مجھے نام نہیں آتا۔''

''رجمنٹ؟''

''فرنٹیئر فورس رائفلز۔''

اس تمام دوران میں زخمی کی نظریں اس کے آدھے بازو پر جمی رہی تھیں۔ نعیم نے وہ بازو آگے بڑھایا اور ہنسا۔ ''ہاں۔ اس کو بھی کاٹ دینا پڑا۔''

چند سیکنڈ تک زخمی تعجب سے اسے دیکھتا رہا' پھر معاً بچوں کی سی بے تکلف مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ہمسائیگی کے ایک لمحے میں اس نے ایک مشترکہ دکھ کو پہچان لیا تھا۔

باہر برآمدے میں دوپہر سے پہلے کی دھوپ پھیل رہی تھی' اور شفاف شیشے کی سی فضا میں شہد کی مکھیاں اڑ رہی تھیں۔

آخری پٹی کروانے کے فوراً بعد نعیم نے یونٹ میں رپورٹ کی جہاں سے اسے بریگیڈ ہیڈکوارٹرز بھیج دیا گیا۔

بریگیڈ ہیڈکوارٹرز کی اونچی' مغربی طرز کی عمارت میں داخل ہو کر اس نے اپنے کاغذ ایک کلرک کے حوالے کئے اور برآمدے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اسے بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے سامنے جاٹ نگر کا خالق کھڑا تھا۔ انہوں نے کسان فوجیوں کے انداز میں ایک دوسرے کو پکارا اور گرمجوشی سے مصافحہ کرنے لگے۔ پھر خالق کی نظریں اس کی لٹکتی ہوئی خالی آستین پر رک گئیں۔

''پیچھے سے میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔''

نعیم خاموش رہا۔

''یہ...... یہ۔''

''ہاں۔'' نعیم نے لاپروائی سے کہا۔ ''میں زخمی ہوا تھا۔''

اس نے سگریٹ نکال کر خالق کو دیا۔ دونوں خاموشی سے دھواں اڑانے لگے۔

''تمہیں یاد ہے نعیم' جب ہم کبڈی کھیلنے کے لئے روشن پور آئے تھے تو اس ہاتھ کی ضرب سے تم نے میرا کان توڑ دیا تھا۔'' اس نے غیر ارادی طور پر کان کو چھوا۔

نعیم ہنسا۔ ''تمہاری بددعا لگی ہوگی۔''

''مذاق مت کرو۔ مجھے دکھ ہوا ہے۔'

''کوئی اور بات کرو۔'' نعیم نے بے چینی سے اردگرد دیکھا۔ مجھے اصل میں وہ واقعہ یادنہیں رہا۔ تم زخمی ہوئے تھے؟''

''میں سپلائی میں تھا۔''

''انبالہ بریگیڈ میں اور سب لوگ؟''

خالق آنکھیں سکیڑ کر ہولے ہولے بولنے لگا: ''عبداللہ کو پچھلے مہینے کراس ملا تھا۔ میرا بھائی طفیل حوالدار ہوگیا ہے۔ فرانس میں ہے۔ درشن سنگھ ناکارہ ہوکر واپس چلا گیا تھا۔ روشن پور کا مہندر سنگھ مارا گیا۔''

نعیم کے ہاتھوں میں سگریٹ کانپنے لگا۔ خالق نے بات جاری رکھی:

''وہ بالکل گدھا نکلا۔ سنا ہے جب ان کی کمپنی ایڈوانس میں پڑی تو اس نے ہلنے سے انکار کردیا۔ کمپنی کمانڈر کے بار بار حکم دینے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔''

''پھر؟'' نعیم نے بے دھیانی سے پوچھا۔

''پھر کیا؟ ناچار کمپنی کمانڈر نے اسے وہیں پر شوٹ کردیا۔ بڑا اچھا سپاہی تھا' پر ذرا یہاں پر کمزور تھا۔'' خالق نے سر کو چھو کر بتایا۔

''یہاں کا موسم بھی عجیب ہے۔'' نعیم نے بے چینی سے کہا۔ ''دھوپ نکلے تو گرمی' نہ نکلے تو سردی۔''

''تمہارا دوست تھا۔'' خالق نے کہا۔

نعیم نے لرزاں انگلیوں سے سگریٹ کے تین چار کش لئے اور اسے دور پھینک دیا۔ پھر اس نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''روشن پور میں وہ میرا واحد دوست تھا۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ فرانس میں۔''

''فرانس میں؟'' خالق نے صرف اتنا کہا۔ لوہے کے بنچ پر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد وہ ایڈجوائنٹ کے سامنے پیش ہوا۔

''حوالدار نعیم احمد خان۔''

''یس سر......'' وہ تن کر کھڑا تھا۔

''ہمیں افسوس ہے تم زخمی ہوئے۔ لیکن رجمنٹ کو تمہاری بہادری پر فخر ہے۔ ہم نے ملٹری کراس کے لئے تمہاری سفارش کی ہے۔ اس سلسلے میں ابھی تک ڈویژنل ہائی کمانڈ کے احکامات کا انتظار ہے۔'' بوڑھے کرنل نے اس کے چہرے پر سیدھا دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رائفل اٹھا سکتے ہو؟''

''یس سر۔''

''اس عرصے میں تم زخمی قیدیوں پر ڈیوٹی دو گے۔''

''یس سر۔''

''ڈس مس۔''

برآمدے میں مڑتا ہوا وہ ایک دھچکے کے ساتھ رکا اور پچھلے پاؤں پر لوٹ آیا۔ وہ دو مریض ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ایک کا چہرہ سوج کر کپا ہو رہا تھا۔ دوسرے کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی' لیکن اس کے ہونٹ خوبصورت تھے اور چمکیلے زرد رنگ کے بال تھے۔ ان سے اگلے زخمی کے اوپر بوتل لٹک رہی تھی اور ربڑ کی نالی کے ذریعے اس کے جسم میں خون پہنچایا جا رہا تھا۔ اس سے اگلے کے بائیں ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلیوں پر خون آلود پٹی بندھی تھی۔ اس سے اگلا زخمی اور اس سے اگلا' اور اس سے اگلا۔ وہ سب بھاری' بیزار چہروں کے ساتھ لیٹے اور بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں میں دودھ دینے والے جانوروں کی سی بے بسی تھی۔ نعیم بے خیالی سے انہیں دیکھتا ہوا گزر گیا۔ اگلے موڑ پر اس کا سپاہی رائفل اٹھا کر 'اٹینشن' ہو گیا۔ نعیم نے کندھے پر رائفل کو درست کیا اور سیڑھیوں کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ نیچے دو گلہریاں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ یکلخت بے حد گھبرا کر وہ مڑا اور برآمدے میں چلنے لگا۔ لیکن اگلے 'ونگ' میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ اسی برآمدے میں چکر لگاتا رہا۔

''وہ پہچان لے گا۔'' ایک خیال بار بار اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ ''یقیناً۔ خدایا...... یہ کیسے سخت جان لوگ ہیں۔'' سیڑھیوں پر گلہریاں دُمیں پھلائے ایک دوسری کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔

''اب کیا ہوگا؟'' اس نے سوچا۔ ''کیا ہوگا؟ کیا ہوگا؟ لاحول ولا قوۃ۔ مجھے اُس طرف کے سپاہی کو چیک کرنا ہے۔ بہرحال۔''

سوجے ہوئے چہرے والے نے اپنا بے تاثر چہرہ اٹھایا اور بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ مضبوطی سے جبڑے پر جبڑا جمائے وہ اگلے 'ونگ' میں مڑا اور سیدھا دیکھتے ہوئے چلنے لگا۔ سپاہی نے رائفل کندھے پر رکھ کر سلام کیا۔ وہ دیوار پر نظریں جمائے اس کے پاس کھڑا رہا۔

''اس نے دیکھا ہے۔ اس نے دیکھ لیا ہے۔ یقیناً۔ قطعی۔ اس کے پاؤں ہل رہے تھے۔'' وہ آدھا ایڑیوں پر گھوما۔ ''اب اس نے دیکھ لیا ہوگا۔ بازو سے دیکھنے پر میں پہچانا جاتا ہوں؟ پتہ نہیں۔ شاید!'' وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ ہوا سے اس کی خالی آستین ہل رہی تھی۔ سامنے والے درخت کے میلے' زرد پتوں پر بارش بہت دیر سے نہیں ہوئی تھی۔

''وہ میرا کیا کر سکتا ہے؟ ایں؟ ہاں' وہ کیا کر سکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔'' اس خیال نے اسے بے حد سکون پہنچایا اور وہ حیران ہوا کہ اب تک وہ کیا سوچتا رہا تھا۔

سامنے پچکے ہوئے گالوں والا ادھیڑ عمر جرمن کسان دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے سامنے سے گزر گیا۔ آگے جا کر وہ مڑا اور زخمی کے سرسوں کی طرح کے زرد' کرخت نقوش والے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔ نعیم دوبارہ اس کے سامنے سے گزرا۔ تیسری بار جب وہ اس کے قریب سے گزر رہا تھا تو زخمی نے آنکھیں کھول دیں اور سوئی سوئی بیزار نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگا۔ نعیم

پر سے اس کی نظریں دوسری جاندار' بے جان چیزوں کی طرح گزر گئیں۔ ان نظروں میں شناسائی کی رمق تک نہ تھی۔ نعیم نے دل میں عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ وہ غیر ارادی طور پر ایک لحظے کے لئے اس کے سامنے رکا۔ اسے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پا کر زخمی نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ نعیم نے حیرت سے اس کی گہری ملائم آواز کو سنا جس کی اس کے چہرے سے کوئی مطابقت نہ تھی۔

''آفیسر' مجھے مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

نعیم گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''ابھی یہاں دھوپ آ جائے گی۔'' وہ تکلیف سے بول رہا تھا۔ ''ہر روز ایسا ہوتا ہے۔ یہاں کی دھوپ...... میرا مطلب ہے کہ اگر مجھے کمرے میں جگہ مل جائے تو۔''

نعیم خاموشی سے اُٹھ کر ڈاکٹر کے پاس آیا۔ ''ڈاکٹر ایک مریض سخت تکلیف میں ہے۔''

ڈاکٹر نے اُکتائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک معمولی آپریشن کی تیاری کر رہا تھا۔

''دھوپ ساری اس پر آ جاتی ہے۔''

''دھوپ تو ہر جگہ آ جاتی ہے۔'' ڈاکٹر جھنجھلا کر بولا۔

''میرا مطلب ہے ڈاکٹر' کہ اگر اسے کمرے میں ڈال دیا جائے۔'' وہ مریض پر جھک گیا۔

''لیکن کیپٹن'' نعیم آگے بڑھا۔ ''وہ سخت تکلیف میں ہے۔'' ڈاکٹر اوزار برتن میں رکھ کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ ''تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟ ایں؟ تمہارا بازو کیا گدھا چبا گیا تھا؟''

''مگر کیپٹن...... وہ تو مریض۔''

''مریض...... جرمن۔'' سب نے دیکھا کہ غصے کے مارے ڈاکٹر کے کان سرخ ہو گئے اور اس کی گردن کے بال اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور دانت پیس کر دھیما سا 'سؤر......' کہنے کے بعد اوزاروں پر جھک گیا۔

نعیم نے ایک آخری کوشش کی: ''کیپٹن' سر' وہ میرے ایک دوست کی طرح ہے۔ اس کا چہرہ۔ بہت عزیز دوست۔ وہ فرانس میں مارا گیا تھا۔''

''زیادہ سے زیادہ تم برآمدے میں ترپال لٹکا سکتے ہو۔'' ڈاکٹر نے جھکے جھکے کہا۔

سپاہی کی مدد سے ترپال لگا چکنے کے بعد وہ اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

زخمی اسی گہری' نرم آواز میں بولا: ''میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں' سارجنٹ۔''

''تم کہاں زخمی ہوئے تھے؟''

''ایگرنجو کی دلدل میں...... تم؟''

''میں؟ ارر...... فرانس میں۔'' نعیم نے جھوٹ بولا۔

اس نے آنکھیں میچ کر سر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے پتھریلے چہرے پر صرف ہونٹوں کے گرد ہلکا سا تبسم تھا۔ اس کے سینے پر چھوٹے چھوٹے سرخ دانے نکلے ہوئے تھے اور پسلی اور پیٹ پر پٹیاں بندھی تھیں۔ نعیم

رائفل کے پٹے پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا۔ ''میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے پہچانتے ہو؟'' اس نے دل میں کہا۔

زخمی قیدیوں کا ہسپتال ایک قدیم گرجا گھر کے احاطے میں تھا۔ نعیم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں داخل ہوا۔

زخمی بہت کم بات کرتا تھا۔ وہ ہر روز نعیم کو دیکھتا اور ہولے سے مسکرا دیتا۔ گو نعیم اسے دیکھتے ہی اس سے باتیں کرنے' اس کی آواز سننے کے لئے بے تاب ہو جاتا۔ ہر روز اس کے پاؤں کے پاس رک کر وہ پوچھتا: ''کیسے ہو؟'' جس کے جواب میں اس کے منجمد چہرے پر صرف ہونٹ مسکراتے اور وہ آنکھیں بند کر لیتا۔ نعیم کے دل میں بے چینی کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

اس روز نعیم کو دیکھ کر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکنے لگیں۔ نعیم گھٹنا ٹکا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''تم نے میری مدد کی تھی سارجنٹ۔ میں بھی تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' بات کرنے میں اس کی آنکھوں میں وہی نامعلوم سی نرمی آ گئی جس کو دیکھنے والا محسوس نہیں کرتا' لیکن بعد میں ہمیشہ کے لئے واضح طور پر یاد رہتی ہے۔ ''میں نے یہ کام اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ کل میری آخری پٹی ہوگی۔ میں کام کر سکتا ہوں۔ اگر تم مجھے چیڑ کی لکڑی کا ایک ٹکڑا اور چند اوزار لا دو۔ میں تمہارا بازو بناؤں گا۔''

''اوہ......'' نعیم ہنسا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

''مگر میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں خالی بیٹھ بیٹھ کر تنگ آ گیا ہوں۔ لا دو گے؟'' اس کی آواز کا خفیف سا ارتعاش نعیم کے کانوں میں گونجتا رہا۔

''اچھا'' اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''تمہیں کون سے اوزار چاہئیں؟''

اگلے دن نعیم نے تین اوزار اور چیڑ کا دو فٹ لمبا ٹکڑا لا کر اس کے آگے رکھ دیا۔

''ڈاکٹر سے بڑی چخ چخ کرنی پڑی۔''

''کیا کہتا تھا؟''

''کہتا تھا اوزاروں سے تم اپنا زخم کھول لو گے۔''

زخمی مخصوص دھیمے انداز میں مسکرایا اور فوراً کام میں مشغول ہو گیا۔

''مجھے بتا دینا چاہیے۔'' اس نے بارک میں لیٹے لیٹے ہزارویں بار سوچا اور اپنی جگہ پر کسمسایا۔ اس کی بے خواب آنکھیں جل رہی تھیں اور وہ بڑی دیر سے پشت پر لیٹا تاریک چھت کو گھور رہا تھا۔ نصف رات کے بعد نیند آنی شروع ہوئی اور ایک شدید تر کربناک کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ روزانہ رات کو اسی طرح ہوتا۔ نیند آتی مگر وہ سو نہ سکتا۔ بخار کی طرح جلتا ہوا خمار اس کی آنکھوں میں بھر جاتا جو آہستہ آہستہ اس کے سارے جسم کو گرفت میں لے لیتا۔ وہ جمائیوں پر جمائیاں لیتا' آنکھیں نیند کے بوجھ تلے بند ہو جاتیں' جسم ڈھیلا پڑ جاتا' پھر ایک بے چینی اس کے دل سے نکلتی اور سارے جسم پر پھیل جاتی اور وہ مرتے ہوئے بیل کی طرح جھرجھرانے لگتا۔ وہ انسانی

جذبات کے شدید کرب ناک دور میں سے گزر رہا تھا۔ چند دنوں میں وہ نمایاں طور پر دبلا ہوگیا تھا اور بے خوابی کا خلا اس کی آنکھوں میں پھیل رہا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ زخمی سپاہی اپنے کام کو جاری رکھے۔ ہر روز رات کو وہ فیصلہ کرتا کہ صبح جاتے ہی اس سے تمام اوزار چھین لے گا اور لکڑی کا وہ کمبخت ٹکڑا نوچ کر پھینک دے گا۔ یا...... اس کو ساری بات بتا دے گا۔ لیکن ہر روز صبح برآمدے میں داخل ہوتے ہی اس کے حواس جواب دے جاتے اور اس کا ارادہ دوپہر کی برف کی طرح پگھلنے لگتا اور اسے دیکھتے ہی زخمی کے چہرے پر ہلکی سی منجمد مسکراہٹ پیدا ہوتی اور وہ جلدی سے جھک جاتا۔

''یہ سب تم کیا کر رہے ہو؟'' ایک روز نعیم نے خفگی سے کہا۔ وہ چہرہ اٹھا کر تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

اب میں بتا دوں گا۔ اب میں اسے بتانے والا ہوں سب۔ نعیم نے سوچا ''سنو۔ ایک بات۔ تمہیں بتاؤں۔'' زخمی اسی طرح دیکھتا رہا۔

نعیم نے اس کی کوری، مخلص آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور ندامت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کیا ہے؟'' کچھ دیر کے بعد جرمن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا تمہارے لئے کام کرنا اچھا نہیں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' لکڑی پر جھکنے سے پہلے اس نے کہا۔

بیٹھے بیٹھے نعیم کا جی گھبرانے لگا۔ ''تم باتیں کیوں نہیں کرتے۔'' اس نے پوچھا۔

''کرتا ہوں۔''

''بہت کم۔''

''باتیں کروں گا تو کام کیسے ختم ہوگا۔''

نعیم خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ آج پہلی بار وہ دھیان سے اس لکڑی کے ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا جس نے ان چند دنوں میں ایک لمبی گول کلائی اور مضبوط، محنتی انسانی ہاتھ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ اسے گھٹنوں میں دبائے جھکا ہوا نہایت انہماک اور کاریگری سے انگلیوں کے جوڑ بنا رہا تھا۔ اس نے کام کرتے کرتے سر اُٹھایا اور بولا: ''دوستی خاموشی اور محنت میں پرورش پاتی ہے۔ باتیں ہم بازاروں اور دکانوں میں کرتے ہیں۔''

''تم میرے دوست ہو؟'' نعیم نے مسکرا کر کہا۔

''میں سمجھتا ہوں۔''

''مگر ہم تو دشمن ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ جھکا جھکا بولا۔ ''میں یہ سب نہیں سمجھتا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ سب میدان جنگ میں تھا۔ سب۔ یہاں تم نے میرے اوپر احسان کیا ہے، میں نے تمہارے لئے محنت کی ہے۔ ہم دونوں دوست ہیں۔'' پھر ہاتھ روک کر اس نے سر اٹھایا۔ ''سنو۔ ہیمبرگ کے قریب میرا گاؤں ہے۔ میں تیس سال تک وہاں رہا اور کسی سے نہیں لڑا۔ اب اگر واپس چلا گیا تو کسی سے نہیں لڑوں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں اگر میں لڑا یا تم لڑے تو کون قصور وار ہے؟ مجھے سب پتہ ہے۔ میں ترکھان کا کام کرتا تھا لیکن گاؤں کی عدالت والے مجھ سے آ کر مشورہ لیا

کرتے تھے۔ یہ سب زندگی کا بہاؤ ہے۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جانتا ہوں۔‘‘

اس کی آواز بلند ہوگئی اور آس پاس کے چند زخمی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ جلدی سے لکڑی کے ٹکڑے پر جھک گیا۔ باتوں کے جوش کی وجہ سے ابھی تک اس کے زرد ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔

’’یہ محنتی ہاتھ ہے۔‘‘ نعیم لکڑی کو چھوکر بولا۔

’’یہ ایک ایماندار آدمی کا ہاتھ۔‘‘ زخمی نے سنجیدگی سے کہا۔ زرد مٹیالے بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر ہل رہی تھی۔

بریگیڈ ہیڈکوارٹرز سے لوٹنے کے بعد نعیم پہلی بار رات بھر سویا۔ سونے سے پہلے اس نے آنکھیں بند کر کے دل میں کہا: ’’کل میں اسے بتا دوں گا۔ آخر کیا فرق پڑتا ہے‘ جب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔‘‘

سورج گرجے کے کلس پر چمک رہا تھا جب وہ کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ اس کے پاس جانے سے پہلے وہ دیر تک برآمدوں اور کمروں کے چکر لگاتا رہا۔

آج وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے‘ آنکھیں بند کئے‘ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ نعیم آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کاہلی سے آنکھیں کھول کر مسکرایا۔

’’تم جاگ گئے؟‘‘ نعیم نے پوچھا۔

’’میں جاگ رہا تھا۔ مجھے پتہ چل جاتا ہے جب تم آتے ہو۔‘‘

نعیم کا دل بیٹھ گیا۔

’’آج تم تروتازہ نظر آرہے ہو۔‘‘ جرمن نے کہا۔

’’مجھے ملٹری کراس مل گیا ہے۔ کل بریگیڈ ہیڈکوارٹرز میں پیشی تھی۔ آج میرا یہاں آخری دن ہے۔‘‘

جرمن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ’’میں خوش ہوں۔‘‘ اس نے کہا اور کمبل میں سے اوزار اور لکڑی کا بازو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ’’شکر ہے کل میں نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔‘‘

نعیم نے چیزیں اس کے ہاتھ سے لے کر جلدی سے بڑے کوٹ کی جیب میں ڈال لیں۔ چند لمحے تک وہ اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔

’’تمہیں افسوس ہے؟‘‘ نعیم نے پوچھا۔

’’کیوں؟‘‘

’’اپنے ملک میں ہوتے تو تمہیں بھی کراس ملتا۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ وہ ہنسا۔ ’’کیا فرق پڑتا ہے؟ میں اپنے گاؤں واپس جا کر کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بس۔‘‘

نعیم کھسک کر اس کے قریب ہوگیا۔ ’’سنو‘ تم بھاگنا چاہتے ہو؟‘‘ جرمن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

’’مجھے بتاؤ۔‘‘ نعیم نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ’’میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔‘‘

اتنے عرصے میں پہلی بار وہ ہنسا۔ کسانوں کی طرح منہ کھول کر‘ گہری‘ مختصر ہنسی۔

''اوہ......نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ چند سال قید میں کاٹ کر میں واپس چلا جاؤں گا۔ دیانت دار آدمی کی طرح۔ مجھے یقین ہے یہ مجھے گولی نہیں ماریں گے۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ' بہرحال میں خوش ہوں کہ جنگ کے باوجود بھی ہم دوست بنے...... میں تمہیں یاد رکھوں گا۔''

دیر تک وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے اور مصافحہ کرتے رہے۔''اب میں اسے بتا رہا ہوں۔ ابھی۔'' اس نے سوچا۔ ''دوست۔'' اس نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ دبایا اور دیر تک دبائے رکھا' پھر گرمجوشی سے ہلانے لگا اور ہلاتا رہا۔ ''خدا حافظ۔'' آخر بند ہوتے ہوئے گلے سے اس نے کہا اور اٹھ کر تیزی سے برآمدے میں مڑ گیا۔

آخری سیڑھی پر پاؤں رکھ کر اس نے آخری بار مڑ کر دیکھا۔ سامنے لیٹے اور بیٹھے ہوئے مریضوں کی لمبی قطار تھی۔ اس کے دماغ میں زور سے کوئی چیخا۔ جیب میں لکڑی کے ٹکڑے پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ وہ مڑا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا جی چاہا کہ چیخیں مار مار کر روئے۔

باہر سڑک پر چند بچے ایک دوسرے کی قمیصیں پکڑے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

☆......☆......☆

(۲)

ہندوستان

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

میر تقی میرؔ

☆......☆......☆

(۱۲)

گاؤں کی سوئی سوئی گرد آلود فضا اسی طرح قائم تھی۔ ان برسوں میں روشن پور کے بیسیوں نوجوان اجنبی سرزمینوں میں ہلاک ہو گئے تھے۔ جنگ کے میدانوں میں بکھرے ہوئے ان کے محبوب، مضبوط جسم تیز دھوپ میں بخارات بن کر اُڑ گئے اور نئے سیلابوں نے، نئی آندھیوں اور طوفانوں نے ان کی ہڈیاں زمین میں دبا دیں۔ بیسیوں عورتیں بیوہ ہو گئیں، اور لڑکیاں محبت میں غریب ہو گئیں۔ روشن پور کی زمینوں میں سیلاب آئے اور فصلیں تباہ ہو گئیں اور کسان قرضے اور بھوک کے نیچے جھک گئے۔ جانور بیماری سے مر گئے یا بھوکے کسانوں نے کاٹ کر کھا لئے اور عورتوں اور بھینسوں کے دودھ سوکھ گئے، اور ایک وقت آیا جب پاگل آنکھوں والے کسانوں کے ڈھانچے گلیوں میں آوارہ پھرتے تھے اور چھتوں پر بڑھے ہوئے پیٹوں والے زرد رُو بچے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتے تھے، تو اس سے گاؤں پر جلے ہوئے جنگل یا بمباری سے تباہ شدہ قلعے کا شبہ ہوتا تھا۔

لیکن نیا موسم اپنے پورے رنگ روپ اور آب و تاب کے ساتھ آیا۔ سیلاب کا پانی اتر گیا اور بارشوں سے گرے ہوئے مکانوں کی دیواریں کھڑی کی گئیں اور ہر دم جوان ہوتے ہوئے لڑکوں اور بیلوں اور بوڑھے ہوتے ہوئے کسانوں نے سیلاب کی ڈالی ہوئی سیاہ، زرخیز مٹی میں ہل چلایا اور گیہوں اور چنے اور دوسرا اناج بویا۔ دن رات کی کڑی محنت سے کھیتوں میں سبز ریشمی فصل اٹھی اور گندم کے دانوں میں گودا پڑا اور عورتوں کی چھاتیاں دودھ سے بھر گئیں اور ان کی کوکھ میں انسانی بیج بڑھنا شروع ہوا اور تخلیق کی پُرسکون شفاف فضا ہر طرف پھیل گئی۔ لڑکیوں نے نئے نئے جوانوں سے محبتیں لگائیں اور رو رو کر اور گمشدہ محبوب یاد کر کر کے انہیں بتایا کہ جنگ کیسی خراب شے ہوتی ہے۔

فصلوں کے درمیان کھڑے ہو کر کسانوں نے پُر قناعت نظروں سے دیکھا کہ صبح کی تازہ، بے ضرر دھوپ ان کی گلیوں اور مکانوں کی ممٹیوں میں داخل ہوئی، اور گہرے نیلے، بے داغ آسمان کے مقابل مکڑی کے چمکیلے تار اور آک کی ''بوڑھی میا'' گاؤں کے اوپر اوپر لہرانے لگیں اور بچے ان کو پکڑنے کے لئے شور مچاتے ہوئے دوڑے۔ پھر سورج اونچا ہوا تو دھوپ ان کے صحنوں اور دالانوں میں پھیل گئی اور ایک خواب آلود، مٹیالی گرد نے، جو زندگی اور کام

کی علامت ہوتی ہے، گاؤں کو لپیٹ میں لے لیا اور کھیتوں میں سے اٹھ کر وہ سائے میں آ بیٹھے اور دوپہر کا کھانا کھانے اور تمبا کو پینے لگے' اور اس سارے وقت کو انہوں نے بڑے سکون اور دل بستگی سے برداشت کیا' کہ جو کچھ گزرا وہ ہندوستان کے کسان کا مقدر تھا اور ایسا ہوتا ہی آیا تھا۔

گاؤں کی سوئی سوئی گرد آلود فضا اسی طرح قائم تھی۔ نعیم کو گاؤں میں رہتے چند مہینے ہو چلے تھے۔ وہ کبھی کبھی ہل چلاتا' لیکن کاشت کاری کی محنت کے اب وہ قابل نہیں رہا تھا۔ وہ شام کے وقت اکثر پنچایت گھر میں جاتا اور بوڑھے جوان سبھی اٹھ کر اس کا استقبال کرتے' جوان سروں پر پگڑیاں رکھ لیتے اور بوڑھے اس کو اپنے برابر جگہ دیتے' کیونکہ وہ واحد شخص تھا جو ابھی تک روشن پور میں جنگ سے زندہ لوٹ کر آیا تھا اور سینے پر امتیازی نشان لگاتا تھا اور ایک مربع زمین جسے سرکار کی طرف سے ملی تھی۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر احترام سے رستہ چھوڑ کر چلنے لگتیں کیونکہ نعیم کی ماں نے انہیں بتا رکھا تھا کہ سمندر پار کے ملکوں میں کئی اجنبی عورتیں اس کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں' مگر وہ انہیں چھوڑ کر اپنے گاؤں واپس چلا آیا تھا۔ نعیم غریب الوطنی' مشقت اور اذیت کے ایک لمبے وقفے کے بعد گاؤں کو پُرسکون خواب کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ جی بھر کر کھاتا' سوتا اور کبڈی کے مقابلوں اور بیل گاڑیوں کی دوڑ میں فوجی وردی پہن کر شریک ہوتا۔

وہ نہر کا پل پار کر رہا تھا جب سامنے سے تین سوار نمودار ہوئے۔ یہ جوگندر سنگھ اور گاؤں کے دو جوان ہوتے ہوئے چھوکرے تھے۔ نزدیک آ کر انہوں نے باگیں کھینچیں اور بلند آواز میں اس کا حال پوچھا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' نعیم نے پوچھا۔

''واہگرو کی فتح' سوروں کو دیکھ کر......'' جوگندر سنگھ بولا۔

''ملے؟''

''ہاں ایک جگہ ڈیرا ملا۔ ریوڑ کا ریوڑ ہے۔''

''پھر؟''

''کل شکار ہے بڑا بھاری۔ چلو گے؟ رات میں ہم گڑھے کھودنے کو جا رہے ہیں۔''

''کل'' نعیم نے کہا۔

تینوں سواروں نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ ''ایک نیزہ نکیا (سورج) اُٹھنے پر آ جانا۔ لسّی ہمارے ساتھ آ کر پینا۔'' جوگندر سنگھ سرپٹ دوڑتی ہوئی گھوڑی پر سے مڑ کر چلایا اور پل پر سے اُتر گیا۔

''اوپر بارش ہوئی ہے۔'' نہر کے گدلے پانی کو دیکھ کر نعیم نے سوچا۔

صبح وہ سو کر اٹھا تو دوارے کے باہر ہلکا ہلکا شور ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے پتلون ٹانگوں پر کھینچی اور فوجی بوٹ پہن کر جمائیاں لیتا ہوا باہر نکل آیا۔ احاطے میں رک کر اس نے سفید بیل کی گردن کا زخم دیکھا اور فیصلہ

کیا کہ شکار پر جانے سے پہلے اس پر دوائی لگائے گا۔ پھر اس نے گھوڑی کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس کے پچھلے دونوں گھٹنوں کو انگلیوں میں لے کر باری باری دبایا۔ گھوڑی کی پھڑک سے اسے اندازہ ہوگیا کہ جانور تازہ دم ہے اور سواری کے لئے تیار ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ماں کو' جو دودھ بلو رہی تھی' ہدایت کی کہ کام چھوڑ اس کی باگ مرمت کرنا شروع کردے۔ پھر اس نے کونے میں سے تھوڑی سی خشک گھاس اٹھا کر گھوڑی کے آگے ڈالی اور علی کو' جو دروازے میں کھیل رہا تھا' ایک ہاتھ سے اٹھا کر اس کی پشت پر بٹھا دیا۔ بچہ اس کے بال پکڑ کر گردن کے ساتھ چمٹ گیا اور اس کی ماں کپاس کے ڈھیر کو چھوڑ کر اس کی طرف بھاگی۔ نعیم ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

احمد دین کے گھر کے آگے چند لوگ جمع تھے۔ نعیم نے جمائی لے کر جوہڑ پر اور سکھوں کے باغ پر اور آسمان پر سارے میں نظر دوڑائی۔ یہ ایک سو کر اٹھے ہوئے کسان کی طرح تروتازہ اور خوش گوار صبح تھی۔ جب دھوپ نے ابھی ابھی درختوں کو چھوا تھا اور ان پر ننھی ننھی چڑیاں ناچ رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ والے مجمع میں شور بڑھ گیا۔

احمد دین اپنے دروازے پر کھڑا غصے میں چیخ رہا تھا۔ روشن آغا کا منشی گھوڑی کی باگ تھامے اپنے چند خاص آدمیوں میں گھرا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ بھاگ جاؤ۔ کچھ نہیں ہے۔'' بازو ہوا میں نچا کر احمد دین چیخا۔

منشی نے حقے کے دو لمبے لمبے کش لئے اور گردن ٹیڑھی کر کے کڑے چالاک لہجے میں بولا۔ ''ہم تمہارے دالان کی تلاشی لیں گے۔''

''تم میرے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ میں دعوٰی کردوں گا۔'' احمد دین چیخا۔ اس کی پگڑی کھل کر زمین پر گھسٹ رہی تھی اور خاک آلود داڑھی ہوا میں اڑ رہی تھی۔ آستین شانے پر سے پھٹ چکی تھی اور غم و غصے کے آنسو اس کے رخساروں کی گہری سیاہ جھریوں میں بہہ رہے تھے۔ ''میں بتلاؤں گا کہ تم نے مجھے پیٹا' میری بے عزتی کی' میری پگڑی اتاری' میری داڑھی نوچی۔ کیا میں چور ہوں۔ ہیں؟ بھاگ جاؤ۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے تم۔'' اس نے منشی کی طرف انگلی ہلائی لیکن اس کا گلا بند ہوگیا۔

کچھ دیر تک منشی کھڑا بوڑھے کسان کو عورتوں کی طرح مٹھیاں چھاتی میں دے کر روتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس کے دل میں اس مخصوص خوف نے سر اٹھایا جو پکی عمر کے سادہ لوح دہقانوں اور مزدوروں کو روتے دیکھ کر ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے آدمیوں کو لے کر چپ چاپ ایک طرف کو چل پڑا۔

نعیم آہستہ آہستہ چلتا ہوا احمد دین کے پاس جا کھڑا ہوا' جواب بے کواڑ کے دروازے میں بیٹھ گیا تھا اور آنسو اس کے رخساروں پر خشک ہو رہے تھے۔ صرف ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس کھڑا رہ گیا تھا۔

''کیا بات ہے چچا؟'' نعیم نے پوچھا۔

''موٹرانہ لینے آئے تھے۔'' احمد دین کی بجائے لڑکے نے جواب دیا۔

''موٹرانہ؟''

''روشن آغا نے موٹر خریدی ہے۔''

''پھر؟''

''ہمیں موٹرانہ دینا پڑتا ہے۔''

نعیم نے ہوا میں دیکھتے ہوئے لمبی سی ''ایں.....؟'' کی اور کچھ نہ سمجھ کر گھبرا گیا۔ ''ٹھہرو ٹھہرو۔ دیکھو'' وہ لڑکے پر جھک کر بولا۔ ''یہ موٹرانہ کیا ہوتا ہے۔''

''جاگیردار نے موٹر خریدی ہے۔ ہمیں اناج دینا پڑتا ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''کتنا؟''

''یہ زمین کے حساب پر ہے۔ میرے پاس بیس ایکڑ ہے اور ایک جوڑی ہے۔ میں نے ایک دھڑی دیا ہے۔''

''روشن آغا کے حصے میں سے؟''

''نہیں۔ اپنے حصے کا۔''

''کیوں؟''

لڑکا سٹپٹا گیا۔ ''بس ہم پر لازم ہے۔''

''میں ضرور دیتا۔'' احمد دین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''سو دفعہ دیتا چوہدری' پر میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اگر میں موٹرانہ دے دوں تو آٹھ مہینے بھوسہ کھانا پڑے۔ یہ دیکھو۔''

اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔ ''میں نے ساری زمین میں پھینک دی ہے۔ کسی نے میری مدد نہیں کی۔ میں نے خود ساری بیائی کی ہے۔ میرا بیٹا جنگ میں مارا گیا ہے اور آج انہوں نے مجھے پیٹا ہے' میری داڑھی۔''

اس نے لرزتے ہوئے بدصورت ہاتھ نعیم کے آگے پھیلائے رکھے۔ جن کے پورے خشکی کی وجہ سے تڑخ چکے تھے۔ نعیم جیب میں ہاتھ دیئے سر جھکا کر چلتا ہوا واپس آ گیا۔ نیاز بیگ چمڑے کے تاگے سے باگیں مرمت کر رہا تھا۔

''تم نے بھی موٹرانہ دیا ہے؟'' صحن میں کھڑے ہو کر اس نے خفگی سے پوچھا۔

''ہماری تو اپنی زمین ہے۔ ہم کیوں دیں گے۔'' اس کے باپ نے چھاتی پھلا کر کہا۔ ''ہمارے نزدیک آنے کی ان میں ہمت ہے؟ سب کو سلا دوں۔ ہم نے کراس جیتا ہے۔ کوئی مذاق ہے؟'' آنکھوں کے کونوں میں سے بیٹے کو دیکھتا ہوا وہ باگیں مرمت کرتا رہا۔

نعیم نے چولہے پر سے پکی ہوئی مٹی توڑی' اسے ہاتھ میں ملا' پھر اس میں کڑوا تیل ڈالا' چھت کے کونے میں سے مکڑی کا جالا انگلی پر لپیٹ کر اتارا اور اس میں ملایا اور پھر اسی مقدار میں بیل کا گوبر اس میں ملا کر اس کی لئی بنائی۔ یہ مرہم بیل کے زخم پر لگانے کے بعد اس نے اپنے فوجی تھیلے میں سے سفید پٹی نکالی اور باپ کی مدد

سے اس پر باندھ دی۔

''اگر تم اسے خرگوش کے بچے کی طرح رکھنا چاہتے ہو تو پھر یہ کھیت میں کام کر چکا'' نیاز بیگ پٹی باندھتے ہوئے جھلایا۔

''جنگ میں یہ مرہم بڑا کام دیتا ہے۔ مگر اس میں خچر کا گوبر بہتر رہتا ہے۔'' نعیم نے کہا۔

پھر اس نے گھوڑی پر زین کسی اور باگیں اس کے منہ میں ڈالیں۔ نیاز بیگ کھڑا چوڑی' اداس آنکھوں کے ساتھ اسے نہایت ہوشیاری سے ایک ہاتھ کے ساتھ سب کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب نعیم نے ٹوپی سر پر جما کر کونے میں سے نیزہ اٹھایا تو وہ بولا:

''لسی نہیں پیو گے؟''

''سکھوں کی طرف پیوں گا۔ شکار پر جا رہے ہیں۔'' وہ اچک کر گھوڑی پر سوار ہوتے ہوئے بولا۔ گھوڑی بغیر کواڑ کے دروازے کے پھلانگ کر غائب ہوگئی۔

جنگل گھنا تھا اور وہ شیشم' کیکر اور جنڈ کے درختوں کے نیچے نیچے تین میل تک چلتے گئے۔ جگہ جگہ پر مردہ کوے اور دوسرے چھوٹے موٹے پرندے مرے پڑے تھے۔ چاروں طرف گلے سڑے پتوں اور پرندوں کی بیٹوں کی تیز جنگلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نیم تاریک جنگل میں گھڑ سوار منڈاسے باندھے' نیزے اٹھائے' اونچی نیچی زمین پر سے ہوتے ایک کھلی جگہ میں آ کر رک گئے۔ یہاں پر درخت کم تھے اور سورج کی روشنی ہموار زمین پر پڑ رہی تھی۔ کھلی جگہ دیکھ کر گھوڑے زور سے ہنہنائے۔

ایک سوار نے بڑی سی گالی دی۔ ''جگا دیں گے سالے۔'' اور نیزے کا دستہ گھوڑے کے سر پر دے مارا۔ وہاں پر سب اتر پڑے۔ سورج سر پر پہنچ چکا تھا۔

''اس وقت آرام کر رہے ہوں گے۔ یہ ان کے آرام کا وقت ہے۔'' گالی دینے والا سوار نعیم کو شکار کے باریک نکتے سمجھانے لگا: ''سوتے میں سے جگایا جائے تو اندھا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ جدھر ہانک دو چلا جائے گا۔ اور اگر سامنے سے آ رہا ہو تو اپنی جگہ مت چھوڑو' دل میں خوف مت لاؤ۔ کھڑے رہو۔ جب بالکل نزدیک آ جائے تو ایک دم سامنے سے ہٹ جاؤ' سیدھا نکل جائے گا۔ یہ دس گز کے اندر اندر نہیں مڑ سکتا۔ اور تم۔ تم ہانکے میں رہنا'' اس نے ہچکچاتے ہوئے نعیم کے لکڑی کے بازو پر نظر ڈالی۔ ''نہیں' میرا مطلب یہ نہیں۔ تم دلیر آدمی ہو' جوانوں سے لڑے ہو' یہ تو سؤر ہیں' پر یہاں بڑے تگڑے جوانوں کی ضرورت ہے۔ سمجھے؟ تم ہانکے میں رہنا' بس۔''

انہوں نے رات کے کھودے ہوئے گڑھوں میں سے گھاس اور لکڑیاں نکالیں۔ ایک قطار میں سات گڑھے تھے۔ جوگندر سنگھ اور چھ دوسرے جوان اپنے اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں اتر کر بیٹھ گئے' اس طرح کہ ان کے گھٹنے زمین میں گڑے ہوئے تھے اور صرف سر زمین کی سطح پر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے نیزے سیدھے زمین کے ساتھ لٹا

دیئے' سر اور منہ پر کس کر منڈاسے باندھے اور ہانکے کا اشارہ دیا۔ نیزوں کے دستے ان کے کندھوں پر جمے تھے۔

ہانکے والے سب کے سب گھوڑوں پر سوار ہوئے اور جنگل میں غائب ہوگئے۔ گھنے درختوں میں سے لمبا چکر کاٹ کر وہ آدھے میل پر اسی سیدھ میں آ نکلے اور چڑھائی کرتے ہوئے سپاہیوں کی طرح سیدھی قطار میں بڑھنے لگے۔ شیشم کے ایک جھنڈ میں انہیں سؤروں کے ایک ریوڑ کے ملنے کی امید تھی' لیکن وہ انہیں توقع سے پہلے ہی مل گئے۔ یہ ان سیاہ' فربہ' طاقت ور جانوروں کا ایک بہت بڑا ریوڑ تھا جس کا سواروں سے اچانک سامنا ہوگیا۔ سواروں نے سرعت سے پھیل کر نصف دائرہ بنایا اور انہیں گھیرے میں لے کر شور مچاتے ہوئے اس سمت میں ہانکنے لگے جدھر شکاری بیٹھے تھے۔ سارا جنگل قیامت کے شور سے جاگ اٹھا۔ پرندے پھڑ پھڑا کر اڑے اور چھوٹے چھوٹے جنگلی جانوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سوار اپنے نیزے سروں سے اوپر اٹھائے' چیخیں مارتے ہوئے ہانکا لگا رہے تھے۔ سؤر اس اچانک حملے سے گھبرا کر چیخیں مارتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ نکلنے کی کوشش میں آخر کار اسی سمت میں بڑھتے جا رہے تھے جدھر کو ہانکے جا رہے تھے۔ اس وقت انسانوں' سؤروں اور گھوڑوں کی چیخوں میں امتیاز کرنا ناممکن تھا۔ نعیم نے سارے جسم میں مکمل سرور کی وہ لہر دوڑتی محسوس کی جو انسان ہر انسانی قید سے آزاد ہو کر عمداً جانوروں کا رویہ اختیار کرتے وقت محسوس کرتا ہے۔ اس جنگلی ماحول میں جان لینے کی قدیم' ظالم انسانی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی۔

آخر ٹھگنے' بدصورت درندوں کا جلوس کھلی جگہ میں داخل ہوا اور شکاریوں کے سرگڑھوں میں غائب ہوگئے۔ وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے ناک کی سیدھ میں جا رہے تھے۔ یک دم پانچ گز کے فاصلے پر نیزوں کے سرے بلند ہوئے اور سؤر اپنی تمام تر برق رفتاری اور بوجھ کے ساتھ ان کے ساتھ ٹکرائے۔ نیزے ان کی گردنوں' سینوں اور شانوں میں اتر گئے۔ زخمی جانور پیچھے ہٹے' چیخ مار کر آگے بڑھے' پیچھے ہٹے' لیکن فولاد کی تیزانی کے آگے ان کی پیش نہ گئی اور نیزہ جو صرف آگے ہی آگے جا سکتا تھا ان کی فربہ' گندھی ہوئی چربی کی تہیں پھاڑتا ہوا نیچے اترتا گیا۔ نیزے کے دستے شکاریوں کے کندھوں میں گڑے جا رہے تھے اور وہ دانت پیس کر زور لگاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے انہیں تھامے بیٹھے تھے۔

پہلے ہلے میں صرف دو جانور رکے۔ سوار پھیل کر دو حصوں میں بٹ گئے اور گھوڑوں کو ایڑ لگا کر' ریوڑ کے جنگل میں غائب ہونے سے پہلے ان کے آگے پہنچ کر انہیں واپس موڑ لائے۔ شکاریوں نے گڑھوں میں پانسہ پلٹ کر پوزیشن لی اور نیزے پیچھے سے آنے والے گلے کے سامنے کر دیئے۔ جوگندر سنگھ کی سیدھ میں ایک سؤر آیا۔ اس نے دانت پیس کر نیزہ اس کے سینے پر جما دیا۔ نیزہ ایک طاقتور جھٹکے سے سینے کی سخت کھال ادھیڑتا ہوا شانے کی طرف بڑھا اور اپنے پیچھے سفید چربی کی لکیر ننگی کرتا ہوا باہر کو پھسل گیا۔ سؤر انتہائی تیز رفتاری سے آ کر اس کے گڑھے میں گرا اور اس کی تیز کینچلی نے شکاری کی پشت پر کندھے سے لے کر ریڑھ کی ہڈی تک چھ انچ لمبا گہرا گھاؤ ڈال دیا۔ جوگندر سنگھ کے منہ سے درد کی بلبلاہٹ اٹھی۔ دوسرے لمحے زخمی جانور ایک جھونسے کے ساتھ باہر نکلا اور

بھاگ گیا۔ اس بار میں تین اور سؤر شکاریوں کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے۔ اگلے ہلے میں چھٹا شکاری بھی مصروف ہوگیا تو ریوڑ کو نکل جانے دیا گیا۔ چیخیں مارتا ہوا خوف زدہ درندوں کا سیلاب برق رفتاری سے جنگل میں غائب ہوگیا۔ جوگندر سنگھ اٹھا اور شیشم کے ایک بڑے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور پشت پر سے خون بہہ رہا تھا۔

ایک بہت بڑے گھیر والے تنے کے پاس سے گزرتے ہوئے نعیم کو سؤر کی پچھلی ٹانگیں دکھائی دیں۔ گھوڑی کا رخ موڑ کر وہ دوسری طرف جانکلا۔ سؤر جڑ کے پاس بیٹھا تھا اور سینے سے لے کر شانے تک اس کی کھال کا چیتھڑا لٹک رہا تھا۔ سفید سفید گھنی چربی میں سے خون نکل نکل کر زمین پر جمع ہو رہا تھا۔ وہ زخمی آنکھوں سے نعیم کی طرف دیکھتا ہوا پھنکارتے ہوئے بھاری بھاری سانس لینے لگا۔ گھوڑی زور سے ہنہنائی۔ اس وقت دفعتاً نعیم کے دل میں خوفناک، بے بس جانور کو دیکھ کر ایک ننگی، طاقت ور، پاگل خواہش پیدا ہوئی اور اس کے سوچنے کی قوت مفقود ہو کر رہ گئی۔ وہ کود کر اترا اور نیزہ اس کے زخم پر رکھ دیا۔

سؤر نے خلافِ امید ایک خفیف سی جھرجھری لی اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ نعیم نے نیزہ دبایا۔ سؤر زور سے سر جھٹک کر اٹھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ نعیم نے گھٹنے زمین میں گاڑ دیئے اور کندھے پر نیزے کا دستہ جما کر ایک ہاتھ سے اسے تھامے رکھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ جانور اس کی طاقت سے باہر تھا۔ سؤر پھنکارا اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا۔ نعیم نے خوف اور تحفظ نفس کی خواہش کے ایک انتہائی حساس لہجے میں بے حد واضح طور پر نیزے کی انی کے چربی کی دبیز تہوں کو پھاڑنے کی آواز سنی، کھرر...... کھرررر......

''ہے...... کیا کرتے ہو چوہدری۔'' دور سے ایک آواز آئی اور وہ سب گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچے اور کود کود کر اترنے لگے۔

' چھوڑو مت چوہدری ' زور لگاؤ۔ ہئی شابا...... ہئی شابا......'' وہ چلائے۔ ''نیزہ اونچا رکھو۔ آگے سے' کندھا نیچا' گھٹنے گاڑو...... ہٹ تیرے سؤر کا۔''

''واہگرو...... یہ لونڈا کیا بیوقوفی کرا۔'' ایک بڈھے سکھ نے غصے سے کہا۔ ''اور پتہ ہے اس کا ایک ہاتھ ہے' ایک......''

ان کے شور کے درمیان نعیم نے آنکھیں میچ کر بازو' کندھے' سینے اور ٹانگوں کا پورا زور لگایا۔ اچانک سؤر نے ایک اونچی' مرتی ہوئی چیخ ماری اور تھوتھنی نیزے پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔

''سیدھا دل میں اتر گیا۔ میں تو آواز پہچانتا ہوں۔ ایسی چیخ اسی وقت اٹھتی ہے جب نیزہ دل میں اترتا ہے۔ میری تو عمر سؤروں میں گزری ہے۔'' بڈھے سکھ نے چھاتی پھلا کر کہا۔

جانور کی ٹانگیں کانپیں اور وہ بھاری جسم کے ساتھ زمین پر آرہا۔ مجمع میں سے ایک شور اٹھا۔ نعیم نے نیزہ چھوڑ دیا اور پرے کھڑا ہو کر پسینہ پونچھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے شکار کی طرف دیکھے بغیر وہ گھوڑی کی باگ پکڑ

کر جوگندر سنگھ کی طرف چلا گیا۔ دو جوان مرے ہوئے جانور میں سے نیزہ نکالنے لگے۔

جوگندر سنگھ شیشم کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان سفید سوت جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھر رہا تھا۔

''میں نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔'' نعیم نے کہا۔

وہ تکلیف اور درد کے درمیان مسکرایا۔ ''تم دلیر آدمی ہو۔ تم میرے بھائی ہو۔ مہندر سنگھ ہوتا تو وہ بھی بدلہ لیتا۔''

ایک لحظہ کے لئے نعیم کے دل میں تیز' کاٹتا ہوا درد سمٹ آیا۔

شام پڑ رہی تھی جب وہ واپس ہوئے۔ جوہڑ کے کنارے کتے بھونک رہے تھے اور اپلوں کے دھوئیں نے گاؤں کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مغرب میں ابھی تک گزرے ہوئے دن کی سفیدی رکی ہوئی تھی اور مشرقی آسمان پر ستارے ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہے تھے۔ کھیتوں پر اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا اور بیچ بیچ نالیوں میں بہتے ہوئے پانی کا ہلکا شور اٹھ رہا تھا۔ نیچی چھتوں والے خاموش گھروں میں دیئے تیزی سے بجھ رہے تھے کہ دن بھر بیلوں کے ساتھ کام کرنے والے کسان جلد سو جاتے ہیں۔

حویلی کی دیوار کے پاس سے گزرتے ہوئے روشن آغا کی بگھی کو دیکھ کر نعیم چونکا۔ گھوڑی روک کر وہ رکابوں میں اٹھا اور دیوار پر سے جھانکنے لگا۔ مٹی کے تیل کے کئی لیمپ جل رہے تھے اور احاطے میں روشن آغا کے تقریباً سبھی مزارعے جمع تھے۔ وہ اپنے بہترین لباسوں میں تھے اور ان کی شوخ رنگ پگڑیوں کے بیچ لگے طرے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ وہ دری پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ منشی دیوان خانے کے دروازے پر ظاہر ہوا اور چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں کو گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اپنی باریک تیز آواز میں بولا:

''احمد دین......''

سب نے مڑ کر دیکھا۔ احمد دین گھٹنوں پر اٹھا۔

''اس کے مٹکے اناج سے بھرے ہیں اور اس نے 'موٹرانہ' نہیں دیا۔ روشن آغا کے سامنے پیش کیا جائے۔'' منشی نے کہا۔

احمد دین سحر زدہ سا' آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نئی ابرق لگی سفید پگڑی کا شملہ سیدھا کھڑا تھا اور اس نے لمبے لڑوں والا نیلا ریشمی تہمد باندھ رکھا تھا۔ اس کے تیل ملے ہوئے چہرے کی سیاہ جلد چمک رہی تھی۔

''بیل کی طرح ...... بیل کی طرح۔'' منشی نے کڑک کر کہا اور نوجوان لڑکوں کی طرف دیکھا۔ لڑکوں نے اٹھ کر اس کی بغلوں میں ہاتھ دیئے اور گھٹنوں کے بل گرا دیا۔ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر ہو گیا۔ منشی نے جھٹک کر اس کی پگڑی اتاری اور لڑکے کے ہاتھ میں دی۔

''بیل کو رسی ڈالو......'' اس نے کہا۔لڑکے نے پگڑی کا ایک سرا اس کے گلے میں باندھا' دوسرا ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''اس کے منہ میں چارہ دو۔'' منشی نے کہا۔ ایک لڑکا خشک گھاس لا کر اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔

احمد دین نے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلائے اور پھٹی ہوئی آواز میں چلایا۔''نہیں نہیں ......نہیں......نہیں'' اس کی باچھوں سے گھاس کے تنکے لٹک رہے تھے۔لڑکوں نے گھاس ٹھونس کر اس کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔''چلو ......'' منشی رسی کھینچتے ہوئے بولا۔

بوڑھا کسان چوپایوں کی طرح زمین پر چلنے اور جلد جلد آنکھیں جھپکنے لگا۔ انتہائی ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ بدنما ہو گیا' جیسے فالج زدہ یا میدان جنگ میں مرے ہوئے آدمی کا چہرہ ہوتا ہے۔

یکلخت بہت زیادہ گھبرا کر نعیم نے گھوڑی کی پسلیوں میں ایڑیاں ماریں اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ روشن آغا کی بگھی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کیکر کی چھڑی گھما کر اس کی چھت پر ماری جو پھسلتی ہوئی دروازے کے قریب جا گری۔ کچھ دیر کے بعد دروازے میں سے ایک سایہ نکلا اور پھیلتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

گلیاں ویران اور تاریک تھیں۔ گھوڑی اپنی مرضی سے چل رہی تھی کہ اس نے پیچھے آنے والے کے تیز قدموں کی چاپ سنی اور کان کھڑے کر کے پھنکاری۔ نعیم نے مڑ کر دیکھا۔

''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' آنے والے نے اس کی رکاب پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ نعیم نے تاریکی میں نوجوان سکول ماسٹر کی آواز پہچان لی۔''میرے مکان تک چلو گے۔''

''تمہارا مکان کہاں ہے؟''

''وہاں......'' ماسٹر نے اندھیرے میں شمال کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گھوڑ سے اتر پڑا' کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا' پھر باگیں پکڑ کر خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔

''آج بہت تھک گیا ہوں۔'' چلتے چلتے نعیم نے کہا۔

''میں تمہیں سبز چائے پلاؤں گا۔''

باقی راستہ انہوں نے خاموشی سے طے کیا۔

ایک چھوٹے سے شکستہ دیواروں والے صحن کو جس میں ایک گھوڑا کھڑا گھاس کھا رہا تھا' پار کر کے ماسٹر نے کواڑ کھولا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا۔

''گھوڑی کو اُدھر باندھ دو۔'' ماسٹر نے کہا۔''میں روشنی کرتا ہوں۔''

کمرے کی دیوار کے ساتھ گدلے شیشوں والی لالٹین لٹک رہی تھی۔ اس کے اوپر چھت دھوئیں سے سیاہ ہو چکی تھی۔ چھت کیکر کے ٹیڑھے میڑھے ڈنڈوں اور پھونس کی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ بارش کے پانی کی لکیریں

تھیں۔ ایک طرف چولہا تھا جس کے گرد کھانے پینے کے چند برتن دھرے تھے۔ لمبی چوڑی کھاٹ پر سفید بستر بچھا تھا جس پہ کچھ کتابیں رکھی تھیں۔ میز پر پنسلیں اور بہت سے سفید کاغذ پڑے تھے۔ ایک کرسی تھی جس پر کتابیں تھیں۔ ایک ٹرنک تھا' اس پر بھی کتابیں تھیں۔

''بیٹھ جاؤ۔'' کرسی پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے ماسٹر نے کہا۔

پھر وہ کیکر کی لکڑیاں توڑ توڑ کر ترتیب کے ساتھ چولہے میں رکھنے لگا۔ خاموش' نیم روشن کمرے میں لکڑیوں کے چیخ کر جلنے کی آواز پیدا ہوئی۔

''نعیم، تمہیں افسوس ہے؟'' وہ آگ پر لکڑیاں پھینکتے ہوئے بولا۔

''کس کا؟''

''جو ابھی ہوا۔ تم نے دیکھا نہیں؟''

کافی دیر بعد نعیم نے بھاری آواز میں کہا۔ ''ہاں۔''

''روشن آغا برا آدمی نہیں۔ میں نے دیکھا کہ جب احمد دین بیل کی طرح چلتا ہوا اندر پہنچا تو اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس نے سب کو باہر نکل جانے کا حکم دیا۔'' وہ پانی کی کیتلی آگ پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''لیکن یہ بکواس ہے۔ ہمیں اس سارے چکر کو ختم کرنا ہے۔''

نعیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ماسٹر نے کواڑ بند کر کے کنڈی چڑھا دی اور نعیم کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''تم نے اپنے باپ کی حالت دیکھی ہے؟'' اس نے گہری' صاف آواز میں پوچھا۔

نعیم کی آنکھوں میں وحشت کی ہلکی سی جھلک ظاہر ہوئی۔

''یہ سارا نظام ردی نہیں؟ بتاؤ؟''

''پھر؟''

''مجھے بتاؤ۔'' ماسٹر نے ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا۔ ''اگر تمہیں بتایا جائے کہ تم اس سارے نظام کو بدل سکتے ہو تو؟''

نعیم نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ ''تم جانتے ہو ماسٹر میں ہر چیز کے لئے تیار ہوں۔ مگر کیسے؟''

ماسٹر جواب دینے کی بجائے جا کر چائے بنانے لگا۔

وہ پچیس تیس کے لگ بھگ جوان آدمی تھا لیکن اس کے بڑے سے لمبوترے چہرے پر داڑھی بہت گھنی اور کھردری تھی اور جلد موٹی اور شکن آلود تھی۔ وہ ایک غریب کسان تھا۔

چائے کے دو پیالے میز پر رکھ کر وہ کھاٹ پر بیٹھ گیا اور کہنیاں میز پر رکھ کر آگے کو جھکا۔ ''مجھے 'اپنا' کام کرنا ہے۔ تمہارا کام تمہیں ضلع کا سیکرٹری بتائے گا۔ وہ تمہیں جانتا ہے۔ اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔''

''میں اسے نہیں جانتا۔ اس کا کیا نام ہے؟''

''وہ تمہیں جانتا ہے۔ ہمارے اور بھی کئی آدمی تمہیں جانتے ہیں۔''

''کانگرس؟''

''ہاں۔''

وہ خاموش بیٹھے خوشبودار' سبز چائے کا پھیکا عرق پیتے رہے۔ مٹی کے پیالوں میں سے دودھیا نیم گرم بھاپ اٹھ اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔

''تمہارا یہاں کیا کام ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''پڑھاتا ہوں۔ اس کے علاوہ کئی کام ہیں جن کا تم سے مطلب نہیں۔ ہمارے آدمی آس پاس کے گاؤں میں ہیں۔'' چائے ختم کر کے نعیم اٹھ کھڑا ہوا۔

''پھر؟'' ماسٹر نے پوچھا۔

''میں تیار ہوں۔ تم سے مل کر جاؤں گا۔ شاید پرسوں۔''

''اللہ کرم کرے۔'' ماسٹر بے تکلفی سے بڑا سا کھردرا ہاتھ بڑھا کر سادگی سے مسکرایا۔ اس کی سادہ' بے فن آنکھیں دیکھ کر نعیم کا جی چاہا کہ گرمجوشی سے اس کے ساتھ مصافحہ کرے۔ اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور ہنسا۔ اپنے اپنے راستے پر جانے سے پہلے رفاقت کے اس ایک لمحے میں اس نے اس اجنبی کے لئے بے پناہ دوستی کا جذبہ محسوس کیا۔

سر جھکائے بیٹھا' گھوڑے کو قدم قدم چلاتا ہوا وہ سنسان گلیوں میں داخل ہوا۔ گھوڑا اپنی مرضی سے' اونچے نیچے مانوس پتھریلے راستوں پر چلتا گھر کی جانب جا رہا تھا۔ پتھروں پر اس کے قدموں کی آواز اندھیرے میں دور تک سنی جا سکتی تھی۔

نہر کے پُل سے اُترتے ہوئے اس نے سامنے کی طرف دیکھا اور اس کا دل یکبارگی ٹھہر گیا۔ اتر کر اس نے نہر سے پانی پیا' گھوڑی کو پلایا' اور اسی سمت میں دوبارہ دیکھا۔

روشن آغا کی بگھی ایک گڑھے میں پھنسی ہوئی تھی اور تین کسان اس کے پہیے سے چمٹے زور لگا رہے تھے۔ دور سے اس نے ادھیڑ عمر' خوبصورت خالہ کو دیکھا جو اگلا پردہ اٹھائے بیٹھی تھی۔ بگھی کے برابر پہنچ کر بالکل غیر محسوس طور پر نعیم کی گھوڑی رک گئی۔ وہ منہ موڑ کر پہیے کو دیکھنے لگا۔ اجنبی گھوڑے ہنہنائے۔ خالہ تعجب اور اپنائیت سے مسکرائی۔

''نعیم' کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

جواب دیئے بغیر وہ ڈھٹائی سے کھڑا پہیے کو دیکھتا رہا۔

''نعیم' تم نے کراس جیتا تھا؟''

''ہاں۔'' وہ نیچے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

''کیسے؟''

اس نے سامنے دیکھا اور گھوڑی کو ایڑ لگادی۔ دائیں طرف اٹھے ہوئے پردے میں اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ بہت پرانا، بہت مانوس چہرہ۔ اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی ابھی گاؤں میں یا راستے کے جنگل میں یا خواب میں یہ چہرہ دیکھا ہے اور اسے اچھی طرح سے جانتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی سوچ ختم ہوگئی اور احساس اوپر آ گیا۔ اس کی ایڑیاں زیادہ تیزی سے گھوڑی کی پسلیوں پر پڑنے لگیں۔

وہ پکی سڑک پر چڑھا ہی تھا کہ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ تھک چکا ہے اور اب ایک پل کو سواری نہیں کر سکتا۔ پلیا کے پاس اس نے گھوڑی روکی اور بھاری جسم کے ساتھ اتر کر دیوار پر بیٹھ گیا۔ نیچے برساتی نالہ خشک پڑا تھا اور جگہ جگہ مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر لگے تھے۔ اس کا دایاں ہاتھ مضبوطی سے لکڑی کی کلائی کو پکڑے تھا اور وہ نیچے نالے میں چلتے ہوئے ایک مینڈک کو دیکھ رہا تھا۔ پھر غیر محسوس طریقے پر اس نے لکڑی کو بازو سے علیحدہ کیا۔ وہ پہلی بار اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ انگلیوں کے جوڑوں پر نہایت کاری گری سے انسانی جلد کی جھریاں بنائی گئی تھیں، ناخن گول اور خوب صورت تھے، کلائی پر ابھرتا ہوا، کسا ہوا صحت مند گوشت تھا اور ہتھیلی میں لکیریں تھیں۔ یہ سب اس نے اس وقت بھی نہیں دیکھا تھا جب وہ بمبئی کے ہسپتال میں اسے فٹ کروا رہا تھا۔ لکڑی کے کھلے ہوئے، چوڑے ہاتھ میں سے ایک چہرہ ابھرا۔ اس چہرے کے شدید حزن اور بے کسی کو محسوس کر کے اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوگئی اور اس نے لکڑی چھاتی میں دبالی۔ سفید ہوتے ہوئے ناخنوں کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ چہرہ، وہ عورت، وہ واحد عورت تھی جو دنیا میں اسے بے پناہ رنج دے سکتی تھی۔ عمر بھر تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ زرد ہوگیا اور تیز، کانپتے ہوئے دانت ہونٹوں میں گھسنے لگے۔

''تمہارا محبوب نام، بہت پرانے خواب کی طرح محبوب اور خوب صورت، ہوا پر بہتا ہوا آیا اور میں نے چونک کر دیکھا۔ تم سامنے کھڑے تھے۔ ہمیشہ کی طرح دلکش، اداس۔ لیکن اس سے پہلے بھی میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ کہاں؟ کہاں کہاں؟ سبزے پر، پہاڑوں پر، برف میں چلتے ہوئے، نینی تال میں، جب لکڑی کے برآمدے میں، مونڈھے پر بیٹھ کر ٹین کی چھت پر برستی ہوئی بارش کی آواز میں نے سنی تھی تو تم گزرے تھے اور نیچے مکئی کے کھیت میں باگھ بول رہا تھا اور جب تم گزر گئے تھے تو رات چاروں طرف پھیل گئی تھی اور ہم نے شکار کیے ہوئے پہاڑی بکرے کا شوربا پیا تھا...... اور بازاروں میں اور گلیوں میں اور ریل گاڑی میں، مجھے یاد نہیں کتنی بار اور کہاں کہاں تمہیں دیکھا ہے، لیکن میں تمہیں جانتی ہوں۔ ہم سب تمہیں جانتے ہیں۔ تم روشن پور کے رہنے والے ہو اور بہت زود رنج ہو۔ تم نے ایک بازو گنوا کر ایک کراس حاصل کیا ہے۔ تم روشن پور سے چلے گئے تھے۔ تم سے کس نے کہا تھا؟ تمہیں محبت کرنے کا ڈھنگ آتا ہے؟ یہ کیسا ڈھنگ تھا؟ تم سیدھے چلے گئے، لیکن راستے میں جو جنگل آئے گا

اس میں میں تمہیں پھر دیکھوں گی۔ میں جانتی ہوں' اس لیے کہ تم بھگت رہے ہو۔ میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بات صرف یہ ہے کہ تم بے حد بنیادی' بے حد قدیم اور بے حد خالص مرد ہو۔ میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ غلطی تمہاری تھی۔ تمہارا یہ کمبخت مغرور مردود سر...... خدایا!''

عذرا نے پردہ گرا کر ہچکولے کھاتی ہوئی بگھی کی دیوار پر سر ٹیک دیا اور خشک' جلتی ہوئی آنکھوں سے اندر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھنے لگی۔

سورج ڈھل رہا تھا جب وہ نقشے کے مطابق شہر کے اس چوراہے پر پہنچا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنی منزل مقصود پر کھڑا تھا۔

یہ ایک پرانی طرز کا' دو منزلہ پرانی اینٹوں کا بنا ہوا مکان تھا جس کی مرمت کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اس نے بند دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے پر کوئی کنڈی نہ تھی۔ دو بار کھٹکھٹانے پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو اس نے رکاب میں سے پاؤں نکالا اور اس کے لوہے کو چند بار پرانی لکڑی کے دروازے پر مارا۔ اندر سے ایک چارپائی گھسیٹنے کی آواز آئی اور خاموشی چھا گئی۔ پھر کوئی چلتا ہوا آیا اور دروازہ کھلا۔ یہ ایک پست قد سفید بالوں والا بڈھا تھا جس نے ریلوے ملازمین کی نیلی سوت کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ عام محنتی لوگوں کا سا تھا۔

''یہاں کون رہتا ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''میں رہتا ہوں۔'' بڈھے نے سکون سے کہا۔ ''میں ریلوے ملازم تھا......''

نعیم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ ''اس نے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ میں روشن پور سے آیا ہوں۔ مجھے ہری چند نے بھیجا ہے۔ ماسٹر ہری چند۔''

''ٹھہرو۔'' بڈھے نے کہا اور اندر غائب ہوگیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور سرد کثیف ہوا کی مخصوص بیمار کر دینے والی بو آ رہی تھی جیسی تہہ خانوں میں سے آتی ہے۔ چند لمحے بعد بڈھا دروازے پر نمودار ہوا۔

''تمہیں سواری کا بہت شوق ہے۔'' اس نے نعیم کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر کہا۔ ''اسے یہاں باندھ دو۔ ہمارے ہاں سوار بہت کم آتے ہیں۔''

اندر داخل ہو کر وہ بائیں ہاتھ کو مڑے۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا جس میں ایک لمبے قد کا' دبلا پتلا زرد رُو آدمی کھڑا تھا۔ اگلے کمرے میں بھی کوئی لیمپ نہ تھا' ایک پچھلے کمرے میں سے نکلتی ہوئی شعاعوں نے اس کمرے کو نیم روشن کر رکھا تھا۔ لمبے آدمی نے گرمجوشی سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔

''میرا نام بالمکند ہے۔ میں ضلع کمیٹی کا اسسٹنٹ سیکرٹری ہوں۔''

وہ پچھلے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے کی چھت نیچی تھی اور تین جگہ پر کیکر کے پتلے تنے چھت کو سہارا دینے کے لئے زمین پر کھڑے کئے گئے تھے۔ درمیان والے تنے سے مٹی کے تیل کی لالٹین لٹک رہی تھی۔

اس کے نیچے ایک بہت بڑی بے ڈھنگی سی میز رکھی تھی جس پر لکھے اور ان لکھے کاغذوں کے انبار لگے تھے۔ ایک پرانا لکڑی کا قلمدان درمیان میں پڑا تھا۔ سٹول پر ایک ملگجے بالوں والا شخص کہنیاں میز پر رکھ کر جھکا ہوا تھا۔ اس کا چشمہ میز پر پڑا تھا۔ دسرے سٹول پر ایک نوجوان بیٹھا چند کاغذ دیکھ رہا تھا۔

ان دونوں کے داخل ہونے پر ملگجے بالوں والے نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ میلے سنولائے ہوئے رنگ کا تھا' جیسے گھوڑے کی لید کے اپلوں کا ہوتا ہے۔

''روشن پور سے' ہری چند نے انہیں۔'' بالمکند نے کہا۔

''روشن پور سے؟'' بوڑھے نے حیرت انگیز طور پر جوان آواز میں دہرایا۔

''نعیم احمد خاں۔''

''نعیم احمد خان۔'' اس نے اُٹھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ ''میں تمہیں جانتا ہوں۔ تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ابھی فارغ ہوتا ہوں۔ بالمکند۔''

وہ پھر سر ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے چشمہ اٹھا کر لگایا اور نوجوان کی طرف دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔ ''یہ تو برا ہوا۔ تھ تھ تھ۔ بہت برا۔''

آتشدان کے قریب سٹول پر بیٹھتے ہوئے نعیم نے دیکھا کہ سیکرٹری کی میز کی دو ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں۔ ایک کی جگہ کیکر کی ٹیڑھی میڑھی' موٹی شاخ میخوں سے جڑی گئی تھی' اور دوسری طرف اوپر نیچے رکھی ہوئی اینٹیں میز کو سہارا دیئے ہوئے تھیں۔ کمرے میں اسی تہہ خانے والی بو کے ساتھ مٹی کے تیل اور جلتی ہوئی سوت کی بتی کی بو شامل تھی۔

بغیر پتے کا ایک لفافہ نوجوان کے ہاتھ میں تھمانے کے بعد وہ نعیم کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آؤ یہاں بیٹھو۔ تمہیں دیکھ کر میں بہت خوش ہوا ہوں۔ میں تمہیں دو سال سے جانتا ہوں۔ تم مئی 1913ء کی روشن محل کی پارٹی میں تھے۔''

نعیم نے بے حد چونک کر اسے دیکھا' جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی بات کر رہا ہو۔

''میں نے تمہیں دور سے دیکھا تھا۔ اسی وقت سے ہم تمہاری تلاش میں تھے۔ لیکن جب ہم نے یہاں پر دفتر قائم کیا تو تم جنگ پر جا چکے تھے۔'' وہ سر ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ دبانے لگا۔ ''کانگرس کے لئے کام کرو گے؟''

''اسی لئے آیا ہوں۔'' نعیم نے مٹی کے تیل کی بو حلق میں محسوس کی۔

''ہاں' یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر تم نے جنگ میں نوکری کی ہے اور امتیاز کے ساتھ......''

''اوہ۔'' نعیم نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''ٹھیک ہے۔ ہمارے پاس فنڈ نہیں ہیں۔ ہم صرف روٹی اور کپڑا مہیا کر سکتے ہیں۔ اور۔ اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری کراس کی زمین بھی چلی جائے۔ ضبط ہو جائے۔''

''میں نے کہا نا......کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''اچھا اچھا۔'' وہ سٹول گھسیٹ کر نعیم کے قریب ہوگیا۔ ''ہمیں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سخت ضرورت ہے۔ خصوصاً اس کام کے لئے جو تمہارے ذمے تھے۔ یہ کام عرصے سے میرے دماغ میں تھا۔ جتنا دشوار یہ کام ہے اس سے زیادہ دشوار اس کے لئے موزوں آدمی کے انتخاب کا سوال تھا۔ تم اس کے لئے موزوں ترین شخص ہو۔ میں جانتا ہوں۔ مگر تمہیں تربیت کی ضرورت ہے۔ تم پندرہ دن یہاں رہو گے۔ بالمکند تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔ میرے پاس آنے کی تمہیں اب ضرورت نہیں...... مگر جاتی دفعہ مجھ سے مل کر جانا۔ خدا حافظ۔''

اس سے مصافحہ کرتے ہوئے نعیم نے محسوس کیا کہ اس کے مردہ چہرے کے برعکس، اس کے ہاتھوں کا لمس، اس کی آواز کی مانند حیرت انگیز طور پر جوان اور گرم تھا۔

درمیانی کمرے میں آ کر بالمکند نے لالٹین روشن کی۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی تھی جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ بالمکند نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میرا بستر ہے۔ تم اس پر سو سکتے ہو۔ جوئیں وؤئیں نہیں ہیں، بے فکر رہو۔''

''تم کہاں سوؤ گے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''میں بھی سو جاؤں گا۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

نعیم نے ٹوپی اتار کر اس کے ساتھ گرد آلود چہرہ صاف کیا اور بستر کے کونے پر بیٹھ گیا۔ ''میں سویر سے بھوکا ہوں۔''

''چاول پک گئے ہوں گے۔'' بالمکند نے اپنے آپ سے کہا۔

کچھ دیر کے بعد نعیم نے گوبھی کے شوربے کے ساتھ سرخ اُبلے ہوئے چاول پیٹ بھر کر کھائے اور بالمکند سے ہاتھ کا بنا ہوا سگریٹ قبول کیا جس کا کاغذ خاصا ردی تھا۔

دو ہفتے کے بعد نعیم نے سیکرٹری کی میز پر سے اٹھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' سیکرٹری نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''اچھی طرح سے سوچو، سمجھو، دیکھو اور سنو اور وہی کرو جو مناسب اور درست ہو اور اپنی جان کی حفاظت کرو۔ تم میرے بیٹے ہو، لیکن سب سے اول تم ہندوستان کے بیٹے ہو۔ خدا حافظ۔''

دروازے پر وہ بالمکند سے رخصت ہوا۔

''تم بہت خطرناک لوگوں میں جا رہے ہو۔ مگر ہم میں سے کسی کو یہ کام بھی کرنا تھا۔'' بالمکند نے اپنی تیز چمکیلی آنکھوں سے جو اس کے چہرے پر اجنبی دکھائی دیتی تھیں، دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری زندگی تمہاری نسبت ہمارے لئے بہت قیمتی ہے۔ بہت زیادہ۔ میں دعا کروں گا کہ تم ہندوستان کی آزادی اپنی آنکھوں سے اپنے وجود کی پوری قوتوں کے ساتھ دیکھو اور......''

''بالمکند۔'' نعیم نے لالٹین کی دھندلی روشنی میں اسے مخاطب کیا۔ ''تمہاری آنکھیں بڑی غیر معمولی

ہیں۔ مجھے پسند ہیں۔''

بالمکند لڑکیوں کی طرح شرمایا اور اس کے زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔

''زندگی کی زیادہ تر قوتیں جو ہم پر عمل پیرا ہوتی ہیں' عموماً آنکھوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ تم بھی جب اصل زندگی کے تکلیف دہ اور گرد آلود محنت کے چند سال گزار لو گے اور تمہارے جسم پر چند اور خراشیں آ جائیں گی تو تمہاری آنکھیں بھی غیر معمولی ہو جائیں گی۔ یا روشن' یا اندھی۔ یہ تمہاری آنکھوں پر منحصر ہے۔'' وہ منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر جو لالٹین کی روشنی میں آ گیا تھا الوداعی نظر ڈالتے ہوئے نعیم نے اس کے ہونٹوں کی خفیف' اداس مسکراہٹ کو محسوس کیا۔

(۱۳)

''آج چالیس روز ہو گئے۔'' اس نے لیٹے لیٹے سوچا اور سیدھا ہاتھ پھیلا کر پتھریلی زمین کو محسوس کیا۔

یہ ایک بڑا سا' تاریک کمرہ تھا جس کا فرش اور دیواریں بڑے بڑے میلے پتھروں کی بنی ہوئی تھیں۔ چھت اونچی اور تاریک تھی۔ کمرے کی واحد کھڑکی بند تھی۔ ایک بے کواڑ کا دروازہ لکڑی کے بھاری تختے کی مدد سے بند کیا گیا تھا۔ چھت کے قریب چھوٹے سے سوراخ نما روشندان میں سے آنے والی روشنی کمرے کی تاریکی میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ دیر سے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔

''آج چالیسواں دن ہے۔'' اس نے مایوسی سے سوچا۔ ''اور میں نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ ان کے ساتھ مل کر خود...... خود بھی۔'' وہ جھلا کر اٹھا اور گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھ گیا۔

''اور یہ شیلا...... کمبخت۔''

''ایک...... دو...... تین۔ تین لائنیں' جن میں مَیں بھی شامل تھا تین۔'' اس نے تکلیف سے دہرایا۔

''ایک کے لئے تو میں نے خود ڈائنا مائٹ...... بالمکند کو اگر پتہ چل جائے کہ اس کے عزیز ہندوستان کے ساتھ میں کیا سلوک کر رہا ہوں۔ عزیز ہندوسان مائی فٹ...... میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ ضروری تھا۔ ان خطرناک' مایوس' بھیڑیوں' حرام زادوں۔'' اس نے بہت دل میں گالی دی۔ ''دہشت پسندوں کے ساتھ رہنے کے لیے اور کیا کر سکتا ہوں۔'' خیالات کی روانی کے پیچھے یا درمیان میں کہیں اس نے یہ بھی سوچا کہ یہ تیسری بڑی گالی ہے جو اپنی عمر میں اس نے دی۔ ''ایسے نامراد لوگ میں نے میدان جنگ میں بھی نہیں دیکھے۔ یا اللہ وہ انگریز کس قدر بے دردی سے اسے۔'' اس نے جھرجھری لی۔

دروازے پر لکڑی کا تختہ آہستہ سے ہٹا اور ایک لڑکی کا گول چہرہ نمودار ہوا۔

''لکڑ بند' کیا حال ہے؟'' اس نے بچوں کے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔''

لڑکی تختہ ہٹا کر اندر آ گئی۔ اس کا چہرہ چھوٹا اور جسم گدرایا ہوا تھا۔ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے لمبی دکھائی دیتی تھی۔

''تم آج کیوں نہیں گئے؟'' اس نے نعیم پر جھک کر پوچھا۔

''میری طبیعت خراب تھی۔''

''بارود لگانے سے ڈرتے ہو؟''

''بکو مت۔'' وہ پھر فرش پر لیٹ گیا۔ کمرے میں دو ایک بے مقصد چکر لگانے کے بعد لڑکی باہر نکل گئی۔ جو ذرا سی روشنی دروازے کے رستے آ رہی تھی ختم ہو گئی۔

''آج میں نہیں گیا۔ ٹھیک ہے۔ کل دردِ سر کا بہانہ بھی نہ بناؤں گا' صاف انکار کر دوں گا۔ پہلے ہی کافی بے گناہ خون بہا لیا ہے۔ لیکن اس کا فائدہ؟ میں سب کچھ کہہ کیوں نہیں چکتا ہوں۔ ایں؟ لاحول ولا قوۃ۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ اتنے اچھے' اتنے دکھی' اتنے...... اور یہ شیلا' شیلا' یہ لڑکی۔''

لکڑی کا تختہ پھر کھسکا اور شیلا نے اندر جھانکا۔

''لکڑ بند' چائے پیو گے؟''

''نہیں۔'' اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

وہ اندر آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''کیوں' بارود لگانے سے ڈر لگتا ہے؟''

''مت ہنسو۔'' نعیم نے خفگی سے کہا۔

''کیوں' بارود تو میں بھی لگا سکتی ہوں۔'' وہ دوبارہ ہنسی۔ نعیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا دیکھتے ہو؟'' شیلا نے آنکھیں چمکا کر کہا۔

وہ چپکے سے اٹھ کر دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چند لمحے تک وہ کھڑکی کی زنگ آلود چٹخنی سے الجھتا اور سرخ ہوتا رہا۔

''اسے مت کھولو'' شیلا نے کہا۔ ''بابا ناراض ہو گا۔''

اس نے کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا سرکایا۔ روشنی کی ایک لمبی لکیر کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے چھوٹے سے پہاڑی گاؤں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ اوپر نیچے بنے ہوئے لکڑی کے مکان دور سے سیڑھیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ گاؤں کے دامن میں گھنے' سیاہ باغ تھے۔ ان سے نیچے کھیتوں میں دھان کی فصل کھڑی تھی۔

''اور یہ کمبخت بابا' آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ کس کے ساتھ ہے!'' اس نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا۔ ''اتنی مدت سے دن کی روشنی میں ہریالی نہیں دیکھی۔''

''لکڑ بند سنو۔'' شیلا اس کے قریب آ کر بولی۔

''مجھ کو لکڑ بند مت کہو۔'' نعیم نے خفگی سے کہا۔

''کیوں؟''

''کیوں؟ کیوں؟'' اس نے جل کر نقل اتاری۔ ''نعیم احمد خان میرا نام ہے۔''

''بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا یہ۔'' اس نے مصنوعی ہاتھ کو ڈرتے ڈرتے چھوا۔ ''لکڑی کا ہے تو...... ہمارے گاؤں میں ایک لنگڑا تھا۔ ایک باؤلا تھا۔ ہم اسے لنگڑا اور اسے باؤلا کہتے تھے۔''

''اچھا تو سنو۔ ہم یوں نہیں کہتے۔ ہم کہتے ہیں نعیم احمد خان اور شیلا رانی۔ کہو؟''

''نعیم احمد خان اور شیلا رانی۔''

دونوں ہنس پڑے۔ دھان کے کھیت پر سے مرغابیوں کی ڈار گزر رہی تھی۔

''نعیم احمد خان، تم بات کیوں نہیں کرتے؟''

''کرتا ہوں۔''

''کب؟ اتنے مہینے ہو گئے تم نے کبھی بات نہیں کی۔''

''صرف ایک مہینہ اور دس دن ہوئے ہیں۔''

''تم بڑا حساب رکھتے ہو۔''

''اچھا سنو۔ میرا یہ ہاتھ اصلی ہاتھ ہے۔ دیکھو۔'' اس نے لکڑی کی انگلیوں سے اس کی ناک کو چھوا۔ ''یہ تمہاری ناک ہے۔ میں محسوس کر سکتا ہوں۔ یہ تمہاری آنکھیں ہیں۔ یہ ہونٹ ہیں، یہ گال ہیں، یہ ٹھوڑی ہے۔ یہ گردن ہے۔'' وہ دیر تک لڑکی کے چہرے کی گندمی، بے داغ جلد پر سرد، ٹھوس انگلیاں پھیرتا رہا اور اس نے محسوس کیا جیسے کہ وہ اس کی اصلی انگلیاں ہیں اور ان میں خون دوڑ رہا ہے اور لڑکی کی جلد کا گرم لمس خون میں شامل ہو کر اس کے سارے بدن میں گردش کر رہا ہے اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''نعیم احمد خان، تم کل......''

''نعیم احمد خان مت کہو۔ صرف نعیم کہو۔''

''تمہارے کتنے نام ہیں۔''

وہ ہنسا۔

''نعیم کل جاؤ گے؟''

''کہاں؟''

''لائن پر۔''

''نہیں۔ تمہیں ہر بات کا کیسے پتہ ہوتا ہے۔'' وہ غرایا۔

''مجھے ہر بات کا پتہ ہوتا ہے۔'' لڑکی نے آنکھیں نچا کر کہا۔ ''کیوں نہیں جاؤ گے؟''

''میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''یہاں کیوں آئے ہو پھر؟''

''کیوں؟ اررر...... پتہ نہیں۔''

''پتہ نہیں؟'' لڑکی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''روٹی یہاں مفت نہیں ملتی جناب۔ واپس جایئے۔''

''اوہ......'' نعیم نے گال پھلا کر سانس چھوڑی۔ ''میں واپس چلا جاؤں گا۔''

لڑکی آنکھیں جھپکاتی ہوئی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ''نعیم ایک بات بتاؤ۔''

''کیا؟''

''تم مجھ سے ملنے کے لئے یہاں رہ گئے تھے؟''

''نہیں۔''

''پھر؟''

''میری طبیعت خراب تھی۔''

وہ ایک دم بجھ گئی۔ ''اچھا......'' اس نے باہر دیکھتے ہوئے بے خیالی سے کہا۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی ستاروں کی روشنی میں اس کے ہونٹوں کی باریک' سرخ جلتی ہوئی لکیریں بہت مدھم ہوگئیں۔

نعیم ہنسا اور سیدھے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ ''اچھا۔ مانا کہ تمہارے لئے ٹھہر گیا تھا۔''

لڑکی کی آنکھیں اندھیرے میں چمکیں۔ ''تو ٹھیک ہے۔''

''کیا؟''

''میں تبھی سمجھ گئی تھی۔ تمہاری آواز بیماروں والی نہیں تھی۔''

اندھیرے میں نعیم نے اپنی کھوکھلی ہنسی کی آواز واضح طور پر سنی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی بند کرنا چاہی لیکن شیلا رستے میں کھڑی رہی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''گاؤں۔''

''تمہارا بھی گاؤں تھا؟''

''ہاں۔ وہ میدانوں میں تھا اور بڑا زرخیز تھا۔''

''ناگپور کے قریب؟''

''ہاں۔ تمہیں کیسے پتہ ہے؟'

''تمہارے بھائی نے بتایا تھا۔ تمہارا وہاں کوئی دوست تھا؟''

''نہیں۔''

''تم جھوٹ بولتی ہو۔''

''نہیں۔نہیں۔'' وہ نیچی آواز میں چیخی۔

نعیم نے کندھے اچکائے۔''یونہی مجھے خیال ہوا تھا۔''

دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر لڑکی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔''مدن گھر سے بھاگ گیا۔ میں اکیلی اکیلی کھیلا کرتی تھی۔ گاؤں میں ہر سال ہیضہ پھیلتا تھا۔ پہلے ماں مری' پھر باپ۔ پھر مدن کہیں سے آ گیا۔ پھر......''

''مجھے پتہ ہے۔'' نعیم نے ہاتھ سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''مجھے سب پتہ ہے۔تمہارے بھائی نے بتایا تھا۔''

''کب؟''

''جب پہلی بار لائن پر گئے تھے۔تم پر بہت ظلم ہوئے ہیں۔''

''اچھا!'' شیلا نے تعجب سے' بے دھیانی سے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

چاند کی آخری تاریخیں تھیں اور سارے میں تاریکی اور ستاروں کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے پہاڑی پر اوپر نیچے بنے ہوئے مکانوں میں دیئے جل رہے تھے اور بجھ رہے تھے۔ ان کی کھڑکی کے نیچے ایک پہاڑی جھرنا بہتا تھا۔ پتھروں پر بہتے ہوئے پانی کی کھنک' جو دور چلتے ہوئے رہٹ کی آواز سے مشابہ تھی' ان کے کانوں میں آ رہی تھی۔ رات کا ایک پرندہ پھڑ پھڑا کر کھڑکی کے سامنے سے گزرا۔

''میں جاؤں؟'' لڑکی نے سہم کر کہا۔

''ٹھہرو۔''

''ابھی فرشتہ گزرا تھا۔'' لڑکی نے کہا۔

وہ ہنسا۔''نہیں۔ چمگادڑ تھی۔''

''چمگادڑ؟'' شیلا نے خوف زدہ آواز میں دہرایا۔''ایسا مت کہو۔ وہ فرشتہ تھا۔ یہ جب بھی گزرتا ہے وہ آ جاتے ہیں۔ مجھے اب جانا چاہیے۔''

لیکن وہ کھڑی رہی۔

''تم کہاں سوتی ہو؟''

''ساتھ والے کمرے میں۔''

''اچھا؟ میں سمجھا گاؤں چلی جاتی ہو۔''

''تم دروازے کے پاس سوتے ہو۔''

''تمہیں کیسے پتہ ہے؟''

''تم بڑے زور کے خراٹے لیتے ہو۔ مجھے غصہ آ جاتا ہے۔''

''اچھا؟'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''تختہ ہٹانے کا شور ہوتا ہے؟''

''نہیں۔ میں نے کئی بار ہٹا کر تمہیں دیکھا ہے۔''

''کیوں؟''

''تم سونے نہیں دیتے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا تختہ تمہارے اوپر دے ماروں۔''

وہ پھر مسکرایا۔ ایک اور چمگادڑ پھڑ پھڑاتی ہوئی کھڑکی کے پاس سے نکل گئی۔ شیلا نے ہاتھ اٹھا کر اس کی کہنی پر رکھا اور آنکھیں پھیلا کر اندھیرے میں پرندے کا تعاقب کیا۔ پھر وہ چپکے سے باہر نکل گئی۔

آدھی رات کے قریب بارش ابھی شروع ہوئی تھی کہ وہ تینوں آ گئے۔ کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے آتش دان پر پڑا ہوا دیا روشن کیا۔

''بارود گیلی ہوگئی؟'' اقبال نے قمیض آتش دان پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔ میرے پیٹ پر تھی۔'' بنرجی نے قمیض کا دامن جھٹکا اور کمر پر سے بارود کی پیٹی کھولنے لگا۔

''آتش دان سے دور رکھنا۔'' اقبال نے کہا۔

''سن سن کر کان پک گئے ہیں۔ خاموش رہو۔'' بنرجی نے ہوا میں منہ اٹھا کر گالی دی۔ پھر اقبال اور بنرجی نے ایک ساتھ اسی نامعلوم شے کو تلخ لہجے میں گالیاں دیں اور کپڑے اتارنے لگے۔

نعیم دیوار کے سہارے، گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھا' سرخ بے خواب آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ مدن آتش دان پر بیٹھا آگ جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اقبال نے کمر سے پستول کھول کر کیل پر لٹکایا۔ کیل اکھڑ گئی اور سن کے خول میں لپٹا ہوا بڑا سا پستول آواز پیدا کرتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ اقبال چند لمحے تک اسے اٹھانے کا ارادہ کرتا رہا' پھر آتش دان کے پاس ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

''سگریٹ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' مدن نے کہا۔

اس نے کندھے ڈھلکائے اور دیوار پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اوپر دیا جل رہا تھا۔ اس کے چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں آنکھوں اور رخساروں کے گڑھوں پر سایہ کئے ہوئے تھیں۔ دیوار کے ساتھ یوں ساکت بیٹھا وہ چکنی سیاہ مٹی کا بت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے بال کھردرے' گھنگریالے اور غلیظ تھے' اور مضبوط بناوٹ کا چہرہ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ نعیم کے دل میں اس کے لئے بے معلوم سا رحم پیدا ہوا۔ اس نے اٹھ کر کیل گاڑی' اس کا پستول لٹکایا اور اس کے پاس جا کر ایک سگریٹ نکال کر دی۔

''کیسے ہو؟'' خاموشی سے سگریٹ سلگا کر اقبال نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔''

''کیا کرتے رہے؟''

''کچھ نہیں۔'' نعیم نے آگ میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سوچتا رہا۔''

''تم سوچ لیتے ہو؟'' بنرجی نے پلٹ کر تمسخر سے پوچھا۔

''ہاں۔'' نعیم نے ڈھٹائی سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہے کہ سوچنا چھوڑ دو۔'' وہ دیوانہ وار گیلے سگریٹ کو سلگانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ ''میں نے بھی چھوڑ دیا ہے۔''

مدن نے ایک لکڑی توڑ کر آگ میں پھینکی اور مسکرایا۔

''تمہارے لئے یہ کام مشکل تھا' تم نے چھوڑ دیا۔''

''کیوں۔ یہ میں نے ہی سوچا تھا کہ ہم سب میں سے آگ جلانے کے لائق صرف تم ہو۔ دیکھو تم کم سے کم وقت میں آگ جلا لیتے ہو۔ میں خوش ہوں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر آگ تاپی۔ ''ہم سب خوش ہیں۔''

اس کے چھوٹے سے مکار' ذہین چہرے پر تعریفی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اپنے دو کمبل گھسیٹ کر وہ آگ کے قریب آ گیا۔ بند کمرے میں پتھروں پر پڑی ہوئی دھول اڑی اور اس کی ناگواری کو سب نے محسوس کیا۔

''تم اپنے بستر سے جدا نہیں ہو سکتے؟'' اقبال نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ''عورتوں کی طرح۔''

''ہم کھڑکی بھی نہیں کھول سکتے۔'' مدن نے کہا۔

بنرجی سگریٹ کو انگلیوں میں پھراتا ہوا سوچ رہا تھا۔ نعیم اس کی طرف جھکا۔

''تم واقعی خوش ہو مادھو کر؟''

''ہاں۔ تم نے ایسی خوف ناک شکل کیوں بنا رکھی ہے؟'' اس نے بیزاری سے سگریٹ کو آگ میں اچھالا۔ ''گیلا ہو گیا ہے۔''

''بارود کی بجائے تمہیں تمبا کو بچانا چاہیے تھا۔'' نعیم نے کہا۔

''ہاں شاید۔''

''اب بارود پیو۔''

شیلا المونیم کے بڑے برتن میں پانی بھر کر لائی اور اسے آگ پر رکھ دیا۔

''بڈھا کچھ کھانے کو دے گا؟ میں بھوک سے مر رہا ہوں۔'' مدن نے کہا۔

''پتہ نہیں۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی۔ گھنے سیاہ بالوں کی لٹ اس کے گال پر لٹک رہی تھی اور آنکھیں آگ کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

''شیلا کچھ کھانے کو دو۔'' مدن نے نرمی سے کہا۔ نعیم نے محسوس کیا کہ اس کا ماتھا اور آنکھیں بالکل اپنی بہن سے مشابہ تھے۔ شیلا 'اچھا' کہہ کر باہر نکل گئی۔ کچھ دیر کے بعد بڈھا ہاتھ میں کھانے کا برتن لئے داخل ہوا۔

''آج کچھ آلو پکائے ہیں، لونڈو۔'' اس نے جنوبی ہند کے کسانوں کے لہجے میں کہا۔ سخت گندا برتن آلوؤں کے اشتہاء آور سرخ شوربے سے بھرا ہوا تھا اور اس میں سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ چاروں مرد اپنی اپنی مصروفیت چھوڑ کر برتن کے گرد جمع ہو گئے۔ بڈھا اپنے حقّے پر جھک گیا۔

''روٹیاں'' دو آدمی ایک ساتھ بولے۔

''اوہ......'' بڈھے نے بڑے فوجی کوٹ کی جیب میں سے چند میلی روٹیاں نکال کر انہیں دیں۔ پھر اس نے مادھو کر بنرجی کی لمبی، باریک، چھری کپڑے کے خول میں سے نکالی اور اس کی مدد سے حقّے کی نالی میں جما ہوا تمباکو کا میل کھرچنے لگا۔

دیر تک وہ آتش دان کے سامنے بیٹھے بھوکے، تھکے ہوئے جبڑوں کے ساتھ کھانا چباتے رہے۔ آگ کی روشنی میں ان کی کنپٹیوں اور جبڑوں پر ایک ایک ہڈی اور پٹھا الگ الگ دکھائی دے رہا تھا۔ باہر بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ کھڑکی پر اس کی ہلکی، مسلسل آواز کمرے کی خاموشی اور اداسی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اندر چیڑ کے جلنے کی ہلکی پھنکار اور کھانا کھانے کی آوازیں تھیں۔ بڈھا ایک پتھر پر آنکھیں بند کئے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

''لونڈیا کے لئے کچھ رہنے دو۔ اور کچھ نہیں ہے۔'' آنکھیں بند کئے کئے وہ بولا۔

چاروں مردوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر تقریباً سب نے ایک ساتھ ہاتھ کھینچ لیا۔

برتن بڈھے کے حوالے کر کے وہ آگ کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ مادھو کر نے گیلے سگریٹ کو سلگانے کی چند منٹ بے کار کوشش کے بعد اسے آگ میں اچھال دیا اور ہوا میں گالی دی۔

''آج کیا ہوا؟'' نعیم نے اقبال کو مخاطب کر کے پوچھا۔

وہ منہ پھیر کر قمیض، جو اب خشک ہو چکی تھی، پہننے لگا۔

''ڈاک خانہ خاموش ہو گیا؟'' نعیم نے پھر پوچھا۔

''اوہ......ہوں۔''

''اور تار؟''

''ہُوں ہنک۔'' اقبال نے آگ میں دیکھتے ہوئے دوبارہ ناک میں سے ملی جلی آواز نکالی۔

''تم بول نہیں سکتے؟'' نعیم نے تیزی سے کہا۔

اقبال نے خفگی، علیحدگی اور اکتاہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور دیوار پر سر رکھ دیا۔ ''بیزار مت کرو۔ میں تھکا ہوا ہوں۔''

''تمہارے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔''

اقبال نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ ''ہم نے ایک آدمی کو خاموش کیا ہے۔ میرے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے۔'' اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

''صرف جب مجبور کر دیے جاؤ۔ ورنہ کچھ نہیں۔ تم کچھ بھی یاد نہیں رکھنا چاہتے۔ تم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے متعلق بات کر سکو۔ میں جانتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے۔''

''بیکار بیٹھے بیٹھے تم ناکارہ ہو گئے ہو۔'' مادھوکر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''اچھا ہوتا تم ہمارے ساتھ چلتے۔''

''اور...... اور۔'' نعیم سخت غصے میں کچھ کہتا کہتا رک گیا۔

مادھوکر اس کی طرف جھکا۔ ''اور یہ کیا چلن ہیں تمہارے۔ باؤلے ہو؟''

نعیم خاموش بیٹھا چھوٹی چھوٹی کمزور لکڑیوں کو انگلیوں سے توڑتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

اقبال دیوار سے لگا لگا سو گیا تھا۔ مدن اپنی ران کے زخم کو گرم پانی سے دھو رہا تھا۔ بند کھڑکی سے لگاتار بارش کی آواز آ رہی تھی۔ مادھوکر نے چند لکڑیاں آگ پر پھینکیں۔ چیڑ کے دھوئیں کی تیز بو کمرے میں پھیلی، پھر لکڑیاں بھڑاک سے جل اٹھیں۔ شیلا اپنے بھائی کے زخم پر پٹی باندھنے لگی۔

''کون تھا؟'' نعیم نے پوچھا۔

''چوکیدار۔'' مدن نے بتایا۔

''پھر؟''

''پھر وہ ہوشیار ہو گئے۔''

''کیوں؟''

''ہم سے غلطی ہو گئی۔''

''اسے قتل کرنا ضروری تھا؟'' نعیم نے مشکوک نظروں سے اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ......'' مدن نے کندھے اچکائے۔ ''شروع حملے میں ہم سے غلطی ہوئی۔ جو بعد میں...... یوں کرنا ہی پڑا۔''

شہد کی سی صاف آواز میں نعیم بولا: ''میں جانتا ہوں۔''

''کیا؟''

''اسی وجہ سے وہ خوف زدہ ہے۔'' اس نے پھر اقبال کی طرف دیکھا۔

''خوف زدہ؟'' مادھوکر حیرت سے پکارا۔ ''وہ ایک مچھر کی طرح قتل کر سکتا ہے۔ پتہ ہے تمہیں؟''

''غلط......'' نعیم نے غصے سے گھونسہ اپنی ران میں مارا۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں وہ اس وقت خواب میں بھی یہی دیکھ رہا ہے۔''

مدن اور مادھوکر نے تمسخر سے اسے دیکھا۔

''کیا دیکھتے ہو؟'' اس نے آگ کی طرف ہاتھ پھیلایا۔ ''یہ سبق میں نے میدان جنگ میں سیکھا تھا۔ تم کسی انسان کو مچھر کی طرح نہیں مار سکتے۔ کبھی نہیں۔'' وہ آگے کی طرف جھک کر بیٹھ گیا۔ ''سنو۔ بہت سے مچھروں کو...... یہ اس نے مجھے بتایا تھا۔ بہت سی چیونٹیوں کو تم آسانی سے مار سکتے ہو۔ ایک کو نہیں۔ وہ بے گناہ آدمی تھا اور

ایک آدمی تھا' اور مزدور تھا یا کسان تھا' اور غریب بھی تھا' چنانچہ وہ ہمیشہ اس کے خواب میں آئے گا۔ میں جانتا ہوں۔''

یکلخت مادھوکر کا قہقہہ بلند ہوا۔ اونچا' زوردار' وحشی قہقہہ۔ اقبال نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ہنستے ہنستے مادھوکر کی آنکھیں اُبھر آئیں اور چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے ہاتھ چوڑا کر کے اقبال کی ران پر مارا۔

''تم خواب میں کیا دیکھ رہے تھے؟''

اقبال خاموش غصے کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

''بے گناہ آدمی' اور ایک آدمی۔'' وہ ہنستے ہنستے جھک گیا۔

''بے گناہ آدمی اور ایک آدمی۔ سنا؟ یہ کہتا ہے چوکیدار تمہارے خواب میں آئے گا۔ وہ بے گناہ آدمی اور ایک آدمی ہے۔ بے گناہ اور ایک۔ ہنہ ہنہ ہنہ ہو ہو ہو ہاہاہا۔ بیگناہ اور ایک......''

اقبال اسی طرح سر دیوار سے ٹیکے سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا رہا' پھر کھسک کر زمین پر لیٹ گیا۔''شور مت مچاؤ۔ مجھے سونے دو۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

آہستہ آہستہ مادھوکر خاموش ہوگیا۔ پھر بھی وقفے وقفے پر خاموش ہنسی کے جھٹکے اس کے پیٹ اور شانوں پر ظاہر ہوتے رہے۔ بارش ختم چکی تھی۔ کھڑکی کی درزوں میں سے جھرنے کا ہلکا شور اندر آرہا تھا۔ آتشدان میں لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔ مردوں پر غنودگی طاری تھی اور وہ سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیند کسی کو نہیں آرہی تھی۔

''میں آج سوچتا رہا۔ ہم پتھر چھوڑ کر میدانوں میں کیوں نہیں چلے جاتے۔'' دھیمی' صاف آواز میں نعیم نے کہا۔ اقبال آنکھیں کھول کر جلتے ہوئے کوئلوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرہ آگ کی وجہ سے سرخ ہورہا تھا۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' مدن نے گرم اینٹ سے زخم پر ٹکور کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں پر کیا ہے؟ پتھروں میں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ پتھر پانی بھی جذب نہیں کرتے۔ یہاں پر جو پانی بہتا ہے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ یہ جگہ بانجھ عورت کی طرح ہے۔''

''یہ جگہ زیادہ محفوظ ہے۔''

''محفوظ؟ یہ ساری جگہ محفوظ ہے۔'' نعیم نے بازو پھیلا کر کہا۔

''یہ دنیا انسان کا گھر ہے۔ ساری دنیا۔ جہاں کھانے کو ملتا ہے وہ جگہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔''

''ہنہ۔'' مدن ہنسا۔ ''کھانے کو؟ کھانے کو کسے ملتا ہے۔ ہمیں؟ مزارعوں کو؟ کھانے کو کون دیتا ہے؟'' زخم پر اینٹ کی تپش محسوس کر کے اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ ''تم چاند پر سے آئے ہو یا میدانوں میں سے؟ تمہیں وہاں کھانے کو ملتا تھا تو وہ جگہ تمہارے لئے محفوظ تھی۔ تم یہاں کیوں آئے؟''

''اسی لئے تو......''

''سنو۔'' مدن نے بات کاٹی۔ ''کھانے کے لئے بیلوں کو بھی ملتا ہے۔ مگر بیلوں اور انسانوں میں بڑا فرق

ہے۔ وہاں بیلوں اور آدمیوں کو ایک ہی برتن میں کھانا ملتا ہے۔ تم نہیں جانتے؟ انسانوں کی پگڑی سر پر ہوتی ہے' گلے میں نہیں ہوتی۔ انسانوں کو کھانا عزت سے آبرو سے ملنا چاہیے۔ وہاں پر کھانا صرف بیل کی ناند میں ملتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' نعیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرایا۔ ''لیکن عزت اور آبرو کے لئے ایک بہت بڑی جنگ کی ضرورت ہے۔ اس سے بھی بڑی جو میں نے دیکھی ہے۔ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔ ہم کمزور ہیں۔ نیچے جا کر ہم ایک وسیع جنگ شروع کر سکتے ہیں۔ ایک نئی جنگ' جو بغیر اسلحے کے ہوگی مگر لاکھوں اور کروڑوں میں ہوگی۔ اس طرح جیسے ہم کر رہے ہیں' ہم کوئی جنگ نہیں جیت سکتے۔'' ''نیچے جا کر؟'' مدن نے سخت جھلا کر کہا۔ ''نیچے جا کر ہم پھر انہی لاکھوں کروڑوں میں مل جائیں جن سے ہم بھاگے ہیں؟ پھر بیلوں کی طرح کام کریں؟ تمہیں پتہ ہے وہ کتنی محنت کرتے ہیں اور انہیں کھانے کو کتنا ملتا ہے؟ وہ کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں اور کتنے گھنٹے سوتے ہیں؟ تم نے میرے باپ کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ یا اپنے باپ کو؟ ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہوگئی ہیں اور پیٹھ کی کھال دھوپ میں جل گئی ہے اور آنکھوں میں پسینہ بہہ بہہ کر وہ اندھے ہوگئے ہیں اور ان پر اتنا قرض ہے کہ سات پشتیں ادا نہیں کر سکتیں اور تم نے مالکوں کے مکان دیکھے ہیں' اور زمینیں' اور مویشی؟ اور جتنا دودھ روزانہ ان کے گھر میں جاتا ہے اتنا تم نے ساری عمر میں بھی پیا ہے؟ تم کہاں کی بات کرتے ہو؟''

''اوہ...... مدن'' نعیم نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ ''ان لوگوں سے بچ کر تم کہاں جا سکتے ہو! اس جنگ میں سبھی شریک ہیں۔ ہندوستان کتنا بڑا ملک ہے۔ اس میں کتنے جاگیردار' کتنے مالک اور کتنے نوکر ہیں۔ اس کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ ہم چند آدمی غاروں میں چھپ کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ درندوں کی زندگی اور درندوں کی جنگ ہے۔ ہم اپنے والدین کی نسبت بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے محنت کی اور خاموش رہے۔ بڑی خاموش' بڑی طاقتور جنگ۔ ہم نہ محنت کرتے ہیں نہ جنگ کرتے ہیں' محض چوری کرتے ہیں۔''

مادھوکر نے ایک لکڑی گھٹنے پر رکھ کر چٹاخ سے توڑی اور اسے آگ میں پھینک کر بولا۔ ''درندے بغاوت کر سکتے ہیں' بیل نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ میں نے ایک سرکس دیکھا تھا۔ رنگ ماسٹر نے جب چھانٹا پٹخایا تو شیروں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس کو پھاڑ ڈالا۔ کبھی بیلوں کو بھی مالکوں پر حملہ کرتے تم نے دیکھا ہے۔ وہ صرف آپس میں لڑتے ہیں۔ کبھی کبھی بیلوں سے انسان بننے کے لئے پہلے درندے بننا پڑتا ہے۔''

''مالکوں کی بحث بیکار ہے۔ ہماری اصل جنگ ان سے ہے جنہوں نے مالکوں کو بنایا ہے۔ جو کاریگروں کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں اور سوچنے والوں کے دماغ شل کر دیتے ہیں۔ وہ غیر ملکی جو ہمارے ملک کو غریب کر رہے ہیں۔ تم ان سے لڑنے کا طور نہیں جانتے۔ اس کے لئے ......''

''میں جانتا ہوں۔'' مدن نے اس کی بات کاٹی اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔ ''میں شاید تم سے زیادہ ہی جانتا ہوں۔ میں نے تین سال تک کتابیں پڑھی ہیں۔ معاشیات اور تاریخ۔ یہ مت سمجھو کہ میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ میں جانتا ہو کہ ہندوستان انگریزوں کی سلطنت ہے' اور ایسے کئی ہندوستان انگریزوں کی ملکیت ہیں۔ مجھے پتہ

ہے کہ وہ کیا حاصل کر رہے ہیں اور کس طریقے سے حاصل کر رہے ہیں۔ انہوں نے سکول اور کالج کھولے ہیں' ریل گاڑی چلائی ہے' ہسپتال بنائے ہیں۔ لیکن وہ کتنا ریونیو اکٹھا کر رہے ہیں۔ تمہیں ہندوستان کا رقبہ معلوم ہے؟ وہ کتنی کھلی تجارت ہندوستان کے اندر اور باہر کر رہے ہیں اور ہندوستان کی آمدنی کا کتنا حصہ وہ یہاں پر خرچ کر رہے ہیں۔ مجھے سب پتہ ہے۔ مگر میں نے تاریخ بھی پڑھی ہے۔ دنیا کی ہر جنگ کا آغاز اسی طرح ہوا۔ ملکوں کی نہیں لوگوں کی جنگ کا۔ ہر تحریک جو ملک کے اندر پھیلی اسی طرح پھیلی۔ بے شک بعض جنگیں آخر میں زیادہ باوقار اور زیادہ سنجیدہ طریقے پر فیصل ہوئیں' لیکن ابتداء میں کیا تھا؟ چند لوگ' جن کے سر پر خون سوار تھا۔ محکومیت اور ظلم سے سوئے ہوئے دماغ اور ہاتھ پاؤں تقریروں اور جلسے جلوسوں سے نہیں جاگتے اور حکومت جس کی جڑیں مدتوں سے مضبوط ہو رہی ہوں' ان باتوں سے کبھی نہیں چونکتی۔ وہ ہنگامے سے چونکتی ہے اور گو جنگ کو ختم کرنے اور جیتنے والوں نے ہمیشہ ان چند لوگوں کی مذمت کی اور انہیں برا بھلا کہا' لیکن بعد میں آنے والوں نے تاریخ کی کتابوں میں لکھا کہ وہ لوگ جنہوں نے جنگ جیتی اسے کبھی شروع نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دماغ میں خون تھا۔ جو شروع کرتے ہیں ان کے بازوؤں اور سینوں میں خون ہوتا ہے۔ آزادی کی ہر تحریک کو شروع کرنے کے لئے درندوں کی ضرورت ہے۔'' اس نے اکڑی ہوئی زخمی ٹانگ کو مشکل سے دہرا کیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ باہر بارش ایک بار پھر تیزی سے شروع ہو گئی۔

نعیم نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''میں نہیں سمجھتا...... میں نہیں سمجھتا مدن تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارے پاس کیا تجویز ہے' کیا پروگرام ہے' مجھے کچھ پتہ نہیں۔ تم خود اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تم بغیر تجویز کے' بغیر ارادے کے مارتے اور تباہ کرتے ہو اور خود اس پر پچھتاتے ہو۔ میں جانتا ہوں۔ میں محسوس کر سکتا ہوں۔ تمہاری زندگیوں میں ایک مہیب خلا ہے۔ تم جو کچھ کرتے ہو اسے بھلا دیتے ہو۔ تم کچھ یاد رکھنا نہیں چاہتے۔ تمہارے پاس محض احساس جرم ہے۔ ایسے کبھی جنگیں جیتی جاتی ہیں۔''

مدن اسی طرح رانوں پر جھکا بیٹھا تھا؟ سر اٹھا کر بولا۔ ''تمہارے پاس کیا تجویز ہے؟''

''کہ یہ جنگ سب لوگوں کی ہے' میری تمہاری یا اقبال کی نہیں۔ ان تمام لوگوں کی جو کھیتوں میں' بازاروں میں' سڑکوں پر اور ریل کے سٹیشنوں پر اور بندرگاہوں پر جھکے ہوئے ہیں اور محنت کر رہے ہیں۔ جن کے چہروں پر مشقت کی لکیریں پڑ چکیں اور جو نہیں جانتے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔ ہم......'' مدن نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ ''یہ تم نے پہلے بھی بتایا تھا۔ میں پوچھتا ہوں تمہارے پاس کیا تجویز ہے؟ زمین ہمیں مل جائے گی؟''

''ہاں۔''

''ہم اس کے مالک بنا دیئے جائیں گے؟''

''یقیناً۔''

''ملک کا ریونیو ملک پر خرچ ہو گا؟''

''ہونا چاہیے۔''

''جاگیرداری ختم کر دی جائے گی؟''

''ہاں۔ اس کے ساتھ جاگیردار اور مزارعے کا رشتہ بھی ختم ہو جائے گا۔''

مدن کی آنکھیں چمکیں۔ ''کیسے؟''

''ان کے پاس جا کر انہیں بتایا جائے کہ وہ محنت کر رہے ہیں اور اس کی قیمت ان کو نہیں مل رہی۔ اور کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور وہ اسے ختم کر سکتے ہیں' کہ دنیا کی تمام تر طاقت ان کے قبضے میں ہے......''

''اور یوں انہیں بتاتے بتاتے ہم جیل میں چلے جائیں؟ کچھ کئے بغیر۔'' مدن نے تیزی سے کہا۔

''کچھ کئے بغیر؟'' نعیم تقریباً چیخ پڑا۔ ''جیل جانے سے پہلے پہلے تم ہندوستان بھر میں آگ لگا سکتے ہو۔ تم بھی اپنی طاقت سے بے خبر ہو مدن۔ جب تم چلے جاؤ گے تو وہ لوگ دوسرے لوگوں کو بتائیں گے اور جب وہ لوگ چلے جائیں گے تو دوسرے دوسروں کو بتائیں گے اور جب وہ کمر سیدھی کر کے کھڑے ہوں گے تو۔''

''ٹھہرو ٹھہرو۔'' مدن نے بیتابی سے بات کاٹی۔ ''زیادہ باتیں مت کرو۔ سنو۔ میں گاؤں کا اچھوت تھا۔ مجھے کس طرح وہاں سے نکلنا پڑا۔ تمہیں سب پتہ ہے۔ میں زمیندار کے کتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا اور رہتا سہتا تھا۔ پھر میں کئی سال تک ملک بھر میں دھکے کھاتا رہا۔ اب میں پچیس برس کا ہوں۔ پچیس برس ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ پچیس برس میرے دل میں محفوظ ہیں۔ میں نے سب کچھ یاد رکھا ہے۔ میں اس کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔ سنو گے؟ پچیس برس۔ اور میں نے ایک روز پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ تمہیں پتہ ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اور تم احساس جرم کی بات کرتے ہو۔ تم نے دو سال کی جنگ دیکھی ہے اور ڈینگ مارتے ہو۔ میں نے ایک ایک دن دیکھا ہے اور پچیس برس نکل گئے ہیں۔ میرے پاس یاد رکھنے کو بہت کچھ ہے اور وہ میری بہن ہے جو میرے بعد فاحشہ عورت بنے گی۔ اس لئے میں جیل میں جانا پسند نہیں کرتا۔ سنا تم نے؟'' اس نے اکڑی ہوئی انگلی نعیم کی چھاتی میں چبھوئی۔ ''تمہیں اب چاہیے کہ جا کر سو جاؤ یا دفع ہو جاؤ۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تمہارے دماغ میں کچھ نہیں ہے۔ سب بکواس ہے۔'' بات ختم کر کے اس نے زخمی ٹانگ کو سیدھا کیا اور ہونٹ کاٹنے لگا۔ نعیم خاموش بیٹھا غصے سے بند کھڑکی کو دیکھتا رہا جس کی درزوں میں سے بارش کا پانی اندر آ رہا تھا۔

اچانک مادھو کر بنرجی بول اٹھا۔ ''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم یہ سب کچھ نہیں چاہتے۔ ہم ہمیشہ سے جانوروں کی طرح رہتے آئے ہیں؟ ہم نے کبھی صاف ستھری جگہ پر بیٹھ کر صاف ستھرے برتنوں میں الگ الگ برتنوں میں نہیں کھایا؟ یا کھانے کی خواہش نہیں کی؟ ایں؟'' اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں غصے میں آئے ہوئے نیولے کی آنکھوں کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔

''ٹھہرو۔'' اقبال نے ایک جلتی ہوئی لکڑی کھینچ کر زمین پر ماری۔ چھوٹی چھوٹی چنگاریاں اِدھر اُدھر اڑیں۔ مادھو کر سی سی کرتے ہوئے بازو پر گری ہوئی چنگاریوں کو ملنے لگا۔ ''پاگل ہو گئے ہو؟'' وہ چیخا۔

''تم زبان چلائے جاؤ گے تو ہو جاؤں گا۔ تم نے کیا کیا ہے جو اب بک بک کر رہے ہو۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ تمہیں پتہ نہیں؟ اور تم۔'' لکڑی کا جلتا ہوا سرا نعیم کی ناک کے نیچے ٹھونستے ہوئے وہ چیخا۔ ''تم کل لائن پر جا رہے ہو۔ ہم سے پہلے۔ اور اپنی یہ فضول باتیں ختم کر دو' ہمیشہ کے لئے' سنا؟ ہمارے پاس پہلے ہی بہت کام ہے۔''

غصے اور خوف کے مارے نعیم جلدی سے اٹھ کر اپنے کمبلوں کی طرف چلا گیا۔ اقبال نے لکڑی آتشدان میں پھینکی اور آگ کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔

دروازے کے قریب اپنے کمبلوں پر لیٹ کر نعیم نے ٹانگ پر ہاتھ پھیرا اور پتلون کی جیب میں پستول کو محسوس کیا۔ تاریک چھت کو گھورتے ہوئے سونے سے پہلے اس نے بہت سے گڈ مڈ خیالات کے درمیان واضح طور پر محسوس کیا کہ آگ لحظہ بہ لحظہ بجھتی جا رہی ہے اور کھڑکی پر بارش تقریباً رک چکی ہے۔

اس کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ آتشدان کی راکھ میں سے دو زندہ کوئلے جھانک رہے تھے۔ چھت کے قریب روشندان کے سوراخ میں سے تاروں کی مدھم روشنی داخل ہو رہی تھی۔ آتشدان کے گرد سوئے ہوئے تینوں مردوں کے بھاری سانسوں کی آواز خاموش کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں سردی تھی۔

سارا جسم ایک دفعہ اکڑا کر ڈھیلا چھوڑ دینے کے بعد اس نے جلد پر مصنوعی حرارت کی ایک تہہ رینگتی ہوئی محسوس کی اور آنکھیں میچ کر سوچا کہ اس وقت کیا بجا ہوگا۔ دوسری بار وہ آدھ منٹ تک اکڑا رہا۔ 'آج جانے کہاں جانا پڑے۔' اس نے سوچا۔ 'اور کام کیا ہوگا! ڈائنا مائٹ اٹھانے والا کام تو آسان تھا۔ اگر میں بھاگ جاؤں' ابھی فوراً۔'' پھر اس خیال کو دل سے نکالنے اور سردی کم کرنے کے لئے وہ تیسری بار اکڑا۔ بارش رک گئی ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ نیند کیوں نہیں آ رہی؟ اندھیرے میں خالی الذہن ہو کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر کمبل میں سے ہاتھ نکال کر اس نے لکڑی کا تختہ آہستہ سے کھینچا۔ تختہ پتھریلے فرش پر ہلکی سی بھدی آواز نکال کر دروازے سے الگ ہو گیا۔ کچھ دیر تک جنگلی چوہے کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھا اور بڑا فوجی کوٹ شانوں پر ڈال کر گھٹنوں پر چلتا ہوا رینگ کر تختے کے پیچھے سے نکل گیا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ چند سیکنڈ تک وہ تھوتھنی اٹھائے بو سونگھتے ہوئے شکاری کتے کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر دروازے میں کھڑا رہا۔ ''یہاں پر آگ کبھی نہیں جلائی گئی۔'' اس نے خنکی محسوس کر کے دل میں کہا اور اسی طرح دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ فرش پر لکڑی کی آواز کو بند کرنے کے لئے اس نے کوٹ ہاتھ پر لپیٹ لیا۔ چلتے چلتے اس کا سر سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس نے دل میں گالی دی اور مڑ کر دوسری دیوار کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ کوٹ آواز نکالے بغیر زمین پر گھسٹ رہا تھا۔

یوں چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے چلتے ایک بار مڑ کر اس نے اپنے آپ پر نظر ڈالی۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا لیکن اسے خیال آیا کہ وہ ایک ریچھ یا بڑے سے بھیڑیے کی مانند چل رہا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے دل

میں نامعلوم سی خوشی محسوس کی اور خاموشی سے ہنسا۔

اگلے کونے پر مڑتے ہوئے کسی نے اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ ''ادھر آؤ۔''

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ آواز اس قدر دھیمی تھی کہ وہ پہچان نہ سکا۔ پھر جب اچھی طرح سے اس کے چہرے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے کے بعد اسے یقین ہوگیا تو وہ اس کے بستر میں گھس گیا۔

''تمہیں سردی لگ رہی ہے؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

''کمبل چھوٹا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''ٹھہرو۔'' اس نے کمبل پر بڑا کوٹ پھیلا دیا اور اس کے ساتھ لگ کر لیٹ گیا۔ ''اس کمرے میں اور کون ہے؟''

''کوئی نہیں۔''

''اور بابا؟''

''باہر سوتا ہے۔''

''اتنی سردی میں؟''

''ہاں۔''

ٹھنڈک محسوس کر کے وہ اکڑا۔

''میرے پاؤں کو سردی لگ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اندر کر لو۔''

میں نے لڑکی کی طرف کروٹ لے کر پاؤں اندر کر لئے۔

''تم نے مجھے دیکھا تھا؟'' اس نے شیلا کے چہرے پر انگلیاں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تمہاری نظر بڑی تیز ہے۔''

''میں سوئی نہیں۔''

''رات سے جاگ رہی ہو؟''

''ہاں۔''

''میں کتنی دیر سویا؟'' اس نے پوچھا۔

''تم سوئے تھے؟''

''ہاں۔''

''ابھی تو تم باتیں کر رہے تھے۔''

''اوہ...... میں سمجھ رہا تھا بہت سو کر اٹھا۔'' اس نے اس کی گردن کو چوما۔ ''تمہاری گردن بڑی نرم ہے۔''

''آج تم کیوں لڑ رہے تھے؟''

نعیم نے جواب دینے کی بجائے دوبارہ اسی جگہ چوما۔

''ان سے مت لڑا کرو۔'' شیلا نے پھر کہا۔

''کیوں؟''

''وہ تمہیں مار دیں گے۔''

اس نے اس کے ہونٹوں کو دبا کر چوما۔

''انہوں نے پہلے بھی ایک کو مارا تھا۔'' لڑکی نے کہا۔

''کب؟''

''وہ پارسال ہمارے ساتھ آیا تھا۔ تب ہم بہار میں تھے۔ دو مہینے وہ ہمارے ساتھ رہا۔ پھر کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ اقبال نے اسے گولی مار دی۔''

نعیم خاموش لیٹا اس کے بدن پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

''مجھے اقبال سے نفرت ہے۔'' شیلا نے اس کے پہلو پر ہاتھ رکھا۔

''تم قمیض اتار کر کیوں سوتے ہو؟''

''میری پرانی عادت ہے۔''

''تمہیں سردی نہیں لگتی؟''

''نہیں۔''

نعیم نے اسے گردن کے نیچے نرم جگہ پر چوما۔

''شیلا۔'' اس نے بھاری آواز سے کہا۔

''آہستہ بولو۔''

''شیلا۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''تمہیں پتہ ہے بوسوں کا مزا کیسا ہوتا ہے؟''

''نہیں۔''

''مجھے چومو۔''

شیلا نے آہستہ سے اس کے گال کو چوما۔

''نہیں۔ ہونٹوں پر۔''

''اوں ہنہ۔''

''کیوں؟''

''یہ مرد کا بوسہ ہے۔ مجھے شرم آتی ہے۔'' وہ اس کی بغل میں منہ دے کر بولی۔

''اچھا سنو۔ یہ پانی کی طرح ہوتے ہیں۔ جب پیاس لگی ہو تو پانی میٹھا لگتا ہے۔ جب نہ لگی ہو تو بد مزہ لگتا ہے۔ دراصل اس کا کوئی مزہ نہیں ہوتا۔''

وہ اس کی چھاتی میں منہ دے کر ہنسی۔ ''تم عجیب باتیں کرتے ہو۔''

وہ خاموشی سے اس کی قمیض الگ کرتا رہا۔

شیلا نے اس کی چھاتی میں ناک رگڑی۔ ''تمہاری چھاتی میں بال نہیں ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تمہاری چھاتی میں بھی نہیں ہیں۔''

''عورتوں کے نہیں ہوتے۔''

''مردوں کے بھی نہیں ہوتے۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''ہوتے ہیں۔''

''کب ہوئے ہیں؟''

''ان سب کے ہیں۔'' اس نے اندھیرے میں دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

نعیم کے دل میں حسد کا ایک عجیب' تیز غصیل جذبہ پیدا ہوا۔ ''ان کی بات مت کرو۔'' اس نے خفگی سے کہا۔

''جن مردوں کی چھاتی میں بال نہیں ہوتے وہ مکار ہوتے ہیں۔'' وہ ہنسی۔

''تمہیں کس نے بتایا ہے؟'' اس نے غصے سے کہا۔

دیر تک وہ دونوں برابر برابر لیٹے رہے۔ ان کی سانسوں کی ہلکی پھنکار کمرے میں بلند ہو رہی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے جوان صحت مند جسموں کی حرارت ہونٹوں سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک رینگتی اور سارے کمرے میں پھیلتی ہوئی محسوس کی۔

''شیلا۔ تمہارا جسم بہت ملائم ہے۔''

وہ خاموش رہی۔

''تمہارے بدن پر کوئی خراش نہیں۔ کسی زخم کا نشان نہیں' تمہاری آنکھیں پھر بھی چمکیلی ہیں۔''

''چمکیلی ہیں؟''

''ہاں۔ یہ میرے ایک دوست کی بات ہے۔''

''تمہارا دوست بھی خوبصورت ہے؟''

''پتہ نہیں۔''

باہر بارش پھر شروع ہو گئی۔

''لیکن ......شیلا؟'' نعیم نے کہا۔

''ہوں۔''

''تم ...... بہت چھوٹی ہو۔''

''نہیں ٹھیک ہوں۔'

''تمہاری عمر کتنی ہے۔''

شیلا نے غصے میں آ کر باہیں اس کی گردن کے گرد کسیں اور پھنکار نما سرگوشی میں بولی۔ ''تم چھوٹے ہو۔ اگر تم عورتوں کے ساتھ بڑے نہیں ہوتے تو کبھی بڑے نہ ہو گے۔''

دور گاؤں میں ایک مرغ کے اذان دینے کی آواز بند دروازے میں سے آئی۔

''اب ہمیں سو جانا چاہیے۔'' نعیم نے کہا۔

''سو جانا چاہیے؟'' شیلا نے پوچھا۔

''ہاں۔ اب ہمیں سو جانا چاہیے۔''

دونوں نے سر ڈھانپ لئے۔ ہوا کے ساتھ بارش کی آواز تیز ہوگئی۔ اچانک شیلا نے سر اٹھایا اور بولی۔ ''نعیم تم چلے تو نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں۔'' نعیم نے بے تابی سے اس کا سر اپنی طرف کھینچا۔ تیز سرد ہوا بڑے دروازے کی درزوں میں سیٹیاں بجانے لگی۔ کمبل میں کئی جگہ سے سردی داخل ہو رہی تھی۔ دفعتاً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''چپ رہو۔ کمبخت۔'' نعیم نے دانت پیس کر اس کا منہ بند کیا۔ شیلا نے اس کا ہاتھ ہٹایا اور ہونٹ دانتوں میں دبا کر سسکی۔ پھر اس نے نعیم کی چھاتی پر منہ رگڑا' اسے چوما' اور دیر تک سسکتی رہی حتیٰ کہ اس کی چھاتی جگہ جگہ سے بھیگ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ خاموش ہوگئی۔

''کیوں روتی ہو؟'' نعیم نے غصے اور بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

''مجھے خیال ہوا تھا تم مجھے چھوڑ جاؤ گے۔'' اس نے کہا اور وحشیوں کی طرح اسے چومنے لگی۔

''بے وقوف لڑکی۔''

گاؤں میں سحر کا پہلا مرغ بولا تو وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ لیٹنے سے پہلے اس نے تختہ دروازے کے ساتھ برابر کر دیا۔ زمین پر سیدھا لیٹے لیٹے پشیمانی کا ہلکا سا سایہ اس کے ذہن پر سے گزر گیا۔

پھر تختہ ہٹنے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ شیلا دروازے میں بیٹھی بلی کی طرح آنکھیں چمکا رہی تھی۔

''کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہارا کوٹ۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر کوٹ تختے کے نیچے سے کھینچ لیا۔

''ٹھیک ہے۔'

وہ وہیں بیٹھی رہی۔

''جاؤ......'' اس نے کہا۔ شیلا کی آنکھیں عجیب طرح سے چمکیں۔

''جاؤ۔'' وہ دانتوں کے بیچ میں سے چیخا۔

وہ سادگی سے ہنس پڑی۔ اس کے سفید دانت اندھیرے میں جھلملانے لگے۔ نعیم نے اٹھ کر تختہ برابر کر دیا' لیکن دیر تک وہ تختے پر چمکتی ہوئی آنکھیں اور سفید دانت دیکھتا رہا۔

نیچے پتھروں پر جھرنے کا پانی بہہ رہا تھا اور بارش تھم چکی تھی۔

''تو تمہیں بس اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ مال گاڑی گزر گئی یا نہیں۔'' اقبال نے نقشے پر انگلی دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''ہم مال گاڑی پر بارود ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ ٹھیک ہے؟'' بات ختم کر کے اس نے پہلی دفعہ سگریٹ نکال کر نعیم کو دیا۔

سوراخ میں سے دھوپ کی لکیر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کمرہ پار کرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ دھوپ کی لکیر اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ آتش دان پر پڑے ہوئے شکستہ شیشے میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا۔ غلیظ اور زرد بڑھی ہوئی داڑھی میں اسے اپنے آپ کو پہچاننے میں کافی دقت ہوئی۔ یکبارگی ایک سرکش خیال نے اس کے دل میں سر اٹھایا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اس کا حق دار ہوں۔''

پشیمانی کا سایہ اس کے ذہن سے چھٹ گیا اور اس نے پہلی دفعہ گزری ہوئی رات کے سرور کو اپنے اعضاء پر محسوس کیا۔

(۱۴)

درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھے ہوئے اس نے ہزارویں بار پتھروں کے اوپر سے وادی میں دیکھا۔

''آدھی رات ہوگئی۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا۔

مغرب کی طرف سے اٹھا ہوا بادل تیزی سے آسمان پر پھیل رہا تھا اور تارے ایک ایک کر کے چھپتے جا رہے تھے۔ ہوا نمدار اور سرد ہوگئی تھی اور اس کی کھوپڑی میں گھستی جا رہی تھی۔ ''گرمی کے دنوں میں یہاں نامراد سردی ہوتی ہے۔'' سینے پر کوٹ لپیٹتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اسے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی اور وہ بار بار ریلوے لائن پر اور سامنے ڈھلان پر دیکھ رہا تھا۔ بادل کے ساتھ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور پہاڑی درختوں کی چوٹیاں جو ستاروں کے مقابل صاف دکھائی دیتی تھیں غائب ہو چکی تھیں۔

''اب تو مسافر گاڑی کا وقت ہوگیا۔ مال گاڑی شاید لیٹ ہے۔'' اس نے پھر بات کی' لیکن اسے خیال

آیا کہ تیز چلتی ہوئی ہوا اس کی آواز کو کہاں سے کہاں لے جائے گی۔ تنے کے پیچھے سے سر نکال کر اس نے اندھیرے میں دیکھا۔ پہاڑ، ڈھلان، لائن، سرنگ، وادی۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ لیکن ان جگہوں کی جائے وقوع کا اسے صحیح اندازہ تھا۔ شروع رات میں جب مطلع صاف تھا، وہ یہ سب جگہیں دیکھ چکا تھا۔ اتنی دیر تک اکیلا بیٹھا رہنے کے بعد وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی خواہش محسوس کر رہا تھا۔ اس خیال کو دل سے نکالنے کے لئے وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پتھروں کی اس حد تک گیا جہاں سے ڈھلان شروع ہوتی تھی۔

''اس راستے سے آئیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''جانے کہاں مر گئے۔ کمبخت سئور۔ میں کہوں گا مال گاڑی گزر گئی۔ بارود لگا دو۔ ہاں، دیکھا جائے گا بعد میں۔'' وہ دل میں ہنسا۔

ڈھلان کے کنارے لیٹ کر اس نے بازو ہوا میں پھیلا دیا۔ ''اب کیا ہوگا؟ گھڑی تو پہلی لائن پر گم ہوگئی۔ اب بتاؤ۔'' بہت بچپنے میں ایک پہاڑی مقام پر وہ اسی طرح ڈھلان کے کنارے لیٹا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کیا۔ لیکن وہاں سبزہ تھا اور دھوپ تھی اور ہوا میں خوش گوار گرمی تھی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ نیچے کود جائے۔ اس نے نیلی نیکر پہن رکھی تھی اور اس کے ساتھ چچا کا بڑا کتا تھا جو سبزے پر اس کے برابر لیٹا ہوا تھا۔ آس پاس اور بہت سے ہندوستانی اور انگریز بچے تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟ شاید اور کون تھا؟ اررر...... لیکن اوہ، خدایا۔ کس قدر خوبصورت۔'' اس نے زور سے آنکھیں میچ کر مٹھی ہوا میں چلائی اور ہنسا۔ کس قدر خوب صورت وقت تھا اور اس وقت پتا نہیں چلا۔ اس وقت کبھی پتا نہیں چلتا۔

دیر تک اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک گال جو ہوا کے سامنے تھا برف کی طرح جم چکا تھا اور بال اڑ اڑ کر آنکھوں میں پڑ رہے تھے۔ کمبخت مردود، ابھی تک غائب ہیں۔ پیٹ میں سخت بھوک محسوس کر کے وہ دل میں گالیاں دینے لگا۔

''یہاں سے کود جاؤں۔'' خیال کی مضحکہ خیزی پر وہ ہنسا۔ ''یا بھاگ جاؤں۔ واپس؟ نہیں۔'' اس نے ترچھی نگاہوں سے اندھیرے میں دیکھا۔ 'نہیں'۔ آہستہ آہستہ رات کا سرور اس کے بدن پر پھیل گیا۔ وہ اٹھا اور چالاکی سے مسکراتا ہوا گھٹنوں اور ہتھیلیوں پر چلنے لگا۔ پتھروں پر لکڑی کی آواز کو روکنے کے لئے اس نے کوٹ کی آستین کو نیچے دبا لیا۔

اس وقت رات کی بارش کے پہلے قطرے اس کے چہرے پر گرے۔

تنے کے ساتھ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں بھیگ گئیں۔ بارش ابھی ہلکی تھی، ابھی تیز ہوگئی۔ اس نے پہاڑی درخت کو گالی دی جس سے بارش میں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ 'ایک چنار کا درخت وہ کھڑا ہے، مگر عین راستے میں ہے۔ بھیڑیے۔ کیا میں سردی اور بھوک سے یہاں مر جاؤں؟' بارش تیز ہوگئی۔ اس نے سردی سے کانپتے ہوئے گیلا کوٹ چھاتی اور کندھوں پر کس کر لپیٹ لیا۔ اس کی پتلون ٹانگوں سے چمٹ گئی تھی اور بڑے فوجی بوٹوں میں پانی بھر گیا تھا۔

ہوا کے ساتھ ڈھلان پر سے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ وہ بیتابی سے بڑھا' مگر بارش کے شراٹے نے اس کی ہمت پست کردی۔ پتھروں پر چڑھنے اور باتیں کرنے کی آواز برابر آرہی تھی۔ ''بے وقوف جاہل' اتنا گلا پھاڑ رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

دور مشرق میں' پہاڑ کے پیچھے گاڑی کی تیز وسل سنائی دی اور سامنے کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس لوٹی۔ وہ چونکا۔ بارش اور ہوا کے شور کے باوجود اس نے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف طور پر سنی۔ 'کون سی گاڑی ہے؟' اس نے سانس روک کر سوچا۔ مال گاڑی؟ نہیں۔ اب مسافر گاڑی کا وقت ہے۔ 'مال گاڑی شاید لیٹ ہوگئی یا کہیں کھڈ میں گر گئی یا جب میں پانچ منٹ کے لئے سوگیا تھا تو گزر گئی ہوگی۔ یقیناً اب کیا ہوگا؟ خدایا' اگر وہ دو منٹ پہلے بھی پہنچ گئے تو بارود رکھ سکتے ہیں۔ یقیناً پہنچ جائیں گے۔ وہ تو اب یہ آگئے' اس نے کان لگا کر سنا۔ باتوں کی آواز ڈھلان کے کنارے پر آ گئی تھی' اچانک بند ہوگئی۔ وہ دیر تک ہوا کے رخ کان لگائے کھڑا رہا' لیکن اس کے کان میں پانی بھر گیا۔ ''خدایا۔'' اس نے آنکھیں بند کرکے کہا۔ ''میں یہ بالکل نہیں چاہتا۔ تم جانتے ہو۔ میں اس وقت یہاں محض اس لئے ہوں کہ اپنا فرض انجام دینا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا یا اللہ کہ وہ وہیں بیٹھے رہیں' یا پھر بارود والے کا ڈھلان پر سے پاؤں پھسل جائے' پھر تو اب پھسلواں ہو ہی چکے ہیں یا پھر۔'' آواز اب سامنے پتھروں پر سے آرہی تھی۔ اس کا دل یکبارگی دھڑکا۔ اندھیرے میں دو سائے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک کسان تھا جو گدھے پر بھوسا لادے جارہا تھا۔ بارش سے بچنے کے لئے اس نے سن کی خالی بوری کا چھاتا بنا کر سر پر اوڑھ رکھا تھا اور گدھے کی پونچھ پکڑے باتیں کرتا ہوا چل رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے کچھ کھاتا جارہا تھا۔ کمزور سا گدھا گیلے بھوسے کے بوجھ سے مر رہا تھا۔

''اب تمہارا پاؤں پھسلتا ہے' ہیں؟ کم ذات۔ میں تیرے بہانے جانتا ہوں۔'' وہ جھڑک کر بولا۔ ''تیری چابی میرے ہاتھ میں ہے' فکر مت کر۔ کمین۔ تو ہے ہی کمین۔ تیرا باپ بھی کمین تھا۔ جس روز خریدا اسی روز مرگیا۔ تو چھوٹا سا رہ گیا۔ چماروں سے خریدا تھا' کمین نہیں تو اور کیا ہوتا؟ دیکھ تو ڈھلان پر ٹانگیں نہ پسارتا تو ہم کبھی کے گاؤں پہنچ چکے ہوتے۔ سارا بھوسا خراب ہوگیا۔ تجھے ذرا سے کو میں نے پالا تھا' تو کسی کا احسان نہیں مانتا؟ ہیں؟ کمین چمار......'' وہ اس کی پونچھ مروڑنے لگا۔ ''ہیں؟ ہیں؟ ہیں؟''

وہ مسلسل کھاتا اور باتیں کرتا ہوا گزر گیا۔

''شاید سرخ گندم کی روٹی ہے۔'' نعیم نے سوچا۔ اس کا جی چاہا کہ اسے دھکا دے کر گرا دے اور روٹی اس سے چھین لے۔ پھر وہ ہنسا۔ ''یہ مجھ سے بھی بے وقوف نکلا۔''

گاڑی سرنگ میں سے نکلی اور دہشت ناک آواز پیدا کرتی ہوئی گزر گئی۔ انجن کی بتی سے نکلتی ہوئی روشنی کی لکیر میں دور تک چمکتی ہوئی بوندیں گر رہی تھیں۔ نعیم نے ہوا میں کوئلے کے گیلے دھوئیں کی بو سونگھی۔ یہ مال گاڑی تھی۔

''اب میں کہوں گا مال ابھی نہیں گزری۔'' وہ اپنی چالاکی پر مسکرایا۔

لیکن اسی لمحے بھوک اس کی انتڑیوں میں زور پکڑ گئی۔ مسلسل کٹکٹاتے ہوئے دانتوں کے درمیان سے اس نے بے شمار گالیاں دیں۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر بارش' بھوک اور انتظار نے اس کا حال بدتر کر دیا۔ اور بغیر سوچے سمجھے وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈھلان پر اترتے ہوئے کئی بار اس کا پاؤں پھسلا لیکن وہ کوستا کلبلاتا ہوا' آستین سے ناک اور آنکھوں کا پانی پونچھتا ہوا جانے بوجھے راستوں پر بھاگتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر وہ دکان میں داخل ہوا۔ چھپر تلے لکڑی کے تخت پوش پر بڈھا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ اس کے پالتو کتے نے تخت پوش کے نیچے سے نکل کر دم ہلائی۔

پہلے کمرے میں سخت اندھیرا تھا۔ تختے کی درزوں میں سے دوسرے کمرے میں جلتی ہوئی آگ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ کمرے کے فرش پر وہ بھاری قدموں سے جھول کر چلتا ہوا بڑھا۔

''کون ہے؟'' ایک دھیمی' مانوس آواز اس کے کانوں میں آئی۔

شیلا اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ''نعیم۔''

اس نے مڑ کر تھکی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔

''وہ ابھی جاگ رہے ہیں۔'' شیلا نے کہا۔

ایک بڑی سی گالی اس کے منہ سے نکلی۔ جیب سے ہاتھ نکالے بغیر وہ سارے جسم کے ساتھ تختے سے ٹکرایا' تختہ زمین پر گر پڑا اور اس پر سے چلتا ہوا وہ اس طرح کمرے میں داخل ہوا جیسے کہ دروازے میں کچھ تھا ہی نہیں۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایک سرخ داڑھی والا اجنبی بڈھا پتھر پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈے کپڑے کا خاکی کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔ اس کا چہرہ گول اور تر و تازہ تھا اور وہ کسی طور سے ان کے گروہ کا آدمی دکھائی نہ دیتا تھا۔ مدن اس کے قریب لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہم تمہارے انتظار میں تھے۔ تم غصے میں دکھائی دیتے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔'' اقبال نے کہا۔ وہ آتش دان کے قریب اپنی مخصوص جگہ پر ایک کہنی کے سہارے لیٹا پستول صاف کر رہا تھا۔

نعیم اس کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ ''آئے کیوں نہیں؟''

اس نے کندھے اچکائے اور ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ ''بارش ہو رہی تھی۔ بارود کیسے لایا جا سکتا تھا۔''

''تو اطلاع بھی نہیں دے سکتے تھے؟'' نعیم نے غصے کو دبا کر کہا۔

''ہم نے مادھو کر کو بھیجا تھا۔'' مدن نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔

''میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ صرف ایک گدھا گزرا تھا اور ایک آدمی جو گدھے سے بدتر تھا۔ میں سردی سے مر رہا ہوں۔'' اس نے لکڑیوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر اٹھا کر بجھتے ہوئے کوئلوں پر پھینکا اور بیٹھ گیا۔ چیڑ کی لکڑیوں نے مخصوص تیز دھواں چھوڑا اور جل اٹھیں۔ اس کے بوٹوں میں بھرا ہوا پانی نکل نکل کر فرش پر بہنے لگا۔ کندھوں پر

گیلے کوٹ کے بوجھ کو بے طرح محسوس کر کے اس نے کافی کشمکش کے بعد اسے اتار کر وہیں پھینک دیا' بالوں میں انگلیاں ڈال کر پانی نچوڑا اور ہاتھ گود میں رکھ کر آگ کی حرارت محسوس کرنے لگا۔

مدن نے سر اٹھا کر اقبال کی طرف انگلی ہلائی۔ ''وہ نکما آدمی' میں کہتا ہوں' شراب پینے کے لئے گاؤں چلا گیا ہوگا۔ تم نے ایسے ایسے آدمی اکٹھے کر رکھے ہیں جو نقصان دیں گے۔ سب کو نقصان دیں گے۔''

اقبال نے ریوالور کی چکلی تیزی سے انگلیوں میں گھمائی اور خاموشی سے بڈھے کی طرف دیکھا۔

''کچھ کھانے کو دو۔'' نعیم نے لکڑی کے گیلے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔

''کچھ کھانے کو دو۔ میں نے کل صبح سے کچھ نہیں کھایا۔''

''تم سے کس نے کہا تھا؟'' اقبال چپکے سے بولا۔

''ایں؟''

''کہ مت کھاؤ...... اس وقت تو کچھ نہیں ہے۔''

''لیکن ن ن......'' انتہائی غصے کی وجہ سے وہ تتلانے لگا۔

''آج ایک نیا مہمان آ گیا تھا۔'' مدن نے بڈھے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ......''

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے نعیم کا ضبط ٹوٹ گیا۔ زمین پر ہاتھ ٹیکے بغیر وہ مشین کی طرح سیدھا اٹھ کھڑا ہوا۔ چند سیکنڈ تک اچانک اور شدید غصے کی وجہ سے گنگ کھڑا وہ سب کو باری باری دیکھتا رہا' پھر مڑ کر کمرے میں تیز تیز چکر لگانے لگا۔ آنسو اس کے حلق اور آنکھوں میں عود کر آئے۔

آہستہ آہستہ اس نے بولنے کی قوت دوبارہ حاصل کی۔

''تو میں بھوکا مر جاؤں؟'' وہ ہوا میں ہاتھ پھینک کر چیخا۔ ''میں گدھا ہوں؟ ایک گدھے کو بھی چارہ نہ دو گے تو کام نہ کرے گا۔ چار گھنٹے تک میں وہاں چوہے کی طرح بھیگتا رہا۔ کس لئے؟ تم جانور ہو؟ تم نے کبھی انسان نہیں دیکھے؟'' وہ رکا اور ہاتھ پتلون کی جیب میں دے کر' کندھے جھکا کر کمرے میں پھرنے لگا۔ مدن نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ ''مت چیخو۔'' اس نے کہا۔ اقبال اسی طرح سکون سے بیٹھا پستول میں گولیاں ڈالتا اور نکالتا رہا۔ کمرے میں صرف لکڑی کے جلنے اور حقہ گڑگڑانے کی آوازیں تھیں۔

''میں چالیس روز سے تمہارے ساتھ ہوں اور میں نے ایک دن پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔ میں اپنی مرضی سے یہاں ہوں؟ ہرگز نہیں' تم وحشی ہو اور وحشیوں کا کام کر رہے ہو۔ مجھے اس سارے کام سے نفرت ہے۔'' غصے اور مایوسی کی حالت میں الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ''میں آج ہی یہاں سے جا سکتا ہوں۔''

اقبال کہنی پر اٹھا اور نظریں اس پر گاڑ کر صاف آواز میں بولا۔

''ٹھہرو تم کون ہو؟ بتاؤ؟'' اس کی صاف' بظاہر پرسکون آواز میں ایک ظالمانہ جذبہ تھا جو صرف نعیم نے محسوس کیا۔

''خفیہ پولیس؟'' اقبال نے پوچھا۔

نعیم کے ذہن میں سفید غبار دوپہر کی برف کی طرح پگھلنے لگا۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ نہایت غلط مقام پر آپہنچا ہے۔ تیز' رکی ہوئی نظروں کے سامنے اس نے سوچا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا کہ زیادہ باتیں بنانا اب بے کار تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں پر بیٹھ گیا۔

''پہلے بھی خفیہ پولیس نے ایک بھیجا تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔'' مدن نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر کہا۔

''میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔'' نعیم نے کہا۔ لیکن تین طرف سے جمی ہوئی نظروں نے اسے مجبور کردیا۔ اس نے گھبرا کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں کانگرس کا آدمی ہوں۔''

مدن آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمبل اس کے کندھے سے ڈھلک کر نیچے جاپڑا۔ کچھ دیر تک وہ حیرت اور تمسخر سے اسے دیکھتا رہا' پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کے بڑے سے شرمیلے چہرے پر تلخی اور مضحکہ تھا۔ ''کانگرس؟ نامردوں کی جماعت؟ کلرکوں اور جاگیرداروں کی؟ جو صوفوں پر بیٹھ کر آزادی کی جنگ لڑتے ہیں۔ ہاہاہا...... ہاہاہا؟''

''یہ غلط ہے۔'' نعیم نے ہاتھ کو جنبش دی۔ ''تم نہیں سمجھتے کانگرس میری جماعت ہے۔ مجھے دیکھو۔ میں جاگیردار ہوں؟ کلرک ہوں؟ میں سیدھا سادا کسان ہوں۔ ہاتھ سے کام کرنے والا مزدور ہوں۔ ہمارا اور تمہارا فرق......''

''تم کسان ہو۔'' مدن نے اس کی بات کاٹی۔ ''اسی لئے انہوں نے تمہیں نکال دیا ہے۔ یہاں بھیج دیا ہے۔ وہ گورنر کی دعوتوں میں جاتے ہیں اور اپنے درمیان کسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔ بس۔ اور تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟ بولو......!''

''دیکھو۔'' نعیم نے اعصابی انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''جن لوگوں سے میں ملا ہوں وہ میری اور تمہاری طرح کے انسان تھے۔ نادار اور محنت کش' شاید کسان' یا مزدور' مجھے علم نہیں' لیکن وہ کبھی گورنر کی دعوتوں میں نہیں گئے اور میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ تم لڑائی کا ڈھنگ نہیں جانتے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے لئے اتنا ہی بڑا دماغ بھی چاہیے۔ چند لوگ کی دہشت پسندی سے کیا ہوگا؟ اس جنگ میں ہم بھی اتنے ہی شریک ہیں جتنے تم'' اس نے رک کر پسینہ پونچھا جو اس سرد رات میں اس کے ماتھے پر نمودار ہوگیا تھا۔ ''ہماری تحریک عوام میں ہے۔ کسانوں اور مزدوروں میں' لاکھوں اور کروڑوں لوگوں میں' جن کے ہاتھ میں بے پناہ طاقت ہے۔ تم نے تاریخ اور معاشیات کا مطالعہ کیا ہے مگر عقل سلیم بھی ایک شے ہے۔ ایک ریل گاڑی اڑانے سے تم کیا کرلوگے؟ ہندوستان میں ہزاروں ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔ آزادی کے لئے ریل گاڑیوں سے نہیں' ان میں سفر کرنے والے لاکھوں لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایک پروگرام چاہیے' ایک ضابطہ۔ تمہارے پاس کیا ہے؟ چند گروہ ہیں جو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں' اور ان کا بھی آپس میں کوئی رابطہ نہیں۔ تم بغیر سوچے سمجھے کام کرتے ہو۔ تمہارے پاس سوچنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ میں نہیں سمجھتا۔'' اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''کہ یہ سب کیا ہے۔''

''اور تم کیا سمجھتے ہو؟'' مدن نے اس پر انگلی ہلائی۔ ''تم۔''

''سنو۔'' نعیم نے اکڑی ہوئی ٹانگیں اکٹھی کیں اور بڈھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس سے حقہ پکڑ کر دو لمبے لمبے کش لینے کے بعد اس نے حقہ واپس کر دیا اور کندھے جھکا کر بیٹھ گیا۔

''سنو۔'' اس نے دوبارہ کہا اور گہرے استغراق میں بولنے لگا۔

''سنو۔'' اس نے دوبارہ کہا اور گہرے استغراق میں بولنے لگا۔ ''میرا یہ پختہ یقین ہے کہ اگر بزدلی اور تشدد میں انتخاب کرنا پڑ جائے تو بزدلانہ طور پر ذلت اور بے بسی کا شکار ہونے کی بجائے ہندوستان کو مسلح طور پر اپنی عزت کی حفاظت کرنی چاہیے۔ مگر ساتھ ہی میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ عام تشدد تشدد سے کہیں زیادہ افضل اور سزا دینے سے معاف کر دینا کہیں زیادہ مردانہ فعل ہے۔ اپنے دشمن کو معاف کر دینا ایک سپاہی کا زیور ہوتا ہے۔ مگر سزا نہ دینا اسی وقت معاف کر دینا کہلاتا ہے جب معاف کرنے والے میں سزا دینے کی طاقت موجود ہو۔ ایک چوہیا جبکہ بلی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہوتی ہے بلی کو معاف کر دینے والی نہیں کہلا سکتی کیونکہ وہ خود مجبور اور بے بس ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی میرا یہ بھی یقین ہے کہ ہندوستان ایسا بے بس بھی نہیں ہے۔ طاقت جسمانی قوت کا نام نہیں، حقیقی طاقت ایک غیر مفتوح آہنی ارادے سے پیدا ہوتی ہے۔

''عدم تشدد کا اصول محض رشیوں کے لیے نہیں بنا تھا۔ بلکہ عام انسانوں کے لیے بھی وہ ویسا ہی قابل عمل ہے۔ عدم تشدد انسانوں کے لیے ایسا ہی زندگی کا قانون ہے جیسے تشدد وحشی جانوروں کے لئے ہے۔ تشدد کا جذبہ وحشی جانوروں کے اندر مخفی ہوتا ہے اور وہ سوائے حیوانی طاقت کے اور کسی قانون کو نہیں جانتے۔ مگر شرف انسانیت ایک بلند تر طاقت کے سامنے سر جھکا دینے کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی روحانی طاقت کے سامنے۔ ہمارے رشی جنہوں نے ایک تشدد آمیز ماحول میں عدم تشدد کے قانون کو دریافت کیا، نیوٹن سے بڑھ کر نابغہ روزگار اور ولنگٹن سے بڑھ کر بہادر سپاہی تھے۔ انہوں نے ہتھیاروں کے استعمال کو جانتے ہوئے ان کے ناکارہ پن کو سمجھ لیا تھا اور اس لیے انہوں نے ایک تھکی ماندہ دنیا کو یہ اپدیش دیا تھا کہ اس کی نجات کا راز تشدد کی بجائے عدم تشدد میں مضمر ہے۔ عدم تشدد کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک مضبوط ارادے والے بدکردار شخص کے سامنے عاجزانہ طور پر ہتھیار ڈال دیئے جائیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی پوری روحانی قوت کے ساتھ ظالم کے ظلم کا مقابلہ کیا جائے۔

''پس میں ہندوستان کو اس کی کمزوری کی وجہ سے عدم تشدد اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دے رہا، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اپنی طاقت اور قوت کا احساس رکھتے ہوئے عدم تشدد کو اختیار کرے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ یہ جانے کہ وہ اپنے اندر ایک ایسی روح رکھتا ہے جو تباہ ہونا نہیں جانتی اور جو ہر جسمانی کمزوری پر غالب آ سکتی ہے۔ میں ان لوگوں کو جو تشدد پر یقین رکھتے ہیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ غیر متشدد اور امن پسند ترک موالات کا ایک دفعہ تجربہ کر کے دیکھیں۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ عدم تشدد اپنی کسی اندرونی ذاتی کمزوری کی وجہ سے ناکام ثابت نہیں ہوگا بلکہ اس وقت ناکام ہوگا جب اس پر پورے طور سے عمل نہ کیا جائے اور وہ وقت حقیقی خطرے کا وقت

ہوگا۔ کیونکہ اس وقت وہ بلند ہمت انسان جو اپنی قومی ذلت کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتے اپنے غصے کا عملی اظہار شروع کر دیں گے اور تشدد کو اختیار کر لیں گے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو اس ظلم سے نجات دلوانے کی بجائے جس کا وہ تختہ مشق بنائے جا رہے ہیں' تباہ ہو جائیں گے۔''

''یہ تمہارا فلسفہ ہے؟'' مدن نے مسکرا کر پوچھا۔

''میرا اتنا بڑا دماغ نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ یہ تمہارا گرو ہے۔ گاندھی۔'' وہ طنز سے مسکرایا۔ ''گاندھی راہب۔ سادھو۔ ولی اللہ۔ جو ہوا میں باتیں کرتا ہے۔ اس کا حلیہ تم نے کبھی دیکھا ہے؟ اور تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں ملک لے کر دینے والا ہے؟ وہ کبھی گورنر کی دعوت میں نہیں گیا؟ اس کی تقریریں اور فلسفے تمہاری کیا مدد کریں گے؟ جنوبی افریقہ میں اس نے کیا کیا' جانتے ہو؟'' وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے ماتھے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی وہ مانوس رگ جو خطرے یا جوش کے وقت ظاہر ہوتی تھی' ابھر آئی۔

''اس کا سر حلوہ کدو کی طرح ہے۔'' اقبال نے زہریلا قہقہہ لگایا۔

''اوہ۔'' نعیم نے مایوسی سے ہاتھ ہوا میں ہلایا۔ ''تم نہیں سمجھتے...... مدن۔ یہ فلسفہ کاغذ پر نہیں' ہاتھوں پر لکھا گیا ہے۔ اس میں کام کرنے کی طاقت ہے۔ ذرا سوچو' ہمارے ہزاروں آدمی ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم پر قانون کی کوئی پکڑ نہیں۔ ہم صرف اپنا حق مانگتے ہیں لیکن تم...... جرم کرتے ہو۔ تم جرم کرتے ہو اور غاروں میں چھپ جاتے ہو اور ہمارے آدمیوں کو پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ ہمارا کام رُک جاتا ہے۔ سمجھے؟'' وہ رُکا۔ ''ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ نوجوان' جن کے پٹھوں میں طاقت ہے۔''

اقبال آنکھیں سکیڑے اسے دیکھ رہا تھا' لاپروائی سے بولا: ''ہماری ضرورت ہمارے کام کو ہے۔ کانگرس کو بزدلوں اور لنگڑوں اور لنجوں کی ضرورت ہے۔''

''بکومت۔'' نعیم چیخا۔ ''میں بزدل نہیں ہوں۔ میں نے جنگ کے میدان میں بازو کھویا ہے۔''

اقبال نے ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھا' پھر احتیاط سے اسے سیدھا کیا اور ایک وحشی لیکن پکے ارادے کے ساتھ حقے کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ دھماکے کے ساتھ مٹی کا حقہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑا اور بدبودار پانی زمین پر بہنے لگا۔ لکڑی کی نالی سرخ داڑھی والے کے ہاتھ میں رہ گئی جو پتھر پر ٹانگیں پھیلائے ششدر بیٹھا تھا۔ مدن سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اقبال ریوالور کو خول میں ڈالنے لگا۔

پتلون کی جیب میں پستول پر نعیم کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ باہر سے بڈھا گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ سوتے سے ایک دم جاگ اٹھنے سے اس کے بال لوہے کے تاروں کی طرح کھڑے تھے' جسم پر صرف ایک دھوتی تھی اور داڑھی پر رال بہہ رہی تھی۔

''کون مر گیا؟'' قریب آ کر اس نے خوف زدہ' سرخ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر سرخ داڑھی والے نے حقے کی نالی سے نعیم کی طرف مبہم سا اشارہ کیا۔
بڈھے نے جھپٹ کر نالی اس کے ہاتھ سے چھینی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر غصے سے سب کو باری باری دیکھنے لگا۔
''چاند ماری کی اچھی جگہ ڈھونڈی ہے تم نے۔'' اس نے اقبال سے کہا۔ ''میرا بھی بیڑا غرق کرو گے۔ اسی لیے میں نے تمہیں رکھا ہے؟'' غصے اور گھبراہٹ کی وجہ سے وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکا اور کہنیاں باہر نکال کر کمرے کی چوڑائی میں چکر لگانے لگا۔ کبھی کبھی وہ رک کر سب کو دیکھتا' کچھ کہتا کہتا رک جاتا' اور پھر چلنے لگتا۔ نعیم جیب سے ہاتھ نکالے بغیر اٹھا اور اپنے کمبل پر جا کر لیٹ گیا۔ انتہائی کوشش کے ساتھ اس نے اپنی انگلیوں کو اسی وحشی انسانی جذبے کے تحت عمل کرنے سے باز رکھا۔

پھر بات کئے بغیر بڈھا سب کی طرف ملامت اور سرزنش سے دیکھتا باہر جانے کو بڑھا' نعیم کے اوپر کھڑا ہو کر بولا: ''سوتے میں اس کی جان مت لینا۔'' اور باہر نکل گیا۔

کچھ دیر کے بعد سرخ داڑھی والا آہستہ آہستہ چلتا ہوا نعیم کے پاس آیا۔ خاکی کوٹ کی جیب میں اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد اس نے ہاتھ باہر نکالا اور چند خشک کھجوریں اس کی طرف بڑھائیں۔

''میرے پاس کچھ کھجوریں ہیں۔'' اس نے کہا۔

ایک لحظے تک نعیم اس کی سادہ' بے مطلب آنکھوں اور بے تکلفی سے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا' پھر اس نے کھجوریں لے لیں اور دیوار کی طرف کروٹ لے کر غیر معمولی اشتہاء کے ساتھ کھانے لگا۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ستاروں کی مدھم روشنی سوراخ میں سے داخل ہو رہی تھی۔ ''بارش تھم گئی۔'' اس نے سوچا۔ آتش دان کے قریب گھپ اندھیرا تھا اور تین طرف سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا ذہن بالکل خالی تھا اور وہ دوبارہ سو جانے کی شدید خواہش محسوس کر رہا تھا۔ بند آنکھوں کے سامنے سفید پردہ اور ستارے لئے وہ خاموش لیٹا کمبل کی آرام دہ حرارت کو محسوس کرتا رہا۔ پھر تختہ سرکا کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اندھیرے میں آسانی سے چلتا ہوا وہ اس کے بستر پر جا کھڑا ہوا۔ بستر میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ گھٹنوں پر بیٹھ کر اس نے تاریکی میں ہاتھ پھیلایا اور شیلا کے چہرے کو چھُوا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ نعیم کی انگلیوں کے نیچے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لحظے تک وہ اسی طرح جلتی ہوئی خشک آنکھوں پر انگلیاں رکھے بیٹھا رہا اور اس کے دل میں اس اجنبی لڑکی کے لئے بے پناہ ہمدردی اور رنج پیدا ہوا۔

''تم سوئی نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' شیلا نے بھاری آواز میں سرگوشی کی۔

''رات بھر؟''

''ہوں۔''

خاموشی سے اس کے برابر لیٹ کر اس نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے احسان مندی کے جذبے سے اس کے سر اور ماتھے کو چوما۔ وہ بلی کے بچے کی طرح اس کے سینے سے لگ کر سکنے لگی۔ اس کی گرم، بخار زدہ سانس نعیم کی ننگی چھاتی پر سے گزری اور اس کی جلد میں ایک درد آلود کپکپاہٹ بیدار کرتی ہوئی ہڈیوں میں اتر گئی۔ نعیم نے انتہائی تکلیف دہ احساس کے ساتھ ایک بازو کے پورے زور سے اسے بھینچا۔

''تم سوئی کیوں نہیں؟''

''ابھی تم خراٹے لے رہے تھے۔''

''تم نے جگایا کیوں نہیں؟''

''میں کئی بار گئی...... پھر لوٹ آئی۔''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں۔'' وہ کہنیاں اس کی چھاتی پر رکھ کر اُٹھی۔ ''آج وہ تمہیں مار دیتے تو؟''

''تو کیا تھا؟''

وہ اس کے سینے سے چمٹ گئی۔ ''میں اسے مار دیتی۔ یقیناً۔ ریچھ۔''

''کیسے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''بارود کے تھیلے پر کوئلہ رکھ کر۔''

''یوں تو سب مر جاتے۔''

''پر زیادہ تو وہ مرتا۔ بارود اس کے سر کے نیچے ہوتا ہے۔''

وہ چپکے سے ہنسا۔ ''عجیب طریقہ ہے۔''

''اس طرح میں نے تمہیں مارنے کا بھی منصوبہ بنایا تھا۔''

''مجھے؟''

''ہاں۔''

''کب؟''

''پہلے پہل۔''

''کیوں؟''

''تم بات جو نہیں کرتے تھے۔''

''پھر۔''

''پھر میں نے سوچا۔'' اس نے نعیم کی گردن پر ہونٹ رکھ کر کہا۔ ''میں خود تم سے بات کروں گی۔''

وہ پھر ہنسا۔

''میں تمہیں مار دیتی تو اچھا تھا۔'' اس نے کہا۔

''کیوں۔''

کہنیاں نعیم کی چھاتی میں گاڑ کر دھیمی' پھنکارتی ہوئی آواز میں بولی: ''آج میں رات بھر جاگتی رہی۔''

''اوہ...... مجھے معاف کردو۔ اب میں آ گیا ہوں۔'' اس نے اسے ہونٹوں پر چوما۔

''نعیم۔''

''ہوں۔''

''تمہیں اب چلا جانا چاہیے۔''

وہ خاموش لیٹا اس کی جلد سے نکلتی ہوئی ہلکی' نشہ آور حرارت کو محسوس کرتا رہا۔ اس نے سوچا کہ وہ حرارت اپنی قوت ضائع کئے بغیر شیلا کی جلد سے نکل کر اس کی جلد میں داخل ہو رہی ہے اور اسے زیادہ صحت مند' زیادہ مضبوط اور زیادہ ریشمیں بنا رہی ہے' جیسی صحت مند اور مضبوط اور ریشمیں وہ حرارت ہے۔ اپنی چھاتی کے ہلکے سے جھکاؤ میں جو شیلا کی چھاتیوں کے درمیانی جھکاؤ کے عین نیچے تھا' سردی محسوس کر کے اس نے پورے جسم کے ساتھ اسے بھینچا۔

''یہ لوگ بھیڑیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔'' شیلا نے کہا۔

''ہاں۔''

''ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''ہاں۔''

''تمہارا گھر ہے؟''

''ہاں۔''

''کہاں۔''

''کہاں؟'' وہ بمشکل اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ ''دلّی میں۔''

''ہم پھر دلّی چلے جائیں گے۔ ہیں نا؟'' شیلا نے اس کے منہ پر گال رگڑا۔

''ہاں۔''

''ہم پھر شادی کرلیں گے۔''

''ہاں۔''

''تم مجھ سے شادی کرلو گے نا؟''

''ہاں۔''

''نہیں' مجھے بتاؤ۔'' اس نے بضد ہو کر پوچھا۔

''ہاں ہاں۔'' نعیم نے سختی سے دہرایا اور اس کے ہونٹوں کو دبا کر چوما۔

''پھر ہم میاں بیوی کی طرح رہیں گے۔''

''ہاں۔''

''تم کیا کرتے ہو؟''

''میں؟ کھیتی۔''

''ہم بھی کھیتی کرتے تھے۔'' وہ خاموش ہو کر بولی۔ ''میں سارا کام کر لیتی ہوں۔''

''اچھا؟''

''دودھ بلو لیتی ہوں۔ چارہ کاٹ لیتی ہوں۔ چاول پکا لیتی ہوں۔ گوبر...... بھی تھاپ لیتی ہوں۔''

وہ ہنسا۔

''میں سارا کام کروں گی۔ تمہاری ماں بھی ہے؟''

''ہاں۔''

''میں تمہارا سارا کام کروں گی۔'' خوشی سے بے حال ہو کر لڑکی نے اس کے بال دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر کھینچے۔ ''ہاں۔ ہاں۔'' پھر اس نے دونوں بازو اس کی گردن کے گرد کس کر لپیٹے اور اس کے گال کا ایک طویل گرم بوسہ لیا۔ ''میں نے بڑی دیر ہوئی گھر میں کام نہیں کیا۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔'' وہیں پر ہونٹ رکھے رکھے اس نے بھاری آزردہ لہجے میں کہا۔

نعیم کے دل میں ایک نامعلوم سی بے چینی، ایک رنج پیدا ہوا۔

''اب وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔ اب وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔'' شیلا نے جواب دیا۔

''صبح ہونے والی ہے۔''

''ہاں۔ صبح ہونے والی ہے۔''

''اب ہمیں سو جانا چاہیے۔''

''اب ہمیں سو جانا چاہیے۔'' شیلا نے دہرایا۔

اور نعیم نے محسوس کیا کہ اُس کی رائے میں اور اس کی رائے میں، اُس کی رضا مندی میں اور اس کی رضامندی میں، اُس کے وجود میں اور اس کے وجود میں کوئی فرق، کوئی فاصلہ نہیں ہے، اور ان کے درمیان مکمل سمجھوتہ، مکمل صلح اور مکمل امن ہے، جیسے میاں بیوی کے مابین ہوتا ہے۔

تمام دن وہ اکیلا اکیلا پہاڑیوں پر پھرتا رہا۔ وہ چھتیس گھنٹے سے بھوکا تھا۔ اس کا دماغ کافی حد تک سُن ہو چکا تھا اور وہ سارے بدن میں کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ کبھی کبھی خیالات کا مختصر سا تیز ریلہ کہیں سے آتا: ''اب کیا

ہوگا! چلا جاؤں؟ رک جاؤں۔'' جواب دینے سے پہلے وہ بے دھیان ہو جاتا۔

دوپہر کے وقت وہ ایک چٹان کے سائے میں سو گیا۔ جب اٹھا تو سورج غروب ہو رہا تھا اور چٹان کا سایہ دور تک چلا گیا تھا۔ اٹھتے اٹھتے معدے میں شدید درد محسوس کر کے وہ پریشان ہو گیا۔

''بھوک کی وجہ سے ہے۔'' اس نے کہا اور آہستہ آہستہ پتھروں پر اترنے لگا۔

بڈھا اپنے مستقل اینچی انداز میں روئی کے میلے گدے پر بیٹھا تھا اور ایک کسان لکڑی کے بنچ پر بیٹھا دودھ پی رہا تھا۔ مٹی کے میلے برتن بڈھے کے آگے رکھے تھے۔ ایک بڑی سی کڑاہی میں دودھ گرم ہو رہا تھا جس پر میلے رنگ کی موٹی بالائی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ کڑاہی کے پاس چھوٹا سا گراموفون پڑا تھا۔ اس کے ہرے رنگ کے بھونپو پر مکھیوں کی بیٹوں کے بے شمار کالے کالے داغ پڑ گئے تھے۔ گراموفون دن بھر گھسے ہوئے ریکارڈ بجا بجا کر اب خاموش ہو چکا تھا۔

نعیم تخت پوش کے کونے پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ تمباکو کی وجہ سے اس کی معدے کا درد بھاری اور بدمزہ ہو گیا۔ اس نے دیوار پر تھوکا۔ کسان نے دودھ کا پیالہ بنچ پر رکھا اور خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ نعیم اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

بڈھے نے پیالہ اٹھا کر میلے برتنوں میں رکھا اور نعیم کو دیکھ کر مسکرایا۔ ''کیا دیکھتے ہو۔ یہ کسانوں کا طریقہ ہے۔ آتے جاتے ہوئے کوئی بات نہیں کرتے۔''

''میں بھی کسان ہوں۔'' نعیم نے دوبارہ تھوکا۔ ''تھوڑا سا دودھ دو۔'' بڈھے نے اسی پیالے میں دودھ ڈال کر اسے دیا۔

''کل تم نے بڑی غلطی کی ۔تم نے کیا کہا تھا؟'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''پتہ نہیں لیکن ان کا مزاج ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔''

نعیم نے چند بڑے بڑے گھونٹوں میں پیالہ خالی کر کے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر ستارے تھے اور تاریکی۔ وہ اندر داخل ہوا۔

اندھیرے فرش پر سے گزرتے ہوئے اس نے اگلے کمرے میں مردوں کے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ اس سے پہلے کہ وہ تختے کو چھوتا کسی نے تیزی سے اس کا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ مڑا۔ شیلا اسے کھینچتی ہوئی اپنے بستر تک لے گئی۔

''اندر مت جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''کیوں۔''

''وہ تمہیں مار دیں گے۔''

دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا غصہ اُس کے دماغ میں چڑھا۔ ''وہ میرے نزدیک بھی نہیں آئیں گے۔''

آہستہ آہستہ اُس نے کہا اور ہاتھ چھڑا کر پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔

''میں نے خود سنا ہے۔'' شیلا نے کہا۔ ''وہ تمہیں آتش دان تک پہنچنے سے پہلے مار دیں گے۔''

''میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ مجھے ان سے بات کرنے دو۔ میں نے ان سے زیادہ آدمی مارے ہیں۔''

''نہیں...... نہیں۔'' شیلا اس سے لپٹ گئی اور رو کر بولی۔ ''مت جاؤ۔ وہ تمہیں مار دیں گے۔ نہیں...... نہیں۔''

''میرا بستر اندر پڑا ہے۔'' نعیم نے درشتی سے کہا۔

''تم باہر بیٹھو۔ جب وہ سو جائیں گے تو میں لے آؤں گی۔''

نعیم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''پھر ہم چلے جائیں گے۔'' شیلا نے کہا۔

کچھ دیر تک وہ اسی طرح کھڑا جھومتا رہا۔ پھر آہستہ سے ہاتھ چھڑا کر باہر نکل آیا۔

یہ پورے چاند کی رات تھی۔ وہ مسلسل چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک اور بے خواب تھیں اور وہ لکڑی کے تخت پوش پر لیٹا تھا۔ دوسری طرف بڈھا لحاف میں سکڑا ہوا سو رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے مادھو کر اندر سے نکلا تھا۔ برآمدے میں رک کر اس نے نیولے کا سا سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور تھیلے کو کندھے پر درست کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ چھپر تلے تاریکی کی وجہ سے وہ نعیم کو نہ دیکھ سکا تھا۔ باتوں کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔

پھر وہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ نعیم کا کمبل اور تھیلا اسے پکڑا کر واپس چلی گئی۔ جب دوبارہ باہر آئی تو اپنے کمبل رسّی میں باندھ کر اس نے کندھے پر اٹھا رکھے تھے اور ہاتھ میں ایک پوٹلی پکڑے ہوئے تھی۔

''چلو۔'' اس نے کہا۔

نعیم نے اندھیرے میں گہری نظروں سے اسے دیکھا اور دیکھتا رہا۔

''یہ روٹی ہے۔'' ہاتھ اٹھا کر اس نے سادگی سے کہا۔ ''راستے کے لئے۔''

اسی طرح دیکھتے ہوئے نعیم نے تھیلا کندھے پر لٹکایا۔ پھر اس نے پورے بازو کے ساتھ مضبوطی لیکن آہستگی سے اسے پیچھے کو دھکیلا۔

''تم یہیں رہو۔'' اس نے کہا اور کمبل اٹھا کر باہر نکل گیا۔

شیلا نے بھاگ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''نہیں۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ تم نے کہا نہیں تھا؟'' اس نے آزردگی سے پوچھا۔

''میں گاؤں نہیں جا رہا ہوں۔'' مڑ کر دیکھے بغیر نعیم نے کہا اور رفتار تیز کر دی۔

شیلا نے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے اس کے بڑے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کھینچا۔ ''میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ تم کہاں جا رہے ہو۔ تم نے کہا نہیں تھا؟''

نعیم نے ایک لحظے کو رک کر اسے دیکھا' اس کا ہاتھ جیب سے نکالا اور تیزی سے چل پڑا۔

''نعیم۔'' وہ اس کی آستین کو مضبوطی سے پکڑے بھاگتی رہی۔ ''میں سارا کام کر سکتی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ۔''

''جاؤ...... '' ڈرے ہوئے کتے کی طرح دانت نکال کر وہ چیخا اور بھاگ اٹھا۔

سیدھا رستہ چھوڑ کر وہ ایک پتھریلی، خطرناک ڈھلان پر اترنے لگا۔ شیلا پتھروں کو پکڑ پکڑ کر دو ایک قدم اتری، پھر ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔

''نعیم...... '' آخری بار اس نے کہا اور بلک کر رونے لگی۔ پتھروں پر پھسلتا، گرتا، لڑھکتا ہوا وہ تیزی سے نیچے اتر رہا تھا۔

''سوٗر...... لکڑ بند...... '' شیلا نے چلا کر کہا اور پوری طاقت سے ایک بھاری پتھر اس کے پیچھے لڑھکا دیا۔ پتھر شور مچاتا ہوا نعیم کے قریب سے تیزی کے ساتھ گزر گیا۔

ڈھلان کے دامن میں جھرنے کے ٹھہرے ہوئے پانی کے کنارے پر پہنچ کر اس نے آستین سے پسینہ خشک کیا اور سخت پیاس محسوس کی۔

پیاس بجھا کر وہ ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنا سیاہ دستے والا استرا نکالا اور دیر تک اسے تھیلے کے چمڑے پر تیز کرتا رہا۔

پانی پر جھک کر داڑھی مونڈتے ہوئے اس نے سوچا: ''پتہ نہیں کہاں چلا جاؤں۔ میں کیسے اس کو...... میں کیسے۔''

پچھلی رات کی سرد، بوجھل ہوا پانی کی سطح پر ہولے ہولے چل رہی تھی۔ اسے نیند آ گئی۔

(۱۵)

گلاب کے پودوں کو پانی دے کر عذرا نے ہاتھ والا فوارہ نیچے رکھا اور سورج کی طرف پشت کر کے کھڑی ہوگئی۔ یوکلپٹس کی چوٹیاں آسمان کی جانب ہل رہی تھیں اور برآمدے پر زرد پھولوں والی ولایتی بیل جھکی ہوئی تھی۔ یہ ستمبر تھا۔ اس نے ملال سے بالوں کی لٹ کو، جو ماتھے پر آ گری تھی، پیچھے کیا۔ پھر سنتھے کی باڑ پر اس کی نظر دوڑنے لگی۔

ہر ایک پودے پر اس نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن آپ سے آپ چلنے والی گولیوں کی طرح وہ ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے پودے پر آگے کی طرف پھسلتی گئی۔ جب باڑ ختم ہونے میں پانچ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے ایک بھرپور اور مخلص کوشش کے ساتھ آنکھوں کو روکا اور سنتھے کے سبز، رس دار، بدمزہ پتوں پر نظریں جما کر کھڑی ہوگئی۔ چند سیکنڈ تک وہ اسی طرح کھڑی رہی، پھر اس نے ایک گہرا پُرسکون سانس لیا۔

باڑ کے پیچھے سبزے پر اٹھارہ بیس نوجوانوں اور بچوں کا ہجوم اس وقت کسی اوٹ پٹانگ کھیل میں مصروف تھا جس میں سبھی لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ بدلتے ہوئے موسم کی خوشگوار گرم دھوپ سبزے پر اور جنگلی سنتھے

کے گھیردار پودوں اور باڑوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں پر پتے زرد ہونا شروع ہو چکے تھے اور فضا میں خزاں کا زرد، مٹیالا رنگ ظاہر ہو رہا تھا۔ ابھی کچھ دنوں میں خزاں کی ہوائیں چلیں گی تو باغبان اور اس کی بیوی بڑی بڑی جھاڑوؤں سے باغ کی روشوں پر خشک پتوں کے ڈھیر جمع کریں گے اور آگ جلائیں گے یا زمین میں دبا دیں گے جو کھاد بنے گی اور موسم بہار کی آمد پر گلاب کی جڑوں میں ڈالی جائے گی۔ خزاں کے بگولے اور کھڑکھڑاتے ہوئے خشک پتے۔ سارے موسم اس قدر خوبصورت ہیں، اللہ۔ جاڑے بھی، جب پچھلے پہر کو ہی شام ہو جاتی ہے اور آتشدان کے قریب محفلیں جمتی ہیں۔ مخملیں سلیپر اور اونی جرابیں اور کوٹ اور کہانیاں اور ریکارڈ اور آتشدان میں لکڑی کے چٹخنے کی آوازیں آتی ہیں اور باہر جاڑوں کی بارش جو بے آواز آہستگی سے گمنام اندھیروں میں دور دور تک گرتی ہے اور قہوہ، اور پھر دس بجتے ہیں اور روشن محل کے قانون کے مطابق سب اپنی اپنی خوابگاہوں کو چلے جاتے ہیں۔ قہوہ اور بارش۔ بھاپ اور بارش۔ سارے موسم۔

اس نے سہم کر باڑ کے پیچھے اس دیوانے، شور مچاتے ہوئے مجمعے کو دیکھا۔ وہ وہاں سے چلی آئی تھی اور اب واپس جانا، اُدھر دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مگر دیکھ رہی تھی۔ کیوں؟ وہ؟ ہشت! کھیلنے اور باتیں کرتے ہوئے گروہ کا شور بڑھ گیا۔ یہ روشن محل کا پچھواڑا تھا جہاں اونچی نیچی کٹی ہوئی گھاس تھی اور بے ترتیب باڑیں تھیں اور گلاب کے چند پودے تھے۔ سامنے والے خوبصورت کٹے ہوئے قطعوں میں انہیں محفلیں منعقد کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہاں روشن آغا کی بڑے پیمانے کی سرکاری دعوتیں، جیسی کل شام پرویز کے سول سروس میں داخل ہونے کی خوشی میں ہوئی تھی، ہوتی تھیں جن میں مشہور وہ معروف لوگ شرکت کرتے تھے اور تقریریں ہوتی تھیں اور سیاست پر گفتگو کی جاتی تھی۔ چنانچہ آج بعد دوپہر، ہمیشہ کی طرح بڑی پارٹی کے بعد ان کی اپنی منظور شدہ چھوٹی پارٹی ہو رہی تھی۔ اسی تقریب کے سلسلے میں، لیکن اس سے کہیں زیادہ مسرت، ہنگامے اور غیر ذمہ داری کے ساتھ، جیسے گائے کے پیچھے پیچھے بچھڑا چلا جاتا ہے۔ وہی پرانے مانوس چہرے تھے، وہی محبوب دوست، وہی پرانی خوشی اور اپنائیت۔ ارشد، گریکسن، شیریں، پرویز، طالع، طلعت، پھر سب کے چچازاد بہن بھائیوں کا ایک گروہ اور چھوٹی نسل کا ہجوم، صرف غیاث پہلی مرتبہ شریک ہوا تھا اور وہ...... وہ، وحید، صاحبزادہ وحید الدین آف رسول پور! وہ سب سے الگ خاموشی سے گھاس پر بیٹھا تھا اور اس کا لمبا جسم باڑ کے پتوں میں سے دکھائی دے رہا تھا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی تھی۔ کیوں؟ کیوں؟''

بلند ہوتے ہوئے شور میں اس کے خیالات کی گاڑی تھم گئی۔

''تمہارا تو کوئی کہنا ہی نہیں مانتا۔ تم کیا مقابلہ کرو گی۔'' ارشد کہہ رہا تھا۔

شیریں درمیان میں ہی بول اٹھی: ''ہمارے میں زیادہ ڈسپلن ہے۔ تم اپنے آدمی سنبھالو۔''

''اچھا تو دو گروپ؟'' ارشد نے للکار کر پوچھا۔

''قطعی۔'' گریکسن نے اسی جارحانہ انداز میں جواب دیا۔

''مقابلہ؟''

''مقابلہ۔''

ارشد نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''کس میں؟''

''تم بتاؤ۔''

''تم بتاؤ۔''

''ہم نہیں بتاتے۔''

''ہم بھی نہیں بتاتے۔ کوئی زبردستی ہے۔'' تھوڑی دیر کے لئے کارروائی رک گئی۔

''لپ اینڈ نوز میں کرلو......'' تماشائی ہجوم میں سے کسی نے تجویز کیا۔

''ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔'' ایک غلغلہ بلند ہوا اور کھلبلی مچ گئی۔ دونوں ٹیمیں آمنے سامنے اکٹھی ہونے لگیں۔ آجاؤ۔ ادھر آؤ۔ یہاں کھڑے ہو جاؤ۔ ارے میاں پینک میں ہو؟ دیکھو۔ نہیں نہیں۔ ہاں ہاں۔ دیا سلائی۔ دیا سلائی کہاں ہے؟ ارے دیا سلائی کوئی آدمی جا کے لاؤ بھائی۔

''مالی......'' شیریں نے آواز لگائی۔ مالی نے بیڑی کنارے کنارے بہتی ہوئی پانی کی نالی میں پھینکی اور دوڑا۔

''دیا سلائی۔''

''ابھی لایا بی بی......'' مالی سُوتی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ مارتا ہوا روشوں پر بھاگنے لگا۔

''دو...... دو۔'' ارشد نے دو انگلیاں ہوا میں ہلائیں۔ ''سیدھی قطار میں کھڑے ہوؤ میاں...... سپورٹس مین شپ کہاں گئی تمہاری۔ ایک ایک فٹ پر۔ ایک ایک فٹ۔'' قیامت کے شور پر قابو پانے کے لئے ارشد چلاّتا ہوا تیزی کے ساتھ قطار کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

سامنے گھاس پر بیٹھے ہوئے وحید کے اوپر کھڑا غیاث اس کا کندھا ہلا رہا تھا۔ ''اٹھو......''

''میں نہیں کھیلتا۔'' وحید نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح کندھا چھڑا کر کہا۔

''ارے واہ۔ کوئی بات ہے! سپورٹس مین شپ سپرٹ کا یہ حال ہے؟ ڈوب مریے۔'' بازو سے پکڑے پکڑے وہ اسے قطار کے سرے پر لے گیا۔

ارشد کرسی پر کھڑا جوش سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ سامنے لڑکیوں کی قطار تھی جس کے آگے شیریں اور گریکسن ہڑبڑائی پھر رہی تھیں اور اپنی کھلاڑیوں کو کھیل کے قوانین ذہن نشین کرا رہی تھیں۔

''خاموش...... خاموش...... بھائیو۔'' ارشد نے دونوں بازو ہوا میں ہلا کر کہا۔ ''دوستو اور بھائیو۔ یہ کھیل کا مقام نہیں، ہماری ناک کا سوال ہے۔''

''بلکہ مقام ہے۔'' ایک لڑکی نے چپکے سے کہا۔

''بالکل درست ہے۔'' پرویز سنجیدگی سے بولا۔ لڑکوں نے تالیاں پیٹیں۔ چند ایک نے ناکوں کو چھو کر دیکھا۔

''خاموش۔ یہ تالیاں پیٹنے کا مقام بھی نہیں، بلکہ رونے کا مقام ہے کہ آج لڑکیاں ہمارے مقابلے پر میدان میں نکل آئی ہیں۔''

''ہیئر ......'' مسرت کے ایک ریلے میں غیاث نے تالی بجائی لیکن فوراً ہی موقع کی نزاکت کا خیال کر کے رک گیا۔ اکلوتی تالی فضا میں ہلکا سا پٹاخہ چھوڑ کر ختم ہو گئی۔ ارشد نے اسے سختی سے گھورا۔ قطار کے سب لڑکوں نے گھورا۔ غیاث انتہائی مسکین شکل بنا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ واقعے کی شدید مضحکہ خیز نوعیت کو محسوس کر کے لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ارشد نے تقریر جاری رکھی۔

''دوستو۔ آؤ ہم عہد کریں کہ آج ہم نظم و ضبط کا بہت بڑے پیمانے پر مظاہرہ کریں گے۔ آؤ ہم ...... آؤ۔'' الفاظ اُس کے ذہن سے غائب ہو گئے۔ دوبار اُس نے کہا ''آؤ۔ آؤ'' کہا جس کے جواب میں قطار میں سے کوئی مستعدی سے بولا۔ ''آ گئے!'' الفاظ کی تلاش میں اس نے مٹھی ہوا میں بلند کی اور چند منٹ تک ہلاتا رہا۔

پھر یک بیک وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان پر انگلی ہلائی۔ ''اور تم۔ سنو۔ تم اپنی تقریر کرو۔ سنا؟'' اس نے نہایت بدتمیزی سے کہا۔

لڑکیوں کی صفوں میں انتشار پھیل گیا اور پھر کرسی کے لئے باؤلی تلاش شروع ہوئی۔ آخر بچوں کے گروہ سے ایک کرسی چھین کر لائی گئی جس کی ایک ٹانگ پارٹی کے ابتدائی دور میں ہی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی ٹانگ جوڑنے اور کامیاب پلیٹ فارم بنانے میں کافی وقت صرف ہو گیا۔

ارشد کی خطابت اب اپنے عروج پر تھی۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر کہہ رہا تھا: ''آج ہم ایک خوفناک چیلنج سے دوچار ہیں۔ آج۔'' کہ ایک لڑکی کی مداخلت سے اس کی تقریر رک گئی۔ لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھ کر اعلان کیا۔

''لڑکیاں کم ہیں۔''

''نہیں پوری ہیں۔''

''نہیں کم ہیں۔''

''پوری ہیں۔ دھاندلی مت کرو۔''

اب تمام لڑکے بادل ناخواستہ متوجہ ہوئے۔ سب نے اپنی اپنی جگہ پر گننا شروع کیا۔ ''ایلس، شیریں، طلعت۔ عذرا کہاں ہے؟''

''کہاں ہے۔''

''ہاں ہاں، کہاں ہے؟''

''کون؟''

''یہی تو پوچھ رہا ہوں۔''

''لاحول ولا قوۃ''

''عذرا کہاں ہے؟ عذرا۔'' کورس بلند ہوا۔ پھر باڑ کے عقب میں عذرا عذرا کی پکار مچی اور کونے کونے میں پھیل گئی۔

''میں ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔ تم کارروائی جاری رکھو۔'' وحید نے جاتے جاتے ارشد کی پیٹھ ٹھونکی۔

اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر شیریں پہلے تقریر شروع کر چکی تھی۔ جب ارشد نے بولنا شروع کیا تو ان کی آوازوں نے مل کر عجب شور پیدا کر دیا جس میں صاف طور سے کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔ مگر اس بات سے بے پرواہ دونوں مخالف ٹیمیں نہایت اعتماد اور وفاداری کے ساتھ سنتی رہیں۔

وہ وہاں سے کیوں چلی آئی تھی؟ کیوں؟ اس نے جھک کر فوارہ اٹھایا' پھر فوراً نیچے رکھ دیا اور کھڑی رہی۔ ابھی ابھی وہ گھاس پر اس کے قریب بیٹھی تھی اور وہ جھک کر اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ ''آہستہ برگ گل بہ فشاں......'' اور اس کی بھاری' نرم آواز اس نے گردن کی جلد پر پھیلتی ہوئی محسوس کی تھی اور اس کے سانس کی نیم گرم بھاپ اس کے گال سے ٹکرائی تھی (اس نے بے خبری میں ہاتھ اٹھا کر گال کو چھُوا) اور وہ دفعتاً بے حد خاموش ہو گئی تھی۔ وہ خوف زدہ تھی۔ کیوں؟ وہ اس قدر دلکش' اس قدر مضبوط' اس قدر نازک تھا۔ ہاں' آنکھوں میں! یہ فی الواقعہ بڑی عجیب بات تھی' لیکن بہر حال تھی۔ کہ دوسری طرف دیکھتے ہوئے اس نے اس کی نظریں اپنے گال میں اترتی ہوئی محسوس کی تھیں اور اس نے اُدھر دیکھنے سے احتراز کیا تھا۔ مگر کچھ ہی دیر میں جب ان تیز' کاٹتی ہوئی نظروں کے نیچے اس کے گال کی جلد کپکپانے اور اس جگہ پر خون اُبلنے لگا تھا تو اچانک بہت زیادہ گھبرا کر اس نے ادھر دیکھا تھا اور دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گائے کے بچے کی سی نرمی اور نزاکت تھی۔ خدایا۔ وہ دوبارہ اسے اپنی طرف جھکتے ہوئے دیکھ کر وہاں سے چلی آئی تھی۔ اپنے تکلیف زدہ دل کے ایک میکانکی اشارے پر کچھ سوچے سمجھے اور محسوس کئے بغیر!

مگر کیا یہ سب ٹھیک تھا؟ وہ جانتی تھی۔ اس نے محبت کا تجربہ کیا تھا اور اس کے دل میں رنج تھا۔ وہ سب جانتی تھی اور اسی لئے اس وقت کی' اس ایک لمحے کی دہشت اس پر سوار تھی۔ اس نے دوبارہ فوارہ اٹھا لیا۔ گلاس کے ننھے پودے کو پانی دیتے ہوئے اپنے نام کی پکار اس کے کان میں پڑی اور اس وقت اپنے تمام گزشتہ رنج کو یکجا کر کے اس نے فیصلہ کیا کہ اب کسی شک' کسی لغزش کی گنجائش نہیں تھی۔

روش پر اسے جانے پہچانے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ''وحید۔ صاحبزادہ وحید الدین آف...... کمبخت!' چھوٹے چھوٹے' تیز مستعد قدموں کے نیچے سرخ بجری چرچرا رہی تھی۔ ان قدموں سے وہ اتنی واقف اور مانوس تھی جتنی وہ روشن آغا اور پرویز اور تقریباً سب دوستوں کے قدموں سے تھی۔ 'آہستہ برگ گل......' جانے کس کا شعر تھا

لیکن وہ اس سے واقف تھی۔ 'میں یہاں سے چلی جاؤں؟ میں بخدا ہرگز یہ نہیں۔ آہستہ برگ گل۔ فوارہ خالی ہو رہا تھا لیکن اس نے پانی دینا جاری رکھا۔ پانی پودے کی جڑوں میں سے بہہ بہہ کر روش پر پھیل رہا تھا۔ ننھے پودے کی پتیوں پر پانی ڈالنے کا عمل اسے بہت بھلا لگا۔ سارے پانی کو وہیں پر ختم کر دینے کی دیوانی خواہش بڑی شدت سے اس کے دل میں پیدا ہوئی اور ایسا کرتے ہوئے ایک عجیب' بے وجہ خوشی کی لہر اس کے وجود پر پھیل گئی اور اس کے کان سنسنانے لگے۔

گردن پر اسی جگہ اس نے اس کے سانس کی بھاپ کو محسوس کیا۔ ''عذرا بیگم آپ کیوں چلی آئیں؟''

''میرا گلاب سوکھ رہا تھا۔ صاحبزادہ صاحب۔'' اس نے اسی اخلاق سے جواب دیا۔

دونوں ہنس پڑے۔ عذرا نے فوارہ نیچے رکھ دیا۔

وحید نے جوتے کی نوک سے پانی کو چُھوا۔ ''ابھی ابھی میں اس سبزے کو دیکھ رہا تھا جس پر تم بیٹھی تھیں۔''

''اچھا......'' عذرا نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''میں نے اسے چُھوا تو وہ ابھی تک گرم تھا اور اس میں سے تمہاری خوشبو آ رہی تھی۔''

''اوہ۔'' وہ ہنسی۔

''تم نے کبھی سبزے کو دیکھا ہے۔'' ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وحید نے پوچھا۔ ''جس پر سے کوئی اٹھ کر گیا ہو؟''

''ایں؟ نہیں۔''

''اس کی ایک ایک پتی آہستہ آہستہ اٹھتی ہے اور جانے والے کے جسم کی حرارت اور خوشبو چھوڑتی ہے۔ سبزے کی عجیب خاصیت ہوتی ہے۔ دن بھر اس کو آنے جانے والے روندتے رہتے ہیں لیکن اس کا ایک ایک تنکا' ایک ایک پتی سر اٹھاتی ہے اور بڑھتی ہے۔ ہمیشہ۔ ہمیشہ۔''

باڑ کے پیچھے بیک وقت ارشد اور شیریں کی تقریروں سے فضا گونج رہی تھی اور مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ دونوں سرخ راستے پر آتے اور جاتے رہے۔

''کس قدر ہنگامہ کر رہے ہیں یہ لوگ۔'' عذرا نے خوش دلی سے کہا۔

''ہنگامہ ہنگامہ۔'' وہ اکتاہٹ سے بولا۔ ''لڑکیوں میں وہ ایک چیز اررر...... وہ جسے انگریزی میں 'گریس' کہتے ہیں' ہونی چاہیے۔''

''ایں؟ لپ اینڈ نوز؟'' عذرا نے باڑ کے پار دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھو عذرا تم نے بے چارے پودے کو اتنا پانی دے دیا کہ پتیوں پر ابھی تک بوندیں رکی ہوئی ہیں۔ یوں جیسے ان کے ساتھ چھوٹی چھوٹی آنکھیں لگی ہوں۔''

عذرا اس کی طرف دیکھ کر تمسخر سے مسکرائی اور یک بیک پلٹ کر چلنے لگی۔ وہ تیز تیز قدم رکھتا ہوا اس سے آملا۔

''میں کبھی اندازہ نہیں کر سکا کہ ابھی اگلے لمحے تم کیا کرنے والی ہو۔'' اس نے ہوا میں ہاتھ پھیلایا۔

''کدھر کو جانے والی ہو' کیا کہنے والی ہو۔ یہ تمہاری شخصیت ہے۔ پتہ نہیں کیوں عذرا' پر یہ سچ ہے کہ...... میں سمجھتا ہوں کہ تم بڑی عجیب وغریب لڑکی ہو۔''

''پتہ نہیں کیوں وحید۔'' عذرا نے اسی لہجے میں کہا۔ ''پر یہ سچ ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم بہت باتیں کرتے ہو۔''

''ٹھہرو عذرا۔ میری بات سنو۔''

وہ اس کے لہجے کو محسوس کر کے ٹھٹک کر رک گئی۔

''ہم ایک دوسرے کو اتنے عرصے سے جانتے ہیں۔ اتنے عرصے سے ایک دوسرے سے واقف ہیں' ان راستوں سے...... واقف ہیں۔''

گھبراہٹ میں عذرا نے راستے سے اتر کر سبزے پر قدم رکھا۔

''میں اررر...... اپنے آپ کو بہتر محسوس کرتا ہوں جب۔ تم سے ملتا ہوں۔ اس کا مطلب سمجھتی ہو کیا ہے۔ تم......''

وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ وحید وہیں کھڑا جھلملاتی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا' پھر وہ بھی ان میں جا ملا۔

کھیل کا مقابلہ شروع تھا۔ چند لمحے تک وہ گم سم کھڑی رہی۔ رنج اور تمسخر کے شدید احساس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ایک انجانی خوشی بھر گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ پورے زور کے ساتھ چیخے اور وہ گلا پھاڑ کر چلائی۔ ''شاباش...... شاباش۔''

(یہ اوپری متوسط طبقے کے ہندوستان کی وہ خوش تربیت' صحت مند نسل تھی جو انگریزی درسگاہوں میں تعلیم پا رہی تھی یا پا چکی تھی اور دن بدن پھیلتی جا رہی تھی۔ لیکن جن برسوں کی ہم بات کر رہے ہیں اس وقت یہ لوگ تعداد میں ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والے کروڑوں کسانوں' مزدوروں اور محنت کش طبقے کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھے اور شہروں سے باہر اپنے کھلے' ہوادار مکانوں میں رہتے تھے۔)

سونے سے پہلے عذرا نے مشرقی دریچے کے پٹ کھولے اور دور دور تک پھیلی ہوئی رات کو دیکھا۔ یوکلپٹس کے پتے ہوا میں ہل رہے تھے۔ وہ دریچے کے پتھر پر بیٹھی ان کی ہلکی خوشبو (جس کے ساتھ قطعی طور پر زکام کا خیال شامل تھا) کو سونگھتی رہی۔ برآمدے میں کسی نوکر کے گزرنے کی چاپ سنائی دی۔ دس بج گئے' اس نے سوچا۔ وہ سہم کر اٹھی اور دریچہ بند کر کے پردہ ہموار کر دیا۔ گزرے ہوئے دن کی مسرت ابھی تک اس کے اعضا پر موجود تھی۔ اس نے تپائی کا سبز لیمپ جلایا اور بڑی بتی گل کر کے بستر میں گھس گئی۔ لیٹے لیٹے اس نے دیکھا کہ کارنس پر پڑی ہوئی تمام چیزوں پر گرد کی تہہ جم رہی تھی۔ وہ اٹھی اور اپنے رات کے لباس سے رگڑ کر انہیں صاف کرنے لگی۔ کانسی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے اور ہاتھی۔ سفید پتھر کا تاج محل۔ چینی کے گلدان۔ خشک پھولوں کو نکال کر اس نے آتشدان میں پھینکا۔ سنہری فریم میں سے جھانکتی ہوئی روشن آغا کی تصویر۔ پھر اس کی نظر اپنے سازوں

پر پڑی۔ اس نے آہستہ سے دو انگلیاں سازوں پر رکھیں' پھر اردگرد چھائے ہوئے گمنام' نازک سکوت کو توڑ دینے کے ڈر سے فوراً اٹھا لیں۔ وہ اس مقدس خاموشی کو توڑنا نہیں چاہ رہی تھی۔ کسی بھی شئے' کسی بھی احساس کو جو اس وقت ظاہر تھا اور جم چکا تھا' وہ بکھیرنا نہیں چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ دن جو گزر چکا تھا' اپنی طرف سے اسے ختم کرتے ہوئے وہ ڈر رہی تھی اور اسے جاری رکھنے کے لئے مصروفیتیں تلاش کر رہی تھی' تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کو پکڑنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ کل کا دن شاید کچھ بھی ساتھ نہ لائے۔ اس نے سوچا۔ آج کا یادگار دن' یہ لمحہ' یہ لحظہ' یہ پل' کس قدر تیز رفتار ہے۔ تیز اور مسرور۔ آہستگی سے اس نے سازوں کو جھاڑا اور واپس آ گئی۔ الماری میں اس کی کتابیں بھی گرد آلود تھیں...... پھر ایک اچانک خیال سے کہ اندھیرا پھیلنے سے وقت کی اڑان تھم جائے گی ہاتھ کی ایک جلد باز جنبش سے اس نے میز کا لیمپ گل کر دیا۔ مگر اسی لحظے اور اس سے اگلے لحظے' اور اس سے اگلے' اس نے رات کے گزرنے کی سرسراہٹ کو صاف طور پر سنا اور اپنے احساس کی شدت پر دل میں تعجب کیا۔ اسی جلد بازی کے ساتھ اس نے لیمپ جلایا اور مدھم سبز روشنی میں کارنس پر چمکتی ہوئی چیزوں کو خوشی سے دیکھا۔ بیک وقت بے چینی اور سکون جو اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا اس کے زیر اثر اس نے لیمپ بجھایا اور جلایا' بجھایا اور جلایا۔

ان گنت بار ایسا کرنے کے بعد آخر کار دن بھر کی تھکاوٹ نے اسے خود بخود سلا دیا۔ بڑھتی ہوئی رات میں لیمپ صبح تک جلتا رہا۔

(۱۶)

شروع ماگھ میں ایک روز بہت سویرے نعیم شیشم کے اس پیڑ کے نیچے پہنچا جہاں سے روشن پور کے کھیت شروع ہوتے تھے اور آنے والوں کو پہلی مرتبہ گاؤں کے درخت اور دیواریں دکھائی دیتی تھیں۔ ملگجی روشنی میں اس نے دھوئیں اور دھند میں لپٹے ہوئے اس پرانے' محبوب گاؤں کو دیکھا اور اس کا دل یکبارگی دھڑکنے لگا۔ مشرق کی طرف ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ گیہوں اور چنے کی فصلوں پر ماگھ کی دھند دور دور تک تیر رہی تھی اور کھیتوں کی لکیریں کہرے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان ساری آباد اور غیر آباد زمینوں پر تیز سرد شمالی ہوا چل رہی تھی۔ وہ میلا لمبا کوٹ' گرم فوجی ٹوپی اور بڑے فوجی بوٹ پہنے شیشم کے قدیم' سیاہ تنے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ پھر بھی ہوا اس کا کوٹ اڑا کر ٹانگوں میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کڑاکے کی سردی میں بھی دس کوس پیدل چلنے کے بعد اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جھک کر پتلے شیشے کا سا کہرے کا ٹکڑا اٹھایا اور منہ میں رکھ کر چوسنے لگا۔ پھر وہ اس وقت تک کھڑا محبت' افسردگی اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ گاؤں کو دیکھتا رہا جب تک کہ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے اسے چلنے پر مجبور نہ کر دیا۔

بوٹوں پر لگے ہوئے کہرے اور کیچڑ کو تنے سے رگڑ کر صاف کرنے کے بعد وہ دوڑتا ہوا اسے چھوٹے

سے ٹیلے پر سے اترا اور جانے پہچانے کھیتوں میں داخل ہوا۔ خاموش' منجمد صبح میں بھاری بوٹوں کے نیچے کہرے کے ٹوٹنے کی آواز بلند ہونے لگی۔ اس نے گیہوں کی چند نرم پتیاں توڑ کر منہ میں رکھیں اور چبانے لگا۔ ''ابھی یہ کچھ نہیں کہتیں۔ پھاگن میں زبان کو کاٹنے لگیں گی۔'' سبز تھوک نگلتے ہوئے اس نے سوچا۔ ''احمد دین نے اس دفعہ پھر دیر میں بیائی کی ہے۔''

اگلے کھیت میں' اور اس سے اگلے میں اسے چند کسان ملے جو منہ اندھیرے ہل کندھوں پر اٹھائے بیلوں کے پیچھے پیچھے نکل آئے تھے۔ نعیم کوٹ کا کالر کھڑا کئے' ٹوپی میں منہ چھپائے خاموشی سے ان کے پاس سے گزر گیا۔ اس نے سب کو پہچانا۔ گرو۔ دینا ناتھ۔ کرم سنگھ۔ امام دین پہلوان۔ یہ وہی پرانے لوگ تھے جن سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ وہ سب حقوں سے منہ ہٹا کر غیر مانوس لباس والے اُس راہگیر کو دیکھتے ہوئے گزر گئے۔ صرف امام دین نے اسے دیکھ کر کمبل لپیٹتے ہوئے کہا: ''سن چودہ میں ایسا جاڑا آیا تھا۔'' پھر نعیم کو خاموشی سے گزر کر جاتے ہوئے دیکھ کر بیلوں کو مخاطب کر کے بولا: ''نیاز بیگ کے لونڈے کی طرح چلتا ہے۔'' نعیم کا جی چاہا کہ رک کر اس سے بات کرے' لیکن ہوا کے دھکوں کے نیچے چلتا رہا اور بات کئے بغیر ہی اس نے اپنے آپ کو حیرت انگیز طور پر مطمئن اور مسرور پایا۔ گنے کی فصل زیادہ تر کاٹی جا چکی تھی۔ کہیں کہیں دو دو چار چار مرلے کھڑی تھی۔ ''شاید شکر بنا رہے ہیں۔'' جیب سے ہاتھ نکال کر اس نے ایک گنے کو چُھوا۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتا ہوا وہ جوہڑ کے کنارے پر آ نکلا۔ چلتے چلتے اس نے ایک کنکر اٹھا کر جوہڑ کی سطح پر پھینکا۔ پتھر کے کہرے کے ساتھ ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی اور کنکر وہیں پڑا رہا۔ نعیم نے رک کر حیرت سے پانی کی سطح کو دیکھا اور ایک بڑا پتھر اٹھا کر پھینکا۔ اب کے کہرے کے ٹوٹنے اور پتھر کے پانی میں ڈوبنے کی آواز جوہڑ کی خاموش سطح پر سے اٹھی اور اس نے لہروں کو کہرے کے نیچے دور دور تک پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ ''میں نے تمہارے لئے رستہ بنا دیا ہے۔ مچھلیو......'' اس نے خوشی سے دل میں کہا۔

جوہڑ کے کنارے پر اکلوتا گھر دیکھ کر اسے مہندر سنگھ کی یاد آئی اور پھر کتنے ہی مردہ دوستوں کی یاد جو اس کے ساتھ روشن پور سے روانہ ہوئے اور لوٹ کر نہ آئے۔ اس نے ٹانگوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس کی اور کندھے جھکائے وہاں سے گزر گیا۔

رستے کے موڑ پر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے مغلوں کا گھر تھا۔ اس کا اپنا گھر ''لیکن...... اوہ۔'' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نزدیک گیا۔ دروازے پر شیشم کی لکڑی کا کواڑ تھا جس پر خوش نمائی کی خاطر بے شمار لوہے کی کیلیں گاڑی گئی تھیں۔ دیوار پکی سرخ اینٹوں کی تھی' جیسی روشن آغا کی حویلی کی تھی۔ دیوار کے اوپر سے پکے مکان کا چوبارہ نظر آ رہا تھا۔ دو دفعہ نعیم نے آہستہ آہستہ دروازے پر ہاتھ رکھا اور اٹھا لیا۔ ''دو برس......'' اس نے سوچا۔ ''اس عرصے میں کیا نہیں ہو سکتا! میرا باپ زندہ ہے؟ یہ کس کا مکان ہے؟''

وہ دیر تک وہیں کھڑا کندھے دیوار کے ساتھ رگڑتا اور زمین پر پاؤں مارتا رہا حتیٰ کہ دن کا اجالا سارے

میں پھیل گیا اور جوہڑ کی سطح پر کہرا پھیلنے لگا۔ اس وقت ساتھ والے گھر کے بے کواڑ کے دروازے سے ایک بیل کا سر نمودار ہوا۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس نے بوڑھی مشکوک نگاہوں سے نعیم کو دیکھا۔ نعیم نے ٹوپی ماتھے پر اونچی کر کے اسے سلام کیا۔

''باہ ...... آہا آہاہا......'' بوڑھے ہمسائے نے دونوں ہاتھ پھیلا کر حیرت اور مسرت کے مارے منہ کھولا اور دھوئیں اور بھاپ کا ایک بادل چھوڑا۔ ''نیاز بیگ کا بیٹا ہے تو؟ تو کب آیا؟ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' وہ نوجوانوں کی سی پھرتی سے چھلانگ لگا کر بیل پر سے اتر آیا اور نعیم کی آستین کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا۔ ''ابھی آ رہا ہے؟ کلکتے سے؟ تو تو موٹا ہو گیا ہے۔''

پھر وہ اس کا بازو چھوڑ کر دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنے لگا: ''نیاز بیگ! ابھی تک سو رہا ہے بڈھے انیچی۔'' وہ چلایا۔ ''دیکھ تیرا بیٹا آیا ہے۔ باہر کھڑا ہے کب سے۔ تیرا بیٹا جس کے کراس کی زمین سے اس دفعہ من من کا تربوز اترا اور جس کے اناج سے تو نے محل کھڑا کیا ہے اور جس کے سبب تو چوہدری بن گیا ہے، وہ باہر آیا ہے۔ اور تو نے گھوڑی بھی نہیں بھیجی؟ ایسا جاڑا پڑ رہا ہے۔ تو نے آگ جلائی ہے؟ اب عورتوں کا پیچھا چھوڑ کر باہر آ۔''

پھر دروازہ پیٹنا اور چلانا چھوڑ کر وہ مڑا اور اس کے کوٹ کے بٹن مروڑتے ہوئے بولا: ''میں نے کئی بار تمہیں پوچھا۔ تم کلکتے میں تھے۔ میرا بیٹا مارا گیا ہے۔ اب سب کے بیٹے میرے بیٹے ہیں۔ اور تمہیں پالا تو نہیں لگ گیا؟ بولتے کیوں نہیں۔ تھ تھ تھ۔ ایک دفعہ مجھے بھی پوس کی ایک رات سفر میں آ گئی تھی تو تین روز تک میں بول نہ سکا۔ میری زبان اکڑ گئی تھی۔''

نعیم نے ہنس کر اسے یقین دلایا کہ وہ بات کر سکتا تھا۔ ''مگر مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

شیشم کی لکڑی کا میخوں والا دروازہ چرچرایا اور اس نے اپنے باپ کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی احمد دین کے منہ سے پھر ملامت آمیز الفاظ کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر نیاز بیگ نعیم کو دیکھتا رہا اور نعیم نے دیکھا کہ دو برس کے عرصے میں اس کا باپ بہت بوڑھا ہو گیا تھا کہ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا منہ کھل گیا اور نچلا جبڑا تیزی سے کانپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد باپ اور بیٹے نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نیاز بیگ نے باہر نکل کر اس کے ماتھے کو اور داڑھی کو اور گردن اور کوٹ اور اصلی اور نقلی ہاتھوں کو چوما۔ ساتھ ساتھ وہ مبہم سی آوازیں نکالتا گیا جو گونگے آدمی کی ان آوازوں سے مشابہ تھیں جو وہ خوشی کے وقت یا باتیں کرنے کی کوشش میں حلق سے نکالتا ہے۔ شور سن کر آس پاس کے گھروں سے عورتیں اور لڑکے باہر نکل آئے اور کھڑے ہو کر باپ بیٹے کے ملنے کا تماشا دیکھنے لگے۔ اندر جانے سے پہلے نعیم نے ارد گرد نظر ڈالی۔ دیکھنے والوں نے نظریں جھکا لیں۔ روشن آغا کے بعد وہ پہلا شخص تھا جس کا احترام کرنا گاؤں والوں نے سیکھا تھا۔

گھر کے اندر نعیم کی ماں اپنی پرانی عادت کے مطابق اونچی آواز سے رو رہی تھی۔ اس نے حیرت سے دیکھا کہ اس کی ماں پر ان برسوں کا بہت کم اثر ہوا تھا۔ اس کے بال سیاہ اور جلد ملائم اور چکنی تھی۔ وہ اسے گھیر کر

اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔ پکے فرش کو پار کرتے ہوئے نعیم نے چھوٹی عورت کو دیکھا جو پانچ سال کے علی کو لئے اپنے دروازے میں کھڑی تھی۔

کمرے میں داخل ہو کر نعیم فرش پر پاؤں مارتا ہوا بولا: ''میرا خون جم گیا ہے۔''

''آگ لا کمبخت۔'' نیاز بیگ بڑھیا پر چیخا۔ ''اور اب ہو ہو بند کر۔ جانتی نہیں سن چودہ کے بعد بس اب کے سال جاڑا پڑا ہے۔ ہو ہو ہو......'' وہ اپنی بیوی کی نقل اتارنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد نعیم کوٹ اور ٹوپی اتار کر سرخ کوئلوں کے آگے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھینس کے گرم دودھ کا کٹورا اور سرخ گیہوں کی روٹی تھی اور وہ سردی سے اکڑے ہوئے جبڑوں کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔

''یہ سب تمہاری زمین کا ہے۔'' نیاز بیگ اسے بتا رہا تھا۔

''میری؟'' دودھ اور روٹی چباتے ہوئے نعیم بے دھیانی سے بولا۔

''ہاں۔ آخر کر اس کی زمین تھی۔ ان دو برسوں میں اتنا پھل پڑا' اتنا پھل پڑا کہ میں نے یہ سب بنایا اور نور پور کے دس کسانوں کو بیج کے لئے اناج دیا اور ابھی تک کوٹھی بھری رکھی ہے۔ جب تم سو کر اٹھو گے تو سب دکھاؤں گا۔ یہ فرش اور چوبارہ اور دیواریں میں نے خود بنائی ہیں اور ایک جوڑی (بیل) جاٹ نگر کے چوہدریوں سے خریدی ہے۔ جب میں جیب میں رقم ڈال کر جاٹ نگر جانے لگا تو لوگوں نے کہا چوہدریوں کے ہاں خریدار بن کر جانا کوئی مذاق نہیں۔ سنبھل کر جانا۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا تو انہوں نے عزت سے تمہارا نام لیا اور مجھے اپنے پاس بٹھایا۔''

''ایسی چادریں ہمارے پاس گیارہ اور ہیں۔'' اس کی ماں نے خوشی سے بستر کی چادر کو چھو کر کہا۔

''تو بیچ میں مت بول۔'' نیاز بیگ نے اس پر انگلی ہلائی۔ ''سارے گاؤں کو پتہ ہے۔ گیارہ اور ہیں۔''

نعیم نے برتن خالی کر کے زمین پر رکھ دیا اور آستین سے منہ صاف کیا۔ اس وقت علی جو بے آواز قدموں سے اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا' پیچھے سے نکل کر بولا: ''میرے لئے شہر سے کیا لائے ہو؟''

نعیم نے بچے کی اداس' معصوم آنکھوں میں دیکھا اور اس کے دل میں شدید کم مائیگی کا احساس پیدا ہوا۔ اس نے منہ پھیر کر دل میں گالی دی۔

''میں شہر نہیں گیا تھا۔'' اس نے علی کے گال کو چھوڑ کر کہا۔

''جاؤ جاؤ۔ تنگ مت کرو۔ تھکا ہوا ہے۔ اسے آرام کرنے دو۔'' نیاز بیگ نے ہاتھ سے لڑکے کو پرے دھکیل دیا۔ پھر کندھے سے پکڑ کر کھینچتا ہوا نعیم کو باہر لے گیا۔

''یہ مشکی بیل اس علاقے میں دور دور تک مشہور ہے۔ اسے کھولنے کے لئے تین دفعہ چور آئے تھے۔ پھر میں نے دروازے میں میخیں ٹھونک دیں۔ یہ سب میں نے اپنے ہاتھ سے ٹھونکی ہیں۔ میں نے کام کرنا نہیں چھوڑا۔ خود بیائی کرتا ہوں' فصل کاٹتا ہوں۔ جب ہاتھ سے کچھ نہ کرو گے تو کیا پاؤ گے۔'' اس نے فخر سے دونوں ہاتھ

پھیلائے۔ سوکھی جلد میں سے لکڑی کی طرح سخت اور خشک ہڈیوں کے جوڑ ابھرے ہوئے تھے۔ ''یہ کھلیان بھی میں نے بنایا ہے۔ آؤ اناج دیکھو۔'' اس نے اناج والے کمرے کا تالا کھولا۔ نعیم نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہوگئی تھیں اور چلتے ہوئے اسے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔

''بابا، تم بہت بوڑھے ہوگئے ہو۔'' نعیم نے ہنس کر کہا۔

نیاز بیگ کی آنکھوں میں یکبارگی دہشت کی جھلک آگئی۔ وہ اس سوال کا متوقع تھا۔

اس نے منہ پھیر کر گیہوں کی مٹھی بھری اور مصنوعی سخت لہجے میں بولا: ''میں کسی کے لئے عورتوں کی طرح نہیں روتا۔ میں کام کرتا ہوں۔ میں نے مکان بنایا ہے۔ محنت سے انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔''

لیکن نعیم نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے اور مکان بنانے کے باوجود بیٹے کے صدمے نے اسے ختم کر دیا ہے۔

جب دھوپ گاؤں کی گلیوں میں داخل ہوئی اور کھیتوں کا کہرا پگھل کر زمین میں جذب ہوگیا تو وہ کوئلوں کی آگ سے گرم کئے ہوئے کمرے میں گھس کر سوگیا۔

وہ سو کر اٹھا تو دھوپ ڈھل چکی تھی اور نیاز بیگ صحن میں گھوڑی کو لٹائے نعل ٹھونک رہا تھا۔ نعیم کو دیکھ کر بولا: ''دو مرلے گنا رہ گیا تھا، آج سارا چھیل دیا ہے۔ رات کو آخری کڑاہ چڑھے گا۔ بیالیس من گڑ رکھ لیا ہے۔ اساڑھ میں بیچوں گا جب بھاؤ چڑھے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔''

گھوڑی کے نعل ٹھونک کر وہ دونوں گنا ڈھونے کے لئے روانہ ہوئے۔ کھیتوں کے بیچ بیچ نیاز بیگ آگے آگے چلتا ہوا مستقل باتیں کرتا رہا۔ اس نے ہر ایک کھیت کے کاشتکار کی کاہلی اور کام چوری کے قصے سنائے اور پچھلے دو برس میں جو جو فصلیں ان کے کھیتوں میں سے اتریں ان کا اپنی فصلوں کے ساتھ مقابلہ کر کے بتاتا رہا۔

گاؤں سے باہر نکل کر نعیم کی نظر غیر ارادی طور پر مغربی کونے کی جانب اُٹھ گئی۔ وہ پھونس کی چھت والا ایک کمرے کا مکان تھا جس کے احاطے کی شکستہ دیواریں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ نعیم نے چلتے چلتے خفیف سی جھرجھری لی اور نظریں چرا لیں۔

''یہاں سے ہماری زمین شروع ہوتی ہے۔'' نیاز بیگ نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔ ''تم ایک قدم ایسی جگہ پر نہیں رکھ سکتے جہاں فصل کی جڑ نہ ہو۔ آ...... ہم۔ میرے گنے کو دیکھنے کے لئے سارا جاٹ نگر پل پڑا تھا۔''

نعیم کو گنوں پر کام کرتی ہوئی تین لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اس نے پھر ہاتھ پھیلایا۔

''آ...... ہا ہا...... یہ احمد دین کی بہو ہے، یہ بیٹی ہے۔ اس کی کٹائی ختم ہوگئی ہے۔ محنتی لڑکیاں ہیں۔ ہمارے گھر میں اب ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے۔'' وہ نعیم کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔ ''اور تو...... تو کون ہے؟''

تیسری لڑکی جو تیز معلوم ہوتی تھی سفید سفید دانت نکال کر ہنسی۔ ''میں رحمو کی بیٹی ہوں۔ تم نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے چچا؟''

نیاز بیگ کھسیانا ہو کر پاؤں پٹکنے اور ان کے گرد گھومنے لگا۔ ''کام کرو۔ جوان لڑکیوں کو زیادہ بولنا نہیں چاہیے۔''

لڑکیاں جو نوجوان اور صحت مند تھیں ہنسیں، نعیم کو دیکھ کر شرمائیں اور پسینے سے نم گالوں اور چھاتیوں کے ساتھ کام میں جٹ گئیں۔ وہ گنے چھیل رہی تھیں۔

رات کو مویشیوں کے احاطے میں گڑ کا کڑاہ چڑھا، جیسے ہر روز رات کو چڑھتا تھا۔ نیچے گنے کے چھلکے کی آگ جلائی گئی۔ نئے بیل جوتتے ہوئے نیاز بیگ نے ایک بار پھر ان کی تعریف کی اور جاٹ نگر کے چوہدری کا قصہ دہرایا۔ گاؤں کا ایک نوجوان جولاہا بیلنے پر آ بیٹھا تھا اور چھیلے ہوئے گنے اس میں دے رہا تھا۔ ایک اور نوجوان تھوڑے تھوڑے وقفے پر رس نکلے ہوئے گنے کا گودا اُٹھا کر سوکھنے کے لئے پھیلا دیتا اور خشک گودا آگ میں جھونک دیتا۔ تیسرا نوجوان رس کے بھرے ہوئے گھڑے اٹھا اٹھا کر کڑاہ کے پاس قطار میں رکھتا جا رہا تھا۔ نیاز بیگ کھڑا ابلتے ہوئے رس میں لکڑی ہلا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ بھنڈی تری کی جڑوں کا رس کڑاہ میں نچوڑتا جس سے گڑ کا میل کٹ کر اوپر آ جاتا۔ لکڑی کے چمچے سے میل اتار کر وہ پھر لکڑی ہلانے لگتا۔ جوش کھاتی ہوئی رس کی میٹھی، گرم خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ نیاز بیگ بولتا جا رہا تھا۔

''منڈی کے سارے گڑ کے سوداگر میرا نام جانتے ہیں۔ پچاس گاؤں کا گڑ رکھ دو، میرے گڑ کو یوں پہچان لیں گے جیسے اس پر میرا نام لکھا ہو۔ سوڈے کی ایک چٹکی نہیں ڈالتا۔ اور لٹھے کا سا سفید گڑ نکالتا ہوں۔ بھنڈی کی کیا بات ہے، ساری کرامات ہاتھ کی ہے۔''

عام دستور کے مطابق گاؤں کے کئی نوجوان، جن کی اپنی فصل نہ تھی، وہاں جمع تھے۔ دن بھر کا کام ختم کرنے کے بعد اس وقت وہ آگ سے اپنے آپ کو گرم کرنے اور گڑ کھانے کے لئے آ بیٹھے تھے اور نیاز بیگ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور گپیں مار رہے تھے۔ کسانوں کے سادہ اکھڑ مذاق، گاؤں کی لڑکیوں اور اپنے معاشقوں کی باتیں اور دن بھر کی اور کئی چھوٹی موٹی خوشی اور غم کی باتیں، اور کہانیاں، چاند کی اور ستاروں کی اور رات سے متعلق ہر ایک چیز کی توہمات سے بھرپور کہانیاں، اور گانا۔ بیلنے والے نوجوان نے گانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے بیلنے میں گنے دیتا جا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ کان پر رکھے منہ چاند کی طرف اٹھائے گا رہا تھا۔ وہ چاند کے اور محبوب لڑکی کے بارے میں ایک دیہاتی گیت تھا۔ نعیم نے سوچا کہ یہ گیت صرف رات کا گیت تھا۔ سرد رات میں گانے والے کی بھاری، بے فن آواز فضا میں جمی ہوئی چاندنی کو توڑتی ہوئی دور تک جا رہی تھی اور سننے والوں کے دلوں میں بیٹھ جاتی تھی۔ سیدھی سادی دیہاتی آوازوں میں لچک اور لہراؤ کی کمی کے باوجود اس قدر گہرائی اور وزن ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ سب سے الگ چھلکے کے ڈھیر پر بیٹھا پاس سے گزرتے ہوئے بیلوں کو ہر پھیرے پر چھڑی جماتا جا رہا تھا۔

ایک پہر رات گزر چکی تھی جب شیشم کا میخوں والا دروازہ چرچرایا اور ایک شخص کمبل میں لپٹا ہوا اندر داخل ہوا۔ آگ کی روشنی میں آنے پر نعیم نے ماسٹر کا چہرہ پہچانا اور اس کے جسم میں انجانے خوف کی جھرجھری پیدا ہوئی۔ چند نوجوانوں کے سلام کا جواب دے کر اور نیاز بیگ کی سنی ان سنی کر کے وہ نعیم کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''میں نے سنا تھا تم آ گئے ہو۔'' اس نے بیلوں پر چند چھلکے پھینکتے ہوئے کہا۔

نعیم خاموش رہا۔

''دو سال..... کیا کرتے رہے؟''

''کام۔'' نعیم نے مختصراً جواب دیا۔

''کہاں؟ کہاں؟''

''نو.....''

''نو کیا؟'' ماسٹر نے بیتابی سے پوچھا۔

''نو جگہوں پر۔ مجھے نام یاد نہیں رہے۔''

''کام بنا؟''

''چند ایک جگہ پر بنا۔ باقی میں تو خفت ہی اٹھانی پڑی۔''

''اوہ.....'' وہ اداسی سے بولا۔ ''خفت تو ہوتی ہی ہے۔ خفت۔ عزیز دوست' آزادی اور فتح سے پہلے ضرور آتی ہے۔ خفت طاقت ہے' طاقت جو کمزوری سے پیدا ہوتی ہے۔ جو کم مائیگی کے احساس سے۔'' باتیں کرتے کرتے اس نے سر اٹھایا اور نعیم کی آنکھوں میں شدید کھچاؤ دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ ''اوہ..... ان باتوں کا یہ وقت نہیں۔''

''مجھے ان باتوں کی کوئی خواہش نہیں۔'' نعیم نے تیزی سے کہا۔ ماسٹر نے اس کے چہرے پر برہمی کے آثار کو تعجب سے دیکھا اور خاموش بیٹھا گنے کے چھلکے کو انگلیوں میں مروڑتا رہا۔ بیلنے پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے پھر گانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی اونچی جاندار آواز رات کے سناٹے میں نعیم نے جیسے بہت دور سے سنی اور اس کے دل میں گانا سننے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ گیت' جس میں محبوب لڑکی کا ذکر تھا اور گیہوں اور مکئی کے کھیتوں کا' اور گھوڑوں' شاہسواروں' کبڈی کے کھلاڑیوں اور نوجوانوں کے ناچ کا اور محبت کے غم کا اور محبوب مردوں کی موت کا ذکر تھا آدھی رات کا گیت: جس میں ماگھ کی سرد چاندنی کی تمام تر موسیقی گھلی ہوئی تھی' جس میں زندگی کی کتنی ہی چھوٹی بڑی مسرتیں تھیں جن سے وہ اتنا عرصہ محروم رہا تھا۔

ماسٹر نے آنکھوں کے کونوں میں سے نعیم کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اب کہاں جاؤ گے؟''

''اب میں کہیں نہیں جا رہا۔ یہیں رہوں گا۔''

دیر تک وہ خاموش بیٹھے گویے کی آواز سنتے رہے اور مٹی کے آبخوروں میں سے مکھن ملا گرم گرم گڑ کھاتے رہے جو نیاز بیگ نے ان کو دیا تھا۔ ''جس گھوڑے کو اس کا ایک آبخورہ کھلا دو وہ چاروں پاؤں پر اٹھ کر یہ دیوار پھاند جائے گا۔ اس نے کہا تھا۔'' کھاؤ۔ سن چودہ کے بعد اتنا جاڑا......''

گڑ سے لتھڑی ہوئی انگلیاں صاف کرتے ہوئے ماسٹر پھر بولا: ''تمہارے بعد بہت لوگ تمہیں پوچھنے آئے۔''

''کون تھے؟''

''ریوینیو کے اور پولیس کے۔''

''پھر؟''

''چوہدری کہتا رہا تم کلکتے گئے ہوئے ہو۔ جب وہ اتا پتا پوچھتے تو کہتا: 'اتنا سا تو شہر ہے۔ جا کے خود ڈھونڈ لو۔'

نعیم ہنسا۔ ''بابا اس معاملے میں ہوشیار ہے۔''

گانے کے سُر بڑھتی ہوئی رات میں چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ ماسٹر نے جو بظاہر گیت سے بے خبر بیٹھا تھا' پیالہ رکھا اور اداس مگر مضبوط آواز میں بولا۔

''ایک نئی مصیبت کھڑی ہوئی ہے۔''

''کیا؟''

''ہندو مسلم سوال۔''

''اوہ......''

''دلّی میں فساد ہوئے ہیں۔ مسجد کے آگے باجا بجانے پر' گئوکشی پر' اب یہاں پر بھی کچھ لوگ آ گئے ہیں' جو ان چیزوں کو ہوا دے رہے ہیں۔''

نعیم کا جی چاہا کہ ان لوگوں کے متعلق کچھ پوچھے لیکن اس موضوع سے اسے جو ہچکچاہٹ اور نامعلوم سی دہشت تھی اوپر آ گئی اور وہ چپکا بیٹھا رہا۔

''یہ چیزیں صحت مند تحریکوں کو تباہ کر دیتی ہیں۔'' ماسٹر نے پھر بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اسے زیادہ دیر تک نہ کھینچ سکا اور بات جلد ہی ختم ہوگئی۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماسٹر نے اپنا بڑا سا بے تکلف ہاتھ بڑھایا۔ نعیم نے بے دلی سے مصافحہ کیا۔

''خفا مت ہونا' ماسٹر۔ میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔ میں نے اپنا کام ختم کر دیا ہے۔ اب میں یہیں رہوں گا۔ تم نے میرے باپ کی حالت دیکھی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ ہر شخص کا اپنا کام ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔'' ماسٹر نے جلدی سے کہا' لیکن وہ اپنے

چہرے پر ناگواری کے اثرات کو چھپا نہ سکا۔

جانے سے پہلے نعیم نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا۔ اور اس وقت اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ وہ ہاتھ محض مردہ گوشت اور ہڈیوں کا بھاری وزن تھا۔ اس کی چھٹی حس نے جو ایسے موقعوں پر تیزی سے کام کرنے لگتی تھی، اسے آنے والے خطرے کا نامعلوم سا پتا دیا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے بڑے سے اداس چہرے کو غور سے دیکھا۔

''ماسٹر، تم نے مجھے اپنی کہانی نہیں سنائی۔ تم نے کہا تھا......''

''ابھی وقت نہیں، پھر کبھی سہی۔'' اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اونچے ہوتے ہوئے چاند کے نیچے وہ اجنبیوں کی طرح جدا ہوئے، یہ جانے بغیر کہ وہ آخری بار مل رہے ہیں۔ گانے والے کی آواز دیر تک ان کے پیچھے بلند ہوتی رہی۔

صبح سو کر اٹھنے کے بعد نعیم نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ دھوپ ابھی صحن میں نہیں آئی تھی۔ رات بھر جاگنے کے بعد اس کا باپ اب سو رہا تھا۔ اس نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ نقلی ریشم کے سرخ لحاف میں اس کا بوڑھا جسم گٹھڑی بنا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد ٹوکرے ڈھکے ہوئے رکھے تھے اور تازہ گڑ کی میٹھی، گرم باس کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ نعیم مسکرا کر صحن میں نکل آیا۔ اس کے ماموں کا لڑکا راول اور علی نلکے کے پاس کھڑے تھے۔ اس نے کان سے پکڑ کر علی کو اٹھایا اور ہوا میں اچھالا۔ لڑکا آواز نکالے بغیر اس کے کندھے پر آن گرا اور اس کی گردن کا گھوڑا بنا کر بیٹھ گیا۔ نعیم ان دونوں کو لے کر احاطے میں نکل آیا۔

''تم تو بڑے لمبے ہو گئے ہو۔'' اس نے بڑے لڑکے کی گردن پنجے میں دباتے ہوئے کہا۔

لڑکے اس کے ساتھ مانوس نہ تھے اور شرما رہے تھے۔ مگر چند ہی باتوں میں کھل گئے۔

''میں گھوڑی دوڑا لیتا ہوں۔'' علی اس کی گردن پر چڑھا چڑھا بولا۔

''میں گھوڑی پر کھڑا ہو کر اسے دوڑا لیتا ہوں۔'' راول نے کہا۔

''جب میں تمہارے جتنا تھا تو اس پر سیدھا لیٹ کر دوڑایا کرتا تھا۔'' نعیم نے گپ ماری۔

''سیدھا لیٹ کر؟'' دونوں لڑکے تعجب سے یک زبان ہو کر بولے۔

''لو اسے دوڑاؤ۔'' نعیم اسے سفید گھوڑی کے قریب لے گیا جس کی تعریف اور خریداری کی لمبی کہانی، جو اس نے اپنے باپ سے سنی تھی، وہ اب بھول چکا تھا۔

علی مینڈک کی طرح اس کے کندھے پر سے کود کر گھوڑی کی پشت پر جا پہنچا۔ گھوڑی اس اچانک دھچکے سے پچھلے پاؤں پر اٹھی اور علی اس کی ایال پکڑنے کی کوشش میں پھسل کر زمین پر آ رہا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے قہقہے لگائے۔ علی کھسیانا ہو کر ہنسا اور ڈھٹائی سے اس کی دم کے ساتھ لٹکنے لگا۔

''کلکتے میں بھی گھوڑے ہوتے ہیں۔'' راول نے پوچھا۔

''ہاں۔ گاڑیوں میں جتتے ہیں۔''

''بیل گاڑیوں میں؟''

''نہیں گھوڑا گاڑیوں میں۔''

''گڑ بھی ہوتا ہے؟''

وہ وہیں کھڑا ان کے ساتھ گپیں مار رہا تھا کہ اس نے صحن میں اپنے باپ کی آواز سنی۔ اب کھانے کا وقت تھا۔ وہ تینوں اندر جاکر نیاز بیگ کے گرد تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ پہلے انہوں نے رات کا مکھن ملا کر گڑ گرم کر کے کھایا' پھر بھینس کا دودھ اور روغنی روٹیاں۔ نیاز بیگ ہر شے اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہتا جارہا تھا:

''کھاؤ کھاؤ۔ کسان اور گھوڑا جب تک کھاتے رہیں جوان رہتے ہیں۔ جب کھانا بند کردیں تو مر جاتے ہیں۔ کسان اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔'' اور خود بھی اس پر عمل کرتے ہوئے گھوڑے کی خوراک کھا رہا تھا۔ نعیم متعدد بار اس کے مختصر سے بوڑھے جسم اور اس کی خوراک کا مقابلہ کر کے دل میں حیران ہوا۔ آخیر میں انہوں نے کچے آموں کا اچار اور تربوز کھایا۔

''بھینس کا معدہ خراب ہو جائے تو اچار کی پھانک دیتے ہیں۔ اچار کھاؤ' پیٹ ہلکا ہو جائے گا۔'' نیاز بیگ نے کہا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد نعیم نے اپنے فوجی تھیلے میں سے فرانس سے خریدا ہوا سگار نکال کر سلگایا اور دھوپ میں بیٹھ کر پینے لگا۔ جنگلی انگور کی بیل اس کے سر پر جھکی ہوئی تھی اور اس میں کئی ننھی ننھی چڑیاں پر پھلائے بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ سردیوں کا آسمان گہرے نیلے رنگ کا تھا اور فضا میں مکڑی کے چمکیلے تار اڑ رہے تھے۔ تلخ' سیاہ تمباکو پیتے ہوئے اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد جاڑوں کی ایک سہانی صبح اور خوش گوار گرم دھوپ کا لطف اٹھایا اور آنکھیں بند کر کے فرانس کے بازاروں اور عورتوں کے خوبصورت لباس کو یاد کیا۔

نیاز بیگ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور لالچی نظروں سے سگار کو دیکھنے لگا۔

''اس کا دھواں بڑا تلخ ہے۔ مجھ کو زیادہ نہیں بھاتا۔'' سگار پر نظریں جمائے جمائے وہ بولا۔ نعیم نے اس کا مطلب سمجھ کر تھیلے میں سے دوسرا سگار نکال کر اسے دیا اور اس کے سلگانے میں مدد کی۔ نیاز بیگ نے تمباکو کا کش لے کر افیمچیوں کی طرح آنکھیں میچ لیں۔

''تمہارے تھیلے کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ فکر نہ کرو۔ میں نہیں پسند کرتا کہ لوگوں کی غیر موجودگی میں ان کی چیزوں کو چھیڑا جائے۔'' اس نے کہا۔

جب تک سورج اوپر آیا وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نیاز بیگ نے مصنوعی سخت لہجے میں مگر دل میں ڈرتے ڈرتے پہلی بار اس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا اور کیوں اتنا وقت ضائع کر کے آیا تھا۔ اس کے جواب

دینے پر کہ اس نے وقت ضائع نہیں کیا تھا' نیاز بیگ نے پوچھا کہ پھر اس نے کیا تیر مارا تھا۔ نعیم کمال چالاکی سے اس سوال کا جواب ٹال گیا اور اس کو یقین دلانے لگا کہ اب وہ کہیں نہیں جائے گا۔

جب سورج کی کرنیں سیدھی ہوگئیں اور دھوپ ان کی جلد جلانے لگی اور وہ وقت ہوا جب گاؤں کی عورتیں کھیتوں میں کام کرنے والے مردوں کا کھانا لے کر جاتی ہیں تو انہوں نے باہر ہلکا ہلکا شور سنا جو بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ باہر نکلے۔ کسانوں کی ایک ٹولی گلی کے موڑ پر نمودار ہوئی اور ان کے گھر کے سامنے سے گزر کر اگلے موڑ پر غائب ہوگئی۔ اس ٹولی میں زیادہ تر نوجوان تھے جن کے چہروں پر دبے دبے جوش کی زردی اور خوف و ہراس کے نشانات تھے۔ ان میں سے کوئی باتیں نہ کر رہا تھا اور نہ ہی ان کے لب ہل رہے تھے' پھر بھی ایک عجیب طرح سے ان کے درمیان سے دھیما دھیما دبا ہوا شور اٹھ رہا تھا۔ ان میں نعیم اور اس کے باپ نے چند اجنبی شکلیں دیکھیں۔ جب وہ گزر گئے تو نیاز بیگ کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اور پیچھے پیچھے نعیم اس گلی کی طرف بڑھا' جس میں سے وہ لوگ نکلے تھے۔

طویل اور ویران گلی میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ گھروں کے دروازے بند اور نیم وا تھے لیکن کوئی متنفس نظر نہ آ رہا تھا وہ دونوں ابھی وہیں کھڑے تھے کہ گلی کے دوسرے سرے سے ایک عورت بھاگتی ہوئی داخل ہوئی۔ سورج اس کی پشت پر تھا اور سراسیمگی میں اس کے دونوں پاؤں بیچ میں بہنے والی نالی کے دونوں طرف باری باری پڑ رہے تھے اور وہ عجیب مضحکہ خیز طریقے سے بھاگ رہی تھی۔ اس کا لہنگا ہوا میں اڑ رہا تھا اور وہ اپنے دو سالہ بچے کو چھاتی میں دبائے ہوئے تھی۔ نزدیک آنے پر انہوں نے پہچانا' وہ رحمت کی بہو تھی۔ نیاز بیگ کو دیکھ کر اس کے زرد' کانپتے ہوئے ہونٹوں سے چیخ نکلی۔ ''مار دیا۔ خون کر دیا ظالموں نے۔'' اور بچہ اس کے ہاتھوں سے لٹک گیا۔

نیاز بیگ نے لپک کر بچے کو سنبھالا۔ ''کس کو...... کس نے؟''

''اس کو...... ماسٹر کو' ہائے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''کہاں...... کہاں پر؟ کیوں...... ہیں؟'' نیاز بیگ نے بے صبری سے پوچھا۔

عورت کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ ''ہائے چچا نیاز بیگ وہ بڑا بھلا مانس تھا۔''

یکلخت بے حد اکتا کر نعیم پلٹا اور گھر میں داخل ہوا۔ بے چینی سے اس نے گھوڑی کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ گھوڑی نے جھرجھری لی اور مانوسیت سے اس کے کندھے پر منہ رگڑا۔

''مجھے کیا......!'' فضا میں دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

پھر وہ سیدھا اپنی ماں کے پاس جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں جو بیٹے کے آنے پر مغرور ہوگئی تھی' صبح صبح دوسری عورت کے ساتھ خوب زور کی جنگ کرنے کے بعد اس وقت اطمینان سے بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھ کر وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔ باجرے کی میٹھی روٹی کا ٹکڑا توڑ کر چبانے لگا' پھر اسے نگلنے کی کوشش میں اگل دیا اور لعاب کا گولہ اس کے حلق میں جا کر پھنس گیا۔ غصے سے جھلا کر اس نے روٹی کا ٹکڑا دور پھینکا اور اونچی آواز سے بولا:

''مجھ کو اس سے کیا غرض!''

صحن میں کھڑا ہو کر وہ نلکے کی ہتھی مروڑتا رہا' پھر اس نے اچک کر ہمسائے احمد دین کے صحن میں دیکھا انگور کی بیل پر بیٹھی ہوئی تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی' گائے کے چار دن کے بچھڑے کو بازو میں لے کر اٹھایا اور رکھ دیا' دروازے میں کھڑے ہوئے علی کو اشارے سے بلایا جو اپنی ماں کے ڈر سے کمرے میں غائب ہو گیا۔ پھر وہ دوبارہ نلکے کے پاس گیا اور ٹونٹی کے ساتھ منہ لگا کر بہت سا پانی پیا۔ جب پانی پی چکا تو جیب میں ہاتھ دے کر باہر نکل گیا۔

اب گلی میں اکا دُکا آدمی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے اور نیچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ پاس سے گزرتے ہوئے میراثی کو روک کر نعیم نے پوچھا: ''کیا بات ہوئی ہے؟''

''گئوکشی کی بات تھی چوہدری۔ مدت سے تمہیں پتہ ہے سائیں کے ڈیرے پر پندرہویں کے پندرہویں گائے ذبح ہوتی آئی ہے۔ آج ہندو ضد پر آ گئے۔ ضد پر کیا آ گئے' یہ سب ان سوروں کی شرارت ہے جو باہر سے آئے ہیں۔ بس جھگڑا بڑھ گیا۔ ماسٹر جو بیچارا اِدھر کا نہ اُدھر کا' سمجھانے گیا اور سوروں نے اسے ختم کر دیا۔ تھ تھ تھ۔ اس نے صرف اتنا کہا'' وہ میراثیوں کے مخصوص انداز میں بات بڑھاتا چلا جا رہا تھا کہ نعیم وہاں سے چل پڑا۔

کھیتوں میں چلتا ہوا وہ اس جگہ پہنچا جہاں شیشم اور کیکر کے ذخیرے کے گرداگرد جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی کچی دیوار کھچی ہوئی تھی۔ پگڈنڈی پر ایک جگہ مٹی کا ایک برتن ٹوٹا پڑا تھا اور لسی بہہ کر زمین میں جذب ہو چکی تھی۔ پاس ہی ایک چنگیر اور باجرے کی روٹیاں بکھری پڑی تھیں۔ یہ اس عورت کی تھیں جسے موت کے نظارے نے پریشان کر دیا تھا۔ نعیم نے پنجوں پر اٹھ کر دیوار کے اوپر سے دیکھا۔ کیکر کے ایک درخت کے نیچے ماسٹر مرا پڑا تھا۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے اور زرد مردہ چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ ذرا فاصلے پر ایک مریل سی مٹیالے رنگ کی گائے گھاس چر رہی تھی اور ڈکرا رہی تھی۔ جب نعیم کی ٹانگیں کانپنے لگیں تو اس نے بے دلی سے دیوار پر تھوکا اور واپس چل پڑا۔

گاؤں میں داخل ہوتے وقت اس نے نوجوانوں کے ایک گروہ کو دیکھا جو لٹھ اور بلم ہاتھوں میں تھامے' چہروں پر خطرناک ارادوں کی چھاپ لئے ایک جگہ جمع تھے۔ نعیم کندھے جھکائے' جیب میں ہاتھ دیئے تیزی سے ان کے پاس سے گزر گیا۔

''مجھ کو اس سے کیا غرض!'' اس نے تیسری بار اپنے آپ سے کہا۔

لیکن رات کو سونے کے لئے جب وہ بستر پر لیٹا تو اندھیرے میں ماسٹر اس کے قریب آ کھڑا ہوا اور رات بھر جاگ کر بے گناہ انسانی خون کی اذیت سہتا رہا۔

وہ ماہ مارچ کا پہلا دن تھا جب نیاز بیگ منہ اندھیرے آخری بار فصل کو پانی لگانے کے لئے کھیتوں کو گیا۔ ایک گھنٹے تک وہ زرد ہوتی ہوئی گیہوں کی فصل کے درمیان پھرتا اور پانی کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب پانی کھلا

تو وہ کدال اٹھا کر کیچڑ میں گھس گیا اور پانی کاٹ کاٹ کر مختلف کھیتوں کو لگانے اور باتیں کرنے لگا:

''پہلے تو ایک گھنٹے کے بعد آیا نامراد اور جو آیا تو برف کی طرح لگ رہا ہے۔ ہیں؟'' وہ جھڑک کر بولا۔ 'پر ٹھہر، فکر نہ کر، میرا بھی اتنا گیہوں ہے کہ ایک گھنٹے میں گھڑ سوار احاطہ نہیں کر سکتا۔ تیرا بھی پھرتے پھرتے بھرکس نہ نکل گیا تو مجھے پکڑ لیو۔ تو بس دو قدم چل کر زمین میں گھس جاتا ہے۔ ہیں؟ آ میرے ساتھ، تجھے پتا چلے کہاں تک جانا ہے، آ، نہر کے بچے، ہی مان، اتنا گیہوں سارے گاؤں میں کسی ایک کی ملکیت نہیں ہے۔ میں بڈھا آدمی ہوں، شرم کر، جب جوان تھا تو پتا ہے ساری ساری رات تیرے اندر کھڑا رہتا تھا اور پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ اس گندم کو بیچ کر مجھے اپنے بیٹے کی شادی کرنی ہے۔ مجھے اس کی بیماری کا علم ہے۔ اسے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ یہ مرد کی بڑی بیماری ہے۔ ہیں؟'' اس نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنی کامیاب تشخیص پر دل میں ہنسا۔ ''عورت کو پاکر اس کی ساری کاہلی دور ہو جائے گی اور وہ خود بخود کام کرنے لگے گا۔ سنا تو نے، کسی کو بتانا نہیں، نہر کے بے وقوف بچے ہیں؟'' وہ منہ پھیلا کر ہنسا اور بڑھتی ہوئی سردی کے اثر کو روکنے کے لئے زور و شور سے باتیں کرنے لگا۔

آخر جب سردی کی وجہ سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں تو اس نے پاؤں خشک کر کے جوتا پہنا اور کدال کندھے پر رکھ کر کنارے کنارے پھرنے لگا۔

سورج دو نیزے سے بھی اوپر آچکا تھا جب وہ گھر لوٹا۔ مکھن اور بادام ملے ہوئے گڑ اور بھینس کے دودھ کا ناشتہ کرنے کے بعد وہ اٹھا اور سبزی کی کاشت کے لئے زمین تیار کرنے کے واسطے نکل پڑا۔ ہل کو اٹھا کر کندھے پر رکھتے ہوئے اس نے جھنجلا کر چھاتی کو ملا۔ ''یہ کیا سویرے سے ہو رہی ہے نامراد'' اور سینے میں پھرتے ہوئے درد کو گالی دی۔

''سبزی کی بیائی اب تک ختم بھی ہو جانی چاہیے تھی۔ پھاگن نکلا جا رہا ہے۔ یہ لونڈا اگر کسی کام کا ہوتا۔'' بیلوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس نے دل میں بیٹے کے ناکارہ پن پر تاسف کا اظہار کیا۔

ہل چلانے کے دوران اس نے درد کو تھوڑے تھوڑے وقفے پر تیز ہوتے ہوئے محسوس کیا مگر اسے کام اور باتوں کے شور میں دبائے رکھا۔ اس کے علاوہ اسے مکھن بادام اور گڑ کی خوراک پر مکمل بھروسہ تھا جس نے ہمیشہ اسے گھوڑے جتنی گرمی پہنچا کر ساری تکلیفوں سے بچائے رکھا تھا۔ ''کسان اور بیل اگر معمولی تکلیفوں سے بیٹھ جائیں تو دنیا کے کام ہو چکے۔'' دانت پیس کر اس نے بیلوں سے کہا۔

سورج سر پر پہنچ چکا تھا جب اس نے سبزی کے لئے چھ چھ انچ زمین پلٹ کر رکھ دی۔ کھیت کے کنارے پر کھڑا ہو کر وہ تھوڑی دیر کے لئے ختم کئے ہوئے کام کی مسرت میں سینے کی تکلیف کو بھول گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے ابلی ہوئی گاجریں کھائیں اور حقہ پینے کے لئے بیٹھ گیا۔ مگر حقہ اس سے زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ تمباکو کے ہر کش پر درد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ابھی سارے جانوروں کے لئے چارہ لے کر آنا تھا اور پھر نیاز بیگ کے لئے تو ہر بیماری کا علاج کام تھا۔ سخت محنت! ''پسینے کے ساتھ ساری انسانی اور حیوانی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔'' اس نے کہا اور رسی اور درانتی اٹھا کر چارہ کاٹنے کے لئے چل پڑا۔ احاطہ پار کرتے ہوئے اس نے دن بھر کے بھوکے مویشیوں کو رحم اور

محبت کی نظر سے دیکھا۔

''میں نے دو بار کھایا ہے اور تم نے چار بار کھایا ہے اور ان کا کوئی خیال نہیں؟ ہیں؟'' اس نے راول کی گردن میں درانتی چبھو کر کہا۔

''جا تو رہے ہیں۔'' لڑکا گردن ملتے ہوئے غصے سے بولا۔

چارہ کاٹتے ہوئے وہ درد کی شدت سے لڑکے پر' درانتی پر اور چارے پر گرجتا رہا۔

''اگر ایک جانور بھی بھوک سے مر گیا تو میں تم سب کو گھر سے نکال دوں گا۔ وہ میرے بڑے بچے ہیں۔ تم چھوٹے ہو۔ عورتوں کی کیا پرواہ ہے۔'' اس نے رعونت سے کہا۔

چارہ کاٹ کر انہوں نے دو گٹھے بنائے اور سروں پر اٹھا کر جھولتی ہوئی مخصوص چال کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ سارے رستے وہ بخار اور درد کی شدت سے بید کی طرح کانپتا رہا۔ اس کے بدن پر بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور جلد جھرجھرا رہی تھی۔ جب اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے تو اس نے آنکھیں بند کرلیں اور دل میں بولا:

''میں ان راستوں پر آنکھیں بند کر کے چل سکتا ہوں۔ میں یہاں پیدا ہوا تھا۔''

لیکن گھر کے دروازے پر گٹھا اس کے سر سے گر گیا اور وہ گردن پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ وہ اسے اٹھا کر اندر لائے اور گھر کے تمام نقلی ریشم اور سوت کے لحاف اسے اڑھا دیئے۔ دونوں عورتوں نے اس کی چھاتی پر تلی کے تیل کی مالش کی اور پودینے اور جنگلی بنفشے کے پھولوں کی چائے بنا کر اسے پلائی۔

تیل اور چائے کی حرارت سے وہ ہوش میں آ گیا اور نعیم کو پاس بلا کر ہدایتیں دینے لگا: ''سبزی کے لئے میں نے زمین تیار کر دی ہے۔ کریلے اور کدو کے بیج علی کی ماں سے لے لینا اور چار دن کے اندر اندر بو دینا۔ ورنہ زمین خراب ہو جائے گی۔ تم نے سرسوں کے پھولوں کو دیکھا ہے۔ پھاگن نکلتا جا رہا ہے اور گیہوں کو اب پانی نہیں لگے گا۔ آج آخری بار لگا دیا۔ یہ شاید اسی کی برکت ہے۔ بدبخت برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اور چنے چیت کے پہلے دنوں میں تیار ہو جائیں گے۔ لیکن تمہیں ان کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت تک میں بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔ اس وقت چارہ کاٹ کر جانوروں کو ڈال دو۔ سویرے سے بھوکے ہیں اور گھوڑی کے پچھلے پاؤں کے نعل گھس گئے ہیں۔ چڑھنے سے پہلے نئے ٹھونک لینا' ورنہ کھر زخمی ہو جائیں گے۔''

نعیم پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا ''اچھا بابا...... اچھا بابا'' کہتا جا رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے نیاز بیگ کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا' لیکن اس نے اپنے لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے ہدایتیں جاری رکھیں۔

''اور کام کرو...... کام کرو۔ محنت سے میں نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ محنت سے تم اسے کھڑا رکھو گے ورنہ یہ گر جائے گا۔ میں اچھا ہو جاؤں تو تمہارے لئے عورت کی تلاش میں نکلوں گا۔ فکر نہ کرو۔ عورتیں ناکارہ ہوتی ہیں۔ لیکن کسان کے لئے عورت بڑی مفید ہوتی ہے۔ فکر نہ کرو۔'' وہ ہونٹوں میں مسکرایا۔

''اچھا بابا۔'' نعیم نے کہا۔ وہ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ شام کے وقت جب کمرے میں دیا جلا تو اس نے آخری بار نعیم کو پاس بلایا۔ جب وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو اس نے اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا اور اسے مضبوطی سے پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ موت کو سامنے دیکھ کر اس کا سارا غرور ختم ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ فقط ایک مرتا ہوا انسان اور ایک باپ تھا۔

بنفشے کے پھولوں کی چائے اور تلی کے تیل کے باوجود آدھی رات کے قریب وہ مر گیا۔

اس کے جنازے پر سارا گاؤں اُمڈ آیا۔ مرنے والے کا بیٹا روشن آغا کے بعد گاؤں کا امیر ترین شخص تھا' اور ابھی کنوارا تھا۔ آنے والوں میں بعض ایسے کسان بھی تھے جو اس کے باپ کے پرانے دشمن تھے اور ایسے بھی جو اس کی سخت طبیعت اور اس کی ڈینگوں کی وجہ سے اسے ناپسند کرتے تھے' اور وہ بھی تھے جو اس کی نئی نئی حاصل کی ہوئی دولت کا خیال کر کے جلتے تھے۔ اس وقت وہ سب غمزدہ دکھائی دے رہے تھے اور نعیم کے پاس بیٹھے افسوس ظاہر کر رہے تھے۔

''جس وقت مجھے خبر ملی میں مکئی کے کھیت میں تھا۔ میرے ہاتھ پھاوڑے پر رک گئے۔ یوں لگا میرے بچے کہ جیسے دل پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہو۔'' ایک بوڑھے کسان نے مٹھی ہوا میں لہرا کر کہا۔

''مجھے میری عورت نے بتایا کہ چوہدری ن ...... ن'' اتنا کہنے کے بعد دوسرے کسان نے ایسا حلیہ بنایا کہ سب سمجھے اب وہ رونے والا ہے۔ ''چوہدری نیاز بیگ بڑا بختاور آدمی تھا۔ جب وہ جیل جانے لگا تو'' اس نے رک کر دوبارہ رونے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی کئی سننے والوں کے چہرے بھی بگڑ گئے۔ بولنے والا فوراً اصلی حالت پر آیا اور ہاتھ پھیلا کر بات جاری رکھی۔ ''اتنے اتنے...... اتنے اتنے بڑے تربوز تھے اس کے کھیت میں جو اس نے مجھے دے دیئے۔ ہائے وہ تربوز اب کہاں۔'' وہ جھکا' لیکن اس سے پہلے کہ وہ یا سننے والوں میں سے کوئی روتا اس نے خشک آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ ''جب وہ جیل سے آیا تو اس نے کبھی ان تربوزوں کا ذکر مجھ سے نہ کیا۔ ہا۔''

کچھ دیر تک رونے کی بے سود کوششوں میں اس کا ساتھ دینے کے بعد حاضرین اس کی اس قدر صریح بہانے بازی سے تنگ آ گئے اور ان میں غصے کی لہر بڑھنے لگی۔ ایک مرتبہ جب وہ جھکا تو اسے اسی حالت میں چھوڑ کر تیسرے کسان نے بے صبری سے اپنی بات شروع کر دی:

''چوہدری بڑا دل والا جوان تھا۔ جب مجھے میلے پر جاتے ہوئے دیکھتا تو ہمیشہ میری پیٹھ ٹھونکتا اور کہتا ''عیش کر بیٹا...... عیش کر' ایسے زندہ دل بوڑھے اب مرتے جا رہے ہیں۔''

اسی طرح ہر ایک نے باری باری کسانوں کے چالاک اور بے فن انداز میں مرنے والے کو یاد کر کے افسوس ظاہر کیا۔

جب انہوں نے جنازہ اٹھایا اور بڑی مشکل سے دونوں واویلا کرتی ہوئی عورتوں کو لاش سے جدا کر چکے تو

ایاز بیگ اپنے بھاری، ٹھگنے جسم کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اور تھوڑی دیر تک وہ دروازے میں کھڑے مجمعے کے اوپر خلا میں دیکھتے رہے۔ نعیم نے دور سے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ مگر جب وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نزدیک آئے اور اپنا بوڑھا، پلپلا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا تو وہ مڑا اور سب لوگوں کے درمیان ان سے لپٹ کر رونے لگا۔

(۱۷)

نعیم کو گاؤں میں رہتے ہوئے چند مہینے ہو چکے تھے۔ اس نے دو جوڑی بیل اور خرید لئے تھے اور اپنے باپ کی، اپنی اور ایاز بیگ کی زمین کی، جو ساری ملا کر چار جوڑیوں کے لئے کافی تھی، اپنی نگرانی میں مزارعوں سے کاشت کروا رہا تھا۔ اس سال کٹائی کے موقعے پر اس نے گاؤں سے باہر ایک کمرے کا پکا مکان بنوایا اور اس میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ آبائی مکان میں دونوں عورتیں، بچے اور مویشی رہتے تھے اور نعیم کھانا کھانے کے لئے وہاں جایا کرتا تھا۔

اپنے باپ کے آخری الفاظ وہ کبھی نہ بھولا۔ کام، کام، کام۔ یہ اس کی زندگی کا مقولہ تھا اور کام ہی سے وہ زمینوں اور مکانوں کو گرنے سے بچائے ہوئے تھا۔ علی الصبح سے لے کر دوپہر تک وہ کھیتوں میں رہتا، ہر روز بڑھتی ہوئی فصل کی رفتار کو دیکھتا اور مزارعوں کو اس کے متعلق ہدایات دیتا۔ حصے پر دی ہوئی زمین کی اسے فکر نہ تھی۔ زیادہ وقت وہ اس زمین پر صرف کرتا جو خود کاشت تھی، جس کے بیل اور بیج اس کے اپنے اور مزارعے اس کے ملازم تھے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ تمباکو پیتا اور گھنٹہ بھر آرام کرتا۔ پھر اٹھ کر کتابوں میں جنسوں کی خرید و فروخت اور قرض اور ادھار کا اگلا پچھلا حساب دیکھتا۔ اس کے بعد مویشیوں کو دیکھنے کے لئے جاتا اور ایک دن چھوڑ کر باقاعدگی سے گھر میں عورتوں کے پاس جا کر بیٹھتا، قاعدے کی رو سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا، ان کی روزانہ ضروریات اور شکایتیں سنتا، مکان کی مرمت اور مکھن کے ذخیرے کے متعلق پوچھتا اور یہ دیکھ کر خوش ہوتا کہ دونوں عورتیں اب مکمل صلح اور دیانت داری کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ شام کے وقت وہ باقاعدگی سے (کبھی کبھی پوری فوجی وردی میں) پنچایت گھر جاتا جہاں وہ پھر تمباکو پیتا، اور اگر منشی غیر حاضر ہوتا تو پنچایت کی صدارت کرتا اور گاؤں کے روز مرہ کے چوری اغوا وغیرہ کے مقدمے سنتا۔ اس طرح اب وہ چھوٹے موٹے زمیندار کی طرح رہ رہا تھا اور گاؤں کے باشندوں کی نظر میں اس کی حیثیت مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن اس دلی اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی اور مویشیوں کی ایک بھاری تعداد کے باوجود اس کا مزاج تیز اور تند ہوتا گیا۔ میل جول والے کسانوں کا کہنا تھا کہ یہ خصوصیت اسے اپنے باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی، لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ اس پر بھی وہ اکثر کسی چھوٹی موٹی بات پر اپنے صحیح ہاتھ کے ایک طاقت ور گھونسے کے ساتھ گاؤں کے کسی کمین یا مزارعے کی ناک سے خون جاری کر دیا کرتا، جس کی ندامت کو

مٹانے کے لئے اسے کٹائی کے موقع پر دل کھول کر ہر ایک کو دینا پڑتا۔

اسی عام عزت افزائی کے باوجود وہ ذاتی تعلقات بڑھانے سے ہچکچاتا تھا' اور گاؤں میں مہندر سنگھ کے بعد اب تک کوئی شخص اس کے زیادہ نزدیک نہ ہو سکا تھا۔ کبھی کبھی وہ زمینداری کے معاملات راول کے سپرد کر کے اپنا فوجی تھیلا اٹھا کر چند دن کے لئے ایاز بیگ کے پاس دلی چلا جایا کرتا۔

خزاں کے موسم میں وہ دلی گیا تو ایاز بیگ نے اسے سنہرے حروف میں چھپا ہوا اعلیٰ درجے کے دبیز کاغذ کا ایک کارڈ دیا۔ یہ سہ رنگی کارڈ روشن محل سے جاری کیا گیا تھا اور چند دن میں ہونے والی پرویز کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔ اس پر انگریزی زبان میں اس کا نام اور دعوت کی عبارت لکھی تھی۔ اسی طرح کا دوسرا کارڈ ایاز بیگ کے نام کا میز پر پڑا تھا۔ نعیم نے اسے دیکھا اور ہلکے دل سے میز پر رکھ دیا۔ لیکن وہ زیادہ دیر اس سے لاپروائی نہ برت سکا۔ اس نے دوبارہ اٹھایا اور رکھا' اٹھایا اور رکھا' ہاتھ میں الٹ پلٹ کر دیکھا' پھر سلیقے سے تہہ کر کے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ ایاز بیگ نے کھڑکی پر جھک کر سگار پیتے پیتے اس کے تانبے کے رنگ والے چہرے کو زرد اور پھر سرخ ہوتے ہوئے دیکھا۔

''چلو گے؟'' انہوں نے بظاہر باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' نعیم نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔

ایاز بیگ نے سگار کو کھڑکی کے پتھر پر مسلا اور ایسے لہجے میں جس سے نعیم کو کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کس سے مخاطب ہیں' بولے ''روشن محل کی دعوت ہے۔ ایسی دعوتیں روز روز کہاں......''

معدے میں بدمزگی محسوس کر کے نعیم نے اگالدان میں تھوکا اور بے چینی سے چھاتی کو ملا۔

بالوں کو ناریل کے تیل سے چکنا کرنے کے بعد نعیم نے انہیں ٹھیک طرح بٹھایا اور داڑھی مونڈی۔ رخساروں کو تولیے سے خشک کرتے ہوئے اس نے ذرا مایوسی کے ساتھ دیکھا کہ ٹھوڑی کے نیچے گوشت نمودار ہو رہا تھا اور جبڑوں کے پاس چہرہ فربہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور دیہات کے تیز موسموں نے اس کی جلد کو جو کبھی سفید اور ملائم تھی' کھردرا کر دیا تھا۔ پھر اس نے چرمی تھیلے میں سے پورا فوجی تقریبی لباس نکال کر پہنا' ٹوپی میں مرغابی کا پر لگایا' سینے پر جنگی ملازمت کی رنگین رین فیتیاں اور نیچے چمکتی ہوئی دھات کا کراس لٹکایا' اسی تھیلے میں سے آخری تین فرانسیسی سگار نکال کر اوپر کی جیب میں رکھے اور جانے سے پہلے لکڑی کا ہاتھ احتیاط سے جیب میں ڈال کر آستین سے ڈھک دیا۔

روشن محل میں داخل ہوتے وقت کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں اور سرخ بجری کے راستے دیکھ کر اسے وہ دن یاد آیا جب وہ پہلی دفعہ یہاں آیا تھا۔ آج بھی پہلی دفعہ آ رہا تھا۔ پہلی دفعہ وہ ہمیشہ تقریبات پر ہی آتا تھا' یہ سوچ کر وہ دل میں ہنسا۔

ان سارے برسوں کے دوران روشن محل میں ایک ''گارڈن ہاؤس'' کے علاوہ کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ باغ کے جنوبی کونے میں اونچے اونچے کیلے کے پودوں میں چھپا ہوا بانس اور لکڑی کا یہ گارڈن ہاؤس ایاز بیگ کے نقشے کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ یہ اسے وہاں داخل ہوتے ہی ایاز بیگ نے بتایا۔ گھاس کے قطعوں پر' برآمدوں میں اور باغ کے راستوں پر آج اس پہلی والی تقریب سے کہیں زیادہ چہل پہل تھی۔ دعوت ولیمہ پر مدعو انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو باتوں اور قہقہوں کے شور میں اِدھر سے اُدھر آ جا رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اسے مانوس شکلیں بھی نظر آئیں۔ یہ وہی لڑکے اور لڑکیاں تھے جن کے ساتھ چند برس پیشتر وہ انہی درختوں کے نیچے کھیلا کودا تھا وہ اب جوان ہو چکے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے اپنے جوان ہونے اور ایاز بیگ کے بہت بوڑھے ہو جانے کا خیال آیا۔

''مبارک ہو۔'' ان دونوں نے پرویز سے ہاتھ ملایا۔

''ہلو...... '' پرویز نے گرمجوشی سے نعیم کے ساتھ مصافحہ کیا اور دیر تک اس کا ہاتھ تھامے اس کی آنکھوں میں پرانی دوستی کو تلاش کر کے محبت سے ہنستا رہا۔ پھر وہ مڑ کر ایاز بیگ سے بولا

''معاف کیجئے گا' میری بیوی ابھی اُدھر گئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... کوئی بات نہیں۔'' ایاز بیگ نے کہا۔

پھر نعیم نے ہاتھ اٹھا کر خالہ کو سلام کیا۔ ادھیڑ عمر خوبصورت عورت نے پسندیدگی کی نظروں سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

''بہت دن کے بعد آئے ہو نعیم میاں۔'' اس نے کہا۔

نعیم مسکرایا۔ اسی وقت اس نے اپنے آپ کو بہت سے آشنا' ہنستے ہوئے چہروں میں گھرا پایا۔

''ہلو ہلو ہلو۔'' کا شور اُٹھا اور اسے اتنے ہاتھ ملانے پڑے اور ایسے زوردار طریقے پر پرانی دوستی کو تازہ کیا گیا کہ اس کا بازو تھک گیا۔ یہ وہی پرویز اور عذرا کا گروپ تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے نعیم ...... اتنی دیر کے بعد......'' ایلس گریکسن نے اپنے مخصوص تیز پُرمسرت لہجے میں پوچھا۔

''جنگیں فتح کر کے آ رہا ہیں۔ دکھائی نہیں دیتا۔'' ملامت بار نظروں سے ایلس کو دیکھتے ہوئے ارشد نے نعیم کے جسم کی ساری لمبان کی طرف اشارہ کیا۔

معصوم طلعت' جو ویسی کی ویسی چھوٹی سی لڑکی تھی' بولی: ''ارے نعیم' اوہ تم تو ہیرو بن گئے سچ مچ کے۔ سب میں سے ...... اب تمہاری 'ہیرو ورشپ' ہوگی۔'' جوش مسرت سے اس نے آنکھیں میچ لیں اور مٹھیاں کس کر کانوں پر بجانے لگی۔

''ہم نے اخبار میں پڑھا تھا۔'' شیریں نے کہا۔

''کیا؟'' نعیم نے پوچھا۔

''تمہارے کارنامے کے متعلق اور ......'' ایک لمحے کے لئے اس کے اردگرد خاموشی چھا گئی اور اس نے پشیمان ہو کر موضوع بدل دیا۔ ''تم ہندوستان میں تیسرے آدمی ہو جسے یہ اعزاز دیا گیا ہے۔''

''ہاں۔'' وہ آہستہ سے ہنسا۔ ان کی اس بے ضرورت چشم پوشی پر اسے صدمہ ہوا۔

''ہل لو......'' عقب سے کسی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''صاحبزادہ صاحب۔'' نعیم نے مڑ کر مصالحہ کیا۔

''ارے میاں کہاں غائب رہے اتنے برس۔ بڑے میدان مار کے آ رہے ہو واللہ کیا شان دار سپاہی ہوا ہاہا......'' وحید نے پسندیدگی سے اسے دیکھا۔ ''اب تو بڑے مشہور و معروف آدمی......''

''نعیم تم ان سے ملے......'' شیریں نے بات کاٹ کر کہا۔ ''بیگم بلقیس وحید الدین آف......''

''ہاں میری بیوی سے ملو نعیم۔''

''آپ انہیں جانتی ہیں بلقیس بھابی۔'' طلعت نے معصومانہ انداز میں کہا۔ ''آپ انہیں نہیں جانتیں؟ ارے واہ۔ بھئی نعیم، یعنی نعیم احمد خان۔ ہمارے بہت پرانے دوست ہیں۔''

بلقیس نے انجانے پن سے سر کو خوبصورت جنبش دی۔ وہ ایک پتلی سی زرد رو جاگیردارانہ نقوش والی لڑکی تھی۔ نعیم نے ذرا سا جھک کر احتیاط سے اسے سلام کیا۔ وہ عمداً زیادہ اخلاق برتنے کی کوشش نہ کر رہا تھا۔ اس میں ایک قدرتی رعونت آ گئی تھی جو اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کی کرختگی سے برابر میل کھاتی تھی۔ اس کے ساتھی اس کی شخصیت میں اس تبدیلی کو اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے گھیرے اس کے چست' بے داغ فوجی لباس اور چمکتے ہوئے کراس اور ٹوپی کے پر کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ درمیان میں وہ اپنے آپ کو سنبھالے' سب میں سے سر نکالے کھڑا سنجیدگی اور احتیاط سے ہنستا رہا' اس شخص کی طرح جو بیک وقت مغرور' رنجیدہ اور مسرور ہو۔

جب مہمان زیادہ اکٹھے ہونے لگے تو وہ اسے کمروں کی طرف لے گئے اور چند ایک اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اندر اس کا اتنے لوگوں سے تعارف کرایا گیا کہ اسے سگار پھینکنے کے لئے باہر آنا پڑا۔ موٹے موٹے بیوپاریوں اور جاگیرداروں اور سیاسی لیڈروں نے اسے بے اعتنائی سے دیکھا اور فانوسوں کی روشنی میں صوفوں میں دھنس کر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

نوجوان عہدیدار' جو پرویز اور وحید کے دوست تھے' اسی خوش دلی کے ساتھ اس سے ملے جو ان لوگوں کا خاصہ تھا۔ انگریز عورتوں اور مردوں نے اس کے سینے پر لٹکتے ہوئے کراس کی عزت میں اپنی جگہ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور اپنے نزدیک بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس نے کئی جگہ رکنا چاہا لیکن ارشد' شیریں اور غیاث اس کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ ان خوشدل لوگوں کے لئے نعیم ایک دوسری دنیا کا بے حد دلچسپ باشندہ تھا جو طبقاتی اختلاف کے باوجود مغرور اور باوقار تھا اور کسی طرح سے ان کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہو چکا تھا اور اس وقت فوجی لباس

میں بے حد دلکش لگ رہا تھا۔

آخر اس گہماگہمی سے تنگ آ کر وہ ایک جگہ پر بیٹھ گیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر زمیندار تھا جس نے اپنے پاس اسے جگہ دی۔ اس نے دیہاتی رئیسوں کا لباس پہن رکھا تھا۔

''اہا...... نوجوان' تم فوج میں ملازمت کر چکے ہو؟ فوج واقعی تم جیسے نوجوانوں سے بنتی ہے' جو ملک فتح کرتی ہے۔ جوانی میں مَیں بھی فوج میں بھرتی ہونا چاہتا تھا لیکن میرا وزن کم تھا۔ شاید میں زمینداری کے لئے ہی موزوں تھا۔ اہاہا......'' اس نے نعیم کو چھاتی پر چُھوا۔ ''کیسا عالی شان تمغہ ہے۔ میں نے دور سے دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ تم نے اصل جنگیں لڑی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے بھئی کہ ہی ہی ہی...... میں سادہ سا آدمی ہوں لیکن جب تم اندر داخل ہوئے تو میرا دل چاہا کہ تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔ تم نے برا تو نہیں مانا۔''

''اوہ ہرگز نہیں۔''

''دراصل میں فوج کا ابتدا سے ہی شیدا ہوں لیکن اررر...... میں شاید زمینداری کے لئے ہی موزوں تھا۔ زمینداری کے لئے ہی موزوں تھا۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟''

''روشن پور سے۔''

''آہا...... پھر تو تم میزبانوں میں شامل ہو۔ ہی ہی......'' وہ کم پڑھے لکھے خوش باش دیہاتی رئیسوں کی طرح ہنسا اور نعیم کو کندھے پر تھپتھپا کر بولا: ''روشن آغا سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی ایک بار بس...... مگر کیا وضعداری ہے صاحب' غازی آباد سے مجھے بلا بھیجا۔''

''آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''مختصر سی زمینداری ہے بھائی۔ غازی آباد میں۔ لیکن میرے باغوں میں اول درجہ کا گلاب ہوتا ہے۔ جنگ میں تم نے پھول کہاں دیکھے ہوں گے۔ میرا گاؤں پھولوں کا گاؤں ہے' گلاب کے پھولوں کا گاؤں۔ تم وہاں ضرور آنا۔''

''یہ بات تو نہیں۔ غیر ملکوں میں مَیں نے بہت اچھے اچھے پھول دیکھے ہیں۔''

''ابھی تو میں بیائی کی تیاری کر رہا تھا جب روشن آغا کا سندیش ملا......''

''آپ کون سی گندم بوتے ہیں؟'' نعیم نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''سفید۔ روشن پور میں سرخ گندم ہوتی ہے' میں جانتا ہوں' جو ایکڑ میں بمشکل بیس من اترتی ہے۔ میری سفید گندم۔''

وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں نعیم اس کے باتونی پن سے اکتا کر اور غازی آباد آنے کا وعدہ کر کے اٹھا اور برآمدے میں نکل آیا۔ سگار جلا کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پرویز ارشد وغیرہ غائب ہو چکے تھے اور ادھیڑ عمر کے باوقار' اجنبی انسان اس کے اردگرد چل پھر رہے تھے۔ اگلے برآمدے میں اس کی مڈبھیڑ

روشن آغا سے ہوگئی۔

''اہا نعیم۔'' وہ مسرت اور تعجب سے بولے۔ نعیم نے جھک کر سلام کیا۔

''تم یہاں کیوں نہیں آتے؟'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے بولے۔ ''نیاز بیگ کی موت کا ہمیں بہت رنج ہوا۔ ہمارا پیغام مل گیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''ہم لوگ ایک ہی نسل کے آدمی تھے۔ نیاز بیگ اور ایاز بیگ اور ہم سب۔ اب تم لوگوں کو چاہیے کہ ہم سے ملا کرو۔ نئی نسل کچھ اس قدر بے مروت واقع ہوئی ہے۔'' وہ اداسی سے ہنسے اور گزر گئے۔

کمروں میں سے ابھی تک کئی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ خصوصاً خواتین اس فوجی لباس اور سیدھے جسم والے شخص کو دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے کی پیدائشی خوبصورتی کے ساتھ نقوش کی خالص مردانہ کرختگی اور بھاری پن نے مل کر اس میں بلا کی کشش پیدا کر دی تھی اور جو سر اٹھائے' ایک ہاتھ جیب میں ڈالے برآمدوں میں گھومتا پھر رہا تھا۔

پھر کھانا شروع ہونے کی خبر نامعلوم طریق پر چاروں طرف پھیل گئی اور مہمانوں کا ہجوم باہر کی طرف' جہاں کھانے کی میزیں لگی تھیں' نکلنے لگا۔ پام کے ایک بڑے گملے پر پیر رکھے سگار پیتے پیتے اس نے اپنی قطعی بے وجہ زود رنجی کو محسوس کیا۔ وہ سب ایک ایک کر کے اس کے پاس سے گزرتے گئے۔

برآمدے کے آخیر پر اوپر کی منزل کو جاتے ہوئے لکڑی کے زینے پر سے اترتی ہوئی عذرا کا سامان خالہ سے ہوا۔

''بی بی آپ کہاں غائب ہوگئی تھیں۔ سارے مہمان تو آ چکے۔'' خالہ نے کہا۔

عذرا لکڑی کے جنگلے پر ہاتھ رکھے بے دھیانی سے کھڑی رہی۔ نیچے برآمدے میں نعیم ان کی طرف پشت کئے کھڑا تھا۔

''خالہ' آپ اس سے ملیں؟''

''نعیم۔ ہاں۔ وہ اسی طرح دلکش اور خلیق ہے۔'' خالہ نے سہم کر بات شروع کی۔ ''لیکن ...... لیکن' اوہ۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ جیسے دسمبر میں پتھر کی دیوار۔ اس کا ایک بازو ضائع ہوگیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری ہے۔ موت!'' وہ کپکپا کر زینہ چڑھنے لگیں۔

نعیم باہر جانے کے لئے مڑا۔ اسی وقت عذرا جیسے ہوا پر چلتی ہوئی اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ چند سیکنڈ تک دونوں ششدر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس نے ہندوستانی شادیوں کا زرتار لباس پہن رکھا تھا اور بے حد زرد نظر آ رہی تھی۔

پھر نعیم نے سنبھل کر سگار کی راکھ جھٹکی اور اسی سرد' لاتعلق لہجے میں بولا: ''عذرا بیگم' کیسی طبیعت ہے؟ میں

کھانے پر جا رہا تھا۔''

''اچھا...... چلیے۔'' عذرا نے اس کی نظروں سے بچنے کے لئے دور ہجوم کے ایک حصے پر دیکھتے ہوئے بے خیالی سے کہا۔ لیکن کوشش کے باوجود اس کے قدم نہ اٹھ سکے۔ نعیم بداخلاقی سے گملے پر پیر رکھے کھڑا رہا۔ باہر کھانا کھاتے ہوئے لاتعداد مہمانوں کا شور آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا اور وہ دونوں وہاں خاموش کھڑے اس ملاقات کے بے ڈھنگے پن کو اور ایک دوسرے کے وجود کو شدت اور بے چینی کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ غیر محسوس طریقے پر نعیم نے فیصلہ کیا کہ اب بات کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

آخر عذرا نے اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑا۔ ''بہت دنوں کے بعد تم...... آپ سے ملاقات ہوئی۔''

''میں کام میں لگا رہا۔'' نعیم نے ایک مصروف آدمی کے مختصر لہجے میں کہا اور عذرا کے وجود کی نفی کرنے کو سگار کا دُھواں اس کے منہ پر چھوڑا۔

لیکن ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس شدت اختیار کر گیا اور وہ ایک بار پھر برتنوں کے ٹکرانے اور انسانی آوازوں کے ملے جلے شور کے نیچے خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ برآمدے کے بیرونی شور اور اندرونی سناٹے کو انہوں نے ایک ساتھ محسوس کیا۔ بے چین لمحے ایک ایک کر کے ان کے سروں پر ٹپکتے رہے۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ حتیٰ کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی ملاقات اور یہ گفتگو انتہائی مضحکہ خیز اور بے مصرف ہے۔

''آپ جنگ میں گئے تھے۔'' عذرا نے سرسری طور پر کہنا چاہا' مگر اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

اچانک نعیم کا زخمی احساس انتہا پر پہنچ گیا۔ تیز تیز سانسوں کے ساتھ اس کی چھاتی اٹھنے اور بیٹھنے لگی اور وہ رک رک کر بولا: ''ہاں۔ مجھے حکومت کی ملازمت مل گئی تھی۔ باوجود تمہارے۔ تمہارے باوجود......''

ایک جھٹکے سے عذرا نے اس کی طرف دیکھا۔ شدید رنج سے اس کے ہونٹ اور گال کانپ اُٹھے۔

''نعیم...... تم...... تم مغرور ہو۔'' اس نے کہا۔ دفعتاً آنسوؤں کا ایک ریلا اس کی آنکھوں میں اور حلق میں عود کر آیا۔

اور اس وقت' دونوں نے' اپنی اپنی جگہ پر' ایک ہی وقت میں' دیکھا' اور محسوس کیا' کہ محبت کا جذبہ فاصلے' اختلاف اور چوبی بازوؤں کے باوجود طاقت ور ہے۔

وہ مڑی اور دوڑتی ہوئی خالی کمرے میں داخل ہوئی۔

''عذرا...... عذرا۔'' نعیم اس کے پیچھے لپکا۔ کمرے سے گزرتے ہوئے ایک ملازم نے عذرا کو روتے ہوئے دیکھا اور ٹھٹک کر رُک گیا۔ پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

چمڑے کی ایک بڑی سی مطالعے کی کرسی میں پوری طرح سما کر بیٹھی ہوئی عذرا نے ہونٹ سختی سے اندر کی طرف داب رکھے تھے اور چھوٹی سی لڑکی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ جذبات کے ہنگام سے اس کا چہرہ زرد اور خوف زدہ تھا۔ نعیم فرش پر ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھا اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لئے گھور رہا تھا۔

''نعیم۔'' دیر کے بعد عذرا نے ہونٹ ڈھیلے چھوڑ کر صاف اور کمزور آواز میں کہا۔ ''عورتیں بے شرم نہیں ہوتیں' پر محبت ضرور کرتی ہیں۔''

''مجھے معاف کردو۔ معاف کردو۔'' وہ اس کے ہاتھ میں منہ چھپا کر کہتا رہا۔

اور پھر وہ ہوا جو روشن پور والوں کی تاریخ میں آج تک نہ ہوا تھا اور حقیقتاً جو ہندوستان کے جاگیردار اور امراء کے طبقے میں بہت کم ہوا تھا۔

روشن محل پر موت کا سکوت طاری تھا اور موسم خزاں کی وہ شام اونچی چھتوں والی اس مہیب عمارت پر آہستہ آہستہ جھکتی آ رہی تھی۔ برآمدوں میں اور بند دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر روشنیاں جل رہی تھیں' لیکن کوئی متنفس دکھائی نہ دے رہا تھا۔ گھر کے تمام نوکر گھر کے پچھواڑے اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے تھے اور برآمدوں میں قدم دھرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والوں کو پہلی نظر میں سنسان برآمدے اور روشوں پر اکٹھے کئے ہوئے خشک پتوں کے ڈھیر دیکھ کر اس جگہ کی ہمہ گیر ویرانی کا احساس ہوتا تھا۔

اوپر کی منزل میں سرخ شیشوں والے بڑے دریچے پر یوکلپٹس کے پتے سایہ کئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے عذرا کے کمرے میں خالہ پلنگ کے کونے پر بیٹھی تھی۔ پلنگ پر عذرا گھٹنوں اور کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی تھی۔ کمرے کی فضا پر دھماکے سے پھٹنے والی خاموشی طاری تھی۔

''آہ......'' خالہ نے ہاتھ اٹھا کر ہوا میں پھیلائے اور پھر گرد میں رکھ لئے۔ ''کس قدر خوفناک...... آج تک ایسا نہیں ہوا۔ کبھی نہیں' تم سوچ نہیں سکتیں؟'' کچھ دیر تک وہ عذرا کی بے حرکت پشت کو دیکھتی رہیں' پھر سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر آہستہ آہستہ دبانے لگیں۔

عذرا اٹھ کر آتش دان تک گئی اور کمرے کی طرف پشت کئے دیر تک کھڑی رہی۔ ''کیا نہیں ہوا؟'' اس نے بظاہر کارنس پر دھرے دھات کے مجسمے سے پوچھا۔

''کہ روشن پور والوں کی لڑکیاں نچلے طبقے میں شادی کریں۔'' خالہ نے سر چھوڑ کر کہا۔

عذرا کلدار گڑیا کی طرح مڑی۔ بجلی کی روشنی میں اس کے دبلے' چوبی چہرے میں سے پیلاہٹ پھوٹ رہی تھی اور اس کی آنکھیں خشک اور پھیلی ہوئی تھیں۔

''نچلا طبقہ' نچلا طبقہ' کیا ہے!'' اس نے ایک ساتھ سختی اور بے چارگی سے کہا۔ ''کیا وہ کمین ہے؟ کیا وہ ہماری زمین کاشت کرتا ہے؟ اس کے پاس اپنے مویشی نہیں ہیں' اور گھوڑے' اور مکان......''

''ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کے باوجود وہ بے حیثیت ہے۔ اس کا باپ ایک معمولی کسان تھا۔'' خالہ نے اس عورت کے پُرعزم اور جسارت آمیز لہجے میں بات کی جو خود باحیثیت طبقے میں چور دروازے سے داخل ہوئی ہو اور اپنی زندگی سے بیک وقت خوف زدہ اور مطمئن ہو۔ اور اس کے پاس تمہارے لئے کچھ نہیں

ہے۔تم نادان ہو۔ اسے ایک کسان عورت کی ضرورت ہے۔''

''وہ کسان نہیں ہے۔'' عذرا نے اسی عزم اور بیچارگی سے کہا۔ ''وہ پڑھا لکھا ہے۔ وہ یہاں پر بھی رہ سکتا ہے۔ اور۔'' اس نے دھات کے مجسمے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کی بے جان آنکھوں میں دیکھ کر بولی:

''کیا وہ بہادر نہیں ہے؟''

''اوہ ......'' خالہ دکھ سے ہنسی۔ ''ہاں۔ وہ بہادر ہے' اور مغرور اور پُرکشش بھی...... لیکن وہ ناکارہ ہو چکا ہے۔ وہ......''

عذرا نے دہل کر اسے دیکھا' اور پہلی بار اس کی آنکھوں میں خالہ کے لئے خوف اور نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ بوڑھی عورت نے اسے دیکھا اور اپنی بات ختم کرنے کا عزم کھو دیا۔ کمزور آواز میں وہ بولی:

''اور روشن آغا۔تم انہیں صدمہ پہنچاؤ گی؟''

عذرا' جس نے چند لمحے پہلے سفید ہونٹ دانتوں میں دبا کر اپنے آپ کو رونے سے روکا تھا یکلخت پریشان ہوگئی۔ اس نے ٹھٹک کر دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھا اور بھاگتی ہوئی آ کر پلنگ پر گر پڑی۔

''بابا...... نہیں' نہیں' بابا...... وہ مجھے نہیں روکیں گے۔نہیں۔''

خشک آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر اس نے دہرایا۔

خالہ دل میں رحم اور محبت اور مستقبل کا خوف لئے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے عذرا کی پشت پر ہاتھ رکھا۔''اٹھو بی بی' کھانا کھاؤ۔''

''نہیں...... نہیں' عذرا نے دہرایا۔''بابا سے کہہ دو میں انہیں صدمہ نہ پہنچاؤں گی۔لیکن......نہیں۔''

ساتھ والے کمرے میں روشن آغا دیواروں کے ساتھ ساتھ چکر لگاتے ہوئے تھک کر بیٹھ گئے۔ بازو سینے پر باندھ کر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور سر صوفے کی پشت پر ٹیک دیا۔ ان کا چہرہ بہت بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ پرویز کونے کے سٹول پر سے اٹھا اور اپنا سیاہ ہیٹ اٹھا کر چپکے سے باہر نکل گیا۔ باغ کی طرف کھلنے والے دریچے کے آگے صوفے پر اس کی ماں اور بیوی اور رشتے کی بہن شیریں خاموش بیٹھی دہشت سے روشن آغا کو دیکھتی رہیں۔

دروازے کے رستے عذرا کے ہولے ہولے سسکنے کی آواز آ رہی تھی' اور باہر باغ کے نیم تاریک' سنسان راستوں پر خزاں کی ہوا میں خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔

اس کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر اس کہانی کے احاطے سے باہر ہے۔ مختصر یہ کہ جاڑوں میں نعیم اور عذرا کی شادی ہوگئی۔ پھر بھی یہ بتانا ضروری ہے کہ اس شادی کو روکنے کے لئے جو دیوانہ وار کوششیں ہوئیں اور صوبے بھر کے تعلقداروں کی جانب سے اس انتہائی مضحکہ خیز خیال کی جو مخالفت ہوئی وہ امراء کے اس

طبقے کی اپنی انفرادیت اور علیحدگی برقرار رکھنے کی خواہش کی خصوصیت سے مظہر تھی۔ شادی بہر حال عذرا کی قوت ارادی کی بدولت، جس نے کہ اس سے پہلے کہ روشن آغا اس تکلیف دہ سکیم سے تعاون کرنے پر اپنے آپ کو مجبور کرتے گھر کے دوسرے افراد کو اپنی بے پناہ بیچارگی اور عزم سے متاثر کر دیا تھا، انجام پائی۔

گاؤں کے باغ میں روشن آغا نے انہیں شاندار مکان بنا کر دیا جس میں دونوں نے رہائش اختیار کر لی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد عذرا کثرت کے ساتھ طویل وقفوں کے لئے دتی جا کر رہنے لگی جہاں کی اونچی، چمکدار زندگی میں گاؤں کی پُرسکون اور غیر دلچسپ فضا کے مقابلے میں اس کے لئے زیادہ کشش تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں نعیم زیادہ تر وقت روشن آغا کی زمینداری کے معاملات پر صرف کرتا جس کا تمام تر بندوبست اب براہ راست اس کی زیر نگرانی ہو رہا تھا۔

(۱۸)

وہ ایک ایسی صبح تھی جب بہار کا زور ٹوٹ چکا ہوتا ہے اور دھوپ میں تیزی آ جاتی ہے۔ جب پتوں کا رنگ شوخ سبز سے گہرا سبز ہو جاتا ہے اور ڈالیوں پر موسم بہار کے آخری پھول کھلتے ہیں اور آسمان مٹیالا اور گرم ہونا شروع ہوتا ہے۔ جب اوس گرنی بند ہو جاتی ہے اور عورتیں رات کو سونے کے لئے چھت سے باہر نکل آتی ہیں اور مرد دن بھر درانتیوں کے دندانے بناتے اور بیلوں کے کھر صاف کرتے رہتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں کٹائی سے پہلے کا خوف سایہ کئے رہتا ہے اور ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوتی ہے۔ جب دور دور تک سونے کے رنگ کی تیار فصل گرد کے طوفانوں میں لہراتی ہے اور چنبیلی کے پودوں پر گرما کی پہلی کلیاں نمودار ہوتی ہیں۔

سورج نعیم کے مکان کی دیواروں سے اوپر آ چکا تھا اور دھوپ صحن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ عذرا پچھلی شام کو دتی سے لوٹی تھی اور رات بھر وہ خوب لپٹ کر سوئے رہے تھے۔ چنانچہ صبح وہ خوش و خرم اٹھے تھے۔ نعمت خانے کے فرش پر بیٹھ کر زور زور سے ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے انہوں نے سرخ سنگتروں اور بھنے ہوئے جَو کے دلیے اور دودھ کا ناشتہ کیا۔ پھر انہوں نے چائے پی اور مویشیوں کے احاطے میں نکل آئے۔ بھوری بھینس کی گردن کا زخم کھلوا کر دیکھا اور اپنے سامنے جانوروں کے رکھوالے سے اس پر ہلدی اور سرسوں کے تیل کی پٹی کرائی۔ پھر وہ دوسرے جانوروں کے پاس سے گزرے اور نعیم نے جو گزری ہوئی رات کی جسمانی آسودگی کے زیر اثر ملنسار موڈ میں تھا، ہر ایک جانور سے الگ الگ اس کا حال پوچھا۔ دھوپ میں جگالی کرتی ہوئی سیاہ اور سفید گایوں، بھینسوں، بھیڑوں اور دوسرے مویشیوں نے اس کا جواب اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ اس قانع اور لاتعلق انداز میں دیکھ کر دیا جس کے ذریعے مویشی اپنی آسودگی اور گہری محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ صرف دونوں گھوڑے خوشی سے ہنہنائے اور دموں کو پھندنے کی طرح ہوا میں لہرایا جس پر نعیم نے اپنے باپ کی بات دہرائی کہ گھوڑے کسان کے عقل مند اور نزدیک

ترین رشتہ داروں میں سے ہوتے ہیں۔

مویشیوں سے ملاقات کرنے کے بعد انہوں نے رکھوالی کے کتوں کو صبح کا کھانا کھاتے ہوئے دیکھا اور دوپہر کے راتب کے متعلق نوکر کو ہدایات دیں۔ پھر وہ گوالے کی کوٹھڑی میں گئے اور صبح کے دودھ کی مقدار دیکھی۔ وہیں پر انہوں نے کل شام کی اتری ہوئی بھیڑوں کی اون کا معائنہ کیا۔ پھر وہاں سے وہ گھر کے پچھواڑے سبزی کی کیاریوں میں گئے اور شیشے کی طرح چمکدار پانی کو شراٹے سے نالی میں بہتے اور آگے جا کر خاموشی سے مختلف راستوں میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ نئی کیاریوں میں پانی انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنے رستے میں آنے والے ہر بھورے اور خشک مٹی کے ڈھیلے کو سیاہ کرتا ہوا گہرائیوں میں اتر رہا تھا' جہاں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے بیجوں کے ہزاروں ننھے ننھے سوراخوں میں رچ بس کر انہیں نرم اور گداز بناتا ہوا نازک نازک' ریشمیں کونپلوں کی تخلیق کر رہا تھا جو پانی کے اترنے ہی کے ساتھ خاموش اور چور انداز میں بڑھتی اور زمین پھاڑ کر باہر نکلتی آ رہی تھیں۔ عذرا کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے یہ سب دیکھ کر اور محسوس کر کے نعیم کی آنکھیں تخلیق کے سرور سے مند گئیں اور اس نے سوچا کہ وہ بنیادی طور پر کسان ہے اور کسان کا بیٹا ہے اور عذرا کی اونچے چھتوں والی دنیا میں وہ چور دروازے سے داخل ہوا ہے۔ لیکن اس خیال نے جس نے کہ آگے جا کر زندگی میں کئی بار اسے لاچار کر دیا' اس وقت اس کو محظوظ کیا اور آہستہ سے مسکرا کر اس نے عذرا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ساتھ لگا لیا۔

''بابا کہا کرتے تھے زمین ماں ہے اور پانی باپ ہے' اور فصل۔ اولاد ہے۔'' اس نے کہا۔

عذرا نے آنکھوں میں محبت کی ساری مستی بھر کر اسے دیکھا اور ایک انجانے خیال سے مسکرائی۔

وہاں سے وہ چاسکو کی بڑھتی ہوئی باڑ کے ساتھ ساتھ لمبا چکر کاٹ کر باغ میں نکل آئے اور بل کھاتے ہوئے تنگ راستوں میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے کھلتے اور مرجھاتے ہوئے پھولوں اور پودوں کا معائنہ کیا۔ کھٹے اور لیموں کی شاخوں کی چھانٹی اور چنبیلی کی قطار کے نیچے نلائی کرنے کا حکم دے کر وہ واپس ہوئے۔ واپسی پر انہوں نے صبح کے دو گلدستے بنائے اور اس وقت انہیں گزرتی ہوئی بہار کا احساس ہوا اور انہوں نے ایک دوسرے سے ان وقتوں کا ذکر کیا جب پانچ پانچ گلدستے بنانے پر بھی پودے اسی طرح لدے پھندے رہتے تھے۔ نعیم نے گرے ہوئے بے شمار خشک پتوں اور پھولوں کو زمین میں دبا دینے اور اس طرح عمدہ کھاد تیار کرنے کی تجویز پیش کی جسے عذرا نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ وہاں نمی اور سائے میں پڑے پڑے وہ خود بخود گل سڑ جائیں گے اور نلائی پر زمین میں رل مل جائیں گے۔ نعیم اپنی بیوی کی اس احمقانہ دلیل پر دل میں ہنسا۔

پھر وہ اپنے مخصوص پیپل کے درخت کے نیچے پہنچے اور ڈالیوں میں سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ میں ناڑ کے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ عذرا اون کے گولے سنبھال کر اس کے موزے بننے لگی اور نعیم نے مونڈھے پر کھسک کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صبح کا پہلا سگریٹ سلگاتا کچھ یاد آنے پر اٹھا اور اندر سے جا کر لکڑی کی ایک تختی اٹھا لایا۔ کئی روز سے یہ زیر بحث تھا کہ اس پر کیا لکھ کر پھاٹک پر لٹکایا جائے۔ ہر روز کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکنے

کے باعث اسے ملتوی کر دینا پڑتا۔ آج اس نے یہ کام ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے تختی مونڈھوں کے درمیان لا کر رکھی تو عذرا نے مسکرا کر سلائیاں ایک طرف رکھیں اور جھک کر بیٹھ گئی۔ بڑی دیر تک وہ دونوں پچھلے دنوں کی تجویزوں پر غور کرتے رہے۔ نعیم اور عذرا۔ روشن محل۔ مے فلاور (ایک بہت بھولا ہوا نام نعیم نے پیش کیا)۔ اور اسی طرح کے کئی اور نام۔ لیکن اس سارے مباحثے کا کوئی مطلب نہ نکلا اور جب ہر ایک نام اور ہر ایک سطر کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر کسی نہ کسی طرف سے مسترد کر دی گئی تو انہوں نے ہار کر اس کا فیصلہ مویشیوں کے رکھوالے پر چھوڑ دیا جو کسی کام سے اُدھر سے گزر رہا تھا۔ بوڑھے رکھوالے نے ان کے اصرار کرنے پر، کسانوں کے انداز میں شرماتے ہوئے ایک سادہ سی سطر پیش کی جو دفعتاً ان دونوں کو بے حد بھا گئی اور وہ اس پر متفق ہو گئے۔ اسی وقت نعیم نے سیاہ روغن کے ساتھ تختی پر لکھا۔ ''یہاں نعیم اور اس کی بیوی رہتے ہیں۔'' اور سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا۔ پھر اس نے سگریٹ سلگایا اور مسرت اور سکون کے ساتھ صبح کی دھوپ کو ٹانگوں پر پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔

موزے بنتے ہوئے عذرا بار بار اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کوئی بات کرنا چاہ رہی تھی۔ نعیم اونگھ رہا تھا۔ اس کا بھاری جسم مونڈھے پر پھیلا اور سر چھاتی پر جھکا ہوا تھا۔ دھوپ اس کی ٹھوڑی تک پہنچ چکی تھی اور ایک کان اور ایک گال تپش سے لال ہو رہے تھے۔ اوپر کے ہونٹ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کا سگریٹ پیپل کے ایک زرد پتے پر گرا تھا اور سگریٹ اور پتا دونوں راکھ ہو چکے تھے اور ان پر مکڑی کا ایک باریک تار چمک رہا تھا۔ مونڈھے کی پشت پر ایک ننھی سی سبز رنگ کی چڑیا بیٹھی تھی جو کبھی کبھی پھدک کر اس کے کندھے پر آ بیٹھتی، لیکن اس کی غنودگی میں جو دھوپ کی آرام دہ حرارت، تازہ ہوا، قوت بخش کھانے اور جسمانی آسودگی کا نتیجہ تھی، چڑیا کی مداخلت سے کوئی فرق نہ آیا۔ قریب سے بہتی ہوئی نالی میں سطح آب پر دھوپ کی چنگاریاں برس رہی تھیں۔

آخر اس کی گہری نیند سے بے چین ہو کر عذرا نے اون کے گولے اور سلائیاں مونڈھے پر رکھیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ جھڑے ہوئے پتوں پر اس کے چلنے کی آواز سے نعیم کی آنکھ کھل گئی۔

''اوہ میں سو گیا تھا!'' وہ ہنسا۔

''دھوپ آ گئی تھی۔'' عذرا نے سرسری طور پر کہا۔ پھر وہ بے چینی سے مڑ کر باغ میں داخل ہو گئی۔

دیر تک وہ خنک، سایہ دار راستوں پر گھومتے رہے۔ دھوپ میں سے اٹھنے کے بعد درختوں کا سایہ انہیں آرام دہ اور بھلا محسوس ہوا۔ دوپہر سے پہلے کا آسمان روشن اور چمکدار تھا اور فضا بے حد خاموش اور شانت۔ راستوں کے ساتھ ساتھ پانی کی نالیاں اپنے مخصوص دھیمے شور کے ساتھ بہہ رہی تھیں اور درختوں کی چوٹیوں پر اڑتی ہوئی سبز چڑیوں کے پر دھوپ میں چمک رہے تھے۔

ہریالی اور سکون کے اس لمحے میں اگر کسی جان دار کے دل میں بے چینی تھی تو وہ عذرا تھی۔ لکڑی کے پھاٹک پر جھک کر وہ بولی: ''جلیانوالہ باغ کا واقعہ سنا؟''

''ہاں۔'' نعیم نے کہا۔ ''مگر مجھے تفصیلات معلوم نہیں ہوئیں۔ بہت آدمی مرے؟''

''ایک ہزار کے قریب موتیں بتلاتے ہیں۔ ابھی تو مارشل لاء لگا ہے۔ مکمل بلیک آؤٹ۔ پنجاب میں ہر طرف سے داخلہ بند ہے۔''

وہ لکڑی کے جنگلے پر جھکی رہی۔ نعیم سامنے فصلوں میں سے گزرتی ہوئی ایک جوان کسان عورت کو دیکھ رہا تھا۔ عورت نے سر پر مٹی کا دونا اور روٹیوں کی چنگیر اٹھا رکھی تھی اور پکی ہوئی فصل میں سے گزرتے ہوئے اس کا سر اور کندھے نظر آ رہے تھے۔ ایک کوا بڑی آہستگی سے چنگیر میں آ کر بیٹھا اور روٹیوں پر چونچ مارنے لگا۔ نعیم مسکرا کر اس وقت تک کوے اور عورت کو دیکھتا رہا جب تک کہ وہ نظر سے غائب نہ ہو گئے۔

''شاید خلافت کے سلسلے میں ہوا۔'' پھر اس نے کہا۔

''خلافت اور رولٹ ایکٹ۔''

''اررر...... رولٹ ایکٹ؟''

''ہاں۔ تم نے تو اب اخبار پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں رولٹ ایکٹ...... کا بھی پتا نہیں۔'' عذرا نے جھلا کر بات ختم کر دی۔

نعیم ناک کو چھو کر شرمندگی سے ہنسا۔ ''رولٹ ایکٹ! دراصل میں مصروف۔''

''مصروفیت کی بات نہیں۔ تم یوں ہی لاتعلق ہوتے جا رہے ہو۔'' عذرا نے تیزی سے کہا اور چل پڑی۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آ کر مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ عذرا موزے بننے لگی اور نعیم نے سگریٹ سلگایا۔ لیکن جلد ہی عذرا سلائیوں پر الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگی اور اس کی ذہنی کشمکش اوپر آ گئی۔ اس نے جلد جلد کئی بار نعیم کی طرف دیکھا' آخر دونوں ہاتھ گود میں رکھ دیئے۔

''تم جنگ پر سے لوٹ کر دو سال تک کیا کرتے رہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں؟ کانگرس کی طرف سے کام کرتا رہا۔''

وہ پھر سلائیوں پر جھک گئی۔

''کیوں؟'' نعیم نے پوچھا۔

''مجھے علم ہے۔''

''پھر؟''

''اب کیوں نہیں جاتے؟''

نعیم نے تعجب سے اسے دیکھا۔ غنودگی جو ابھی تک اس پر چھائی ہوئی تھی دفعتاً غائب ہوگئی۔ ''پگلی ہو؟ تمہیں چھوڑ کر میں کہاں جاؤں!''

عذرا نے سر اٹھا کر اپنی بھوری' مضطرب آنکھوں سے نعیم کو دیکھا۔ ''کیوں کیا ہندوستان آزاد ہوگیا؟''

نعیم کے دل میں ایک بہت پرانے خوف نے سر اٹھایا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امن اور سکھ کی اس گھڑی میں

ایک فرد واحد کے اضطراب اور بے چینی نے متعدی بیماری کی طرح ہر شے کو گرفت میں لے لیا تھا۔ نعیم نے پیپل کے تنے پر ہاتھ رکھ کر نالی میں تھوکا۔ اس کے سینے میں ایک بھاری' بے نام سی خلش ابھر رہی تھی۔

عذرا اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ''نعیم ......'' اس نے آنکھیں اٹھا کر کہا اور نعیم نے دیکھا کہ ان میں اس عورت کی' ہزار عورتوں کی بھرپور قوتیں یکجا تھیں۔ انتہائی کوشش سے وہ ذرا سا مسکرایا۔

''چلو چلیں ......'' عذرا بولی۔

''کہاں؟''

''امرتسر...... دونوں! ہیں' نعیم؟''

''عذرا...... یہ زندگی آسان نہیں ہے۔ تم نہیں جانتیں۔''

''لیکن اتنی دلچسپ ہے۔ اس بار میں دلی گئی تو ڈیسائی سسٹرز نے بدیشی مال کی دکانوں پر پکٹنگ کی تھی۔ ان کی تصویریں سارے بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں میں چھپیں اور جہاں بھی میں گئی انہیں کا تذکرہ رہا۔ ہر موقع پر ہر پارٹی میں تم کانگرس پارٹی کے ممبر ہو۔ ہم آسانی سے جا سکتے ہیں۔ نہیں' نعیم؟ ہم دونوں۔ ہیں' نعیم؟'' اس نے لجاجت سے دونوں ہاتھ اس کے بازو پر رکھے۔ ''میں اس جگہ سے اکتا گئی ہوں۔''

نعیم نے اس کے کندھوں کے گرد بازو لپیٹ کر اپنی طرف کھینچا اور مسکرا کر بولا۔ ''اچھا۔''

راستوں کے ساتھ ساتھ نالیوں میں بہتا ہوا پانی خاموش فضا میں اپنی مدھم موسیقی بکھیرتا رہا اور اس کے اوپر اسی خاموشی سے انسانی خواہشات کی آفت نے نعیم اور عذرا کو اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ خوشی خوشی جا کر مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔

ذہنی اور اعصابی آسودگی کے اس وقت میں نعیم نے اپنی بیوی کی بات کو لاپروائی سے سنا اور ٹال دیا۔ لیکن آنے والے دنوں میں عذرا کے حواس پر اس طاقت ور خواہش کا جادو سوار رہا اور ہر کام اور ہر بات اس نے بے خیالی اور بے دلی سے کی سوائے اس ایک بات کے' یہاں تک کہ آہستہ آہستہ نعیم پر بھی اس کا رنگ چڑھنے لگا۔

وہ اس انکوائری کمیٹی میں شامل کر لیا گیا جو انڈین نیشنل کانگرس نے غیر سرکاری طور پر امرتسر فائرنگ کی تفتیش کے لئے مقرر کی تھی اور مارشل لاء کی پابندیاں ہٹتے ہی وہ امرتسر پہنچے۔

(۱۹)

''یہ ہے وہ جگہ۔'' کبڑے بڈھے نے ہاتھ سے اشارہ کر کے انہیں بتایا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں انہوں نے سارا دن بسر کیا تھا اور اس سے پہلے کئی ایسے دن گزارے تھے۔ ایک کھلی سی جگہ کے گرداگرد چار فٹ اونچی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں کنواں کھدا تھا۔ یہ جگہ تین اطراف سے

اونچے اونچے سہ منزلہ مکانات میں گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف سے راستہ باہر کو نکلتا تھا۔ یہ جگہ' جو جلیانوالہ باغ کہلاتی تھی' باغ سے زیادہ مویشی باندھنے کا باڑہ معلوم ہوتی تھی۔ یہاں پر انہوں نے پچھلے چند روز فائرنگ کے سلسلے میں اخباری نمائندوں' سیاسی ورکروں' تاجروں اور وکیلوں کے بیانات قلمبند کرنے میں صرف کئے تھے۔ لیکن آج اتفاق سے راستے میں نہیں یہ بوڑھا مچھلی فروش مل گیا تھا جو باتیں کرنے کے شوق میں اس وقت انہیں وہاں لے آیا تھا جب کہ ان کے پاس کاغذ اور پنسل ختم ہو چکے تھے۔

وہ ٹھگنے جسم اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں والا کبڑا بڈھا تھا جس کی کمر کے خم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ پیدائشی تھا یا بڑھاپے کی وجہ سے نمودار ہوا تھا۔ اس کا لباس خستہ حالت میں تھا اور جسم سے مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اور داڑھی کے بال بھی گندے تھے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی توانائی اور معصومیت تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اکیلے پیدا ہوتے ہیں اور اکیلے ہی مر جاتے ہیں مگر جنہیں اپنی سادگی اور خوش دلی کی بنا پر لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور باتیں کرنے کے کافی مواقع میسر آتے ہیں۔

ان کے دیکھتے دیکھتے وہ نوجوانوں کی طرح اچک کر دیوار پر چڑھا اور دونوں پاؤں جوڑ کر آرام سے بیٹھ گیا۔

''یہ ہے وہ جگہ' میرے بچو۔'' اس نے اسی انداز میں ہاتھ پھیلا کر دہرایا۔

ڈھلتی ہوئی زرد دھوپ میں سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے لیکن جلیانوالہ باغ پر مکمل ویرانی تھی۔ صرف دو گورے سپاہی کمر سے ریوالور لٹکائے اندر گھوم رہے تھے۔ دیوار پر چڑھ کر بیٹھے ہوئے اس قدیم' سال خوردہ بڈھے کو اس کے ساتھیوں نے اشتیاق سے دیکھا اور انہیں محسوس ہوا کہ وہ ایک اجاڑ اور خشک سمندر کے کنارے پر کھڑے ہیں اور تہہ میں ڈوبے ہوئے شکستہ جہاز اور کشتیاں ننگی ہوگئی ہیں۔

عذرا نے سہم کر دونوں ہاتھ دیوار پر رکھے۔ ''ہمیں سب کچھ بتاؤ' مچھلی والے۔'' اس نے کہا۔

''ہمیں سب کچھ بتاؤ جو ہوا' بوڑھے مچھلی والے۔'' اُن سب نے کہا۔

''میں تو مچھلی بیچتا ہوں' بچو' شروع سے۔ جب میں پیدا ہوا۔ نہیں' بلکہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ کیونکہ جب میں پیدا ہوا اس وقت تو میرا باپ مچھلی بیچتا تھا اور میری ماں انہیں نمک لگایا کرتی تھی تاکہ وہ تازہ رہیں اور ان میں سڑاند پیدا نہ ہو۔ وہ بڑی اچھی اور نیک دل عورت تھی۔ میرا باپ اسے پیٹا کرتا تھا اور وہ مجھے پیٹتی تھی۔ لیکن سال کا زیادہ تر حصہ ہم امن اور سکون کے ساتھ رہتے تھے۔ مار پیٹ صرف اس وقت ہوتی تھی جب مچھلیاں میرے باپ کے ساتھ نہ لگتیں۔ مجھے یاد ہے کہ گرمیوں کا موسم جنگ اور مصیبت کا زمانہ ہوتا جبکہ دریا میں سیلاب آ جاتا اور مچھلیاں گدلے پانی میں بہت نیچے چلی جاتیں اور جال کے پھندے میں نہ آتیں۔ پھر میرا باپ سخت خفا ہوتا۔ دریا میں وہ مچھلیوں کو کوستا اور جال کو اور کشتی کو اور سورج کی تپش کو کوستا اور برابر غصے سے میری جانب دیکھتا جاتا اور مجھے ٹھونکنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا۔ لیکن میں ہمیشہ اس کے پنجے سے بچ نکلتا کیونکہ میں اس کی طرف پیٹھ کئے چپو چلاتا جاتا اور اس کے کوسنے ایک کان سے سن کر دوسرے کان اڑا دیتا اور جب کنارا آتا تو پوری قوت

سے دوڑتا اور جلد ہی اس کی زد سے باہر ہو جاتا۔ پھر میں تمام دن گھر کا رخ نہ کرتا کیونکہ مجھے علم ہوتا کہ وہاں افراتفری کا عالم ہوگا۔ میں مچھیروں کی جھونپڑیوں سے پرے پرے گندے پانی کے گڑھوں پر مارا مارا پھرتا اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑ کر چباتا رہتا۔ سیلاب کے دنوں میں مَیں ہمیشہ نمک کی ڈلی جیب میں رکھتا کیونکہ کچی مچھلیاں نمک کے بغیر آسانی سے نہیں کھائی جاسکتیں۔ پہلے پہل کچھ دقت ہوئی پھر بعد میں عادت ہوگئی اور میں مزے لے کر انہیں کھانے لگا۔ وہ میرے جسم میں بے انتہا گرمی اور خون پیدا کرتیں۔ پھر شام ہونے پر میں گھر جاتا اور دروازے کے باہر اندھیرے میں کھڑے ہوکر دیکھتا۔ ماں کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھ کر مجھے علم ہو جاتا کہ اس کی ٹھکائی ہوئی ہے۔ جب میں باہر کھڑا کھڑا نیند کے ہچکولے کھانے لگتا تو اپنے کتے کے پلے کو زمین پر دے مارتا جس پر وہ چیخنے لگتا اور میری ماں کو میری آمد کا پتا چل جاتا۔ لیکن وہ کافی ہوشیار عورت تھی' اس لئے وہ بہانے بازی سے کام لے کر پیار بھری آواز میں مجھے پاس بلاتی اور کوئی کام کرنے کو کہتی' مثلاً یہ کہ' کتا سویر سے بھوکا ہے۔ اس کے لئے مچھلی لے جاؤ۔ جب میں اندر داخل ہوتا تو وہ دروازے کی اوٹ میں سے نکل کر مجھے پکڑ لیتی اور میرے کان مروڑتی اور آنکھیں نکال کر مجھ پر چیختی اور مجھے آوارہ گرد' کام چور اور بدبخت کے ناموں سے پکارتی۔ یہ تقریباً وہی نام تھے جن سے میرا باپ ٹھونکتے وقت اسے مخاطب کیا کرتا تھا۔ پھر وہ میرے منہ پر زور زور سے طمانچے مارتی۔ پہلے پہل میں سچ مچ رو دیا کرتا' لیکن بعد میں جب میں عادی ہوگیا تو جھوٹ موٹ شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھالیتا اور میرا باپ نیند سے اٹھ کر ہم دونوں کو گالیاں دیتا۔ وہ چند ہفتے سخت آفت اور بدامنی کے ہوتے۔

ایک بار جب سیلاب بہت عرصے تک جاری رہے اور مفلسی کے مارے ہمارا برا حال ہوگیا اور ہمارے سارے کتے فاقے سے مرگئے تو میرا باپ بے حد چڑ چڑا ہوگیا اور بہانہ تلاش کرنے کی تکلیف کیے بغیر مجھے پیٹنے لگا۔ تب میں نے ایک تجویز سوچی۔ ایک روز حسب معمول جب کوئی مچھلی ہمارے ہاتھ نہ لگی تو میرے باپ نے خالی جال کشتی میں دے مارا اور ساری دنیا کو کوستے ہوئے میرے سر پر کھڑا ہوکر مجھے ٹھونکنے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے چپو سر سے اوپر اٹھا کر اپنا بچاؤ کیا اور کہا:

''ٹھہرو بابا۔ میری بات سنو!''

''اس نے ہاتھ روک لیا اور خفگی سے چھینکیں مارتا اور کھنکارتا ہوا مجھے گھورنے لگا۔ میں نے کہا: ''دیکھو۔ اگر تم مجھے مارو گے تو میں کشتی نہیں چلاؤں گا۔''

''میں خود کشتی چلالوں گا۔'' اس نے سڑیل مزاجوں کی طرح جواب دیا۔

''اور مچھلیاں کون پکڑے گا۔'' میں نے حیلہ جوئی کی۔

''مچھلیاں؟'' اس نے داڑھی میں انگلیاں ڈال کر سوچا۔ پھر کوسنے دے کر کہنے لگا: ''مچھلیاں ملتی کہاں ہیں۔'' میں نے فوراً کہا: 'جب سیلاب کم ہوگا؟ پھر پھر کون پکڑے گا؟'

وہ اسی طرح داڑھی میں انگلیاں ڈالے سوچتا رہا' پھر خاموشی سے جا کر جال پر بیٹھ گیا۔ میری بات اس کی

سمجھ میں آگئی کیونکہ اس کے بعد اس نے کبھی مجھ پر ہاتھ نہ اٹھایا۔

''لیکن بدامنی کا زمانہ زیادہ دیر تک نہ رہتا۔ کیونکہ جاڑوں کی آمد کے ساتھ ساتھ پہاڑوں پر برف پگھلنی بند ہو جاتی اور دریا کا پانی صاف ہو جاتا اور مچھلیاں اوپر آجاتیں اور ایک بار پھر ہمارے پاس سینکڑوں کی تعداد میں مچھلیاں جمع ہو جاتیں جنھیں میری ماں نمک لگا کر خشک کرتی اور بوریوں میں بھر دیتی اور ہم چند نئے کتے پال لیتے اور میرا باپ خوش مزاج ہو جاتا اور ہم تمام جاڑے' خزاں اور بہار کے موسم مکمل صلح کے ساتھ شریف اور امیر لوگوں کی طرح بسر کرتے' اور ہر روز شام کے وقت میری ماں آگ کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ باندھ کر چھت کی طرف دیکھتی اور کہتی: 'تیرا شکر ہے مالک کہ سیلاب گرمیوں میں آتے ہیں اور جاڑوں میں نہیں آتے ورنہ اگر سردیوں میں مچھلی نہ ملے تو پھیپھڑے کا بخار ہو جائے یا جوڑوں میں درد شروع ہو جائے اور اوپر سے تُو تُو مَیں مَیں جو ہو وہ الگ' تیرا شکر ہے' اپنی پٹائی کو وہ ہمیشہ تُو تُو مَیں مَیں کے نام سے یاد کرتی۔''

بڈھا سانس لینے کے لیے رکا تو پانچوں سننے والوں نے جس بے تابی کا اظہار کیا اس سے واضح تھا کہ اس کی بے تکی باتوں نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔

''ہمیں فائرنگ کے متعلق بتاؤ' مچھلی والے۔'' سب نے ایک ساتھ کہا۔

''ٹھہرو۔'' بڈھے نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا۔ ''سب کچھ بتاؤں گا۔ رات کے آٹھ بجے تک ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔ مجھے یاد کرنے دو۔ آج کئی روز کے بعد تم لوگ بات کرنے کو ملے ہو ورنہ اس شہر میں ایک سے ایک ہونق ہو رہا ہے۔ جس کسی سے بات کرو لگتا ہے جیسے قبر سے اٹھ کر آ رہا ہے اور بول نہیں سکتا۔ حالانکہ میں نے اس سے کہیں زیادہ آدمی وبا میں مرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ تو میں اپنی ماں کی بات کر رہا تھا۔ وہ بڑی نیک دل' ہوشیار اور خدا پرست عورت تھی۔ لیکن وہ جلد ہی مر گئی اور اس کا سارا کام ہمارے گلے پڑ گیا۔ پھر ہمیں اس کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ اب میرا باپ اکیلا ہی کسی نہ کسی طرح سے مچھلیاں پکڑ کر لاتا اور میں ان کو نمک لگا کر دھوپ اور چھاؤں میں سکھاتا اور تھیلوں میں بھرتا۔ رات کو ہم آمنے سامنے بیٹھ کر خشک مچھلیاں مرچوں کے ساتھ کھاتے۔ میرے باپ کو بڑھاپے کی وجہ سے کبھی کچی مچھلیاں کھانے کی عادت نہ پڑ سکی اور وہ جب تک زندہ رہا اسی تکلیف میں مبتلا رہا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ آگ جلانے میں ہم میں سے کوئی بھی ماہر نہ تھا۔ مجھے مزے لے کر مچھلیاں چباتے ہوئے دیکھ کر وہ انتہائی خفا ہوتا اور کہتا: 'جانور کے بچے' مگرمچھ کے بچے' کیسے مزے لے رہا ہے! اس پر میں ہنس کر کہتا: بابا تم مچھیرے ہو اور مچھلی نہیں کھا سکتے۔ کیسے مچھیرے ہو!''

''میں انسان کی اولاد ہوں' جانور کی اولاد نہیں ہوں۔'' وہ کہتا۔ کبھی کبھی اسے جلانے کے لیے میں کہتا: مَیں زندہ مچھلی بھی کھا سکتا ہوں۔ تم کھا سکتے ہو؟'

''چپ رہو۔ تم بکتے ہو۔'' وہ کہتا۔

'''اچھا؟' میں کہتا۔ 'تو یہ لو۔' یہ کہہ کر میں لکڑی کی بالٹی میں جس میں میں مچھلیاں پالا کرتا تھا' ہاتھ ڈال کر

ایک زندہ مچھلی نکالتا اور منہ میں پکڑ لیتا۔ میرے دانتوں کے درمیان تڑپتی ہوئی مچھلی کو دیکھ کر وہ غصے سے پاگل ہو جاتا اور ایک لمبی سی خشک مچھلی اٹھا کر میرے پیچھے دوڑتا۔ میں خشک مچھلی کے ڈر سے' جو کہ بید کی طرح لگتی ہے' باہر بھاگ جاتا اور اندھیرے میں کھڑا ہو کر اس کی غصیلی آواز سنتا رہتا: 'کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ سانپوں اور سؤروں کے بچے انسانوں کے گھر پیدا ہونے لگے ہیں۔ ایسا کبھی سنا تھا! زندہ مچھلی کو۔ زندہ آدمی کھاتا ہے۔ ایک زندگی دوسری زندگی کو' میں باہر کھڑا ہو کر خاموشی سے ہنستا اور مچھلی کھاتا رہتا۔'' بڈھا بازو ہوا میں پھیلا کر ہنسا جس سے اس کے آخری تین دانت' جو اس کے منہ میں رہ گئے تھے' ننگے ہو گئے اور آنکھوں کے گرد جھریاں پڑ گئیں۔ اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس کرنے کے باوجود سننے والے وقت کی کمی کی وجہ سے گھبرائے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ادھر ادھر کی باتیں چھوڑ کر جلد اصل موضوع پر آ جائے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں بڈھے نے بات جاری رکھی:

''لیکن جلد ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ گھر کا کام چلانے میں ہم کس قدر ناکام رہے ہیں۔ تمام مچھلیاں جو میں سکھا کر بوریوں میں بھرتا دو دن کے بعد بو دینے لگتیں اور انہیں گھر میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ چونکہ بیچنے کے قابل بھی نہ ہوتیں اس لیے جتنی ہم کھا سکتے ایک دو روز میں جلد جلد کھا لیتے' باقی گلی سڑی مچھلیاں دریا میں بہا دیتے۔ اس کے بعد میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہماری روزانہ کی آمدنی میں نمایاں کمی ہوتی جا رہی ہے' اور ایک وقت آیا کہ جتنی مچھلی گھر میں آتی روز کی روز ہم ہضم کر جاتے۔ خشک مچھلی کے مقابلے میں میرے باپ کو تازہ کچی مچھلی زیادہ بھا گئی جس کی چربی نرم اور نمکین ہوتی ہے۔ چنانچہ اِدھر وہ چند مچھلیاں لا کر رکھتا اُدھر کھڑا کھڑا چٹ کر جاتا۔ میں نے سوچا یوں کام نہیں چلے گا۔ آخر ایک دن کچھ اپنی کچھ اپنے باپ کی نااہلی پر جھلا کر میں نے جھونپڑی کا دروازہ بند کیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

''ماگھ کا مہینہ تھا' یا شاید پھاگن کا۔ مجھے یاد ہے پہاڑوں پر برف جمی تھی اور دریا کا شفاف پانی تہہ کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس میں دوڑتی بھاگتی ہوئی مچھلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں کشتی چلا رہا تھا اور میرا باپ میری طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو چکی تھیں اور ان پر زرد زرد نسیں ابھر آئی تھیں۔ لیکن موسم بڑا شاندار تھا۔ دریا اور آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا اور ہوا ہمارے بال اڑا رہی تھی اور میرے باپ کے اڑتے ہوئے بال برف کی طرح سفید تھے اور دھوپ میں خوش نما لگ رہے تھے اور ہوا کی وجہ سے جو ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں ان پر ہماری کشتی ڈول رہی تھی۔ چلتے چلتے ہم مچھلیوں کے خطے میں داخل ہوئے۔ یہاں پر دریا کنارے کو کاٹتا ہوا بہت اندر تک چلا گیا تھا اور ٹھہرے ہوئے پانی کی ایک ننھی سی جھیل کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہاں پر ہم نے ہزاروں کی تعداد میں مچھلیاں دیکھیں۔ رنگ برنگ کی چھوٹی بڑی قسم قسم کی مچھلیاں پانی میں کھیل رہی تھیں اور دھوپ چھن چھن کر ان کے جسموں پر پڑ رہی تھی۔ میرے باپ نے جال پھینکا۔ مچھلیوں میں افراتفری مچ گئی۔ جال میں بہت سی بڑی بڑی مچھلیاں آئیں اور انہیں کشتی میں لاد کر ہم واپس لوٹے۔ میں بے حد خوش تھا اور تیز تیز چپو مار رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے باپ نے جال میں ہاتھ ڈال کر کلبلاتے ہوئے

ڈھیر میں سے ایک مچھلی نکالی اور اسے ہاتھ میں پکڑے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ بڑی خوبصورت مچھلی تھی۔ اس کا رنگ گہرا نیلا اور اوپر بڑے بڑے سنہری رنگ کے چانے تھے۔ وہ گردن کے پر پھلا پھلا کر سانس لے رہی تھی اور کھلی ہوئی آنکھوں سے جانے کدھر دیکھ رہی تھی۔

''پانی خوبصورت ہے۔'' میرے باپ نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا گھر بدصورت ہے۔ تو اپنے گھر جا۔'' میرے باپ نے کہا اور ہاتھ لٹکا کر اسے پانی میں چھوڑ دیا۔ مجھے اس کی اس احمقانہ حرکت پر بڑا تاؤ آیا اور میں نے اسے متوجہ کرنے کو ناک میں سے آواز نکالی۔ لیکن وہ گہری سوچ میں تھا۔ پھر اس نے دوسری مچھلی اٹھائی۔ اس کا جسم قرمزی رنگ کا تھا اور اوپر سیاہ لکیریں تھیں اور اس کی آنکھوں کا رنگ سرخ تھا اور دم بھی سرخ تھی۔ 'تم خوبصورت ہو۔ میرا گھر بدصورت ہے۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ'' میرے باپ نے کہا اور اسے بھی چھوڑ دیا۔ پانی میں داخل ہوتے ہی مچھلی نے تیزی سے دم چھنکی اور تہہ میں چلی گئی۔ پھر میرے باپ نے ایک اور مچھلی اٹھائی جس کی جلد سفید ریشم کی طرح تھی اور جس پر دنیا کے ہر رنگ کے نقطے اور لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا سر اور آنکھیں اور ہونٹ بھی سفید تھے۔ میرے باپ نے یہ کہہ کر اسے بھی چھوڑ دیا: ''تم بھی خوبصورت ہو۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ۔ مجھے پیٹ بھرنے کے لیے بس چند ایک نکمی اور بدصورت مچھلیوں کی ضرورت ہے۔''

غرضیکہ کنارے پر پہنچنے سے پہلے پہلے تمام عمدہ عمدہ مچھلیاں اس نے ضائع کر دیں۔ میں خاموش بیٹھا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ مگر دل میں مطمئن تھا کہ بالآخر مجھے روزانہ کے نقصان کا راز معلوم ہو گیا ہے۔ کنارے پر اتر کر میں نے اس سے کہا۔ 'دیکھو بابا۔ تم کل سے گھر پر رہو گے۔ دریا پر میں جاؤں گا۔'

''کیوں؟'' اُس نے خفگی سے پوچھا۔

'کیوں؟' میں چیخ کر بولا۔ ''تم ساری مچھلیاں تو ضائع کر دیتے ہو۔ کیوں!'' میں غصے سے کانپ رہا تھا۔ میری عمر اس وقت گیارہ برس کی تھی لیکن میرے تیور دیکھ کر وہ ڈر گیا اور خاموشی سے سر جھکا کر آگے آگے چلنے لگا۔ راستے میں اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا: ''جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے اور تمہاری عورت مر جائے گی تو تمہیں پتا چلے گا۔'' میں غصے میں تھا اس لیے اس کی بات کے جواب میں خاموش رہا۔

''اس کے بعد وہ ہمیشہ گھر پر رہتا اور میں دریا پر جاتا۔ ہمارے پاس پھر مچھلیوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا اور مچھیروں کی بستی میں ہم ایک بار پھر متمول خاندانوں میں شمار ہونے لگے۔ مگر اب میرا باپ روز بروز بوڑھا اور اندھا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سارا سارا دن چھاؤں میں مچھلیوں کو پھیلا کر ان کی رکھوالی پر بیٹھا رہتا اور دوسرے مچھیروں کو لڑنے جھگڑنے سے منع کرتا اور جو لوگ اپنی عورتوں کو پیٹتے ان کو نصیحت کرتا کہ عورتوں کو پیٹنا نہیں چاہیے ورنہ وہ مر جاتی ہیں اور پھر بڑھاپے میں کچی مچھلیاں کھانے کی لعنت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''اسی طرح جب میں سن بلوغت کو پہنچا تو وہ مر گیا۔ بڈھا سانس لینے کے لیے رکا اور سادگی سے ہنس کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے تین دانت پھر نمودار ہو گئے۔ اب وہ سب اس بڈھے کے باتونی پن اور اس کی

باتوں سے اکتا چکے تھے اور نعیم تو اس سے کوئی فائدہ مند تفصیلات حاصل کرنے کی امید قطعی طور پر کھو چکا تھا۔ صرف عذرا' جسے نعیم یا اس کے ساتھیوں کے کام سے زیادہ سروکار نہ تھا' اس سے دلچسپی لے رہی تھی۔

''پھر' مچھلی والے؟'' عذرا نے کہا۔

''ہمیں تیرہ اپریل کا واقعہ بتلاؤ' مچھلی والے' ورنہ ہم چلے جائیں گے۔'' مردوں میں سے ایک نے کہا۔

''اوہ اچھا اچھا۔ میں آٹھ بجے سے پہلے پہلے سب کچھ بتا دوں گا۔ میرے بچو۔ گھبراؤ مت' کیونکہ آٹھ بجے تمہیں چلے جانا ہوگا۔ اس وقت یہاں کرفیو شروع ہو جاتا ہے۔ جب میرا باپ مرگیا تو میں اکیلا رہ گیا۔ پھر میں نے گھر کے کام کے لیے ایک عورت کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن بدقسمتی سے میرا قد بہت چھوٹا رہ گیا تھا۔ جو بھی عورتیں مجھے ملیں بہت قد آور نکلیں اور انہوں نے میرے ساتھ رہنا پسند نہ کیا۔ جو دو ایک عورتیں راضی ہوئیں وہ بدمزاج نکل آئیں' اور بدمزاج عورتیں تم جانتے ہو بچو' مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے عورتوں کی تلاش میں وقت ضائع کرنا ترک کر دیا۔ پھر میں نے اپنے باپ کی ٹوکری نکالی اور اس میں روزانہ کی تازہ مچھلیاں ڈال کر بیچنے لگا۔ اب گھر کا کوئی کام نہ تھا اور عورت کی ضرورت نہ تھی۔ میں خوش خوش اکیلا رہنے لگا اور اب تک رہتا ہوں۔ میرے پاس اب بھی میرے باپ کی ٹوکری ہے جس میں میں مچھلیاں بیچتا ہوں حالانکہ اپنا گاؤں چھوڑ کر اب میں شہر میں آ گیا ہوں۔ میں نے آج تک کچی مچھلی اور اُبلی ہوئی مکئی کے سوا کچھ نہیں کھایا۔ میں اس وقت تک اپنے باپ سے پانچ برس زیادہ دنیا میں رہ چکا ہوں۔ میں نے جلیانوالہ باغ سے کہیں بڑے موقعے دیکھے ہیں۔ سن ستاون کا غدر' جب میرا باپ نیا نیا فوت ہوا تھا' اور اس صدی کے شروع کا سرخ بخار' اور...... اور' لیکن تم لوگ چونکہ اس واقعے کا اصرار کرتے ہو اس لیے میں تمہیں اسی کا قصہ سناؤں گا۔' میں اس دن کی اور اس سے پہلے کئی دن کی ایک ایک بات بتا سکتا ہوں۔ سن ستاون کے پچاس برس کے بعد غدر کی ایک ایک بات سن کر ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا' تم کیا کھاتے ہو' میں نے بتایا: 'مچھلی اور ابلی ہوئی مکئی' تو وہ کہنے لگا: اسی لیے تم عقل مند آدمیوں میں سے ہو۔'' بڈھے نے بیٹھے بیٹھے کمر سیدھی کی اور اندھیرے میں اس کی تین سفید دانت دکھائی دیئے جس سے سننے والوں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے سادہ بے تکلف اور متکبرانہ انداز میں ہنس رہا تھا۔ ''بدامنی چوتھے مہینے کے نویں دن ہی شروع ہوگئی تھی جب شہر کے چار بازاروں میں نو انگریزوں کو مار دیا گیا۔ ہر بات میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ انہوں نے مجھے ٹھہرایا۔ وہ دو تھے۔ میں نے سمجھا مچھلی کے گاہک ہیں۔ خوشی خوشی میں نے ٹوکری نیچے رکھی۔ ایک وہیں کھڑا رہا' دوسرا کیمرہ آنکھ سے لگائے لگائے پیچھے ہٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے تصویریں لیں۔ پھر جیب سے چاندی کا ایک سکہ نکال کر میری طرف اچھالا۔ سکہ ذرا غلط نشانے پر پڑا اور میں نے پاگلوں کی طرح ناچ ناچ کر اور گھوم گھوم کر اسے ہوا میں پکڑنے کی کوشش کی۔ اس نے اور تصویریں لیں۔ آخر سکہ زمین پر گر پڑا۔ جب میں اسے اٹھا چکا تو وہ جا رہے تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے۔ اب۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے گلی کے موڑ سے دو آدمی ان پر حملہ آور ہوئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ایک کی تلوار

اس کے، جس نے تصویریں لی تھی، پیٹ کے پار ہوگئی۔ دوسرے کی تلوار اس کے ساتھی کی پسلیوں میں اٹک گئی۔ دونوں گرتے ہی ختم ہوگئے۔ میں واقعے کی سرعت کی وجہ سے ششدر رہ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ابھی ابھی میں نے ان غیر ملکیوں سے روپیہ قبول کیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ سؤر مجھ پر بھی حملہ آور ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے روپیہ اندرونی جیب میں رکھا اور ٹوکری اٹھا کر وہاں سے کھسک آیا۔ اگلے بازار میں مَیں نے تین اور لاشیں دیکھیں جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پڑی تھیں۔ ان کے چہرے ابھی گرم تھے۔ وہ بھی تینوں غیر ملکی تھے، جن کے سنہرے بال خون اور گرد کی وجہ سے بدرنگ ہو رہے تھے۔ ان کے پاس کیمرے نہیں تھے۔ کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے ہاتھ خالی تھے۔ بازار میں لوگ عجلت سے دکانیں بند کررہے تھے۔ چند ایک لاشوں کے آس پاس کھڑے تھے اور ان کے چہرے بچوں کی طرح زرد اور خوفزدہ تھے۔ مجھے ان لوگوں کی حالت پر بڑا ترس آیا کیونکہ میں اس سے کہیں بڑے بڑے موقعے دیکھ چکا تھا اور یہ صورت حالات میرے لیے معمولی تھی۔ چنانچہ ان میں دلچسپی لیے بغیر میں وہاں سے گزر گیا، بلکہ میں نے اپنا کاروبار بھی بند نہ کیا اور برابر مچھلی کی آواز لگاتا رہا۔ دربار صاحب کے بڑے دروازے کے سامنے میں نے ایک اور انگریز کو دیکھا جو مر رہا تھا۔ ایک پتلی سی چھری اس کی گردن کے آر پار ہوچکی تھی اور وہ اس کے دستے کو پکڑے جان کنی کی حالت میں سے گزر رہا تھا۔ دوپہر کے وقت شہر کا سب سے بڑا چوک ویران پڑا تھا اور آس پاس کوئی جان دار دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں وہاں سے بھی گزر گیا۔ لیکن وہ بڑا خوبصورت لڑکا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود میں اسے دوبارہ دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ راستے کے موڑ پر رک کر میں نے دیکھا۔ مرتے ہوئے اس شخص کا چہرہ آسمان کی طرف تھا اور نوجوان ہونٹ سرد ہوچکے تھے۔ بچو، تم خوش قسمت ہو کہ ابھی نوجوان ہو اور لاعلم ہو۔ میں بڈھا مچھلی والا ہوں۔ لیکن ایک زمانہ گزار چکا ہوں اور زندگی کی چند ایک باتوں کا علم رکھتا ہوں۔ نوجوان چہرے، اور آنکھیں، اور ہونٹ دنیا کی خوش نما چیزیں ہیں۔ لیکن جب وہ سرد کردیئے جاتے ہیں۔ میں نے مچھلیاں دیکھی ہیں جو موت میں بھی آنکھیں کھول کر مسکراتی رہتی ہیں، مگر نوجوان۔ ان کی دوسری بات ہے۔ اس سے انسان کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کا خیال دل سے نکالنے کے لیے میں نے زور سے مچھلی کی آواز لگائی۔ اسی طرح کچہری تک پہنچتے پہنچتے میں نے تین اور لاشیں دیکھیں جو نالیوں کے کنارے اور پٹریوں پر پڑی تھیں۔ اور لاشوں کے علاوہ میں نے ایک آگ دیکھی، پوشیدہ اور خاموش آگ جو سڑکوں اور گلیوں اور بازاروں میں دوڑتے ہوئے شہریوں کے درمیان لپک رہی تھی۔ آگ جو جسموں کے بجائے دلوں اور آنکھوں میں لگی تھی۔ ایک خوفناک غصہ جو تمام شہریوں کے سروں پر لہرا رہا تھا اور میں تمہیں سچ بتاتا ہوں بچو، تم نے نہیں دیکھا میں نے دیکھا ہے۔ میں نے ہزارہا مردہ انسان اور جوان اور مچھلیاں دیکھی ہیں، اور سرخ وبا میں ایک ایک دروازے سے تین تین مردے بیک وقت نکلتے اور عورتوں کو ماتم کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور جب ریل گاڑیوں کی ٹکر ہوئی تو میں وہاں پر موجود تھا اور میں نے دیکھا کہ ایک آدمی کی گردن کے پاس دوسرے کا سر پڑا تھا، اور میں نے چیختے چلاتے اور ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہوئے قافلوں کو دیکھا ہے مگر کبھی خوفزدہ نہیں ہوا، کبھی نہیں، کیونکہ اس میں خوفزدہ ہونے کی کوئی بات ہی

نہیں، لیکن وہ خاموش اور دبا ہوا غصہ جو اس شہر کے ہر نفس، ہر جان دار اور ہر پیڑ میں سانس لے رہا تھا اسے دیکھ کر میں گھر چلا آیا۔

''اس وقت سے شہر کا تمام کاروبار بند ہوگیا اور سڑکوں پر اور بازاروں میں فوجی ٹرک اور گورے سپاہی پھرنے لگے اور شہر کے باشندے، جو چپے چپے پر بکھرے ہوئے تھے، اب گلیوں، کونوں اور محلوں کے اندر گروہوں میں اکٹھے ہونے لگے، جیسے ایک مچھلی کے جال کو قینچی سے بیچ میں سے کاٹ دیا جائے تو جگہ جگہ سے گچھوں میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اور انہی میں سے ایک گروہ تھا جس نے کہ بھرے بازار میں اس انگریز عورت کی بے حرمتی کی جو فساد کی جڑ بنی۔ یہ انتشار کا تیسرا روز تھا۔ میں حسب معمول مچھلیاں اٹھائے پھر رہا تھا۔ اور دل میں کڑھ رہا تھا کیونکہ ان میں سڑاند پیدا ہو چکی تھی اور مجھے ان سے نفرت ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے ہوشیاری سے کام لے کر اب آواز لگانی بند کردی تھی۔ کیونکہ کئی دن گزر جانے پر اب ان میں خوبیاں کم ہی رہ گئی تھیں، اور اس امید میں انہیں لئے چپ چاپ پھر رہا تھا کہ شاید کوئی نیک دل شوقین انہیں خرید لے۔ بڑے بازار میں جب اس گلی کے مقابل پہنچا جو بازار کو سبزی منڈی کے ساتھ ملاتی ہے تو ٹھٹک کر رک گیا۔ گلی میں سے ایک گوری عورت دوڑتی ہوئی نکل رہی تھی۔ اس کے پیچھے شہریوں کا ایک گروہ شکاری کتوں کی طرح لگا ہوا تھا۔ بازار کے وسط میں انہوں نے عورت کو آلیا۔ چاروں طرف سے اسے گھیرے وہ پلید نظروں سے اسے گھورتے رہے۔ عورت کے بال راکھ کے رنگ کے تھے اور اس کی اوڑھنی غائب تھی۔ اس کی ٹانگیں کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے درمیان کلدار گڑیا کی طرح بہت آہستہ آہستہ ایڑیوں پر گھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید مچھلی کی طرح بے جان تھا۔ کچھ دیر تک ہجوم خاموش رکا پلکیاں جھپکاتا رہا۔ پھر ایک شخص آگے بڑھا اور عورت کی قمیض کو گلے سے پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دامن تک پھاڑ دیا۔ عورت نے چیخ ماری جس سے سارا طلسم ٹوٹ گیا اور مجمع اس پر پل پڑا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ بیس پچیس آدمیوں کے نیچے غائب ہوگئی لیکن اس کی چیخیں زمین کے ساتھ ساتھ مجھ تک پہنچتی رہیں۔ میرے سامنے وہ سب اسے کوؤں کی طرح نوچتے رہے۔ مگر وہ عجب سخت جان ربڑ کی عورت تھی بھئی واہ وا۔ میں نے اس سے زیادہ عجیب وغریب عورت آج تک نہیں دیکھی۔ اِدھر ہجوم کا دباؤ ذرا کم ہوا اُدھر وہ اچھل کر ان کے بیچ میں سے نکلی اور ایک طرف کو بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے بدن پر پھولدار قمیض کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف اس کے چوتڑوں پر ہلکا سا زیر جامہ اور چھاتی پر عورتوں کے پہننے کا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ اس کے بال سر پر کھڑے تھے اور وہ ٹانگیں پھیلا کر پوری رفتار سے چڑیلوں کی طرح بھاگ رہی تھی۔ اس کے پلے ہوئے سفید کولہے اور رانیں ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہل رہی ہیں۔ آہ۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ یہ عورت اگر شام کے وقت گھر میں بیٹھ کر مچھلی کھا رہی ہو تو شاید آنکھوں کو بھلی لگے۔ آہ۔ اس کے بعد وہ گروہ اسی گلی میں غائب ہوگیا۔ میں دل میں انہیں لعنت ملامت کرتا ہوا واپس چلا آیا۔

''اس رات پہلی بار مجھے اچھی طرح سے نیند نہ آئی۔ اس سے پہلے مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری نیند میں گڑبڑ

ہوئی ہو۔ میں خوب سونے کا عادی ہوں کیونکہ نیند صحت کے لئے مفید ہوتی ہے۔ لیکن اس رات میں خشکی کے مارے ہوئے مریضوں کی طرح جاگتا رہا۔ پھر مجھے اپنی صحت کے متعلق بڑا فکر ہوا۔ پہلے میں نے آگ جلا کر کمرے کو خوب گرم کیا۔ پھر بچی کھچی مچھلیوں کو آڑا ترچھا دیوار کے ساتھ کھڑا کیا تا کہ گلنے نہ پائیں۔ پھر کونے میں جا کر چٹائی پر لیٹ گیا جو کہ میری روزانہ سونے کی جگہ ہے۔ لیکن نیند نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ یہ شاید سڑاند کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ میں اٹھا اور مچھلیوں کو ایک ڈھیر میں اکٹھا کر کے ٹوکری کے نیچے ڈھک دیا۔ پھر اپنی مقررہ جگہ پر واپس آ کر داہنی کروٹ لیٹ گیا۔ کیونکہ اس طرح میں گہری نیند سوتا ہوں۔ نیند پھر بھی نہ آئی۔ میں اٹھ کر چٹائی آگ کے قریب لے گیا۔ مگر چند ہی سانس لئے ہوں گے کہ گرمی کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اب میں اکڑوں بیٹھا تھا اور اپنی جسمانی حالت پر غور کر رہا تھا کہ سوچتے سوچتے مجھے ایک تجویز سوجھی۔ میں نے ٹوکری اٹھائی اور گندی مچھلیوں کو چن چن کر ایک طرف رکھا۔ ''نیند تو آتی نہیں۔ آؤ تم سے گپیں ہی ماریں۔ میں نے کہا اور ایک سڑی ہوئی مچھلی اٹھائی۔ مچھلی کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''میرا باپ زندہ ہوتا تو تمہیں مرنے سے پہلے ہی چھوڑ دیتا۔ لیکن میں تمہیں آسانی سے نہیں چھوڑنے کا۔ کان کھول کر سن لو۔'' میں نے کہا۔ ''تم لاکھ ہنسو' لیکن تمہارے بچے اور دوسرے رشتہ دار تمہاری موت پر آنسو بہا رہے ہوں گے۔' مچھلی اسی طرح ہنستی رہی۔ مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ 'تم سوتی نہیں؟ بے آرام جانور۔ تمہیں مرے بھی ایک عرصہ ہو گیا پر بے دید آنکھیں اسی طرح کھلی ہیں۔ نہ خود سوتی ہو نہ کسی کو سونے دیتی ہو۔ لو......' یہ کہہ کر میں نے اسے آگ میں اچھال دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں خشک مچھلی تڑ تڑا کر جلنے لگی۔ مگر اس کی آنکھیں اسی طرح کھلی تھیں اور آگ میں پڑی ہوئی وہ ابھی تک ہنس رہی تھی۔ میں نے غصے میں دوسری مچھلی کو بھی اٹھا کر آگ میں پھینکا۔ یہ مقابلتاً سنجیدہ چہرے والی مچھلی تھی لیکن یہ بھی جاگ رہی تھی۔ جلتی ہوئی مچھلی کی چربی کی بو ہر طرف پھیل رہی تھی جو کہ اگر تم نے کبھی سونگھی ہے بچو تو تمہیں پتا ہوگا کہ کافی اشتہاء آور ہوتی ہے مگر آدھی رات کے وقت میں نے زیادہ کھانا مناسب نہ سمجھا اور بھوک کو کسی اور وقت پر ٹال کر ایک اور مچھلی اٹھائی۔

''تمہاری جلد بڑی خوبصورت اور نرم ہے۔ شاید کوئی گاہک مل جائے۔ تم آرام کرو۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔

''یہ تجویز کارگر ثابت ہوئی اور کافی دیر تک ان کے ساتھ گپ شپ کرنے اور ناکارہ مچھلیوں کو جلانے کے بعد میں خود بخود سو گیا۔

''صبح جو سو کر اٹھا تو سورج سر پر آن پہنچا تھا اور باہر چہل پہل تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ آج کئی روز کے بعد سڑکیں آباد ہوئی تھیں۔ میں نے اچھی طرح سے آنکھیں مل کر نیند کو دفع کیا۔ وہ سب بڑی جلدی میں تھے اور ایک ہی طرف کو جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مچھلی کی نیلامی شروع ہو چکی ہے اور وہ اس فکر میں ہیں کہ اچھی اچھی مچھلی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ لیکن ایک بات جس سے وہ مچھلی کے گاہک معلوم نہ ہوتے تھے ان کی خاموشی تھی۔ وہ بات

کئے اور شور مچائے بغیر تیز تیز چل رہے تھے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے: بڈھے جوان' چھوٹے بڑے' پتلے موٹے' لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ سب کے رنگ زرد تھے اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہ رہے تھے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے جستجو ہوئی۔ جلد جلد ٹوکری میں مچھلیاں بھر کر باہر نکلا اور ان میں شامل ہوگیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی' پھر بھی میں نے ہونٹ بھینچ لئے اور انہی کی طرح اکڑ کر چلنے لگا۔ وہ تعداد میں بے شمار تھے۔ آگے اور پیچھے حد نظر تک ان کی قطاریں تھیں اور وہ ہر طرف سے آ رہے تھے۔ اسی طرح چلتے چلتے ہم بازار کے منہ پر پہنچ گئے۔ وہاں پر بہت سے مسلح گورے سپاہی کھڑے تھے۔ جب ہمارا ہجوم بازار میں داخل ہونے کو بڑھا تو انہوں نے شستیں باندھ لیں اور اِدھر اُدھر بکھر کر میدان جنگ کی طرح مورچہ لگالیا۔ ہم ڈر کر رک گئے۔ پھر بازار میں سے ہندوستانی لاٹھی بردار پولیس کا ایک دستہ برآمد ہوا جس نے ہم پر لاٹھیاں برسانی شروع کیں جو کسی کو لگیں کسی کو نہ لگیں' لیکن اس سے یہ ہوا کہ ہم بازار میں داخل نہ ہو سکے۔ ایک لاٹھی میری ٹوکری پر لگی جس سے وہ گر پڑی اور ساری مچھلیاں بکھر گئیں۔ انہیں اکٹھا کرتے ہوئے چند لاٹھیاں میری پیٹھ پر بھی پڑیں لیکن میں نے ساری مچھلیوں کو اکٹھا کر کے چھوڑا۔ جب میں اٹھ رہا تھا تو میرے کان میں گونج دار نعروں کی آواز آئی۔ یہ ایک دوسرا ہجوم تھا جو مخالف سمت سے آ کر بازار میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس کو بھی لاٹھیوں کی مدد سے روکا گیا اور وہ ہمارے ساتھ آملا۔ ان کے آ کر ملتے ہی ہمارے لوگوں کی زبانوں میں جان پڑ گئی اور گونگا مجمع یکبارگی پوری طاقت سے چلاّ اٹھا۔ اب ہم ہزاروں کی تعداد میں تھے اور ایک لمبا چکر کاٹ کر اس طرف کو بڑھ رہے تھے جہاں اس وقت موجود ہیں۔ میرے چاروں طرف لوگ دھکم پیل کر رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے اب خوف و ہراس غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ خون اور جوش ابھر آیا تھا۔ ان کے منہ گرد آلود تھے اور بار بار دل دہلا دینے والی آواز میں کھل رہے تھے۔ ہم دیر تک اچھل اچھل کر اور چھلانگیں لگا کر چلتے ہوئے اور شور وغل مچاتے ہوئے سڑکوں پر بڑھتے رہے۔ راستے میں کئی چھوٹے چھوٹے ہجوم ہمارے ساتھ آ کر مل گئے اور کئی جگہ مسلح سپاہیوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی۔

''جب ہم یہاں داخل ہوئے تو باغ میں انسانوں کا ایک سمندر تھا جس کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ ہم سے پہلے بھی یہ بھرا ہوا تھا' جب ہم داخل ہوئے تو بھی یہ بھرا ہوا تھا' اور ہم سے بعد میں بھی گھنٹوں اس میں لوگوں کا سیلاب داخل ہوتا رہا اور یہ بھرا ہی رہا۔ گرد کا ایک طوفان پاؤں تلے سے اٹھ اٹھ کر سروں پر منڈلا رہا تھا۔ لاکھوں لوگوں نے قیامت کا شور مچا رکھا تھا اور انتشار کا یہ عالم تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ گرد میری ناک میں گھس رہی تھی اور میرے پاؤں ہزاروں پاؤں کے نیچے کچلے جا رہے تھے اور کھلی بہار میں بھی میرے سر میں سے پسینے کی دھاریاں بہہ رہی تھیں۔ میں ان کو کوس بھی رہا تھا لیکن وہاں سے نکلنا بھی مشکل تھا۔ اس ریلتے پیلتے اور شور مچاتے ہوئے مجمعے میں مَیں واحد شخص تھا جس کے سر پر ٹوکری تھی اور مجھے اس بات پر دل میں شرم محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اسی وقت میری نظر بارہ سال کے ایک بچے پر پڑی جو شاید اپنے باپ سے بچھڑ گیا تھا اور ہجوم میں دھکے کھا رہا تھا اور

رو رہا تھا۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر گرتا پڑتا میں اسے ایک طرف لے گیا۔ وہ روتا رہا۔ میں نے ٹوکری میں ٹٹول کر ایک اچھی سی مچھلی نکالی اور اس کے ہاتھ میں تھمائی جسے دیکھ کر وہ چپ ہوگیا اور خوش خوش ایک طرف کو چل پڑا۔ پھر میں نے سوچا کہ ٹوکری لے کر آنے کے یہ فائدے ہیں۔

''دروازے میں سے ابھی تک چلاتے ہوئے لوگ داخل ہو رہے تھے۔ مسلمان اپنے خدا اور مذہبی رہنماؤں کا نام لے کر اور ہندو اور سکھ اپنے خداؤں کو پکار پکار کر نعرے لگا رہے تھے۔ جب میں مڑا تو سب لوگ ایک سیاہ داڑھی والے شخص کی طرف دیکھ رہے تھے جو ایک اونچی جگہ پر کھڑا مجمعے کو چپ کرانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کی داڑھی ہوا میں ہل رہی تھی لیکن وہ اپنی کوشش میں کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پیچھے ایک گورا نمودار ہوا جس نے فوجی افسروں کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس نے دھکا دے کر کالی داڑھی والے کو نیچے گرا دیا اور اسی کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی اور اس کی انتہائی غصیلی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی لیکن اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ وہ ہمیں وہاں سے دفع ہو جانے کو کہہ رہا ہے۔ اچانک شور پھر بلند ہوا اور اس کی آواز دب گئی۔ ایک طرف سے کسی نے جوتا اتار کر اس کی طرف پھینکا۔ پھر ہر طرف سے جوتوں کی یلغار شروع ہوئی۔ ساتھ ساتھ مجمع مسلسل حرکت میں تھا۔ کیونکہ اس دھکم پیل میں ایک جگہ رکنا سخت مشکل تھا۔ اب آس پاس سے ہزاروں نئے اور پرانے جوتے پھینکے جا رہے تھے اور ہوا میں جوتوں کی یلغار تھی، جیسے دریا کی سطح پر سے مرغابیوں کی ڈار اڑ کر ایک لمحے کے لئے اندھیرا کر دیتی ہے...... لیکن فوجی افسر کے ارد گرد کے لوگ ڈرے ہوئے چپ چاپ کھڑے تھے اور پیچھے سے آنے والے جوتے ان کے سروں پر گر رہے تھے۔ اس وقت میں نے ہوشیاری سے کام لے کر اپنے جوتے سنبھال کر رکھے کیونکہ میرے پاس، تم جانتے ہو بچو کہ جوتوں کا صرف ایک ہی جوڑا ہے۔ جب جوتے ختم ہوگئے تو لوگوں نے اپنے کپڑے اتار اتار کر پھینکنے شروع کر دیئے۔ اب پگڑیوں، قمیضوں اور بنیانوں کے گولوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور جلد ہی آدھے سے زیادہ لوگ ننگے بدن ہوگئے بلکہ بعض تو بے حیائی سے کام لے کر سب کچھ ہی نکال کر پھرنے لگے۔ جب سب کچھ ختم ہوگیا تو صرف شور باقی رہ گیا جو کہ ہجوم اور وہ فوجی افسر مل کر مچا رہے تھے۔ اتنے میں میرے آگے کھڑا ہوا ایک شخص مڑا اور میری ٹوکری کی طرف بڑھا۔ میں پیچھے ہٹا تو عقب سے دس بارہ ہاتھوں نے ٹوکری گھسیٹ لی اور اس میں سے مچھلیاں اٹھا کر خونبار نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر پورے زور سے انہوں نے مچھلیاں ہزاروں انسانی سروں کے اوپر سے اس طرف کو پھینکیں۔ جن لوگوں پر وہ گریں انہوں نے اٹھا کر آگے پھینکیں، پھر آگے، اور آگے، اور اسی طرح ایک مچھلی جا کر فوجی افسر کی آنکھوں کے درمیان لگی۔ اس نے وہیں پر اسے پکڑ لیا اور ایک لحظے تک اسے دیکھتا رہا، پھر سر اٹھا کر مجمعے کو دیکھا، پھر مچھلی کو، پھر مجمعے کو۔ دفعتاً اس نے مچھلی سر سے بلند کی اور پوری طاقت سے اسے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے منہ پر کھینچ مارا۔ پھر اس نے بازو ہوا میں پھینکے اور پاگلوں کی طرح چیخ مار کر چلایا۔ اسی وقت گولی چلنی شروع ہوئی۔

''پھر وہ منظر شروع ہوا جو زندگی میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ سارے باغ میں افراتفری پھیل گئی اور وہ بھگدڑ مچی جو صاف پانی میں جال پھینکنے پر مچھلیوں میں مچتی ہے۔ لیکن پیچھا کرتی ہوئی گولیاں انسانوں سے بہت تیز بھاگتی ہیں بچو...... ایک وہ شخص تھا جو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے دوڑ رہا تھا' گولی لگنے پر ہوا میں اچھلا اور وہیں پر ٹنگ گیا' کیونکہ نیچے آنے سے پہلے چند اور گولیاں اس کے جسم میں داخل ہوئیں اور اس نے ہوا میں قلابازی کھائی' پھر اور گولیاں اور ایک اور قلابازی اور اس طرح جب سرکس کے مسخرے کی طرح کرتب دکھانے کے بعد وہ زمین پر آیا تو کب کا مر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی جوش و خروش تھا اور وہ بدشکل نہ ہوا تھا' کیونکہ اس نے موت دیکھی ہی نہ تھی۔ یہ عجیب و غریب موت تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس کا جسم گرتی ہوئی لاشوں میں چھپ گیا۔ یہ سارا قصہ چند لمحے کا ہے۔ وہاں سے آندھی کی طرح بھاگتے ہوئے مجھے اپنی ٹوکری دکھائی دی جو گولیاں لگنے پر گیند کی طرح اچھل رہی تھی۔ پھر بھاگتے بھاگتے میں چیخ مار کر رک گیا۔ چند گز کے فاصلے پر وہ کنواں تھا۔ وہ خشک کنواں تم دیکھ رہے ہو؟ ہاں وہی۔ میرے ساتھ بھاگتے ہوئے زیادہ تر لوگ اس میں جا گرے۔ ان کے اوپر دوسری طرف سے آنے والے گرے۔ پھر اس میں ہر طرف سے آنے والے زندہ اور مردہ لوگ گرنے شروع ہوئے اور انسانوں کی چیخوں نے گولیوں کی آواز کو دبا دیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے کنواں مردہ اور نیم مردہ لوگوں سے بھر گیا اور لوگ آسانی کے ساتھ اس پر سے دوڑتے ہوئے گزرنے لگے۔ گولیوں کی بوچھاڑ کے نیچے نیچے دوڑتا ہوا میں اس دیوار کے پاس سے گزرا جہاں میں اب بیٹھا ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو بچو؟ اب یہاں پر کوئی نہیں ہے لیکن اس وقت اس ساری دیوار پر آدمی لٹکے ہوئے تھے۔ ان کی ٹانگیں دیوار سے اندر کی طرف تھیں اور سر اور بازو باہر کی طرف لٹک رہے تھے اور ان کے پیٹ دیوار پر تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دیوار کو اس جگہ سے نیچا دیکھ کر پھاندنے کے لئے اوپر چڑھے اور گولیوں کی زد میں آ گئے اور اندر سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتے تھے جیسے دھوبی نے بے شمار پاجامے اور کوٹ اور پتلون سوکھنے کے لئے دھوپ میں پھیلا دیئے ہیں۔ تم نے دیوار میں یہ سوراخ دیکھے ہیں؟ آہ۔ تم جو یہ سب باتیں لوگوں سے پوچھتے پھرتے ہو بچو' تم کبھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس باغی شہر کو کتنی بڑی سزا ملی۔ آہ......
باہر نکلتے ہوئے مجھے چند کتے دکھائی دیئے جو ایک مچھلی کو کھینچ رہے تھے۔ یہ وہی سفید اور چمکدار مچھلی تھی جو میں نے اس خیال سے الگ کر دی تھی کہ شاید کوئی گاہک مل جائے۔ اس وقت اس کے ایسے انوکھے گاہک دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ لیکن ہنسنے کا وقت نہ تھا اس لئے میں جان بچانے کی خاطر سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ آیا۔

''بھاگتا بھاگتا میں اس جگہ پہنچا جہاں ایک روز پہلے اس گوری عورت کی مٹی پلید کی گئی تھی۔ وہاں پر تمام مجمع رکا ہوا تھا۔ عقب سے گولیاں چلنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ جب میں ہجوم کو چیر کر آگے بڑھا تو عجیب منظر دیکھا۔ بازار کے دونوں طرف گورے سپاہیوں کی قطاریں شست باندھے گولی چلانے کے لئے تیار کھڑی تھیں اور بازار کے بیچوں بیچ انسانی جسموں کا ایک دریا تھا جو بہہ رہا تھا۔ وہ سب زمین پر لیٹ کر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے پچیس گز کا وہ ٹکڑا طے کر رہے تھے۔ انہیں کہنیوں یا گھٹنوں سے کام لینے کی بھی اجازت نہ تھی۔ انہیں بتایا گیا اور ہم

سب کو بتایا گیا کہ ہمیں سانپ کی طرح پیٹ پر چل کر یہاں سے گزرنا ہے جہاں پر کہ ان کی عورت کے ساتھ سانپوں کا سا سلوک کیا گیا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ جو کوئی بھی کہنیوں پر اٹھتا' اور جو کوئی بھی گھٹنوں پر اٹھتا اسے گولی مار دی جاتی اور پھر انہوں نے ایسا کیا کہ بازار کے ایک طرف جمع ہو کر رینگتے ہوئے جسموں سے چھ انچ اوپر اوپر گولی چلانا شروع کر دی اور جان بچانے کے لئے بھگوڑوں نے مٹی میں سر گاڑ دیئے اور پاؤں کی انگلیوں اور ناخنوں کی مدد سے رینگنے لگے۔ لیکن باغ سے بچ کر نکل بھاگنے والوں کے لئے یہی ایک راستہ تھا اور لوگوں کا رش لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جس شخص کے سامنے جگہ بنتی وہ سر کے بل گر کر اژدھوں کے اس جلوس میں شامل ہو جاتا۔ اور تم جانتے ہو بچو کہ ہم مچھیروں کے لئے یہ کام معمولی ہوتا ہے۔ میں ابھی چھ سال کا تھا کہ میرے باپ نے اس کی روح کو ثواب پہنچے' مجھے پانی کی سطح پر اوندھے منہ لیٹ کر بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مردے کی طرح تیرنے کا ڈھنگ سکھایا تھا۔ اس لئے جب میری باری آئی تو میں پھرتی اور آسانی سے رینگنے لگا۔ لیکن گولیوں کی زد سے بچنے کے لئے مجھے اپنا سر زمین میں گاڑنا پڑا جس سے میری کھوپڑی زخمی ہوگئی اور کئی دن تک سوجی رہی۔ پھر بھی میں نے یہ کام ہوشیاری اور چالاکی سے سرانجام دیا' مگر میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ جو بڈھا رینگ رہا تھا اس کے سر پر ایک بال بھی نہ تھا اور کھوپڑی سے خون بہہ رہا تھا' اس کا ایک گال مٹی میں دبا دبا اپنے پیچھے ایک چوڑی لکیر چھوڑتا جا رہا تھا اور وہ بڈھوں کی طرح بھونڈے پن کے ساتھ رو رہا تھا۔ جب راستے کے اختتام پر ہم اٹھ کر بھاگے تو میں نے دیکھا کہ یہ وہی نورانی داڑھی والا بڈھا تھا جو ہر جمعرات کو مجھ سے مچھلی خریدا کرتا تھا اور جس کے تین جوان بیٹے تھے اور پنساری کی بہت بڑی دکان تھی۔ اس کے بعد میں اس طرف نہیں گیا لیکن میں نے دور سے کئی بار دیکھا کہ ایک مدت تک لوگ وہاں سے اسی انداز میں لیٹ کر گزرتے رہے جو انسانوں کی آمد و رفت کا سخت معیوب طریقہ ہے۔ میری آبائی ٹوکری بھی اس روز کھوگئی۔

''اب تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے بچو۔ کیونکہ ابھی یہاں پر کرفیو لگ جائے گا اور اس کے بعد بارہ گھنٹے تک جو بھی یہاں پایا گیا اسے گولی مار دی جائے گی۔ میں نے کافی مغز ماری کی ہے۔ لیکن تم نے خود ہی کہا تھا: 'بڈھے' ہم کو سب کچھ بتاؤ۔' مگر تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے اس سے بڑے بڑے موقعے دیکھے ہیں اور یہ باتیں میرے لئے معمولی ہیں۔''

''تم یہاں سے نہیں اٹھو گے بابا؟'' ایک سننے والے نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''تم ہندو ہو یا مسلمان؟'' نعیم نے جلدی سے سوال کیا۔

''آہا...... یہ اچھا سوال ہے۔'' وہ انگلی اٹھا کر ہنسا۔ ''یہ اچھا سوال ہے۔ واقعی۔ لیکن مجھے پتا نہیں۔ یہ کچھ اررر ایسا ہے کہ میں مصروف ہی رہا۔ میرا باپ بھی مصروف آدمی تھا۔ مچھیرے کا کام دراصل جان توڑ کام ہوتا ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں پر تم دھیان ہی نہیں دے سکتے۔'' اس نے گورے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے

انہیں بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ مجھے کچھ نہیں کہتے۔ میں آدھی آدھی رات تک یہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ یہ جانتے ہیں کہ میں ان باتوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ میں مچھلی بیچنے والا بڈھا ہوں۔''

واپس آتے ہوئے وہ دیر تک مڑ مڑ کر اس سیاہ، مختصر ہیولے کو دیکھتے رہے جو اس سال خوردہ بڈھے کا تھا جو باتیں کر کر کے تھک چکا تھا اور اب سکون سے دیوار پر تنہا بیٹھا تھا اور ایک غیر آباد رات اس کے چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ رات ان کے درمیان حائل ہوگئی تھی اور وہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوگئے لیکن اس شام کے بعد کئی برسوں تک دیوار پر بیٹھا ہوا وہ اکلوتا، سیاہ جسم ان پانچوں کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔

پنجاب کا دورہ ختم کرنے کے بعد سال کے آخری دنوں میں نعیم اور عذرا لاہور سٹیشن سے دلّی جانے والی رات کی گاڑی پر سوار ہوئے۔ جس کمرے میں وہ چڑھے اس کی تمام نشستیں سوئے ہوئے مسافروں سے گھری ہوئی تھیں۔ سوائے ایک کے جو کہ اوپر والی نشست تھی۔ تمام رات دونوں میاں بیوی کو ایک ہی سیٹ میں بسر کرنا تھی، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ وہ اوپر چڑھے اور لحاف میں گھس کر سو گئے۔ جگہ کم تھی اور گاڑی انہیں بری طرح ہلا رہی تھی لیکن اتنا عرصہ ایک مصیبت زدہ خطے میں بسر کرنے کے بعد گھر واپس جانے کے خیال سے ان کے اعصاب مکمل طور پر پُرسکون تھے اور وہ رات بھر خوب گہری نیند سوئے رہے۔

جب عذرا جاگی تو لحاف کے اندر آنکھیں کھول کر اس نے کونوں کناروں میں سے داخل ہوتی ہوئی دن کی روشنی کو دیکھا اور اسے کافی وقت گزر جانے کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی بہت سی اونچی مردانہ آوازوں کا شور اس کے کان میں پڑا۔ اس نے لحاف کا کونا اٹھا کر دیکھا۔ یہ شور چند فوجی افسروں کی باتوں کا تھا جو سب کے سب غیر ملکی تھے۔ وہ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر آمنے سامنے دو نچلی سیٹوں پر جمع تھے۔ ان میں سے دو پورے فوجی لباس میں تھے، تین کو ان کے ہندوستانی بیرے لباس پہنا رہے تھے۔ اور باقی دو، جو طور اطوار سے فوجی افسر ہی معلوم ہوتے تھے، رات کے لباس میں پاس پاس بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ رات کے لباس میں ایک اور شخص بھی تھا جو ان کے پاس ہی سیٹ پر بیٹھا بظاہر ان کی باتوں سے لاتعلق ایک انگریزی کتاب پڑھ رہا تھا اور پائپ پی رہا تھا۔ دو سیٹوں کے درمیان ایک چھوٹی سی میز پر شیمپین کی بوتل رکھی تھی۔ دو افسر، جو لباس پہننے سے فارغ ہو چکے تھے، چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں سے گھونٹ گھونٹ شراب پی رہے تھے اور اونچی، لاپرواہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ صبح کی نرم دھوپ کھڑکی کے شیشوں میں سے اندر آ رہی تھی اور گاڑی تیزی سے آموں کے ایک باغ کے پاس سے گزر رہی تھی۔ عذرا نے انبالہ کے گرد و نواح کے آم کے باغوں سے ڈھکے ہوئے علاقے کو دیکھا اور دل میں گھر واپس آنے کی خوشی، جو ہر انسان کو ہوتی ہے، محسوس کی۔ اس نے شفقت اور مہربانی کی نظر نعیم پر ڈالی جو بچوں کی طرح سو رہا تھا۔ وہ دیر تک خاموش لیٹی اس کے جسم کی گرمی کو جذب کرتی رہی۔

اچانک ایک مانوس نام سن کر اس نے کان کھڑے کیے۔ اس کا تذکرہ اس انگریز فوجی نے کیا تھا جو گلابی لکیروں والا پاجامہ اور ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے تھا اور سب سے اونچی آواز میں سب سے زیادہ جارحانہ انداز میں بول رہا تھا:

''لاہور میں مَیں نے ہنٹر کمیٹی کو بتایا کہ مجھ میں کتنی انسانیت ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''ورنہ۔''

''بالکل درست ہے۔'' دوسرے فوجی نے انگلی سیدھی کر کے کہا۔ ''ورنہ کون نہیں جانتا کہ کیا کچھ کیا جا سکتا تھا۔''

''میں ہندوستانیوں کے اس مقدس شہر کو جلا کر راکھ کر سکتا تھا اور ان کا طرزِ عمل دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ اس قانون شکن اور باغی ہجوم کو نیست و نابود کر دوں اور ان کے بچوں اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ لیکن محض انسانی رحم و کرم اور خدا ترسی کے جذبے نے مجھے روک لیا۔ میں نے ایک لاقانون قوم کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ پر انکوائری بٹھائی گئی۔''

''یہ انکوائری کمیٹیوں کے لوگ انتہائی جاہل ہوتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ ان میں سے کسی کو اگر تمہاری جگہ پر کھڑا کر دیا جائے تو وہ وہی کرے گا جو کچھ تم نے کیا۔ بہرحال اب اس قصے کو ختم کرو اور اپنی کامیابی کا جام نوش کرو۔''

اس تجویز کا ایک عام اظہارِ مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور سب فوجیوں نے جن میں کتاب پڑھنے والا اور تین لباس پہننے والے بھی شامل تھے' آگے بڑھ کر اپنے اپنے گلاس اٹھائے۔ اس تجویز کے بانی نے ہر ایک کے گلاس میں باری باری شراب انڈیلی اور پھر سب نے ایک ساتھ گلاس سروں سے اوپر اٹھا کر خوشی کا نعرہ لگایا اور غٹا غٹ پی گئے۔ اس کے بعد ڈریسنگ گاؤن والا پھر جوشیلے' اعصابی لہجے میں تیز تیز باتیں کرنے لگا۔ نعیم اور عذرا کو یہ جاننے میں دقت نہ ہوئی کہ وہ شخص جلیانوالا باغ کا فاتح بریگیڈیئر جنرل ڈائر تھا۔ دلّی سٹیشن پر وہ اسی لباس میں اتر گیا۔

عذرا اس کی شاندار شخصیت اور جارحانہ انداز سے مرعوب ہوئی لیکن نعیم کے ہاتھ اسے مار گرانے کے لئے کانپنے لگے۔

(۲۰)

روشن آغا متواتر ایک گھنٹے سے بالائی منزل کی بالکونیوں میں چکر لگا رہے تھے۔ اسی طرح وہ پچھلے چند گھنٹوں میں روشن محل کے تمام برآمدوں' غلام گردشوں اور خالی کمروں میں گھوم چکے تھے۔ سر نیہوڑائے' ہاتھ پیچھے باندھے وہ گہرے متفکر انداز میں چل رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ پشت پر سے کھول کر بازوؤں کو سینے پر باندھ لیتے اور پھر سیدھے چھوڑ کر چلنے لگتے۔ باہر ڈرائیو کے آخیر پر موٹر گاڑیوں اور بہلیوں کی ایک قطار کھڑی تھی اور ان میں آنے والے ڈاکٹر اور نرسیں گھر کے دوسرے افراد کے ہمراہ' جن میں نعیم اور عذرا بھی شامل تھے' گول کمرے میں جمع تھے۔

تمام ڈاکٹر اطمینان سے بیٹھے اخبار اور ذاتی کاغذات دیکھ رہے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ گھر کے لوگوں کے چہروں پر سراسیمگی کے آثار تھے اور وہ بے چینی سے وقت کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کبھی کبھی بے داغ لباس میں کوئی نرس بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی آ کر کسی ڈاکٹر کی کرسی پر جھک جاتی اور کھسر پھسر کرنے کے بعد اسی سمت میں غائب ہو جاتی۔ ڈاکٹر اُکتائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا اور پھر کاغذات پر جھک جاتا۔ اندر بڑے بڑے طویل کمروں کے پیچھے کہیں سے دھیما، مکھیوں کے بھنبھنانے کا سا شور اٹھ رہا تھا۔ مختصر وقفوں پر اس کو چیرتی ہوئی ایک تیز، دردآلود چیخ بڑے کمرے تک پہنچتی، جو گھر والوں کے چہرے زرد اور ڈاکٹروں کی اکتاہٹ میں اضافہ کر دیتی۔

باہر برآمدوں، زینوں اور گیلریوں میں گھر کے نوکر، مہریاں اور مالی ایک بیکار مصروفیت کے ساتھ ایک دوسرے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ خاص طور پر عورتیں خاموش ہنسی سے گال نچاتی ہوئی مسلسل اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں اور اپنے خاوندوں کے علاوہ دوسرے مردوں کے قریب سے گزرتے ہوئے بے وجہ طور پر مسکرائے جاتی تھیں۔ ان کے بازو چاندی کے موٹے موٹے کڑوں اور کنگنیوں سے کہنیوں تک چھپے ہوئے تھے اور شور کرنے کے ڈر سے وہ انہیں تھامے ہوئے تھیں۔ روشن آغا کو لکڑی کے بڑے زینے پر سے اترتے ہوئے دیکھ کر وہ سب سایوں کی طرح کمروں میں غائب ہو گئے۔

انہوں نے دونوں ہاتھ اونی ڈریسنگ گاؤن کی جیبوں میں گہرے ٹھونس رکھے تھے اور تیز اعصابی چال سے چل رہے تھے۔ دروازے پر آ کر وہ رکے اور ایک طویل، مشتاق نگاہ کمرے کی ساری گولائی میں پھینکی۔ ایک سفید فام نرس ایک سفید فام ڈاکٹر سے ہدایات لے کر واپس جا رہی تھی۔ اس کے غائب ہوتے ہی وہ اذیت ناک چیخ بلند ہوئی۔ روشن آغا عجلت سے مڑ کر چلنے لگے۔ برآمدے کی لمبائی طے کرتے ہوئے وہ کئی جگہ پر رکے، پام کے پتوں کو توڑ کر دانتوں میں چبایا، ناخن سے برآمدے کے ستون پر لکیریں کھینچیں اور زرد رنگ کی بیل میں سے چڑیوں کو اڑایا۔ جب وہ دوبارہ دروازے کے سامنے سے گزرے تو ان کے دوست ڈاکٹر انصاری اٹھ کر ان سے آ ملے۔

''ہلو روشن آغا۔'' سنہرے رنگ کی سگار دانی کھول کر بڑھاتے ہوئے وہ بولے۔

''نہیں ڈاکٹر، شکریہ۔ تمباکو کی خواہش نہیں ہے لیکن ڈاکٹر...... پہلے بھی میرے دو بچے ہو چکے ہیں، پر یہ حالت میری کبھی نہیں ہوئی۔'' انہوں نے ایک تھکی ہوئی سانس چھوڑی۔ ''شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔''

ڈاکٹر نیم تمسخر، نیم سنجیدگی سے ہنسا: ''بوڑھے تو ہم سب ہو رہے ہیں۔ پر یہ کوئی ایسی بات نہیں۔''

''لیکن کیا یہ ممکن ہے ڈاکٹر......'' انہوں نے رک کر پوچھا۔ ''کہ...... یعنی آخری بچے سے کم و بیش بیس سال کے بعد، یعنی...... کیا تمہیں یقین ہے کہ......''

''یقیناً......'' ڈاکٹر انصاری نے سگار کا دھواں پام کے پتوں پر چھوڑا۔ ''میں نے ایسے کیس بھی دیکھے ہیں جب شادی کے چالیس برس کے بعد پہلا بچہ ہوا۔''

''مضحکہ خیز...... قطعی مضحکہ خیز۔'' روشن آغا کپکپاتی ہوئی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولے۔ ''لیکن میں نے

زندگی بھر ایک دن میں اتنا پیدل سفر طے نہیں کیا ہے جتنا کہ آج۔ ڈاکٹر۔''

''اطمینان رکھو۔ اب وقت گزرا ہی چاہتا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد روشن آغا کو اسی طرح برآمدے میں چکر لگاتے ہوئے چھوڑ کر وہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ جب اندر سے آنے والی چیخیں بلند ہو گئیں تو عذرا نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے جھک کر نعیم کے کان میں کچھ کہا۔ نعیم اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر روشن آغا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دو ایک دفعہ کچھ کہنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا' پھر سر جھکا کر چلنے لگے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر' اب انہوں نے اسے برابر کے آدمی کی طرح مخاطب کرنے کے خیال کو قبول کر لیا تھا۔ اب وہ ان میں سے تھا۔

دو دفعہ برآمدے کی لمبائی طے کرنے کے بعد آخر نعیم بولا: ''ہمارا پنجاب کا دورہ خاصا کامیاب رہا۔''

''اہا' ہاں' پنجاب میں تم لوگوں نے بڑے دن لگائے۔ کیا نتیجہ نکلا؟''

''کمیٹی نے تمام اہم اور قابل اعتماد لوگوں سے رابطہ قائم کیا جن سے ہمیں چشم دید حالات معلوم کرنے کا موقع ملا۔ گورنمنٹ کے اعلان کے مطابق چار سو آدمی مرے اور زخمی ہوئے۔ فی الواقع مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔''

''ہوں۔'' روشن آغا تشویش سے بولے۔ ''تشدد! انکوائری کمیٹی میں اور کون لوگ تھے؟''

''دیش بھاندو داس' جواہر لال نہرو' سعید احمد اور چند اور لوگ تھے۔ انکوائری رپورٹ عنقریب شائع ہونے والی ہے۔''

''پنجاب کے حالات میں مجھے بڑی دلچسپی ہے لیکن اس وقت۔'' انہوں نے ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس معاملے نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ میں کبھی اتنا پیدل نہیں چلا۔''

نعیم نے ایک قریبی عزیز کی طرح چند باتیں ان کی تسلی کے لئے کہیں اور کمرے میں واپس آ گیا۔

اب عذرا اٹھ کر باہر جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اندر سے چیخوں کی آواز آنی بند ہو گئی اور شہد کی مکھیوں کا شور آہستہ آہستہ قریب آنے لگا۔ ڈاکٹروں نے اپنے اپنے کاغذوں اور سگریٹ تپائیوں پر رکھ دیئے اور جنہوں نے چشمے لگا رکھے تھے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ گھر کے باقی افراد اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے' باہر نوکروں میں کھلبلی مچ گئی۔ اندر سے دو نرسیں نکلیں اور اپنے اپنے ڈاکٹروں کو جا کر خوشخبری دی۔ ان کے پیچھے پیچھے خالہ نمودار ہوئیں اور تیزی سے کمرہ پار کر کے برآمدے میں پہنچیں' ایڑیاں اٹھا کر دونوں ہاتھ روشن آغا کے کندھوں پر رکھے اور بولیں: ''بیگم محفوظ ہیں۔ آپ کو یاد کر رہی ہیں۔''

''اوہ...... سچ؟'' انہوں نے دونوں بازو برآمدے میں پھیلائے۔ پھر اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں خالہ کا ہاتھ دبوچ لیا اور اسے منہ کے قریب لا کر چوما۔ ''آہ' یہ اذیت ناک وقت تھا۔ رب امجد۔''

ڈاکٹر انصاری ان کی طرف آئے: ''مبارک ہو روشن آغا۔ آپ بچی کو دیکھ سکتے ہیں۔ زچہ کی حالت مکمل

طور پر تسلی بخش ہے۔''

''مبارک ہو...... مبارک ہو'' پکارتے ہوئے روشن آغا دروازے کی طرف بڑھے' دہلیز پر پہنچ کر رکے' پھر پلٹ کر برآمدے میں پڑی ہوئی بید کی لمبی کرسی پر دراز ہو گئے۔ گاڑیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو رہی تھیں۔ آرام دہ کرسی پر پوری طرح پھیل کر انہوں نے پاؤں ٹھنڈے فرش پر رکھے اور آنکھیں بند کر لیں۔ سب لوگ اندر کے کمروں کی طرف چلے گئے۔ آہستہ آہستہ برآمدے میں سناٹا چھا گیا۔ چند منٹ کے اندر اندر روشن آغا کا سر چھاتی پر ڈھلک آیا اور وہ اونگھنے لگے۔

صرف نوکروں میں ایک خاموش کھلبلی مچی رہی۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے کبھی اندر کے کمروں میں جھانکتے اور کبھی طویل خالی برآمدے میں دیکھتے' جہاں روشن آغا تنہا سو رہے تھے اور ان کا ملازم خاص خاموش اشاروں سے ان چڑیوں کو اڑا رہا تھا جو برآمدے کی بیلوں اور پام کے پتوں میں شور کرنا چاہتی تھیں۔

وہ آگ' جو بڈھے مچھلی والے نے امرتسر میں دیکھی تھی' آہستہ آہستہ ملک بھر میں پھیل گئی۔

یہ سارے مہینے نعیم اور اس کی بیوی کسانوں میں پھرتے رہے اور انہوں نے ایک بہت بڑی بدلتی ہوئی دنیا دیکھی۔ سر اٹھاتے اور کمر سیدھی کرتے ہوئے کسانوں کی دنیا جو تیزی سے بدل رہی تھی' اور اپنی حیثیت اور طاقت کا علم' جو متعدی بیماری کی طرح کسانوں میں پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ گو ان کی یہ ساری کارروائی روشن آغا کے علم سے باہر تھی اور گو عذرا کے لئے کسانوں اور ان کی زندگیوں میں کوئی کشش نہ تھی پھر بھی اپنے خاوند کے ہمراہ بہر حال وہ پھرتی رہی اور اپنے دیہاتی گھر کو مرکز بنا کر انہوں نے چاروں طرف اپنا کام جاری رکھا۔

ہندوستان کے شدید موسموں میں وہ دور دور کے گاؤں میں پیدل چل کر پیدل پہنچے اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے مخاطب ہوئے۔ کسان جو نعیم اور اس کی طرح کے ہزاروں کارکنوں کی کوششوں سے اب ان کی باتوں کا مطلب سمجھنے لگے تھے' ان کے گرد جمع ہوتے اور ان کی عدم تعاون کی ہدایتوں کو خاموشی اور جذبے کے ساتھ سنتے۔ پہلے پہل ان کو یہ باتیں وحشت ناک معلوم ہوئیں' کیونکہ ان باتوں میں کوئی فلسفہ نہ تھا اور یہ سیدھی سادی' ننگی بغاوت کی باتیں تھیں۔ ان پڑھ اور پیدائشی لاعلم کسانوں کے لئے یہ قبول کرنا بڑا مشکل کام تھا کہ ان کی زمینوں کا مالک' جاگیردار' ان کا محسن نہیں بلکہ دشمن تھا۔ جب پہلے پہل انہوں نے یہ باتیں سننا شروع کیں تو ٹیکس کی عدم ادائیگی اور زمیندار کو اس کے واجبی حصے سے زیادہ اناج نہ دینے کے خیال سے ان کے دل میں خوف اور ہراسانی کے جذبات پیدا ہوئے اور انہوں نے ان لوگوں کو کہ جو یہ سبق دیتے تھے مجرم تصور کیا' پر اس کے ساتھ ہی دل کے چور میں انہیں یہ ساری باتیں بھا گئیں اور چھوٹی بڑی انسانی مسرتوں اور آسائشوں کی چاہ نے' جن سے وہ اب تک محروم رہے تھے' کیڑوں کی طرح ان کے سینے میں خلش پیدا کرنا شروع کی اور انہوں نے باہر سے آنے والے ان لوگوں کو عقیدت کی نظروں سے دیکھا۔ لیکن زندگی کا خوف' جو ان کی نس نس میں بس چکا تھا' ان پر چھایا رہا

تھا اور انہوں نے ان لوگوں کو اپنے سے علیحدہ اور مختلف انسان سمجھا اور ان کے قریب آنے سے گھبراتے رہے۔

لیکن انہی لوگوں نے جب بھوک اور پیاس کا اظہار کیا' ان کے پاس بیٹھ کر کھانا کھایا اور پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا' ان کے کھیتوں اور کھلیانوں میں بیٹھ کر حقہ پیا اور ان سے باتیں کیں' ان کی فصلوں اور مویشیوں کی بیماریوں کے بارے میں پوچھا اور مشورے دیئے' ان کے ہمراہ زمین پر سو کر راتیں بسر کیں' اور سب کے ساتھ مل کر گایا' اور کسانوں کی سادہ' بے فن قصے کہانیاں سنیں اور محظوظ ہوئے' ان کے کھیتوں میں چھوٹے موٹے کام کرنے میں مدد کی اور وہ سب کچھ کیا جو ہر کسان کرتا ہے تو ان کا عمومی پن سب پر واضح ہو گیا اور انہوں نے نئے سرے سے ان کی باتیں سنیں جنہوں نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ملک کے لاکھوں کھیتوں میں جھک کر کام کرتے ہوئے کروڑوں کسانوں نے سر اٹھایا اور کمر سیدھی کی اور غرور سے ابرو پر انگلی تھپکا کر پسینہ خشک کیا۔ یہ ہندوستان کا بدنصیب کسان تھا جس نے ان گنت مصیبتیں بغیر احساس کے جھیلی تھیں۔ اس کے چہرے پر بے شمار لکیریں اور گہری تھکن کے آثار تھے اور اس کا جسم موسموں کی شدت میں ننگا رہ رہ کر قرمزی' نیلا اور سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کے حصے کا اناج زمینداروں کے گھروں میں تھا اور اس کی عورتوں کے زیور مہاجنوں کے پاس رہن رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور وہ نادار تھا' اس کی ملکیت میں ایک درانتی اور ایک کدال تھی اور اس کے ہاتھوں میں اپنی محنت تھی۔ اس پر جو آفتیں نازل ہوئیں ان میں سبھی کچھ شامل تھا۔ زمیندار اور مہاجن سے لے کر خشک سالی' سیلاب' ہیضہ' پلیگ' میعادی بخار اور مویشیوں کی وباؤں تک! لیکن ہندوستانی کسان میں صدمے برداشت کرنے کی حیرت ناک قوت ہوتی ہے۔ ہر تھپیڑے کے ساتھ وہ ذرا اور جھک جاتا اور گزر جانے پر پھر گھٹنے سیدھے کر لیتا۔ لیکن اس کی کمر سیدھی کرنے اور سر اٹھانے کے لئے ایک بیرونی طاقت کی ضرورت تھی جو سالہا سال کی مظلومیت کا طوفان اس کے اندر سے نکالتی اور اسے ان مصائب سے آگاہ کرتی جو کہ وہ بغیر احساس اور علم کے جھیل رہا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو ملک کی تین چوتھائی آبادی پر مشتمل تھا اور جس پر ملک کی تمام خوراک اور بندوبست کا انحصار تھا۔ آخر جب حالات اور واقعات کے زور سے وہ بیرونی طاقت میسر آ گئی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مظلومیت کا احساس غصے اور نفرت کی قوت میں تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آلام زدہ مقدر کو محسوس کیا اور یہ بڑی بات تھی۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار کسان نے اپنی حیثیت بیل سے بلند تر خیال کی۔

اور اس سے بڑی بات یہ کہ انہیں اپنی طاقت کا علم ہوا۔ ایک گاؤں میں جہاں چند ماہ پیشتر سیلاب نے تباہی مچا دی تھی اور اناج کا ایک دانہ تک کھیتوں میں نہ ملا تھا' نعیم کو رہتے ہوئے پانچ روز ہو چکے تھے۔ گاؤں میں قحط سالی کا عالم تھا اور مٹھی بھر اناج پر کسانوں کا پورا پورا خاندان گزران کر رہا تھا۔ اس وقت زمیندار کے کارندے گزشتہ فصل کی مقررہ مقدار کی عدم ادائیگی پر ٹیکس وصول کرنے اور دوسری صورت میں قرضے کے اندراج پر کاشت کاروں کے نشان انگوٹھا حاصل کرنے کی غرض سے وارد ہوئے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے اور ہر ایک دروازے پر رک کر اونچی' درشت آوازوں میں مطالبہ کر رہے تھے۔ ان سے ذرا فاصلے پر ایک کھلیان میں گاؤں کے زیادہ تر مرد

جمع تھے۔ یہ وہ کسان تھے دو یا دو سے زیادہ دن سے ٹھوس خوراک کی کوئی مقدار جن کے حلق سے نہ اتری تھی۔ وہ سب کھلیان کے ننگے فرش پر بیٹھے تھے جہاں سے گھاس اور بھوسے کا آخری تنکا تک اٹھا کر مویشیوں کو ڈال دیا گیا تھا۔ نعیم درمیان میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور چاروں طرف وہ سب خاموش بیٹھے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے فاقہ زدہ تھے اور وہ ایسے پرندوں کی طرح تھے جو طوفان باد و باراں میں گھر گئے ہوں۔

جب چلاتے ہوئے کسانوں کی آوازیں قریب آنے لگیں تو کسانوں کے چہروں پر سارے جسم کا بچا کھچا لہو اکٹھا ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ آوازیں کھلیان کی دیوار کے پاس آ گئیں۔ دیوار کے پیچھے سے ایک عورت کے رونے کی آواز ئی جو کہہ رہی تھی: ''میرا خاوند گھر پر نہیں ہے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔'' جواب میں وہی درشت آوازیں گالیاں دیتی ہوئی سنائی دیں اور ایک شخص اندر داخل ہو کر کسی بھاری شے سے دیواریں ٹھونکنے لگا جس سے اس گھر اور کھلیان کی مشترکہ دیوار ہلنے لگی۔ ملی جلی آوازوں کا شور بلند ہو گیا: ''ٹسوے مت بہا۔ تیرا خاوند کہاں ہے؟ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ دیکھ لو۔ میرا خاوند گھر پر نہیں۔ چور بہانے باز۔ کتیا کی اولاد۔''

ایک کسان کھلیان میں سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سارے کسان نکل کر دروازے پر جمع ہو گئے۔ نعیم کھلیان میں اکیلا رہ گیا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو۔ کام چور۔'' ایک گھڑ سوار نے چلا کر پوچھا۔

وہ سب خاموش کھڑے ابلتے ہوئے غصے سے انہیں دیکھتے رہے۔

''تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے؟ یا تمہارا کوئی عزیز مر گیا ہے۔'' گھڑ سوار دوبارہ چلایا' پھر کوئی جواب نہ پا کر وہ کود کر گھوڑے سے اترا اور چابک ہوا میں لہرا کر چلایا: ''فصل کا حساب دو۔''

''ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔'' پہلے کسان نے کہا۔

''کیوں نہیں ہے؟'' غصے سے اندھا ہو کر وہ دوبارہ کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور چابک کو پوری طاقت سے ہوا میں پٹخانے لگا۔ گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر اٹھ کھڑا ہوا۔

انتہائی نفرت اور غصے کے زیر اثر کسان ایک لمحے کے لئے گنگ رہ گیا اور تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح سانس لینے لگا۔ پھر اس کے گلے سے تیز پھٹی ہوئی آواز نکلی:

''کیوں نہیں ہے؟ ہیں؟ یہ دیکھو......'' اس نے پاس بندھے ہوئے بیل کے پہلو میں چاروں انگلیاں اتار دیں جو اس کی ننگی پسلیوں میں غائب ہو گئیں۔ بیل دہشت زدہ آواز میں ڈکرایا۔ ''اور یہ......'' اس نے اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھایا۔

اور یہ ایک خوفناک نظارہ تھا' جس کا حال وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے فاقہ زدہ انسانی جسم دیکھے ہیں۔ اپنی پسلیوں میں اس کی انگلیاں ایک ایک پور تک اتر گئیں۔

''سئور۔'' وہ اسی پھٹی ہوئی آواز میں چیخا۔ ''بھاگ جاؤ۔ جاؤ...... ہم آگ لگا دیں گے۔ کھلیانوں کو......

گھروں کو...... سب کو۔''

کسانوں میں جانوروں کے گلے کی سی بلبلاہٹ بلند ہوئی اور وہ خالی ہاتھ اوپر اٹھا کر بڑھے۔ سواروں نے ٹھٹک کر دیکھا اور خاموشی سے گھوڑے موڑ کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد کوئی اس فصل کا حساب وصول کرنے کے لئے نہ آیا اور اس چھوٹی موٹی بغاوت کو عمداً نظر انداز کر دیا گیا۔

جب موسم میں ذرا شدت آئی تو عذرا نے جو پہلے ہی دیہات اور دیہاتیوں سے میل جول رکھنے سے اکتا چکی تھی' اپنے خاوند کے ہمراہ جانا چھوڑ دیا اور روشن پور میں بیٹھ کر اپنے دل میں شہری زندگی کی چمک دمک اور شہرت کی خواہشات کے زہر کو پالنے لگی۔ جب بھی نعیم پھر پھرا کر اور عذرا کی کشش سے مجبور ہو کر گھر آتا تو وہ اس سے کہتی: ''تم گاؤں گاؤں پھرا کرتے ہو' پہلے اپنے مزارعوں کو زمینیں بانٹو۔'' اس پر وہ جواب دیتا: ''یہ سب روشن آغا کے مزارعے ہیں۔ میرے کوئی مزارعے نہیں ہیں۔ میری زمینوں پر میرا بھائی اور ماموں کا لڑکا کام کرتے ہیں۔'' وہ چپ ہو جاتی۔ لیکن وہ دلی نہ جا سکی' کیونکہ اپنے خاوند سے اسے عشق تھا اور وہ محبت کی ادھ مٹی خواہشوں کو لے کر' اکیلی رہتی ہوئی خلش اور جذبے کے ساتھ اس کا انتظار کرتی رہتی۔

نعیم اب مکمل طور پر کسانوں میں گم ہو چکا تھا۔ انفرادی طور پر کسی سے اس کے تعلقات نہ تھے' کیونکہ ایک فرد کی حیثیت سے کسان موٹے دماغ کا ان پڑھ اور غیر دلچسپ شخص ہوتا ہے اور اس سطح پر وہ نعیم کا دوست نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اجتماعی طور پر نعیم نے انہیں قابل اعتماد اور وفادار پایا۔ ان کا ادھ ننگا' گونگی لاعلم آنکھوں والا ہجوم پالتو جانوروں کی طرح برتاؤ کرتا اور دیکھنے والے کے دل میں رحم کے جذبات پیدا کرتا تھا۔ اجتماع کی شکل میں وہ ایک ایسی پھٹنے والی قوت کا یقین دلاتے تھے جس پر مکمل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت ان کا نعرہ صرف ایک تھا۔ ''سوراج''۔ اس ایک لفظ میں جو کانگرس نے انہیں دیا تھا' ان کی آئندہ زندگی کی آسائشوں کے تمام مبہم اور غیر مبہم تصورات شامل تھے۔ نعیم اور اس کے ساتھیوں نے یہ بہت بڑا' تیزی سے بدلتا ہوا منظر دیکھا اور محسوس کیا اور خود کو اس میں شریک پا کر محظوظ ہوئے۔

دسمبر کے شروع میں 'پرنس آف ویلز' کے ہندوستانی دورے کے سلسلے میں حکومت نے تمام سیاسی پارٹیوں کو دبانا شروع کیا۔ جب 'انڈین نیشنل کانگرس' نے دورے کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا تو اسے خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ اس پر بھی والنٹیروں کے ناموں کی فہرستیں شائع ہوتی رہیں اور عام ہڑتال اور شاہی خاندان کے ایک فرد کی آمد کے موقع پر حکومت کی طرف سے جاری کردہ تمام احکامات کی خلاف ورزی اور تقریبات کے بائیکاٹ کی ہدایت کے اشتہارات عوام میں تقسیم کئے جاتے رہے۔ نتیجے کے طور پر حکومت کے اعصاب جواب دے گئے اور وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

روشن پور میں جس گھر کے دروازے کی تختی پر لکھا تھا: ''یہاں نعیم اور اس کی بیوی رہتے ہیں'' وہاں پچھلے

چند روز سے عذرا مستقل بے چینی کے ساتھ نعیم کا انتظار کر رہی تھی۔ پرنس آف ویلز کی آمد کا اسے علم ہو چکا تھا اور اسے دیکھنے' اس کے ساتھ باتیں کرنے اور اس کے پاس بیٹھنے کی خواہش نے اس کے دل میں کرب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک لمبی مدت تک وہ اس دنیا سے محروم رہی تھی جس کا کہ وہ باشندہ تھا اور اس دنیا کی کشش کو محسوس کر کے وہ راتوں کو سو بھی نہ سکتی تھی۔ گزشتہ چند ایک طویل' بے خواب راتوں نے اسے بڑی اذیت دی تھی' جن میں اسے نعیم کے جسم کی حسرت اور دلّی کی زندگی سے اپنی محرومی کا شدت کے ساتھ احساس ہوا تھا۔

آخر ایک سہ پہر کو نعیم آ پہنچا۔ اس رات کے لئے وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس رات اس نے اپنے آپ کو محض یہ یقین دلایا کہ اس کا محبوب جسم اس کے قبضے میں ہے اور اب کہیں نہیں جائے گا۔ پو پھٹنے کے وقت نعیم کو ہلتا ہوا پا کر وہ کسمسائی اور اس کے ساتھ لگ کر بولی: ''ہم دلی جائیں گے نعیم۔ پرنس آف ویلز آ رہے ہیں۔ چلیں گے نا؟''

نعیم نے' جو ہلکی ہلکی تکان' بستر کی حرارت اور عذرا کے جسم کی لذت سے مدہوش تھا' صرف اتنا کہا:

''ہاں...... ہاں۔''

لیکن دوسری رات کو جو وہ سونے کے لئے لیٹے تو عذرا کے ذہن میں صرف ایک سوال تھا جو اس نے چھوٹتے ہی کیا: ''ہم دلّی جائیں گے نعیم۔''

وہ یوں چونکا جیسے اس نے پہلی دفعہ سنا ہو۔ ''کیوں؟''

''پرنس آف ویلز......''

''اوہ۔'' اس نے اداسی سے کہا۔ ''اس سے پہلے ہی شاید میں گرفتار ہو جاؤں۔''

''کیوں؟''

''ہم نے بائیکاٹ کیا ہے اس کے دورے کا۔''

''نہیں۔'' عذرا نے بچوں کی طرح کہا۔ ''لیکن نہیں۔ تم گرفتار مت ہونا' ہم دلّی جائیں گے۔ ایں؟''

''دلّی میں کچھ بھی نہ ہوگا۔ وہ جہاں جائے گا وہاں ہڑتالیں کرائی جائیں گی۔ اس کے خلاف مظاہرے ہوں گے۔''

''مگر کیوں!'' عذرا سٹپٹا گئی۔ ''وہ شاہی خاندان کا اتنا شریف انسان ہے۔ اسے سیاست سے کیا مطلب۔''

''یہ پارٹی کا فیصلہ ہے' عذرا۔ میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔''

نعیم نے آہستہ سے اسے ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اور تم...... تم تو سب کچھ سمجھتی ہو پھر پوچھ رہی ہو؟''

وہ سیدھی لیٹی بے خواب آنکھوں سے چھت کو گھورتی رہی' یہ قطعاً بھول کر کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ لیٹی تھی۔ اس کا جسم سرد تھا اور اس کا خاوند اس کے ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔ عذرا کے جسم کو آہستہ آہستہ دباتے ہوئے نعیم پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

''لیکن نعیم۔'' اچانک عذرا نے کہا۔ ''پھر ہم مظاہرہ کریں گے۔ کر سکتے ہیں ناں!''

نعیم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی بات ذہن نشین کرتا رہا۔ ''ہاں۔''

''ہاں ہم مظاہرہ کریں گے۔ تم گرفتار مت ہونا' بس۔'' عذرا خوشی سے بولی۔

''لیکن...... روشن آغا تمہیں ایسا کرنے دیں گے؟''

''روشن آغا......؟'' وہ اس کے ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے سوچنے لگی۔ ''ہاں...... اررر...... ہم کلکتے چلے جائیں گے۔ تمہارے چچا کے ہاں' ٹھیک ہے؟ ٹھیک ہے ناں۔''

''ہاں' ٹھیک تو ہے۔'' نعیم نے کمزور آواز میں کہا۔

''ہم کلکتے جائیں گے۔ تم گرفتار مت ہونا۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم گرفتار مت ہونا۔ اچھا؟''

وہ خاموش رہا۔

''تم گرفتار نہیں ہوؤ گے نا۔ وعدہ کرو نا' نعیم۔'' عذرا نے اس کی ٹھوڑی پر ہونٹ رگڑتے ہوئے کہا۔

''وعدہ کرو نا۔''

نعیم نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔ ''اچھا۔'' اس نے جلدی سے کہا اور اپنی بیوی کے غالب آتے ہوئے ارادے سے بچنے کی کوشش میں اس کے جسم کا سہارا تلاش کرنے لگا۔

کلکتے کے صدر بازار کے فٹ پاتھ پر وہ ایک گھنٹے سے کھڑے تھے۔ بازار میں مکمل ہڑتال تھی لیکن تماشائیوں کا پتلا ہجوم بند دکانوں کے آگے آگے گھوم رہا تھا۔ بازار کے بیچوں بیچ رستہ صاف تھا اور دو رویہ غیر ملکی اور مقامی پولیس کے آدمی کھڑے تھے۔ وہ اپنی تقریبی وردیوں میں ملبوس' مستعدی سے سیدھی قطاروں میں کھڑے' خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک پر انگریز فوجی اور پولیس افسر موٹر سائیکلوں پر گھوم رہے تھے۔ پرنس آف ویلز کا جلوس گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ ہو چکا تھا۔

شہر کے تمام بازاروں اور گلیوں میں مکمل ہڑتال تھی۔ دکانوں اور گھروں کے دروازے بند تھے اور ان پر شناختی تختیاں الٹی لٹک رہی تھیں۔ لوگوں کی چال بے مصرف اور نگاہیں کوری تھیں اور چالیس لاکھ نفوس پر مشتمل ایشیا کے اس سب سے بڑے شہر میں دنیا کا تمام کاروبار معطل ہو چکا تھا۔ فٹ پاتھ پر پھرنے والوں میں انسانوں کی نسبت مویشیوں اور کتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن عوام کے عدم تعاون کے باوجود فوج اور پولیس کی بھاری تعداد کی مدد سے شہر پر تقریبی رنگ لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ شہزادے کے جلوس کے رستے میں رنگ برنگ کی جھنڈیاں اور غبارے اڑ رہے تھے اور فاصلے فاصلے پر پام کے پتوں اور سرو کے مصنوعی پودوں سے بڑے بڑے استقبالیہ دروازے کھڑے کیے گئے تھے۔

نعیم ایک مدت کے بعد اس شہر میں واپس آیا تھا جو ساری دنیا میں اس کا محبوب شہر تھا۔ جس طرح دنیا میں نادار سے نادار شخص کو اپنے بچپن کا گھر محبوب ہوتا ہے اور جس طرح ان زمانوں کو یاد کرتے وقت اس کے

چہرے پر وہ دمکتا ہوا حسن پیدا ہو جاتا ہے جو لڑکپن کی عمر کے ساتھ مخصوص ہے اس طرح نعیم نے ان سارے زمانوں کو یاد کیا جو گزر چکے تھے۔ جب وہ درمیانے قد کا گورا سا لڑکا تھا اور روزانہ اس راستے سے جہاں پر اس وقت وہ اپنی بیوی کے ہمراہ کھڑا تھا' سکول کو جایا کرتا تھا۔ اور اس کے پاس رنگ برنگ پنسلوں کا ایک ڈبہ تھا جو وہ ہمیشہ اپنے بیگ میں رکھتا اور صرف اپنے خاص خاص دوستوں کو دکھایا کرتا تھا۔ ان میں خوبی یہ تھی کہ جس رنگ کی پنسل تھی اسی رنگ کی اس سے لکھائی بھی ہوتی تھی۔ اور اس کی نیکر کی جیب میں بہت عرصے تک شیشے کی ایک خالی دوات رکھی رہی تھی جس میں اس نے تتلیوں کے چمکدار پر جمع کئے تھے اور رات کو سونے سے پہلے جسے وہ اندھیرے میں جیب سے نکال کر تکیے کے نیچے رکھ لیا کرتا تھا' کیونکہ اس میں اس قدر قیمتی' اس قدر خوبصورت تتلیوں کے پر تھے جو ہاتھ لگانے سے ٹوٹتے تھے۔ پھر ایک روز سمندر کے ساحل پر ریت میں کھیلتے ہوئے وہ دوات کہیں گم ہوگئی اور ہمیشہ کے لئے اسے یاد رہ گئی تھی۔ جیسے گم شدہ محبوب چیزیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ اسے تلاش کرتے ہوئے اس نے ریت پر سے بہت سارے چمکدار پتھر اور سیپیاں چن کر جیبوں میں بھر لی تھیں لیکن شیشے کی وہ دوات ہمیشہ اس کے ذہن میں چمکتی رہی اور اس کے ذہن میں اور بھی بہت کچھ تھا جس میں اس کے سکول کے دوست' نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والے گول مٹول بچے اور اس راستے پر یہی لوگ' گندمی اور سیاہ رنگ' موٹے جسم اور ٹھگنے قد کے یہ لوگ شامل تھے جو آج بھی اس طرح اس کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ ان کے جسموں پر اسی طرح سفید دھوتیاں لپٹی تھیں اور ان کے ہمراہ ان کی لمبے سیاہ بالوں اور خوبصورت آنکھوں والی عورتیں تھیں جن کے چہرے گندمی تھے۔ یہ اور اسی طرح کی ہزاروں چھوٹی چھوٹی چیزیں۔ ان سب کو یاد کر کے نعیم نے دل میں پرانی یادوں کی خلش محسوس کی' وہ خلش جو ہر شخص' خواہ وہ کسان ہو یا شہری' مہذب ہو یا غیر تہذیب یافتہ' زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور محسوس کرتا ہے۔

سڑک پر اب فوجی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی آمد و رفت تیز ہو گئی تھی اور قطار میں کھڑے باوردی جوانوں کو فوجی سلامی کی ہدایات دینے والے کڑک کڑک کر بول رہے تھے۔ عذرا نعیم کا بازو تھامے اس کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی اور اس کا چہرہ زرد تھا۔ ان کے اردگرد مجمع کم ہوتا جا رہا تھا۔

''کاغذ تمہاری ساڑھی میں ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''ہاں۔'' عذرا نے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔ اس کی آواز سے اس کی گھبراہٹ ظاہر تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑی نعیم کے بازو پر اعصابی انگلیاں بجاتی اور ایک ٹانگ ہلاتی رہی۔ پھر منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر آہستہ سے بولی۔ ''کس طرح کریں گے؟''

نعیم نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک موٹی سی عورت اس کے ساتھ ٹکرا گئی۔ وہ درمیانی عمر کی عورت تھی اور ان لوگوں میں سے دکھائی دیتی تھی جو بہت زیادہ جسمانی آسائش اور فربہی کی بدولت خوش شکل سے بدشکل ہو جاتے ہیں۔ وہ پٹڑی پر چہل قدمی کرتے ہوئے ایک بیل سے بچنے کے لئے اس سے ٹکرا گئی تھی حالانکہ نعیم کو اس مضبوط عورت کے بیل سے ڈرنے کی کوئی وجہ دکھائی نہ دی۔ اس نے عورت کی ساڑھی کا گرا ہوا پلو

زمین پر سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھا اور پلپلے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا۔ عورت' جو تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہی تھی' تشکر سے ہنسی اور جلدی سے گزر گئی۔ نعیم نے چند لمحے تک ان لوگوں کے گزرنے کا انتظار کیا' جن کا راستہ عورت اور بیل نے روک رکھا تھا' پھر عذرا کی طرف جھک کر بولا:

''ہمارے پیچھے دکان کا بورڈ میری پہنچ میں ہے۔ اس پر لگائیں گے۔''

''اچھا۔'' ذرا نے پیچھے دیکھے بغیر بے خیالی سے کہا اور ایک ٹانگ ہلاتی رہی۔ نعیم نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

''گرفتار تو اسی وقت کر لئے جائیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کہیں مظاہرے سے پہلے ہی نہ پکڑ لئے جائیں۔'' اس نے کہا۔ عذرا نے سنا یا نہیں' اس کا اسے پتا نہ چل سکا۔ وہ اسی طرح سڑک کی طرف منہ کئے' کہیں بھی نہ دیکھتی ہوئی' خاموش کھڑی رہی۔

اس کے بعد وہ زیادہ تر خاموش رہے۔ کبھی کبھی چھچھلتی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔

ان کے سامنے سے گزرتی ہوئی شہریوں کی ایک ٹولی ٹھنک کر رک گئی۔ وہ سب کے سب خالص بنگالی باشندے تھے اور بڑی فرصت سے سڑک کا نظارہ کرتے اور آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مگر اب وہ اچانک خاموش ہو کر ایک شخص کو دیکھ رہے تھے جو ان کے درمیان آ کر رک گیا تھا۔ اس نے سفید کھدر کا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے سے پڑھا لکھا بنگالی معلوم ہوتا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟ یہاں کیوں جمع ہو؟'' وہ چاروں طرف دیکھ کر دبی ہوئی غصیلی آواز میں بولا۔

''دکانیں اس لئے بند کی تھیں کہ ان کا استقبال کرو؟ جاؤ...... چلے جاؤ' ایک ایک شخص' خدا کے لئے۔''

آناً فاناً وہ ٹولی تتر بتر ہوگئی۔ غالباً اس کی طرح کے اور بھی کئی لوگ وہاں پہنچ چکے تھے جو انہوں نے جگہ جگہ پر کھڑی ہوئی اور حرکت کرتی ہوئی کئی ٹولیوں کو بکھرتے اور غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ ہر طرف سے لوگ گلیوں میں اور بازار کے موڑوں پر نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے پٹڑیاں ویران ہوگئیں اور شہری لباس میں انسان کی شکل خال خال نظر آنے لگی۔ ان کے اردگرد کتے اور بیل پھرنے لگے۔ کچھ وقت اسی ویرانی کے عالم میں گزر گیا۔ پھر انہوں نے ایک فوجی لاری موڑ پر سے نمودار ہوتی اور زن سے گزرتی ہوئی دیکھی جس کے پیچھے وہی کھدر کے لباس والا شخص اور اس کے تین ساتھی بیٹھے تھے۔ ان کے اوپر دو مسلح گورے سپاہی کھڑے تھے۔ کھدر پوش خاموش' مطمئن نظروں سے باہر کو دیکھ رہے تھے۔ نعیم نے ہولے سے مسکرا کر عذرا کو دیکھا۔ وہ لاری پر سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھ رہی تھی' زرد رُو اور نروس! اسی وقت بازار کے دوسرے سرے سے پرنس آف ویلز کا جلوس داخل ہوا۔

کاشن دینے والوں کی کڑک دار آوازیں دو رویہ سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی فوجی جوان' جو کھڑے ستا رہے تھے' ہتھیار بجا بجا کر سیدھے' مستعد فوجی انداز میں

کھڑے ہوتے گئے۔ فوجی بینڈ کی ولولہ انگیز دھن آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ پا پپا...... پپا پپا...... قریب' اور قریب' پاپپا...... پپا پپا...... فوجی جوانوں کا جذبہ سرفروشی پھٹنے کی حد تک پہنچ چکا تھا' خون کو گرمانے والی موسیقی کے زیراثر ان کے سخت' اکڑے ہوئے جسموں میں بے پناہ طاقت عود کر آ گئی تھی اور ان کا جی بے اختیار اپنے بادشاہ پر فدا ہو جانے کو چاہ رہا تھا' پاپپا' پپا پپا...... پپ پپا...... پپا پپا۔

نعیم نے پھرتی سے مڑ کر لٹکتا ہوا بورڈ اتارنا چاہا لیکن وہ کیلوں میں الجھ گیا۔ ٹین کے دیوار کے ساتھ ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی۔ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں زیرلب کوستے ہوئے نعیم نے اسے زور سے کھینچا جس سے اس کی رسّی ٹوٹ گئی اور وہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ اپنی جگہ پر پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بینڈ کے شور میں فوج یا پولیس کا کوئی آدمی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اس کی پھسلتی ہوئی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ جہاں اس نے دیکھا کہ دکانوں کے چوباروں کی کھڑکیوں کے پٹ نیم وا تھے اور ان میں سے سینکڑوں چمکتی ہوئی آنکھیں چوروں کی طرح جھانک رہی تھیں۔ نعیم نے کہنی عذرا کے پہلو میں چبھوئی اور دبی ہوئی آواز میں بولا: ''یہ لو...... کاغذ نکالو۔''

وہ دم بخود کھڑی نزدیک آتے ہوئے جلوس کو دیکھتی رہی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟ کاغذ کہاں ہے؟'' نعیم نے سٹپٹا کر اس کے کان میں کہا۔

اسی طرف دیکھتے دیکھتے عذرا دھیمی' غیر حاضر آواز میں بولی:

''ایں؟...... بورڈ اتار لیا؟''

''ہاں...... یہ ہے۔''

بینڈ بجاتے ہوئے شاندار وردیوں والے فوجی ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ان کے پیچھے موٹر سائیکل سواروں کا دستہ تھا۔ پھر چار گھوڑوں والی سنہرے رنگ کی رتھ جس میں انگریز شہزادہ گورنر صاحب بہادر کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ ان کے سامنے کی سیٹ پر آگے کی طرف پشت کئے دو انگریز عورتیں بیٹھی تھیں۔ ویلز کا شہزادہ اپنی جگہ پر سیدھا بیٹھا تھا' خوبصورت' متین اور باوقار' جیسا کہ شاہی خاندان کے ایک فرد کو ہونا چاہیے لیکن متردد! اس کے دونوں جانب رتھ کے پائیدانوں پر دو گرانڈیل ہندوستانی باڈی گارڈ سرخ اور سنہری لباس میں مجسموں کی طرح سیدھے ساکت کھڑے تھے۔ ایک بڑی سی سنہری چھتری اس پر سایہ کئے ہوئے تھی۔

اچانک شہزادے نے نظریں اوپر اٹھائیں اور دیکھتا رہا۔ پھر وہ ذرا سا گورنر کی طرف جھکا۔ گورنر نے بھی اسی سمت میں دیکھا اور اس کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائی' پھر سامنے دیکھا۔ سرو کے مصنوعی درختوں سے بنے ہوئے تقریبی گیٹ کی لکڑی پر برقی روشنی سے لکھے ہوئے یہ الفاظ بار بار ظاہر اور غائب ہو رہے تھے:

"Tell your Mother, we are unhappy"

گورنر پیچھے کی طرف دیکھتا تو حروف غائب ہو جاتے' سامنے دیکھتا تو ابھر آتے۔ اس پُراسرار روشنی کے

منبعے کا پتا نہ چل سکا۔

رتھ ان کے نزدیک آتا جارہا تھا۔ گورنر اپنی خفت چھپانے کو ناگواری سے ہنس رہا تھا اور کوئی بات کر رہا تھا۔ شہزادہ اس کی طرف دھیان دیئے بغیر گہری متردد نظروں سے برابر ان الفاظ کو تکے جارہا تھا جو لکڑی کے تختے پر بن رہے تھے اور مٹ رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے چہرے پر فکرمندی کی کوئی علامت ظاہر نہ ہونے دی۔

ان کو اپنے سامنے پاکر آخر نعیم نے قدم بڑھایا۔ ''کاغذ نکالو۔'' اس نے کہا۔

وہ شہزادے پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔ نعیم اس کا بازو ہلا کر نیچی آواز میں چیخا۔ ''نکالو۔''

''ایں؟'' وہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔ ''تم نے بورڈ اتار لیا؟''

''ہاں...... ہاں۔''

''اچھا؟ مجھے دو۔''

نعیم نے بورڈ اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا جو اس نے ہاتھ لٹکائے لٹکائے پکڑ لیا اور شہزادے پر سے نظریں ہٹائے بغیر سحر زدہ سی کھڑی رہی۔ انہیں گزرتے ہوئے دیکھ کر نعیم نے سیدھے ہاتھ کے پورے زور سے اس کا بازو مروڑا اور سانپ کی طرح خاموشی سے پھنکارا۔

''بدبخت عورت...... جلدی کرو۔''

''اوہ۔'' عذرا کے منہ سے نکلا اور انتہائی رنج کے مارے اس نے نعیم کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ بورڈ پاؤں میں گر پڑا۔

اب ان کے سامنے سے گھڑ سوار فوج کے جرنیل، حکومت برطانیہ کے 'نائٹ'، والیان ریاست' اور ان کے بعد درجہ بدرجہ سرکاری افسروں کی ایک لمبی قطار اپنی اپنی جگہ پر گھوڑوں، رتھوں اور موٹروں پر گزر رہی تھی۔ دو رویہ فوجی جوان سلامی دیتے ہوئے یوں کھڑے تھے جیسے گاڑ دیئے گئے ہوں۔ پرنس آف ویلز اس دروازے کے نیچے سے گزر رہا تھا جس پر سے روشنی کے الفاظ کو ہٹا کر اب اگلے دروازے پر Project کیا جارہا تھا۔ اچانک پرنس کے برابر والی گلی سے چند لوگوں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ ان کے جسم ننگے اور سیاہ تھے اور سر منڈے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پیٹوں پر بڑے بڑے بورڈ باندھ رکھے تھے جن پر لکھا تھا:

"Tell your Mother , we are hungry."

چند ثانیے میں وہ ٹولی غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اسی گلی میں سے چند گائیں باہر ہانک دی گئیں جو فوجیوں کے درمیان سے سر نکال کر کھڑی ہوگئیں۔ ان کے گلوں میں بھی بورڈ لٹک رہے تھے جن پر رقم تھا:

"Tell your Mummy, we are dry."

نعیم عذرا کو تھام کر واپس چلنے لگا۔ عذرا کا سر ابھی تک اس کے کندھے پر ٹکا ہوا تھا۔ چلتے چلتے نعیم نے اس کے آہستہ آہستہ بڑبڑانے کی آواز سنی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید دلآزاری کے

آثار تھے۔ نعیم کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر اس نے نظریں چرا لیں۔

''کوئی بات نہیں...... کوئی بات نہیں۔'' نعیم نے فکرمندی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

الٹے لٹکتے ہوئے بورڈوں کے نیچے نیچے' ایک دوسرے کو تھامے ہوئے وہ چلتے گئے۔

(۲۱)

1924ء کے موسم گرما میں نعیم کو ایک اور بلاخیز تجربہ ہوا۔ وہ واقعہ اپنی جگہ پر ایک نیا تجربہ ہونے کے علاوہ اس کی زندگی میں ایک انوکھے' انجانے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ واقعہ اس روز پیش آیا جب چار دن کی مسلسل بارش کے بعد دھوپ نکلی تھی اور نعیم نے پہلی بار کسی اونچی جگہ سے مجمعے سے خطاب کیا تھا۔

وہ یادگار دن تھا۔ اس روز ہوا میں برساتی پروں والے مکوڑے اڑ رہے تھے اور کیکروں پر جھینگر بول رہے تھے۔ جھینگر جو ایک سانس میں اتنے زور سے چلائے جاتا ہے کہ کہیں پر دکھائی نہیں دیتا۔ پیڑوں پر جھینگر اور برساتی نالوں کے کنارے مینڈکوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی' اور گاؤں کے بچے اور کام چور نوجوان ستلی کے جال کندھوں پر رکھ کر گپیں مارتے ہوئے مچھلیاں پکڑنے کو چل دیئے تھے اور اپنی تفریح کے حق میں یہ دلیل دے رہے تھے کہ چار روز سے مستقل اندر بیٹھ بیٹھ کر وہ عورتیں بنتے جا رہے تھے اور مچھلیاں مکوڑے کھا کھا کر فربہ ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک لحاظ سے یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔

چند روز پیشتر نعیم کو جاٹ نگر میں جلسہ منعقد کرنے کے سلسلے میں دلّی سے ہدایات موصول ہوئی تھیں۔ چنانچہ بارش سے بھیگے ہوئے چاروں کھونٹ میں اس نے اپنے گھڑ سوار دوڑا دیئے اور خود بھی روزانہ فوجی برساتی اوڑھ کر جاٹ نگر جانے لگا۔ جاٹ نگر آس پاس کے دو سو گاؤں میں سب سے بڑا گاؤں تھا اور اناج اور کپاس کی بڑی بھاری منڈی تھی۔ انہوں نے منڈی کے احاطے میں جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بارش سے بچاؤ کی خاطر کئی سو ٹاٹ جوڑ کر بڑی سی ترپال بنائی گئی جسے موٹے موٹے رسوں کی مدد سے باندھ کر سائے کا انتظام کیا گیا۔ مگر قسمت سے اس روز دھوپ نکل آئی اور کیکروں پر جھینگر ایک تال سے بولنے لگے۔

صبح دس بجے نعیم گاؤں میں داخل ہوا تو پولیس کی جمعیت کو دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ اتنے دنوں سے جلسے کی خبر اڑنے کے باوجود جاٹ نگر میں پولیس کا کوئی آدمی نہ دیکھ کر وہ بے چین ہو رہے تھے۔ یہ جلسے جلوسوں کی ممانعت کا علاقہ تھا۔ ان کے دس میں سے نو اجتماع خلاف قانون ہوتے تھے اور وہ روز روز کی پولیس کی موجودگی کے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ اس موقع پر ان کی غیر موجودگی انہیں کھٹکنے لگی تھی۔ آخر اس روز انہیں موجود پا کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ سب ہندوستانی پولیس کے لٹھ بند جوان تھے اور ان میں سے سوائے چند افسروں کے کوئی بھی مسلح نہ تھا۔ ان جلسوں میں ہر چند کہ خلاف قانون ہوتے' بلوے کا زیادہ امکان نہ ہوتا جس کی وجہ سے

مسلح گارڈ کی ضرورت نہ کبھی جاتی اور زیادہ سے زیادہ لاٹھی چارج کی نوبت آتی۔

لاٹھیاں پٹک پٹک کر اکھڑ انداز میں چلتے اور کسانوں کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لسی پیتے ہوئے پولیس کے جوانوں کے پاس سے گزر کر نعیم مقررہ جگہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پولیس کی بھاری تعداد نے منڈی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ منڈی میں داخل ہونے کا واحد راستہ لکڑی کے لمبے لمبے تختے، جو رسوں کی مدد سے ایک دوسرے سے بندھے تھے، کھڑے کر کے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے آگے پہرہ لگا تھا۔

بڑی دیر تک اِدھر اُدھر سے اندر گھسنے کی ناکام کوششیں کرنے کے بعد نعیم اور اس کے ساتھیوں کو لکڑی کے تختوں کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھ رہنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ زمین گیلی اور اونچی نیچی تھی اور جگہ جگہ پر بارش کا پانی کھڑا تھا۔ جوں جوں سورج اوپر آتا جا رہا تھا دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی اور نم زمین میں سے بھاپ اٹھ اٹھ کر حبس پیدا کر رہی تھی۔ یہ برسات کا مخصوص، تکلیف دہ موسم تھا۔ اس کے ساتھ ہی زائرین جلسہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب تک سورج سر پر آیا منڈی کے سامنے کا میدان اور اس سے آگے بازار کا ایک حصہ کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ یہ جاٹ نگر کے علاوہ اردگرد کے کئی گاؤں کے لوگ تھے جو جلسے کی خبر پا کر پہنچے تھے۔ اس بولا دینے والے موسم میں انتظار کرتے کرتے جب کچھ بن نہ آئی تو انہوں نے واویلا شروع کر دیا۔

سب سے آگے نعیم اور اس کے ہمراہ چند لوگ، جو جلسے میں بولنے کے لئے دلّی سے آئے تھے، زمین پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ پیچھے مڑ کر دم بدم بیتاب ہوتے ہوئے مجمعے کو دیکھ لیتے۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر پولیس کے سپاہی لاپروائی سے لاٹھیاں پٹکاتے ہوئے چل پھر رہے تھے۔ ان کے پیچھے لکڑی کے وہ تختے تھے جن کی حفاظت کا ذمہ ان کے سر تھا۔ لیکن اب وہ مجمعے کے خاموش احتجاج سے اس حد تک اکتا چکے تھے کہ تختوں کے دروازے کو چھوڑ کر دور دور تک چلے جاتے، کبھی بیٹھنے والوں کے پاس آ کر مصنوعی غصے کے ساتھ انہیں دھمکاتے اور کبھی ان کا ٹھٹھہ اڑانے لگتے۔ کچھ دیر پہلے نعیم کی توجہ اس کے ایک ساتھی نے ایک تختے کی طرف دلائی تھی جو کسی وجہ سے ٹوٹ چکا تھا اور ایک پتلے سے رسے کے ذریعے لٹک رہا تھا۔ رستہ، جو تختے کے ٹوٹنے سے بن گیا تھا، ایک آدمی کے گزرنے کے لئے کافی تھا۔

وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے اور زمین کی گرم مرطوب بھاپ ان کے سروں میں چڑھتی رہی اور برسات کی کڑی دھوپ ان کے بھیجے پگھلاتی رہی اور طویل، صبر آزما، بیکار انتظار نے ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نعیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ سپاہی، جس نے ابھی ابھی انہیں اپنی ماؤں کے ساتھ جا کر سونے کا مشورہ دیا تھا، پندرہ گز کے فاصلے پر پرے جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا کوئی اور ساتھی بھی دس دس گز کے فاصلے پر نظر نہ آ رہا تھا۔ دفعتاً نعیم نے ہوا میں ایک جست بھری اور ٹوٹے ہوئے تختے کے راستے سے صاف گزر گیا۔ ساتھ ہی اس کے تین چار ساتھیوں نے چھلانگیں لگائیں اور اسی راستے سے اندر داخل ہو گئے۔ تقریباً اسی وقت سارا ہجوم بلبلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے پر ٹوٹ پڑا۔ تین چار تختے ایک ساتھ ٹوٹ گئے اور اچھلتے کودتے، ریلتے پیلتے ہوئے مضبوط، محنتی

کسانوں کا مجمع ایک دیوار کی طرح حرکت کرتا ہوا گزرنے لگا۔ یہ سارا واقعہ اس قدر تیزی سے اور میکانکی طور پر عمل میں آیا کہ چند لمحوں کے لئے پولیس کے سپاہی حیران و پریشان اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ایسا پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ پہلے کبھی اگر منتخب جگہ کو روک دیا جاتا تو لوگ جہاں اکٹھے ہو جاتے وہیں پر جلسہ کرلیا کرتے، لیکن یہ تو صریحاً سول نافرمانی تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ حواس یکجا کرتے پچاس کے لگ بھگ کسان اندر پہنچ چکے تھے۔ دیکھتے دیکھتے لکڑی کے تختوں کی باڑ دھڑام سے زمین پر آگری اور چند لوگ اس کے نیچے آکر زخمی ہوگئے۔ اب پولیس کی برستی ہوئی لاٹھیوں کے نیچے مجمع دوڑتا ہوا منڈی کے احاطے میں داخل ہونے لگا۔

نعیم بھاگتا ہوا کپاس کی گیلی گانٹھوں کے ایک ڈھیر پر جا چڑھا۔ سب سے اونچی گانٹھ پر کھڑے ہوکر اس نے لوگوں کو خاموش کرانے کے لئے سیدھا بازو فضا میں بلند کیا۔ آگے آگے کے لوگ خاموش ہوکر قریب سرک آئے اور آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ عقب میں مجمع ابھی تک دوڑ بھاگ رہا تھا اور پولیس کی لاٹھیاں برس رہی تھیں۔ نعیم نے بولنا شروع کیا۔

اس کا جلسے کو خطاب کرنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ اس کام کے لئے دلّی سے چند لوگ آئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ہجوم میں گم ہو چکے تھے اور نعیم اسی میکانکی قوت کے زیر اثر اوپر جا چڑھا تھا۔ اس کے پاس کہنے کو کوئی خاص بات نہ تھی، پھر بھی اس نے بولنا شروع کر دیا اور کئی منٹ تک بے تکان بولتا چلا گیا۔ اس کا ایک بازو مستقل ہوا میں اٹھا ہوا تھا۔ اس وقت اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ کب اس نے بولنا شروع کیا تھا اور کب ختم کیا، یا یہ کہ اس نے کیا کہا۔ بعد میں اسے صرف اتنا یاد رہا کہ وہ ان سے پُرامن رہنے کے سلسلے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن بے خودی کے اس لمحے میں اسے کسی شے کی خبر نہ رہی۔ اس نے ایک عجیب کیفیت اپنے اوپر طاری ہوتی ہوئی محسوس کی۔ اس کیفیت کے دوران صرف اس کی آنکھیں اور اس کا احساس کام کرتا رہا۔ اس کے سامنے بلکہ اس کے نیچے، پھیلتا سکڑتا، اٹھتا بیٹھتا اور پھٹتا دبکتا ہوا مجمع مجمع نہ رہا تھا، ایک ٹھوس اور لچکدار، پگھلے ہوئے ربڑ کا وسیع جسم بن گیا تھا۔ فرد کا، یا افراد کے ہجوم کا تصور غائب ہو چکا تھا۔ اب یہ محض ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو اپنی ہی قوت کے تحت پھیل اور سکڑ، اٹھ اور بیٹھ رہا تھا اور جس کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی، وہ جو سب سے اوپر اکیلا کھڑا تھا، اکیلا اور قوی اور غالب خودمختاری کے اس لمحے میں اپنے آپ سے اس سارے منظر سے الگ ہوکر اس نے یہ سب دیکھا اور محسوس کیا اور اسے اپنے آپ پر ایک ایسی ہستی مطلق کا گمان ہوا اس ٹھوس، ابلتے ہوئے لاوے کے سیلاب کی تمامتر نقل و حرکت جس کے قبضے میں تھی۔ اپنے اس اختیار کو عمل میں لانے کے لئے اس نے بازو سے ہوا میں چند بے تکے اشارے بھی کئے۔ اس انوکھی کیفیت کو مؤثر طریقے پر الفاظ میں بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے، لیکن یہ ان معدودے چند بلاخیز ذاتی تجربوں میں سے ایک تھا جن سے کہ عمر بھر میں اسے کبھی گزرنا پڑا تھا۔

جب وہ اسے گرفتار کرنے کے لئے آئے تو وہ بازو سر سے اوپر اٹھائے، نیم وا، پُرسکوت آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے جھٹکے سے اس کا بازو نیچے کیا اور جب وہ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنانے

لگے تو حیران رہ گئے۔

اسی موسم گرما کی ایک چمکدار صبح کو روشن پور کے باہر بہت سے بچے کنکروں کی گولیاں کھیل رہے تھے کہ اچانک ان میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ لڑ بھڑ کر تتر بتر ہو گئے۔ لڑائی کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ کنکروں کے لین دین پر ہو گی، یا دھکم پیل میں کسی کے ضرب آ گئی اور وہ بیچ پا ہو گیا۔ بہر حال ایک مختصری دھینگا مشتی کے بعد سب نے اپنے اپنے قیمتی پتھر قبضے میں کئے اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جگہ، جہاں کچھ دیر پہلے چیخ پکار مچی تھی، ویران ہو گئی...... صرف ایک لڑکا، جسے چند لڑکوں نے پکڑ کر زدوکوب کیا تھا، بیٹھا روتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے رونا بند کر دیا اور غصے میں بھرا انگلی سے مٹی میں لکیریں کھینچتا رہا۔ لکیریں کھینچتے کھینچتے اسے چند کنکر دکھائی دیئے جو مٹی میں چھپے تھے اور افراتفری میں کسی کے رہ گئے تھے۔ اس نے انہیں اٹھا کر ہتھیلی پر رکھا، پھونک مار کر گرد اڑائی، پھر کُرتے کے دامن سے رگڑ کر صاف کیا اور ان پر نظریں جما کر ہنسنے لگا۔ وہ بڑے خوبصورت پتھر تھے، شیشے کی طرح چمکدار اور دودھ کی طرح سفید۔ لڑکا انہیں جیب میں ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا اور گرد سے اٹا ہوا کُرتا جھاڑ کر خوشی خوشی ایک طرف کو چل پڑا۔

اس سے پہلے بڑے لڑکوں کا جو ہجوم بکھرا تھا اس میں علی بھی تھا۔ اس نے عائشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ عائشہ بہت سے پیپل کے پتے جیب میں ٹھونسے ہوئے تھی اور ایک ایک پتا نکال کر ان کی پیپیاں بناتی جا رہی تھی۔ لیکن پتے خستہ اور خشک تھے اور گولانے کی کوشش میں ٹوٹے جا رہے تھے۔ جھلا جھلا کر ایک کے بعد ایک پتا پھینکتے ہوئے وہ ہاتھ کی پشت سے مستقل بالوں کی لٹ کو پیچھے کئے جا رہی تھی جو ہوا کے زور سے بار بار اس کی آنکھوں پر آ گرتی تھی۔ جب اس کی جیب کا ابھار نمایاں طور پر کم ہونے لگا تو اسے نقصان کا خدشہ ہوا اور وہ دیر دیر کے بعد پتے نکالنے لگی۔ ہر پتا نکالنے کے بعد وہ ہاتھ کی کشتی سی بنا کر جیب پر رکھتی اور پتوں کی مقدار کو جانچتی اور ہر بار گھٹتی ہوئی تعداد کا خیال کر کے اس کا دل دہل جاتا۔ پتوں کے ختم ہونے تک وہ صرف ایک بار پیپی کی آواز نکال سکی تھی اور وہ بھی چند سیکنڈ کے لئے۔ پھر پتا تڑخ گیا اور ہوا پہلو میں سے سرکنے لگی۔ روکھی سی ہو کر اس نے آخری پتا منہ میں ڈال کر چبایا اور سبز رنگ کا تھوک اگلا۔ پھر وہ اداس سی ہو کر چلنے لگی۔ علی ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ، جو ان کے ہمراہ آ رہا تھا، باتیں کرنے میں مشغول تھا۔

''سلیمان نے جس بنئے پر فساد کیا ہے اس کا میں الٹے ہاتھ سے نشانہ لگا سکتا تھا۔'' علی کہہ رہا تھا۔

علی کی بات سن کر دوسرا لڑکا، جو چھوٹی عمر کا مگر بہت بڑے سر اور چہرے کا مالک تھا، زعم میں آ گیا اور نتھنے پھلا کر شیخی سے بولا: ''سلیمان؟ سلیمان تو رونے والا ہے رونے والا۔ میں اس بنئے کا الٹے پاؤں سے نشانہ کر سکتا تھا۔ وہ روتا ہے اور فساد کرتا ہے۔ جب دھمکاؤ تو چوہا بن جاتا ہے۔ تم نے دیکھا؟'' بات ختم کر کے وہ فخریہ طنز کے ساتھ ہنسا۔

''میں اسے جانتا ہوں۔ گھوڑ دوڑ پر ہماری گھوڑی اس کے پاس سے گزری تھی تو اس کی ہوا سے ہی وہ گر پڑا تھا اور دونوں پیشاب اس کے وہیں پر نکل گئے تھے۔'' بات کو ختم کر کے علی نے بھی اپنے دوست کے فخریہ طنز کے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی، کیونکہ یہی ایک چیز تھی جس کی وجہ سے وہ اس بڑے سر والے بدصورت لڑکے کو پسند کرتا تھا اور اسے یہ احساس تھا کہ اس بات میں وہ کبھی ڈھنگ سے اس کی نقل نہ کر سکتا تھا۔

''تمہاری گھوڑی اچھی تھی۔ بیچاری بخار سے مر گئی۔'' دوسرے لڑکے نے کہا۔

''لیکن وہ گھاس کو سونگھتی بھی نہ تھی۔ بس سبز چارہ کھاتی تھی۔'' علی نے کہا۔

''سبز چارہ پیٹ لٹکا دیتا ہے۔''

''اس کی قسمت ہی خراب تھی۔ جب سے مری ہے ہمارا چارہ خوب ہو رہا ہے۔''

''یہ چارے کا موسم ہے۔ کاٹ کاٹ کر ہاتھوں میں گلٹیاں پڑ گئی ہیں۔'' اس نے چھوٹا سا سخت ہاتھ پھیلایا جس کی انگلیاں تڑخی ہوئی تھیں۔

''گلٹیاں اچھی ہوتی ہیں۔ تم گھوڑی کو خوب ٹھونک سکتے ہو۔'' علی پھر اپنے پسندیدہ انداز میں ہنسا۔

''ہاں۔ گلٹیاں اچھی ہوتی ہیں۔ ایک بار پڑ جائیں تو پھر نہیں ٹوٹتیں۔''

اسی طرح راستہ چلتے ہوئے وہ بچوں کے شیخی خورے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ گاؤں کے باہر ایک شکستہ دیوار والے مکان کے قریب پہنچ کر دوسرے لڑکے کی چال دھیمی پڑ گئی۔

''میرا گھر آ گیا ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر کوئی مزید بات کئے بغیر وہ اپنے اپنے راستے پر مڑ گئے۔

جب وہ دونوں اکیلے رہ گئے تو عائشہ نے علی کی آستین پکڑ کر کھینچی: ''علی ...... علی۔''

''ہنہ۔'' وہ اکھڑوں کی طرح بولا۔

''ہمیں پیپل پر سے پتے اتار دو۔'' لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

''کیوں؟''

''پپنیاں بنائیں گے۔''

''کہاں ہے۔'' علی اس طرف سے، جدھر پیپل تھا، نظر ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''وہ ہے۔ وہ ہے۔'' عائشہ نے اس کا بازو کھینچا، کندھا کھینچا، پھر ٹھوڑی سے پکڑ کر چہرہ گھمایا اور انگلی ناک کی سیدھ میں کر کے درخت دکھایا۔ ''وہ ہے۔''

''اچھ چ چ ا؟'' وہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے بولا، یوں جیسے بڑی دقت سے پیپل کو دیکھنے میں کامیاب ہوا ہو۔

پیڑوں پر چڑھنے کا وہ شوقین تھا لیکن اس وقت عائشہ کی خواہش کے مقابل سخت گیر ہو گیا۔

''چلو۔'' اس نے آہستہ لیکن بااختیار لہجے میں کہا۔

پیپل سے ذرا فاصلے پر اس نے بازو عائشہ کے کندھے پر سے اٹھالیا۔

درخت کی جڑ کے پاس پہنچ کر رک گیا اور اونچی اونچی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''یہ...... یہاں سے چڑھو۔'' عائشہ نے تنے کے بڑے بڑے سوراخوں میں اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ وہ چپکا کھڑا رہا۔ لڑکی تنے پر ہاتھ رکھ کر تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم راول کے ساتھ کیوں کھیلتی ہو؟'' علی نے سختی سے پوچھا۔

''راول؟ وہ بھی میرے ساتھ کھیلتا ہے۔''

''ہنہ۔'' اس نے غصے اور طنز کی ملی جلی آواز ناک میں سے نکالی۔ ''وہ اس پر نہیں چڑھ سکتا۔''

''اچھا۔'' عائشہ آنکھیں پھیلا کر بولی۔ ''پتا نہیں۔''

''پتا نہیں کیا ہوا؟'' وہ چیخا۔ ''وہ اس پر نہیں چڑھ سکتا۔ بس۔''

کچھ دیر تک وہ تند نظروں کے ساتھ عائشہ کی طرف دیکھتا رہا' پھر سامنے سے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا جہاں پر کہ چڑھنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

ننھی سی لڑکی سہمی ہوئی خاموش کھڑی اس کی پے در پے ناکام ہوتی ہوئی کوششوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس سے نہ رہا گیا اور تنے کے سوراخوں کی طرف اشارہ کر کے مری ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ...... اِدھر سے چڑھو۔''

''تم میرے کام میں دخل نہ دو۔'' علی جھڑک کر بولا اور پیپل کے ہاتھی جیسے تنے کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔ آخر وہ اوپر چڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ بندر کی طرح ایک سے دوسری شاخ پر پھلانگتے ہوئے اس نے سوکھے سوکھے پتے نیچے پھینکنے شروع کیے۔

''ہرے ہرے پتے پھینکو۔'' عائشہ نے کہا۔

''ہرے پتے نہیں ہیں۔'' وہ بے اعتنائی سے بولا۔

عائشہ بھری ہوئی کھڑی خاموشی سے گرتے ہوئے خشک پتوں کو دیکھتی رہی۔ علی ایک شاخ کو گھوڑی بنا کر بیٹھ گیا۔

''یہاں کہیں راول آ سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' سہمی ہوئی آواز میں نیچے سے عائشہ نے جواب دیا۔ اس پر وہ خوش ہوگیا' لیکن اپنی مسرت کا کھلے بندوں اظہار کرنے کی بجائے چالاکی سے ہونٹوں میں مسکراتا ہوا شاخوں میں پھرنے لگا۔ صرف اس نے اتنا کہا۔

''یہاں ہرے پتے بھی ہیں۔''

عائشہ دوڑ دوڑ کر سبز اور نرم پتے اٹھانے لگی۔ جب اس کی جیب بھر گئی تو خوشی سے منہ اٹھا کر بولی۔ ''اب آ جاؤ۔''

پیپل کی پھیلی ہوئی جڑوں پر بیٹھ کر وہ دونوں پیپنیاں بناتے اور بجاتے رہے۔ سورج کے اٹھنے کے ساتھ ساتھ ہوا گرم ہوتی جا رہی تھی حتیٰ کہ مویشی اور کسان ہانپتے ہوئے جا کر سائے میں بیٹھ گئے اور گاؤں کی زمینوں اور

گلیوں میں ایک عام دیہاتی وحشت پھیل گئی۔ مشقت اور گرمی کے اس وقت میں علی اور عائشہ پیپل کی جڑوں پر بیٹھے پپییاں بجا رہے تھے اور گپیں مار رہے تھے۔ پیپل کا سایہ گھنا اور خنک تھا اور گرمی کے مارے ہوئے کوے اور چڑیاں پتوں میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور اِدھر اُدھر بیٹیں کر رہے تھے۔ دونوں بچوں کے قریب سے ٹھنڈے کنوئیں کے پانی کی نالی ہلکے شور کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ اوپر سے ایک ایک دو دو کر کے چڑیاں آتیں، پانی میں ڈبکیاں لگاتیں اور پر جھٹک کر واپس چلی جاتیں۔ ان کے پروں سے پانی کے ننھے ننھے قطرے اڑتے اور ہوا کے زور سے بچوں کے گالوں اور آنکھوں پر آ گرتے۔

جب پتے ختم ہوگئے تو علی نے جیب میں سے پتھر نکالے اور پیپل کے تنے پر رگڑنے لگا۔

''پیپل کی چھال سے بنٹے چمک جاتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

عائشہ نے بھی اپنے کنکر نکال کر تنے پر گھسنے شروع کر دیئے۔ بیچ بیچ میں وہ چھوٹی چھوٹی بے ترتیب باتیں کرتے اور زور شور سے اپنے اپنے پتھر درخت پر گھستے جا رہے تھے۔ علی نے اپنا پتھر ہتھیلی پر رکھ کر اس پر تھوکا اور کُرتے سے صاف کیا۔

''میرا چمک گیا ہے۔''

عائشہ نے بھی اس کی نقل میں اپنا پتھر تھوک سے صاف کیا اور دکھا کر بولی۔ ''میرا بھی چمک گیا ہے۔''

علی چڑ گیا اور گھٹنوں کے بل اوندھا ہو کر اسے درخت کی جڑ پر زور زور سے گھسنے لگا۔ لڑکی نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

پھر علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''میرا زیادہ چمکدار ہے۔'' اس نے کہا۔

''میرا بھی چمکدار ہے۔''

''میرا زیادہ ہے۔''

''نہیں میرا۔''

''نہیں۔'' علی آنکھیں نکال کر چیخا۔ ''میرا ہے، بس میں نے پتے اتار کر نہیں دیئے تھے؟''

عائشہ مرعوب ہو کر چپکی ہوگئی۔ علی غصے میں بھرا آہستہ آہستہ پتھر جڑ پر رگڑتا رہا۔

''اگر زیادہ باتیں کروگی تو گال کی چٹکی بھر لوں گا۔'' پھر اس نے کہا اور ساتھ ہی اس کے گال کی چٹکی بھر لی۔ عائشہ کا منہ لال ہوگیا۔ اس نے آتشیں نظروں سے علی کو دیکھا۔ غصے کے جھٹکے سے سے بالوں کی ایک لٹ اس کے بھبھوکا چہرے پر آ گری تھی اور وہ بپھری ہوئی اسے دیکھے جا رہی تھی، دیکھے جا رہی تھی۔ علی کھسیانا ہوگیا۔ بولا:

''کیوں، راول نے تمہارے گال کی چٹکی نہیں لی تھی کل؟ میں نے دیکھا تھا۔''

دفعتاً عائشہ رونے لگی۔ علی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لڑکی کی آواز لحظہ بہ لحظہ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

''اچھا۔ اب کچھ نہ کہوں گا۔ اب چپ ہو جاؤ۔'' اس نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ

روتی رہی۔

''اچھا۔ تم راول کے ساتھ جا کر کھیلو بیشک۔ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ وہ اسی طرح روں روں کرتی رہی۔

''اچھا یہ لو۔'' علی نے کنکر آگے بڑھایا۔ اس کی چمک دیکھ کر عائشہ للچا گئی اور آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا' لیکن رونا بند نہ کیا۔

''یہ لو۔ میرے پاس اور بھی ہیں۔ سب تم لے لو۔'' علی نے سارے خوبصورت پتھر اس کے حوالے کر دیئے۔ آہستہ آہستہ وہ خاموش ہوگئی۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ علی نے بازو اس کے کندھے پر رکھا اور وہ گھر کی جانب چل پڑے۔

ابھی وہ گھر سے ذرا فاصلے پر تھے کہ علی نے بڑی ماں کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ دوسری گلی میں غائب ہوگئی تو علی عائشہ کو کھینچتا ہوا بھاگنے لگا۔ مویشیوں کے احاطے میں داخل ہو کر وہ بولا: ''تم یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

''کہاں جارہے ہو؟''

''مجھے بھوک لگی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔''

دبے پاؤں صحن میں داخل ہو کر اس نے دیکھا گرمیوں کی دوپہر اپنے عروج پر تھی اور اس کا جادو جو خاموشی اور ویرانی کا جادو ہوتا ہے' انسان اور حیوان پر یکساں چل چکا تھا۔ چھوٹی ماں کے کمرے کا کواڑ کھلا تھا اور وہ عائشہ کی ماں کے ساتھ زمین پر سوئی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ صحن کے کونے میں جو ذرا سا سایہ تھا وہاں گائے اور اس کا بچھڑا آنکھیں میچے بیٹھے تھے اور دونوں کے سروں پر ایک ایک کوا بیٹھا خاموشی سے زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ کھلی اور ویران جگہوں کا ایک پُرسکوت سحر تھا جسے محسوس کر کے وہ دل میں خوش ہوا۔ صحن کو پار کر کے وہ بڑی ماں کے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ کونے میں کچی دیواروں کا ڈربہ سا بنا تھا۔ اس نے آہستہ سے اس کا کواڑ ہٹایا اور اندر گھس گیا۔ ڈربے کی چاروں دیواروں میں سوراخ تھے اور دھواں' جو سارے میں بھرا تھا' سوراخوں کے رستے آہستہ آہستہ باہر نکل رہا تھا۔ درمیان میں اپلوں کی آگ پر دودھ کی بھری ہوئی ہانڈی رکھی تھی۔ دودھ پر سرخ رنگ کی موٹی بالائی کی تہہ جم چکی تھی۔ علی دھوئیں سے اندھا ہو رہا تھا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر جانی پہچانی جگہ پر سے ایک لمبا سا ناڑ اٹھایا اور پھونک مار کر اسے صاف کیا۔ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بالائی کو احتیاط سے ایک طرف ہٹایا اور ناڑ کا ایک سرا دودھ میں ڈبو کر دوسرے سرے سے پینے لگا۔ سرخی مائل میٹھا گرم ریشمی سیال اس کے حلق میں اترنے لگا۔ دودھ گاڑھا اور مقوی تھا چنانچہ چند گھونٹ سے ہی وہ سیر ہوگیا۔ ناڑ کو دودھ میں سے نکال کر کُرتے کے دامن سے صاف کرنے کے بعد اس نے اسے واپس رکھا' انگلی سے بالائی کو اپنی جگہ پر پھیلایا اور بے آواز قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تازہ ہوا میں دو چار لمبے لمبے سانسوں کے ساتھ دھواں' جو اس کی ناک اور حلق میں بھر گیا تھا' صاف کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''چلو۔''

عائشہ کے گلے میں بازو ڈال کر وہ چل پڑا۔ عائشہ چند قدم دھیرے دھیرے اس کے ساتھ چلی' پھر رک گئی۔

''تم کل جارہی ہو؟'' علی نے پوچھا۔

وہ خاموش کھڑی رہی۔

''کیا ہے؟ چلو۔''

''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''جاؤ جا کر دودھ پی آؤ۔'' علی نے اس کے گلے سے بازو نکال کر کہا۔ ''ہمارا مت پینا۔ بڑی ماں کا پینا۔ اور سیدھے ہاتھ کے کونے میں میرا ناڑ پڑا ہے' اس سے پینا اور بالائی مت توڑنا' پی کر برابر کر دینا' نہیں تو پتا چل جائے گا۔''

وہ وہیں کھڑی بسورتی رہی۔

''جاؤ...... میں یہاں کھڑا ہوں۔''

''میں نہیں پیتی دودھ۔''

''کیوں؟''

''مجھے قے ہوتی ہے۔''

''ہنہ۔'' علی اپنے پسندیدہ انداز میں ہنسا۔ ''عورتیں نخرے کرتی ہیں۔ میں دو سیر دودھ پی سکتا ہوں۔ پر مرد تو نخرے نہیں کرتے۔ اچھا ٹھہرو' تم یہیں پر ٹھہرو۔''

لومڑی کی طرح چلتا ہوا وہ بڑی ماں کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک اکیلے ہی زنگ آلود کنڈی کو کھولنے کی کوشش کرنے کے بعد وہ باہر آیا اور اشارے سے عائشہ کو بلا کر لے گیا۔

''گھوڑی بنو۔ یہاں...... آں بس ۔ بیٹھنا نہیں' چونڈی گھماؤں گا نہیں تو۔'' اس نے آہستہ سے اس کے بالوں کی لٹ پکڑ کر کھینچی۔ لڑکی غصے سے سرخ ہوگئی مگر چاروں ہاتھوں پاؤں پر گھوڑی بنی رہی۔ علی نے اس کے اوپر کھڑے ہو کر کنڈی کھولی اور وہ اندر داخل ہوئے۔

''بتا دو۔'' اس نے عائشہ کی جیب سے ایک پتھر نکالا۔ اسے استعمال کرنے سے پہلے وہ دیر تک اوپر چھتی پر پڑی ہوئی گھڑیا کا نشانہ باندھتا رہا۔ پتھر عین نشانے پر پڑا اور کچی گھڑیا میں بڑا سا سوراخ ہوگیا جس میں سے گڑ کی ڈھیلیاں نیچے گرنے لگیں۔

انہیں جیبوں میں بھر کر جب وہ باہر نکل رہے تھے تو بڑی ماں صحن میں داخل ہوئی۔ دونوں بچوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ بڑی ماں وہیں سے چلائی۔

''ٹھہر جاؤ چورو۔ آج تمہاری بوٹیاں کروں گی۔''

وہ دونوں آگے آگے اور بڑی ماں اونچی آواز سے کوستی ہوئی پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ اسی طرح انہوں نے تپتے ہوئے صحن کے تین چکر لگائے۔ پھر وہ دونوں بچپن کی پھرتی اور قوت کے بل پر بوڑھی عورت کی زد سے نکل بھاگے۔

جب وہ احاطے سے باہر نکل رہے تھے تو عائشہ رونے لگی۔

''کیا ہے؟'' علی نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''میرے پیر جل گئے ہیں۔''

''ہنہ' یہ عورتوں کے نخرے ہیں۔'' وہ سختی سے بولا۔ ''لو' یہ گڑ کھاؤ۔''

عائشہ اس سے گڑ لے کر کھانے لگی۔

''تم کل جا رہی ہو؟''

''ہاں۔''

باہر سنسان دوپہر اسی طرح تپ رہی تھی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے جوہڑ کی طرف چلے گئے جدھر درختوں کا سایہ تھا۔

اگلے روز عائشہ اور اس کی ماں رخصت ہوئے۔ عائشہ کی ماں نے' جو علی کی خالہ تھی' اسے پاس بلا کر چوما اور سر پر پیار دیا۔ پھر دونوں ماں بیٹی گھوڑیوں پر سوار ہوئیں۔ جب دونوں بہنیں دنیا بھر کی باتیں کر چکیں تو گھوڑیاں' جو رخصت ہوتے ہوئے مہمانوں کو لے کر جانے کی عادی تھیں' بغیر اشارے کے چل پڑیں۔

دھوپ زرد ہو رہی تھی اور دونوں گھوڑیاں جوہڑ کے کنارے آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ جوہڑ کے پانی میں ان کے زرد عکس دوسرے کنارے پر چلتے ہوئے کسانوں کو دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پانی میں ان کا عکس دیکھ کر چونکتے اور ان کی طرف اشارہ کر کے کہتے۔ ''نعیم کے جانور اچھی نسل کے ہیں۔ اس کی موسی جا رہی ہے۔'' دو ادھیڑ عمر کسان ان کو دیکھ کر رکے' ایک نے ہاتھ ہوا میں اٹھا کر بلند آواز میں کہا۔ ''نعیم کی موسی' اللہ فضل کرے۔'' گو وہ نعیم کی بجائے علی کی خالہ تھی لیکن گاؤں کے لوگ خوشامد کے طور پر یہی کہہ کر بلاتے اور اس گھر کا ہر فرد نعیم کا نام اپنے نام کے ساتھ منسوب دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ کسان کے جواب میں اس نے دوسرے کنارے سے ہاتھ ہوا میں اچھالا اور منہ میں کہا۔ ''اللہ فضل کرے۔'' جس کی آواز دوسرے کنارے تک نہ پہنچ سکی۔ دونوں کسان تھوڑی دیر تک کھڑے سادہ' شہوانی نظروں سے اسے دیکھتے رہے' پھر ایک نے کہا: ''خوب عورت تھی' اب تو ڈھل گئی ہے'' اور ہنس کر اپنے راستے پر ہو لئے۔ اسی طرح انہیں راستے میں گاؤں کے سب رہنے والے ملے اور جو انہیں جانتے تھے انہوں نے اونچی آواز میں الوداع کہا اور جو نہ جانتے تھے انہوں نے محض پسندیدگی کی نظروں سے اسے اور اس کی گھوڑی کو دیکھا اور گھر جا کر اپنی عورتوں سے ان کا تذکرہ کیا اور اس طرح سارے گاؤں کو پتا چل گیا کہ گاؤں سے کون رخصت ہوا ہے۔ سوائے نعیم اور اس کی بیوی کے جو گاؤں سے باہر' بڑے مکان میں رہتے تھے۔

علی جوہڑ کے کنارے پڑے پتھر پر بیٹھا تھا۔ آج دن بھر وہ کھیلتا رہا تھا اور ایک بار بھی کھیتوں پر نہ گیا تھا۔ دوپہر تک وہ ایک سو سے زیادہ بار عائشہ سے پوچھ چکا تھا۔ ''آج تم جا رہی ہو؟'' اور ہر بار اس کے اثبات میں

جواب دینے پر ایک سخت سی ''ہنہ'' کر کے بچپن کے غرور میں اس کو ٹال گیا تھا' لیکن دوپہر کے بعد جب وہ گھوڑیوں پر سوار ہوئے تو وہ دفعتاً خاموش ہو گیا۔

جب عائشہ کی گھوڑی اس کے برابر پہنچی تو وہ اٹھ کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''کیوں؟'' عائشہ نے پوچھا۔

''راستہ خطرناک ہے' عورتوں کو اکیلے نہیں جانا چاہیے۔''

''کیا ہے؟''

''راستے میں بھیڑیے ہیں۔ جنگل میں......''

''ہنہ...... ہمارے پاس گھوڑیاں ہیں۔'' عائشہ نے بدد ماغی سے جواب دیا۔

''وہ گھوڑیوں کو پھاڑ کھاتے ہیں اور عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔''

''ارے باپ رے۔'' عائشہ آنکھیں پھیلا کر دہشت سے بولی۔ ''پھر؟''

''کوئی فکر نہیں۔ میں ساتھ جاتا ہوں۔''

عائشہ احسان مندی سے اس کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

انہوں نے روشن پور کے کھیت پار کر لئے تھے اور اب دوسرے گاؤں کی زمینوں میں چل رہے تھے۔ عائشہ کی ماں کی گھوڑی آگے نکل چکی تھی اور علی سینے پر بازو باندھے عائشہ کی گھوڑی کے ساتھ چل رہا تھا۔ مختلف کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔ عائشہ' جو گھڑ سواری اور گھر جانے کے خیال سے کافی مسرور تھی' بڑے اشتیاق سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ مثلاً یہ کہ کس طرح وہ ایک دفعہ تین بھیڑیوں کو جُل دے کر ان کے پنجے سے نکل آیا تھا اور یہ کہ اس جنگل میں جو ایک عجیب سا درخت تھا اس کے نام کا کسی کو پتا نہ تھا مگر اس کے پتوں کی کھاد بڑی عمدہ بنتی تھی' اور یہ کھیت' جن میں سے وہ گزر رہے تھے' ان کے نہیں بلکہ دوسرے گاؤں کے تھے اور ان کے کھیتوں کی طرح زرخیز نہ تھے کیونکہ اس گاؤں کے لوگ کام چور اور کھلنڈرے تھے اور محنت سے جی چراتے تھے۔ اور یہ کہ بھیڑیے مردوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے بلکہ عورتوں کو دبوچتے ہیں' ان کے زیورات اور قیمتی کپڑے اتار کر اپنی بیویوں کو پہناتے ہیں اور عورتوں کو ان کی خدمت پر مامور کر دیتے ہیں۔ عائشہ نے بھیڑیے کی بیوی کی خدمت گار بننے کے خیال پر خوف اور تعجب کا اظہار کیا۔ پکی سڑک پر پہنچتے پہنچتے ان کو شام ہو گئی۔

گھوڑی سخت اور ہموار زمین کو محسوس کر کے خوشی سے ہنہنائی اور تیز ہو گئی۔ علی ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ عائشہ نے' جو اچھی خاصی سوار تھی لیکن گھوڑی کی عادتوں سے واقف نہ تھی' اسے روکنے کے لئے باگیں کھینچیں۔ گھوڑی نے اگلے پاؤں اٹھا کر ہوا میں چلانے شروع کر دیئے۔

''میں اس کے ساتھ دوڑ سکتا ہوں۔ اسے چھوڑ دو۔'' علی نے کہا۔

''ابھی یہ چاروں پاؤں پر آ جائے گی۔''

''تو کیا ہے۔ میں خرگوش کی طرح دوڑتا ہوں۔'' وہ تیزی سے بھاگنے لگا۔

''تو لو......'' عائشہ باگیں ڈھیلی چھوڑ کر بولی اور چمٹ کر بیٹھ گئی۔ ڈھیل پا کر گھوڑی آسانی سے دوڑنے لگی۔

''میں اس سے بھی تیز دوڑ سکتا ہوں۔'' علی نے دانت پیس کر کہا اور سر گھوڑی کے سر سے آگے نکال لے گیا۔ عائشہ نے آہستہ سے ایڑیاں گھوڑی کی پسلیوں پر ماریں۔ گھوڑی چار پاؤں پر دوڑنے لگی۔ علی اب پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا اور تیز ہوا کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ پل کے پل میں گھوڑی فراٹے بھرتی ہوئی اس کے پاس سے نکل کر گرد کے طوفان میں غائب ہوگئی۔

جب گرد و غبار ذرا کم ہوا تو اس نے دیکھا کہ سوار اور گھوڑی دونوں حد نظر سے باہر جا چکے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جا کر پلیا پر بیٹھ گیا۔ نیچے ایک ننھا سا برساتی نالہ بہہ رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا جو اندھیرے میں اس کی نظروں سے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے طبیعت میں سخت بدمزگی محسوس کی۔ اس کے دل میں ایک محبوب دوست کے بچھڑنے کا رنج تھا مگر ابھی وہ اس عمر کو نہ پہنچا تھا کہ اس رنجیدہ جذبے کو جان سکتا۔ چنانچہ وہ پلیا پر بیٹھا بے دلی سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ قریب کی فصل میں سے ایک گیدڑ کان کھڑے کر کے نکلا اور نالے پر آ کر پانی پینے لگا۔ علی واپس جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اب اسے پتا چلا کہ وہ ننگا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا تو جوتے اس کے پاؤں سے اتر گئے تھے۔ وہ اندھیرے میں سر جھکا کر دیکھتا ہوا اسی راستے پر چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر ایک جوتا مل گیا لیکن بہت تلاش کرنے کے بعد بھی دوسرا جوتا نہ ملا۔ رات چاروں طرف پھیل گئی تھی اور وہ اکیلا تاریک راستوں کو دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ رنج سے مجبور ہو کر وہ رونے لگا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں نے جھپٹ کر اسے گود میں لے لیا اور اس کا ماتھا چوم کر بولی:

''کیوں روتا ہے میرے لال۔ ایں؟ بتا۔''

''میرا جوتا کھو گیا ہے۔'' اس نے بمشکل کہا۔

''پھر کیا ہے۔ چپ ہو جا میرے لال' وہ پرانا اور پھٹا ہوا جوتا تھا۔ مت رو۔''

لیکن اس رات وہ پرانے اور پھٹے ہوئے جوتے کے علاوہ اور بہت سے انجانے رنج کی وجہ سے دیر تک لیٹا سسکیاں لیتا رہا۔

(۲۲)

جیل جانے کا خیال نعیم کے لئے انوکھا نہ تھا۔ اس سے پہلے اس کے ہزاروں ساتھی جیل جا چکے تھے' پھر بھی جیل کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے وقت اس کے جسم میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ گئی اور دل کے دھڑکنے کی آواز اس نے صاف طور پر سنی کہ بالآخر یہ ایک ان دیکھی اور انجانی دنیا تھی۔

وہ اپنی دس فٹ مربع کوٹھڑی میں بیٹھا رات کا کھانا کھا رہا تھا اور آستین سے آنکھیں پونچھتا جا رہا تھا۔ کوٹھڑی میں ایک چھوٹا سا سوراخ روشن دان کے نام کا تھا جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ روشنی کے لئے ایک مٹی کا دیا تھا جس میں گاڑھا' سیاہ رنگ کا تیل جل رہا تھا جو مرچوں کی طرح آنکھوں کو لگتا تھا۔ فرش اور دیواریں پتھر کی تھیں جن پر مٹی کی ایک دبیز تہہ چڑھ چکی تھی اور اس میں کیڑے مکوڑے اور بچھوؤں کے چلنے سے لکیریں بن گئی تھیں۔ ایک کونے میں چٹائی بچھی تھی جو کہ اس کا بستر تھا۔ سالن نمک مرچ اور دال کے چند دانوں کو پانی میں ابال کر بنایا گیا تھا اور روٹی کے آٹے میں ریت اور مٹی ملی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود سارے دن کی بھوک کے مارے اس نے بکری کی طرح وہ کھانا کھالیا اور کھانے کے دوران دل میں پریشان ہوتا رہا کہ دھواں جو بادل کی طرح اس کے کمرے میں بھر گیا تھا' کس طرح صاف ہوگا اور وہ ایسے دھوئیں میں کیسے سو سکے گا۔ لیکن جیل میں پہلا دن گزارنے کا تناؤ کھانا کھانے کے بعد جب ذرا کم ہوا تو اسے خود بخود نیند آنے لگی۔ اس نے کونے میں پڑے ہوئے ایک پتھر کو اٹھا کر چٹائی کے سرہانے کی جگہ پر رکھا اور اس پر سر رکھ کر لیٹ گیا' لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس کو دھاریوں میں بہتے ہوئے پسینے کو خشک کرنے کے لئے اٹھنا پڑتا۔ برسات کے مخصوص حبس کی رات تھی اور نعیم کے اردگرد دھواں اور پرانی' سال خوردہ ہوا بھاری تہوں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ایک دفعہ پسینہ پونچھتے ہوئے آستین لگنے سے دیوار کی مٹی اڑی اور اس کی ناک میں جا گھسی۔ وہ چھینکتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت یہ سوچ کر دل میں اسے افسوس ہوا کہ اس کے ساتھ نچلے درجے کے اخلاقی قیدیوں کا سا سلوک کیا گیا تھا۔

وہ بہت دن کے بعد زمین پر سویا تھا۔ رات میں کئی بار اس کی آنکھ کھلی اور اسے ان دنوں کا خیال آیا جب وہ جنوبی ہندوستان کے گاؤں اور شہروں میں ایک لمبے عرصے تک زمین پر سوتا رہا تھا۔ صبح جب وہ جاگا تو آنکھیں بند کئے کئے اس نے عادتاً اپنی بیوی کو پکارا۔ کمرے میں وہی جمود تھا' لیکن دھواں ڈغائب ہو چکا تھا اور دن کا اجالا دروازے میں سے اندر آ رہا تھا۔ سامنے جیل کی اونچی دیوار تھی اور دھوپ کہیں پر نظر نہ آ رہی تھی۔ آسمان کا وہی چھوٹا سا حصہ دکھائی دے رہا تھا جو اس نے کل کوٹھڑی میں داخل ہونے کے بعد دیکھا تھا۔ سامنے ایک عجیب نظارہ تھا۔ کھلی جگہ میں لوہے کی سلاخوں کا ایک اونچا اور گول سا جنگلہ بنا تھا جس کے اندر بہت سے لوگ لکڑی کے ایک شہتیر کو کھینچتے ہوئے گول دائرے میں گھوم رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ کنوئیں میں سے پانی کھینچنے

کے لئے بیلوں کی جگہ پر کام کر رہے تھے۔ ایک بدنما چہرے والا شخص ان کی نگرانی پر کھڑا تھوڑے تھوڑے وقفے پر گالیاں دے رہا تھا۔ چڑیا گھر کے سے اس منظر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے نعیم نے گننا شروع کیا۔ وہ تعداد میں اٹھارہ تھے اور برابر نگران کو اور ایک دوسرے کو کوس رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ دروازے کی سلاخوں پر ہاتھ رکھے رکھے وہ ان کی اس بے حس خوش دلی پر محظوظ ہوتا رہا۔

پھر اپنے قریب ہی ایک کرخت انسانی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ یہ ایک اتنے ہی کرخت نقوش والا شخص تھا جو قیدیوں کے لباس میں تھا اور بازو پر 'ڈبلیو۔او' (وارڈ اوورسیئر) کا بلا لگائے ہوئے تھا۔ وہ ایک دوسرے قیدی کو گردن سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بڑے معمولی' روزمرہ کے انداز میں گالیاں دے رہا تھا۔ جواب میں قیدی بھی گالیاں دے رہا تھا اور قسمیں کھا رہا تھا۔ نعیم کے برابر پہنچ کر وہ رکا اور کوری کوری نظروں سے اسے تکنے لگا۔

''سورج نکل آیا ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''ہاں' ابھی ایک چیل گزری تھی۔'' اس نے کرخت' بے معنی لہجے میں جواب دیا۔

(جلد ہی نعیم قیدیوں کے اس طریق سے واقف ہوگیا' جب وہ خود بھی سر اٹھا کر آسمان کے اس حصے کو جو ان کے سروں پر تھا' دیکھنے اور پرندوں پر پڑتی ہوئی دھوپ سے طلوع وغروب کا اندازہ لگانے لگا۔)

''رات بھر تم کتے کی طرح سوئے رہے۔'' وارڈ اوورسیئر پھر اسی ناخوشگوار آواز میں بولا۔

رات بھر کی خجالت نے نعیم کے دماغ میں ایک دم غصے کی شکل اختیار کرلی۔ اس نے سارے جسم کے ساتھ دروازے کو دھکیلا: ''کتے۔'' اس نے خشمگیں لہجے میں کہا۔

وارڈ اوورسیئر بے حس نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ منجمد چہرے کے ساتھ منہ کھول کر ہنسا:

''میں تین بار یہاں سے گزرا۔ تمہیں پتا ہے؟''

''یہاں آؤ'' نعیم نے غصے کو دبا کر کہا۔ وہ بے شرمی سے چلتا ہوا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ نعیم نے سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر زور سے گھونسہ اس کی ناک پر مارا۔ ''سؤر۔''

اس غیر متوقع حملے سے وہ لڑکھڑا گیا اور ناک کو چھو کر بولا: ''کیوں...... کیوں!''

''گالی کیوں دی؟'' نعیم نے کہا۔

''گالی؟'' کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے کئی بار ناک چھو کر دیکھا۔ ''گالی؟''

''ہاں۔ میں نے چوری نہیں کی۔''

''پھر کیا کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے؟...... میں نے......'' نعیم نے بے خیالی سے اس کی ناک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں کیا۔''

''قتل کیا ہے؟''

''نہیں۔''

''زنا کیا ہے؟''

''نہیں۔'' نعیم چیخا۔

''پھر تمہارا دماغ چل گیا ہے۔'' وارڈ اوورسیئر نے کہا۔ ''مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی سزا تم کو ملے گی۔ کتے کے بچے۔''

وہ نفرت سے اسے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ نعیم کا جی چاہا کہ دروازے کی سلاخوں کو چبا ڈالے' لیکن جب وہ چلا گیا تو دفعتاً وہ اپنی پیش قدمی اور اس دوسرے شخص کی شدید بے حسی پر دل میں خوف زدہ ہو گیا۔

دن کی روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی لیکن دھوپ کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ سامنے جنگلے کے اندر قیدیوں کے پانی کھینچنے کا نظارہ کرتے کرتے اچانک نعیم کے دل میں ایک بے کلی پیدا ہوئی۔ دھوپ کہاں تھی؟ اور پرندے آسمان کا مختصر سا حصہ اس کی نظروں کے سامنے بے رنگ اور ویران تھا۔

وہ قیدی' جسے وارڈ اوورسیئر وہاں چھوڑ گیا تھا' اس کے قریب آیا۔

''مجھے مت مارنا۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔'' اس کے نعیم کی زد سے باہر رہتے ہوئے کہا۔ نعیم خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ بھی دیکھنے والے میں تنفر اور ناگواری پیدا کرتا تھا' گو کبھی خوبصورت رہا ہو گا۔

''تم کیوں آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے کچھ پتا نہیں۔'' نعیم نے ایک لمحے تک سوچ ہوئے چہرے کے ساتھ دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

''یہاں پر تم کچھ نہیں چھپا سکتے۔ دو دن میں تمہاری اصلیت کا پتا چل جائے گا۔ شکل سے تو کچھ ایسے حرامی معلوم نہیں ہوتے۔''

''میں نے 'سوراج' کے لئے تقریر کی تھی۔'' نعیم نے جلدی سے کہا۔

''سوراج؟''

''آزادی۔ آزادی کے لئے۔''

اس کی آنکھوں میں امید کی ایک رمق ظاہر ہوئی: ''آزادی؟ ہم آزاد ہو جائیں گے؟''

''نہیں' ملک کی آزادی کے لئے۔''

''ملک؟ ایں...... اور ہم؟''

''پہلے تمہارے ماں باپ اور بیوی بچے اور زمینیں آزاد ہوں گی۔ پھر جب تمہاری سزا ختم ہو جائے گی تو تم بھی آزاد ہو جاؤ گے۔''

''آہاہاہا۔'' وہ دیوانوں کی طرح ٹکٹکی باندھ کر ہنسا۔ اس کے چہرے پر ہنسی کی رمق تک نہ بکھری۔ نعیم نے اپنی پشت پر خوف کی سرسراہٹ محسوس کی۔ ''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ تب میرے ماں باپ اور بیوی بچے اور زمینیں سب مر چکی ہوں گی۔''

''مر چکی ہوں گی؟''

''یہ دیکھو۔'' اس نے کندھا آگے بڑھایا جس پر اس کی تاریخ رہائی 1972ء لکھی تھی۔

''اڑتالیس سال اور۔''

''ایں؟'' نعیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

وہ دوبارہ منہ کھول کر ہنسا۔ ''یہ تقریر والی تو تم بکواس کر رہے ہو' لیکن تمہارے جھوٹ کا ہمیں پتا چل جائے گا۔ چرس پیو گے؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟ پیسے نہیں ہیں' نواب کے بچے' یوں تو کتے کی گالی پر سیخ پا ہوتے ہو۔''

''جاؤ اپنا کام کرو۔'' نعیم نے خاموش غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے بیٹا۔'' قیدی جاتے جاتے مکاری سے بولا۔ ''میں تمہارا دوست ہوں۔ چرس کی ضرورت پڑے تو مجھ سے کہنا۔''

غصے کے ساتھ ساتھ نعیم کے دل میں اس کے لئے رنج پیدا ہوا۔

ایک وارڈر نے آ کر اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور گندم کی آدھی بوری چکی کے پاس لا رکھی۔

''آج شام تک اس کو ختم کرنا ہے۔'' اس نے مخصوص کرخت آواز میں' جس سے نعیم اب آشنا ہوتا جا رہا تھا' کہا پھر جاتے جاتے اس کی نظر ان چھوئے کھانے پر پڑی اور وہ رک گیا۔ ''تم نے کھانا نہیں کھایا؟''

''یہ؟ یہ جانوروں کا کھانا؟'' نعیم نے رک رک کر کہا۔

''اہا...... بیل کے بچے' تو تم اپنی ساس کے گھر آئے ہو۔'' پھر وہ ایک دم آنکھیں نکال کر چیخا۔ ''سنو۔ اگلے ہفتے تمہارا وزن ہوگا۔ اگر ایک تولہ بھی کم ہوا تو تمہیں مویشیوں کا گوبر کھلایا جائے گا۔ سنا؟'' دروازہ بند کرتے ہوئے سلاخوں میں ناک ٹھونس کر پھر چیخا۔

''تم نے بیلوں کو دوا پلانے والی نال دیکھی ہے؟ تم جیسے کتوں کو گوبر کھلانے کے واسطے ہم اس کا استعمال کرتے ہیں۔''

نعیم زخمی سؤر کی طرح اسے دیکھتا رہا۔

دن بھر وہ چکی پیستا اور بار بار اٹھ کر دروازے کی طرف جاتا رہا۔ کئی بار اس نے دروازے کو دھکیل کر' بیٹھ کر اور لیٹ کر باہر کی دنیا کو ذرا دور تک دیکھنا چاہا' لیکن آسمان کو دیواروں سے باندھ دیا گیا تھا اور اس پر کوئی پرند نہ تھا۔ دوپہر کے قریب ایکا ایکی گرم سورج دیوار کے عقب سے اس کے سامنے آ گیا اور اس نے گھبرا کر آنکھیں پھیر لیں۔ دھوپ کڑی اور بے رنگ تھی۔ وہ واپس چکی کی طرف لوٹ آیا اور پیٹ میں بھوک محسوس کر کے کھانے پر پل پڑا۔

آسمان پر ابھی اجالا تھا جب جیل کا ایک افسر اور ایک وارڈر اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ وہ چکی پر سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ جیل کے افسر نے جوتے کی نوک اس کی پسلی کی چبھوئی۔

''تم نے ڈبلیو۔او۔نمبر 19 کو مارا تھا؟ آج صبح۔''

''ہاں۔'' گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے نعیم نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

یہ کہتے ہوئے کہ اس نے اسے گالی دی تھی نعیم جھجک گیا کہ اب وہ ان گالیوں سے مانوس ہو چکا تھا۔ وہ خاموش رہا۔

''اٹھو۔'' جیل کے افسر نے پھر اس کے پہلو میں جوتے کی نوک ماری۔''اس کے لئے تمہیں پانی کھینچنا پڑے گا۔''

باہر نکل کر اس نے کسی بات پر جو اس کے نگران آپس میں یا اس کے ساتھ کر رہے تھے' دھیان نہ دیا اور خوشی سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ سہ پہر کی زرد دھوپ میں چند کبوتر اس کے سر پر سے گزر رہے تھے۔ اس نے چند لمحے کے لئے آزادی کا سرور محسوس کیا۔ آہنی جنگلے میں پہنچ کر اس نے تیز کرخت آوازوں میں غل مچاتے اور پانی کھینچتے ہوئے قیدیوں کو قریب سے دیکھا۔ چوبیس گھنٹے تک تنہائی میں رہنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں آ گیا ہے۔ وہ بدنما شخص' جسے اس نے مارا تھا۔ اسے قطار میں کھڑا کر کے رسہ پہنانے لگا۔

''ایک اور بیل آیا ہے۔'' قطار میں سے آواز آئی۔

''سئور کی طرح پلا ہوا ہے۔'' دوسرے نے کہا۔ قطار میں سے زوردار ہنسی کی آواز بلند ہوئی۔ نعیم کا جی اس خوشدل گروہ کے ساتھ گھلنے ملنے اور باتیں کرنے کو چاہنے لگا۔ اس نے اپنے ساتھ والے سے پوچھا۔''تم کسان ہو؟''

''میں بیل ہوں۔'' اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ پسینے میں بھیگے ہوئے' ہانپتے ہوئے قیدیوں کی قطار سے پھر ہنسی کی آواز اٹھی۔

ہر چکر پر وارڈ اوورسیئر اس کی پسلیوں پر چھڑی مارتا جا رہا تھا۔ پہلے چند چکر تو باہر آنے کی خوشی میں اس نے آسانی سے مکمل کر لئے' پھر اس کی کمر اور ٹانگوں میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت اس کے دل میں اپنی اور اس نوع کی مشقت کرنے والے دوسرے انسانوں کی شدید ذلت کا احساس پیدا ہوا۔ جسمانی تکلیف اور خفت کے احساس میں اس نے نگران کی گالیوں اور چابکوں کو نظر انداز کر دیا۔

جب انہیں کھولا گیا تو چند منٹ تک وہ آنکھیں بند کئے کھڑا اپنے جسم کی منتشر اور ضائع ہوتی ہوئی قوتوں کو یکجا کرتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر وارڈ اوورسیئر نمبر 19 کو دیکھا۔

''تمہارے پاس سگریٹ ہیں؟''

''کیوں' نوابی ختم ہوگئی؟'' وارڈ اوورسیئر نے رعونت سے کہا۔ نعیم خفت سے ہنس کر ناک کھجانے لگا۔

''چلو۔'' وارڈ اوورسیئر نعیم کو لے کر اس کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔ ''تم اگر مجھ سے صلح رکھو تو میں سگریٹ مہیا کر سکتا ہوں؟''

''میں تمہاری طرح باہر پھر سکتا ہوں؟'' نعیم نے پوچھا۔

''نہیں۔ ہم عمر قید والے ہیں۔ ہم نے اچھا چال چلن دکھایا ہے اس لیے ہمیں ڈبلیو۔ او۔ بنا دیا گیا ہے۔ میں نے بارہ سال کاٹ لئے' بتیس سال اور ہیں۔ دیکھو۔'' اس نے اپنا کندھا دکھایا جس پر اس کی تاریخ رہائی 1956ء لکھی تھی۔ دروازہ بند کر کے جاتے ہوئے وہ بولا: ''اب تم نے کسی پر ہاتھ اٹھایا تو درے لگیں گے۔ سنا حرامی؟''

شام کے وقت وہ اندھیرے میں بیٹھا تھا کہ کسی نے دروازہ کھولا۔

''اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہو؟'' تحکمانہ لہجے میں کوئی بولا۔

''تمہارا باپ آنکھوں کو لگتا ہے' دھواں۔'' نعیم نے جل کر کہا۔

''دیا جلاؤ۔ یہاں چالاکیاں نہیں چلیں گی۔'' چلنے والے کو چکی کی ٹھوکر لگی اور اندھیرے میں اس کے کوسنے کی آواز آئی۔

دیا جلانے سے دھوئیں کا بادل چھت کو چڑھنے لگا۔ ''میں بھاگ کر کہیں نہیں جاؤں گا' بے فکر رہو۔'' نعیم نے کہا۔

''ہنہ'' دوسرا شخص بڑبڑایا۔ یہ وہی اوورسیئر تھا جس نے صبح کو اسے گوبر کھلا کر اس کا وزن بڑھانے کی دھمکی دی تھی۔ ''یہ؟ یہ سارا؟ کام چور گدھے کے بچے...... ہیں؟'' وہ یکلخت چیخا۔

''میں اس سے زیادہ نہیں پیس سکتا۔''

''کیوں؟'' وہ جارحانہ انداز میں بڑھا۔

''میرا ایک ہاتھ ہے۔'' نعیم نے چیخ کر کہا اور جلدی سے بازو ننگا کر کے آگے بڑھایا۔ ''دیکھو...... دیکھو۔''

''ہیں۔'' حیرت کے مارے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کپکپاتی ہوئی انگلیوں کے ساتھ نعیم نے آستین اتار کر اسے ڈھک دیا۔

''دو...... مجھے دو۔'' اوورسیئر نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھایا۔

''تم اسے نہیں رکھ سکتے۔ یہ قانون ہے۔ دو۔'' اس نے لکڑی کی انگلیوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا' جس سے نازک کمانیاں کھل گئیں اور لکڑی کا ٹکڑا بازو سے الگ ہوگیا۔

نعیم نے بھیڑیے کی طرح دانت نکال کر جھپٹا مارا اور لکڑی کا ٹکڑا اس سے چھین لیا۔ ایک پل کے لئے اس نے اپنے آپ کو تولا اور پھر ہاتھ اٹھا کر لپکا۔ اوورسیئر تیزی سے باہر نکل کر غائب ہوگیا۔ ٹکڑا ہاتھ میں لٹکائے

لٹکائے نعیم جنگلی جانور کی طرح کمرے میں چکر لگاتا رہا۔ غیض کی حالت میں اس کی سوچنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ جبلی طور پر خطرے کو محسوس کر کے اس نے اسے چکی کے نیچے چھپا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جیل سپرنٹنڈنٹ، جیلر، اوورسیئر اور ایک سپاہی اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔

''کہاں ہے؟'' سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔

''میرا ایک ہاتھ ہے۔'' نعیم نے آستین چڑھا کر اسے کٹا ہوا بازو دکھایا۔

''لکڑی کا کہاں ہے؟''

نعیم خاموش بیٹھا بازو پر ہاتھ پھیرتا اور زیر لب بڑبڑاتا رہا۔ ''میرا ایک ہاتھ ہے...... ایک ہے۔''

چکی کے نیچے سے اسے تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دیر نہ لگی۔ کچھ دیر تک وہ سب تعجب اور دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھتے رہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی کاریگری کی تعریف کرتے رہے۔ پھر وہ اسے لے کر باہر نکل گئے۔

''جب تم جاؤ گے تو دے دیا جائے گا۔'' جاتے جاتے سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

برسات کی اس بندرات میں آدھے بازو کو پکڑ کر لیٹے لیٹے اس کے دل میں بیکراں تنہائی اور عظیم نقصان کا احساس پیدا ہوا، جیسے اس کے تمام ساتھیوں کے کارواں اسے چھوڑ کر آگے نکل گئے ہوں۔

اسی طرح ایک مدت تک جیل میں رہتے رہتے وہ وہاں کے ماحول اور وہاں کے باشندوں سے مانوس ہو گیا، جس طرح انسان تقریباً ہر چیز کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس پر بھی ایک خلش، جو ہر ذہین انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کی روح میں چبھی رہی۔ کبھی کبھی وہ خلش باہر نکل کر ایک بھاری درد کی طرح اس کے سارے جسم کو جکڑ لیتی اور ان دنوں میں وہ بے حد آزردہ ہو جاتا۔ یہی چیز تھی جو اسے وہاں کے معمولی باسیوں سے ممتاز کرتی تھی اور جس نے دوسروں کو اس کی عزت کرنے پر مجبور کیا۔

ان قیدیوں میں معمولی اخلاقی قیدی تھے جن کی سزائیں نسبتاً مختصر تھیں۔ اس کے بعد عمر قید والوں کا عجیب وغریب گروہ تھا۔ عموماً عمر قید چودہ یا بیس سال کی ہوتی ہے لیکن بعض اوقات انہیں اس سے کہیں زیادہ لمبی سزا بھگتنا پڑتی، مثلاً کئی کئی جرموں کا ایک ساتھ مقدمہ چلایا جاتا اور سب کی سزائیں جمع کر کے ان پر عائد کر دی جاتیں۔ نعیم کے جیل میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو کئی کئی سال جیل میں گزار کر ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے تھے اور ابھی ان کی سزا کے بیس بیس اور تیس تیس برس باقی تھے۔ یہ لوگ، جو اپنی عمروں کا بہترین حصہ جیل میں گزارتے ہیں، سالہا سال تک کوئی عورت یا بچہ یا مذہبی رہنما نہیں دیکھتے۔ وہ باہر کی دنیا سے علیحدہ اور قطعی بے خبر ہوتے ہیں اور اپنی عمریں ہر قسم کے دوستانہ انسانی رشتوں سے دور رہ کر بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نفرت اور انتقام کے مکروہ انسانی جذبات میں لپیٹ لیتے ہیں اور زندگی کی اچھائیوں اور مہربانیوں کو یکسر بھول جاتے ہیں حتیٰ کہ آہستہ آہستہ ان کے یہ ناپاک جذبات بھی معدوم ہو جاتے ہیں اور ایک اذیت ناک بے حسی ان پر طاری ہو جاتی ہے۔ نعیم کو ابتدا میں انہی لوگوں

سے واسطہ پڑا اور یہی لوگ اس کے دوست بنے۔

جیل کی زندگی میں کوئی تبدیلی، کوئی تنوع نہ تھا۔ روز بہ روز، سال بہ سال وہی کڑی، بے رنگ دیواریں اور پرانے غیر دلچسپ چہرے۔ آسمان کا قطعی وہی حصہ جو پہلے روز نظر آیا تھا ہمیشہ نظر آتا رہا اور کبھی کبھار اس پر سے پرندے گزرا کرتے۔ عام طور پر آسمان مَیلا، یک رنگ رہتا۔ صرف برسات کا موسم نعیم کے لئے خوشی کا پیغام لے کر آتا جب بادل آسمان پر چلتے اور یوں لگتا جیسے آسمان چل رہا ہے۔ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہوئے گھنٹوں لیٹا آسمان پر آگے پیچھے دوڑتے ہوئے بادلوں اور سرکتے ہوئے آسمان کو دیکھا کرتا۔

جیل کی زندگی رنگوں سے یکسر مبرا ہوتی ہے۔ کسی طرف ہریالی یا سرخی نہیں ہوتی۔ کسی کو گھاس یا سبزیاں اگانے کی اجازت نہ تھی۔ رنگین لباس برسوں نظر نہیں آتے۔ دوپہر کے قریب سفید، گرم سورج اچانک سامنے آجاتا ہے اور طلوع و غروب کے رنگ قیدیوں کے حافظے سے محو ہو جاتے ہیں۔ گول، بدرنگ دیواروں میں چکر لگا لگا کر نظریں کند ہو جاتی ہیں اور رنگوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ ذہانت سے گفتگو کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، چاروں طرف سے گفتگو کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، چاروں طرف وہی گنے چنے، قدیم، بدنما چہرے، جنہیں دیکھ دیکھ کر نظریں پک جاتی ہیں۔ جیل وہ جگہ ہے جہاں پر انسان کے دل میں کھلی سرسبز جگہوں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے لئے چاہت اور آرزو پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی ان معمولی معمولی چیزوں کی خواہش دل اور آنکھوں میں خلا پیدا کردیتی ہے اور سوچنے والے ذہنوں میں دیوانگی جنم لیتی ہے۔

کافی عرصے کے بعد جیل کی فضا میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی جب عدم تعاون کے سلسلے میں والنٹیئر وں نے قید میں آنا شروع کیا۔ نعیم کی آنکھوں کا خلا پُر ہونے لگا اور اردگرد اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر وہ واپس احساس کی دنیا میں چلا آیا۔ نووارد تروتازہ چہروں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والے لوگ تھے اور پرانے باشندوں سے ہر حالت میں مختلف تھے۔ انہوں نے آتے ہی جیل کے ماحول کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور کھلے بندوں حکام اور جیل کے قوانین سے عدم تعاون کا اعلان کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیل کا نظام سخت کردیا گیا اور زائد مشقت اور درے بازی کے واقعات روز بروز بڑھنے لگے۔ ایک واقعہ جو نعیم کو بہت عرصے تک یاد رہا، ایک سولہ سالہ لڑکے کا تھا۔ وہ ذہین چہرے والا خوش مزاج اور دلیر لڑکا تھا اور اس کے چہرے پر لڑکپن کا مخصوص دمکتا ہوا حسن اور دلربائی تھی۔ وہ عدم تعاون کی تحریک میں سکول چھوڑ کر جیل چلا آیا تھا۔ آتے ہی اس نے قانون شکنی شروع کردی۔ اس کی پیش قدمیوں سے تنگ آکر حکام نے اس کے لئے درے بازی کی سزا تجویز کی۔ اسے مادرزاد ننگا کرنے کے بعد درے بازی کی تکون کے ساتھ باندھ دیا گیا اور جلادوں نے جو کہ وارڈ اوورسیئروں میں سے ہی منتخب کئے گئے تھے، کوڑے برسانے شروع کئے۔ تیل پلائے ہوئے ٹھوس چمڑے کا کوڑا اس کے کنوارے، بے داغ جسم پر پڑتا اور کاٹتا ہوا چلا جاتا۔ اس کے سارے بدن میں جھرجھری پیدا ہوتی اور وہ پوری آواز سے چلاّتا۔ ''انقلاب زندہ باد۔'' حتیٰ کہ درد کی شدت سے اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید اور جسم نیلا پڑ گیا اور اس کی آواز آہستہ ہوتی ہوئی بالکل بیٹھ گئی اور وہ

گردن ایک طرف ڈھلکا کر رونے لگا۔ گیارہ کوڑوں کے بعد وہ بے ہوش ہوگیا۔

جیل کے عملے نے اپنی زندگیوں میں ایسے قیدی کب دیکھے تھے جو اپنی مرضی سے جیلوں میں داخل ہوئے تھے اور جو اس قدر ذہین، چست اور خوش وخرم تھے اور جنہوں نے ان کا ہر حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ قید سے نکلنا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس کے لئے انہیں صرف ایک معافی نامہ لکھنا ہوتا تھا اور آئندہ کے لئے پُر امن چال چلن کا وعدہ کر کے وہ باہر جا سکتے تھے۔ ان کے بارے میں جیل کے عملے کو اعلیٰ حکام کی طرف سے خاص ہدایات موصول ہوئی تھیں۔ ان دنوں میں ان جیلروں کو خاص ترقیاں اور خطابات عطا کئے گئے جن کا سلوک قیدیوں کے ساتھ خصوصی طور پر سنگدلانہ تھا۔

ایک مرتبہ نعیم کی ساتھ والی کوٹھڑی میں کچھ دیر کے لئے چند خاتون قیدیوں کو رکھا گیا جو عدم تعاون کے سلسلہ میں قید ہوئی تھیں۔ وہ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے کی عورتیں تھیں لیکن انہیں پختہ اور عادی مجرم عورتوں کی زبانی جن کے ساتھ انہیں ٹھہرایا گیا تھا، کچھ اس قسم کی باتیں سننا پڑیں:

"تم تو بڑی خوبصورت ہو۔"

"جیلر کے ساتھ سوؤ تو چھوٹ جاؤ گی۔"

"افیم لو گی؟"

"تمہارے خاوند نامرد ہیں جو یہاں آ گئی ہو؟"

اس کے علاوہ گندے الفاظ اور گالیوں کی بھرمار تھی جو اس آفت خیز دور میں ہندوستان کی ہزاروں مہذب عورتوں کو سہنا پڑی۔ نعیم نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی بیوی کو کبھی جیل میں نہ آنے دے گا۔

سال کے آخری دنوں میں روشن آغا کے سیاسی دوستوں کی مجلس منعقد ہوئی جیسے گزشتہ کئی برسوں سے ہوتی آ رہی تھی۔ یہ لوگ ملک کی متوازی سیاسی جماعتوں میں ایک سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے آپ کو "لبرل" کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ بارسوخ اور روشن خیال تعلقہ دار طبقے سے تعلق رکھنے والے تقریباً سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین اور تن آسان لوگ تھے جن کے پیچھے شان دار خاندانی روایات تھیں۔ یہ لوگ سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

دسمبر کی وہ سرد صبح روشن محل میں چہل پہل لے کر آئی تھی۔ بڑے گیٹ پر بہلیاں رکی تھیں اور اندر برآمدے کے سامنے موٹر گاڑیوں کی قطار تھی۔ یہ دلّی کے جاڑوں کا خوبصورت ترین دن تھا جب کہ رات بھر کی پڑی ہوئی شبنم خشک ہو چکی تھی اور مہمان، جو زیادہ تر صبح کے انگریزی لباس میں تھے، ہلکے رنگ کی ٹائیاں اور شوخ رنگ سکارف لگائے، ہاتھوں میں سگریٹ، سگار اور سنگترے کے رس کے گلاس تھامے باہر سبزے پر نکل آئے تھے۔ کئی ایک سبزے پر بچھے ہوئے سفید بید کے مونڈھوں پر بیٹھے ستا رہے تھے۔ ایک انگریز خاتون جو ہندوستانی لباس میں تھی، مونڈھے کی پشت پر چھوٹی سی پھولدار چھتری لگائے تین مردوں کے ساتھ بیٹھی پھلوں کا رس پی رہی تھی۔ اس

نے آنکھوں پر دھوپ کی عینک لگا رکھی تھی۔

"گریپ فروٹ۔" خاتون کے پاس بیٹھے ہوئے ایک مرد نے قریب سے گزرتے ہوئے بیرے سے کہا۔
بیرا مستعدی سے جھکنے کے بعد اندر کی طرف لپکا اور پل کے پل میں معزز مہمان کے لئے گریپ فروٹ کا رس لے آیا۔

وہ سب دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بٹے ہوئے دھیمی، ملائم آوازوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ خلاف معمول آج استقبال کے رسمی فرائض انجام دینے کے لئے کوئی نظر نہ آ رہا تھا۔ خالہ بیمار تھی، پرویز کی تعیناتی ضلع میں کہیں ہو چکی تھی اور عذرا ان دنوں روشن پور میں تھی۔ چنانچہ نو وارد مہمانوں کے گاڑیوں سے اترتے ہی روشن محل کا ایک ملازم ادب سے جھک کر اطلاع دیتا کہ روشن آغا فلاں مہمانوں کے ساتھ اندر، مجلس کے خصوصی نشست کے کمرے میں اور باقی مہمان باہر دھوپ میں ہیں۔ آنے والا اپنی مرضی کے مطابق اندر یا باہر کی طرف بڑھ جاتا۔ لیکن جاڑوں کی اس صبح کو تازہ، چمکدار دھوپ آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی اور سبزے پر پھیلا ہوا اجلا مجمع نو واردوں کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔

روشن آغا اپنے اہم مہمانوں کے ساتھ سنجیدہ گفتگو میں محو تھے کہ باہر دو گھوڑوں والی ایک بگھی آ کر رکی اور اس میں سے تین مہمان اترے۔ تینوں ادھیڑ عمر کے تھے۔ ایک نے کشمیری برہمنوں کا اور دوسرے نے مرہٹوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ تیسرا دبلا پتلا، لمبوترے چہرے والا آدمی انگریزی لباس میں تھا اور آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ تینوں سیدھے اندر کی جانب بڑھے۔ انہیں برآمدے میں آتا دیکھ کر روشن آغا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہم اندر آ سکتے ہیں؟" دروازے میں رک کر مرہٹے نے اپنائیت اور ادھیڑ عمر خوش طبعی کے لہجے میں کہا۔
روشن آغا وہیں کھڑے کھڑے دونوں بازو پھیلا کر بولے: "ہر وہ عالی ظرف روح جو دنیا میں آئی ان دروازوں پر عزت اور محبت سے قبول کی جائے گی۔" پھر انہوں نے آگے بڑھ کر تینوں کا پُر جوش استقبال کیا۔ دوسرے مہمان اپنی اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ان کے میزبان نے نو وارد مہمانوں کا تعارف کرایا۔ ہندوستانی لباس میں دونوں شخص بالترتیب پونا اور بمبئی سے آئے ہوئے تھے اور "مجلس خدام ہند" سے تعلق رکھتے تھے۔ دبلے چہرے والا شخص لکھنؤ کے ایک مشہور انگریزی اخبار کے عملے کا ممتاز رکن تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں تینوں مہمان آرام سے دھنس کر صوفوں میں بیٹھ چکے تھے اور کافی پی رہے تھے جس کی خواہش انہوں نے خود ہی ظاہر کی تھی۔ انہیں دیکھ کر باہر کے لوگ بھی اندر آ آ کر بیٹھ رہے تھے۔ ہر طرف گرمجوش مصافحوں اور استقبالیہ جملوں کا شور تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں نشست کا کمرہ لوگوں سے بھر گیا۔ لمبے ریشمی پردے اکٹھے کر دیئے گئے اور کھلے دریچوں میں سے صبح کی دھوپ اندر آنے لگی۔

باہر جو گروپ بنے ہوئے تھے ٹوٹ کر بکھر چکے تھے، چنانچہ نئے نئے ساتھی مل جانے پر گفتگو پھر شد و مد سے شروع ہو چکی تھی۔ دریچوں میں سرما کے پھول دھات کے قدیم گلدانوں میں سجائے گئے تھے۔ لوگوں کے سروں کے اوپر او پر مکھیوں کی بھنک کی طرح شائستہ انسانی آوازوں کی گونج تیر رہی تھی اور تمباکو کا دھواں سورج کی شعاعوں

میں سفید، ریشمی چادر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

''تاریخ کا مطالعہ سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے از حد ضروری ہے۔'' ڈاکٹر امبید کر' جن کی جاگیریں اودھ کے علاقے میں تھیں' پائپ منہ میں ڈالے ڈالے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سفید فام شخص سے کہہ رہے تھے۔ ''ہمیں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جب قومیں تاریخ کے علم کی کمی کی وجہ سے سیاسی جدوجہد ہار گئیں۔ میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے عوام کو جو نوے فیصد ناخواندہ ہیں' کیسے سیاسی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ یہ جو بعض لوگ 'عوامی تحریکوں' کا چرچا کر رہے ہیں یہ کس حد تک دانش وری ہے' آپ بتا سکتے ہیں؟ عظیم انقلاب فرانس' یا حال کی بات کریں تو روسی انقلاب جو رونما ہوا تو مختلف حالات اور تاریخی پس منظر اور قطعی مختلف قسم کے عنصر کے ہاتھوں۔''

''عوام دانش وروں کے ہاتھ میں ایک خطرناک ہتھیار ہیں۔'' سفید فام نے "Quote" کیا۔ خاتون جو مستقل دھوپ کی عینک لگائے ہوئے تھیں' سیاست کے موضوع سے اکتا کر اب بچوں کی نفسیات کا ذکر کر رہی تھیں۔ ''ایک عجیب بات جو میں سوچ سوچ کر نہیں تھکتی' یہ ہے کہ ہندوستانی بچوں کی ناک ہر وقت کیوں بہتی رہتی ہے؟ حالانکہ یہ استوائی خطہ......'' انہوں نے راجہ صاحب کرم آباد سے کہا جو نرگس کا پھول سونگھتے ہوئے اخلاق سے مسکرائے جا رہے تھے۔

پروفیسر اقبال سنگھ جن کی کرنال میں اوسط درجے کی جاگیر تھی پر جو تھے انٹلکچول آدمی' حسب معمول ادب کا ذکر کر رہے تھے۔ ''اس کی تو بہت بعد کی بات ہے بھائی' آپ ٹیگور کا مقابلہ آسانی کے ساتھ رومین رولاں سے بھی نہیں کر سکتے جو کہ اس کا ہم عصر تھا۔ مثلاً رومین رولاں میں جو معاشی شعور.......''

''مگر فرانسیسی نقاد......'' دائیں پہلو سے ایک شخص نے بات کرنے کی سعی کی جس پر پروفیسر اقبال سنگھ جھلا گئے۔

''میں فرانسیسی نقادوں کو نہیں مانتا۔ فرانسیسی شر پسند ہیں' قطعی طور پر......فرانسیسیوں نے نہ شاعری اچھی کی ہے' نہ فلسفہ دانی' وہ صرف ادب میں اور آرٹ میں نئی نئی تحریکیں چلانے میں ماہر ہیں' وہ بھی دو چار روز میں پرانی ہو کر فرسودہ ہو جاتی ہیں۔ سارے فرانسیسی تخلیقی ادب کی بنیاد گھٹیا افواہوں اور تہمت تراشی پر ہے۔''

''گوتھک طرز تعمیر ہندوستان سے ہی ایشیا اور افریقہ میں پھیلا۔'' اگلے صوفوں پر بات ہو رہی تھی۔

''افریقہ میں؟ لاحول ولا قوۃ۔'' کسی نے کہا۔

تھوڑی دیر تک اسی طرح مختلف دائرہ احباب میں ذاتی پسند کے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ ٹمپو' تیز ہوتا گیا' پھر اچانک' تحریک اور ترغیب کے بغیر' بھنبھناہٹ کی وہ یکسانیت ایک طرف سے ٹوٹ گئی جب روشن آغا کے پاس بیٹھے ہوئے 'مجلس خدام ہند' کے نمائندے نے سب کو مخاطب کر کے بولنا شروع کیا:

''افواج انگلشیہ کے ملک سے انخلا کا مطالبہ اس وقت میں سخت غیر دانش ورانہ ہے۔ اس کے سپرد محض ملک کے دفاع کا کام ہے اور اس نے اپنے فرائض ایمان داری سے سرانجام دیئے ہیں۔ جنگ عظیم میں انہوں نے

اپنی قدر و قیمت واضح کر دی ہے۔ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمارے ملک کو بھی جنگ کی ہولناکیوں سے بچایا اور ملک کے تتر بتر عوام میں سے ایک فوج کھڑی کی ہے۔ کیا ہماری فوج ہندوستان کو جنگ سے بچا سکتی تھی؟ جب کہ فوج کا ملک کی اندرونی پالیسی میں کوئی دخل نہیں ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کی موجودگی سے انتقال نظم و نسق میں کون سی رکاوٹ پڑ سکتی ہے۔ اگر وہ لوگ ہماری فوج کی سربراہی چھوڑ کر چلے گئے تو۔ آپ جانتے ہیں؟ ایک غیر منظم، مسلح فوج اوہ......'' اس نے آنکھیں میچ کر اس خوفناک خیال پر ہلکی سی جھرجھری لی۔

پروفیسر سنگھ نے وہیں سے اس کی بات اٹھائی: ''ہندوستان میں کون سے اسلحہ جات بن رہے ہیں؟ اب ہوائی جنگ کا زمانہ شروع ہو چکا ہے۔ ہم ترقی یافتہ جنگوں کا اررر...... ترقی یافتہ ملکوں کی جنگ کا اررر...... کے حملوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟''

لکھنؤ کے انگریزی اخبار کے نمائندے نے اپنے خاکستری رخساروں پر ہاتھ پھیرا اور چشمہ ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے بولا: ''نازک ترین مسئلہ جو اس وقت درپیش ہے ''ڈکٹیٹر ازم'' کا ہے۔ وہ آمرانہ پالیسی جس کی طرف بعض انتہا پسند جماعتیں ملک کو لے جا رہی ہیں۔'' یہ الفاظ اس نے نظریں اٹھائے بغیر مفکرانہ لہجے میں کہے اور اسی طرح نیچے دیکھتا ہوا بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر امبید کر نے پہلی بار پائپ منہ سے نکالا۔ ''ابھی پروفیسر سنگھ نے۔''

لیکن ان کی بات ختم ہونے سے پہلے کشمیری برہمن، جو سب سے پہلے بولا تھا، بے خیالی میں بول اٹھا:

''سوراج! سوراج کیا ہے؟ قومیت! قومیت کیا ہے؟ یہ بین الاقوامیت کا دور ہے۔ اشتراکی قومیں اور یورپی اقوام اس قومیت کے خبط میں علیحدگی میں جا پڑی ہیں اور اب معاشی تکلیفات میں مبتلا ہیں۔ کوئی قوم آج اکیلی زندہ نہیں رہ سکتی۔ خود مختاری اور نیشنلزم کا نعرہ ایک نہایت تنگ خیال معاشی اور سیاسی نظریے کا حامل ہے۔ کیا ہم ترقی یافتہ ملکوں سے تجارتی تعلقات منقطع کر کے اپنی ساکھ قائم رکھ سکتے ہیں؟ خود مختاری اور اسے حاصل کرنے کا جو طریقہ کار بتلایا جاتا ہے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

اخبار کا نمائندہ گالوں پر ہاتھ پھیرتا اور عینک ٹھیک کرتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور انگریزی میں بولنے لگا: ''یہی طریقہ کار ہے جو سراسر غلط ہے۔ ''ڈائرکٹ ایکشن۔'' جسے بعض انتہا پسند جماعتیں اچھال رہی ہیں، قطعی طور پر دہشت انگیزی ہے۔''

تمام مہمان خاموشی سے بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ خاتون نے سیاہ عینک اتار کر صاف کی اور دوبارہ لگالی۔

پھر مرہٹوں کے لباس والا شخص، جو اس تمام دوران میں خاموش بیٹھا رہا تھا چھڑی کو انگلیوں میں گھما کر پہلی دفعہ بولا:

''دوسروں پر اعتراضات کرنے سے پیشتر بہتر ہے کہ اپنا نقطہ نظر واضح کیا جائے۔ ہر بات وقت اور حالات کے مطابق وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم مرکزی حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔ ہمیں دفاع یا خارجہ پالیسی سے تعلق نہیں ہے، لیکن وزارت خزانہ اور ملک کا عام بندوبست ہمارے ہاتھوں میں ہونا

چاہیے۔ اس کا مطلب۔'' اس نے چھڑی اٹھا کر ایک پل کو سوالیہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا' پھر فیصلہ کن انداز میں چھڑی زمین پر ٹیکتے ہوئے بولا: ''ڈومینین سٹیٹس۔''

اس کے باوجود صبح کا زیادہ تر وقت دوسروں پر اعتراضات کرنے میں صرف ہوا۔ دوپہر کے قریب سب مہمان اس کارروائی سے اکتا گئے اور خالی خالی نظروں سے خطاب کرنے والوں کو دیکھنے لگے۔ واضح طور پر دوپہر کے کھانے کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ دعوت ان دعوتوں میں سے تھی جن کے لئے روشن محل مشہور تھا۔

کھانے کے بعد معزز مہمانوں کی گرانیٔ طبع کا خیال کرتے ہوئے عجلت کے ساتھ ایک ریزولوشن پاس کیا گیا جس میں ملک کی انتہا پسند جماعتوں کی دہشت انگیز کارروائی کی مذمت کی گئی اور ''ڈومینین سٹیٹس'' کا مطالبہ کیا گیا۔ زیادہ تر مہمان غنودگی کی حالت میں تھے اور بعض صوفوں پر دراز باقاعدہ قیلولہ کر رہے تھے۔

(۲۳)

سائمین کمیشن کے لکھنؤ پہنچنے سے دو روز قبل عذرا وہاں پہنچی۔ لکھنؤ میں اسے دو کام کرنا تھے: ایک نعیم سے ملنا' دوسرے سائمین کمیشن کا استقبال۔

اس سلسلے میں لاہور کے واقعات اور لالہ لاجپت رائے کی موت کے باعث ملک بھر میں سائمین کمیشن کی بے پناہ تشہیر ہو چکی تھی اور جن شہروں میں ابھی اسے جانا تھا وہاں ہفتوں پہلے سے سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ اس کا استقبال کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اس سے متعلق خبروں کو انتہائی اہمیت دی جا رہی تھی۔ ملک کے بڑے بڑے اخباروں میں اس کی نقل و حرکت اور دیگر مصروفیات کا حال جلی حروف میں چھاپا جاتا تھا اور ہر مجلس' ہر محفل میں اس کا تذکرہ تھا۔ عذرا اس موقعے کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتی تھی۔ دلّی میں روشن آغا کے ڈر سے وہ کسی مظاہرے میں شریک نہ ہو سکتی تھی' چنانچہ اس نے لکھنؤ جانے کی ٹھان لی' جہاں پر وہ ضلع جیل میں نعیم سے بھی مل سکتی تھی۔ اس ملاقات کو بہرحال اس نے اُس وقت تک ملتوی رکھا جب تک کہ سائمین کمیشن کا استقبال نہ کر لیا۔

لکھنؤ کی اس شفاف صبح کو وہ کانگرس کے دفتر سے روانہ ہوئے۔ شہر' اور آس پاس کے دیہات سے آئے ہوئے وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ان میں سے زیادہ تر تو شہر پہنچنے کے لئے رات بھر پیدل چلتے رہے تھے۔ گرد آلود بالوں اور تھکے ہوئے چہروں والے وہ جاہل' ننگے اور بیکس لوگ ایک ایک دو دو کر کے جمع ہوتے ہوئے اب ایک مہیب اور محرک قوت کی شکل اختیار کر چکے تھے جس پر قابو پانے کا کام حکومت کی مسلح انتظامی مشینری کے سپرد تھا۔ مویشیوں کے گلّے کی طرح ایک دوسرے سے بھڑتے' ریلتے پیلتے اور گرد اڑاتے ہوئے ان لوگوں کی آنکھوں میں کوئی تہیہ' کوئی بغاوت نہ تھی۔ صرف لاعلمی اور امید تھی' جو بھوکے مویشیوں کی آنکھوں میں دور سے چارے کا کھیت دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ ان کا نظارہ دیکھنے والے کے دل میں ایک مجموعی طاقت کے ساتھ ساتھ بے اندازہ رحم

کے جذبات پیدا کرتا تھا۔ عذرا نے انہیں دیکھا اور سوچا۔

''ان کو کون دھوکا دے سکتا ہے انہیں کون پیٹھ دکھا سکتا ہے!!''

ہزاروں انسانی سروں کے اوپر جگہ جگہ چھوٹے بڑے سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے اور ہجوم میں بار بار تین انگریزی الفاظ کی پکار اٹھ رہی تھی۔ ".Simon, Go Back" شاید یہ انگریزی زبان کے صرف تین الفاظ تھے جو ان میں سے بہت سوں نے عمر بھر میں سیکھے تھے اور ان کا مطلب ان میں سے کسی کو بھی نہ آتا تھا لیکن وہ انہیں اس جذبے سے دہرائے جا رہے تھے جیسے ان کی سینکڑوں برس کی مشقت اور غربت کا انعام انہی تین لفظوں میں پنہاں تھا۔ مختلف سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے ان کے ساتھ مزید جتھے آ کر ملتے گئے اور ریلوے سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے اس لمبے چوڑے جلوس میں کئی ہزار کا اضافہ ہو چکا تھا۔ راستے میں سب سڑکوں پر پولیس اور فوج کا پہرہ تھا۔ پچھلی شام اسی طرح کے ایک جلوس کو لاٹھی چارج کے ذریعے منتشر کیا جا چکا تھا۔

ریلوے سٹیشن کے سامنے ایک میدان میں انہیں روک دیا گیا۔ گھڑ سوار پولیس کے جوان آہنی زنجیر کی طرح ان کے آگے کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں دیکھنے سے احتراز کر رہے تھے اور ہجوم کے سروں کے اوپر اوپر دیکھ رہے تھے۔ پیچھے میدان میں فوج اور پولیس کی ایک بھاری تعداد بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھی اور ان سے پرے ضلع کے تمام حکام' جن میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی' پھیلے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی ٹوپیاں آنکھوں پر نیچے تک کھینچ رکھی تھیں اور دھوپ میں ان کے چہرے زرد دکھائی دے رہے تھے۔ کئی لوگ آگے بڑھنے کے امکان نہ پا کر زمین پر بیٹھنے شروع ہو گئے اور جب وہ سامنے کھڑے ہوئے مسلح فوجیوں کے چوبی چہروں کو دیکھ دیکھ کر اکتا گئے تو آپس میں باتیں کرنے لگے۔ عذرا نے اپنے قریب چند کسانوں کو دیکھا۔ پہلے انہوں نے قطار کو توڑ کر چھوٹا سا دائرہ بنایا۔ پھر ایک نے سن کا ایک ٹکڑا جلا کر آگ سلگائی' دوسرے نے پگڑی ٹٹول کر تمباکو اور گڑ نکالا' تیسرے نے حقہ تیار کیا۔ پھر وہ بیٹھ کر باری باری کش لگانے اور دلجمعی سے باتیں کرنے لگے۔ عذرا نے سنا' وہ گاؤں کی باتیں کر رہے تھے' اور فصلوں کی اور بیلوں کی' اور تمباکو کی تعریف جو شراب سے زیادہ کڑوا تھا' اور جنس کی گرانی کی شکایت' اور اپنی عورتوں کی جو آٹھ آٹھ ماہ کی حاملہ تھیں اور کھیتوں میں کام نہ کر سکتی تھیں' اور روز مرہ کی کتنی ہی ایسی باتیں جو ہر شام کو چوپال میں بیٹھ کر کیا کرتے تھے' اور عذرا نے خاموشی سے دل میں تعجب کیا کہ یہ معمولی معمولی لوگ کس قدر آسانی کے ساتھ وقت کی گرانی کو قبول کر کے نظر انداز کر دینے کے قابل تھے اور اس لحاظ سے وہ سامنے کھڑے ہوئے اور پھرتے ہوئے ان لوگوں سے کس قدر مختلف تھے جو اذیت ناک توجہ اور احتیاط کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھے۔

اگلی صف میں کھڑے کھڑے اس نے پرویز کو دیکھا جو گھڑ سواروں کی قطار کے پیچھے میدان کو پار کر رہا تھا اور وہ حیران رہ گئی۔ اس کے اندازے کے مطابق اسے اس وقت دلّی میں ہونا چاہیے تھا۔ ایک لمحے کے لئے اسے خیال ہوا کہ پرویز نے اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ گھبرا گئی۔ اس سارے عرصے میں پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ کس قدر

نامناسب جگہ پر کھڑی تھی۔ کتنے نامناسب ماحول میں' دکانداروں اور مزدوروں اور کسانوں کے درمیان' اور وہ پرویز کی بہن تھی' خان بہادر غلام محی الدین آف روشن پور کی لڑکی تھی' اور روشن محل میں چیف کمشنر کو مدعو کیا جاتا تھا' کہ وہ گھڑ سواروں کے دوسری طرف کے گروہ سے تعلق رکھتی تھی اور اس طرف کھڑی تھی' تنہا' غیر محفوظ! اسے دل میں شرم محسوس ہوئی۔ اسی وقت پولیس کے جوانوں کی قطار بیچ میں سے ٹوٹ کر سامنے سے ہٹ گئی اور سامنے گرد کا طوفان دکھائی دینے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گرد میں سے نکل آئے۔ یہ گھڑ سوار فوجیوں کی قطار تھی جو میدان کے سارے طول میں پھیلی ہوئی تھی اور تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

پوری رفتار سے حملہ آور ہوتے ہوئے گھڑ سواروں کا نظارہ یقیناً حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ ہجوم کی پہلی قطاروں میں ہلچل مچ گئی اور لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھنے لگے۔ پھر یک بیک' کسی ان دیکھی طاقت کے تحت مجمع ساکت ہو گیا اور فضا پر مکمل خاموشی چھا گئی' جیسے کمرہ امتحان میں ہزاروں طالب علموں پر چھا جاتی ہے۔ صرف گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز باقی رہ گئی جو برق رفتاری کے ساتھ لحظہ بہ لحظہ قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر پتھر کی طرح گڑے ہوئے مجمعے کے ساتھ ٹکرا کر انہوں نے باگیں کھینچ لیں اور گھوڑے اگلے پاؤں اٹھا کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ عذرا نے اپنے سر پر گھوڑے کے سم ہوا میں کانپتے ہوئے دیکھے اور اپنے آپ کو ایک لمبے قد کے مرد کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی مگر نیچے آتے ہوئے گھوڑے کا سم اس کے ماتھے سے ٹکرا گیا' جس سے وہاں پر خفیف سا زخم آ گیا اور قطرہ قطرہ خون بہنے لگا۔

اس کے بعد لاٹھی چارج شروع ہوا۔ سکوت اسی تیزی کے ساتھ ٹوٹ گیا اور چاروں طرف چیخ پکار مچ گئی۔ تیزی کے ساتھ سرسراتے اور مارگراتے ہوئے مگدر اور لاٹھیاں ان کے سروں پر سے گزرنے لگے۔ اچانک وہ بے حد خوف زدہ ہو کر واپس بھاگی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے لاٹھیوں کی ضربوں سے گرتے' اٹھتے اور حاسدانہ جذبے کے ساتھ اپنی جگہ کی حفاظت کرتے ہوئے مرد دیکھے۔ ان کے ہاتھ واپس مار گرانے کے لئے بے چین ہو رہے تھے اور ان کے چہرے شدید نفرت سے سیاہ ہو گئے تھے۔ اور غصے' ذلت اور جسمانی تکلیف کے سارے دانت ننگے کر کے وہ زمین سے اٹھ رہے تھے۔ عذرا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے گھڑ سواروں کے چند چہرے دکھائی دیئے۔ ان پر بھی وہی شدید نفرت اور تناؤ تھا۔ دفعتاً کہرام اور افراتفری کے اس وقت میں عذرا کے دماغ نے بے حد واضح طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے سوچا کہ کس طرح انسانوں کے دو گروہ بغیر کسی دیرینہ عناد اور جان پہچان کے نفرت اور انتقام کے جذبات لے کر اچانک آمنے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں کہ حاکم اور محکوم گروہوں کے درمیان اس تیسرے گروہ کی' جو محکوم گروہ میں سے چنا جاتا اور ہتھیاروں کے طور پر استعمال ہوتا تھا' کس قدر لایعنی اور مضحکہ خیز پوزیشن ہے۔ چند لمحوں کے اندر اندر خیال کی یہ تیزی غائب ہو گئی اور وہی کنفیوژن پھیل گیا۔ لیکن یہ وقت اسے بہت دیر تک یاد رہا اور اس واقعے کے گزر جانے کے بہت عرصے کے بعد اس نے نعیم سے اس کا ذکر کیا کہ کس طرح خطرے اور ابتری کے لمحے میں اس کا ذہن حیرت ناک طور پر واضح اور تیز تھا۔

ہجوم کے عقب میں اس نے ایک شخص کو دیکھا جو الٹے پاؤں بھاگتے ہوئے مجمعے کی تصویریں لے رہا تھا۔

وہ ماتھے کے زخم پر سے کپڑا ہٹا کر عین اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

مختصر سی مزاحمت کے بعد لوگ شدید ہوتی ہوئی ضربوں سے بلبلا کر بھاگ اٹھے۔ حملہ آوروں نے کچھ دیر تک ان کا تعاقب کیا' پھر رک گئے۔ مجمع آگے جا کر ٹھہر گیا اور اس وقت تک رکا رہا جب تک کہ سائمن کمیشن کے ارکان گاڑی سے اترے بغیر لکھنؤ سٹیشن پر سے خاموشی کے ساتھ گزر نہ گئے۔

نعیم کی مشقت میں نمایاں طور پر کمی کر دی گئی تھی اور اب وہ محض قیدیوں کے پھٹے پرانے کپڑے مرمت کرنے کے کام پر مقرر تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے سینے سلانے میں کافی مہارت حاصل کر لی اور اس کام سے خوش رہنے لگا۔

اس روز وہ آہنی جنگلے سے ٹیک لگائے بیٹھا ایک قمیض سی رہا تھا کہ (Convict Overseer)No. 19.C.O اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ان کے عقب میں شور مچاتے ہوئے قیدی پانی کھینچ رہے تھے اور دھوپ سیدھی ان کے سروں پر پڑ رہی تھی۔ No.19 C.O. نے شیشے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جیب سے نکالا اور اس میں دیکھ دیکھ کر داڑھی کے سفید بال نوچنے لگا۔ نعیم اپنے کام میں مصروف رہا۔ اوورسیئر نے دو ایک بار کھانس کر اور پاؤں زمین پر رگڑ کر حسب معمول اپنی آمد کی اطلاع دی۔ جب نعیم نے اسے کوئی اہمیت نہ دی تو اس نے اپنی ٹانگیں' جو وہ پہلے ہی پسارے ہوئے تھا' بڑھا کر عین اس کی ناک کے نیچے رکھ دیں۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اس نے شیشے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اندھے ہو؟'' نعیم نے جواب دیا۔

''میں نے کسی لنجے کو آج تک کپڑے سیتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''بیکار باتیں مت کرو۔'' نعیم نے اکتا کر کہا۔ اوورسیئر کے پاؤں میں سرخ' کچی کھال کا نیا جوتا دیکھ کر وہ اس کے ٹانگیں پسارنے کا مطلب سمجھ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ نئے خوبصورت جوتے کی تعریف کرے کہ جیل میں ایسی چیزیں کم دیکھنے میں آتی تھیں' مگر وہ جوتے کے مالک سے اس حد تک اکتا چکا تھا کہ خاموشی سے قمیض پر جھکا رہا۔ اوورسیئر شیشے میں دیکھ کر بال نوچتا اور پاؤں ہلاتا رہا۔

''تم کتے برس کے ہو؟'' نعیم نے کپڑا سیتے سیتے پوچھا۔

''پینتیس۔''

''کتنی سزا باقی ہے؟''

''چالیس۔''

''باہر جانے سے پہلے مر جاؤ گے۔''

''پتا نہیں۔ شاید!''

''پھر داڑھی میں سے سفید بال کیوں نکالتے ہو؟''

''ایں؟'' وہ شیشہ زمین پر رکھ کر داڑھی کھجاتا ہوا سوچنے لگا۔ پھر قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''سؤر۔ تم کیا سوچتے رہتے ہو۔'' وہ یقیناً اچھے موڈ میں تھا کیونکہ اس نے پاؤں آگے کھسکایا اور بولا: ''تم نے میرا جوتا دیکھا؟''

''نہیں۔'' نعیم نے جل کر کہا۔

''ہاہا...... لومڑی کے بچے۔ دیکھو کیسا خوبصورت ہے۔ پتا ہے میں نے کیسے لیا ہے؟''

نعیم خاموشی سے کپڑا سیتا رہا۔ اس نے جوتا اتارا اور اس پر بچے کی طرح پیار سے ہاتھ پھیر کر بولا: ''دس مہینے تک میں اس کی راہ دیکھتا رہا۔ کرم چند کو جانتے ہو وہ لمبا اینچی جو پار سال باہر گیا تھا' اسے سال بھر تک میں افیم کھلاتا رہا۔ جب جانے لگا تو بولا: ''استاد تمہیں دنیا سے کیا چاہیے؟'' میں نے کہا۔ ''میرے پیر کی درگار پر سلام پہنچا آئیو۔'' پھر میں نے سوچا: مدت ہوئی میں نے نیا جوتا نہیں پہنا۔ پیر کو گولی مارو۔ تو اس دن کا گیا ہوا کل وہ حرامی لوٹا اور اسے باہر والی نالی میں رکھ گیا۔ رات بھر میں اسے نکالنے میں لگا رہا۔ جب نکلا تو بھیگے ہوئے چوہے کی طرح دکھائی دے رہا تھا پر اسے میں نے نکال کر چھوڑا۔ تمہارا باپ بھی اسے نہ نکال سکتا۔ دیکھا؟ اچھا ہے نا؟''

کافی دیر کے بعد نعیم نے تلخی سے کہا: ''ہاں۔''

''تم جلتے ہو اسی لئے اس کی تعریف نہیں کرتے۔ اسے نکالنے میں میری کھوپڑی پر تیرہ زخم آئے ہیں۔''

''تمہاری شیخیاں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔''

''چپ رہو۔'' وہ غرایا اور شیشہ اٹھا کر داڑھی صاف کرنے لگا۔ دونوں خاموش بیٹھے اپنا اپنا کام کرتے رہے' پھر اوورسیئر یکلخت پکار اٹھا: ''حرامزادہ۔''

نعیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''پسو ہے۔'' اس نے پسو کو انگلیوں میں مسلا' جس سے خون اس کے پوروں پر پھیل گیا۔ ''یہ بہن چود پسو داڑھی میں بھی گھس آتے ہیں۔'' وہ وحشیوں کی طرح ناخنوں سے داڑھی کھجانے لگا جس سے اس کے گال جگہ جگہ سے زخمی ہو گئے اور ان سے خون رسنے لگا۔ نعیم تمسخر سے ہنسا۔

''دیکھو۔'' اوورسیئر نے انگلی اٹھائی۔ ''میں چاہے مروں یا زندہ دنیا میں چلا جاؤں' میری داڑھی میری اپنی ہے میری۔'' اس نے انگلی سینے پر بجائی۔ ''تم نے اس میں دخل دیا تو تمہاری داڑھی جلا دوں گا۔''

دونوں پھر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ ذرا دیر بعد اوورسیئر نے شیشہ جیب میں ڈالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آج ملاقات ہے۔''

''ایں؟ آج ملاقات ہے؟'' نعیم چونکا۔

''ہاں۔ تمہاری بیوی آئے گی؟''

''پتا نہیں۔ تمہاری؟''

''نہیں۔ میری بیوی اب دوسرے مرد کے ساتھ رہتی ہے۔'' وہ جانے کے لئے مڑا' پھر رک کر بولا۔ ''پہلے ہر سال آیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا ''تمہاری خواہش نہیں ہوتی؟'' کہنے لگی۔ ''ہوتی ہے۔'' میں نے کہا: ''جاؤ' جس مرد کے ساتھ جی چاہے رہو۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اس کے بعد وہ نہیں آئی۔'' کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑا ہتھیلی پھیلا کر اس میں دیکھتا رہا۔ ''لیکن کبھی کبھی۔ مجھے یاد آتی ہے۔''

نعیم اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر داڑھی مونڈنے اور بازو حاصل کرنے کے لئے چلا گیا۔

دوپہر کے بعد ملاقات شروع ہوئی۔ حسب معمول قیدیوں اور ملاقاتیوں کو سات سات کی ٹولیوں میں آمنے سامنے دس گز کے فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا۔ نعیم نے داڑھی مونڈلی تھی لیکن اس روز وہ اپنا بازو حاصل نہ کر سکا' جیسے کہ وہ ہمیشہ ملاقات سے پہلے چند منٹ کے لئے حاصل کر لیا کرتا تھا۔ عذرا بائیں کونے میں کھڑی تھی۔ وہ اس کے سامنے والی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے فاصلے پر سے اور ایسے جمگھٹے میں خوش آمدید کے الفاظ ادا کرنا ناممکن تھا' چنانچہ کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑے رہے' پھر عذرا نے جیب سے اخبار نکال کر لہرایا۔

''ہم نے کل سائمین کمیشن کے لئے مظاہرہ کیا تھا۔''

نعیم کو ایک لفظ سنائی نہ دیا۔ تمام قیدی اور ملاقاتی بیک وقت چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے۔

''ہم نے سائمین کمیشن کا کالی جھنڈیوں سے جلوس نکالا۔'' وہ دوبارہ چلائی ''یہ دیکھو۔ یہ تصویر' میری تصویر...... لو۔'' اس نے اخبار نعیم کی طرف بڑھایا جسے نگران ملاقات نے آہستگی سے اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ وہ چلاتی رہی۔ ''ہم نے انہیں یہاں پر اترنے نہیں دیا۔ وہ چوروں کی طرح سٹیشن پر سے ہی چلے گئے۔ مجھے زخم آ گیا تھا۔ یہ۔'' اس نے ماتھے پر سے کپڑا اٹھا کر دکھایا۔

نعیم کو یہ سن کر خفت ہوئی۔ وہ غیر شعوری طور پر اپنی بیوی اور اس کے خاندان پر متفخر تھا۔

''تمہیں گھر پر رہنا چاہیے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''ایں؟''

''تمہیں گھر پہ رہنا چاہیے۔'' اس نے دوبارہ کہا۔ عذرا نے کچھ نہ سنا۔

''وہاں پرویز بھی تھا۔ وہاں پر۔'' وہ بولتی رہی۔

اس وقت نعیم کو کھلے دروازے میں سے باہر کا نظارہ دکھائی دیا۔ ایک عورت ہاتھ میں سبزی کا تھیلا لٹکائے گزر رہی تھی۔ ایک بچہ اس کا دامن تھامے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے مسحور ہو کر ایڑیاں اٹھائیں اور عذرا کے کندھے کے اوپر سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک خوابناک کیفیت اس کے سارے وجود پر طاری ہو گئی جس میں اس کے کان کبھی کبھی کام کرنا شروع کر دیتے اور عذرا کی آواز سنائی دیتی۔ اس کی تمام تر قوتیں آنکھوں میں مرکوز ہو چکی تھیں۔ سبزی سے بھرا ہوا ایک ٹرک گزرا جس میں سے چند شلغم گر کر سڑک پر بکھر گئے۔ پھولدار چھاتے والی ایک عورت' تانگے' بیل' کتے' ایک خوبصورت کتے کو دیکھتے رہنے کی کوشش میں وہ کھسکتا کھسکتا ساتھ والے قیدی کی

بغل میں گھس گیا، جس نے دھکا دے کر اس کا طلسم توڑ دیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ والے دو قیدی بیک وقت پوری آواز سے چلّا رہے تھے۔

''لال گائے نے کیا دیا ہے؟'' ایک نے پوچھا۔

''دو روپے۔'' اس عورت نے چلّا کر دوسرے کی بات کا جواب دیا جو اپنے ملاقاتی سے جوار کا بھاؤ پوچھ رہا تھا۔ ''دو روپے من۔''

پہلا قیدی جھنجھلا گیا۔ ''چپ رہو سور۔'' وہ دوسرے کی پسلیوں میں کہنی مار کر غرایا۔ نعیم کو ہنسی آ گئی۔ عذرا خاموشی سے اس کے بازو کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کئی بار باری باری عذرا کو اور اپنے بازو کو دیکھا۔

''ہاں۔ وہ لے گئے ہیں۔''

''کیوں؟'' عذرا نے پوچھا۔

''مل جائے گا۔ صاف کرنے کو دیا ہے۔'' اس نے جھوٹ بولا اور لٹکتی ہوئی آستین کو مروڑنے لگا۔

''یہ لو۔'' نگران کی آنکھ بچا کر عذرا نے سگرٹوں کا ایک پیکٹ اس کی طرف اچھالا۔

چند منٹ کے بعد ملاقات ختم ہوگئی اور وہ دل میں ایک بھاری، لامقام سی خلش لے کر وہاں سے لوٹ آیا۔

اس نے عذرا کی کمی کو اس وقت محسوس کیا جب کہ وہ جا چکی تھی۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں آ کر لیٹ گیا اور خواہش کی شدت میں اس کے حلق سے نیم مردہ جانور کی طرح ایک خشک، کرب آلود کراہ نکلی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے قریب بیٹھے، اسے چھوئے، اسے محسوس کرے، اس کی جلد کی ہلکی ہلکی گرمی، ہلکی ہلکی خوشبو کو سونگھے اور جذب کرے، اس کے جسم کی ڈھلانوں پر ہاتھ پھیرے۔ وہ آہستہ آہستہ پتھر کی دیوار پر ہاتھ پھیرنے لگا اور جلتی ہوئی خواہش کا دھیما، کچلتا ہوا درد اس کے جسم پر پھیلتا گیا۔ وقفے وقفے پر وہ مرتے ہوئے جانور کی سی خشک، مختصر آوازوں میں کراہنے لگتا۔

چند گھنٹے کے مدقوق جذبے میں گھلنے کے بعد اس کی آنکھیں نمایاں طور پر اندر دھنس گئیں اور رخساروں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔

اندھیرا ہونے سے پہلے C.O. نمبر 19 کی کوٹھڑی میں آیا۔

''اٹھو۔ اندھا جیب کترا جا رہا ہے۔''

''جا رہا ہے؟'' نعیم نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ دنیا میں'' پھر وہ چونک پڑا۔ ''ایں؟ تم بیمار ہو؟''

''نہیں۔'' نعیم نے جھوٹ بولا۔ ''میں نے کھانا نہیں کھایا۔''

اوورسیئر جیل والوں کو گالیاں دینے لگا جو کھانے میں ریت ملا کر دیتے تھے۔ پھر وہ دونوں اندھے جیب کترے کی طرف چل پڑے جو چھ ماہ گزار کر باہر جا رہا تھا۔

اس کے گرد سب پرانے قیدی، جنہیں اس وقت باہر پھرنے کی اجازت تھی، جمع تھے اور اس کے ساتھ ٹھٹھا کر رہے تھے۔ سی او نمبر انیس نے جاتے ہی ایک زور دار دھپ اس کی کمر پر جمایا جس سے اس کا سر زمین سے جا لگا۔ پھر وہ اس کی داڑھی پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا:

''اندھے سور، بڑے خوش ہو رہے ہو۔ دنیا میں جا رہے ہو اس لئے؟ ابھی کوئی دن میں پھر یہاں آؤ گے۔''

اندھے نے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے داڑھی کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ ''اب کے میں ان حرامیوں میں تو نہیں آؤں گا۔ میری داڑھی کا ستیاناس کر دیا ہے۔''

اردگرد ہنسی کی ایک لہر اٹھی۔

''اندھے، تم دنیا میں کس کے پاس جاؤ گے؟'' ایک نے پوچھا۔

''باپ کی قبر پر۔''

''کیوں؟''

''وہاں میں نے کچھ نقدی دبا رکھی ہے۔ ابھی کچھ روز اس پر گزران کروں گا جب تک ان کا آدمی میرے پیچھے لگا رہے گا۔ پھر اپنا دھندا شروع کروں گا۔''

''پھر تم گھر جاؤ گے؟'

''میرا گھر کوئی نہیں۔''

''بیوی؟''

''اوہ ہنہ۔'' اس نے گونگوں کی طرح سر ہلایا۔

''ماں؟''

''اوہ ہنہ۔''

''باپ؟''

اندھے نے بڑی سی گالی دی۔ ''گدھے کے بچے اسی کی قبر پر تو جاؤں گا۔''

''اندھے، اب تم پہلی جیب کب کاٹو گے؟'' اسے تنگ کرنے کے لئے ایک قیدی نے پوچھا۔

''ہٹ جاؤ...... ہٹ جاؤ۔'' اچانک اندھے نے چیخ کر کہا اور دھکے مار مار کر سب کو پیچھے ہٹا دیا۔ ''کھجلی شروع ہو گئی۔'' پھر وہ وحشیوں کی طرح ناخنوں سے پاؤں کو کھرچنے لگا۔ اس کے پاؤں غلیظ تھے اور ان پر جگہ جگہ پھٹے ہوئے زخم تھے۔ کھرچنے سے زخم چھل گئے اور ان سے خون رسنے لگا۔ اندھا بے دردی سے کھرچ رہا تھا اور درد کے مارے سی سی کرتا جا رہا تھا۔ دوسرے قیدی اردگرد کھڑے قہقہے لگاتے رہے۔

آخر اوورسیئر نے گالیاں دے کر سب کو چپ کرایا اور وہ اسے بڑے دروازے تک چھوڑنے کے لئے گئے۔ بہت سی ابابیلیں دوسرے آسمانوں پر سے اڑ کر جیل کے آسمان پر آ گئی تھیں۔ اندھے کے جانے کا وقت ہو

چکا تھا۔ وہ سب فطری طور پر خاموش اور اداس ہوگئے۔ وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے بڑے آہنی گیٹ کی طرف جارہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ سب غول بیابانی کی طرح بے جان بازو لٹکائے حریص' بے نور نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً C.O. نمبر 19 ان میں سے نکل کر بھاگ پڑا۔ اندھے جیب کترے کے پاس جاکر وہ رکا اور پاؤں سے جوتا اتارنے لگا۔

C.O. نمبر 19 ہنستا ہوا نعیم کی طرف آیا۔ ''میری کھوپڑی ابھی تک زخمی چوہے کی طرح دکھ رہی ہے۔'' اس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں نے سوچا وہ دنیا میں جارہا ہے اور اس کے پاؤں میں کھجلی ہے۔''

تاریکی تیزی سے چاروں طرف پھیلتی جارہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی اپنی کوٹھڑیوں کی طرف لوٹ آئے۔

جب عذرا روشن محل پہنچی تو وہاں کی فضا کشیدہ تھی۔ اس کا استقبال پرانے' پُرمحبت طریقے پر نہ کیا گیا۔ اس کی ماں' جو پہلے ہی اس سے لاتعلق رہتی تھی' کچھ نہ بولی۔ خالہ نے اسے بتایا کہ پرویز اس سے پہلے پہنچ چکا تھا اور وہ اور روشن آغا اس سے سخت خفا تھے۔ پرویز کی بیوی بظاہر اس واقعے سے بے خبر اپنے اسی سرپرستی اور برتری کے رویے کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے ملی۔ عذرا نے چھوٹی بہن نجمی کو اٹھا کر پیار کیا اور اس سے باتیں کرتی رہی۔ صرف روشن محل کے تمام ملازم اور ان کی عورتیں باری باری سلام کے لئے حاضر ہوئیں۔

پھر اس نے مضبوطی سے ماتھے پر کپڑا جمایا اور ناشتہ کئے بغیر بھاری دل کے ساتھ روشن آغا کو سلام کرنے گئی۔ وہ اپنی سٹڈی میں چمڑے کی لمبی کرسی پر بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کے سر پر سبز رنگ کا فرشی لیمپ جل رہا تھا۔ پرویز سٹول پر چڑھ کر بیٹھا ہوا دھات کی راکھ دانی کو دریچے کے فرش پر چلا رہا تھا۔ روشن آغا نے سنجیدگی سے اس کے سلام کا جواب دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اٹھ کر اس کا ماتھا نہ چوما۔ سر پر ہاتھ نہ رکھا' کوئی ایسا اشارہ نہ کیا جس سے انہوں نے کئی بار پریشان حال موقعوں پر عذرا کے دل میں سکون اور سلامتی کا احساس پیدا کیا تھا۔ وہ دوسرے کونے میں جاکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ پرویز عمداً اس کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے راکھ دانی کے ساتھ مصروف رہا۔ دفعتاً عذرا نے پہلی دفعہ روشن آغا کے کمرے میں اپنے آپ کو غیر محفوظ اور کمزور محسوس کیا' وہ جگہ جہاں پر وہ ہمیشہ محبت اور سلامتی کی تلاش میں آیا کرتی تھی۔

کمرے پر کڑی خاموشی طاری تھی۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ وہی پرانی کرسیاں اور صوفے اور پردے اور کتابیں۔ کیسی عجیب بات تھی۔ الماریوں میں جانے کون کون سی کتابیں بھری پڑی تھیں' اس نے کبھی انہیں اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ ان الماریوں میں کون کون سے کپڑے ٹنگے تھے؟ کس کے؟ اس نے کبھی ان پر برش نہ کیا تھا۔ سامنے سبز لیمپ کے نیچے اس کا باپ بیٹھا تھا' تیزی سے بوڑھا ہوتا ہوا' زرد' رنجیدہ اور پُروقار جیسے ایک شریف النسب انسان کو ہونا چاہیے۔ وہ اسے نہ جانتی تھی۔ اس نے کبھی اس کے مخملیں سلیپر سیدھے کرکے نہ رکھے تھے۔ وہ کبھی اس قالین پر بلی کی طرح نہ لیٹی تھی۔ وہ ان سب چیزوں سے اس قدر الگ' اس قدر اجنبی ہو چکی

تھی، پل کے پل میں، کیسی عجیب بات تھی۔

روشن آغا نے کتاب بند کر کے بازو کی چھوٹی میز پر رکھی اور سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر سیدھا اس کی طرف دیکھ کر آزردہ، لیکن مضبوط لہجے میں بولے: "آپ لکھنؤ میں تھیں، بی بی۔"

عذرا نے گونگوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔ روشن آغا نے چشمہ اتار کر کتاب پر رکھا اور ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا۔ "ہم نے سنا آپ نے وہاں کسی ہنگامے میں شرکت کی۔"

"میں نعیم سے ملنے گئی تھی۔" عذرا نے یکساں آواز میں کہا۔

"تو آپ کا خیال ہے ہم نے غلط سنا؟" انہوں نے غصے کو دبا کر کہا اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگے۔

"مجھے تمہارے کارنامے دیکھنے کے لئے چشمے کی ضرورت نہیں ہے۔" پرویز نے تیزی سے کہا۔ عذرا نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کوئی سخت بات کہنے کے لئے اس کے ہونٹ کانپے۔ پرویز نے گھبرا کر نظریں ہٹا لیں اور راکھ دانی میں انگلی گھمانے لگا۔

"نعیم نے پہلے ہی اپنی حب الوطنی سے ہماری عزت بڑھائی ہے۔ ہمارے خاندان میں پچھلے سو برس سے کسی نے ایسے کام نہ کئے تھے۔" روشن آغا خفگی اور طنز سے ہنسے۔ عذرا اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

"میں نے تمہیں روشن آغا اور روشن محل کا نام برقرار رکھنے کے لئے پرورش کیا۔" روشن آغا اب واضح طور پر تلخی سے بولے۔ "آپ سے امیدیں وابستہ کی تھیں۔ یہ نہیں کہ چھوٹے لوگوں کی طرح آپ ہنگامے اور قانون شکنی کریں۔ اب آپ بھی جیل جاؤ گی؟"

جواب دینے سے پہلے وہ ایک لحظے کو دل میں کانپی، پھر سیدھا اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی: "اس کے ساتھ اور بھی کئی بڑے بڑے لوگ جیل گئے ہیں۔ انہوں نے کوئی گھٹیا جرم نہیں کیا ہے۔"

"مجھے علم ہے جیل میں ان کے ساتھ اخلاقی مجرموں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔" پرویز راکھ دانی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ٹوٹنے سے پہلے جو چند لمحے بے خیالی کے آتے ہیں ان میں اس نے باری باری کئی بار اپنے باپ اور بھائی کو دیکھا، لیکن جواب نہ دے سکی۔ بیکسی اور ذلت کے شدید احساس کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور رونے لگی۔ آہستہ آہستہ دو بار اس نے کہا: "بابا...... بابا۔"

چند طویل لمحوں تک دونوں مرد پشیمانی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر پرویز سٹول سے اترا اور باہر نکل گیا۔ روشن آغا نے چشمہ آنکھوں پر لگایا اور دونوں ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر پھرانے لگے۔ پھر چشمہ اتار کر واپس کتاب پر رکھا اور بار بار انگلیوں کو کھولنے اور بند کرنے لگے۔ لیمپ کی روشنی میں وہ بے حد زرد نظر آ رہے تھے اور ان کی انگلیوں کی پوریں کپکپا رہی تھیں۔ پھر وہ اٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے عذرا کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ عذرا نے رک رک کر روتے ہوئے کہا:

"بابا...... میرا شوہر جیل میں ہے، اور آپ...... آپ۔"

جیب سے ہاتھ نکال کر انہوں نے آہستہ سے عذرا کے سر پر رکھا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

ناشتہ کئے اور کسی سے ملے جلے بغیر عذرا نے جا کر اپنے کمرے کھلوائے اور صفائی کروائی۔ پھر وہ دیر تک دریچے میں کھڑی ہاتھ بڑھا کر یوکلپٹس کے پتوں کو توڑتی رہی۔ دوپہر کے قریب اسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ کھانا اس نے وہیں پر منگوایا اور خالہ سے، جو اسے دیکھنے آئی تھی، نرمی سے کہا: ''میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

کھانا کھا کر وہ پھر دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔ کھانا مقوی اور لذیذ تھا اور وہ ایک پُرشکم توانائی اور فرحت محسوس کر رہی تھی۔ وہ احساس جو اکثر بہت سارا رونے کے بعد بھی ہوتا ہے۔ یوکلپٹس کے پتے توڑتے ہوئے اس کی نظر میلے ناخنوں اور بازوؤں پر پڑی جن پر سفر کی تمام گرد جمی ہوئی تھی۔ اس نے نہانے کا ارادہ کیا۔

کپڑے اتار کر اس نے زیتون کا تیل سارے بدن پر ملا اور ہتھیلیوں کی مدد سے آہستہ آہستہ اسے جلد میں جذب کرنے لگی۔ اس نے ربڑ کی طرح دبتی اور ابھرتی ہوئی اپنی گندمی، تندرست جلد کو دیکھا اور اس کے بدن میں گہرا سرور اور امنگ پیدا ہوئی۔ سرور جس میں پیاس چھپی ہوئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور کمروں میں پھرنے لگی۔ قد آدم آئینے کے سامنے رک کر اس نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اپنے جسم کو ہر زاویے سے دیکھا۔ اس کا بدن کنواری لڑکیوں کی طرح کسا ہوا، لچکدار اور مضبوط تھا۔ دیر تک وہ معطل ذہن کے ساتھ بند کمروں میں چکر لگاتی رہی اور اس کے روئیں روئیں میں سوزش پیدا ہوئی، سوزش اور پیاس، اس مرد کے لئے جس سے وہ محبت کرتی تھی۔ حسن اور محرومی کے اذیت ناک لمحے ایک ایک کر کے اس پر سے گزرتے رہے۔

آخر بند دریچے کے پتھر پر گال رکھے رکھے وہ رفتہ رفتہ واپس آ گئی۔ اس نے اپنے آپ پر نظر ڈالی اور لال ہو کر غسل خانے میں گھس گئی۔ بڑی دیر نہاتے رہنے کے بعد جب وہ بالوں کو برش کر رہی تھی تو اس کا جسم مردوں کی طرح سرد ہو چکا تھا اور دل میں ایک بے نام سی، بیمار کر دینے والی کسلمندی باقی رہ گئی تھی۔

(۲۴)

C.O. نمبر 19 کا ایک دوسرے اوورسیئر کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور اس نے آہنی جنگلے پر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا۔ سزا کے طور پر اسے دو ماہ کے لئے کوٹھڑی کی قید اور سخت مشقت کا حکم سنایا گیا۔ سزا کے دوران وہ بند دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہتا اور ہر آنے جانے والے کو گالیاں دیا کرتا۔ اس کے چہرے پر درندوں کی سی بے روح تندی کا اثر نمایاں طور پر بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ برسات کا موسم تھا۔ یہ موسم قیدیوں کے واسطے سارے سال میں دلچسپ موسم ہوتا تھا۔ جب بارش سے دیواروں کا رنگ گہرا ہو جاتا اور آسمان پر بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور بہت سی ابابیلیں سروں پر اڑا کرتیں۔ برسات کا موسم ان کے لئے رونق اور تبدیلی کا پیغام لے کر آتا۔

بارش صبح سے ہو رہی تھی۔ جب کپڑے سی سی کر نعیم کی آنکھیں اور انگلیاں درد کرنے لگیں تو اس نے انہیں ایک طرف رکھا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ رک کر خوشی سے آسمان کی طرف دیکھتا اور پھر چلنے لگتا۔ چلتا چلتا وہ C.O. نمبر 19 کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرا۔ اس کے دروازے پر تالا لگا تھا اور وہ سلاخوں کے ساتھ ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ نعیم وہاں سے گزر گیا۔ موسم کی وجہ سے وہ دل میں اپنے آپ کو اس قدر مسرور اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ اوورسیئر کا خاموش' پتھریلا چہرہ دیکھ کر اسے کوفت ہوئی اور واپسی پر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ قیدی نے لحظہ بھر کو سنگین نظروں سے سگریٹ کی طرف دیکھا' پھر ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔

''جب تم نئے نئے آئے تھے تو میں نے بھی تمہیں سگریٹ دیئے تھے۔ اس کا بدلہ اتارتے ہو؟'' اس نے کہا۔

نعیم نے سنی ان سنی کر کے دونوں سگریٹ جلائے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''تمہیں بہترین موسم میں قید کیا گیا ہے۔'' اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

''موسم؟'' اوورسیئر نے بے خیالی سے دہرایا۔ ''اچھا ہے؟''

''دیکھ نہیں رہے ہو؟''

اس نے باہر دیکھا۔ ''ہاں' اچھا ہے...... ابابیلیں ہیں؟''

''ہاں۔'' نعیم نے کہا۔ ''بہت سی ہیں۔''

اوورسیئر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ نعیم کو اس کے استفسار پر دل میں خوشی ہوئی کیونکہ اس نے کبھی ان چیزوں' بادلوں' موسموں' پرندوں وغیرہ کے متعلق دلچسپی ظاہر نہ کی تھی۔ دونوں خاموش بیٹھے برآمدے کی چھت سے ٹپ ٹپ گرتی بوندوں کو دیکھتے رہے۔

سگریٹ ختم کر کے نعیم نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری داڑھی میں پھر سفید بال آ گئے ہیں۔''

''ایں؟ داڑھی میں؟'' وہ کچھ دیر تک متفکرانہ طور پر داڑھی کو کھینچ کھینچ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا' پھر یکایک آنکھیں نکال کر چیخا: ''میری داڑھی میری اپنی ہے۔ تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو؟ تم میری عورت ہو؟''

نعیم چالاکی سے ہونٹوں میں ہنسا۔ ایک لحظے کے لئے اس کے دل میں عجیب سا سرور پیدا ہوا' اپنی آزادی اور دوسرے کی قید کا سرور۔ اس کا جی چاہا کہ اوورسیئر کو' اس پتھر کے سے سخت اور بے حس شخص کو' جس نے آج تک کبھی کوئی' خواہش کوئی احساس یا کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی تھی' اذیت دے۔ برسوں کا بغض تھوڑی دیر کے لئے اوپر آ گیا۔ یہ بغض بے وجہ تھا' لیکن ایک لمبے عرصے تک جیل کے غیر معمولی ماحول میں رہنے کے بعد ایسے جذبات عام لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس نے جیب سے دوسرا سگریٹ نکالا اور جب اوورسیئر نے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو واپس کھینچ لیا۔

''پہلے وعدہ کرو آئندہ مجھے گالی نہ دو گے۔''

اوورسیئر وحشیوں کی طرح ہونٹ چبانے لگا۔ آخر جب سگریٹ پینے کی خواہش اس پر غالب آ گئی تو وہ غصے اور گالیوں کو ضبط کر کے بولا: "نہیں دوں گا۔" اور لالچیوں کی طرح سگریٹ نعیم کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

نعیم نے دونوں سگریٹ سلگائے اور خاموشی سے بارش کو دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ بارش بالکل تھم گئی اور رہا سہا پانی برآمدے کی چھت پر سے قطرہ قطرہ گرنے لگا۔

"آج میں اس کا بھیجا نکال دوں گا۔" اوورسیئر نے اپنے آپ سے کہا۔

"کس کا؟"

"نمبر 17 کا۔ اس نے مجھ سے افیون طلب کی ہے اور رپورٹ کرنے کی دھمکی دی ہے۔ ناجائز باپ کی ناجائز اولاد۔"

جب دوسرا سگریٹ بھی ختم ہو گیا تو نعیم نے اسے بارش کے پانی میں اچھال دیا اور دھوئیں کے ننھے سے مرغولے کو، جو بجھتے ہوئے سگریٹ سے اٹھا تھا، ہوا میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" پھر اس نے پوچھا۔

"نام؟" اوورسیئر نے داڑھی میں انگلیاں گھمائیں، پھر بالوں کو دہرا کیا اور دانتوں میں لے کر چبانے لگا۔ پھر یکا یک غور و فکر کو چھوڑ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ "مہندر۔"

"کیوں ہنستے ہو؟"

"مادر چود نام بھول گیا تھا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مہندر۔"

"مہندر سنگھ؟" نعیم نے کچھ اپنے آپ سے، کچھ اس سے پوچھا۔

"سنگھ کی ماں کی۔" وہ بولا۔ "خالی مہندر۔"

کچھ دیر کے لئے نعیم کو ایک پرانے، گم شدہ دوست کی تکلیف دہ یاد آئی، لیکن جیل کی لمبی زندگی، جس نے اس کے جذبات کو کند کر دیا تھا، آڑے آ گئی۔

"ہاں تو مہندر۔" اس نے کہا۔ "تم نے قتل کیا تھا؟"

"سات۔"

"سات؟" نعیم چونک اٹھا۔

جواب میں اوورسیئر تلخی سے ہنسا۔

"کیسے؟" نعیم نے پوچھا۔ وہ نظر جما کر نعیم کو دیکھنے لگا۔ اس کے تیور دیکھ کر نعیم کو گالی یا کسی سخت جواب کی توقع ہوئی، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے خود بخود کہنا شروع کر دیا:

"ہماری سات مائیں تھیں اور ہم گیارہ بھائی تھے۔ بہت سی زمین تھی جس میں ہم سبزیاں اور ہر قسم کے

اناج بویا کرتے تھے۔ دوسری مائیں سب بدشکل اور پھوہڑ تھیں۔ میری ماں سب سے کم عمر اور شکل والی تھی کیونکہ وہ ایک ایسے شخص کی بیٹی تھی جس کے پاس بہترین کپاس کا بیج تھا اور اس نے اپنی بیٹیوں کو کھیتوں میں کام کرنے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ وہ گھر میں ہی چھوٹا موٹا کام کر کے پلی تھیں۔ دوسری عورتیں میری ماں سے جلتی تھیں کیونکہ میرا باپ مہینے میں بیس روز ہمارے پاس سوتا اور دس روز باقی سب کے پاس۔ تیسری ماں' جو چڑیل سے مشابہ تھی' ہم سے اس لئے بھی جلتی تھی کہ ہر سال کپاس کی فصل کے موقع پر میری ماں اپنے باپ کے گھر سے سوت لا کر میرے باپ کے لئے کپڑے بنایا کرتی تھی۔ اس کا بیٹا بڑا بدمعاش تھا۔ وہ اسے ہمارے خلاف بھڑکاتی رہتی تھی۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑا اور طاقتور تھا اور مجھ سے جھگڑنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔ کئی دفعہ اس نے اِدھر اُدھر کے بہانے کر کے مجھے کھیتوں میں پکڑ کر مارا۔ میں اس وقت چپ رہا لیکن دل میں ارادہ کرلیا کہ بڑا ہو کر اس کا بدلہ لوں گا۔ جب میرا باپ مر گیا تو میری ماں نے دوسری عورتوں سے کہا کہ اب ہمارا مرد مر گیا ہے اور فساد کی جڑ ہی نہیں رہی اس لئے اب ہمیں صلح سے رہنا چاہیے۔ چنانچہ وہ مل جل کر رہنے لگیں۔ لیکن میرے دل میں کینہ بیٹھ چکا تھا' جوں جوں بڑا ہوتا گیا اسے پالتا رہا۔ میرا بھائی بھی ساتھ ساتھ بڑا ہو گیا اور وہ بڑا بدمعاش نکلا۔ اس نے گاؤں میں بدمعاشوں کا گروہ بنالیا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے۔ وہ لوگوں کے بیل چرا کر بیچ دیتے اور کسانوں کی عورتیں اٹھا کر لے جاتے اور کھڑی فصلیں کاٹ لیتے۔ گاؤں والے ان سے خوف کھاتے تھے۔ ایک روز میں اپنے کھیت میں کھڑا تھا کہ وہ دندناتے ہوئے وہاں سے گزرے۔ میرا بھائی مجھے مخاطب کر کے بولا: ''تمہاری ماں فاحشہ عورت ہے۔ اس نے ہمارے باپ کی عزت مٹی میں ملا دی ہے۔ وہ موچیوں اور کمین لوگوں کے ساتھ سوتی ہے' یہ سن کر مجھے دکھ ہوا۔ میں نے کہا: ''اس وقت میں تمہارا کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے ساتھ تمہارے ساتھی ہیں اور میں اکیلا ہوں۔ لیکن یاد رکھو ایک نہ ایک دن میں تمہیں قتل کر دوں گا۔'' وہ میری دھمکی کا ٹھٹھا اڑا کر چلا گیا۔

''اس رات میں نے اپنی ماں سے پوچھا۔'' موچیوں کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟''

اس نے کہا 'اچھے ہیں۔' اس پر میں نے اسے بھائی کی بات بتائی اور اسے قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ سن کر میری ماں خوف زدہ ہوگئی اور دروازے کی کنڈی لگا کر باہر چلی گئی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو میں نے اٹھ کر اندر سے دروازے کے قبضے اکھاڑے اور باہر نکل آیا۔ میری ماں کی چارپائی خالی تھی۔ اسی وقت میں نے اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ میرا شک مکمل ہوگیا۔ میں نے اس کا گلا گھونٹ کر وہیں پر اسے ختم کردیا۔ اسی رات کو میں نے بدمعاش بھائی کو بھی قتل کر دیا اور جنگل میں بھاگ گیا۔ وہاں پر مجھے چند ایسے آدمی مل گئے جو میری طرح مفرور تھے اور بھوکے مر رہے تھے۔ ہم نے صلاح کر کے گروہ بنالیا اور ڈکیتیاں شروع کر دیں۔ ایک روز خواہش کے زور کرنے پر میں چھپ چھپا کر اپنی بیوی سے ملنے کے لئے گاؤں گیا تو دیکھا کہ میرے بچے کو اس بدمعاش کے بیٹے نے قتل کر دیا ہے۔ میں پاگل ہوگیا۔ ایک پہر کے اندر اندر میں نے اس بدمعاش کی بیوی اور چاروں بیٹوں کو ہلاک کر دیا اور واپس آ گیا۔ کافی عرصے تک ہم ڈاکے مار کر اور مسافروں کو لوٹ کر پیٹ پالتے رہے۔ آخر ایک روز

شراب پی رہے تھے کہ پکڑے گئے۔ میرے قتلوں کے عینی گواہ موجود نہ تھے چنانچہ مجھ پر ڈکیتیوں کے مقدمے چلے اور اڑتالیس سال کی سزا ملی۔ ایک سگریٹ دو۔''

''نہیں ہے۔'' نعیم نے کہا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا بیٹھا رہا۔

اب رفتہ رفتہ دن کا اجالا غائب ہو رہا تھا۔ بارش پھر شروع ہو چکی تھی۔ یکا یک نعیم نے محسوس کیا کہ مہندر نے بیٹھے بیٹھے بھاری بھاری سانس لینے شروع کر دیئے ہیں۔

''اس کے بعد میں نے اس جگہ کو اپنا گھر بنالیا۔ اب انہوں نے یہاں پر ہی مجھے قید کر دیا ہے۔ سؤر۔ کتے۔'' یہاں آ کر اس کی آواز پھیل کر پھٹ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں میں سلاخوں کو پکڑ کر وحشیوں کی طرح دروازے کو جھنجھوڑا۔ نعیم نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر دفعتاً وہ رونے لگا۔ عذاب کی شدت سے اس کا چہرہ بدنما ہو گیا تھا اور وہ ایک ایسے آدمی کی طرح رو رہا تھا جو رونے سے قطعی نا آشنا ہوتا ہے' جیسے کتا کھانستا ہو۔

''میری بیوی دوسرے مرد کے ساتھ سوتی ہے۔ میں نے برسوں سے......'' اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

اس ادھیڑ عمر کے سخت گیر انسان کو جیل کی تمامتر ناداری' اذیت اور کوفت کے بوجھ سے ٹوٹ کر بچے کی طرح روتے ہوئے دیکھ کر نعیم کے دل میں ایک خوفناک احساس پیدا ہوا۔

جس طرح ایکا ایکی وہ رویا تھا اسی طرح چپ ہو گیا۔ خاموش' بھاری بھاری سانس لیتے ہوئے' ایک دوسرے سے نظریں بچاتے ہوئے وہ دونوں بیٹھے رہے۔ پھر اوورسیئر اپنی کرخت آواز میں بولا:

''تم بھیڑیے کی طرح سخت دل ہو۔''

اس دوسرے شخص کے دکھ اور اپنی رکھائی پر نعیم کو اپنے کمینے پن کا احساس ہوا۔ وہ ندامت سے ہنسا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں مانتا ہوں کہ جیل رہنے کے لئے اچھی جگہ نہیں ہے۔'' اس نے سلاخوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

''فکر نہ کرو۔ میں نے بھی کئی برس سے کچھ نہیں دیکھا۔ مثلاً باغ' اور بچے......اور اررر......انگور۔''

وہ کوشش کر کے دوبارہ ہنسا اور ادھ سیئے کپڑوں کا گٹھا اٹھا کر اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا۔

(۲۵)

جس روز نعیم رہا ہوا اس کے ساتھیوں نے جیل کے دروازے پر اس کا استقبال کیا اور اسے پھولوں سے لاد دیا۔ جیل کی بے آب و گیاہ دنیا سے نکل کر دفعتاً اتنے بہت سارے خوشبودار رنگ رنگ کے پھول اور پرانے ساتھی پا کر۔ وہ لوگ جن کے چہروں پر محبت اور احسان مندی کے کثیر جذبات تھے...... نعیم کے سینے کا خلا پُر ہو گیا

اور اس کی آنکھوں میں زندگی کی نرمی اور محبت اتر آئی۔ اس تھوڑے سے وقت میں ہی اس نے اپنے آپ کو پھر اسی پرانی دنیا کا مسرور و توانا انسان محسوس کیا۔ ایک مقصد کے لئے کام کرنے والے لوگوں میں زندگی اور رفاقت کی ایسی بے پناہ قوتیں ہوتی ہیں۔

عذرا کو اطلاع ملنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ وہ اسے دلّی کے سٹیشن پر ملی۔

''روشن محل چلیں گے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''نہیں۔ روشن پور جائیں گے۔ میں نے ٹکٹ لے لئے ہیں۔'' عذرا نے کہا۔

سفر کے دوران نعیم لوگوں کی نگاہوں سے بے خبر اس کے دونوں کندھوں پر بازو رکھے محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ ان سارے سالوں نے عذرا میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تھی۔ وہ اسی طرح حسین اور شاندار تھی۔ اس کا بدن زندہ مچھلی کی طرح سخت اور چکنا تھا۔ صرف اس کے چہرے پر زردی تھی اور آنکھوں کے گرد کی جلد سنولا گئی تھی، جس سے ایک طویل، خاموش اذیت کا پتا چلتا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹ اسی طرح بھرے ہوئے اور نم تھے۔ نعیم کے ذہن میں ایک پرانا، مضحک خیال ابھرا کہ اگر ان ہونٹوں کو انگلیوں میں پکڑ کر آہستہ سے دبایا جائے تو یہ پھٹ جائیں گے اور ان میں سے رس بہنے لگے گا۔ اس نے چپکے سے مسکرا کر عذرا کو اپنے ساتھ لگالیا اور اس کا دل ایک طاقتور احساس سے بھر گیا، قوی انسانی رشتوں کا احساس، جس سے وہ ایک لمبی مدت تک نا آشنا رہا تھا۔

شام گہری ہو چلی تھی جب وہ روشن پور پہنچے۔ لکڑی کے پھاٹک پر لٹکتی ہوئی تختی کو نعیم نے آہستہ سے چھوا، پھر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، اندھیرے میں اس نے بہتے ہوئے پانی کے ہلکے شور کو سنا اور رات کے پھولوں کی خوشبو کو چاروں طرف پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ دونوں رکھوالے کتے عذرا کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر چونکے اور کان کھڑے کر کے ہوشیاری سے دم ہلانے لگے۔ تناور درختوں کے نیچے نیچے تاریک، سرد راستوں پر سے گزرتے ہوئے نعیم نے جسم پر خوشگوار تھکن اور بھوک محسوس کی۔ درختوں پر دن کے پرندے سونے سے پہلے شور مچا رہے تھے اور رات کے خاموش پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ رہے تھے۔

نعمت خانے میں داخل ہو کر نعیم نے کہا:

''ہم یہاں بیٹھ کر کھائیں گے۔'' اور فرش پر بیٹھ گیا۔

''اچھا۔'' عذرا نے خوشی سے جواب دیا۔ وہاں بیٹھ کر انہوں نے جنگلی پرندوں کا بھنا ہوا گوشت کھایا جو گرم اور قوت بخش تھا۔ اس کے بعد انہوں نے قہوہ پیا جو روشن محل کی خوشبودار چائے کی پتیوں کا تھا۔ قہوے کے دوران عذرا کی نظر نعیم کے بازو پر پڑی اور وہ چونک اٹھی۔ پھر بغیر کچھ کہے اس نے رنجیدگی سے لکڑی کی ٹوٹی ہوئی انگلی کو چھوا۔ نعیم کی زبان پر غلیظ سی گالی آئی جسے وہ بمشکل روک سکا۔ ''انہوں نے توڑ دی ہے۔'' اس نے جلدی سے بات ختم کردی۔ مسرت کے اس وقت میں جب کہ خوش ذائقہ کھانے سے اس کا پٹ بھرا ہوا تھا اور جسم میں ایک خوشگوار تھکن گدگدا رہی تھی وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جو اسے ناخوش کردے۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس

نے دودھ مانگا۔

''پرندوں کے گوشت کے ساتھ دودھ نہیں پیا کرتے۔ بھول گئے ہو؟'' عذرا نے کہا۔

نعیم کو یاد آیا کہ یہ اس کے باپ کی نصیحتوں میں سے ایک تھی۔'' چنانچہ وہ کندھے اچکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

تاریک کمرے میں لیٹ کر اس نے اپنی بیوی کے بھرے ہوئے ہونٹوں کو شوق اور جذبے سے چوما' اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا' اپنے باسی اور ضائع ہوتے ہوئے جسم کو اس کے صحت مند اور گدرائے ہوئے بدن کے ساتھ رگڑا اور دیر تک اس کی ہلکی ہلکی خوشبو اور حرارت کو جذب کرتا رہا۔ پھر بازو اس کے گرد لپیٹ کر کس کے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ یہاں تک کہ اسے خدشہ ہونے لگا کہیں عذرا کا سانس نہ رک جائے۔ مگر عذرا بھی اسے بھینچے ہوئے تھی۔ اسے اپنی بیوی کی زندگی اور خواہش کا احساس ہوا۔ اس نے اس کی گردن میں نرمی سے دانت گاڑ دیئے اور ایک مختصر سے لمحے کے لئے خود کو اس کے وجود کا ایک حصہ تصور کیا۔ اگلے لمحے دفعتاً اس کے دل میں دہشت پیدا ہوئی اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔

آہستہ آہستہ وہ اس سے الگ ہو گیا۔ کچھ دیر تک دونوں مردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہے۔ پھر عذرا نے آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ نعیم سیدھا لیٹا لیٹا ہونٹ کاٹتا رہا حتیٰ کہ رستے ہوئے خون کا نمکین ذائقہ اس نے اپنی زبان پر محسوس کیا۔

''جیل کی وجہ سے ہے......'' اس نے خفگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔'' عذرا نے نرمی سے کہا اور اسے چھوٹے سے بچے کی طرح ماتھے پر چوما۔

''تم کس قدر کمزور دکھائی دے رہے ہو۔''

''جیل کے مضر کھانے کی وجہ سے ہے۔'' نعیم کی آواز میں ابھی تک خفگی اور خفت کا اثر تھا۔ اس نے ہوا میں بڑی سی گالی دی۔ ''میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کل شکار کے لئے جاؤں گا۔ گھوڑے کی سواری مرد کے لئے مفید ہوتی ہے۔''

''میں بھی جاؤں گی۔''

''تم ہر جگہ میرے ساتھ نہیں جا سکتیں۔'' نعیم نے کہا۔

''نعیم آؤ باتیں کریں۔'' عذرا نے آہستگی کے ساتھ اس کا سر لحاف سے نکالا۔

اس کے باوجود وہ دیر تک خاموش لیٹے رہے۔ پھر نعیم نے پوچھا:

''کر اس کی زمین چلی گئی؟''

''ہاں' ضبط ہو گئی۔''

''اب میں غریب آدمی ہوں۔'' نعیم نے کہا۔

''ہاں۔ ہم اب غریب لوگ ہیں۔'' عذرا نے دہرایا۔ ''لیکن ہمارے پاس ساری زمینیں ہیں۔''

''وہ ہماری نہیں ہیں۔''

''علی تمہاری اور روشن آغا کی زمینیں خراب کر رہا ہے۔''

نعیم چونکا۔ ''کیوں؟''

''پتا نہیں۔ لوگ کہتے ہیں اپنی ماں کے کہنے پر کرتا ہے۔ ہماری فصل کا اس نے بہت نقصان کیا۔''

''ہوں۔'' وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر پوچھنے لگا۔ ''روشن آغا کیسے ہیں؟''

عذرا خاموش رہی۔

''مجھ سے خفا ہیں؟''

''پتا نہیں۔''

''تم سے؟''

عذرا نے اس کی چھاتی میں منہ چھپا لیا۔ ''مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ رو کر بولی۔

نعیم اس کی گردن اور پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کل صبح کھیتوں کو جاؤں گا۔ ان چیزوں سے میں ایک مدت تک محروم رہا ہوں اور کوئی وجہ نہیں۔''

اس کی آواز میں خفت یا خفگی نہ تھی، سچائی اور دردمندی تھی۔

چند روز گاؤں میں رہنے اور شکار کئے ہوئے تیتر اور خرگوش کا گوشت کھانے کے بعد نعیم بالکل تندرست ہو گیا۔ اس کی سوئی قوتیں کھلی زمین اور کھلی ہوا کے لمس سے بیدار ہو گئیں اور میاں بیوی محبت اور کام کی پوری توانائی اور مصروفیت کے ساتھ رہنے لگے۔

کئی دن کی کڑی نگرانی کے بعد نعیم کو پتا چل گیا کہ علی، غالباً اپنی ماں کے ایما پر اس کی زمینداری اور فصلوں کے ساتھ شرارت کر رہا تھا اور گاؤں کے آوارہ لوگوں کے ساتھ مل کر بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اسی دم اسے شہر بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک روز صبح سویرے وہ اسے اپنے باپ کے گھر میں مل گیا، جہاں نعیم دونوں عورتوں سے ملنے کے لئے گیا تھا۔

''میرے ساتھ چلو۔'' اس نے علی سے کہا۔

''کہاں؟'' علی نے نوجوان بے خوف نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''باہر۔''

گھر سے نکل کر وہ کھیتوں کے بیچوں بیچ چلنے لگے۔ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر مڑتے ہوئے کبھی ایک آگے نکل جاتا کبھی دوسرا۔ دھوپ کھیتوں میں پھیل چکی تھی۔ ہل جوتتے ہوئے کسانوں نے دونوں بھائیوں کو ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تعجب سے دیکھا اور ان پر اللہ کی رحمتیں بھیج کر حال پوچھا۔ جب سے علی نے ہوش سنبھالا تھا وہ پہلی

بار دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ دیکھ رہے تھے اور وہ علی کی کدورت سے بھی واقف تھے۔ جب وہ باہر والی حویلی کے پاس سے گزر رہے تھے تو نعیم نے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا:

''تم یہاں کیوں نہیں آتے؟''

''مجھے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ اکھڑ پن سے بولا۔

نعیم نے کڑی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ سولہ سال کا تھا لیکن پیچھے سے چلتا ہوا پورا جوان کسان دکھلائی پڑتا تھا۔ اس کا قد نعیم سے چھوٹا تھا مگر ہاتھ پاؤں اپنے باپ کی طرح بڑے بڑے اور مضبوط تھے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل سرخ تھا اور گردن کی جلد بیل کی طرح موٹی اور سخت تھی۔ اس کی چال میں لاپروائی اور پھرتی تھی۔ نعیم نے محسوس کیا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے ساتھ سختی سے کام لینا پڑتا ہے۔ قدرتی طور پر اس نے اپنی طاقت کا جائزہ لیا۔ اسے اپنے اوپر اعتماد تھا۔ لیکن اپنے بھائی کے ساتھ معاملہ چکاتے ہوئے وہ دل میں ہچکچا رہا تھا۔

''تم ہل میں جتتے رہے ہو؟ اس نے تمسخر سے پوچھا۔

''تم مذاق کرنے کے لیے مجھے یہاں لائے ہو؟''

نعیم ہنسا۔''یونہی مجھے خیال آیا' تمہاری گردن بیل کی طرح ہے۔''

علی کا ہاتھ آپ سے آپ گردن کی طرف اٹھ گیا اس کی جلد جھرجھرائی لیکن وہ خاموش چلتا رہا۔ جب وہ حویلی سے کافی دور نکل آئے تو نعیم نے پوچھا:

''تم کام کیوں نہیں کرتے؟''

''کرتا ہوں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''تمہارے دوست گاؤں کے ناکارہ ترین لوگ ہیں۔''

''تمہیں کیا؟''

''ان کے پاس زمین کا ایک مرلہ اور بیلوں کی جوڑی تک نہیں اور ان کی جوانی ڈھل رہی ہے۔ انہیں کوئی پسند نہیں کرتا۔''

''تمہیں کیا؟'' علی نے دہرایا۔

نعیم کو سخت طیش آیا۔ وہ تیز غصیلی آواز میں بولا: ''جاہل کسان میں تمہارا بھائی ہوں۔ ٹھہرو۔ میری بات کا جواب دو۔''

علی بے خوفی سے پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔ نعیم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

''تم نے میرے بعد فصلوں کو کیوں تباہ کیا؟ اور اب بھی تم ڈنڈے بجاتے پھرتے ہو اور میرے کاموں میں روڑے اٹکاتے ہو' کیوں؟ تمہارے سر میں بیل کی عقل ہے؟''

''تم تو جج کو گئے تھے نا۔'' علی نے بے خوف' طنزیہ لہجے میں کہا لیکن بات ختم کرتے کرتے اس کی زبان

لڑکھڑا گئی کیونکہ اس کا بڑا بھائی جسے وہ شروع سے بڑا دیکھتا آیا تھا' دانت پیس کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''سور' میں تجھے شہر چھوڑ کر آؤں گا۔'' نعیم نے کہا اور مضبوطی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ اگلے لمحے ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ علی ہاتھ چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

شکاری کتوں کی طرح جھاڑیوں اور پانی کی نالیوں پر سے زقندیں بھرتے وہ دیر تک ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔ دور دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں نے رک کر' آنکھوں پر سایہ کرکے انہیں دیکھا اور ہنسے:

''چھوٹا لونڈا بڑے کو ورزش کرا رہا ہے۔'' انہوں نے ایک دوسرے سے کہا۔

علی خرگوش کی طرح آسانی اور پھرتی سے بھاگ رہا تھا۔ وہ جھاڑیوں میں اور ہل جتی ہوئی زمین میں بھاگنے کا عادی تھا۔ لیکن نعیم اپنی عمر کی وجہ سے سست رفتاری اور بے ڈھنگے پن سے کوستا ہوا بھاگ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ تھک کر رک جاتا تو علی بھی ٹھہر جاتا اور آنکھوں کے کونوں میں سے اسے دیکھتا رہتا۔ سانس لے کر وہ پھر بھاگنے لگتے۔ نعیم گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا اور جانتا تھا کہ اس طرح وہ اس کم عمر لڑکے کو نہیں پکڑ سکتا' مگر وہ اس کا پیچھا شروع کر چکا تھا اور اب رکنے کے خیال سے خفت محسوس کر رہا تھا۔ آس پاس دور دور تک کوئی بشر نہ تھا اور بھاگتے ہوئے بھائیوں کے پاس سے کئی خرگوش اور گیدڑ جھاڑیوں میں سے نکل نکل کر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ ایک خرگوش نعیم کی ٹانگوں سے ٹکرایا اور دور تک قلابازیاں کھاتا ہوا چلا گیا۔

''خرگوش کو پکڑ کر لے جاؤ۔ اس کا گوشت دوڑنے کے لئے مفید ہوتا ہے۔'' علی نے کہا۔

وہ بھاگتے رہے۔

آخر بہت تھک کر نعیم ایک پتھر پر ٹانگ رکھ کر ہانپنے لگا۔ علی بھی رک گیا اور کچھ دیر کے بعد زمین پر بیٹھ گیا۔ اسے بیٹھتے دیکھ کر نعیم بھی بیٹھنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ پتھر کے نیچے سے ایک خرگوش نکل بھاگا۔ وہ اچھل پڑا۔

''اب تم نے خرگوش پیدا کرنے شروع کر دیئے ہیں۔'' علی نے پکار کر کہا۔

نعیم خفت سے ہنستا ہوا بیٹھ گیا۔ ''چپ رہ جاہل باتونی۔ آج تو نے مجھے بڑا خوار کیا۔'' پھر وہ بظاہر اپنے آپ سے لیکن بلند آواز میں بولا۔ ''شکر ہے میں نے جنگ میں ٹانگ تو نہیں کھوئی' ورنہ یہ لونڈا کبھی ہاتھ نہ آتا۔''

''گھر والوں کے دانت نہیں گنا کرتے۔'' علی نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں تم مجھے کبھی نہیں پکڑ سکتے۔''

دونوں اپنا اپنا سانس ملاتے رہے۔ جنوب کی طرف سے بادل اٹھ رہا تھا۔

''بارش آئے گی۔'' نعیم نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

''بارش ابھی اچھی نہیں ہے۔ گیہوں کے لئے۔'' علی نے کہا۔

جب دونوں کے سانس مل گئے تو بغیر کچھ کہے اٹھ کر پھر بھاگنے لگے۔ اب علی نے گاؤں کا رخ کر لیا تھا۔ نعیم کو ایک تدبیر سوجھی۔ جب وہ اس کی حویلی کی دیوار کے پاس سے گزر رہے تھے تو اس نے اپنی مخصوص سیٹی بجائی۔ رکھوالی کے کتے گھر کی چار دیواری پھاند کر علی پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لاتوں کے زوردار جھٹکوں کی مدد سے ان

سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنے لگا لیکن کتے پلے ہوئے اور خونخوار تھے اور اسی مقصد کے لئے رکھے گئے تھے۔ اتنے میں نعیم اس کے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے اسے گردن سے پکڑ کر کتوں کے پنجے سے چھڑایا۔ علی گردن چھڑانے کی لگاتار کوشش کر رہا تھا۔ نعیم نے دانت پیس کر اس کی رگوں کو انگلیوں میں دبایا۔ درد کی شدت سے وہ بلبلا اٹھا۔

''ایک ہاتھ سے تمہیں اور تمہارے تین دوستوں کو سنبھال سکتا ہوں۔'' نعیم نے کہا۔

اسے گردن سے پکڑے پکڑے وہ گھوڑی کے پاس لے کر آیا' اچھل کر اس پر سوار ہوا' کالر سے پکڑ کر علی کو اٹھایا اور اپنے پیچھے بٹھا لیا' پھر گھوڑے کی رسی اتار کر اپنی اور علی کی کمر کے گرد پھینکی اور کس کر باندھ دی۔ گھوڑا بھاگنے لگا۔

''میں اب بھی بھاگ سکتا ہوں۔'' اس نے ضدیوں کی طرح کہا۔ وہ برابر رسی تڑا کر بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

نعیم نے باگیں کھینچ لیں۔ جب گھوڑا رکا تو وہ کندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھ کر درشت لہجے میں بولا۔

''کیا مرضی ہے؟ لڑائی کی؟''

''نہیں۔''

''پھر چپکے بیٹھے رہو۔''

''پھر عائشہ سے میرا بیاہ کر دو۔'' علی نے بے خوفی سے کہا۔

نعیم چونکا' گردن موڑ کر کنکھیوں سے پیچھے دیکھا' لمبا سا معنی خیز 'ہوں' کیا' پھر سامنے دیکھ کر لمبا سا سانس چھوڑا اور ہونٹوں میں مسکرایا۔

پوری رفتار سے گھوڑا بھگاتے ہوئے وہ مصنوعی سختی سے بولا: ''تو اسی لئے تم نے اتنا اُدھم مچا رکھا تھا؟''

علی خاموش رہا۔

''میں سمجھا تمہاری ماں تمہیں سبق دے رہی ہے۔''

''میں عورتوں کی باتوں پر نہیں چلتا۔'' علی نے کہا۔

نہر کے پل پر چند کسانوں نے دونوں بھائیوں کو اس ہیئت کذائی میں دیکھا اور مسکرا کر ان کا حال پوچھا۔ پل پر سے اتر کر نعیم نے کہا:

''لیکن راول؟''

''میں اسے قتل کر دوں گا۔'' علی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''بکومت۔ میں انتظام کر دوں گا۔''

تھوڑی دور جا کر علی کسمسانے لگا۔ ''رسی ڈھیلی کرو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

نعیم نے گھوڑا روک کر رسی کھولی اور اس کے گلے میں لپیٹ دی۔ علی چلتے گھوڑے پر سے چھلانگ لگا کر

اترا اور رکاب پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگا۔

''راول مجھ سے بڑا ہے لیکن مجھ سے تیز نہیں دوڑ سکتا۔ میں نے پچھلی فصل پر اسے کٹائی میں بھی مات دی تھی۔ اور وہ ایک خرگوش بھی نہیں پکڑ سکتا۔'' وہ باتیں کرتا ہوا ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔

جب وہ شہر پہنچے تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ وہ سیدھے کپڑے کی مل پر گئے جس کی تعمیر کا کام زوروں پر تھا۔ کچی دیواروں اور پھونس کی چھت والے عارضی دفتر میں بیٹھا ہوا بھرتی کا کلرک ادھیڑ عمر اور خاکستری رنگ کا شخص تھا جس کی عینک کے فریم کی ایک طرف سے دھاگوں کی مدد سے مرمت کی گئی تھی۔ نعیم نے علی کو پیش کیا۔

''نوکری کے لئے ہے؟'' کلرک نے عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے تیز' باریک آواز میں پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیا عمر ہے لونڈے کی؟''

''سولہ سال۔''

''عمر کم ہے۔'' کلرک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''میں سب کام کر سکتا ہوں۔'' علی نے سادگی سے کہا۔ کلرک چشمہ اتار کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''فیکٹری ایکٹ کے تحت۔'' اس نے بات شروع کی۔ نعیم' جو ضبط کئے کھڑا تھا آگے بڑھا اور چیخ کر بولا:

''جب میں سولہ سال کا تھا تو انہوں نے میرے ہاتھ میں سنگین دی تھی اور پکڑ کر جنگ پر لے گئے تھے۔''

کلرک نے اس غیر متوقع طرزِ عمل سے چکرا کر کمر سیدھی کی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

علی کو مل میں بھرتی کروا کے نعیم اسی روز گاؤں لوٹ آیا۔

(۲۶)

اس سال کے آخری دن دلّی کے ایک اجتماع میں مسلمانوں کی دو جماعتوں کو متحد کر دیا گیا اور اس طرح ایک واحد جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جس نے رفتہ رفتہ ایک زبردست متوازی اور مخالف سیاسی قوت کی حیثیت اختیار کر لی اور آگے چل کر واقعات کی تشکیل میں اہم حصہ لیا۔ اس موقع پر صدارت کرنے کے لئے فرانس سے آغا خان III تشریف لائے جن کی وجہ سے ملک کے طول و عرض میں اس کانفرنس کا چرچا ہو گیا اور وہ مسلمان بھی جو کہ مخالف سیاسی نظریات رکھتے تھے' اس میں شریک ہونے کے لئے آنے لگے۔

اس سے پہلی رات نعیم اور عذرا روشن آغا کو شب بخیر کہنے کے بعد اپنے کمروں کو لوٹے۔ عذرا صحت مند اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ نعیم صحت مند اور دل کش دکھائی دینے کے باوجود کھویا کھویا سا تھا اور اس کی آنکھوں میں وہ پُر قناعت ٹھہراؤ نہ تھا جو اس کی بیوی کی نظروں میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا تھا۔ برسوں کی پُر آشوب زندگی

نے اس کے دل میں آرام دہ اور پُر آسائش رہائش کے لئے تنفر اور بیزاری پیدا کردی تھی اور وہ اسی بے نام خلش کا شکار تھا جو اس وقت ملک کے کروڑوں دلوں میں پیدا ہو چکی تھی۔ وہ روزانہ کی طرح سونے کے لئے بستر پر لیٹے' یہ جانے بغیر کہ وہ رات ان کے لئے بلا خیز تھی۔

آہستہ آہستہ روشن محل کی تمام خواب گاہوں کی روشنیاں گل ہوگئیں سوائے دوسری منزل کی ایک خواب گاہ کے جس کے سبز شیشوں والے دریچے تھے اور ان میں سے پھوٹتی ہوئی مدھم روشنی میں یوکلپٹس کی چوٹیاں ہل رہی تھیں۔ جاڑوں کی غیر آباد رات چاروں طرف پھیل چکی تھی اور شیشوں کے دوسری طرف وہ دونوں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے نیند سے پہلے کی باتیں کر رہے تھے۔ روئی کے نرم گدوں میں کسمساتے ہوئے' دن بھر کی چھوٹی چھوٹی' غیر دلچسپ' خواب آور باتیں۔

باتیں کرتے کرتے عذرا کسی خیال سے چونک پڑی۔

''کل آغا خان کی کانفرنس ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہوں۔'' نعیم نے غنودگی کی حالت میں سر ہلایا۔ عذرا نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کیا۔

''روشن آغا بھی جا رہے ہیں پر میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ آغا خان کو بہت سال ہوئے میں نے بمبئی میں دیکھا تھا۔ اس قدر شاندار شخصیت ہے ان کی' اللہ......تم نے دیکھے ہیں؟''

''میں بمبئی نہیں گیا تھا۔'' نعیم جل کر بولا۔ عذرا کو پہلے ہی نیند آ رہی تھی۔ اس بات سے بالکل ہی دبک گئی۔ اسے خاموش ہوتے ہوئے دیکھ کر نعیم کو اپنے طرز عمل پر ندامت محسوس ہوئی۔

''تم روشن آغا کے ساتھ چلی جانا۔'' اس نے کہا۔

''کیوں؟''

''پرنس آف ویلز سے مل کر ہمیں کوئی خاص خوشی نہ ہوئی تھی۔'' وہ تمسخر سے ہنسا۔

''اوہ...... وہ تو ہم ایسی غلط جگہ پر تھے۔''

نعیم نے کروٹ بدلی اور بازو اس کے جسم کے گرد لے جا کر اسے چوما۔ ''میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم خفا ہوگئیں؟'' اس نے دوبارہ اس کی گردن کا ایک طویل' بے مزہ بوسہ لیا۔

''آؤ اب سو جائیں۔'' اس نے کہا' لیکن عذرا اپنے محبوب ہونٹوں کے لمس سے پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔

''لیکن آغا خان' اوہ......'' اس نے ہتھیلی نعیم کے گال پر رگڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایسی پُر اسرار شخصیت کے مالک ہیں نہیں؟''

''ہوں۔'' نعیم اب اپنی بیوی کے طرز عمل سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔

''مگر تم......تو مخالف پارٹی سے ہو۔'' عذرا نے پوچھا۔

''مسلم لیگ کانگرس کے خلاف نہیں ہے اور پھر وہ مسلمانوں کی جماعت ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ

لوگ کیا کہتے ہیں۔"

"اچھا۔" عذرا نے یکساں آواز میں کہا۔ اس کے ذہن میں آنے والے دن کی باتیں اکٹھی ہو رہی تھیں۔
"کل نئے سال کی رات ہے نعیم۔ دو سال ہوئے ارشد اس رات کو ہمارے ساتھ تھا۔ اگلے روز اس کا حادثہ ہو گیا۔" نعیم خاموشی سے کسمسایا۔

"کل وحید کی پارٹی پر جائیں گے۔ ایں نعیم؟ کل نئے سال کی رات ہے۔"

"ہوں۔"

"وحید کی بیوی بڑا عمدہ رقص کرتی ہے۔ گریکسن کنبہ بھی وہاں آئے گا۔ وہ سب رقص کے شیدائی ہیں۔ کونونٹ میں ہم سب نے رقص سیکھا تھا۔ لیکن ہم نہیں ناچیں گے۔ بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے۔ اچھا؟"

"ہوں اوں۔"

"تم فوجی تقریبی لباس پہن سکتے ہو؟"

"پتا نہیں۔"

"کراس تو چلا گیا۔" کچھ دیر تک وہ بے حس و حرکت لیٹی رہی' پھر اس نے ہاتھ پھیلا کر نعیم کے سینے پر رکھا اور آزردگی سے بولی۔ "کتنا اچھا ہوتا اگر تم جیل نہ جاتے...... نعیم۔"

نعیم کی آنکھیں آپ سے آپ وا ہو گئیں اور وہ بے خیالی سے چھت کو گھورنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا اور نیند اس کی آنکھوں سے ہوا کی طرح غائب ہو گئی۔ اس کے سینے میں ایک بھاری' درد آلود شے کلبلائی۔ اس نے آہستگی سے اسے چھوئے بغیر اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اذیت اور تبدیلی کے اس لمحے میں اس کے دل میں ساتھ لیٹی ہوئی عورت کے لئے شدید تنفر پیدا ہوا۔ اس کا جسم ایک دھیمے' مسلسل ارتعاش کی حالت میں تھا۔ میکانکی طور پر اس نے گردن موڑی اور بے شرمی سے ابھری ہوئی چھاتیوں اور موٹے شہوانی ہونٹوں کو دیکھا۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس نفسانی عورت میں اس نفسانی چہرے پر حسن کی رمق تک نہ تھی۔ اس کے ہونٹوں کے پھیلے ہوئے کناروں اور ابھرے ہوئے گالوں سے صرف شہوت اور بازاری پن عیاں تھا۔ وہ بستر سے اٹھا اور آتشدان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے اس نے کہنیاں آتشدان پر ٹیک دیں اور سر کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

عذرا بستر پر ششدر بیٹھی رہی۔

"ہندوستان میں بہت لوگوں کے پاس بہادری کے تمغے ہیں۔ تم ان کے پاس جا سکتی ہو۔" وہ اسی طرح کھڑے کھڑے بولا۔

عذرا نے عجیب سی' پُرسکوت آواز میں صرف اتنا کہا: "نعیم' پاگل ہو گئے ہو۔"

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ نعیم کی ایک ٹانگ تیزی سے کپکپا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے جذبات کے ابال

پر قابو پالیا۔ اب اس کے دل میں ایک سرد اور قطعی جذبہ تھا۔ ہتھیلی پر سر رکھے رکھے اس نے مڑ کر اس عورت کو دیکھا۔

''تمہاری وجہ سے میدان جنگ میں مَیں نے ایک ساتھی کو قتل کیا تھا۔ تمہیں پتا ہے؟''

عذرا اچنبھے سے اسے دیکھتی رہی۔

''وہ میرا دوست تھا۔ اپنی عورت کا تذکرہ کرتا رہتا تھا۔ میں نے اسے ختم کر دیا۔''

''میں قصوروار تھی؟'' عذرا نے آزردگی سے پوچھا۔

نعیم نے سپاٹ، غیر جذباتی لہجے میں اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں نے غلطی کی۔ تم قابل نفرت ہو۔''

عذرا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور وہ کل کی طرح بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ غصے اور رنج کے آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ تیز تیز سانس لیتے ہوئے وہ رک رک کر بولی:

''تم...... تم سے شادی کر کے مجھے کیا حاصل ہوا؟ تم...... ایک بچہ تک نہیں۔ یہ سارے سال...... قابل نفرت۔''

''چپ رہو۔'' نعیم نے وحشیوں کی طرح دھات کا گلدان اٹھا کر اس پر پھینکا۔ عذرا فطری طور پر اس سے بچنے کے لئے ایک طرف کو جھکی، دھات کا بھاری وزن فرش سے ٹکرایا اور کمرے کی خاموش فضا میں شور پیدا کرتا ہوا دور تک چلا گیا۔

''نکل جاؤ۔'' وہ آگے بڑھ کر دھاڑا۔

عذرا کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ برسوں تک اکٹھا رہنے کے بعد وہ دفعتاً ایک دوسرے کے مقابل آن کھڑے ہوئے تھے۔ ہنوز اجنبی اور متنفر! انتہائی ذلت کے احساس سے اس نے چیخنا چاہا، لیکن وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ ''تم...... تم۔'' پھر اس نے رونا چاہا لیکن صدمے کی شدت سے رو بھی نہ سکی۔ ایک لمحے میں جذبے کی یہ ساری وارداتیں اس پر سے گزر گئیں۔ آخر اس کی آنکھیں آگ برسانے لگیں۔ تیز، مکروہ آواز میں اس نے کہا:

''میرے باپ کا گھر ہے۔ میرے باپ کی زمینیں ہیں جو تم کھاتے ہو۔ تم۔''

نعیم کی آنکھوں میں موت دیکھ کر وہ تیزی سے مڑی اور ڈرے ہوئے بچے کی طرح بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد نعیم نے اس کے اور اپنے وجود کے لئے عجیب سی نفرت اور حقارت محسوس کی، اس قسم کی نفرت جو زنا بالجبر کے بعد انسان کو ہوتی ہے۔ دیر تک وہ تعجب کرتا رہا کہ کس طرح اتنے عرصے تک وہ اس عورت سے محبت کرتا رہا تھا۔

جب تک جذبات اعتدال پر آئے وہ اپنے آپ کو بے حد کمزور محسوس کرنے لگا تھا، پھر بھی وہ کہیں رات کے پچھلے پہر کو جا کر سو سکا اور اجالا ہونے پر جاگ گیا۔

بند دریچے کے شیشے پر انگلیاں پھیلائے وہ بے خیالی سے کھڑا رہا۔ کئی مرتبہ اس نے رات کے واقعے کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن محض اپنی انگلیوں کو اور چھن کر آتی ہوئی دھوپ کو اور شیشے پر پڑتے ہوئے یوکلپٹس کے پتوں کے

سائے اور دریچے کے پتھر کو دیکھتا اور محسوس کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک بے معنی خلا اور تعطل تھا۔ وہ آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے کھڑا گونگی' بے تاثر نظروں سے اس نئی صبح کو دیکھتا رہا جو ہر روز کی طرح دنیا پر طلوع ہوئی تھی۔

دروازہ جو رات بھر کھلا رہا تھا' ہلا اور خالہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے بوڑھے خوبصورت چہرے پر بے خوابی اور رنج کے آثار تھے۔ کمرے کے وسط میں رک کر وہ نعیم کی ساکت' بے جان شبیہ کو دیکھتی رہی' پھر میز پر پڑی ہوئی راکھ دانی کے کناروں پر انگلی پھیرنے لگی۔ نعیم مڑا اور نا آشنا نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔ وہ ہلکے پھلکے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ایک دوسرے انسان کو سامنے پا کر رفتہ رفتہ نعیم کے حواس بجا ہو گئے۔ بجلی کی سی تیزی سے سارا واقعہ' جو گزشتہ شب اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان گزرا تھا' اس کے ذہن میں کوند گیا اور وہ پشیمانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

کمرے کو پار کرتے ہوئے دھات کا گلدان نعیم کے پیر سے ٹکرایا اور ناخوشگوار' مانوس آواز پیدا کرتا ہوا ایک طرف کو لڑھک گیا۔ وہ آ کر آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''مجھے ساری بات کا علم ہے۔'' خالہ نے گلدان قریب کھینچ کر باسی پھولوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''عذرا رات بھر میرے پاس بیٹھی روتی رہی۔''

''وہ اپنے باپ کے پاس نہیں گئی؟'' نعیم نے تلخی سے کہا۔

''آ آ آ ...... یہ معمولی باتیں ہیں۔ معمولی۔ میاں بیوی کے لئے یہ معمولی باتیں ہیں۔''

نعیم نے سگریٹ سلگایا اور کندھے پر دھواں چھوڑا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اس نے یکساں آواز میں' جس میں خفیف سی پشیمانی تھی' کہا۔

''روشن آغا کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ تم جانتے ہو مجھے ان بچوں سے گہرا تعلق ہے۔ اور ...... اور مجھے یہیں رہنا ہے۔''

نعیم نے سر اٹھایا۔ وہ رنجیدہ متجسس نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ نعیم اس کے سر کے اوپر سے شیشوں پر دیکھنے لگا جہاں صبح کی ہوا میں ہلتے ہوئے پتوں کا سایہ لرز رہا تھا۔ گلدان لڑھکتا ہوا جا کر دیوار کے ساتھ لگ گیا تھا اور اس کے پھول جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ بستر پر شکنیں تھیں۔ بند کمرے میں سگریٹ کا دھواں بہت دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہا تھا۔ اس نے آخری کش لے کر سگریٹ راکھ دانی میں مسلا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

بوڑھی عورت کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جب نعیم نے دوسرا سگریٹ سلگایا تو وہ کہنیاں میز پر رکھ کر ہلکی پھلکی مسرور آواز میں باتیں کرنے لگی۔

''کاش تم اس کو ٹھیک طرح سے سمجھ سکو۔ اررر...... تم اس کی طبیعت سے واقف نہیں ہو سکے نعیم۔ تم ہمیں میں سے ہو۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ تم اس کے شوہر ہو۔ اسے اپنی ماں کی طرف سے خودسری اور قوت ملی ہے'

لیکن اس نے روشن آغا کی تربیت، ضبط اور شفقت بھی پائی ہے۔ اسے تم سے بڑی محبت ہے۔ انسانوں کے ساتھ اتنی عمر تک میل جول رکھنے کے بعد ان کی فطرت کے متعلق میں بہت کچھ جان گئی ہوں۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تم آج اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ، جہاں بھی تم جا رہے ہو، مجھے پتا نہیں، لیکن...... ٹھیک ہے نا؟''

''ٹھیک ہے۔'' نعیم نے کندھے جھٹکا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ برآمدے میں اترا تو اسی وقت عذرا دوسرے سرے سے ظاہر ہوئی۔ وہ برآمدے میں اس طرح داخل ہوئی تھی جیسے دھکیل دی گئی ہو، زرد اور کمزور، سفید لباس میں کلدار گڑیا کی سی شان کے ساتھ چلتی ہوئی دور سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر انہوں نے نظریں چرا لیں۔ وہ عجیب کنارہ کش نظریں تھیں۔ ان میں کسی پرانی شناسائی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایک لفظ بولے بغیر وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔

جامع مسجد کے سامنے ایک وسیع میدان میں خیمے اور قناتیں لگی تھیں اور انسانوں کی ریل پیل تھی۔ یہ ہندوستان کی تمام اہم اور بااثر مسلم جماعتوں کی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ چنانچہ پشاور سے لے کر بمبئی تک کے مسلمان وہاں پر جمع تھے، یوں دعوت نامے ملک کی ہر سیاسی جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو جاری کئے گئے تھے۔ جلسے کی کارروائی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پنڈال میں اور پنڈال کے باہر بے پناہ رش تھا۔ ہر طبقے اور ہر نسل کے مسلمان ان قناتوں کے نیچے گھوم رہے تھے اور بیٹھے ہوئے تھے۔ مختلف نقوش، مختلف لباسوں اور مختلف زبانوں والے ان گنت گروہ باتوں میں مشغول تھے۔ لکڑی کے سٹیج پر، مائکروفون کے پاس، جلسے کے چند منتظمین عجلت سے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے اور ان کے مکالموں کے بعض حصے مائیکروفون میں سنائی دے رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر ایک شخص اس میں ناک ٹھونس کر پکارتا: ''ہلو ہلو ہلو'' ملے جلے شور کے اوپر اوپر اس کی آواز چاروں طرف گونجتی۔ کوئی اس کی طرف دھیان نہ دیتا۔

سٹیج سے لے کر جلسہ گاہ کے دروازے تک قیمتی سرخ قالینوں کا رستہ بنایا گیا تھا جس کے دونوں جانب سرما کے سفید پھولوں کی قطاریں تھیں۔ جلسہ گاہ کے باہر سرو اور پام کے درختوں کا ایک بہت بڑا تقریبی دروازہ بنایا گیا تھا جس کے نیچے استقبالیہ کمیٹی کے ارکان کھڑے تھے اور آ جا رہے تھے۔ اندر سٹیج پر اور لکڑی کی سیڑھیوں پر قرمزی رنگ کے قالین بچھے تھے اور مائیکروفون کے پاس ایک میز اور صدر جلسہ کی اونچی پشت اور زردوزی کے کام والی مخملیں کرسی رکھی تھی۔ سٹیج کے دائیں اور بائیں کانفرنس میں شرکت کرنے والے مندوبین کی نشستیں تھیں جو تقریباً تمام کی تمام پُر ہو چکی تھیں۔ سامنے مسلم لیگ کی دونوں جماعتیں تھیں جن کے سربراہ محمد علی جناح اور سر محمد شفیع، نمایاں طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ وہیں پر ڈاکٹر اقبال بھی تھے۔ دائیں طرف خلافت کمیٹی کے ارکان تھے جن میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی تھے۔ بائیں طرف جمعیت العلماء ہند کے باریش چغہ پوش نمائندے تھے جن میں مولانا حسین احمد مدنی اور شبیر احمد عثمانی شامل تھے۔ ان تینوں بڑی جماعتوں کے بیس بیس منتخب نمائندے شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ ان کے پیچھے معزز اور منتخب نمائندوں کی نشستیں تھیں۔ ہندوستانی مسلمان امراء جو اپنی شان و

شوکت کی وجہ سے سمندر پار تک مشہور تھے' اپنے بیش قیمت آرائشی چغوں اور تقریبی لباسوں اور خطابوں کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کے مخملیں لبادوں پر قیمتی دھات کے تاروں کی کشیدہ کاری کی ہوئی تھی اور انہوں نے چمکدار ستاروں والی خاندانی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ چند ایک نے صبح کا انگریزی لباس بھی پہن رکھا تھا۔ وہ سادہ مگر بااختیار انداز میں ٹانگیں پھیلائے آرام دہ نشستوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں خوابیدہ اور بے مصرف تھیں۔ ان کے پیچھے ننگے سروں اور ادھ ننگے جسموں کا ایک سمندر تھا جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ وہ لاتعداد' غیر اہم لوگ تھے جو ہر تحریک اور تبدیلی کی پشت پر آخری اور اصل قوت ہوتے ہیں۔ وہ تیز' بے صبر اور مشتاق چہروں کے ساتھ کارروائی شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کانگرس کے جلسوں کے برعکس اس جلسے میں مسلمان عورتوں میں پردے کے رواج کی سختی کے باعث خواتین کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ چنانچہ جب نعیم اور عذرا جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو بہت سی متجسس نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ دونوں محتاط' بے لوچ چال سے چلتے' ہجوم سے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہوئے' آ کر امراء اور عوام کی درمیانی نشستوں پر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ بیٹھتے بیٹھتے نعیم نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اپنی بیوی پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہزہائی نس سر آغا خان اپنے ذاتی عملے اور استقبالیہ کمیٹی کے ارکان میں گھرے ہوئے داخل ہوئے۔ تمام لوگ اٹھ کر احتراماً کھڑے ہوگئے۔ آغا خان صبح کے سفید انگریزی لباس میں تھے۔ انہوں نے چھڑی والا ہاتھ اٹھا کر لوگوں کے سلام کو قبول کیا اور بھاری' ٹھگنے جسم کے ساتھ' دھیمی پُر وقار چال سے چلتے ہوئے سٹیج کی سیڑھیاں چڑھ کر کرسی صدارت پر بیٹھ گئے۔ بھرے پنڈال میں موت کی خاموشی چھا گئی۔ اس اچانک سناٹے میں دفعتاً نعیم نے اپنے آپ کو ان نگنت انسانوں میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ اپنی موجودگی کو محسوس کیا اور ہزاروں انسانوں کی اور اپنی بیوی کی موجودگی کو محسوس کیا اور آنکھوں کے کونوں میں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر رنگ جھلک آیا تھا اور بڑی بڑی مایع آنکھوں سے جذبات ظاہر تھے۔ وہ کرسی کی پشت کو چھوڑ کر سیدھی بیٹھی ہوئی صدر کو دیکھ رہی تھی' مسحور اور مضطرب آغا خان نے سفید ہیٹ اتار کر میز پر رکھ دیا اور چھڑی اس کے ساتھ کھڑی کر دی۔ انہوں نے کسی اعصابی جھلاہٹ کا اظہار نہ کیا۔ نعیم کے دل میں جلن سے ملتا جلتا ایک جذبہ پیدا ہوا۔ وہ ارادتاً کسمسایا اور سیدھا عذرا کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

اسی پگھلی ہوئی' تحیری حالت میں عذرا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور گرم سرگوشی میں' خیالات کی شدت سے رک رک کر بولی:

''ابھی وہ بولیں گے تو سننا' وہ بہترین انگریزی۔''

نعیم کی آنکھوں میں سرد غصہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا' اگلے لمحے وہ کانوں تک سرخ ہوگئی۔ اس نے مضبوطی سے ہونٹ بند کر لئے اور نیچے دیکھنے لگی۔

کافی دیر کے بعد جب نعیم کے ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو سٹیج پر سر شفیع کہہ رہے تھے:

''...... میں پنجاب مسلم لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ میں مدغم کر دینے کے ریزولیوشن سے اتفاق کرتا ہوں اور اسے محمد علی جناح کی قیادت میں دیتا ہوں اور خود بھی ان کی قیادت قبول کرتا ہوں۔''

تالیوں اور نعروں کے شور میں سر شفیع اور محمد علی جناح بڑھ کر آپس میں گلے ملے اور دیر تک مصافحہ کرتے رہے۔

''آج ہندوستان کی مسلمان جماعت ایک ......'' سر شفیع نے کہنا شروع کیا۔

''جماعت نہیں 'قوم' کہو۔'' محمد علی جناح خفگی سے انگریزی میں بولے۔

''ہندوستان کی مسلمان قوم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئی ہے۔'' انہوں نے کہا اور اچٹتی ہوئی نگاہ صاحب صدر پر ڈالی جو بے حد اداس نظر آ رہے تھے۔

اس مقام پر اس کا ذہن پھر تاریکی میں چلا گیا اور احساس اوپر آ گیا۔ وہ اکیلا بیٹھا تھا' وہ ہزاروں انسانوں میں گھرا ہوا بیٹھا تھا' اس کے پاس اس کی بیوی بیٹھی تھی جس کے لئے اس کے دل میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ برسوں تک ساتھ ساتھ رہے تھے' ساتھ سوئے تھے' ہنوز اجنبی تھے۔ وہ بے شرمی کی حد تک نفسانی اور خوبصورت تھی' وہ محبت کرنے والی عورت تھی' وہ بیہودہ عورت تھی' وہ اونچے طبقے کی عورت تھی' وہ برتر تھی' وہ تہذیب وتمدن کی عورت تھی وہ ایک نکما مرد تھا' نکما اور نادار' معمولی' بے حد معمولی۔

''ریزولیوشن پاس کیا جاتا ہے۔'' ایک شخص' جو شکل و شباہت سے اہم دکھائی دیتا تھا' مائیکروفون پر کہہ رہا تھا۔ ''یہ نتیجہ ووٹنگ کے بعد نکالا۔''

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے مولانا محمد علی کود کر سٹیج پر چڑھے اور اپنے مخصوص جوشیلے انداز میں اسے پرے دھکیل کر مائیکروفون پر قبضہ جمالیا۔

''لیکن اس طرح ہم جائنٹ الیکٹریٹ کو قبول نہیں کر سکتے۔'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''سیاست چند مادی فوائد کا نام ہے۔ وہ اگر ہماری شرائط ماننے پر تیار ہیں تو ہم جائنٹ الیکٹریٹ قبول کرتے ہیں ورنہ نہیں۔ اس کے لئے انہیں ہم کو تصفیہ حقوق (Reservation of Seats) دینا ہوگا۔ تیسرا حصہ مرکز میں اور صوبوں میں بھی Weightage۔'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے مجمع کی طرف دیکھا۔ یہ موقع پا کر پہلا شخص' جو ریزولیوشن کا اعلان کر رہا تھا' پھرتی سے آگے بڑھا اور مولانا سے تیز تیز باتیں کرنے لگا۔ اس کے انداز سے انکساری اور منت ظاہر تھی۔

مائکروفون کو خالی دیکھ کر ایک شخص' جو آغا خان کے کان کے پاس جھکا ہوا تھا' آگے بڑھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں لنچ کے وقفے کا اعلان کرنے لگا۔

''دوسری نشست دوپہر کے کھانے کے بعد ہوگی۔'' اس نے کہا۔ مولانا محمد علی نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن اسی وقت صاحب صدر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھا اور سٹیج سے اتر آئے۔ مائکروفون کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کا ایک فقرہ لوگوں کو سنائی دیا۔ وہ انگریزی میں کہہ رہے تھے:

''محمد علی کو سنبھالے رکھو۔ لنچ کے وقفے میں اسے مت بولنے دینا۔''

مولانا کے گرد بہت سے لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ سٹیج کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے خلافت کمیٹی کے ارکان برافروختہ چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھے اور احتیاط کے ساتھ ہجوم سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے۔ ایک بار پھر بہت سے سراس زرد رو' باوقار خاتون کی جانب مڑ گئے۔ روشن محل کی سیڑھیوں پر وہ اسی طرح جدا ہو گئے۔ انہوں نے کوئی جذبہ' کوئی شائستگی محسوس نہ کی۔ انہیں یکجا رکھنے والی کوئی قوت ان کے درمیان باقی نہ رہی تھی۔ اسی شام کو نعیم روشن پور لوٹ آیا۔

اسی سال چھ اپریل کو' ڈنڈی ساحل' پر مہاتما گاندھی نے نمک سازی کا قانون توڑ کر ''سول نافرمانی'' کا آغاز کیا۔

(۲۷)

ہندوستانی میدانوں کا بہترین موسم تھا۔ وہ موسم جس میں روشن پور کی انگور کی بیلیں ہری ہو جاتی تھیں اور جنگلی گلاب جگہ جگہ کھلنے لگتا تھا اور خوش حال شہد کی مکھیاں اپنے اپنے چھتے پُر کر کے' تازہ شہد کی خوشبو سے بدمست' شفاف اور چمکدار فضا میں اڑتی پھرتی تھیں اور کھیتوں میں گیہوں اور چنے کی فصل تیار کھڑی ہوتی تھی۔ یہ بہار کے آخری دن تھے جب ہواؤں میں خوشگوار حرارت پیدا ہونے لگتی ہے۔ آسمان کا رنگ' جو جاڑوں میں گہرا نیلا تھا۔ گدلا دودھیا ہو جاتا ہے اور شاخوں پر پھول مرجھا مرجھا کر دن بھر گرتے رہتے ہیں اور چڑیاں کوے دوپہر کو آسمان پر اُدھم مچانے کی بجائے سایہ دار درختوں اور مکانوں کی چھتوں میں آرام کرنے کے لئے چلے آتے ہیں اور بدلتے ہوئے موسم کا مخصوص' بہت اداس کر دینے والا' شدید حسن سارے دنوں میں دور دور تک پھیلا رہتا ہے۔

گاؤں کے باہر نعیم کی حویلی میں نمک بن رہا تھا۔ حویلی مدت سے بند پڑی تھی اور باغ ویران ہو چکا تھا۔ پانی کی نالیاں سوکھی پڑی تھیں اور دو ایک جگہ مردہ کوے گرے پڑے تھے اور آغاز گرما کی اٹھتی ہوئی ہواؤں میں زرد پتے ان پر سے اڑتے ہوئے گزر رہے تھے۔ گھر کے مالکوں میں سے کوئی بھی وہاں پر نہ تھا۔ شیشم کے ایک قدیم درخت کے نیچے گاؤں کے تمام نوجوان جمع تھے۔ انہوں نے بجلی سے مرا ہوا ایک درخت کاٹ کر آگ جلا رکھی تھی۔ آگ پر گڑ بنانے والا کڑاہ دھرا تھا جس میں پانی ابل رہا تھا۔ وہ سب خاموش' پُر اشتیاق چہروں کے ساتھ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے اور دھڑا دھڑ آگ جلا رہے تھے۔ دن کا تیسرا پہر جا رہا تھا۔ وہ اب باتیں کر کر کے اور آگ جلا جلا کر تھک چکے تھے۔ صبح سے دوپہر تک کئی بار کڑاہ کا پانی ابل ابل کر خشک ہو چکا تھا پر نمک کہیں پر بھی دکھائی نہ دیا تھا۔

اب سارے کسان لونڈے جھلا گئے تھے اور ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔

''کچھ منہ سے بول' کوؤں کے سردار۔ باپ کی حویلی میں نمبردار بنے بیٹھے ہو۔'' لمبے گالوں والے پرتاپے نے کہا۔ علی اپنے سیاہ رنگ پر طنز سن کر لال ہوگیا' مگر خاموش بیٹھا رہا کیونکہ نمک بنانے کے سلسلے میں وہ دوسرے سے زیادہ کچھ نہ جانتا تھا اور سب سے اونچی اور چودھراہٹ والی جگہ پر بیکار اس لئے بیٹھا تھا کہ وہ اس کے بھائی کا باغ تھا۔

''ان کو بتاؤ پانی سے گڑ کیسے بنتا ہے۔'' گنجے علی بخش نے کہا اور اکیلا ہنسنے لگا۔

پیدائشی گنجا علی بخش خاموشی سے ٹوپی میں تمباکو جما کر آگ دھرتا رہا' پھر حقہ لے کر دوسروں سے ہٹ کر جا بیٹھا۔ وہ طبعاً خسیس آدمی تھا اور اپنے تمباکو میں سے کسی کو حصہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس سے پرے راول اپنی بال دار پنڈلیوں پر سے کپڑا اٹھا کر اسے دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ ٹانگیں مرد کی ٹانگیں تھیں اور اس کی ملائم اور چکنی ٹانگوں پر چونکہ بال نہ تھے اس لئے وہ عورت کی ٹانگیں تھیں۔ سنتو کھا جواب میں کہہ رہا تھا کہ راول کی ٹانگیں ریچھ کی ٹانگوں کی مانند تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ان کی بحث خاموشی پر ختم ہوگئی اور راول حقے کی طرف دیکھنے لگا۔ گنجا علی بخش خطرہ محسوس کر کے جھگڑنے کا کوئی بہانہ تلاش کرنے لگا۔

''کیوں بے' خاموش کیوں بیٹھا ہے؟ عائشہ کا دکھ لگا ہے؟'' وہ بولا۔

''تیری ماں کا دکھ لگا ہے۔'' راول نے خشونت سے جواب دیا۔

گنجا کھی کھی کر کے ہنسا۔ ''تیرے سر میں بھوسا بھرا ہے۔ وہ تو میری ماں سے بڑی جوان ہے۔''

راول لال پیلا ہو کر اٹھا اور اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ ''اور بک بک کی تو تیری ٹانٹ توڑ دوں گا۔ گنجے خسیس۔'' وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ گنجا اس اچانک حملے سے گھبرا گیا اور دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ راول کچھ دیر تک اسی انداز میں آنکھیں نکال کر اس پر جھکا رہا' پھر جھٹکے کے ساتھ حقہ اٹھا کر خفگی سے مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہوا اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

جب حقہ پی پی کر اس کا غصہ اتر گیا تو گنجا علی بخش حقہ واپس لینے کی غرض سے اس کے پاس جا بیٹھا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

جب سارے کنوؤں کا پانی باری باری ابالا جا چکا اور کچھ بھی نہ بنا تو علی کو سوجھا کہ کھارے کنوئیں کا پانی آزمایا جائے۔ چنانچہ اس کے مشورے سے کھارے پانی کے تین گدھوں پر لاد کر لائے گئے اور کڑاہ بھر دیا گیا۔ پانی ابلنے لگا اور سب ایسی چمکتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے کہ کبھی فصل کے پھوٹنے کو بھی نہ دیکھا ہوگا۔ ابلتے ابلتے جب پانی دو انچ نیچے چلا گیا اور خشک جگہ پر سفید سفید نمک چھوڑ گیا تو بہت سوں نے یک زبان ہو کر کہا: ''نمک'' اور اس پر جھپٹ پڑے۔ ہر ایک نے باری باری انگلی مل مل کر اسے چکھا۔

''نمک ہے...... نمک۔'' پرتاپے نے پوری آواز سے چلا کر کہا۔

''ٹھہر بے کھانا نہیں۔'' سنتو کھ سنگھ اس کا بازو جھٹک کر بولا۔ ''کیا پتا کیا ہے۔''

''پر بن تو گیا۔''

''ہاں ہاں، بن تو گیا۔''

سب نوجوان کڑاہ کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور بچوں کی طرح مسرور اور مشتاق نظروں سے ابلتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں بجلی گرا ہوا درخت ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگ میں جھونک دیا گیا اور سہ پہر کی دھوپ کے باوجود شعلے، جو کڑاہ سے اوپر اٹھ رہے تھے، کسانوں کے جھکے ہوئے مضبوط ہڈیوں والے چہروں پر جھلملانے لگے۔

پانی کی سطح برابر نیچے جا رہی تھی اور وہ ہر دم گاڑھا اور گدلا ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے وہ سب خوشی کے اولیں اثر سے گنگ ہو گئے۔ پھر ایکا ایکی اٹھ کر علی پر ٹوٹ پڑے۔ سنتو کھے نے علی کو کندھوں پر اٹھا لیا اور ناچنے لگا۔ اس کے گرد تمام لڑکوں نے ناچنا اور گانا شروع کر دیا۔ بیچ بیچ میں وہ رک کر خوشی کے نعرے لگانے لگتے۔ ان میں سے ایک نے بھی شراب نہ پی رکھی تھی، لیکن ایک نامعلوم نشہ تھا جو ان کے حواس پر طاری تھا۔ ناچتے ناچتے ان میں سے کئی ایک نے تہمد نکال دیئے تھے۔ یہ وہ پاگل خوشی کا منظر تھا جو کسانوں میں کبڈی کے مقابلوں یا فصل کے موقعوں پر دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ تمام اس وقت کسانوں کے فحش عشقیہ گانے اور دلاوری کی داستانیں گا رہے تھے۔ کوئی لے سُر یا آہنگ نہ تھا، صرف ایک ترنگ تھی اور کسانوں کا ملا جلا شور! علی لمبے سکھ کے کندھوں پر بیٹھا تھا اور اس کا سیاہ رنگ خون کی یورش کی وجہ سے رگڑے ہوئے تانبے کا سا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فتح مندی کی وحشیانہ چمک تھی اور وہ بازو ہوا میں پھینک کر چیخیں مار رہا تھا۔ ایک شخص، جو اس دیوانے گروہ میں شامل نہ تھا، راول تھا۔ وہ سب سے الگ اپنی جگہ پر بیٹھا زہریلی، بدنما نظروں سے علی کو دیکھے جا رہا تھا۔

جب وہ ناچ ناچ کر نڈھال ہو گئے تو بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ پانی اب سوکھ چلا تھا۔ انہوں نے کڑاہ اتار کر نیچے رکھا اور دو لونڈے گاؤں کو دوڑا دیئے۔ گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھے اور ادھیڑ عمر کسان مٹھی مٹھی بھر اناج لے کر اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ کٹائی میں ابھی چند دن باقی تھے اور بعض کسانوں کے گھروں میں چند پاؤ اناج رہ گیا تھا۔ لیکن اس وقت انہوں نے اناج والوں سے کہا:

''ایک پاؤ اناج دے دو۔ کٹائی پر سیر بھر لے لینا۔''

''کھانے کو؟''

''نہیں، نمک کے لئے۔''

''لے لو، لے لو...... تم بس پہر بھر آ کر کٹائی کرا دینا۔'' امیر کسانوں نے کہا۔

اور اس طرح مٹھی بھر اناج کے بدلے انہوں نے محنت کا سودا کیا۔ اپنا اپنا اناج لا کر انہوں نے پھیلی ہوئی چادر پر ڈالا اور چٹکی چٹکی بھر نمک لے کر گھروں کو لوٹ آئے۔

''چلو اچھا ہوا۔ گھر میں نمک بھی نہ تھا۔'' ایک بوڑھے کسان نے نمک کو پگڑی کے کونے میں باندھتے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا ہوا'' پیچھے آتا ہوا سرخ داڑھی والا کسان بولا، یہ کھانے کے لیے نہیں ہے۔

''ایں؟''

''مجھے پرتاپے نے بتایا تھا۔''

''کیا بتایا تھا؟''

''صرف قانون توڑنے کے لیے ہے۔'' سرخ داڑھی والے نے زمین پر تھوک کر کہا۔ ''یہ اچھا نمک نہیں ہے۔''

''سؤروں نے اچھا سودا کیا ہے۔'' پہلے کسان نے ہنس کر کہا اور زور سے زمین پر تھوکا۔

جلد ہی آس پاس کے گاؤں میں خبر پہنچ گئی اور رات گئے تک دوسرے قصبوں سے لوگ آتے رہے۔ وہ میلوں میں جاتے ہوئے کسانوں کی طرح ٹولیوں میں بٹ کر آئے اور نمک کی جمی ہوئی کھردری ڈلیوں کو سروں کے گرد گھماتے ہوئے واپس لوٹے۔ جب سارا نمک ختم ہوگیا اور رات گہری ہوگئی اور وہاں کوئی بھی نہ رہا سوائے ان لڑکوں کے جنھوں نے نمک بنایا تھا تو خاموشی کے اس وقفے میں دفعتاً ان پر اپنی لاقانونیت اور جرم کا انکشاف ہوا۔ عجلت کے ساتھ اُٹھ کر انہوں نے اناج کی گٹھڑی، جس میں گیہوں، جوار، باجرہ، مکئی، سبھی کچھ تھا، باندھی اور اسے دورہ کرتی ہوئی پارٹی کے لوگوں کے پاس پہنچا دیا جو حویلی کے پچھلے برآمدے میں دیا جلائے کام کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے کڑاہ کو اٹھا کر چولہے میں اوندھا گرایا، تازہ مٹی میں اسے دفن کیا اور اوپر خشک مٹی ڈال کر زمین ہموار کر دی۔ پھر وہ اسی نامعلوم خوف کے زیرِ اثر خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔

راول اندھیرے میں درخت کی جڑ کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے کسی کام میں حصہ نہ لیا تھا۔ جب علی گروہ کو چھوڑ کر گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر مڑا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے کھیتوں کے بیچوں بیچ اس کی جانب بڑھا۔

گاؤں کا پہلا گھر ابھی دو کھیت دور تھا جب علی نے اپنے پیچھے تیز تیز قدموں کی آواز سنی۔ وہ رُک گیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں آنے جنگلی بلے کی سی پھرتی کے ساتھ اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ چند لمحے تک وہ خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر آنے والے نے زمین پر تھوکا۔

''تم آج کتے کے بچے کی طرح شور مچا رہے تھے۔ ہیں؟''

علی نے نیم تاریکی میں راول کی آواز پہچان لی۔

''تم نے آج بہت کام کیا ہے۔ تھک گئے ہوگے، جاؤ جا کر آرام کرو۔'' علی نے طنز سے کہا۔

''آج ہم میں سے ایک ہی آرام کرے گا۔'' راول نے مٹی کے ڈھیلے کو ٹھوکر ماری۔ ڈھیلا ٹوٹ گیا اور سیاہ مٹی اڑ کر علی کی ٹانگوں پر پڑی۔ اس نے ہوا میں گالی دی۔ ''میں بدلہ لینے آیا ہوں۔''

''مجھے تم سے کوئی بدلہ نہیں لینا۔''

''بزدل، حرامی۔''

''میں عورتوں کے لیے کسی سے نہیں لڑتا۔'' علی نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''گائے کے بچے، حرامی...... اپنی ماں کے لیے بھی نہیں لڑو گے؟''

علی کی رگیں آہستہ آہستہ کھنچنے لگیں۔ کئی لمحوں تک وہ آمنے سامنے کھڑے اجنبی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے کپڑے اتارے اور ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔

وہ اچھل اچھل کر، بچ بچ کر ایک دوسرے پر وار کرتے رہے۔ دونوں خالی ہاتھ تھے لیکن اپنی بہترین اور مضبوط ترین انگلی کے جوڑوں سے ایک دوسرے پر چوٹ لگا رہے تھے۔ ان کے پاؤں میں سے گرد اٹھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ ان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس خاموش اور نیم تاریک رات میں گرد وغبار کے درمیان وہ دیر تک رقابت اور دیوانگی کا ناچ ناچتے رہے حتیٰ کہ ان کے جسم گرد اور پسینے سے اَٹ گئے اور وہ منہ کھول کر ہانپنے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ علی تھکنا شروع ہوا۔ اسے ہمیشہ سے راول کی برتری کا احساس تھا لیکن اب اس نے واضح طور پر اپنی طاقت زائل ہوتی ہوئی محسوس کی اور پہلی بار اس کے دل میں نوعمری کے خوف نے سر اٹھایا۔ اپنے مقابل کو ست پا کر راول نے سیاہ درندے کی طرح ہوا میں جست بھری اور چاروں ہاتھوں پاؤں کی بھرپور کوشش سے علی کو دبوچ کو نیچے گرا لیا۔ پھر اس کے اوپر جم کر اس نے اس کی بغلوں میں گھٹنے دیئے اور گردن کو مروڑنا شروع کیا۔ علی بلبلا اٹھا۔ اس کی لمبی وحشیانہ چیخ، جو زخمی سؤر کی چیخ سے مشابہ تھی، خاموش رات میں دور تک چلی گئی۔ ساتھ والے کھیت میں سرخ داڑھی والا کسان سو رہا تھا۔ چیخ سن کر وہ اٹھا اور کاہلی سے چلتا ہوا ان کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک کمر پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد گرد کی وجہ سے کھانسنے لگا اور حلق صاف کرتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

''جنے کب پولس آجائے اور لونڈوں کو مستی آئی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

اب راول تھوڑے تھوڑے وقفوں پر اس کی گردن کو دبا رہا تھا اور علی گہری گہری کربناک مختصر چیخیں مار رہا تھا۔

''مت چلاؤ۔ حرامی۔''

علی خوفزدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔

''میں تمہیں قتل کر سکتا ہوں۔'' راول نے اطمینان سے کہا۔

''کیوں؟''

''اس کو لے کر تم ماں کی ٹانگوں میں نہیں بیٹھ سکتے۔''

''کیوں؟'' علی نے اسے باتوں میں لگانا چاہا۔

''تمہیں پتا نہیں؟'' راول نے سارا بوجھ اس کی گردن پر ڈال دیا۔

علی کے حلق سے چیخ اور گالی ایک ساتھ نکلی۔

جب راول گردن دباتے دباتے تھک گیا تو خاموش اس کے اوپر بیٹھ گیا۔ علی ذرا دیر کے بعد ہوش میں

آ کر گلے کی رگوں کو ملنے لگا۔

''تمہارے جسم سے بو آ رہی ہے۔ اٹھو۔'' پھر اس نے چالاکی سے کہا۔

''کیوں؟ میں کتا ہوں؟ بیل ہوں؟'' راول نے اس کی گردن پر بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں کتا ہی تھا۔ بیل ہی تھا۔ لو۔ میں اس کے قابل نہ تھا۔ میں کتا ہوں۔ بیل ہوں۔ لو۔''

علی تکلیف کی شدت سے پھر چیخنے لگا۔ دوسری دفعہ جب راول دم لینے کو رکا تو علی نیچے سے رو کر بولا:

''میری فصل کھڑی ہے اور میرا بھائی یہاں نہیں ہے اور تم۔''

''میں تیری فصل کی پروا نہیں کرتا۔ تیری فصل کی ماں......''

''تو کیا یہاں رہے گا، سوٗر؟ تیری فصل کو بھی چوہے کھائیں گے۔''

راول کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وار کاری پڑتا دیکھ کر علی پھر بولا: ''پولس یوں بھی آنے والی ہے۔ وہ تجھے پکڑ کر لے جائیں گے اور تیری فصل کا بھی نقصان ہوگا۔ بات کو کٹائی تک رہنے دو، پھر میں خود تم سے لڑوں گا۔ میں کوئی بزدل ہوں؟''

راول نے جواب دینے کی بجائے دونوں گھٹنوں کا بوجھ اس کی گردن پر ڈال دیا۔ علی کی چیخیں لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی گئیں اور وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔ آخر شدید اذیت کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگیا۔

راول نے الگ ہو کر کپڑے اٹھائے، پسینہ خشک کیا اور حلق صاف کر کے زور سے علی کی پیٹھ پر تھوکا۔

''ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ پھر کٹائی کے بعد سہی۔''

آہستہ آہستہ کھیتوں کی گرد بیٹھ گئی اور فضا میں رات کی صاف ہوا چلنے لگی۔ لیکن ضربات کی شدت سے علی صبح تک وہیں پڑا رہا۔

اس سے ٹھیک چوتھے روز نعیم پشاور سٹیشن پر جا اترا۔ اس اجنبی سرزمین پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلا خیال جو اس کے دل میں آیا امیر خان کا تھا، اس کا لنگڑا دوست جو کئی سال پہلے ایک مشترکہ دکھ میں اس کا ساتھی رہا تھا اور جس سے دوبارہ ملنے کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ اس وقت مصروفیت کے باوجود دفعتاً پرانی رفاقت کا احساسِ حزیں اس کے دل میں جاگا اور وہ کہ محبت کا محتاج تھا سب سے پہلے اس سے ملنے کو روانہ ہوگیا۔

امیر خان کا گاؤں پشاور کا ایک نواحی گاؤں تھا جو پتھروں کے ایک بہت بڑے ٹیلے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ جب نعیم اس ٹیلے پر چڑھا تو سارا گاؤں اس کے سامنے آگیا۔ رات پڑنے والی تھی اور پتھریلے مکانوں کے صحنوں میں کہیں کہیں دیے جل رہے تھے۔ صرف گاؤں کے ایک کونے میں بہت سی روشنی تھی جہاں دو تین مکانوں میں ننگی آگ کی مشعلیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں اور ان کی سرخ روشنی سیاہی مائل فضا میں آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی۔ وہ گاؤں ایک دوسرے مخروطی شکل کے ٹیلے پر واقع تھا۔ مکانات ٹیلے کی ڈھلانوں پر اوپر نیچے بنے ہوئے

تھے اور ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شام کے دھند لکے میں اس نے ٹیلے کے دامن میں پھیلے ہوئے سیاہ پیڑوں کے باغ دیکھے اور اس سے نیچے وادی میں ادھ کٹی فصلوں کے کھیت' اور دور سے بہتے ہوئے پانی کا شور سنا اور وہ دم بخود کھڑا رہا۔ اس نے آگے بڑھنے کی خواہش محسوس نہ کی۔ چاروں طرف پھیلتی ہوئی رات میں وہ اکیلا ٹیلے پر کھڑا دیکھتا رہا۔ سفیدی مائل آسمان کے مقابل ٹیلے کی چوٹی پر اس کی سیاہ' لمبی شبیہہ ایک برق زدہ درخت کی طرح ساکت دکھائی دے رہی تھی۔ اسے وہ گاؤں بے حد مانوس اور خوشگوار معلوم ہوا۔ اس نے یاد کرنا چاہا' لیکن اسی دم اس کے دل میں خطرے کا احساس پیدا ہوا۔ وہ ایسے دیس میں تھا جہاں آسمان کے مقابل سیاہ شبیہوں کو دیکھ کر گولی مار دی جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اترنے لگے۔

راستہ پتھروں سے اٹا ہوا اور ڈھلوان تھا۔ وہ پتھروں پر سے پھسلتا پھلانگتا اور دل میں گاؤں والوں کو کوستا ہوا اترتا رہا۔ وادی کو پار کر کے سیاہ باغوں میں سے گزرتے ہوئے نمدار ہرے پتوں کی خوشبو اس کی ناک میں داخل ہوئی اور اسے گھنے جنگلوں کی مخصوص خنکی اور سناٹے کا احساس ہوا۔ بہتے ہوئے پانی کا مسلسل شور اس کے کانوں میں آ رہا تھا لیکن پانی رستے میں کہیں بھی نہ ملا' حالانکہ اس سناٹے اور سکوت کے وقت بہتے ہوئے پانی کے کنارے کھڑا ہونا اور اسے پار کرنا اس کے جی کو اچھا لگتا۔

گاؤں میں داخل ہو کر اسے اکا دکا آدمی گلیاں اور رستے پار کرتے ہوئے ملے۔ تقریباً سبھی نے بڑی بڑی گھیر دار شلواریں پہنی ہوئی تھیں اور کندھوں پر رائفلیں لٹکا رکھی تھیں۔ ان سے پوچھ گچھ کرتا ہوا آخر وہ گاؤں کے مغربی کونے میں ان مکانوں کے آگے جا کھڑا ہوا جہاں سے نارنجی روشنی کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور اندر باہر شادی کا ہنگامہ تھا۔ یہی امیر خان کا مکان تھا۔ رنگ برنگے بھڑ کیلے لباس پہنے اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے مرد اور عورتیں اندر باہر آ جا رہے تھے۔ مکان کا احاطہ جلتی ہوئی چکنی لکڑی کی مشعلوں سے روشن تھا اور لکڑی میں سے تیل نکل نکل کر زمین پر ٹپک رہا تھا۔ جگہ جگہ دار چینی اور لونگ کی انگیٹھیاں سلگ رہی تھیں اور ان کا خوشبو دار دھواں مشعلوں کے دھوئیں سے مل کر ساری فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ احاطے کے وسط میں بہت سے لوگ جمع تھے اور ان کے درمیان ایک دبلا پتلا بڈھا کان پر ہاتھ رکھے اونچی کرخت آواز میں گا رہا تھا۔ اتنی ساری خوشی اور ہنگامہ دیکھ کر نعیم سہم گیا۔

''میں غلط وقت پر آیا ہوں۔'' اس نے سوچا۔ ''میں اس کی خوشی میں مخل ہوں گا'' وہ وہیں پر کھڑا رہا۔ وہ احاطے میں سے گزر آیا تھا اور کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ اب وہ گھر کے اندر جانے والے دروازے کے پاس اندھیرے میں اکیلا کھڑا تھا۔ آنے جانے والے اس کی طرف توجہ دیے بغیر گزر رہے تھے۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا گانے والے کی آواز کو سنتا رہا۔ گیت کے بول ناقابل فہم زبان میں تھے لیکن اس کی لے میں وہی مستی اور ترنگ تھی جو اس کے اپنے گاؤں میں میلوں اور شادیوں کے موقعوں پر گونجا کرتی تھی۔

پھر گانے والے کے گرد گھیرے میں لہر پیدا ہوئی اور امیر خان ایک بیساکھی کی مدد سے چلتا ہوا نمودار

ہوا۔ وہ منہ میں تیز تیز باتیں کرتا ہوا اندر کی جانب آرہا تھا۔ مشعل کے نیچے آکر رکا' چاروں طرف چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر چل پڑا۔ وہ اسی طرح صحت مند تھا جیسے برسوں پہلے نعیم نے اسے دیکھا تھا۔ آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ نارنجی اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ صرف اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ اس نے سرخ ریشم کا لمبا کُرتا اور سرخ پھولوں والی واسکٹ پہن رکھی تھی اور سر پر تیز نارنجی رنگ کا صافہ باندھا ہوا تھا۔ اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر نعیم آہستہ آہستہ چلتا ہوا روشنی میں آکھڑا ہوا۔

''ایں؟'' امیر خان آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرکے بڑبڑایا۔ ''بولو، تم بالکل اس کی طرح چلتے ہو۔'' پھر بیساکھی پر مینڈک کی طرح پھدک کر اس نے دو چھوٹی چھوٹی چھلانگیں بھریں حتیٰ کہ اس کی چھاتی نعیم کی چھاتی سے آلگی۔ قریب سے دیکھ کر امیر خان نے اسے پہچان لیا اور اس کا چہرہ ایک سادہ بے اختیار مسکراہٹ میں پھیل گیا۔ اس نے اچک کر نعیم کے گال میں چٹکی بھری۔ ''اہا نعیم۔ میں اندھا ہو رہا ہوں مگر تمہیں دس ہزار انسانوں اور مویشیوں کے ہجوم میں پہچان سکتا ہوں۔''

''پہچان لیا؟'' نعیم نے اپنا مضبوط بازو اس کے گرد لے جاتے ہوئے کہا۔

''اخطاہ۔ ہم کڑے وقتوں کے ساتھی ہیں۔ میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ ہم برے وقتوں کے دوست ہیں۔'' وہ اسے دبا دبا کر ٹٹولنے کے بعد کھینچتا ہوا گانے والے کے پنڈال کی طرف لے جارہا تھا۔ رستے میں اس نے اس کے سخت چوبی بازو کے حیرت سے آنکھوں کے قریب لاکر دیکھا' انگلیوں سے دبا دبا کر محسوس کیا اور اسی طرح بے اختیار ہنس پڑا۔

''اچھا ہے' اچھا ہے۔'' اس نے تعریفی انداز میں سر ہلا کر کہا۔

مجمع میں داخل ہوتے وقت اس نے مڑ کر اطلاع دی: ''میرے بیٹے کی شادی ہے۔''

''مبارک ہو۔'' نعیم نے کہا۔ وہ دونوں لوگوں کے سروں کو پھلانگتے ہوئے دائرے کے وسط میں جا کھڑے ہوئے۔

''ابے او بڈھے مینڈک' اب ٹرانا بند کر۔'' امیر خان نے گانے والے سے کہا۔ پھر پنڈال کی طرف مخاطب ہوا: ''ہم برے وقتوں کے دوست ہیں۔ صوبے دار نعیم خان۔ یہ بہادر آدمی ہے اور میرے بیٹے کی شادی میں مہمان ہوا ہے۔''

تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور نووارد سے جھک جھک کر ہاتھ ملانے کے بعد اس کے لیے راستہ چھوڑنے لگے۔ بڈھا اور اس کا مہمان سب سے اونچی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ نعیم پختگی عمر کے باوجود لال ہو رہا تھا۔ امیر خان کرخت آواز میں سننے والوں سے اپنی اور اس کی پہلی ملاقات کا قصہ بیان کر رہا تھا۔

گانے والے نے پھر گانا شروع کر دیا تھا۔ دو ایک دفعہ اس نے نعیم کے سامنے آکر گانے کی سعی کی لیکن امیر خان نے اس کے سر میں بیساکھی مار کر اسے بھگا دیا۔ پھر اس نے بیساکھی پاس بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی

پسلیوں میں چبھوئی۔

''یہ میرا بیٹا ہے، وزیر خان۔''

نوجوان اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا نوعمر لڑکا تھا اور باپ کی نسبت زیادہ خوبصورت تھا۔ وہ دولہوں کے رنگین لباس میں تھا اور ہاتھ میں بہت سے پھولوں کے ہار لٹکائے ہوئے تھا۔ وہ اکھڑ پن سے کھڑا اپنی بیباک آنکھیں نعیم کی آنکھوں میں ڈالے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر نوعمری اور کنوارپنے کی دمک تھی۔ نعیم نے اسے رشک سے دیکھا' جیسے ایک ادھیڑ عمر کا انسان اپنی گزری ہوئی خوبصورت جوانی کی جھلک ہر نوجوان میں دیکھتا ہے۔

''کیا کام کرتا ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''فوج میں ہے۔''

''خوبصورت جوان ہے۔''

''ہاں ہاں۔'' امیر خان ہنسا۔ ''اس نے ابھی جنگ نہیں دیکھی۔'' ''ابھی اس کے گالوں پر خون ہے۔ تمہیں کراس ملا تھا؟''

نعیم خاموش رہا۔

''تم کو توقع تھی نا۔ تم نے بتایا تھا۔''

''نہیں۔'' نعیم نے جھوٹ بولا۔

''آہ۔ ہا۔'' امیر خان نے تأسف سے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ''بہادروں کی کوئی قدر نہیں، کوئی قدر نہیں۔''

''تم اپنے بیٹے کی شادی کہاں کر رہے ہو؟'

''ساتھ والے گاؤں میں۔ اپنی ہی برادری ہے۔ ابھی اس میدان میں مقابلہ ہوگا۔'' اس نے مغربی سمت میں اشارہ کر کے بتایا۔

''مقابلہ؟''

''ہاں۔''

کچھ دیر تک وہ وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر امیر خان اٹھ کر اندر چلا گیا۔ نعیم کو میزبانوں نے جو تمبا کو پلایا سخت کڑوا تھا اور اس نے اس کا حلق پکڑ لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بارات روانہ ہوئی۔ آگے آگے مشعلوں کا جلوس تھا۔ اس کے پیچھے دولہا گھوڑے کی باگ تھامے پیدل چل رہا تھا۔ پھر خاموش باراتیوں کا ہجوم۔ ان کے چہرے تنے ہوئے تھے اور ان کے کندھوں پر رائفلیں خاموش تھیں۔ صرف ایک اکیلے ڈھول کی دھما دھم خاموش رات میں گونج رہی تھی۔ سب سے آخر میں امیر خان نعیم کا بازو تھامے بیساکھی پر اچھلتا ہوا چل رہا تھا اور آہستہ آہستہ باتیں کرتا جا رہا تھا: ''مقابلے سے پہلے ہم کوئی

فائر نہیں کر سکتے۔ نہ باجے بجا سکتے ہیں۔ مقابلے سے پہلے دولہا گھوڑے پر سوار بھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ رحم کرے۔ اللہ رحم کرے۔''

تنگ پتھریلے راستوں پر چکر لگاتے ہوئے جب وہ گاؤں کی مغربی سمت میں نکلے تو یکایک ان کے سامنے ایک وسیع میدان آ گیا جو اسی طرح کی مشعلوں سے روشن ہو رہا تھا اور بہت سے لوگ خاموشی سے چل پھر رہے تھے۔ ایک بہت بڑی مشعل کے نیچے ایک چھوٹا سا خیمہ نصب تھا۔ اس سے پرے ایک قطار میں آگ کے الاؤ جل رہے تھے جن پر مسلم دنبے گھمائے جا رہے تھے۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سارے میدان میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کی چربی پگھل پگھل کر آگ میں گر رہی تھی اور چرچرا کر جل رہی تھی۔ میدان کے وسط میں ایک اکلوتا ڈھولچی اسی لَے پر ڈھول بجا رہا تھا۔

باراتیوں کو نمودار ہوتے دیکھ کر ان کی حرکت رک گئی اور سب لوگ خیمے کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ دونوں ڈھولچی ایک دوسرے کو مقابل پا کر جوش میں آ گئے اور ان کے ہاتھ مشین کی طرح چلنے لگے۔ میدان کے تین طرف پہاڑیاں تھیں اور آسمان تاریکی تھا۔ فضا میں کوئی انسانی آواز نہ تھی۔ صرف ڈھول کی دبنگ اور گرما دینے والی آواز پُرسکوت میدان میں گونج رہی تھی اور ہر دم تیز ہوتی جا رہی تھی۔ چند لمحے کے لیے نعیم کو محسوس ہوا کہ یہ کٹائی کے ڈھول کی آواز تھی اور خاموشی سے کام کرتے ہوئے کسانوں کو اُکسا رہی تھی۔ کڑے وقتوں میں ڈھول کی آواز کس قدر بے رحم اور پاگل کر دینے والی ہوتی ہے' اس نے سوچا۔

باراتی میدان کے اس کنارے پر رک گئے۔ امیر خان اس کا بازو چھوڑ کر آگے بڑھا اور اچھل کر چلتا ہوا میدان کے وسط میں جا کھڑا ہوا۔ سامنے سے اس کا ہم عمر' ایک بھاری جسم والا بڈھا نکلا اور آ کر اس سے ملا۔ چند لمحے ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے بعد دونوں اپنی اپنی جگہ پر لوٹ آئے۔ اب دونوں مجمعے خاموشی سے آمنے سامنے کھڑے تھے اور مشعلوں کی روشنی ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ پھر خیمے کا پردہ ہلا اور گول چہرے اور میانے قد کی ایک لڑکی سیاہ ریشم کا بھاری لباس پہنے' سر پر تیز سرخ رنگ کا رومال باندھے نکلی اور آ کر مشعل کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ سیاہ لباس اور سرخ رومال میں اس کی بے حد سفید رنگت چمک رہی تھی اور اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ امیر خان کے قریب سے اس کا بیٹا باراتیوں کے مجمعے سے الگ ہوا اور جمے ہوئے قدموں سے جا کر لڑکی سے تیس قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ نوجوان دولہا کو سامنے پا کر لڑکی نے جلد جلد چند بار اپنی سیاہ آنکھیں جھپکیں' پھر نظریں جھکا لیں۔ ایک بہت لمبے قد کا پٹھان چار ماہ کے پلے ہوئے گائے کے بچھڑے کو اٹھائے ہوئے لایا اور اسے لڑکی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ لڑکی خاموشی کھڑی بچھڑے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر بچھڑے کی پشت پر رکھا اور رکھے رہی۔ اس کا چہرہ رنگ بدل رہا تھا۔ دفعتاً اس نے جھجک کر چاروں طرف دیکھا اور جھک کر بچھڑے کی کمر کے گرد بازو ڈالے۔ بچھڑے کا پیٹ اس کے بازوؤں کے حلقے سے باہر تھا۔ پھر اس نے اس کی ٹانگوں کے گرد بازو ڈال کر اسے اٹھانا چاہا لیکن چار ماہ کا چوپایہ اس کے لیے بہت بوجھل ثابت ہوا۔ وہ سیدھی کھڑی ہو گئی اور دوبارہ

جھجک کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی وحشت تھی۔ ڈھول کی دھمک تیز تر ہوگئی۔ لڑکی نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیکا اور سر نیہوڑا کر بچھڑے کے نیچے سے دوسری طرف نکالا' اس طرح کہ بچھڑے کا پیٹ اس کی گردن کی پشت پر آگیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے چوپائے کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں پکڑیں اور اسے گردن اور شانوں پر لے کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب رکھا تھا اور اس کا چہرہ بیر بہوٹی ہو رہا تھا۔ اس کے لباس میں ہلکی سی لرزش تھی۔

ایک غیر متزلزل ارادے کے ساتھ نوجوان نے رائفل پشت پر سے اتاری اور بچھڑے کے سر پر نظریں جمائے آہستہ آہستہ اسے کندھے تک لے گیا۔ کئی لمحے تک وہ شست باندھے کھڑا رہا۔ نعیم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ شست باندھے ہوئے وہ ایک پتھر کا مجسمہ نظر آ رہا تھا جس میں ذرا بھی جنبش نہ تھی۔ لیکن اس نے لبلبی کو نہ چھوا۔ میدان میں موجود ہر شخص کے اعصاب کھنچے ہوئے تھے اور فضا میں کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ ڈھول کی تال انتہائی تیزی کو جا پہنچی تھی۔ اچانک اس نے رائفل نیچی کی' اس کا دستہ زمین پر ٹکایا اور انگلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ امیر خان کے منہ سے ایک گالی نکلی اور اس نے انتہائی غیض کی حالت میں بیساکھی زمین پر ماری۔ نوجوان نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی اور غصہ تھا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا' رائفل اٹھا کر شست باندھی اور گولی چلا دی۔ فائر کی خشک' پٹاخے دار آواز دور تک پہاڑیوں میں گونجتی چلی گئی۔ بچھڑا لڑکی کے شانوں پر تڑپ رہا تھا اور وہ انتہائی کوشش کے ساتھ اس کی ٹانگوں کو بازوؤں میں جکڑے اسے قابو میں کیے ہوئے تھی۔ اب سر سے پاؤں تک اس کے سارے لباس کی لرزش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی طرح کپکپاتی ہوئی ٹانگوں پر اس نے چلنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ پیر جما جما کر' مرتے ہوئے' جدوجہد کرتے ہوئے چوپائے کو جکڑے ہوئے' اٹھائے ہوئے' آدھے راستے تک پہنچتے پہنچتے وہ تھک کر رک گئی۔ اس کے چہرے سے سرخی غائب ہونے لگی۔ لیکن جلد ہی ٹانگیں چلاتے ہوئے بچھڑے کی گردن لٹک گئی اور وہ اس کے شانوں پر بے حس ہوگیا۔ اس کے سر میں سے خون' جو اب تک پتلی سی دھار کی شکل میں بہہ رہا تھا' قطرہ قطرہ کر کے ٹپکنے لگا۔ لڑکی نے پھر چلنا شروع کیا۔

دولہا کے سامنے پہنچ کر اس نے آہستہ سے بچھڑے کو زمین پر رکھا اور اس کے نیچے سے سر نکال کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ زرد اور پُر جلال تھا۔ ماتھوں پر پسینے کے قطرے لیے دونوں بے خوف نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے آمنے سامنے کھڑے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو فتح کر لیا تھا۔

مسرت کے پُر جوش نعروں' رائفل کے ان گنت فائروں اور آسمان پر بارود کی چمک کے درمیان نعیم جھلا کر منہ میں بولا:

''بیچاری لڑکی۔ لاحول ولا۔''

''ہنہ' بیچاری لڑکی۔'' امیر خان نے غصے سے جواب دیا۔ ''اگر نشانہ خطا ہو جاتا یا ادھر اُدھر لگ جاتا تو میرے لڑکے کو وہیں پر ڈھیر کر دیتے' کافر!''

''لاحول ولاقوۃ۔'' نعیم نے دہرایا۔

نکاح کے بعد دعوت شروع ہوئی۔ آگ کے الاؤ کے گرد دونوں قبیلے زمین پر بیٹھ گئے۔ رائفل کے اکا دُکا فائروں اور نفیریوں کی آواز چاروں طرف پہاڑوں میں گونج رہی تھی۔ ڈھول خاموش تھا' کڑا وقت گزر چکا تھا۔ بھاری جسم والا بڈھا' جو لڑکی کا باپ تھا' تین آدمیوں کی مدد سے تھال میں بھنا ہوا مسلم دنبہ اٹھائے ہوئے لایا اور امیر خان کے سامنے رکھ دیا۔ امیر خان نے تھال میں سے چمکتی ہوئی چھری اٹھا کر نعیم کی طرف بڑھا دی۔

میرا مہمان میری طرف سے پہل کرے گا۔ اس نے کہا۔ دوسرا بڈھا خوشدلی سے ہنسا۔

نعیم نے جھجکتے ہوئے' چھری کی نوک بھنے ہوئے سرخ' چکنے دنبے پر لگائی۔ گوشت گل چکا تھا لیکن ہڈی سخت تھی۔ وہ لال ہو ہو کر اور دل میں کوس کوس کر اس کی ٹانگ کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا کہ امیر خان باتیں کرتے کرتے رک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''اررر۔ یہ۔ یہاں۔'' اس نے نعیم کا ہاتھ پکڑ کر چھری خوشبودار جانور کے پیٹ سے لگائی۔ نعیم نے ایک جھٹکے سے ٹانکے لگا ہوا پیٹ چیر دیا۔ لونگ' دارچینی اور الائچی میں پکے ہوئے چاولوں کی مقوی' اشتہا آور خوشبو کا جھونکا آیا اور بھوکے مہمانوں کے دماغوں کو تر کر گیا۔ سفید' کنواری چربی میں ترتراتے ہوئے سرخ چاول طشت میں گرنے لگے۔ امیر خان چھری پکڑ کر ماہرفن کی طرح خستہ گوشت کو ہڈیوں سے علیحدہ کرنے لگا۔ جب وہ اس سے فارغ ہوا تو سب انگلیاں چاولوں میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگے۔ امیر خان مزے لے لے کر چاول کھا رہا تھا اور اپنے نئے عزیز کو اپنی اور نعیم کی پہلی ملاقات کا قصہ سنا رہا تھا جب اس کے سر پر کرخت باؤلی ہنسی کی آواز گونجی۔

''ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ ہاہا۔'' یہ ایک لمبے قد کا دبلا پتلا بڈھا تھا جس کی سرخ داڑھی بے تحاشا پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دنبے کی ایک ٹانگ چباتا ہوا مسلسل ہنس رہا تھا۔ کھانے اور ہنسنے کے مشترکہ فعل سے اس کی باچھوں میں رال بہہ رہی تھی اور گوشت کے ریزے اس کی داڑھی میں اٹکے ہوئے تھے۔

''اے او بڈھے۔ بڈھے دولہا کے جوان باپ' او۔'' وہ چبائی ہوئی لمبی ہڈی امیر خان کی ناک میں ٹھونس کر بولا: ''امیر خان' جو کسی دوسرے موقع پر اس کو بیساکھی کے ساتھ پیٹتا' پیچھے ہٹتا ہوا خوشدلی سے ہنسا۔ بڈھا نشے کے زیر اثر تھا۔ ''اررر ہاہاہاہاہا۔'' جوان دولہا کے بڈھے باپ' جب تیرے لڑکے کا نکاح ہو چکا تو میں نے پوچھا: 'دنبہ کھاؤ گے؟' بولا 'نہیں' میں نے کہا۔ 'ارے او بیوقوف باپ کے بیٹے' قہوہ تو پی لے......' ہی ہی ہی ہاہاہاہا۔ پھر وہ دلہن کو اُڑا کر لے گیا۔ 'اڑا کر لے گیا۔ ہاہاہا' لے گیا لے گیا۔''

امیر خان اور اس کا نیا رشتہ دار خوش اخلاقی سے ہنسے۔ لمبا بڈھا آسمان کی طرف منہ اٹھا کر قہقہے لگاتا اور ہڈی کو سر کے گرد گھماتا ہوا آگے نکل گیا۔ جب وہ ان کی آواز کی حد سے باہر چلا گیا تو دونوں نے اس کو برا بھلا کہا اور ناکارہ نشئی کے نام سے یاد کیا۔

کھانا ختم کر کے وہ قہوہ پینے لگے۔ قہوہ کسیلا اور خوشبودار تھا لیکن اس میں بھنے ہوئے گوشت کو ہضم کرنے

کی بے پناہ قوت تھی۔ الاؤ میں دیر تک جلنے والی چکنی لکڑیاں ڈالی جارہی تھیں تاکہ شادی کی آگ تمام رات روشن رہے۔ جب قہوے کا دوسرا دور شروع ہوا تو دو نوجوان اٹھ کر الاؤ کے گرد رقص کرنے لگے۔ انہوں نے شوخ رنگوں کے لمبے گھیردار کُرتے اور شلواریں پہن رکھی تھیں اور ان کی کمروں سے کس کر پٹکے بندھے ہوئے تھے جن سے ننگی تلواریں لٹک رہی تھیں۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھینک کر اور چھلانگیں لگا لگا کر رقص کر رہے تھے۔ چند چکروں کے بعد وہ سر کو ایک تیز اور مختصر جھٹکا دیتے جس سے ان کے لمبے سیاہ بال آنکھوں پر آگرتے۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجاتے اور اسی طرح کے دوسرے جھٹکے کے ساتھ بال پیچھے پھینک دیتے۔ پھر تالی اور چکر۔ ان کے گھیردار لباس اور بال گول دائرے میں لہرا رہے تھے۔ نفیریوں کی نازک اور سرور انگیز موسیقی کی دھن پر ان کا رقص تیز تر ہوتا جارہا تھا۔ آگ کی روشنی میں ان کے چہرے دھک رہے تھے یہ قبائلیوں کا بے ہنگم ناچ تھا۔ بے پناہ جوش اور ولولے کا ناچ' جس سے ایک وحشیانہ' بے باگ قوت اور جذبے کا اظہار ہوتا تھا۔

رقص کی انتہائی تیزی میں آکر دونوں نے کمر سے تلواریں کھینچ لیں۔ چمکدار دھات آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی اور ہوا میں ان کی تیز کاٹ سے سائیں سائیں کی آواز پیدا ہونے لگی۔ فضا میں وحشیانہ تاثر بڑھتا جارہا تھا۔ یہ ننگی طاقت اور خوشی کا' بنیادی انسانی خواہش کا رقص تھا۔ انتہائی تیزی سے چاروں طرف ہوا میں بجلی کی طرح کوندتی ہوئی تلواریں گھماتے ہوئے' غیر انسانی آواز میں لمبی لمبی چیخیں مارتے ہوئے' غیض وغضب کی حالت میں ایک دوسرے کو للکارتے اور مقابلے کی دعوت دیتے ہوئے اچانک ان کی تلواریں ٹکرائیں اور وہ لڑنے لگے۔

اب یہ رقص نہ تھا' لڑائی تھی۔ دائرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آوازوں کا شور ایک دم تھم گیا۔ یہ نظارہ ان کے لیے نیا نہ تھا۔ نوجوان خون کے جوش میں اکثر' بلا وجہ طور پر' ایسا ہو جاتا تھا۔ بوڑھوں کے اشاروں پر چند ادھیڑ عمر کے مضبوط پٹھانوں نے اٹھ کر ناچنے والوں کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ اپنی پوری قوت اور فن کے ساتھ دانت پیس پیس کر ایک دوسرے پر ضرب لگانے کی کوشش کررہے تھے اور ان کی آنکھوں سے نشے کے شعلے نکل رہے تھے۔ گھیرے والوں نے جب موقع دیکھا تو دونوں کی کمروں میں ہاتھ ڈال کر جدا جدا کر کے لے گئے اور ان کے ہاتھوں سے تلواریں چھین لیں۔ دور تک وہ دونوں پلٹ پلٹ کر اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر جھپٹنے کی کوشش کرتے رہے۔

پھر دونوں قبیلے گلے ملے اور تحائف تقسیم ہوئے۔ آدھی رات کے بعد دونوں قبیلے جدا ہو کر ڈھول نفیریوں اور فائروں کے شور میں اپنے اپنے گاؤں کو لوٹ گئے۔

حجرے میں پہنچ کر نعیم تھکاوٹ اور ادھ پکے گوشت کے خمار میں جلد ہی سو گیا۔ صبح میں ابھی بہت دیر تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ مکان کے اندر مدہم سی روشنی ہورہی تھی اور انسانی آوازوں اور گھوڑوں کے ہنہنانے کا ملا جلا شور اٹھ رہا تھا۔ امیر خان کی چارپائی خالی تھی۔ نعیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک سایہ مکان میں سے اچھلتا ہوا برآمد ہوا۔ اندھیرے میں نعیم نے امیر خان کو پہچان لیا۔ وہ چپکے سے آکر بستر پر لیٹ گیا۔

''کیا بات ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''وزیر خان۔ اسے یونٹ سے بلاوا آیا ہے۔'' امیر خان نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

''ابھی؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

امیر خان خاموش رہا۔ نعیم کو فوج کی ملازمت کی پرانی تکلیف دہ یاد آئی اور اس نے دل میں گالی دی۔

''چلا گیا؟''

''پتا نہیں۔ میں چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ شادی کی رات میں اس کا جانا پسند نہیں کرتا۔'' اپنے دکھ کو چھپانے کے لیے امیر خان نے سختی سے جواب دیا۔

نعیم پر پھر خمار چھانے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب پتھریلی ڈھلانوں پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پیدا ہوئی اور دور تک چلی گئی تو اس کے دل میں جانے والے کے لیے افسوس پیدا ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھا۔ امیر خان سیدھا لیٹا بے خواب آنکھوں سے چھت کو تکے جا رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد امیر خان نے بستر پر بازو پھیلا کر پریشان آواز میں دو دفعہ پکارا۔ ''نعیم، نعیم۔'' وہ اندر سے ہل چکا تھا۔ نعیم پر نیند طاری تھی۔

بہت سفید رنگت اور براؤن بالوں والا ایک شخص جس نے ہاتھ کے کاتے ہوئے کھدر کا لباس پہن رکھا تھا' بازار کے عین وسط میں چبوترے پر کھڑا کھدر کی ایک سفید پٹی کو سر کے گرد گھما رہا تھا۔

''نمک۔ نمک۔ نمک۔'' اس کے اردگرد سے آوازیں اٹھیں۔

چبوترہ ایک سٹیج کی شکل کا تھا جو لکڑی کے کریٹوں اور بکسوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اور ٹاٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس پر کھڑا ہوا شخص ایسے لوگوں میں سے تھا جن کی عمر کا اندازہ آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا' پھر بھی وہ نوجوانوں میں شمار نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کا چہرہ قدرے لمبوترا اور نقش باریک تھے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کی جلد بیشمار باریک باریک تلوں سے بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بادامی تھا۔

ایک دفعہ بولتے بولتے اس نے کھدر کی پٹی تیزی سے سر کے گرد گھمائی اور نمک کا نعرہ لگایا۔ اس کے گرد کھڑے ہزاروں کے مجمعے میں سے شور بلند ہوا۔ یہ نمک خاصیت میں روشن پور والے نمک سے بہتر اور قابل خورد تھا۔ لیکن شاید زندگی میں ایک دفعہ' اتنے اچھے' اتنے معمولی نمک کو دیکھ کر کسی کے دل میں اسے کھانے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ وہ مقدس ہاتھوں کا تحفہ تھا۔

رنگوں کے شیدائی وہ لوگ شادی کے بھڑکیلے کپڑے پہنے سڑکوں پر اور گلیوں میں ایک ہی سمت میں رواں تھے' جدھر وہ کھدر پوش چبوترے پر کھڑا تھا۔ نوجوانوں کی آنکھیں سرمئی اور مسوڑھے کڑوے درخت کی چھال سے

عنابی ہو رہے تھے اور بوڑھوں نے داڑھیوں پر مکھن مل رکھا تھا۔ اونچی، تیکھی ناک، سفید رنگت اور عقابی نظروں والے ان مردوں نے جو کڑی تربیتوں میں سے گزر کر آ رہے تھے، آج آخری اعلان سن کر اپنے اپنے کاروبار بند کر دیئے تھے اور اس وقت قانون شکنی کا قدیم جبلی جذبہ دلوں میں لیے راستوں پر اِدھر اُدھر تھوکتے اور نسوار کی ڈبیوں کے شیشوں میں دیکھ کر داڑھیاں سنوارتے ہوئے قانون شکنی کے منظر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

مرکز کے گرد پولیس کی بھاری تعداد تھی۔ جلسے میں جانے والے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے غرور اور نفرت سے ان کی طرف دیکھتے اور اونچی کرخت آوازوں میں قہقہے لگا رہے تھے۔ پولیس والے ان کی نظروں سے بچنے کے لیے اوپر اوپر دیکھ رہے تھے۔ جب آخری بار کھدر پوش نے پٹی کو تیزی سے گھمایا اور ایڑیوں پر چاروں طرف گھوما تو ہجوم کا دبا دبا شور دفعتاً پھٹ پڑا اور سینکڑوں رائفلیں ہوا میں اچھالی گئیں جن کی دھات نے دھوپ میں خیرہ کن چمک پیدا کی۔ یکا یک ایک دوسرا کھدر پوش نوجوان، جو غیر معمولی لمبے قد اور ڈیل ڈول کا آدمی تھا، کود کر چبوترے پر آ چڑھا۔ اس نے دونوں بازو ہوا میں پھیلائے اور پھرکی کی طرح پاؤں پر گھومنے لگا۔

''ایک فائر نہ ہو۔ ایک بھی فائر۔'' وہ چلایا۔

جب وہ رکا تو اس کی آنکھوں سے ملامت ٹپک رہی تھی اور ہونٹ کچھ کہنے کے لیے بیتابی سے کانپ رہے تھے۔ وہ اسی طرح بازو پھیلائے مجمع کو دیکھتا ہوا کھڑا رہا۔ رائفلیں جہاں تھیں وہیں پر رک گئیں اور ہزاروں انسانوں کے مجمع پر سکوت چھا گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ بازو نیچے گرا دیئے۔

''کیا ہے؟ کیا مطلب ہے؟'' وہ چیخا۔ ''انہیں گھر رکھ آؤ۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟ انہیں دیکھو۔'' اس نے ہاتھ لمبا کر کے پولیس کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان سے لڑنا چاہتے ہو۔ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا، ہیں؟ ایک بھی جان ضائع نہ ہو۔ ایک بھی جان''۔ انتہائی غصے میں رک رک کر بات مکمل کرنے کے بعد وہ ملامت بری نظروں سے دیکھتا ہوا چبوترے سے اتر گیا۔ کھسیائے ہوئے مجمع میں دبے غصے کی دھیمی ہموار آوازیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئیں۔

دوسرے کھدر پوش نے پٹی میں باندھی ہوئی نمک کی ڈلی کو ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

''کل شراب کی دکانوں پر پکٹنگ ہوگی۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔ مجمع آہستہ آہستہ منتشر ہونا شروع ہوا۔

اس رات پشاور شہر میں نمک بنانے والے بہت سے والنٹیئروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نعیم اس وقت امیر خان کے گاؤں میں سو رہا تھا۔ اگلی صبح جب وہ شہر آ رہا تھا تو اسے پکڑ لیا گیا۔ پولیس کی سیاہ وین بازار قصہ خوانی میں کابلی تھانہ کے سامنے آ کر رکی۔ تھوڑی دیر کے بعد نعیم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حوالات میں بیٹھا تھا۔

دوپہر سے پہلے پہلے قصہ خوانی بازار شہریوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ وہ سوتے ہوئے اٹھ کر چلے آئے تھے۔ ان کی داڑھیاں بکھری ہوئی اور گرد آلود تھیں اور کپڑے میلے کچیلے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند اور دماغوں میں غصہ

بھرا ہوا تھا کیونکہ وہ اپنی بندوقیں پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اس وقت اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔ آج بھی وہ بازار کے فرش پر اِدھر اُدھر تھوک رہے تھے اور ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے تھانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

تھانے کے گرد دور دور تک پولیس کا پہرہ تھا۔ وہ زیادہ تر پٹھان تھے اور پچھلے دن کی طرح آج بھی ان کے ساتھ آنکھیں ملانے سے احتراز کر رہے تھے، لیکن مستعدی سے اپنی جگہوں پر کھڑے سنگینوں اور آہنی زنجیروں کی مدد سے ہجوم کو روکے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر اچھلتے کودتے اور لڑکھڑاتے ہوئے ہجوم میں سے دبی دبی غراہٹ ابھرتی جو ایک مستقل غصیلی چنگھاڑ کی آواز اختیار کر لیتی، کہیں کہیں سے اکا دُکا آوازیں آتیں۔ ''چھوڑ دو...... چھوڑ دو'' پھر خاموشی چھا جاتی۔ بہت آہستہ آہستہ پولیس کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ کھلے موسم کے باوجود بے شمار انسانی جسموں کی رگڑ سے دن میں گرمی پیدا ہو گئی تھی۔ سورج ابھی نصف النہار پر نہ پہنچا تھا۔

پھر بھاری مشینوں کی دھیمی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک طرف سے چند آرمرڈ کاریں بازار میں داخل ہوئیں۔ ان کی بتیوں پر سیاہ غلاف پڑے ہوئے تھے اور زندگی کا کوئی نشان باقی نہ چھوڑا گیا تھا۔ سیاہ لوہے کے وہ مہیب، اندھے جانور پوری رفتار سے ہجوم کے ساتھ ٹکرائے اور سست رفتار پٹھانوں کو کچلتے ہوئے آگے نکل گئے۔ دہشت زدہ شہری بازار چھوڑ کر گندے پانی کی نالیوں میں اور دکانوں کے تختوں کے نیچے گھسنے لگے۔ جو اس پر بھی بچ گئے وہ بند دکانوں کے تالے توڑ کر اندر چھپ گئے۔ پل کے پل میں بازار بے قابو شہریوں کے مجمع سے خالی ہو گیا۔ بکتر بند گاڑیوں نے تھانے کے سامنے رک کر پوزیشن لے لی۔ ان کے درمیان سڑک خالی تھی اور چند کچلے ہوئے انسانی جسم دور دور پڑے تھے۔ وہ پٹیوں پر سے، ٹانگوں پر سے اور سینوں پر سے، جہاں جہاں سے بکتر بند گاڑیوں کے پہیے گزرے تھے، تین تین فٹ زمین پر لیپ ہو چکے تھے اور ان کی سفید آنکھیں اور زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آناً فاناً موت ان کے چہروں پر حیرانی کا تاثر چھوڑ گئی تھی۔

''مر چکا ہے۔'' کالی پگڑی والے پٹھان نے سر نالی میں نیچا کرتے ہوئے کہا۔

وہ جسم بہت سی نگاہوں کا مرکز تھا۔ گاڑی اس کے پیٹ پر سے گزری چلی گئی تھی اور باہر پڑی ہوئی ریزہ ریزہ انتڑیوں کے ڈھیر میں سے دودھیا رنگ کا سیال بہہ رہا تھا۔ جس میں خون کی دھاریاں تھیں اور ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے جان تھا لیکن آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور حلق سے ایک مردہ کراہ نکل رہی تھی۔ دکان کے تختے کے نیچے نالی میں چھپے ہوئے چند پٹھان کان لگا کر اس کی آواز سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

''نہیں ہل رہا ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''مر چکا ہے۔'' پہلا درشتی سے بولا۔ ''تم نے ذبح کیا ہوا گوشت دیکھا ہے جو پھڑکتا ہے؟''

''آواز سن رہے ہو؟''

پہلا سنی ان سنی کر کے، تاسف سے سر ہلانے لگا۔ ''مر چکا ہے۔ کتے کی طرح...... کتے کی طرح۔''

''گولی مار دوں؟'' دوسرے نے کہا۔ ''میرے پاس پستول ہے۔''

پہلے نے پریشان نگاہوں سے سامنے دیکھا۔ پھر دوسرے نے دیکھا۔ کچھ دیر تک دونوں نالی میں سے آنکھیں نکالے سامنے سے گزرتے ہوئے فوجیوں کو دیکھتے رہے۔

''خود بخود مر جائے گا۔'' پہلے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ خود بخود مر جائے گا۔'' کچھ دیر کے بعد دوسرے نے دہرایا۔

سامنے فوجیوں کے دستے گزر رہے تھے۔ وہ مختلف جگہوں پر رک کر پوزیشن لے رہے تھے۔ پولیس والے اب پیچھے ہٹ کر تھانے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ بازار خالی تھا' لیکن ان دیکھی قوت سے پھٹا پڑ رہا تھا' جیسے منہ بند کیتلی' جس میں پانی آہستہ شور کے ساتھ ابلتا ہے۔

دفعتاً مغربی سرے پر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ ایک بکتر بند گاڑی کا پٹرول جل اٹھا۔ پھر اس میں پڑا ہوا میگزین پھٹنے لگا۔ یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے' گاڑی کی چھت پھٹ گئی' اس میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں کے ٹکڑے دور دور تک اڑ گئے اور سیاہ دھوئیں کے بادل آسمان کو اٹھنے لگے۔ بارود اور جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بو بازار میں پھیل گئی۔

گاڑی کے نیچے ایک پٹھان کا سر نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ باہر آنے لگا۔ اس کا چہرہ موت کی اذیت سے بگڑ چکا تھا لیکن وہ اندھا دھند زمین پر بازو چلاتا ہوا سرک رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد وہ باہر آیا۔ کمر سے نیچے اس کا دھڑ غائب تھا' اڑ چکا تھا۔

''الٰہی...... ابھی تک زندہ ہے۔'' کسی نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

نالیوں میں' تختوں کے نیچے اور دکانوں کے دروازوں کے پیچھے چھپے ہوئے پٹھانوں نے اس طرف سے نظریں پھیر لیں۔

بارود کے دھماکوں سے شہریوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دھکم پیل میں ایک ننگے سر کا نوجوان پٹھان' جس کے پٹے آنکھوں پر بکھرے ہوئے تھے' باہر اچھل پڑا۔ اس نے واپس نالی میں جانا چاہا لیکن وہاں ایک چوہے کی جگہ بھی نہ تھی۔ جھکے جھکے اس نے بازار پار کیا اور تختے کے نیچے گھسنا چاہا۔ اس طرف سے ایک زوردار دھکا پڑا اور ساتھ ہی کسی نے کرخت آواز میں خدا کی قسم کھا کر گالی دی۔ وہ پلٹ آیا۔ بازار کے درمیان ایک لمبے انگریز فوجی نے دانت پیس کر پہلو سے ریوالور نوچا اور ایک فٹ کے فاصلے سے گولی چلا دی۔ گولی اس کی گردن میں لگی۔ گردن کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہ جھکا حتیٰ کہ اس کے گھٹنے اور ماتھا زمین پر لگ گئے اور انگلیوں کے درمیان سے خون باہر آنے لگا۔ کئی لوگ اچھل کر پناہ گاہوں میں سے نکل پڑے۔

''فائر......'' ایک آنکھ والے کیپٹن وڈ نے چیخ کر حکم دیا۔

فوجی دستے کی پہلی قطار بے حرکت کھڑی رہی۔ کانا کیپٹن ایک لحظے کو متعجب ہوا' پھر اس نے آنکھیں سکیڑیں۔ ''گڑھوالی رائفلز رجمنٹ' کمپنی نمبر...... فائر...... فائر۔'' وہ غصے سے لرز اٹھا۔ گڑھوالی رائفلز کا دستہ اسی

طرح کھڑا تھا۔ چند لحظے تک افسر اور ماتحت ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر قطار کے آخیر پر ایک سپاہی نے منہ کھولا۔ وہ بھاری سانولے چہرے والا شخص تھا جس نے ٹوپی آنکھوں پر کھینچ رکھی تھی۔ اس نے لب ہلائے بغیر' سامنے دیکھتے ہوئے غیر جذباتی آواز میں کہا:

''وہ نہتے ہیں۔''

''میں حکم دیتا ہوں گولی چلاؤ۔'' کیپٹن وڈ پاگلوں کی طرح چیخا۔''فائر......''

گڑھوالی دستے کے ہتھیار منجمد تھے۔ ان کے چہرے بے رنگ پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے ہونٹ سفید اور بھنچے ہوئے تھے اور ایک سپاہی کے دل میں نہتے' بے بس ہجوم پر حملہ کرنے سے جو تنفر ہوتا ہے ان کے چہروں پر رقم تھا۔ انگریز افسر نے اس ان لکھی عبارت کو صاف طور پر پڑھ لیا۔

انتہائی کوشش سے اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور دبی ہوئی' گہری آواز میں بولا: ''جنہوں نے حکم عدولی کی ہے باہر آ جائیں۔''

قطار میں سے چودہ سپاہی ایک قدم آگے نکل آئے۔ ایک سرے پر بھاری سانولے چہرے والا سپاہی اور دوسرے پر لمبے دبلے پتلے جسم والا خوبصورت وزیر خان تھا۔

''انہیں گرفتار کرلو۔'' کیپٹن نے حکم دیا۔ پچھلے دستے نے بڑھ کر ان کے ہتھیار لے لئے اور رائفلوں کے آگے لگا کر انہیں باہر لے آئے۔ قیدیوں کے چہروں پر رنگ جھلک آیا تھا اور وہ قدم ملائے بغیر لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے۔

''فائر...... فائر...... فائر۔''

پچھلے دستے آگے آئے اور گولی چلنی شروع ہوگئی۔ اندھا دھند فائرنگ میں نالیوں اور تختوں کے نیچے چھپے ہوئے شہری چوہوں کی طرح نکل کر بھاگے اور ایک ایک کرکے گرنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے بازار مرتے ہوئے' کپکپاتے ہوئے اور زمین پر ایڑیاں مارتے ہوئے انسانوں سے اٹ گیا۔

حوالات کے دروازے کی سلاخوں میں سے نعیم نے بازار کے اس حصے میں' جو اسے دکھائی دے رہا تھا' بھاگتے اور گرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ جذبے کی انتہا پر پہنچ کر چند لمحے جو تعطل کے آتے ہیں ان میں اس نے سوچا:

''ان کی فصلیں تیار کھڑی ہیں۔''

(۲۸)

شانتی نگر شہر سے باہر ایک چھوٹی سی صاف ستھری بستی تھی جیسی ہر ایک مل کے ساتھ ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے الگ الگ بنے ہوئے پکی اینٹوں کے مکان جن پر چونے کی سفیدی کی گئی تھی۔ بیچ بیچ میں بغیر سفیدی کئے

ہوئے مکان بھی تھے جو بارش کے موقع پر ڈھل کر گہرے سرخ ہو جاتے اور تازہ پکی ہوئی مٹی کی خوشبو چھوڑنے لگتے۔ اسی موسم میں سفیدی والے مکان پر بارش کی سیاہ لکیریں پڑ جاتیں جو بدنما لگتیں اور ان پر دوبارہ سفیدی کرنی پڑتی۔

پانی کے نل مکانوں میں سے نکل کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلے گئے تھے اور آگے جا کر زمین میں دھنس جاتے تھے۔ دیواریں اونچی تھیں اور گلی میں گزرتا ہوا لمبے سے لمبا آدمی بھی صحن میں چلتی پھرتی عورتوں اور بچوں اور الگنی پر پھیلے ہوئے کپڑوں کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سڑکیں چوڑی اور سیدھی تھیں اور ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر کاٹتی تھیں۔ دو ایک جگہ چوراہوں پر فوارے نصب کئے گئے تھے جن کے چاروں طرف سیمنٹ کے گہرے ٹینک بنے تھے۔ لیکن ابھی پانی نہ چلا تھا اور ان میں کوڑا کرکٹ، آموں کی گٹھلیاں، کاغذ کے پرزے، ٹوٹے پھوٹے کھلونے اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی بیکار چیزیں بھری رہتی تھیں۔ شام کے وقت بستی کے بچے ان کی سیڑھیوں پر ایک دوسرے کی قمیصیں پکڑ کر آگے پیچھے بھاگتے اور منہ سے گاڑی کے انجن کی آواز نکالتے جاتے۔ جب وہ تھک جاتے تو سب سے اوپر کی سیڑھی پر چڑھ کر بیٹھ جاتے اور چھوٹی چھوٹی بیکار چیزیں، جن سے وہ تنگ آ چکے ہوتے، نیچے پھینکتے رہتے۔ کبھی کبھی کوئی لڑکا کتے کا پلا پکڑ کر لے آتا اور سب مل کر اس کی کمر میں رسی باندھ کر نیچے فوارے میں لٹکا دیتے اور اس کی چیخوں کا مزہ لیتے۔ ان کی مائیں اور بہنیں دروازوں سے سر نکال کر دیکھتیں اور انہیں اس کام سے باز رہنے کو کہتیں۔

آس پاس دور دور تک کوئی درخت یا سایہ نہ تھا اور سلسلہ کوہ کی مدھم لکیر، جو عموماً حد نظر پر دکھائی دیتی ہے، ندارد تھی۔ چنانچہ سورج زمین پر سے طلوع ہوتا اور یکایک دھوپ کھلے دروازوں میں سے گزر کر صحنوں اور برآمدوں میں پھیل جاتی اور مرغیاں اور دوسرے پالتو پرند دیواروں پر سے کود کود کر صحن میں پھرنے اور اپنے مکار اور مضحکہ خیز طریقے پر کیڑے مکوڑوں کے تعاقب میں دوڑنے لگتے۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرے دھوپ کے سیلاب سے بھر جاتے اور اندر رکھی ہوئی گھریلو استعمال کی چیزوں پر گرد کے ذرات چمکنے اور صاف کئے جانے کی یاد دہانی کرانے لگتے۔

گلیاں، جو عموماً صاف ستھری رہتیں پختہ تھیں، اور دونوں کناروں پر ڈھکی ہوئی گندے پانی کی نالیاں بہتی تھیں۔ سڑکوں کی مانند یہ بھی سیدھی تھیں اور ایک دوسرے کو عموداً کاٹتی تھیں۔ بستی کو اگر بلندی سے دیکھا جاتا تو یوں لگتا جیسے اقلیدس کے بڑے بڑے آلوں سے سیدھی لکیروں، دائروں، چوکوروں اور تکونوں کا خاکہ بنا دیا گیا ہو۔ اس میں گاؤں کی گندگی، گھلملاہٹ، بے ڈھنگا پن اور ہمہ گیری نہ تھی۔ کہیں کہیں مکانوں کے آگے سبزہ اگانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن پانی کے ناقص انتظام کی وجہ سے زیادہ تر کوششیں ناکام ثابت ہوئی تھیں۔

پھر بھی یہ بستی ہندوستان کی بہترین صنعتی بستیوں میں سے تھی اور گاہے گاہے حکومت کے ذمہ دار ارکان نچلے صنعتی طبقے کی خوشحالی کا نقشہ دیکھنے کے لئے وہاں لائے جاتے تھے۔

اس سے پرے کپڑے کی مل تھی جو ابھی نامکمل تھی اور تیزی کے ساتھ مکمل کی جا رہی تھی۔ مل کے دوسری طرف ایک اور، نسبتاً مختصر، بستی تھی، اس طرح کہ مل درمیان میں آ جاتی تھی اور دونوں بستیوں کے رہنے والے اپنے اپنے گھروں میں سے ایک دوسرے کے گھروں کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ صرف اس وقت جب سب لوگ مل میں کام

کرنے جاتے وہ ایک دوسرے کی بستی کو دیکھ سکتے۔

چھوٹی بستی بڑے مکانوں پر مشتمل تھی اور سبزہ اگانے کی کوششیں زیادہ منظم طور پر عمل میں لائی گئی تھیں۔ چنانچہ اکثر مکانوں کے آگے چھوٹی چھوٹی باڑیں، اِکا دُکا موسمی پھول، گملے اور کھدرے کھدرے گھاس کے قطعے دکھائی دیتے تھے۔ مکانات جدید طرز پر بنے ہوئے تھے اور بغیر سفیدی کے تھے جس سے مکینوں کی سادگی اور عمدہ مذاق کا پتا چلتا تھا۔ چند ایک برآمدوں کے ستونوں پر بیلیں چڑھنا شروع ہوگئی تھیں۔

مل سے سیمنٹ کی پختہ سڑک شروع ہوتی تھی جس پر ہر وقت موٹر کے ٹائروں کے نشان پڑے رہتے تھے۔ جہاں پر سڑک ختم ہوتی تھی وہاں سے یہ بستی شروع ہوتی تھی۔ سب سے پہلے نصف دائرے میں بنے ہوئے پندرہ بیس کمرے آتے تھے۔ ہر ایک کمرے سے ملحقہ ایک ایک غسلخانہ تھا جس میں جدید طرز کا سامان مہیا کیا گیا تھا۔ ان کمروں کے سامنے ٹینس کھیلنے کا پختہ کورٹ تھا جس میں ہر وقت جالی لٹکی رہتی تھی۔ یہاں پر نوجوان، غیر شادی شدہ، تعلیم یافتہ افسر رہتے تھے۔ اگلے مکانوں میں بڑے افسروں کی رہائش تھی جو ادھیڑ عمر اور بڈھے عیال دار لوگ تھے۔

ہر ایک گھر کے آگے بہت سی خالی جگہ باغ کے لئے مخصوص کی گئی تھی جس پر ایک آدھ مالی دن بھر کام کرتا رہتا تھا۔ وہ عموماً ایک چھوٹے قد کا، منحنی سا بوڑھا کسان ہوتا جو خاموشی اور اداسی کے ساتھ ربڑ کے لمبے لمبے پائپ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھتا اور گھاس کو پانی دیتا رہتا۔ جھک کر اور پاؤں پر بیٹھ کر کام کرتے رہنے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں ٹیڑھی اور کمزور ہو چکی ہوتیں اور کھرپا ہاتھ میں پکڑے وہ سبزہ اگانے کی انتھک کوشش میں مصروف رہتا۔ باہر کے پھاٹک سے لے کر برآمدے تک لمبی ڈرائیو تھی جس پر بجری بچھا کر رولر سے زمین ہموار کی گئی تھی۔ گھر کے بچے اکثر کھیلتے ہوئے نظر آتے۔ وہ سفید رنگت اور سیاہ آنکھوں والے گول مٹول بچے ہوتے جو گرم موسموں میں صرف جانگیے پہنے پانی کی ٹونٹیوں کے گرد کھیلتے اور جاڑوں میں شوخ رنگ اونی بنیانیں اور پتلونیں پہنے برآمدے کے فرش پر لکڑی کے گھوڑے اور موٹریں دوڑاتے پھرتے۔ وہ نیچے والی بستی میں کبھی نہ جاتے۔

ان گھروں کے پچھواڑے عام کوٹھیوں کے پچھواڑوں کی طرح تھے۔ اونچی نیچی باڑیں، رسی پر پھیلے ہوئے چھوٹے بڑے کپڑے، گھڑونچی پر مٹی کے گھڑے اور لوہے کے گلاس اور لوٹے، مرغیاں اور ان کے ڈربے، پودینے اور ٹماٹر کی کیاریاں۔ دن کے دوران گھر کی مالکاؤں اور ماماؤں میں بہت کم امتیاز کیا جاسکتا، سوائے شام کے وقت کے جب گھر کی عورتیں لباس تبدیل کر کے مردوں کے ہمراہ سامنے والے حصے میں ٹہلتیں اور کبھی کبھار مالی سے پوچھ گچھ کر لیتیں۔

وہاں تین مختلف قسموں کے لوگ رہتے تھے۔ بڑی بستی میں ہاتھ سے کام کرنے والے کاریگر اور چھوٹے موٹے کاموں میں ان کی مدد کرنے اور کام سیکھنے والے لوگ تھے۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو درحقیقت کسان تھے اور خشک سالی و مزارعہ گیری سے تنگ آ کر شہر میں محنت کرنے کے لئے آ گئے تھے۔ ان میں سے بہت کم ایسے تھے

جن کا آبائی پیشہ لوہار یا ترکھان کا تھا۔ باقی سب زمین کے بیٹے تھے اور زندگی کے چکر میں ایک بالکل انوکھی دنیا میں آ نکلے تھے اور اپنے آپ کو وہاں کا باشندہ بنانے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔

وہ سخت محنت کش مرد تھے اور دن رات میں دو وقت کھاتے تھے۔ ان کی غذا میں زیادہ مقدار اناجوں کی ہوتی جن سے وہ کام کرنے کے لئے حرارت اور قوت حاصل کرتے۔ چنے ان کی خوراک میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے جن کو ان کی عورتیں کئی مختلف طریقوں پر پکاتیں۔ گوشت کی کمی انڈے پوری کر دیتے جو تقریباً ہر گھر میں پالتو مرغیوں اور بطخوں سے حاصل کئے جاتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا' چونکہ ہر کام کرنے کے دن ان کا بہت سا پسینہ نکل جاتا اس لئے وہ ہر دم نکھرے ستھرے رہتے۔ ان کی عورتیں اور بچے دن رات میں تین دفعہ کھاتے۔ یہ ان کی جسمانی صحت کی حالت تھی جسے قائم رکھنے کے لئے وہ پیسے کما لیتے تھے۔

لیکن زندگی جسمانی صحت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اور اس کے لئے خوش و خرم رہنا نہایت ضروری بات ہے۔ اسی بات کے لئے وہ تگ و دو کر رہے تھے' بغیر جانے بوجھے ہوئے!

روح کی وہ نکھراہٹ اور تروتازگی جو انسانی زندگی میں قوت اور سکون پیدا کرتی ہے' جو محنت کرنے والوں کو اطمینان بخشتی ہے' روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی' غیر اہم چیزیں جو خوشی دیتی ہیں' جو نہایت اہم ہیں: روز روز کے مقابلے' لڑائی جھگڑے' کبھی کبھی کے میلے' تہوار' دوست' دشمن' ہولی' دیوالی' عاشورہ' عید' بیل' شکار' گپوں میں بے کار وقت خرچ کرنے کی طمانیت' گیت' بانسری' مویشیوں کی منڈیاں' درخت جو موسموں کے ساتھ رنگ بدلتے اور ہوا میں جھومتے' نالیاں جن میں پانی ہلکے شور کے ساتھ بہتا' یہ سب بے زبان' جاندار چیزیں' جو کسان کی زندگی میں رچ بس کر اس کا ایک حصہ بن جاتی ہیں' پیچھے رہ گئی تھیں۔ اب سیدھے سیدھے اکل کھرے مکان تھے جن کی اپنی حد بندی تھی واضح اور متعین عمودی لکیریں اور متوازی لکیریں جو علیحدگی کو ظاہر کرتی تھیں۔ درختوں سے محروم' بدرنگ فضا میں دھوپ چلچلاتی اور صاف ستھرے مکان اجاڑ معلوم ہوتے جن کی اپنی اپنی چھتیں تھیں' اپنے اپنے صحن تھے' اپنی اپنی زندگیاں تھیں۔ جب وہ راستے میں ملتے تو کسانوں کے اکھڑ دوستانہ لہجے میں ایک دوسرے کا حال پوچھتے' پر دلوں کی ہمسائیگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے اپنے خول نما گھروں میں واپس آ جاتے' اپنی اپنی منفرد دنیا میں مستقل بدلتی ہوئی زندگی کی اذیت کے زیر اثر رہنے کے لئے...... گاؤں کی وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی چھتیں اور حدیں' جہاں ہر کسی کو اپنی اپنی جائداد پر فخر ہوتا تھا پر جو لامحدود تھی' جس میں لاتعلقی نہ تھی۔ ساجھے کے صحن اور ساجھے کی دیواریں' منڈیریں' جن پہ ہر کوئی بیٹھ سکتا تھا اور جن کی ہر کوئی مرمت کر سکتا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے گھر جن کا پتا نہ چلتا تھا کہ کہاں سے شروع ہوتے تھے اور کہاں پہ ختم۔ مڑتی مڑاتی بے ترتیب گلیاں' کہیں سے چوڑی کہیں سے تنگ اور بیچ میں گندے پانی کی نالی' چلتے چلتے جس میں پاؤں پھسل کر جا پڑے اور چھینٹے اڑ کر ٹانگوں کو خراب کر دیں۔ چلتے چلتے پھر ایک گلی اچانک ختم ہو جائے اور آگے رستہ بند ہو اور وہاں ایک چھپر ہو اور ایک کنبہ...... ارے' یہ گلی ہے یا گھر؟ 'سلام لیکم ماسی' اللہ کرم کرے......' دلوں کی ہمسائیگی ختم ہو چکی تھی۔ اب وقت

مقررہ پر لوہے کے اوزاروں اور سیمنٹ کے مسالے اور تپے ہوئے سرخ لوہے کے ساتھ مل کر کام کرتے رہو۔ ایک تال۔ ایک تال۔

اور وہ بیل کے ساتھ مل کر باتیں کرنے کی خوشی۔ چمکتی ہوئی سیاہ' نمدار آنکھوں والا بیل جو رفیق بھی تھا اور نوکر بھی' جو خاموشی سے ساری باتیں سنتا تھا اور ضد بھی کرتا تھا۔ گوبر کے ڈھیر اور چاندنی راتوں میں گھنٹیوں کی آواز اور جب کوئی ہمسایہ گائے لے کر آتا تو ساری دنیا کی مردانگی اور غرور دل میں لے کر بیل کو اٹھاتے اور گائے کے پاس لے جاتے۔ ملاوٹ کے بعد گائے والا شکریہ ادا کرتا اور بیل والا اپنے نر کی کامیابی پر اس کا ٹھٹھہ کرتا اور لطف لیتا۔ پھر کھیتوں میں روز بروز بڑھتی ہوئی فصل تھی جس میں نوخیز لڑکی کی رعنائی اور اٹھان ہوتی تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم چیزیں تھیں جو زندگی کا جزو تھیں اور جب زندگی کا وہ حصہ گم ہوگیا تو اس کی تلاش ایک گھلا دینے والی' بیمار کر دینے والی بے کلی بن کر ان کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ بیمار روحوں اور محنتی جسموں والے' تنہا' لوگوں کا گروہ تھا۔

دوسرا گروہ بڑے بڑے مکانوں میں رہنے والوں کا تھا۔ یہ گزری ہوئی عمروں والے تجربہ کار' ذمہ دار افسر تھے جو اس سارے منظر کو کنٹرول کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ نچلے طبقے میں سے اٹھے تھے' کچھ اونچے طبقے میں سے' بعض کو موجودہ پوزیشن تک پہنچنے کے لئے سخت محنت کرنا پڑی تھی' بعض آسانی سے اوپر آ گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ سب وجیہہ شخصیتوں اور آسان روحوں والے لوگ تھے۔ ان کے گھر مضبوط' زندگیاں محفوظ اور چہرے مطمئن تھے۔ ان کے طور طریقوں میں بااختیار لوگوں کا بازاری پن تھا۔ یہ لوگ لاتعلقی کے ساتھ اپنا کام کرتے تھے اور اپنی روزانہ کی غذا' اپنے بچوں اور گھر کے سامنے والے باغ میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ وہ عمر کی اس منزل میں تھے جب معمولی صلاحیتوں کے انسان کی زندگی میں جمود اور قناعت آ جاتی ہے۔ وہ سن تمیں کے بعد کے اس ہندوستان میں رہ رہے تھے جب ادھیڑ عمر اور بڈھے ہندوستانی افسروں کے لئے سب سے اطمینان بخش خیال یہ تھا کہ زندگی میں انہوں نے ایک باعزت مقام حاصل کرلیا ہے اور عہدے میں اپنے کئی ساتھیوں سے زیادہ ترقی حاصل کی ہے اور ان کے بچے انگریزی سکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ وہ غیر دلچسپ اور ایک حد تک خودغرض لوگ تھے جو اونچی غیر ملکی سوسائٹی میں' کبھی کبھار' احساس کمتری کے ہمراہ جا سکتے تھے' ماتحت طبقے کے جلسے جلوسوں اور شادی بیاہوں میں شدید احساس برتری کے ساتھ شریک ہوتے تھے' برج کھیلتے تھے' ڈریس سوٹ پہنتے تھے اور اپنی صحت کا خیال رکھتے تھے۔

ایک درمیانہ اور سب سے زیادہ دلچسپ گروہ نوجوان افسروں کا تھا۔ ان میں زیادہ تر غیر شادی شدہ تھے اور نئے نئے درس گاہوں سے نکل کر آ رہے تھے۔ سب کے سب بیحد چست' مستعد اور صحت مند نوجوان تھے۔ ان میں اکثریت ایسے نوجوانوں کی تھی جو نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے' ایسے گھرانے جن کا کوئی پس منظر' کوئی روایات نہیں ہوتیں' جو فقط زندہ رہنے اور اپنے کنبوں کو پالنے کی جدوجہد ہی میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ ان نوجوانوں کی روحانی حالت خستہ تھی لیکن ان کے پاس چند خواب تھے جن کو پورا کرنے کی خاطر وہ ہمہ تن مصروف

رہتے تھے۔ ان میں سے چند ایک کو محکمہ صنعت کی طرف سے کچھ عرصہ کے لئے یورپ بھی بھیجا جا چکا تھا اور ان کے خیالات خاصے ترقی یافتہ تھے۔ یہ خوش لباس لوگ تھے اور ان کے کمروں میں صفائی کا عنصر نمایاں تھا۔ ہر ایک شے موزوں جگہ پر دھری تھی اور باقاعدہ صفائی کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل اور کتابوں کی میز سب سے نمایاں جگہ پر تھیں جن پر کمرے میں داخل ہونے والے کی نظر سب سے پہلے پڑتی تھی۔ بستر اور میز کا لیمپ کم نمایاں جگہ پر' جوتے ایک کونے میں نصف پوشیدہ' جن کو روز کا آنے والا یا دیر تک بیٹھا رہنے والا دیکھ سکتا تھا۔ کپڑے کہیں نظر نہ آتے تھے' جو یا تو بستر کے نیچے ٹرنک میں بند تھے یا الماریوں اور غسل خانوں میں ٹنگے ہوئے تھے۔

کتابوں کے گرد پوش مضبوط اور خوش نما تھے اور ہر روز جھاڑ پونچھ کر رکھے جاتے تھے۔ انہیں بے حد ترتیب کے ساتھ سائز وار سجایا گیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کا قد آدم آئینہ اس زاویے پر موڑا گیا تھا کہ کتابوں کی قطاریں اس میں سے دکھائی دیں۔ کتابوں کی اندرونی حالت خستہ تھی کیونکہ انہیں پڑھنے کے لئے کوئی وقت نہ تھا' کوئی خواہش نہ تھی۔ بعض کتابوں کو اندر سے دیمک چاٹ چکی تھی اور وہ کھوکھلی اور ہلکی ہوگئی تھیں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان نوجوانوں اور ان کی کتابوں کے وجود میں دردناک حد تک مشابہت تھی۔

یہ بات نہیں کہ ان کے پاس فالتو وقت نہ تھا۔ لیکن ان کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ماضی کے گھٹیا پن سے خوف زدہ تھے اور کسی صورت بھی اپنے آپ کو اس سے منسلک رکھنا نہ چاہتے تھے۔ عمر میں پہلی مرتبہ انہوں نے معاشی آزادی حاصل کی تھی۔ معاشی سہولت کے ساتھ انہیں جسمانی طمانیت میسر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی تجسس اور اضطراب ختم ہوگیا تھا۔ ان کی روحیں آسان ہو رہی تھیں۔ زندگی کا راستہ سیدھا اور بے خطر تھا جس پر ان کو بڑھتے جانا تھا' بے سمجھ سرگرمی کے ساتھ۔ ان کے 'آئیڈل' وہ افسر تھے جو ان سے فقط ایک درجہ اوپر تھے۔ ان کی نظر میں یہ وہ لوگ تھے جو اپنی پوزیشن کے اہل تھے اور زندگی میں کامیاب رہے تھے۔ ان کی تقلید میں یہ نوجوان ان کی عملی کامیابی' ان کا احساس کمتری و برتری' ان کا بازاری پن اور خود غرضی اور ان کی دانائی حاصل کر رہے تھے۔ یہ اپنے وجود کی اس سطح پر مکمل طور پر خوش تھے جہاں زندگی کے مشکل تر مراحل میں سے گزرے بغیر منزل تک پہنچا جا سکتا تھا۔ یہ خوش باش لوگ تھے۔

ان کی مجلسی زندگی میں یکسر تبدیلی آچکی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر' جنہوں نے ابتدائی عمر میں یا درسگاہوں میں ادنیٰ عادات اور تربیت پائی تھی' اب تہذیب یافتہ ہوتے جا رہے تھے۔ تہذیب اور اخلاق کا ان کے پاس ایک بالکل نیا تصور تھا جو کہ ان کے لئے بے حد خوش کن تھا۔ ایک چھوٹے سے کلب میں وہ اکثر شاموں کو اکٹھے ہوتے' تاش کھیلتے اور گپیں مارا کرتے۔ وہاں پر وہ کبھی کسی ملکی' سیاسی یا معاشرتی مسئلے پر بہت زیادہ سنجیدگی یا جوش کے ساتھ بحث کرتے ہوئے نہ سنے گئے تھے۔ ضبط و اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا یا غیر ضروری طور پر گرمجوشی کا اظہار کرنا ادنیٰ تربیت کو ظاہر کرتا تھا' چنانچہ سخت ناگوار تھا۔ وہ یہ کبھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ غیر تہذیب یافتہ کہلائیں' چاہے اس کی قیمت ان کو نفرتوں اور لمبی لمبی شخصی کدورتوں کی شکل میں ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ وہ

ایک بہتر زندگی میں داخل ہو رہے تھے جہاں خارجی زندگی بے فکر اور آسان تھی' راستہ بے خطر اور پُر آسائش تھا۔ لیکن شخصی زندگی میں قدم قدم پر دھچکے اور دل شکن انکشافات تھے' ضبط اور کبر نفس تھا۔ اس نے ان نوجوانوں کو مغرور اور زود رنج بنا دیا تھا۔ وہ ایک ایسے نئے چمکدار جوتے کی طرح تھے پہلے ہی روز کسی حادثے کی وجہ سے جس کے ٹانکے ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور پہننے والے کو ہمیشہ اسے احتیاط اور میانہ روی سے استعمال کرنا پڑتا ہے۔

ملک کے حالات یا عوامی جذبات سے کسی کو دلچسپی نہ تھی' کوئی خواہش نہ تھی۔ ان کا فالتو وقت زیادہ تر باتیں کرنے میں گزرتا۔ ہلکی' پُر اخلاق' خوش کن باتیں' افواہیں' پُر مذاق گپیں جن سے خود اطمینانی کا احساس پیدا ہوتا' لڑکیوں کی باتیں جو نہایت غیر شخصی اور ہلکے طنزیہ انداز میں کی جاتیں۔ ذاتی باتیں کوئی نہ کرتا اور ذاتیات میں دلچسپی کوئی نہ لیتا۔ اگر کوئی ذاتی مسئلہ پیش کرنا بھی چاہتا تو اس خیال سے رک جاتا کہ کہیں سننے والوں کی طبیعت پر بار نہ گزرے۔ ماحول میں ان کا ایک ہلکا پھلکا' بے تأثر وجود تھا' جیسے بجلی کے وہ کھمبے جن پر ابھی تار نہ لگائے گئے ہوں ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان اِکا دُکا چمکتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں' خشک اور بے جان!

عملی زندگی میں اور زیادہ تصادم تھا۔ کاریگروں اور مزدوروں کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ انہیں برتری حاصل تھی چنانچہ ان سے الگ تھلگ رہنا ضروری تھا۔ افسروں کی طرف سے ان کی بہت کم حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ کبھی کبھار رسمی دعوتوں میں گھروں پر مدعو کر لئے گئے اور بس (ان کے لئے مسرور ترین دن وہ ہوتا جس روز وہ کسی افسر کے ساتھ چند منٹ کے لئے ذاتی نوعیت کی گفتگو کرنے کا موقع نکال لیتے۔) اس طرح وہ ایک دردناک علیحدگی میں جا پڑے تھے۔ لیکن یہ علیحدگی ان کے لئے اذیت ناک نہ تھی بلکہ ان کی خود پسند اور زود رنج طبع کی خوراک بن گئی تھی۔ آپس میں بھی ان کے تعلقات بڑے دلچسپ تھے۔ جن کو وہ اپنے سے زیادہ قابل اور ہوشیار سمجھتے ان کے ساتھ دوستی کرنے سے کتراتے اور حاسدانہ احترام کے ساتھ ان سے ملتے۔ زیادہ تر ان سے بے تکلف ہوتے جن کو اپنے سے کمتر' بے ضرر اور بیوقوف سمجھتے۔ ایک بے روح مادی زندگی کے قواعد نے انہیں عورتوں سے زیادہ حاسد بنا دیا تھا۔ یوں ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ ان کا برتاؤ بے حد پُر اخلاق تھا۔

تیز سفید دھوپ تھی جس سے آنکھیں دکھنے لگتی ہیں اور زمین بے رنگ اور کمزور ہو جاتی ہے اور کوے پانی کے نلوں پر بیٹھے رہتے ہیں' بیٹھے رہتے ہیں حتیٰ کہ لوگ ان کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور موسم کی شدت میں پرندے اور انسان کے قدرتی عناد کا احساس نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ یہ مئی کا موسم تھا' ننگے بے رنگ کھیتوں کا موسم۔

طویل میدان کو پار کر کے علی نو تعمیر کمرے میں داخل ہوا۔ کڑی دھوپ میں سے گزر کر آنے کے بعد خنک دیواریں اور تازہ پلستر کی بُو اسے خوشگوار معلوم ہوئی۔ اس نے لمبا پُر سکون سانس لیا اور ہوا کی نمی کو حلق میں محسوس کیا۔ کمرے کے وسط میں کھڑے کھڑے اس نے خوشی اور سکون کے ساتھ بے مدعا چاروں طرف دیکھا۔ اس کے معدے کی جلن اب کم ہو گئی تھی اور وہ آسانی کے ساتھ اپنے وزن کو سنبھالے ہوئے کھڑا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر

نرم روشنی تھی جو آنکھوں کو اچھی لگتی تھی۔ فرش پر جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی اینٹیں، گھلا ہوا پلستر، لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ دو ایک جگہ ترکھانوں کے اوزار اور لکڑی کا سامان بکھرا تھا۔ کمرے میں سوائے علی اور ایک دوسرے شخص کے، جو کونے میں بیٹھا کھا رہا تھا، اور کوئی نہ تھا۔ اس نے کمرہ پار کر کے اوزار فرش پر رکھے اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی۔ لُو اور دھوپ کے سیلاب کے ساتھ کھڑکی کے راستے باہر کا سارا منظر کمرے میں آ گیا۔ طویل اور چٹیل میدان، اور اسے تیز تیز پار کرتے ہوئے اکا دُکا مزدور اور کاریگر جن کے سروں اور کندھوں پر سورج چمک رہا تھا۔ پرے فیکٹری کی عمارت جس کے برآمدوں میں بیٹھے وہ کھانا کھا رہے تھے اور پسینہ پونچھ رہے تھے۔ سارا کام ایک دم تھم گیا تھا۔ یہ کھانے کا اور خاموشی کا وقفہ تھا۔

''اسے بند کر دو۔'' دوسرے شخص نے بے تعلق لیکن قطعی لہجے میں کہا۔

علی نے کھڑکی بند کر دی۔ باہر کا نظارہ واپس چلا گیا۔ وہ ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ڈھانپ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ بند آنکھوں کے سناٹے میں دیکھتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے اس نے اپنے آپ کو محفوظ اور آسودہ محسوس کیا۔ پھر اس نے ہاتھ ہٹائے اور آنکھیں جھپکنے لگا۔

وہ اس کی طرف آدھی پشت موڑ کر بیٹھا ہوا کاہلی سے کھا رہا تھا۔ پشت سیاہ اور چوڑی تھی اور گوشت کی کمی کے باعث کندوں کی مضبوط ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کا جبڑا بہت لمبا اور بھاری تھا اور جگالی کرتے ہوئے بیل کی طرح ہل رہا تھا۔ علی خاموشی سے بیٹھا اس غیر انسانی جبڑے کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھتے ہوئے علی کو قوت کا احساس ہوا۔ سخت خوراک ٹوٹ کر، پس کر، ذرات میں تبدیل ہو کر لعاب بن کر گلے سے اتر رہی تھی اور جبڑا کاہلی سے، لیکن مشینی باقاعدگی اور قوت کے ساتھ چل رہا تھا۔

کھانا ختم کر کے وہ مڑا ''لو......'' اس نے بچی ہوئی روٹی علی کی طرف بڑھائی۔

''مجھے بھوک نہیں۔'' علی نے کہا۔ وہ تعجب سے ہنسا اور روٹی کا ٹکڑا کتے کے آگے پھینک دیا۔

''آدمی کا حلق پہلے ہے۔ خیر......'' وہ کھانے کی پوٹلی باندھتا ہوا بولا۔

''کیوں؟'' علی نے پوچھا۔

اس نے سر اٹھایا اور ایک سادہ، احمقانہ ہنسی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ علی نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا لیکن اس کا بے تکلف ہمدردی کا رویہ اس کے جی کو اچھا لگا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ پوٹلی کے ساتھ ہونٹ صاف کر رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا مضبوط چہرے اور سادہ آنکھوں والا شخص تھا۔ اس کے سیاہ پٹھے دار جسم سے مشقت کی آفتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ علی دیوار سے ٹیک لگا کر کمرے میں دیکھنے لگا۔ وہ دل میں سُن محسوس کر رہا تھا اور خوش تھا۔

''میں ہر روز نئے بنے ہوئے کمروں میں آ جاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں؟''

''گرمی سے بچنے کے لئے۔''

''آہ......آہاہا'' ادھیڑ عمر شخص کے ہونٹوں سے مختصر اور بے اختیار ابلتی ہوئی ہنسی نکلی۔ ''عجیب بات ہے۔ عجب۔''

علی اس کو دیکھتا رہا۔

''آہاہا......'' وہ پھر ہنسا۔ ''جب کمرے بننے بند ہو جائیں گے پھر؟''

''پھر؟'' علی سوچنے لگا۔ ''پھر تو جاڑے آ جائیں گے۔''

اس کے منہ سے پھر وہی مختصر، ابلتی ہوئی ہنسی پیدا ہوئی۔ ایسی ہنسی پکی عمر کے جاہل محنت کش لوگوں کے لئے غیر معمولی بات تھی۔

''یہ اچھے دل کا آدمی ہے۔'' علی نے سوچا۔

''بڑی عجب بات ہے۔ بڑی عجب'' اس نے دہرایا۔

''کیا؟''

''اس پلے کو میں روز روٹی دیتا ہوں۔ پر ایک روز میں چلا جاؤں گا تو پھر؟''

''کہاں۔''

''گھر''

''گھر؟'' علی نے حیرانگی سے دہرایا۔ پھر اس نے دیوار کے ساتھ سر ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں اور زیر لب بڑبڑایا۔ ''میں گھر نہیں گیا۔ اس بار۔''

پلا آ کر اس کا پاؤں چاٹنے لگا تھا۔ اس نے آنکھیں بند رکھیں اور یاد کیا کہ اس دفعہ فصل کے موقع پر اس کو چھٹی نہ ملی تھی اور گھر پر کوئی مرد نہ تھا اور اسے اطلاع ملی تھی کہ کاٹنے والوں نے اس کی ماؤں کو بہت کم حصہ دیا تھا۔ اس کے معدے میں پھر ہلچل اٹھی۔

ادھیڑ عمر کا شخص غور سے اس نوجوان آدمی کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑے ہوئے تھے اور رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہوگئی تھیں مگر جس کے چہرے پر ابھی تک نوجوانی کا بانکپن تھا۔ اس نے آہستہ سے علی کو کندھے پر چھوا۔

''تم بیمار ہو؟''

''میں؟ نہیں۔'' علی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''میں نے بہت سے کسانوں کو بیمار دیکھا ہے' آج کل۔''

''میں کسان نہیں ہوں۔'' علی نے کہا۔

''کسان بیمار نہیں ہوتا۔ اسے بیماری راس نہیں آتی۔ جب وہ بیمار ہوتا ہے تو مر جاتا ہے۔ پر پتا نہیں۔'' اس نے فکر مندی سے ہاتھ پھیلائے۔ ''اتنی زیادہ مردنی...... شکل سے تو تم کسان ہی دکھائی دیتے ہو۔''

''میں مستری ہوں۔''

وہ بے یقینی سے ہنسا۔ ''پھر بھی ...... پھر بھی، تمہاری عمر میں یہ تردد۔''

علی باہر دیکھنے لگا۔ دھوپ کی سفید چادر میدان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر لیا۔

''تم سورج میں نہیں دیکھ سکتے؟'' دوسرے شخص نے پوچھا۔

''تم کہاں کام کر رہے ہو؟'' علی نے پوچھا۔

''پچھمی دروازے پر۔''

''کیا کر رہے ہو؟''

''کھود رہے ہیں۔ بجلی کے لئے۔''

''تمہارا جسم کھودنے کے لئے اچھا ہے۔'' علی نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے منہ میں ہنس کر کوئی جواب دیا لیکن علی باہر دھوپ میں اور اندر کمرے میں لکڑی اور اینٹوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے شخص نے ٹانگیں سمیٹیں اور بیلچہ کندھے پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''پھر بھی، اس عمر میں یہ تردّد۔ خوراک زیادہ کردو، خوراک......''

اس نے بیلچے کے دستے کے سرے پر پوٹلی باندھی اور باہر نکل گیا۔

اس کی پشت چوڑی تھی اور اس میں ہلکا سا خم تھا۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے چل رہا تھا۔ اکیلا۔ بیلچے کے سرے پر خالی پوٹلی ہل رہی تھی۔ کتا کچھ دور تک اس کے پیچھے پیچھے گیا، پھر واپس آ گیا۔ جب میدان کے سرے پر وہ مڑ کر اوجھل ہو گیا تو علی، جو خالی خالی نظروں سے اسے تک رہا تھا، اچانک بے چین ہو گیا۔ وہ اب پورے طور پر اس کے ذہن میں آ گیا تھا۔ جھکی ہوئی چوڑی پشت پر اس کی سادہ خوش کن مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ پھر اس کو دیکھے۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا جو لُو کے زور سے کھل گئی تھی۔ وہ اب بھی جا رہا تھا، اسی بھاری تھکی ہوئی چال کے ساتھ۔ بیلچے کا سرا اور خالی پوٹلی سر سے اوپر نکلے ہوئے تھے۔ علی دیر تک متلاشی نظروں سے دیکھتا رہا لیکن اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اور سورج اس کے کندھوں پر چمک رہا تھا۔ دور سے اس کی دھیمی، مستقل چال کا نظارہ دیکھنے والے میں تھکن پیدا کرتا تھا۔ علی کھڑکی سے ہٹ آیا۔ وہ اس قدر اکیلا تھا...... تنہا۔ یہ حیران کن خیال پہلی دفعہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔

اب میدان بہت سے لوگوں سے بھر گیا تھا جو مختلف سمتوں میں آ جا رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو کام کی جلدی نہ تھی۔ وہ محض سورج کی سختی کی وجہ سے تیز تیز چل رہے تھے۔ جب وہ ٹھنڈے کمروں اور سایہ دار جگہوں میں اپنے اپنے کام پر پہنچتے تو بے مدعا خلا میں گھورتے، اوزاروں کو بے دلی سے اٹھاتے اور رکھتے اور کام شروع کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جو کاہلی اور ستانے کی خواہش جسم پر قبضہ پا لیتی ہے، اس کے زیر اثر وہ تھوڑی دیر کے لئے بیکار ہو جاتے۔

کمرے میں اور کمرے کے باہر خاموشی اور خلا کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ علی کے چاروں طرف لوگ گھوم رہے

تھے اور اونچی سست آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے اس نے باری باری سب کو دیکھا۔ واضح طور پر سب کی موجودگی کو الگ الگ محسوس کیا۔ خود ان کے وجود سے بے تعلق رہا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ خود باہر کے نظارے میں شامل تھا اور کھڑکی کے باہر کھڑا کمرے میں دیکھ رہا تھا۔ یہ حیران کن محسوسات کا دن تھا۔ وجود اور احساسات کا یہ عالم اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''بند کرد۔ اسے بند کردو۔'' چند آوازیں آئیں۔ علی نے جھک کر اوزار اٹھائے اور باہر نکل گیا۔ پیچھے کمرے میں کسی نے گالی دی اور پٹاخ سے کھڑکی بند کر دی۔

میدان میں سورج کی چمک کے ساتھ ساتھ خواب کا وہ عالم تیزی سے گزر گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے معدے کی مخصوص جلن بڑھنی شروع ہوئی۔ وہ اس بڑے ہال میں داخل ہوا جہاں وہ کام کر رہے تھے۔ ہال خشک اور تپا ہوا تھا اور بے کواڑ کھڑکیوں میں سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ لمبائی کے رخ چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر تکلوں کی موٹریں نصب کی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے چبوترے کے پاس رک کر ادھ کسے کابلے کو دیکھنے لگا جس کو وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے آگے اور پیچھے تمام لوگ کام شروع کر چکے تھے۔ دھات کے ٹکرانے اور ایک ساتھ مل کر زور لگاتے ہوئے خلاصیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ چبوترے پر بیٹھ کر کابلہ کسنے لگا۔ چابی گھماتے گھماتے اس نے کسے ہوئے کابلوں کو گنا۔ صرف پندرہ تھے۔ یہ اس کا اس وقت تک کا کام تھا۔ شام سے پہلے پہلے اسے چالیس کابلے کسنا تھے۔ وہ تیزی سے چابی گھمانے لگا۔

فٹر نے دور سے علی کو کام کرتے ہوئے دیکھا اور موٹے موٹے کھردرے ہاتھ لٹکا کر چلتا ہوا اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

''کتنے ہوئے؟''

علی اس کرخت آواز سے مانوس تھا۔ ''پندرہ...... استاد۔'' اس نے کہا۔

''ایں؟ پندرہ؟'' فٹر چیخا۔

''پندرہ۔'' علی نے ڈھٹائی سے دہرایا۔

''آ...... آ۔'' فٹر نے مایوسی سے ہاتھ پھیلائے۔ اس کا مصنوعی غصہ غائب ہو چکا تھا۔ ''تُو لوہار کا لونڈا ہے' ہیں؟ لعنت ہے۔ تو اپنے باپ پر حرف بد لایا ہے۔ تجھ سے تو یہ چمار کا لونڈا اچھا ہے جس نے اپنے خاندان کا نام اونچا کیا ہے۔'' وہ اگلے چبوترے کے پاس سے گزرتے ہوئے چمار لونڈے کی پسلیوں میں انگوٹھا چبھو کر بولا۔ لڑکا جو نو عمر اور تازہ وارد تھا' سرخ ہو گیا اور دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

علی مشین کی سی تیزی اور باقاعدگی سے کابلے کستا رہا اور آہستہ آہستہ اس کے سینے کی سوزش بڑھتی گئی۔ جب بتیس کابلے ہو گئے تو اس نے سر اٹھایا۔ چار موٹریں چھوڑ کر ایک لونڈا فٹر کی ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا۔ اس وقت وہ استاد کی پتلون اتارنے کی فکر میں تھا جو کہ ان سب کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے اس کی ٹانگوں پر ہاتھ رکھ

کر اصرار کرتے جاتے اور فنز' سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے آگے آگے چلنے کی کوشش کرتا رہتا۔ اس طرح وہ اس کی پتلون نیچے گرانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس وقت وہ لڑکا بہانے خوری سے مسکین سی شکل بنائے منتیں کر رہا تھا اور استاد اس سے ٹانگیں چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پتلون لونڈے کے ہاتھوں میں آ گئی جسے وہ نیچے گرا کر سرپٹ بھاگا۔ فنز اونچی آواز میں گالیاں دینے اور پتلون کسنے لگا۔ سب اپنے اپنے منہ قمیضوں میں چھپا کر ہنسنے لگے۔ علی کو اپنی ہنسی کی آواز سینے کی دیواروں کے ساتھ بجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جب فنز چکر لگاتا ہوا وہاں سے گزرا تو وہ چابی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں چائے پینے جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ایں...... ابھی تو آئے ہو؟''

''میں نے کچھ نہیں کھایا۔''

فنز نے شاید پہلی دفعہ اسے غور سے دیکھا اور چونک پڑا۔ ''علی'' اس نے آہستہ سے اسے کندھے پر چُھوا۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''تم رات کو سوئے نہیں؟''

''مجھے بھوک لگی ہے۔'' علی نے دہرایا۔

''جاؤ۔'' اس نے دوبارہ اضطراب سے علی کے کندھے کو چُھوا۔ ''آرام کرو۔ جاؤ''

باہر نکلتے ہی اس کی بھوک غائب ہوگئی۔ میدان میں دھوپ کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا اور اندر سے اٹھنے والے شور کے باوجود باہر گرما کی دوپہر کا سناٹا اور جمود قائم تھا۔ لوہے کی پائپوں اور بند مشینری کے کریٹوں کے پاس سے گزر کر وہ کینٹین کی سیڑھیاں چڑھا۔

''ایک چائے دو۔'' اس نے کنکریٹ کے کونٹر پر جھک کر کہا۔

''بیٹھ جاؤ علی۔ بڑی گرمی پڑ رہی ہے۔'' کینٹین والے ادھیڑ عمر کمزور شخص نے کہا۔

''ہاں۔'' وہ بنچ پر بیٹھ گیا۔

''کیسا چل رہا ہے؟''

''ٹھیک چل رہا ہے۔'' علی نے چائے کی سُرکی لی۔

''اتنے سال ہوگئے۔'' کینٹین والے نے مایوسی سے کہا۔ ''کب تک چلے گا؟''

''کیا؟''

''فیکٹری بن ہی نہیں پاتی۔''

گرمی سے گھبرائی ہوئی چند چڑیاں کمرے میں چکر لگا رہی تھیں۔ وہ پھر بولا:

''تمہارے کوئی بچہ ہے؟''

علی نے نفی میں سر ہلایا۔

''کتنے سال ہوئے؟''

''پتا نہیں۔''

''پتا نہیں؟'' ادھیڑ عمر کا کمزور شخص منہ کھول کر ہنسا۔ علی نے سرخ سرخ آنکھیں نکال کر اسے دیکھا اور چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتار کر باہر نکل آیا۔

''یہ گنوار لوگ جو بھوکے مرتے ہوئے کام کی تلاش میں آتے ہیں۔'' کینٹین والے نے علی کے پیچھے دیکھتے ہوئے ایک اور گاہک سے کہنا شروع کیا۔

لوہے کے پائپوں اور مشینری کے کریٹوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے کان میں دور سے خلاصیوں کے گروہ کی دھیمی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ ہئی سا...... ہئی سا...... ہئی سا...... بے دلی سے قدم رکھتا ہوا وہ اپنے چبوترے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ زیادہ تر لوگ کام چھوڑ کر چبوتروں کے پیچھے چھپ کر بیٹھے ہوئے گپیں مار رہے تھے۔ استاد دوسری لائن کے فٹر کے پاس بیٹھا چھوٹا سا جیبی حقہ پی رہا تھا۔ چند ایک محض آواز پیدا کرنے کو دھات سے دھات ٹکرا رہے تھے اور باتیں کرتے جا رہے تھے۔ خلاصیوں کا گروہ ایک بھاری موٹر کو رسے سے باندھ کر اندر لا رہا تھا۔ ہئی سا...... ہئی سا۔ بولی دینے والے کی آواز خواب آلود تھی۔

پھر خلاصیوں کی آوازیں اچانک تیز ہو گئیں۔ دونوں فٹر گھبرا کر اٹھے اور حقہ جیب میں ڈال کر قطاروں کے بیچ دوڑنے لگے۔ مزدور اور کاریگر اپنے اپنے اوزاروں کی طرف لپکے۔ کام کا شور ایک دم بڑھ گیا۔ دروازے میں سے سرخ چہرے والا بڈھا انگریز چیف انجینئر داخل ہوا۔ وہ ہر وقت آگ بگولہ رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹھگنا فورمین تھا۔ چھوٹا سا گنجا سر سانپ کی طرح تیزی سے چاروں طرف گھما کر چلتا ہوا وہ اندر آیا۔ ''ہے...... ہے'' کر کے فٹروں کو پاس بلایا اور ہال کے وسط میں رک کر کام کا جائزہ لینے لگا۔ پھر فورمین کو مخاطب کر کے اس نے فٹروں کے سروں کے اوپر بازو چلائے اور نامکمل کام کی طرف اشارہ کر کے پانچ منٹ تک تیز خشک آواز میں چیختا اور غصے سے ناچتا رہا۔ موٹروں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک لڑکے کے چوتڑوں پر بوٹ کی ٹھوک ماری اور چیخا۔

''ہے جالڈی کرو......'' لڑکے نے چبوترے کا سہارا لے کر آہستہ سے گالی دی۔ علی بازو لٹکائے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ کھڑا رہا حتیٰ کہ بڈھا انگریز اسی طرح چیختا ہوا اس کے پاس سے گزر گیا۔ اس نے خاموشی سے دانت پیسے۔

کچھ دیر تک کام تیزی سے ہوتا رہا۔ پھر نوجوان انجینئر مجید داخل ہوا۔ اس کا قد لمبا اور رنگ سانولا تھا۔ انگریزی لہجے میں ''ہے...... ہے'' کر کے اس نے فٹروں کو بلایا۔ چند منٹ تک بازوؤں کو تیزی سے ہوا میں حرکت دیتا اور چیختا رہا۔ پھر کہنیاں باہر نکال کر چلتا ہوا نکل گیا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی اطمینان بخش، فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

کچھ دیر کے بعد دونوں فٹر پھر حقہ پی رہے تھے اور لونڈے چبوتروں کے پیچھے چھپے گپیں مار رہے تھے۔

اوزاروں کو وہیں چھوڑ کر علی باہر نکل آیا۔ معدے کی جلن کی جگہ اب ایک دھیمی، مستقل، شدید بے دلی اور بدمزگی نے لے لی تھی۔ ایک ایسی کیفیت جو آسانی سے سہاری نہ جاسکنے کے علاوہ آسانی سے بیان بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ میدان کو پار کرتے ہوئے اسے ایک عجیب وغریب خیال آیا کہ جیسے وہ اکھڑے ہوئے نوجوان درختوں کے سائے میں ستا رہا ہے اور درخت روز بروز خشک ہوتے جارہے ہیں۔

دھوپ میں سر جھکا کر وہ اکیلا چلتا رہا۔ دوپہر زرد پڑ چکی تھی۔ لیکن آسمان ابھی گرم اور نیلا تھا۔ چیلیں اوپر چلی گئی تھیں اور دور سے ان کی چیخوں کی آواز دوپہر کے آخری سناٹے کو سنسان بنارہی تھی۔ کوے، جو درختوں اور دیواروں کے پرند ہیں، سائے میں پانی کی ٹونٹیوں کے گرد چوکس بیٹھے تھے جب کہ علی کڑی، مستقل چال سے ان کے قریب سے گزرتا رہا۔ کہیں کہیں بچے، جن کے والدین مصروف اور لاپرواہ تھے۔ کوؤں کی طرح دیواروں کے سائے میں بیٹھے آہستہ آہستہ کھیل رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بچہ اس اکیلے جاتے ہوئے شخص کو پہچان کر انگلی سے اشارہ کرتا: ''وہ علی ہے'' اور پھر کھیلنے لگتا۔

دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے عائشہ سو رہی تھی۔ اس کے گال اور چھاتیاں پسینے سے تر تھیں اور ذرا سے کھلے ہوئے منہ میں سے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ علی دروازے میں کھڑا آشنا، لاتعلق نظروں سے اس کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔ عائشہ جاگ اٹھی۔

''آج تم دوپہر کو نہیں آئے؟'' وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چھریرے بدن کی لمبی سی لڑکی تھی جس کا رنگ گندمی اور جلد صحت مند تھی۔ ''میں بیٹھی انتظار کرتی رہی، پھر پتا نہیں کب سوگئی۔ بڑی گرمی لگ رہی تھی، تم کھانا کھالیا؟ سب تو آئے تھے۔ آج تم کو بڑا کام تھا؟ میں نے رحیم سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اس نے تمہیں ادھر آتے دیکھا تھا۔ پھر تم کہاں چلے گئے؟ ایک مرغی کو کالو اٹھا کر لے گیا ہے۔ کالو کا بچہ۔ بلا تم اسے مار کیوں نہیں دیتے؟ پتا ہے ان گرمیوں میں ہم نے ایک بلا مارا تھا۔ گاؤں میں۔ جب روشن آغا کے کتے ......''

''مجھے کھانے دو۔'' علی نے جھلا کر کہا۔

وہ باتیں کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ ''تم نہالو تو اچھا ہے۔ کھا کر نہاؤ گے تو گرم سرد ہو جاؤ گے۔ کھانا تو میں نے تیار کر دیا تھا۔ جب ایک پہر دن ......'' آہستہ آہستہ اس کی آواز بھنبھناہٹ میں تبدیل ہوگئی۔ علی خالی خالی نظروں سے دیواروں کو دیکھتا ہوا چارپائی پر بیٹھا رہا۔ جب وہ کھانا لے آئی تو اس نے پاؤں اوپر کھینچ کر ٹانگیں سمیٹیں اور کھانے لگا۔

''مکھیاں ٹڈی کی طرح آتی ہیں۔'' عائشہ مکھیاں اڑاتے ہوئے بولی: ''ٹڈی یہاں کبھی نہیں دیکھی۔ شادی سے پہلے سال جب میں روشن پور آئی تھی تو کتنی ٹڈی آئی تھی۔ گاؤں کی ساری لڑکیاں ٹڈی پکڑنے کو نکل آئی تھیں اور سارے مرد فصلوں میں گھس کر شور مچا رہے تھے۔ اور ہمیں دیکھ کر تم کھیت سے نکل آئے تھے اور تم نے مجھ سے کہا تھا ''ٹڈی مت کھانا۔ عورتوں کے لئے اچھی نہیں ہوتی۔ بس مرد کے لئے اچھی ہوتی ہے۔'' اس وقت میں راول کی

مانگ تھی۔ اس نے ہمیں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ راول آج کل کہاں ہے؟ آج بارش آئے گی۔ آسمان تپ رہا ہے اور چیلوں کی آواز تم نے سنی ہے؟ پانی مانگ رہی ہیں۔ دور اوپر...... وہ دیکھو۔ آج کریلے اچھے نہیں ہیں؟ آج پودینہ نہیں تھا۔ رحیم کے بیٹے کے پیٹ میں مروڑ اٹھا تھا وہ سارا توڑ کر لے گئے۔ تم نے ہی کہا تھا رحیم کے گھر سے جو کچھ مانگیں دے دیا کرو۔ آج مکھیاں بھی زیادہ ہیں۔ سویرے کچھ لوگ آئے تھے جو مسجد کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے۔ میں نے اندر سے کنڈی لگا کر مکر کر لیا۔ (علی نے کھانا کھاتے ہوئے دل میں اسے گندی سی گالی دی) دیر تک وہ دروازہ توڑتے رہے، پھر چلے گئے۔ ہم کوئی مسجد میں جاتے ہیں جو چندہ دیں۔ کالو کے پیچھے میں بھاگی تھی مگر وہ تیز نکلا۔ میں کتنا تیز بھاگتی تھی تمہیں یاد ہے؟ میرا جی گاؤں جانے کو کرتا ہے۔ یہاں پر چڑیاں نہیں ہوتیں۔ ایں؟'

علی کو بھوک نہ تھی مگر کھائے جا رہا تھا، ہر ایک نوالے کو چبا کر، باریک لعاب بنا کر نگل رہا تھا۔ جب اس نے پانی پی کر برتن عائشہ کو پکڑائے تو بھی وہ باتیں کر رہی تھی۔ وہ ایک بے تمیز کسان لڑکی تھی جس کی زندگی کی واحد خواہش اپنے مرد کو خوش کرنا تھی، اس قوی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اسے باتیں کرنے کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔ جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو علی چارپائی پر لیٹا چھت کو تک رہا تھا۔ وہ پھر باتیں کرنے لگی۔

''دروازہ بند کر دے۔ یہ روشنی۔'' علی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ بولتے بولتے اس نے دروازہ بند کیا۔

''بک بک بند کر۔ ادھر آ۔'' علی نے کہا۔

وہ گنوار عورتوں کی طرح آ کر اس کے پاس بے سدھ لیٹ گئی۔ علی اس کی لمبی، گول ران پر ہاتھ رکھے لیٹا رہا، انتظار کرتا رہا، پھر یکایک اندھیرے میں ہنسا اور اس پر جھک گیا۔ ہنسی کی آواز مصنوعی اور کھوکھلی تھی۔

بعد میں وہ دیر تک بے دم لیٹا ہوا چھت کو گھورتا رہا اور غنودگی آہستہ آہستہ اس پر طاری ہوتی گئی۔ اس کے اعصاب پُرسکون تھے لیکن روح کی سوزش، دب جانے کے باوجود قائم تھی۔ آج کا دن تیز جلن کا دن تھا۔ ایسے دن لمبے لمبے وقفوں پر آیا کرتے تھے۔

(۲۹)

''اے لڑکو، لڑکیاں ہیں'' فتح احمد نے دروازے میں رک کر کہا۔ پھر وہ مڑا اور ایک آنکھ بھینچ کر مسکرایا۔

''کچھ لڑکیاں ہیں۔'' اس نے دوبارہ کہا۔

سارے 'سپننگ روم' میں ایک خاموش اضطراب پھیل گیا۔ بیزار چہروں پر رنگ آ گیا اور مشتاق نظریں دروازے پر لگ گئیں۔ باہر فیکٹری کی فضا ہمیشہ کی طرح بے موسم اور گرد آلود تھی۔ ایک مزدور اوزار بجاتا ہوا تیز تیز میدان پار کر رہا تھا۔ اندر قطار در قطار چلتے ہوئے تکلوں پر کھڑے ہوئے مزدوروں میں یہ خبر آہستہ آہستہ پھیلنے لگی۔

فضل نے ہمت کر کے اپنا تکلا چھوڑا اور دروازے میں جا کر سر باہر نکالا۔ فیکٹری کی گرد آلود فضا صاف ہوگئی تھی اور اس میں موسم کے رنگ نکھر آئے تھے۔ شوخ رنگوں کے اونی لبادے اور شالیں اوڑھے طالب علم لڑکیوں کا گروہ لاپروائی سے چلتا ہوا سپننگ روم کی طرف آ رہا تھا۔ سرما کی تیز ہوا میں ان کے لبادے اڑ رہے تھے اور سر پر بندھے ہوئے رنگین رومالوں میں سے نکلی ہوئی گھنے سیاہ بالوں کی لٹیں ان کے ماتھوں پر پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ وہ سب نوعمر' صحت مند لڑکیاں تھیں اور کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ چند لمحے تک وہ دونوں دروازے میں کھڑے خوشگوار تحیر کے ساتھ انہیں دیکھتے رہے' پھر جلدی سے ہٹ آئے۔ واپسی پر فضل علی کے پاس رکا۔ اس کے ایک زوردار دھپ سے علی اچھل کر سیدھا ہوگیا۔

''کیا ہے؟'' اس نے گالی دے کر کہا۔

''لڑکیاں آئی ہیں۔''

''ہنہہ ......''

فضل مکاری سے ہنستا اور اس کے کندھے پر ہاتھ مارتا ہوا آگے چلا گیا۔ علی نے دوبارہ گالی دی۔

ان کے ساتھ ایک نوجوان انجینئر' جس نے لباس میں غیر معمولی اہتمام کر رکھا تھا' بے حد اخلاق کے ساتھ آگے آگے چل رہا تھا۔ گروپ کے آخیر میں دو لڑکیاں نوجوان کی چال ڈھال کی نقل اتار رہی تھیں۔

''یہ تکلے ہیں۔ یہاں کپڑا بُنا جاتا ہے۔''

''چرخے؟''

''ہاں۔ مشینی چرخے۔'' انجینئر نے فخر سے مسکرا کر کہا۔

''چرخہ ......'' شرارتی لڑکیوں میں سے ایک نے انجینئر کی طرف اشارہ کر کے اپنی ساتھی سے کہا۔

''مشینی چرخہ......'' دوسری نے زیرلب دہرایا اور ہونٹ دبا کر ہنسی۔

''یہ کیا ہے اے اے۔''

''ارررر آ آ ......'' انجینئر نے جھپٹ کر بڑی لڑکی کی شال تکلے میں سے چھڑالی۔ وہ لڑکی جو گروپ کی لیڈر معلوم ہوتی تھی اور سنجیدگی سے انجینئر کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی سب چیز دیکھتی رہی تھی' اب حواس باختہ کھڑی پھٹی ہوئی شال کو ہاتھ میں مروڑ رہی تھی۔

''محرک مشینری'' انجینئر تنبیہاً ہاتھ ہوا میں ہلا کر پکارا۔ ''محرک مشینری کے نزدیک کوئی مت جائے۔ یہ انتہائی خطرناک ہے۔ اور اپنے اپنے لبادوں کو ڈھیلا مت چھوڑیئے' یہ انتہائی خطرناک ہے اور ...... یہ انتہائی خطرناک ہے' بہر حال۔''

''اف اللہ' کتنا شور ہے۔'' ایک لڑکی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''چرخے کے نزدیک مت جاؤ۔'' پہلی شرارتی لڑکی نے کہا۔

''چرخے کو ہاتھ مت لگاؤ۔'' دوسری شرارتی لڑکی نے کہا۔

مشینری کے شور میں ان کی آواز زیادہ دور تک نہ جاسکی۔ دو رویہ متحیر اور سادہ' جھجک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مزدوروں کے بیچ بیچ یہ خوبصورت مجمع آگے بڑھتا گیا۔

''اے......'' ایک مزدور کے پاس رک کر انجینئر مصنوعی غصے سے چلایا۔ ''تکلا اُدھر نہیں اِدھر ہے۔''

مزدور کھسیانا ہو کر مشین کو گھورنے لگا۔

''چرخہ اُدھر نہیں اِدھر ہے۔'' دونوں شرارتی لڑکیوں نے کہا۔

مستقل باتیں کرتا اور نکٹائی کو چھوتا ہوا نوجوان انجینئر گروہ کے آگے آگے باہر نکل گیا۔

مزدوروں میں آہستہ آہستہ اضطراب پھیلنے لگا۔ پہلے وہ اپنی اپنی جگہوں پر پیر گھسیٹتے رہے' پھر دروازے کی طرف بڑھنا شروع ہوئے۔ پہلے فٹر' پھر نائب فٹر' پھر تکلوں والے' چھوٹے سے دروازے پر دس بارہ سر اکٹھے ہوگئے اور ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے۔ اب سارا تحیر مٹ چکا تھا اور مسرور قوتیں بیدار ہو رہی تھیں۔ وہ وحشیانہ طور پر ہنس رہے تھے' بے دھڑک گالیاں دے رہے تھے اور ایک دوسرے کی بغلوں میں سر دے کر اچھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی لڑکیوں کا گروہ آہستہ آہستہ میدان پار کر رہا تھا۔ تیز سرد ہوا میں ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے اور انہوں نے اپنے لبادے کس کر لپیٹ رکھے تھے جن میں سے ان کے صحت مند جسموں کا ایک ایک عضو متحرک دکھائی دے رہا تھا۔ روئی کے کمرے' صفائی کے کمرے اور کھڈیوں کے کمرے کے دروازے انسانی سروں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔

چھوٹا سا گنجا فورمین عقبی دروازے سے داخل ہوا اور بہت سی مشینوں کو خالی پا کر سیخ پا ہوگیا' بھاگتا ہوا دوسرے دروازے پر پہنچا اور پچھلے دو مزدوروں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اچھلا۔

''کیا ہے۔ کیا ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ گرجا۔

پہلے دو مزدور تیزی سے اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچ گئے۔ اگلے دونوں کی پشت پر ہاتھ رکھ کر فورمین نے دوبارہ اونچی چھلانگ لگائی اور زمین پر آ رہا۔

''سؤرو' یہ کیا ہو رہا ہے۔ مشینوں کو کیوں چھوڑا' ہیں؟ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔ ہیں؟''

مزدور کھسیا کر وہاں سے کھسکنے لگے۔ فورمین ان کے درمیان اچھلتا رہا۔ جب فٹر اس کی نظر بچا کر گزرنے لگا تو اس نے اسے کالر سے پکڑ لیا اور انگلی ہلا ہلا کر ملامت کرنے لگا۔ فٹر احمقوں کی طرح ہنستا رہا۔

جب فورمین چلا گیا تو مشینوں پر کھڑے ہوئے انسانوں کی شوخی پھر اوپر آ گئی۔

''سیدھا ان کے پیچھے جا رہا ہے۔ گنجا سؤر۔'' ایک مزدور نے کہا۔ علی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''جاؤ...... اپنی جگہ پر جاؤ'' فٹر ان کے قریب آ کر چیخا۔ ''اب ان کو پکا کر کھانا چاہتے ہو؟''

دونوں بزدلی سے ہنستے ہوئے واپس آ گئے۔ فٹر جا کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

''' اسے ناچتے ہوئے دیکھا تھا۔ گنجے مسخرے کو؟''

''ہاں۔'' علی ہنسا۔ ''میرے کندھے تک بھی نہ پہنچتا تھا۔''

''گنجے بونے کو؟'' فضل نے ٹھٹھا مار کر پوچھا۔ ''وہ اور اس کا باپ اوپر تلے کھڑے ہو جائیں تو پار کر جاؤں۔''

''چپ رہ شیخی خورے۔'' پہلا مزدور جل کر بولا۔

''ہیں؟'' فضل للکارا۔ ''تم کھڑے گھوڑے کو پار کر سکتے ہو؟''

''ہنہ۔'' دوسرے نے حقارت سے کہا۔ ''نہ ہوگا گھوڑا نہ تم کرو گے پار۔''

''تو ...... آ جاؤ۔'' فضل نے چاروں طرف دیواروں پر اونچی اونچی نظریں گھمائیں۔ ''اس پر ...... اس پر۔'' اس نے ایک اونچی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''آ جاؤ۔''

دونوں نے ہنستے اور گالیاں دیتے ہوئے لنگوٹ کسنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ساتھ وہ دروازے سے باہر بھی دیکھتے جا رہے تھے۔ میدان کے دوسرے سرے والے ہال کی کھڑکیوں میں سے طالب علموں کے سر نظر آ رہے تھے۔

''چلو......'' ایک نے کہا۔

''پہلے تم جاؤ۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

فضل نے ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ باہر کی طرف دوڑائی اور تیزی سے بھاگا۔ جب دیوار چند قدم پر رہ گئی تو اس نے رفتار تیز کر دی اور دیوار پر پاؤں مار کر اچھلا اور کھڑکی پر ہاتھ ٹکا دیئے۔ اب وہ بازوؤں کے سہارے لٹک رہا تھا۔

''شاباش۔'' کھڑکی کے قریب کی مشین والا ران پر مکا مار کر چلایا۔

فضل بازوؤں کے زور پر آہستہ آہستہ اٹھنا شروع ہوا۔ ذرا سا اٹھ کر رکا اور نیچے آ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد پھر اٹھا اور ناکام رہا۔ اس دفعہ وہ پہلے سے زیادہ اٹھ گیا تھا اور زیادہ دیر تک رکا رہا تھا۔ نیچے کھڑے ہوئے مزدور جوش سے چلائے۔ تیسری دفعہ اس نے دانت پیس کر زور لگایا اور اس کی ٹھوڑی کھڑکی کے زینے تک پہنچ گئی۔ وہ رکا رہا، رکا رہا۔ اس کے دانت ننگے ہو کر ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے اور کندھے بری طرح کپکپا رہے تھے۔ اس نے گھٹنے اور پاؤں چلائے لیکن دیوار سیدھی اور ہموار تھی اور اس پر کوئی سہارا نہ تھا۔ ایک آخری کوشش میں اس نے ہاتھ اٹھا کر سلاخوں کو پکڑنا چاہا مگر دوسرا ہاتھ بوجھ کو نہ سنبھال سکا اور پھسل گیا۔ اس کی ٹھوڑی کھڑکی کے پتھر سے ٹکرائی اور وہ دھڑام سے نیچے آ گرا۔ نیچے والے مجمع میں سے مایوسی کی کراہ بلند ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھا اور لنگڑاتا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کا انتظار کئے بغیر دوسرا مزدور پوری قوت سے بھاگا اور دیوار پر پاؤں مار کر بہت اونچا اچھلا۔ پہلی ہی کوشش میں اس نے مضبوطی سے ہاتھ سلاخوں پر جما لئے۔ لیکن اس کے بازو کمزور تھے۔ دو ایک بار خفیف سا اوپر اٹھنے کے بعد اس نے ہاتھ چھوڑ دیئے اور بلی کی طرح پاؤں پر گرا۔ مزدور، جو اب

کھڑکی کے نیچے اکٹھے ہو گئے تھے' ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ ناکام چھلانگیے نے ڈھٹائی سے انہیں گالی دی اور بلاوجہ ہنسنے لگا۔

فنڑ جو مجمع کے سر پر آ گیا تھا' پہلے تو بھنایا' پھر مزدوروں کا جوش و خروش دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا اور ان میں دلچسپی لینے لگا۔ دو تین اور جوان پھلانگنے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

''ایک ایک کر کے ...... ایک ایک کر کے۔'' فنڑ پکارا۔ ''مشینوں کو خالی مت چھوڑو۔ جو چھلانگ لگائے گا اس کی مشین کا دوسرا دھیان رکھے گا۔ ایک ایک ......''

ایک ایک کر کے سب جوانمردوں نے چھلانگ لگانی شروع کی۔ کافی دیر تک وہ زور آزمائی کرتے رہے مگر دیوار سرد اور اٹوٹ تھی۔ اس نے سارے نوجوانوں کے غرور کو مجروح کر دیا۔ دانت پیس پیس کر' پٹھے کھینچ کھینچ کر اور رگیں پُھلا پُھلا کر انہوں نے اپنی ساری قوتیں صرف کر دیں۔ ایک مسخرہ مزدور دیر تک جو سلاخوں سے لٹکا رہا تو اس کے ہاتھ وہیں پر جکڑے گئے اور اس کو نیم بیہوشی کی حالت میں سیڑھی کی مدد سے نیچے اتارا گیا۔ اس کے بعد سب نے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے یہ کھیل بند کر دیا۔

ایک گھنٹے کے بعد حالات معمول پر آ گئے۔ سب مزدور اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے مشینوں کی یکساں' بیزار کر دینے والی آواز کو سن رہے تھے۔ باہر فیکٹری کی فضا بے موسم اور گرد آلود تھی اور ہوا کا زور ٹوٹ چکا تھا۔

(۳۰)

اوپر کی منزل سے جو چوبی زینہ برآمدے میں اترتا تھا مسلسل استعمال کی وجہ سے گھس چکا تھا مگر اس کی لکڑی سیاہ' ٹھوس اور عمدہ تھی۔ نجمی نے برآمدے میں اترتے ہی ناک اٹھا کر سونگھا۔ ہوا میں بارش اور گیلے پتوں کی مہک تھی۔ اس نے خوشی سے کپڑوں پر ہاتھ پھیرا اور پائنچے اٹھا کر احتیاط سے چلنے لگی۔ برآمدے کا فرش گیلا اور پھسلواں تھا۔ اندر سے خالہ نے اُسے دیکھا اور پکاری:

''بی بی ...... ننگے پاؤں ں ں ......''

اس نے چوٹوں کی طرح گردن کندھوں میں چھپا لی اور دیوار کی اوٹ میں ہو کر چلنے لگی۔ برآمدہ خالی اور طویل تھا اور بھیگی ہوئی چڑیاں بیلوں میں بیٹھی پر جھٹک رہی تھیں۔ اس نے پائنچے چھوڑ دیئے۔ ڈھیلے ڈھالے پاجامے میں اس کے پاؤں اور پائنچے گیلے ہونے لگے۔ برآمدے کے وسط میں چند لمحے کو رک کر اس نے بے مدعا' اطمینان کے ساتھ آس پاس کی بے رنگی اور بیزار کر دینے والے موسم کو دیکھا۔ پھر اُس نے پائنچے اُٹھا لیے۔ اس کے پاؤں زردی مایل اور دبلے تھے۔ چلتے چلتے اس نے ایک پاؤں پلٹ کر دیکھا۔ تلوا گلابی اور دھلا ہوا تھا اور اس میں فرش کی نمدار' خوشگوار ٹھنڈک جذب ہو رہی تھی۔ برآمدے کے موڑ تک پہنچتے پہنچتے اس نے پھر پائنچے چھوڑ دیئے اور باہیں ہلاتی ہوئی لاپروائی سے چلنے لگی۔ اگلے بازو میں بہت سی اوٹ پٹانگ چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ پنگ پونگ

کی میز کے کونے پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلانے لگی۔ دوسرے کونے میں عمران دیوار سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس نے ایک سرسری' سست نگاہ اپنی نوعمر پھوپھی پر ڈالی اور باہر دیکھنے لگا۔

وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھی پاؤں ہلاتی رہی' پھر مڑ کر شگفتگی سے بولی۔ ''ہلو ماسٹر ڈل''

عمران نے ٹھہری ہوئی' کاہل نظروں سے جن سے حماقت اور لاعلمی کا اظہار ہوتا تھا' اسے دیکھا۔

''موسم نے سارا مزا خراب کر دیا۔'' وہ پھر بولی۔

''ہاں۔'' عمران نے سر ہلایا۔ وہ ایک سست دماغ اور بھیگی بھیگی اداس آنکھوں والا نوجوان لڑکا تھا جس کے چہرے پر کوئی تاثر شاذ ہی پیدا ہوتا تھا نجمی بیزاری کے باوجود اسی طرح بیٹھی شگفتگی سے ٹانگیں ہلاتی اور فرش پر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھتی رہی۔ بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ ایک بھٹکی ہوئی زرد تتلی برآمدے میں سے گزری۔

''زرد گلاب کی پنکھڑی۔'' وہ بولی۔ ''تم نے وہ نظم سنی ہے جو میں نے جاڑوں میں لکھی تھی؟''

عمران نے اپنی لاعلم نظروں سے دیکھا۔ ''جاڑوں میں؟ اوہ...... ہاں' جاڑوں میں۔''

''ساری چڑیاں بھیگ گئی ہیں۔ تتلیاں غائب ہو گئی ہیں۔ برسات آ گئی ہے۔'' وہ گاتی ہوئی بولی۔

''تتلیاں جاڑوں میں ہوتی ہیں۔'' عمران نے بے حد اہم لہجے میں' جیسے کہ وہ ہر معمولی بات کو ادا کیا کرتا تھا' کہا۔

''جب دن میں باہر بیٹھتے ہیں اور دھوپ میں ایسی چمک ہوتی ہے اور ہر طرف تتلیاں اڑتی پھرتی ہیں رنگ برنگ اور شہد کی مکھیاں رنگ برنگ ...... رنگ برنگ' اور تازہ ہے نہیں؟ اوہ......'' اس نے مٹھیاں کس کر چھاتی میں بھینچ لیں اور آنکھیں میچ کر ہنسی۔ ''ہے نہیں؟''

''میں نے پرویز بھائی کو سنائی تھی' زرد گلاب کی پنکھڑی۔'' اس نے پاؤں پھیلا کر بارش کی پھوار کو محسوس کیا اور گنگنائی۔ ''گلاب جو خزاں کی بارش میں پھولتا ہے۔''

''پپا ابھی تک نہیں آئے۔'' نوجوان لڑکے نے بچوں کی طرح بھیگی بھیگی اداس آنکھیں اٹھا کر کہا۔

''پرویز بھائی کبھی نہیں آتے۔ پچھلی بار بھی آدھی رات کو پہنچے تھے۔ آج بھی نہیں آئے۔''

''انہوں نے تحفہ تو دیا ہی تھا۔''

''تحفوں کا کیا ہے۔'' وہ رنج سے چیخ کر بولی۔

عمران ششدر بیٹھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کو جمع ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ پاؤں لٹکائے' دونوں ہاتھ گود میں رکھے خاموش بیٹھی بارش کے شور کو سنتی رہی۔ آس پاس گہرا سکوت تھا۔ بے رنگ' بارش آلود سہ پہر کا سکوت جس میں گیلی چڑیاں برآمدے کی بیل میں چھپی سست' مختصر آوازوں میں باتیں کر رہی تھیں اور بادل بہت نیچے جھک آئے تھے اور یوکلپٹس کی چوٹیوں میں پھر رہے تھے۔ یہ برسات کی پہلی بارش تھی جس نے آج نجمی کی سالگرہ کا ستیاناس کر دیا تھا۔

عمران اپنے کونے پر بیٹھا کاہلی سے پنگ پونگ کی جالی کو کھولتا اور لپیٹتا رہا۔ کبھی کبھی وہ سہمی ہوئی نظر نجمی پر بھی ڈال لیتا جو ایک بڑے سے سر والی، دبلی پتلی اور سیدھے سادے، قدرے ہموار جسم کی لڑکی تھی۔ وہ ایسے لوگوں میں سے تھی جن کی صحت کا اندازہ لگانے میں ہمیشہ مشکل پیش آتی ہے، جو ہر روز مزاج کے مطابق رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا قد چھوٹا تھا مگر جسم کے تنگ چوکھٹے کی وجہ سے پست قد نہ لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی خصوصی جاذبیت نہ تھی۔ صرف اس کے نسبتاً بڑے سائز کے سر نے اس میں مستقل کم عمری کی دلکشی پیدا کردی تھی۔ اور پھر اس کی آنکھیں تھیں، سیاہ اور مائع اور بڑی بڑی اور گہری اور بے حد روشن۔ اس کی ساری شخصیت میں صرف آنکھیں تھیں جو دیکھنے والے کو متاثر اور مبہوت کرتی تھیں۔ نازک جسم اور پھیکے چہرے پر وہ اس قدر ذہین اور جاندار آنکھیں تھیں اور اس کے بال تھے جو سیدھے اور سیاہ تھے اور اس کی آنکھوں سے میل کھاتے تھے۔ اس کی غیر معمولی حساس طبیعت نے اسے گھر بھر کے لئے دردِ سر بنا رکھا تھا۔ اس وقت وہ برآمدے میں بیٹھی جلد جلد آنکھیں جھپکتی ہوئی دور دور تک گرتی ہوئی بارش کو دیکھ رہی تھی۔ بادلوں کے نیچے آنے سے دن کی روشنی گھٹتی جا رہی تھی۔

"ہلو ماسٹر ڈل۔" خاموش بیٹھے بیٹھے اس نے دوبارہ مڑ کر شگفتگی سے کہا۔

"ہلو۔" عمران نے رکھائی سے جواب دیا۔ وہ پھر اپنی مخصوص بے خیالی میں جا چکی تھی۔ اس کی یہ اوٹ پٹانگ ذہنی غیر حاضری عمران کو پریشان کر دیتی تھی۔

پھر وہ ٹانگیں اوپر سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ "میں بارش دیکھنے کے لئے آئی ہوں۔ بارش اتنی دور دور تک ہو رہی ہے۔ ایسا عجیب لگتا ہے۔"

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ماسٹر یہ بارش جو ہے یہ تم کو بیزار کرتی ہے کہ تم کو اچھی لگتی ہے؟ بتاؤ۔"

"مجھے۔" وہ تیز تیز جالی لپیٹنے لگا۔ "بیزار نہیں کرتی۔"

"اچھا؟" نجمی نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ پھر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کانوں پر رکھ کر دبائیں۔ "اوہ خدایا۔ پتا نہیں ...... مجھے کچھ پتا نہیں چلتا۔ بس ایسا عجیب لگتا ہے۔ ہاؤ سلی۔" تھوڑی دیر کے بعد اس نے دونوں ہاتھ گود میں رکھ لئے اور آنکھیں کھول کر دھیرے دھیرے کہنے لگی: "یہ مجھے بیزار بھی کرتی ہے اور میں اس کو دیکھنے کے لئے بھی آئی ہوں۔ پتا نہیں کیوں۔"

لیکن عمران نے محسوس کیا کہ وہ وہاں پر نہ تھی، وہ اسے دیکھ بھی نہ رہی تھی۔ وہ اس پر نظریں جمائے کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ بارش کا شور بڑھ گیا اور بیلوں میں بھیگتی ہوئی چڑیاں گھبرا کر اڑنے لگیں۔

"بارش تیز ہوگئی ہے۔" عمران نے اہم لہجے میں اطلاع دی۔ وہ چونک پڑی۔ "بارش کی آواز کو تم سن رہے ہو؟"

لڑکے نے گومگو کی حالت میں سر ہلایا۔

''اوہ سویٹ۔'' نجمی نے مٹھیاں ہوا میں چلائیں۔ ''ایمی ڈیئر یہ اس قدر بس اررر...... بالکل بے ہوش کر دینے والی آواز ہے۔ بارش کی نا؟ (اس نے پوچھا۔) ہاں جیسے میوزک...... رات کے وقت میں ایک دم بج اٹھیں۔ مکمل میوزک۔ آرکسٹرا۔ یا رقص کی تال جیسے ایک دم تیز ہو جائے' گھنگرو' یا پھر...... ارے نہیں بھئی۔'' اس نے ہاتھ جھٹک کر گود میں رکھ لئے اور خلا میں دیکھنے لگی۔ لڑکے نے اطمینان کا سانس لیا اور جالی میز پر رکھ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ پھر بول اٹھی: ''ارے ہاں۔ جیسے میوزک بجتے بجتے ایک دم تھم جائے' یا ناچتے ناچتے کوئی ایک دم رک جائے۔ ایک دم' تو پھر جو شور پیدا ہوتا ہے کانوں میں تیزی' بالکل بے ہوش کر دینے والا پیدا ہوتا ہے نا سارے میں؟ تمہیں پتا ہے؟ یعنی گھنگرو جب ایک دم تھم جائیں تو اس کے بعد......'' اس نے آنکھیں پھیلا کر سمجھانے کی کوشش کی۔

دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''ہائے سویٹ ایمی ڈیئر میوزک کلاس میں اتنی دفعہ میں نے محسوس کیا اور آج ابھی اس وقت مجھے یاد آیا ہے کہ یہ بالکل ویسا ہے۔ پر ماسٹر یہ کہاں سے آتا ہے' بتاؤ۔ یہ بارش تو تمہیں پتا ہے کہاں گرتی ہے۔ راستوں پر' چھتوں پر' درختوں پر' پتوں پر۔'' اس نے ہاتھ پھیلایا۔ ''ساری بے آواز جگہوں پر۔ پھر یہ میوزک کہاں سے آتا ہے۔ بتاؤ۔''

لڑکا اپنی جگہ پر کسمسا کر خاموش رہا۔

''تم نے سنا ہے تو ضرور پتا ہوگا۔ ایمی بتاؤ نا۔''

وہ عادی' بیزار نظروں سے بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اچانک نجمی نے کانوں کو دونوں ہاتھوں میں ڈھانپ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تمہیں کچھ پتا نہیں۔'' وہ چیخی۔ ''کچھ بھی نہیں۔ ڈل۔ ڈل ماسٹر۔''

وہ پھر پلٹ کر بیٹھ گئی۔ بارش کا شور آہستہ آہستہ کم ہو گیا اور بادلوں کے اٹھ جانے سے اجالا بڑھنے لگا۔ جب وہ بیٹھی بیٹھی اکتا گئی تو میز سے اتر کر برآمدے کی سیڑھیوں تک گئی اور بارش میں ہاتھ پھیلا کر کھڑی رہی۔ بارش بدستور کبھی تیزی کبھی آہستگی سے ہوتی رہی۔

برآمدے کے کونے سے ایک مہری گھاگرا اٹھائے تیز تیز چلتی ہوئی نمودار ہوئی اور پاس آ کر چائے کے لئے بولی۔

''ہم یہیں پر چائے پئیں گے۔'' عمران نے کہا۔

''ہاں' ہم یہیں پر چائے پئیں گے۔'' نجمی نے خوشی سے کہا۔

''آج لیلیٰ بڑا عمدہ ناچی تھی۔'' عمران نے کہا۔

''او ونڈرفل ایمی' اس سے اچھی رادھا تو وہ ڈرامے میں بھی نہیں بنی تھی۔'' وہ کھسک کر اس کے قریب ہو بیٹھی۔ ''اور اس کی بہن نے ماسک کیا شاندار بنائے تھے۔ ارے کچھ بھی پتا نہیں چلتا تھا اللہ...... وہ سینٹ زیویئرز میں ہے۔''

''تم نے میرے گھوڑے کی ٹانگ توڑ دی۔'' عمران نے منہ لٹکا کر نیچے دیکھا جہاں اس کا تین ٹانگوں والا گھوڑا اوندھا پڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔

''مجھے اتنا افسوس ہے ایمی ڈیئر پر میں کیا کرتی' تم خود ہی میرے اوپر چڑھ آئے تھے۔ ریس میں کوئی گھوڑا اپنی لین بھی چھوڑتا ہے؟ میرے گھوڑے نے دولتی لگائی تمہارے گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔''

''گھوڑے نے لگائی یا تم نے لگائی۔'' لڑکا جل کر بولا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی: ''لیکن مجھے افسوس ہے ایمی۔ ہم ایسے عزیز العزیز ترین دوست ہیں آپس میں' نہیں؟''

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ آمنے سامنے بیٹھے میز کی ہموار چمکدار سطح پر چائے کے قطرے ٹپکاتے ہوئے وہ خوشی سے دن بھر کی باتیں کرتے رہے۔

''فرحت کیوں نہیں آئی؟'' عمران نے پوچھا۔

''اسے انفلوئنزا ہو گیا ہے۔ ریاض نے ہمیں بتایا۔ اُسے دیکھنے کو ہم کل صبح جا رہے ہیں۔''

''ہاں کل صبح۔''

''پچھلی بار جو ہم نے مبارک باد کا گیت گایا تھا......''

''یہ تمہاری انگلش ٹیچر گریکسن مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔''

''ارے آہستہ بولو بھئی۔'' نجمی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ''عذرا آپا کی بڑی پکی دوست ہے۔ لیکن ایمی' یہ ذرا اچھی بات نہیں۔ تمہیں اس سے بات تو کرنی چاہیے کم از کم وہ اتنی سویٹ ہے۔ اچھا تو اسی لئے مبارک باد کے گیت میں تم بلے کی طرح منہ پھلا کر بیٹھے رہے۔''

''پپا بھی کہتے تھے وہ سویٹ ہے۔'' وہ پھولے ہوئے منہ سے بولا۔

''وہ تو بھئی۔'' نجمی نے سٹپٹا کر کہا۔ ''گیت نوری نے بھی اچھا گایا تھا۔''

''تم اس کے ساتھ لڑی کیوں تھیں؟''

''ارے نہیں بات کر رہی تھی۔''

''ارے واہ' تم تو گرج گرج کر بحث کر رہی تھیں۔''

''میں نے پوچھا تھا آنکھیں بند کر کے جھولا جھولنے سے جو تارے نظر آتے ہیں ان کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کو نہیں آتے نظر۔''

''اسے خواب میں نظر آتے ہوں گے۔'' عمران ہنسا۔

''ارے ہائے ایمی کل میں نے خواب دیکھا۔'' وہ اس پر نظریں جمائے جمائے بے خیالی میں چلی گئی اور رک رک کر بولنے لگی۔ ''خواب دیکھا کہ جنگل ہے اور میں گھوڑے پر سوار جا رہی ہوں جا رہی ہوں اور جنگل گہرا ہوتا

جا رہا ہے گہرا ہوتا جا رہا ہے' پھر گھوڑا بھاگ گیا۔ ہیں؟ پھر گھوڑا مجھے گرا کر کہیں بھاگ گیا۔ میں نے اٹھ کر اسے آوازیں دیں' پونی ...... پونی ڈیئر ...... پونی پونی ...... ' حتیٰ کہ ڈر کے مارے میری آواز بیٹھ گئی اور پونی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر میں چلنے لگی۔ بیچ راستے سے ہٹ کر' کنارے کنارے' درختوں کے نیچے نیچے' میرے اوپر کہرے سے مرے ہوئے درخت تھے اور جب کوئی پتا میرے بالوں پر گرتا تو میں چونک پڑتی۔ پھر پتوں کی بارش ہونے لگی' ہر طرف۔ اور دیکھتے دیکھتے راستہ پتوں میں غائب ہوگیا۔ میں بھاگنے لگی' بہت تیز۔ پتے زرد اور خشک تھے اور میرے پاؤں کے نیچے ان کے ٹوٹنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بھاگتی گئی اور گھوڑے کے ملنے کی دعائیں مانگتی رہی کہ ایک کھلی جگہ آ گئی۔ یہ ایک جھیل تھی جو خشک ہو چکی تھی۔ تہہ میں تھوڑا سا پانی تھا جس پر کہرہ جما ہوا تھا۔ وہاں پر کوئی بھی نہ تھا۔ سوائے ایک پرندے کے جو جھیل کے کنارے ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے قریب جا کر کچھ پوچھا۔ اس ننھے سے آبی پرندے نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور منہ کھول کر قہقہہ لگایا (عمران کھلکھلا کر ہنسا۔ وہ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر بولتی رہی۔) پھر اس نے سر سے مجھے آگے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا آگے پہاڑیاں تھیں جن پر برف گر رہی تھی۔ گر رہی تھی یا گر چکی تھی' یاد نہیں رہا' لیکن وہ برف پوش تھیں۔ میں پھر بھاگنے لگی۔ اب میں خوفزدہ نہ تھی۔ میں خوشی سے بھاگ رہی تھی۔ خوشی سے ...... بہت خوفزدہ نہ تھی۔ میں خوشی سے بھاگ رہی تھی۔ خوشی سے۔ بہت تیز۔'' وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ''کیسا ہے یہ کہ ...... بتاؤ۔''

''اچھا ہے۔'' عمران نے خوشدلی سے کہا۔ وہ ایک دم سرخ ہوگئی۔

''کیوں کر ہے؟ کیوں ہے؟'' اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''کیوں؟'' لڑکے نے سہم کر دہرایا۔ ''پتہ نہیں۔ خوابوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔''

''اوہ ......'' انتہائی رنجیدہ ہو کر وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ اس کا گھٹنا لگنے سے پیالی اوندھی ہوگئی اور اس میں بچی ہوئی چائے میز پر پھیل گئی۔ آنسوؤں کو روکنے کے لئے وہ تیز تیز آنکھیں جھپکنے اور پاؤں ہلانے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

''تم خواب نہیں دیکھتے؟''

''نہیں ...... کبھی کبھی۔''

''کیا۔''

''کیا؟'' لڑکے نے دہرایا۔ ''کچھ نہیں۔ یہی کہ ...... جیسے آج دیکھوں کہ ہم نے برآمدے میں چائے پی۔''

وہ کانوں تک سرخ ہوگئی۔ عمران نے جالی اٹھائی اور اسے کھولنے اور لپیٹنے لگا۔ بے حد گیلی ہوا ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی۔ بیل پر سے بارش کے قطرے سیڑھیوں پر گر رہے تھے۔ اب شام پڑ رہی تھی۔

''تم نے اپنا کام ختم کرلیا؟'' دیر کے بعد نجمی نے مڑ کر پوچھا۔

''کیا؟''

نجمی نے برآمدے کے فرش کی طرف دیکھا۔ عمران جھنجھلا کر اٹھا اور اس کے سامنے سے گزر کر بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگا۔ لکڑی کے گھوڑے' ماسک' ریل گاڑی بمع لائن' کریکر' کاغذ کی ٹوپیاں' غبارے' اور اسی طرح کا کتنا ہی الم غلم۔ وہ رنجیدہ نظروں سے بیٹھی دیکھتی رہی۔

''باقی تم اٹھاؤ گی۔'' آدھی چیزوں کا ڈھیر لگاتے ہوئے وہ پھولے ہوئے منہ سے بولا۔

''یہ میرا کام نہیں۔''

''مجھے نہیں پتا۔''

''میں خالہ سے کہوں گی ...... کہ تم نے اپنا کام نہیں کیا۔''

''میں بھی کہوں گا۔''

''کیا؟''

''کہ تم نے پھر میز پر چائے گرائی ہے۔'' اس نے دونوں بازوؤں میں چیزیں بھرتے ہوئے کہا۔

''تم ...... میری شکایت کرو گے؟'' وہ رنج سے چیخی۔

لڑکے نے بیزاری سے اس کی طرف دیکھا اور چیزیں سنبھال کر چل پڑا۔ ''میں تمہاری پرواہ نہیں کرتا۔'' اس نے کہا۔ وہ اسے برآمدے میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر کود کر اتری اور پائنچے اٹھا کر برآمدوں میں بھاگنے لگی۔ عذرا کے کمرے میں روشنی نہ جلی تھی۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی اور پلنگ پر خاموش بیٹھی تھی۔ نجمی نے قالین پر گر کر اس کی گود میں منہ چھپا لیا۔

''عذرا آپا'' وہ سسک کر بولی۔ 'میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

''کیا ہے بی بی۔ کس کے ساتھ؟'' عذرا نے تشویش سے پوچھا۔

''ماسٹر ڈل۔''

''تو کون کہتا ہے آپ اس کے ساتھ رہیں بیٹا۔ کیا کہتا ہے؟''

''وہ کہتا ہے ...... کہتا ہے کہ خواب میں وہ چائے پیتا ہے اور ......''

عذرا ہنسی۔ ''تو ٹھیک ہے آپ الگ رہیں وہ الگ رہے گا۔'

نجمی نے اس کی گود میں سے منہ اٹھایا اور غصے سے بولی: ''ڈل ...... ماسٹر۔''

''ڈل ماسٹر نہیں کہتے بیٹا' عمران کہتے ہیں۔ وہ آپ سے بڑا ہے۔'' عذرا نے اس کے بال سنوارے' آنکھیں خشک کیں اور جھک کر اس کی پیشانی کو چوما۔ ''اچھا اب آپ جا کر جوتے پہنیں۔''

وہ بارش آلود دن ختم ہو رہا تھا اور عذرا اکیلی دریچے میں کھڑی دور تک گرتی ہوئی بارش اور جھلملاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ رات کے ساتھ مخصوص ہیں۔'' اس نے برقی روشنیوں کو دیکھ کر سوچا۔

بھورے رنگ کی گھنی لٹ اس کے ماتھے پر پھڑ پھڑائے جا رہی تھی۔ اس نے کاہلی سے اسے بالوں میں اڑسا اور دوبارہ اس کے گرنے کا انتظار کرنے لگی۔

''یہ رات کے ساتھ جلتی ہیں۔'' اس نے دوبارہ سوچا۔

لیکن یہ کوئی سوچ نہ تھی۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے بیکار خیالوں میں سے ایک تھا جو خالی الذہن انسان کے دماغ میں آپ سے آپ چلے آتے ہیں۔ وہ اپنی کاہلی اور بے خیالی پر جھنجھلا گئی۔

لیکن وہ اکیلی تھی اور اندھیرا اس کے چاروں طرف پھیل چکا تھا اور بارش صبح سے ہو رہی تھی دور دور' جھلملاتی ہوئی روشنیوں پر اور اس سے پرے اندھیرے کھیتوں اور میدانوں اور درختوں پر' لگاتار......

''جب یہ نہیں تھیں بارش جب بھی ہو رہی تھی۔'' اس نے پھر سوچا اور دل میں خیال کی نارسائی اور بے تکے پن پر جھنجھلائی۔

مسلسل بارش نے اس کے حواس کو کند کر دیا تھا اور وہ بیزار ہو چکی تھی۔ نمدار ہوا اس کے سرد بے جان چہرے سے ٹکرا رہی تھی اور اسٹول پر پاؤں لٹکائے' دریچے کے پتھر پر دونوں کہنیاں رکھ کر بیٹھی وہ اتنی بے حس اور کاہل ہو گئی تھی کہ اٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ اس نے گیلے' منجمد چہرے کو چھونا چاہا مگر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ نہ کر سکی۔ پھر اس نے اوپر کا ہونٹ پھیلا کر سانس کو محسوس کیا۔ سانس گرم تھا اور وہ خوش ہوئی۔ اس بے نام خوشی اور مصنوعی طمانیت کے ساتھ بیٹھی وہ لٹ کے گرنے کا انتظار کرنے لگی جو لاپروائی سے بالوں میں الجھائی گئی تھی۔

چھوٹے چھوٹے' بیکار' لایعنی خیال آپ سے آپ آتے اور جاتے رہے۔ اندھیرے میں اس کا وجود اور احساس دونوں معدوم ہو گئے۔

''سارے وقت بارش ہو رہی ہے۔'' اس نے دل میں کہا۔

رات کی مخصوص' دھیمی اور مسلسل بارش سارے ہی وقت ہو رہی تھی۔ دریچے کے چھجے پر' یوکلپٹس کے پتوں پر' نیچے باغ کے راستوں پر' ترپ' ترپ' ترپ ...... اس کی خاموش آوازوں کی موسیقی سارے میں پھیلی ہوئی تھی' ایک ایک کر کے بند ہوتے ہوئے دریچوں پر' بجھتے ہوئے شیشوں پر' ایک ایک کر کے سوتے ہوئے مردوں عورتوں کے کانوں پر بج رہی تھی۔ رات کا سمے' جو بھاری اور محفوظ سے تھا' جانداروں کے لئے آرام کا سمے تھا۔ لیکن ہوا' جو دن بھر سے گیلی اور مضطرب تھی' چلے جا رہی تھی۔ بالآخر یہ رات غیر آباد نہ تھی۔ بند دریچوں کے باہر ہوتی ہوئی بارش خواب آلود اور پُراسرار تھی۔

''بارش سارے وقت ہو گی۔'' اس نے دل میں دہرایا۔

لٹ ابھی تک نہ گری تھی اور وہ جھنجھلا رہی تھی' ذہن کی نارسائی اور انتظار کی کوفت پر۔ اس نے دوبارہ ہونٹ پھیلا کر سونگھا۔ صرف ایک سانس تھا جسے وہ محسوس کر رہی تھی' گرم اور جاری انسانی سانس' باقی سب چیزوں کو'

بارش کو اور چہرے کی گیلی ہیجان جلد کو اور خوشبودار درخت کے پتوں کو اور اندھیرے میں بازوؤں کی مدھم لکیروں کو اور دور دور جھلملاتی ہوئی گیلی اور اکلوتی روشنیوں کو اس نے فرض کرلیا تھا۔

''پھر؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں دل میں کہا۔

سڑک کے پار دوسرے مکان کے شیشوں پر روشنی گل ہوگئی۔ کسی نے دریچہ کھول کر خاموشی سے باہر جھانکا۔ کوئی سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ بھی اس نے فرض کرلیا (کہ سبھی لوگ تو سوتے ہیں۔)

''پھر؟'' اس نے بیزاری سے دل میں دہرایا۔

برآمدے میں کسی نوکر کے گزرنے کی چاپ سنائی دی۔''بٹیا سو رہی ہیں۔'' انہوں نے ایک دوسرے سے کہا اور گزر گئے۔ باغ کی باڑ کے پیچھے ایک بیل گاڑی بھیگتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس کے نیچے لالٹین لٹک رہی تھی اور گیلی سڑک پر اس کا دھندلا عکس دور تک چلا گیا تھا۔ پھونس کی چھت کے نیچے بیٹھے ہوئے چند کسان موٹی اداس آوازوں میں باتیں کر رہے تھے اور بیلوں کو چلا رہے تھے۔

لیکن اس دوسرے مکان کے شیشوں پر روشنی گل ہوگئی تھی اور ان کے پیچھے رات کا اولیں بوسہ لیا جا رہا تھا' یا شاید لیا جا چکا تھا' کیونکہ وہ دو تھے اور جب کمرہ ابھی روشن تھا تو ان کے سائے شیشوں پر لرز رہے تھے اور وہ ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے باتیں کر رہے تھے' بے آواز باتیں' جن کو صرف وہی جانتے تھے۔ پھر جب مرد نے سگریٹ دریچے میں مسلا اور روشنی گل کر دی تو کسی نے پل کی پل کو دریچہ کھول کر باہر جھانکا' کسی نے ایک مختصر سا قہقہہ لگایا اور دریچہ بند کر دیا اور اب کمرہ گرم اور تاریک تھا اور باہر بارش ہو رہی تھی اور سڑک پر رات کے اِکا دُکا مسافر بھیگتے ہوئے گزر رہے تھے اور اب کمرہ گرم اور تاریک تھا' اور اب کمرہ......

''لاحول ولا قوۃ ......'' اس نے پہلی دفعہ شعوری طور پر سوچا اور اسٹول سے اتر آئی۔ کمرہ پار کر کے اس نے بتی جلانا چاہی لیکن دیوار پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی۔ ایک بہت پرانا خوف تھا جس نے اسے باز رکھا' لمحوں کے بہاؤ کو' وقت کے طلسم کو توڑ دینے کا خوف۔

اور لمحوں کے بہاؤ میں ایک دن اور گزر گیا۔ ایک سال اور۔ ابھی جب دن رخصت نہیں ہوا تھا تو بہت سے بچے کسی کی سالگرہ منا رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے وہ محل کے پچھواڑے گھاس پر نہ جا سکے تھے اور برآمدوں میں ادھم مچاتے پھر رہے تھے اور چلا چلا کر گا رہے تھے اور گھوڑ دوڑ کے مقابلے منعقد کر رہے تھے ...... پچھواڑے کی طرف سبزے پر کیا عمدہ پارٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ اللہ کیا یادگار زمانہ تھا۔ وہ لوگ اب کہاں گئے؟ وہ لوگ' آہستہ برگِ گل بفشاں برمزارِ ما' کوئی بیحد دلکش انداز میں جھک کر کہہ رہا ہے۔ ارے یہ تو ایک بہت پرانا' بہت بھولا ہوا منظر ہے۔ ہشت ...... اور گھوڑ دوڑ کے مقابلے کر رہے ہیں۔ کوئی ریس کے دوران بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ جوڑ رہا ہے۔ کوئی جب پیچھے رہ جاتا ہے تو گھوڑے کو بغل میں دبا کر بھاگ اٹھتا ہے۔ پھر وہ اپنی ہمجولی کو تنگ کرنے لگے کہ وہ انہیں اپنی سالگرہ کی نظم سنائے۔ ارے یہ تو نجمی ہے' یہ پیاری سی عجیب و غریب لڑکی جو نظم سنا رہی

ہے۔ پھر رادھا ناچی اور ماسک ڈانس ہوا۔

''فرحت کی صحت کے متعلق کوئی تازہ بلٹن شائع ہوا؟'' وہ ریاض سے پوچھ رہے ہیں۔ ''سینٹ جونز کی کیبنٹ مین کیک چرانے کا' پورٹ فولیو' ریاض کے پاس ہے۔'' وہ ریاض کو تنگ کر رہے ہیں' ریاض جو گول مٹول سیدھا سادا لڑکا ہے۔ گریکسن انہیں سختی سے منع کر رہی ہے۔ گریکسن جو مشن میں چلی گئی ہے۔ 'اوہ' شریف خاتون' تو گویا آپ راہبہ بن گئیں! تھ تھ تھ۔ اب کیک پر موم بتیاں جل رہی ہیں اور سب مل کر مبارک باد کا گیت گا رہے ہیں' گریکسن جسے لیڈ کر رہی ہے۔

''چودھواں سال جو ختم ہوا۔

اس کے بعد پندرھواں آئے گا اور پھر سولھواں۔

اور ہم پھر گائیں گے: 'پچھلا سال جو ختم ہوا۔'

چودھواں سال جو......''

سالگرہ کا یہ انوکھا گیت ایلس گریکسن کے وطن آئرلینڈ کا ہے۔ ایلس جو ایک بہت پرانی' بہت پیاری ساتھی ہے۔ لیکن اب وہ کچھ نہیں بتاتی' بات بھی نہیں کرتی۔ اب وہ اس قدر کمینے پن پر اتر آئی ہے کہ ملتی بھی ہے تو اجنبیوں کی طرح۔ بس بچوں میں مگن رہتی ہے اور بالوں کو سفید رومال میں کس کر باندھتی ہے اور ہر روز گرجا کے پیانو پر بیٹھ کر گاتی ہے اور اپنی آواز میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔ دھوکے باز لڑکی' تو نے دل کا چین پالیا ہے؟ میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں۔

''ہلو عذرا۔'' وہ اپنے کمینے پن کے سرد' ناآشنا لہجے میں کہتی ہے۔

''ہلو......'' میرے حلق میں کچھ اٹک جاتا ہے۔ جیسے میں نے کبھی اسے 'ایلی' کے نام سے نہیں پکارا' جیسے کبھی اس نے روشن محل کے توشہ خانے کے فرش پر بیٹھ کر پکوان تیار نہیں کئے' جیسے کبھی اس نے فوارے پر پیپل کی جڑ پر' باغ کے کونے کونے میں بیٹھ کر پہروں ارشد سے باتیں نہیں کیں۔ 'کیا ہم نے کبھی سوچا تھا؟' میں پوچھنا چاہتی ہوں' 'یہ سب جو بیتا' خدایا۔ وہ کچھ بھی نہیں بتاتی۔ اس کے باوجود وہ اس قدر عزیز دوست ہے۔ دن رخصت ہوگیا اور روشن محل میں لوگ اب سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ رات کا کھانا کب کا ختم ہو چکا۔ اب وہ درمیانی کمرے میں بیٹھے قہوہ پی رہے ہوں گے یا پی چکے ہوں گے اور اسے کوئی بلانے نہیں آیا۔ اسے کوئی بلانے نہیں آئے گا کہ یہ اس کا حکم ہے۔

''لمحوں کے بہاؤ کو میں روک سکتی ہوں؟'' اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

بارش تھوڑی دیر کے لئے رک گئی تھی۔ وہ بجلی کے بٹن پر سے ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ نیم روشن گیلریاں طویل اور خالی تھیں۔ روشن آغا کے سوا سب کے رہائشی کمرے دوسری منزل پر تھے۔ اونچے' تنگ محرابی دروازے بند تھے اور منقش شیشوں پر روشنیاں جل رہی تھیں۔

روشنیاں بجھ رہی تھیں۔ یہ ممی کا کمرہ ہے جس میں ابھی ابھی روشنی گل کی گئی ہے۔ میری ماں' جس کا میری زندگی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ بس جیسے یہ بند کمرہ ہے اور میں اس کے آگے سے گزر رہی ہوں اور ممی اندر اکیلی رہ رہی ہیں' تنہا اور محفوظ' بے حد شان و شوکت کے ساتھ۔ لیکن میں عذرا ہوں ممی' میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ خدارا بتلایئے...... گیلری خاموش اور اندھیری ہے اور میں اکیلی یہاں سے گزر جاتی ہوں۔ یہ نجمی کا کمرہ ہے۔ میری پیاری بہن جس کو اس گھر میں صرف میں سمجھتی ہوں اور اسی لئے اس سے محبت کرتی ہوں۔

وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ نجمی کمبلوں میں لپٹی' دیوار سے ٹیک لگائے بستر پر بیٹھی تھی۔

''عذرا آپا...... روشن آغا کھانے پر آپ کو پوچھ رہے تھے۔''

''مجھے وہ نظم سناؤ'' اس نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''جو آج سب کو سنا رہی تھیں۔''

''ایک شہزادہ اور اس کا دوست مینڈھا' عذرا آپا؟'' اس نے آنکھیں جھپکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بھئی۔ اکیلا شہزادہ۔''

''نہیں عذرا آپا اس کا دوست مینڈھا بھی۔'' نجمی نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر سمجھانے کی کوشش کی۔

''ارے نہیں بھئی۔'' عذرا نے سٹپٹا کر کہا۔ ''اکیلے شہزادے کی نظم سناؤ۔''

''اکیلا؟'' وہ آنکھیں جھپکنے لگی۔

''اچھا کل سنیں گے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے نجمی کو لٹایا' کشن ٹھیک کئے اور جھک کر اس کی پیشانی کو چوما۔ ''شب بخیر بی بی' اب آپ سو جاؤ۔''

بتی بجھا کر وہ باہر نکل آئی۔ گیلری اسی طرح طویل اور خالی تھی۔ دوسرے سرے پر ایک مہری نے سائے کی طرح لپک کر گیلری پار کی اور زینے پر غائب ہوگئی۔ بارش پھر شروع ہو چکی تھی۔

یہ پرویز کا کمرہ ہے۔ اور اس کی بیوی کا' اس دوسری' اجنبی عورت کا جو مجھے نہیں جانتی۔ بس جیسے ہم روشن محل میں سو رہے ہیں اور سڑک پر سے کوئی مسافر بھیگتا ہوا گزر جائے لیکن پھر بھی یہ اس کا کمرہ ہے اور اس میں اس کا سامان رکھا ہے جس پر گرد جم رہی ہے اور جسے اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں کھول سکتا۔ اور پرویز' میرا بھائی' جو میرا دوست بھی تھا اس کے ساتھ چلتا ہوا دور نکل گیا ہے' اور میں...... وہیں پر آ گئی ہوں جہاں سے چلی تھی۔ کاش میرا بھائی مجھ سے' میری دنیا سے صلح کر لینے پر آمادہ ہو سکتا' کاش...... لیکن میں اس کی پرواہ نہیں کرتی کیونکہ اب میں اپنے کمرے کے سامنے آ گئی ہوں۔ بالآخر یہ میرا کمرہ ہے۔ اس جگہ میں بچپن سے رہتی آئی ہوں۔ یہاں میں نے کیسے کیسے خواب دیکھے ہیں۔ مجھے اس کمرے سے نفرت ہے۔ اس کے دریچے کے شیشوں پر یوکلپٹس کے پتوں کا عکس پڑتا ہے جو مجھے ناپسند ہے۔ بارش جب تیز ہو جاتی ہے تو بے پناہ شور اندر آتا ہے کیونکہ یہ گیلری کے اختتام پر ہے۔ یہ بھی مجھے ناپسند ہے۔ اس کمرے میں مَیں نے کیا کیا سوچا ہے' کیسے کیسے پروگرام بنائے ہیں۔ ان تمیں

سالوں میں جو مجھے یاد ہیں کتنے ہی مسرت کے، کتنے ہی دکھ کے لمحے گزرے ہیں۔ اس لمحوں کے بہاؤ کو میں کبھی بھول سکتی ہوں؟ اور اس کمرے کو جس کی کارنس پر کتنے ہی پھول سوکھ گئے اور کتنے ہی تازہ پھول ان کی جگہ رکھے گئے، پھول جو صرف میری خاطر، اس کمرے کی خاطر اگائے گئے اور کتنے ہی ...... ارے یہ خاموشی کیوں ایک دم ہوگئی سارے میں، میرے ساز، میرے سازوں پر مٹی جم رہی ہے اور برآمدوں میں اتنی ویرانی سمٹ آئی ہے۔ میں ان کو یہاں لاکر رکھوں گی تا کہ وہ دہل جائیں اور یہ خاموشی ٹوٹ جائے۔

اس نے سارے سازوں کے غلاف اتارے اور ایک ایک کر کے انہیں باہر لے آئی۔ طویل، اندھیری گیلری میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تان پورہ، ستار، وائلن، طبلہ، ہارمونیم...... کوئی ایک دیوار کے ساتھ، کوئی دوسری دیوار کے ساتھ، کوئی دروازے کے پاس، کوئی ریلنگ کے ساتھ۔ پھر دیر تک وہ ان کے درمیان پھرتی اور احتیاط سے ان پر انگلیاں دھرتی رہی۔ انہیں خاموش اور بے اثر پاکر اسے خوشی ہوئی۔ اندھیرے میں بھدی، سیاہ شکلیں، وہ دیوار کے سائے میں سوئے ہوئے فقیروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

جب وہ بہت تھک گئی تو جاکر لکھنے کی میز پر بیٹھ گئی۔

''اب؟ اب میں خط لکھوں گی۔'' لیمپ جلاتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا۔ ''کس کو؟ ...... کیا فرق پڑتا ہے۔'' سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اس نے لکھنا شروع کیا۔

''پیاری شیریں!

صبح سے بارش ہو رہی ہے۔ طبیعت سخت اوب گئی ہے۔ آج نجمی کی سالگرہ تھی۔ تمہیں سب نے بہت یاد کیا۔ میں نے، نجمی نے، سب نے۔ ایلس بھی آئی تھی، لیکن وہ کسی کو یاد نہیں کرتی، وہ مجھے بھی کچھ نہیں بتاتی۔ بھلا بتاؤ کس قدر مسخرے پن کی بات ہے۔ اس میں کسی کا کیا قصور تھا۔ پر شیریں، وہ تو انگریز لڑکی ہے، کہتے ہیں یورپی اقوام سمجھدار ہتی ہیں اس معاملے میں اور پھر موت پر کسی کا کیا بس...... اللہ۔

شیریں آج میں نے شام کے سمے کو اپنے اردگرد پھیلتے ہوئے دیکھا، محسوس کیا، تم نے کبھی کیا ہے؟ جب ذرا ذرا بارش ہو رہی ہو اور شام ہر طرف دھواں دھار ہو اور نیلی ہو اور بڑھتی جائے بڑھتی جائے۔ تو تم نے کبھی محسوس کیا ہے؟ ارے یہ ایسی خوبصورت شے ہے شیریں، نرم اور خوبصورت، اولیں بوسہ، یا اولیں سرگوشی یا...... ارے میں کیسے بتاؤں بھئی۔

اور کوریڈور، طویل اور خالی کوریڈور، زندگی سے اس قدر قریب ہیں۔ آج میں ان میں اس طرح پھرتی رہی جیسے کہ وہ میرے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ ایک گیلری میں مجھے چند ساز پڑے ہوئے ملے جو سب کے سب خاموش تھے۔ ایک ستار ابھی تک ریلنگ پر جھکا ہوا ہے۔ جب اس پر بارش پڑے گی تو وہ ٹیون ہوگا؟ میں سوچتی ہوں۔

آج عمران بے حد اداس تھا۔ پرویز ابھی تک نہیں آیا۔ میرے خیال میں بچوں کو والدین کے پاس رہنا

چاہیے۔ نجمی آج سارا دن ننگے پاؤں بارش میں پھرتی رہی' مجھے ڈر ہے اسے زکام نہ ہو جائے۔ تمہارے بچے کیسے ہیں منو اور گڈو۔ حامد بھائی کی صحت کیسی ہے۔ شیریں ہم اس قدر تیزی سے بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم اور تم اور سب...... ایک بات بتاؤ شیریں: محبت کیا اتنا ہی دکھ دیتی ہے؟ کیا انسانوں کی یہی خطا ہے کہ وہ محبت کرتے ہیں؟''

آخری سطریں گھسیٹ کر وہ کرسی کی پشت پر گر گئی۔ 'یہ فرخندہ کے گیلے پاؤں کے نشان ہیں جو قالین پر پڑ گئے ہیں۔' وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھی دیکھتی رہی۔ باہر بارش تیزی سے ہو رہی تھی۔

بارش کے شور سے خالہ کی آنکھ کھل گئی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر کمزور آواز میں مہری کو پکارا جو انہیں کے کمرے میں سوتی تھی۔ وہ نیند میں بڑبڑا کر خاموش ہو رہی۔ خالہ بستر میں پڑی سنتی رہیں۔ بارش عجیب آواز سے ہو رہی تھی۔ پھر انہوں نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ عذرا کے کمرے کے کھلے دروازے میں سے روشنی نکل رہی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئیں۔ برآمدے میں بڑھتے ہوئے وہ کسی شے سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچیں۔ تاروں میں خفیف سی جھنجھناہٹ پیدا ہوئی۔ ''مردار'' انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

عذرا کے دروازے میں وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ کھلے دریچے میں سے ہوا اور بارش اندر آ رہی تھی۔

''بی بی پاگل ہوئی ہو۔'' انہوں نے تیزی سے جا کر دریچہ بند کیا' کمبل اٹھا کر عذرا کے شانوں پر ڈالا اور قالین کو دیکھا جو آدھے سے زیادہ بھیگ چکا تھا۔ ''اتنا پانی پڑ رہا ہے اور آپ بیٹھی بھیگ رہی ہیں۔ اتنی رات گئے۔'' عذرا کرسی سے اٹھی اور کمبل کو شانوں پر ٹھیک کر کے پھر بیٹھ گئی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے اعصابی لہجے میں کہا۔ پھر خالہ کو عجیب نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ گھبرا گئی۔

''بیٹھ جائیے۔'' اس نے پریشان تر لہجے میں کہا اور کاغذات الٹنے پلٹنے لگی۔ خالہ نے اس کے چہرے پر بہت کچھ پڑھ لیا۔ ''عذرا تم ایک بچے کی طرح ہو جو چوری کرتا ہوا پکڑا جاتا ہے۔ حالانکہ تم نہ بچہ ہو نہ تم نے چوری کی ہے۔'' خالہ نے پُرسکوت آواز میں کہا۔ ''ایسا کیوں ہے؟''

عذرا صرف خاموش' زخم خوردہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ خالہ نے میز کا کونہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور کھڑی رہیں۔ لمبی بیماری نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ سفید بالوں کی لٹیں ان کے کانوں پر بے ترتیبی سے لٹک رہی تھیں اور میز کا سہارا لئے کھڑی وہ بیکسی اور کسمپرسی کی تصویر نظر آتی تھیں۔ بارش دریچے کے شیشوں پر سر مار رہی تھی۔ دفعتاً وہ بہت دکھ سے بولیں: ''تمہاری عمر ڈھل رہی ہے...... اور تم ابھی نادان ہو۔''

عذرا نے دہل کر انہیں دیکھا۔ اس کا رنگ سنولا گیا اور ڈھلتے ہوئے چہرے کی لکیریں کانپنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ...... اپنے کمرے میں جائیں۔ آپ یہاں کیوں آئی ہیں۔''

خالہ بڑھاپے کے باوجود جذبے کی شدت سے کانپنے لگیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ ایک دوسرے کے

مقابل آن کھڑی ہوئی تھیں، اس مقام پر جہاں وہ محض دو عورتیں تھیں، ایک دوسرے کے لئے حقارت اور ترحم کے جذبات لئے ہوئے!

چند لمحوں تک وہ گستاخی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر عذرا کی بیکراں الم ناک نظروں کے سامنے خالہ ٹوٹ گئیں۔ میز کا کونہ پکڑے پکڑے وہ فرش پر بیٹھ گئیں اور رونے لگیں۔ عذرا کرسی پر بیٹھ کر کاغذوں کو دیکھنے لگی۔ دریچے کی درزوں میں سے پانی اندر آ رہا تھا۔ خالہ کی بلی ان کی قمیض کے دامن سے کھیل رہی تھی۔

جب خالہ نے آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھایا تو اپنے آپ کو اسی طرح تنہا بیٹھے ہوئے پایا۔ دفعتاً اس وقت خالہ کو اپنے اور عذرا کے، اپنے اور اس دوسری عورت کے درمیانی فاصلے کا احساس ہوا، بعد جو ان کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔

''تم...... کیا تم چاہتی ہو کہ روشن آغا اس غم میں ہلاک ہو جائیں اور......'' خالہ نے کہا۔ ''اور میں یہاں سے چلی جاؤں؟''

''خالہ......'' عذرا نے تقریباً چیخ کر کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

خالہ نے دہشت سے دیکھا کہ وہ دوسری عورت ان سے زیادہ جوان، زیادہ مضبوط اور زیادہ سرد تھی۔ اس کی کچلتی ہوئی سرد نظروں کے سامنے خالہ لوٹنے پر مجبور ہو گئیں۔ ایک نامعلوم ندامت کے مارے انہوں نے جھک کر بلی کو اٹھایا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ جب وہ باہر آ رہی تھیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ عذرا کی زندگی سے بعید تر ہوتی جا رہی ہیں۔ بالآخر وہ ان سے الگ، ایک بالکل دوسری عورت تھی۔

جب وہ اکیلی رہ گئی تو بستر پر جا لیٹی۔ اس کے دماغ میں مکمل سناٹا تھا۔ گھبراہٹ کے باوجود اس کا چہرہ سنگین تھا۔ ایک ایسا گونگا بے تاثر چہرہ جس کا بوجھ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیٹے لیٹے اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں ہوا کی شدید کمی تھی۔ اس نے اٹھ کر دریچہ کھول دیا اور کھڑے کھڑے اس کا چہرہ بھیگ گیا۔ وہ دوبارہ بستر پر لوٹ آئی۔ اب تھوڑے تھوڑے وقفوں پر سناٹا اس کے دماغ میں داخل ہونے لگا۔ لیکن ہوا پھر بھی نہ تھی، ہوا کی ایک رمق اس کے پھیپھڑوں میں نہ تھی۔ ایک دم بہت زیادہ گھبرا کر اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کئے۔ اس کے حلق میں سے گرمی نکل رہی تھی اور زبان اکڑ گئی تھی۔ اس نے زبان کو تالو پر پھیرا۔ ہر سانس کے لئے اسے مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ مایوس ہو کر اس نے چیخنا چاہا لیکن آواز کہیں دور رہ گئی۔ اب اس کے کانوں میں شور مچ رہا تھا۔ کانوں میں اور دماغ میں اور ساری دنیا میں۔ اس کے پھیپھڑے بند ہو رہے تھے۔ یہ کیا ہے؟ یہ کون سا وقت ہے؟ اس نے کوشش کر کے سوچا اور مشکل مشکل سانس لیتی رہی۔ اس نے رونے کی ایک بے سود کوشش کی۔ صرف سانس کو جاری رکھنا اس وقت کا، اس لمحے کا اہم ترین کام تھا۔ سانس جو زندگی کا آخری نشان ہے۔ اسے جانکنی کا خیال آیا اور بہت زیادہ دہشت زدہ ہو کر اس نے سانس لینا جاری رکھا۔ لیکن اس کوشش میں اس کے سر میں سے پسینہ نکلنے لگا۔ سر میں سے اور پیشانی اور گردن اور چھاتی میں سے اور کمر اور ٹانگوں میں سے۔ وہ پسینے میں بھیگ گئی۔

انتہائی تکلیف کی حالت میں اس نے سر اور کندھوں کو دائیں بائیں ہلانا اور کراہنا شروع کیا۔
دیر تک وہ ادھ مرے سانپ کی طرح بستر پر تلملاتی رہی۔ جب تکلیف ختم ہوئی تو اس کے چہرے پر راکھ کے رنگ کی لکیریں گہری ہو چکی تھیں اور اس کے اندر کوئی شے' سرکش اور زور آور' ٹوٹ چکی تھی۔
بارش تھوڑی دیر کے لئے رک گئی تھی اور کمرے میں گیلے قالین کی بُو پھیل رہی تھی۔

(۳۱)

سردیوں کا موسم گزر رہا تھا جب علی کو نعیم کے رہا ہو کر گاؤں پہنچنے کی اطلاع ملی۔ اسی رات کو اپنی بیوی سے مشورہ کرنے کے بعد وہ گاؤں کے لئے روانہ ہو پڑا۔ وہ اب وہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ گاؤں واپس جا کر کھیتی باڑی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ماں ایک سال ہوا مر چکی تھی اور زمینوں پر بڑی ماں (نعیم کی ماں) کا قبضہ تھا۔ چنانچہ اسے نعیم کی واپسی تک رکنا پڑا تھا۔
نعیم اور عذرا کا بڑا مکان برسوں سے بند پڑا تھا۔ اس کا باغ ویران ہو چکا تھا اور راستے گلے سڑے پتوں اور آندھی سے ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں سے ڈھکے پڑے تھے۔ گھاس میں جابجا بوڑھے پرندوں کی لاشیں پڑی ہوئی ملتی تھیں۔ ایک بوڑھا رکھوالا رہ گیا تھا جو دن بھر دھوپ میں بیٹھا حقہ پیتا اور قناعت سے اپنے اردگرد کی مرتی ہوئی دنیا کو دیکھتا اور نظر انداز کرتا رہتا تھا۔ اس روز بھی اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے دیوار کے ساتھ ساتھ گزرتے ہوئے علی کو دیکھا اور پہچان کر دھیان ہٹا لیا۔ وہ نعیم کا پرانا نوکر تھا لیکن علی کو پسند نہ کرتا تھا۔ علی نے آم اور امرود کے بہترین درختوں کو دیکھا جو ضائع ہو چکے تھے اور اس کے دل میں افسوس پیدا ہوا۔ اوپر کی منزل کی کھڑکیوں کے چند شیشے بھی ٹوٹ چکے تھے۔ گاؤں کے چاروں طرف تیزی سے پکتی ہوئی فصل کھڑی تھی۔ علی نے لمبا راستہ پکڑا جو مختلف کھیتوں کا چکر کاٹ کر گاؤں میں داخل ہوتا تھا۔ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے وہ دونوں ہاتھ فصل پر پھیرتا رہا' یوں جیسے کہ وہ گائے کا نومولود بچھڑا ہو۔
مویشیوں کے احاطے میں علی کی بوڑھی بھینس اسے دیکھ کر خوشی سے ڈکرانے لگی۔ علی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جگالی کا جھاگ اس کے منہ سے صاف کرتے ہوئے سوچا۔ ''جانور نہیں بھولتے۔''
اندر نعیم اپنی ماں کے پاس بیٹھا کھا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر گرمجوشی سے اپنے بھائی کے ساتھ گلے ملا۔
''میں خود آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔'' اس نے کہا اور اسے اپنے پاس بٹھا کر مکھن اور روٹی کھانے کو دی جسے علی غیر معمولی اشتہا کے ساتھ کھانے لگا۔ بوڑھی اسے دیکھ کر ہمدردی سے رونے لگی۔
مگر جب دوبارہ نعیم نے اسے دیکھا تو اسے صدمہ ہوا۔
''تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔'' اس نے پوچھا۔

علی نے جھینپ کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''تم بھی تو بوڑھے دکھائی دے رہے ہو۔''

''بوڑھے تو سب ہو جاتے ہیں پر جوان آدمی ...... وہاں کھانے کو نہیں ملتا؟''

''خالص نہیں ملتا۔'' علی نے مختصراً کہا۔

کھانے کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ دیر تک وہ مویشیوں کے درمیان پھرتے اور باتیں کرتے رہے۔ نعیم کے کہنے پر رکھوالا علی کو ہر ایک مویشی کی پچھلی پانچ سالہ زندگی کے حالات' جن میں اس کی بیماریاں' اس کی خوراک اور اس کا کام شامل تھا' مختصراً بتاتا جا رہا تھا۔ ان سے فارغ ہو کر وہ کھیتوں کو نکل گئے۔ ایک پہر تک وہ فصلوں میں گھومتے رہے۔ راستے میں ان کو کئی پرانے دوست ملے جنہوں نے رک کر دونوں بھائیوں کی خیریت پوچھی اور انہیں پھر سے اکٹھا دیکھنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ نعیم نے عمداً اپنے بڑے گھر کی طرف جانے سے گریز کیا گو علی نے دو ایک دفعہ دبی زبان سے خواہش ظاہر کی کہ انہیں وہاں جا کر کم از کم پھلدار درختوں کی حالت کو دیکھ آنا چاہیے۔

واپسی پر نعیم نے پوچھا ''عائشہ کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' علی نے بتایا۔

سہ پہر کے وقت علی سو گیا۔ جب اٹھا تو شام پڑ رہی تھی اور نعیم کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی ماں نے دونوں کے آگے بھنے ہوئے پرند اور گوبھی کے سالن کا کھانا لا کر رکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کھانا شروع کرتے نعیم بولا۔

''میں نے کہا نا کہ میں خود آنے والا تھا۔''

علی سالن کی پلیٹ کو آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔

''چھٹی لے کر آئے ہو؟''

علی پھر خاموش رہا۔

''بولتے کیوں نہیں؟''

''میں وہاں نہیں رہنا چاہتا۔ میں گھر آنا چاہتا ہوں۔'' علی نے کہا۔

نعیم نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی روٹی برتن میں رکھ دی۔ ''لیکن ...... ہاں میں سمجھتا ہوں ...... پر ابھی کچھ دیر تک تو تمہیں وہیں پر رہنا پڑے گا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ ہمیں مزدوروں میں کام کرنا ہے۔ مزدوروں کی جماعت اس وقت ہندوستان کی بہت بڑی طاقت ہے۔ تمہیں پتا ہے؟''

علی کے ہاتھ' جو شورے کی پلیٹ کو گھما رہے تھے' رک گئے۔

''تو اب ...... میں بھی؟'' وہ غصے سے بولا۔ ''تم نے ہمیشہ میرے ساتھ دشمنی کی ہے۔ تم نے یہاں سے مجھے نکالا' اب مجھے جیل بھیجنا چاہتے ہو؟ تم خود جا کر جو مرضی ہو کرو۔''

نعیم اٹھ کھڑا ہوا اور پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں چکر لگانے لگا۔ ایک لوہے کا برتن اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے اڑ کر شور مچاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی ماں آگ جلانا چھوڑ کر دم بخود بیٹھی تھی۔ دھواں چولہے میں

سے نکل نکل کر کمرے میں بھر گیا تھا اور آنکھوں کو لگ رہا تھا۔

ایک بار علی کے سر پر رک کر اس نے کہا۔ ''لیکن تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ خود اپنی خاطر...... احمق۔'' اور جواب نہ پا کر چل پڑا۔ علی نے قمیض کے دامن سے آنکھیں پونچھیں اور دبی زبان سے دھوئیں کو گالی دی۔

یکلخت نعیم غصے سے بولا: ''پھر تم یہاں نہیں آ سکتے۔ اِدھر کا رخ بھی نہیں کر سکتے۔''

''میں وہاں بھی نہیں رہ سکتا۔ میں تنگ آ چکا ہوں۔''

''جاؤ......'' نعیم گرجا۔ ''جہنم میں جاؤ یا کہاں پر ابھی نکل جاؤ۔ جاؤ۔''

''جاتا ہوں۔'' علی آدھے قد سے اٹھ کر پھر بیٹھ گیا۔

''ابھی نکل جاؤ۔'' نعیم پھر گرجا۔

''جاتا ہوں جاتا ہوں۔ کھانا تو کھانے دو۔''

''بھاگ جاؤ سؤر۔ جہاں مرضی ہو جاؤ۔'' اس نے دروازے کی طرف بازو لمبا کر کے کہا۔

''اچھا...... اچھا......'' علی نے انتہائی غصے میں کہا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

روانگی کی تیزی میں اس نے اپنی بوڑھی بھینس کی لگاوٹ کو بھی نہ دیکھا جس نے اسے دیکھ کر کان کھڑے کر لئے تھے۔ گاؤں کو ایک نیلگوں دیہاتی کہر نے لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ جوہڑ کے کنارے رک کر پانی میں چمکتے ہوئے تاروں اور درختوں کے عکس کو دیکھنے لگا۔ غصے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ایک زبردست رنج تھا جس نے اس کے دل کو مردہ پرندے کی طرح کر دیا تھا۔ خاموش اور ناطاقت۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں پر اس نے چند پتھر اٹھا کر پانی میں پھینکے۔ پھر وہ قدموں کی آواز پر چونک پڑا۔ اندھیرے میں ایک ہیولا کمزور چال سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''علی......'' شام کے سناٹے میں نعیم کی آواز آئی جس میں نرمی تھی۔

''سؤرنی کا جنا...... سوتیلا......'' اس نے دانت پیس کر کہا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

گھر پہنچ کر جب اس نے کھانا کھایا اور عائشہ کو ہر دم بک بک کرتے رہنے پر پیٹا تو اس کے دل پر موت کا سایہ گہرا ہو گیا۔ صبح سویرے کام پر جاتے ہوئے اسے عجیب احساس ہوا۔ وہی گلیاں، مکان، نل، وہی فیکٹری، مشینیں، دیواریں، وہی جگہ، وہی منظر، وہی لوگ جن سے وہ ہر روز ملتا تھا، ہر چیز، ہر شے اس قدر حوصلہ شکن طور پر یکساں اور ساکن اور غیر مبدل...... دفعتاً اس جگہ کی تنگی اور خوفناک حد بندی کا احساس بوجھ بن کر اس کے دل پر بیٹھنے لگا۔ وہ فیکٹری کے دروازے سے لوٹ آیا۔

(۳۲)

وہ کئی گھنٹے تک ریل کے سٹیشن پر آتے جاتے مسافروں، ریل گاڑیوں اور گڈ مڈ ہوتی ہوئی لائنوں کو دیکھتا پھرا۔ آخر تنگ آ کر شمال کی طرف جانے والی ایک ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔

سارا راستہ وہ ڈبے میں بیٹھا رہا۔ راستے میں کئی بار لوگوں نے کسان جان کر اسے نشست سے نیچے دھکیل دیا اور خواہ مخواہ جھگڑا کرنے لگے اور دور کے مسافر اسے بھگوڑا سمجھ کر حقارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کرتے رہے لیکن وہ خاموش بیٹھا اپنے دل میں تازہ تازہ حاصل کردہ آزادی کے خوف کو پالتا رہا یہاں تک کہ، قریب تیس گھنٹے کے سفر کے بعد، ایک بڑے سے ڈھکے ہوئے سٹیشن پر پہنچ کر گاڑی خالی ہونا شروع ہوئی۔ ٹکٹ دیکھنے کوئی نہ آیا۔ اس نے جوتا پہنا اور باہر نکل آیا۔ یہ لاہور کا سٹیشن تھا۔ وہ حیران رہ گیا۔

دیر تک وہ بنچ پر بیٹھا آتے جاتے مسافروں کو دیکھتا رہا۔ پھر بھوک محسوس کر کے اٹھا اور چائے کے ٹھیلے والے کے پاس پہنچا۔

''یہاں کیسے آئے ہو؟'' چائے والے نے پوچھا۔

''ایسے ہی۔'' علی نے چائے کی پیالی خالی کر کے اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''نوکری کی تلاش میں؟''

''ہاں۔''

''مل جائے گی۔ مل جائے گی۔'' چائے والے نے تشفی کے لہجے میں کہا۔ ''جب تک تم میرے پاس رک سکتے ہو۔ میں بھی دلّی سے نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ یہاں آ کر کام شروع کر دیا۔ پھر یہیں پر جھونپڑا ڈال لیا۔ میری ماں ہے اور میں ہوں۔ بس پنجاب روزگار کے لئے اچھا ہے۔ جب تک کام نہ ملے جب تک جو مرضی آئے دے دینا۔ جب کام مل جائے گا جب جو مرضی آئے کرنا، الگ ہو جانا یا جو مرضی آئے ...... کیا کہا کہ کہاں کے رہنے والے ہو ایں؟''

تھوڑی دیر کے بعد وہ چائے والے کی تجویز پر شہر دیکھنے کی غرض سے چل پڑا۔ یہ شہر اسے اچھا لگا۔ یہاں کے لوگ موٹے تازے تھے اور دیہاتیوں کی طرح اونچی کرخت آوازوں میں باتیں کرتے تھے۔ وہ عمر میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے شہر میں آیا تھا۔ رستے میں کئی جگہ پر وہ دلچسپی کی چھوٹی موٹی چیزوں کے پاس رکا۔ ایک کیمرے والا سڑک کے کنارے ایک دیہاتی کی تصویر اتار رہا تھا۔ ایک جگہ سرکس لگا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک گنے کھاتے ہوئے ہاتھی کے پاس کھڑا رہا۔ پھر ایک بیل گاڑی گزری جسے ایک کسان اور اس کی بیوی ہانک رہے تھے اور لاپروائی سے سڑک کے بیچوں بیچ چلے جا رہے تھے۔ علی نے ہاتھ بڑھا کر ایک بیل کا سر تھپتھپایا۔

ایک بازار میں داخل ہوتے ہوئے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہاں پر لوگوں کے اجتماع میں وہ بدنظمی اور لاپروائی نہ تھی جو منظم شہری زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ کاروبار معطل تھا اور لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کھڑے ہراساں آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے درمیان پولیس کی ایک غیر معمولی تعداد نظر آ رہی تھی۔ ایک دکان پر ایک آوارہ بیل کھڑا کپڑے کے تھان کو چبا رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں سے رونق غائب تھی۔ بظاہر وہ پُرامن طریقے پر کھڑے تھے مگر ایسا ہراساں اور چپ چاپ امن جس سے بدامنی کا خدشہ پیدا ہوتا تھا۔ علی جلد جلد ان کے درمیان سے گزر گیا۔ صرف بیل کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ دیکھ کر کہ وہ خصی جانور تھا' اسے رنج ہوا اور اس نے ان لوگوں کو' جو اس حرکت کے ذمہ دار تھے' دل میں گالی دی۔ وہ ہمیشہ سے ان خود غرض لوگوں کے خلاف تھا جو زیادہ کام لینے کی خاطر بیلوں کو خصی کروا دیتے تھے۔

اگلے بازار میں بھی اسے اس آفت سے چھٹکارا نہ ملا۔ یہ بازار تو گویا ساری چیز کا مرکز تھا۔ لوگ وہاں باقاعدہ جلوس کی شکل میں دونوں طرف جمع تھے۔ ان کے بیچوں بیچ چند باوردی لوگ' جو رضا کار معلوم ہوتے تھے' ہاتھوں میں معمولی ہتھیار مثلاً لاٹھی' بیلچہ' بلم یا تلوار لئے سیدھی قطاروں میں کھڑے تھے۔ ایک شخص خاکی وردی میں ملبوس ہاتھ میں بیلچہ اٹھائے ان قطاروں کے سرے پر یوں کھڑا تھا جیسے ابھی ابھی تقریر کر چکا ہے۔ ہجوم سے دبے دبے نعروں کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ علی نے خطرہ محسوس کر کے وہاں سے گزر جانا چاہا۔ جب وہ ہجوم میں سے گزر رہا تھا تو چند پولیس کی لاریاں آ کر رکیں اور ان میں سے چند انگریز افسر اور مسلح گورے سپاہی کود کود کر برآمد ہوئے۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ایک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر سرے والے بیلچہ بردار سے کوئی بات کی۔ اس نے جواب میں انگریز افسر کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا۔ انگریز نے پیچھے کود کر ریوالور نکالا اور ایک فٹ کے فاصلے سے گولی چلادی۔ گولی اسے آنکھوں کے درمیان لگی اور وہ گر پڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ افسر سنبھلتا عقب سے کسی نے اس کے پہلو میں بلم چبھو دی۔ وہ ریوالور پھینک کر بلم کے دستے پر جھک گیا۔ پیچھے سے دوسرا انگریز افسر جو بھاگا آ رہا تھا رک گیا اور ریوالور ہوا میں لہرا کر چلایا۔ ''فائر...... فائر۔''

مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ چشم زدن میں بازار گولیوں کے خشک دھماکوں اور بارود کی بُو سے بھر گیا۔ منظم رضا کار' جن میں بھگدڑ نسبتاً کم تھی' کود کود کر اور چکر کھا کھا کر گر رہے تھے۔ علی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پھر بھاگتے ہوئے ہجوم کے دھکوں کے ساتھ وہ بھی بھاگنے لگا۔ پھر ایک زخمی سے ٹھوکر لگنے پر دور تک لڑھکتا ہوا چلا گیا' پھر چلا کر اسے کوسا اور چھلانگ لگا کر ایک زینے پر چڑھ گیا اور بے تحاشا دروازہ پیٹنے لگا۔ پل کے پل کو مڑ کر اس نے تیزی سے گزرتی ہوئی زرد' خوفزدہ شکلوں اور موت کا ناچ ناچتے ہوئے لوگوں کو دیکھا' پھر اونچی روتی ہوئی آواز میں گالی دے کر دھڑا دھڑ پیٹنے لگا۔ دروازہ کھل گیا۔ علی کے دھکے سے دروازہ کھولنے والی عورت لڑکھڑا کر زینے پر جا پڑی۔

وہ ایک معمولی شکل وصورت کی عورت تھی جس کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ علی گھبراہٹ میں کافی دیر تک چیخنی بند کرنے کی کوشش کرتا اور منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ اچانک عورت نے بڑے لاپرواہ انداز میں گالی دی اور اس کا ہاتھ

جھٹک کر چیخنی بند کر دی۔

''چلو۔'' اس نے اسی بیزار لہجے میں کہا اور علی کو آستین سے پکڑ کر زینے میں دھکیل دیا۔

آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دونوں اوپر آ گئے۔ چھوٹے سے کمرے میں پہنچتے ہی علی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عورت کھڑکی کی درز میں سے نیچے کا نظارہ کرنے لگی۔ انسانی چیخوں اور گولیوں کے چلنے کی آوازیں لگاتار آ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ ہاتھ پشت پر باندھ کر کمرے میں چکر لگانے لگتی۔ اس کا چہرہ زرد مگر بے خوف تھا۔

''چوہوں کی طرح مر رہے ہیں۔'' ایک دفعہ رک کر اس نے زیر لب کہا اور حقارت سے علی کو دیکھا۔ اس کے چلنے کے انداز سے بے حیائی اور مردانہ پن ظاہر تھا۔ علی خاموش بیٹھا حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ گولیوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ کبھی کبھی دور و نزدیک سے ایک آدھ فائر ہوتا اور پھر سناٹا چھا جاتا' سناٹا جو زخمیوں کی کراہوں کی وجہ سے شدید ہوتا جا رہا تھا۔ عورت مڑی اور باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ تمسخر' کچھ حقارت سے بولی۔

''تم وہاں پر مرے پڑے ہوتے۔ اب اُلو کی طرح مست بیٹھے ہو۔ آ کر دیکھو' آؤ۔''

علی خفت سے ہنستا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یکلخت عورت نے دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹایا اور کھڑکی بند کر دی۔ نیچے کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا۔ پھر ایک دم بہت سے ہاتھ دروازے پر پڑنے لگے۔ عورت علی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی اور پچھلی طرف کی گلی میں اترنے والے تاریک زینے میں غائب ہو گئی۔ آدھے رستے میں رک کر اس نے دیوار میں سے ایک تختہ ہٹایا اور علی کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اس میں دھکیل دیا۔

''جاؤ۔ اندر جاؤ...... چلو۔''

جب وہ اندر گھس کر بیٹھ گیا تو عورت نے تختہ اپنی جگہ پر برابر کیا اور واپس آ کر زینے کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ پھر اس نے جا کر بازار والا دروازہ کھول دیا۔ پولیس اور فوج کے سپاہی رائفلوں کے دستے بجاتے اوپر چڑھ آئے۔

''کہاں ہے؟'' ایک پنجابی سپاہی نے پوچھا۔

''کون؟''

''تیری ماں کا یار۔''

''یہاں کوئی نہیں ہے۔''

ایک سکھ سپاہی نے ڈنڈا گھما کر عورت کے چوتڑوں پر مارا۔ اس نے بلبلا کر گالی دی۔

''بتا کہاں گیا؟''

''یہاں بس میں رہتی ہوں۔ مجھے پتا نہیں۔'' عورت چوتڑ ملتے ہوئے بولی۔

''بتا......'' پنجابی سپاہی خوفناک گالیاں بکتا ہوا جھپٹا اور اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دوسری دیوار تک

لے گیا۔ عورت ہوا میں ہاتھ چلانے لگی۔

''بتا رنڈی...... '' سپاہی نے اس کے بال بازو پر لپیٹتے ہوئے کہا۔ عورت نے چیخ مار کر ناخن سپاہی کی ران میں گاڑ دیئے۔ سپاہی نے ٹانگیں جھاڑ کر فوجی بوٹوں کی ایک زوردار ٹھوکر عورت کی کمر میں ماری۔ ''بول ...... رنڈی۔''

واحد گورا سپاہی' جو سٹین گن کندھے سے لٹکائے خاموش کھڑا تھا' آگے بڑھا اور عورت پر جھک کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں نرمی سے بولا: ''ٹیک ٹیک بولو...... رنڈی۔''

عورت نے تڑپ کر سر اٹھایا اور گالیوں کی بوچھاڑ اس کے منہ سے نکلی: ''ہاں میں رنڈی ہوں ...... میں ہوں۔ ٹھیک ہے۔ یہاں ہر کوئی آ سکتا ہے۔ مجھے پتا نہیں یہاں کون کون ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔''

گورا سپاہی برا سا منہ بنا کر پیچھے ہٹ آیا۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے آدھے سپاہی دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں وہ الماریاں اور صندوق کھول کھول کر دیکھتے رہے۔ پھر چارپائیوں کے نیچے' کھڑکیوں کے باہر اور چھت بجا بجا کر دیکھنے کے بعد زینے کا دروازہ کھول اندھیرے میں اتر گئے۔ نیچے پہنچ کر انہوں نے گلی کا دروازہ کھول کر دیکھا' اسے بند کیا اور لوٹ آئے۔

جب وہ پہلے کمرے میں پہنچے تو سپاہی عورت کے بالوں کو سانپ کی طرح بازو پر لپیٹے اس کی چھاتیاں مروڑ رہا تھا۔ عورت کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید تھا۔

''نہیں ہائے؟'' گورے نے اکتا کر پوچھا۔

''نہیں اے ے ے......''

اس کی کلائی میں عورت نے دانت گاڑ دیئے تھے۔ سپاہی نے دونوں ہاتھ چھڑائے اور پیچھے کود کر پوری قوت سے اس کے شانوں کے درمیان بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ اس کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر انہوں نے مارنا شروع کیا۔

جب تک وہ اپنے پاؤں پر قائم رہی وہ گھونسوں' بوٹوں اور رائفلوں کی ضربوں سے اسے ایک سے دوسری دیوار کی طرف اچھالتے رہے۔ جب وہ فرش پر ڈھیر ہوگئی تو انہوں نے اس کا لباس پھاڑ ڈالا اور پیٹھ اور چھاتی پر ڈنڈے مارنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد تھک کر انہوں نے پیٹنا بند کر دیا اور اس مردہ ڈھیر کے اردگرد خاموش کھڑے ہو کر خالی خالی نظروں سے کمرے میں دیکھنے لگے۔ وہ یکلخت پشیمان ہوگئے تھے اور اس بے جان انسانی جسم کو' جس سے انہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوا تھا' دیکھنے سے احتراز کر رہے تھے۔

''بیکار ہے۔'' آخر گورے سپاہی نے بے حد اکتا کر کہا اور سیڑھیوں کی جانب لپکا۔ اس کے پیچھے پیچھے سب اتر گئے۔

جب علی کو دیوار سے کان لگائے بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہوگئی اور کوئی آواز نہ آئی تو اس نے احتیاط سے تختہ ہٹایا اور سیڑھیوں پر کود گیا۔ مکان میں گہرا سناٹا تھا۔ اوپر والے دروازے میں ایک بلی کھڑی تھی جو اسے دیکھتے ہی

بھاگ گئی۔ پہلا کمرہ خالی تھا۔ دوسرے کمرے کے فرش پر اس کا ننگا جسم بے حس و حرکت پڑا تھا اور ٹانگیں بے شرمی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ششدر کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر بھاگ بھاگ کر دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ ننگے جسم پر ضربوں کے نشان تھے۔ علی نے اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھایا لیکن وہ لڑھک گئی۔ کافی دیر تک وہ اسے ہوش میں لانے کی بے سود کوششیں کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ خود بخود ہوش میں آ گئی۔

سب سے پہلی نظر اس نے اپنے آپ پر ڈالی اور جسم کو بازوؤں میں چھپا لیا۔ علی نے بستر پر سے چادر کھینچ کر اسے اڑھا دی۔ وہ خاموشی سے چادر لپیٹتی اور اردگرد دیکھتی رہی۔ پھر اس نے خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیر کر علی کی طرف دیکھا۔ علی نے بھونڈے پن سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دفعتاً وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اس کے آنسو پونچھتا اور پیار سے سارے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر اس نے اس کے گالوں اور آنکھوں کو چوما۔

تھوڑی دیر کے بعد علی نے احتیاط سے بازوؤں میں بھر کر اس کو اٹھایا اور لے جا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ بازو پر سر رکھے وہ دیوار کو دیکھتی دیکھتی نقاہت کے مارے اونگھنے لگی۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو علی دیوار کے ساتھ بیٹھا اسے تکے جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اب میں ٹھیک ہوں۔'' وہ اداسی سے مسکرائی۔

''تم لیٹی رہو۔''

''اچھا ہوا تم نہیں آئے۔ وہ تمہیں قتل کر دیتے۔''

علی چارپائی کے پائے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکا۔ ''تم سمجھتی ہو میں بزدل ہوں؟''

''اوہ نہیں۔'' وہ ہنسی۔

''گاؤں میں لوگ کہتے تھے کہ شہر میں رہ رہ کر میں بزدل ہو گیا ہوں۔'' علی نے اداسی سے کہا۔

''ارے نہیں پگلے۔'' وہ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر ہنسی۔ ''تم نے کھانا نہیں کھایا۔''

''نہیں نہیں، تم بیٹھی رہو۔''

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا اور چادر لپیٹتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ اس کمرے سے برآمد ہوئی تو اس نے سفید ریشم کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا منہ دھلا ہوا اور بال سنورے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے مسکراتی ہوئی جا کر سبزیاں نکالنے لگی۔

''میں آگ جلاؤں؟'' علی نے پوچھا۔

''تم بیٹھے رہو۔ میں سب کام کر لوں گی۔''

وہ کمرے میں پھرنے لگا۔ بازار والی کھڑکی ذرا سی کھلی تھی۔ باہر موت کا سناٹا تھا اور چند آوارہ کتے اِدھر اُدھر پڑی ہوئی لاشوں کو سونگھ رہے تھے۔ وہ وہاں سے ہٹ آیا۔ الماری میں بچی کھچی سبزیاں اور کچھ باسی اشیائے

خوردنی پڑی تھیں۔ اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا جو چولہے کے آگے سمٹی سمٹائی بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ وہ اسے بڑی پیاری لگی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''زہرہ۔ زہرہ بیگم۔''

''اچھا اچھا۔'' وہ خوشی سے سر ہلا کر بولا۔ ''میرا نام علی ہے۔''

دونوں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد علی چارپائی پر لیٹ گیا۔

''یہاں آ جاؤ۔''

وہ اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھی۔

''تم بڑی مضبوط ہو۔'' علی نے اس کا جسم ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''ضربوں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔''

''ہاں'' وہ ہنسی۔ ''مضبوط تو تم بھی ہو' صرف ذرا بزدل ہو۔''

''ایں؟'' علی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

''ارر.....'' وہ کڑی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی سمٹ کر پرے ہو بیٹھی۔

علی کھسیانہ ہو کر اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''تمہارا لباس شاندار ہے۔''

''تم گاؤں میں رہتے ہو؟'' عورت نے پچھا۔

''ہاں۔''

''ہم بھی گاؤں میں رہتے تھے۔''

''اچھا؟ کہاں؟'

''ہمارا گاؤں امرتسر کے قریب تھا۔''

''اب کہاں گیا؟''

''اب بھی ہے۔ لیکن میں وہاں نہیں جاتی۔''

''کیوں؟''

''جب میرا باپ مر گیا تو ہم نے گاؤں چھوڑ دیا۔''

''تمہاری زمین بھی تھی؟''

''پتا نہیں۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے ذرا ذرا یاد ہے۔ بس اتنا کہ میں بھینس کی پونچھ پکڑ کر جوہڑ میں تیرا کرتی تھی اور ایک دفعہ جب میرا باپ گرد سے اٹا ہوا شہر سے لوٹا اور مجھے گھوڑے کی رسی پکڑا کر گھر کے اندر چلا گیا تو گھوڑا میرے آدھے بال کھا گیا اور میں ساری رات روتی رہی تھی۔ اور میرا باپ تھا جو بڑا جوان' بڑا نرم

دل اور بڑا خوبصورت تھا۔ اس کے بعد میں نے کوئی خوبصورت آدمی نہیں دیکھا۔'' علی کو اس کی آواز ڈوبتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ''تمہیں بھی بہت بچپن کی کوئی بات یاد آتی ہے؟''

''ہاں۔'' وہ ہنسا۔ ''اررر...... سب سے پہلی بات یہ یاد آتی ہے کہ میرے باپ کے پاس تین دودھ دینے والی بھینسیں تھیں اور سویرے سویرے جب میری ماں مکھن نکال لیتی تھی تو ہمسایوں کے بچے اپنے اپنے برتن لے کر لسی لینے آیا کرتے اور دروازے میں کھڑے ہو کر دانت نکوسا کرتے تھے۔ میری ماں ایک ایک کو بلا کر چھاچھ دیتی تھی۔ ان میں زیادہ تر لڑکیاں ہوتی تھیں اور جب وہ بھرے ہوئے برتن اٹھائے مویشیوں والے احاطے میں سے گزرتیں تو میں بلاوجہ ان کو مارا اور ان کی چوٹیاں کھینچا کرتا تھا۔''

''کمینے۔'' وہ چلائی۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

انتہائی اعصابی کوفت کے بعد پیٹ بھر کھانے اور تھوڑے سے سکون نے علی پر غنودگی طاری کر دی اور وہ عورت کی گود میں ہاتھ رکھے رکھے سو گیا۔ وہ محبت سے اسے دیکھتی اور لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ پھر اس نے آہستگی سے علی کا ہاتھ بستر پر رکھ اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر ایک لمبی انگڑائی لی۔ انگڑائی کے درمیان وہ چونک کر رک گئی اور باہیں لٹکا کر پریشانی سے چاروں طرف دیکھنے لگی، یوں جیسے مہربان دوستوں میں بیٹھ کر قہقہے لگاتے لگاتے ذہن پر سے کسی ناخوشگوار خیال کا سایہ گزر جائے۔

جب علی اٹھا تو وہ ایک بچے سے کھیل رہی تھی۔

''یہ کون ہے؟''

''میری سہیلی کا بچہ ہے۔''

''تمہارا کوئی بچہ نہیں؟''

''یہ سب کا بچہ ہے۔''

''سب کا؟''

بچہ صحت مند اور چلبلا تھا۔ علی نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ کر عورت کے کندھوں پر جا چڑھا۔

''اب گھوڑا بنو۔ مجھے بلایا کیوں تھا۔ اب گھوڑا بنو۔'' بچے نے رٹ لگائی۔ وہ ہنستے ہنستے دہری ہوئی جا رہی تھی۔

''یہ دیکھو، تمہارا گھوڑا یہ بنے گا۔'' عورت نے علی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ کون ہے؟'' بچے نے پوچھا۔

''بوجھو۔''

''ابا ابا ابا......'' وہ تالیاں بجاتا ہوا چلانے لگا۔

علی کو بچے پر بے حد پیار آیا۔ وہ چارپائی سے اتر کر فرش پر گھوڑا بن گیا۔

''آؤ......آؤ''

بچہ ڈرتے ڈرتے جاکر اس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ اب وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ سارے کمرے میں چل رہا تھا اور عورت ہنستے ہنستے بیر بہوٹی بنتی جارہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اچھلنے اور گھوڑے کی بولی بولنے لگتا تو بچہ خوشی سے تالیاں بجاتا۔ آخرکار عورت نے کھینچ کر اسے علی کی پیٹھ سے اتارا اور گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ وہ باتیں کرنے لگے۔ گاؤں کی باتیں' شہر کی باتیں۔ علی نے اسے اپنے کام کے متعلق بتایا جو اسے قطعی پسند نہ تھا اور صبح کا واقعہ جس کے متعلق عورت نے بتایا کہ بازار کے آخیر پر زمین کا ایک قطعہ تھا جو مسجد (شہید گنج) کے لئے وقف تھا اور جس پر سکھ اپنا حق جتا کر گوردوارہ بنانا چاہتے تھے۔ اس طرح وہ جو مدت سے جھگڑے کا سبب بنا ہوا تھا آج صبح کے سانحے پر ختم ہوا۔ پھر انہوں نے گھر باہر کی باتیں کیں۔ معمولی معمولی ذاتی باتیں جو ایک ہی گھر کے افراد یا قریبی دوست آپس میں کرتے ہیں۔ باتوں کے دوران دو ایک مرتبہ علی نے اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا لیکن اس نے سردمہری سے اسے روک دیا۔ باتیں کرتے کرتے شام پڑ گئی۔ بچہ ان کے پاس سے اٹھ کر جا چکا تھا۔

اس وقت دوسرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ عورت دروازے میں کھڑی ہو کر دستک دینے والے سے جو کواڑ کی اوٹ میں تھا' باتیں کرنے لگی۔ دیر تک سرگوشیوں میں تُو تُو مَیں مَیں کرتے رہنے کے بعد وہ اونچی آواز میں گالی دے کر بولی: ''اس آفت کے وقت میں بھی......'' اور دروازہ بند کر کے علی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''اب تم جاؤ''

علی حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

اس نے ندامت سے کپڑے جھاڑے اور اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی: ''اب تم جاؤ۔ کل پھر آنا۔''

''کہاں؟ کہاں جاؤں؟''

''کہیں بھی جاؤ۔ چلو اٹھو۔'' اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

آدھے رستے میں علی نے اسے روکا۔ ''لیکن......پچھلی طرف سے نکالو۔ ادھر پولیس ہے۔''

''اس وقت اندھیرا ہے۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔ چلو......''

آخری سیڑھی پر رک کر اس نے دونوں ہاتھ علی کے کندھوں پر رکھ دیئے اور دھیرے سے بولی: ''کل پھر آنا۔''

''میرا یہاں کوئی نہیں۔ مجھے یہیں رہنے دو۔''

''اوں ہنک......'

''میں تمہارے ساتھ نہیں سوؤں گا۔'' علی نے منت کی۔ ''فکر نہ کرو۔''

''نہیں اب تم کل آنا۔ پھر پرسوں آنا۔ پھر ہر روز آیا کرنا' پھر......'' وہ ہنسی۔

اندھیرے میں اس کے گہرے' جذباتی قہقہے کی آواز علی کو بھلی معلوم ہوئی۔

''اب جاؤ......'' اس نے دروازہ کھول کر علی کو باہر دھکیل دیا۔

وہ اندھیرے میں کھڑا اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

''جاؤ......''

''تو ٹھیک ہے۔ اب میں نہیں آؤں گا۔''

''نہیں بھئی ضرور آنا۔ تمہاری منت کرتی ہوں۔''

''کتیا۔'' علی نے کہا۔ ''اب تھوکنے بھی نہیں آؤں گا۔''

کئی لمحوں تک وہ اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر عورت کی بپھری ہوئی آواز آئی جس میں وہی پہلے والی عریانی اور لاپروائی تھی۔

''حرامی۔ تم اس وقت چوہے کی طرح مرے پڑے ہوتے۔ وہاں۔'' اس نے گالی دے کر دروازہ بند کر دیا۔

علی نے انتہائی غصے میں دو تین لاتیں بند دروازے پر جمائیں اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''رنڈی۔''

بازار میں سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آہٹ پیدا ہوئی۔ وہ کود کر ایک دکان کے نیچے گھس گیا۔ اس وقت اس نے ڈھل کر دیکھا کہ وہ ایک مرے ہوئے آدمی پر بیٹھا تھا۔ سپاہی خاموشی سے گزر گئے۔

باہر نکل کر وہ کچھ دیر کانپتی ہوئی ٹانگوں پر وہیں کھڑا رہا۔ اس کا دل سُن ہو چکا تھا۔

(۳۳)

سردیوں کے آغاز میں نعیم پر فالج کا حملہ ہوا۔ حملہ زیادہ شدید نہ تھا۔ گاؤں کے حکیم نے یقین دلایا کہ کوئی بات نہیں، سردیوں میں گھوڑے بھی اکثر جڑ جایا کرتے ہیں اور دو ایک گیدڑ پکا کر کھلانے پر بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ چارپائی سے جا لگا۔

دو ہفتے بعد یہ خبر عذرا نے منشی کی زبانی سنی جو لگان کے سلسلے میں روشن محل گیا ہوا تھا۔ دن بھر وہ کمرے میں پڑی رہی۔ سہ پہر کے وقت باغ میں اتر آئی۔ خزاں کی زرد ہوائیں چل رہی تھیں اور روشوں پر گرے ہوئے پتے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ برگد کی جڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور خشک پتوں کی ڈھیری بنانے لگی۔ کبھی کبھی دفعتاً بے چین ہو کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ پھر اس کنفیوژن سے گھبرا کر اٹھی اور اگلے درخت کی جڑ پر جا بیٹھی۔ وہاں بھی وہ آسانی کے ساتھ توازن قائم کر کے بیٹھی پتوں کو ہوا میں اڑاتی رہی۔ اس نے موسم کے شدید حسن کو بھی محسوس نہ کیا۔

اگلے روز وہ روشن پور پہنچی۔ گاؤں اسی طرح پرانا اور گرد آلود تھا۔ وہی دیواریں اور درخت اور گلیاں، وہی کھیت جن میں اِکا دُکا کسان ہل جوت رہے تھے۔ یہ بیائی کا موسم ہے۔ اس نے ذہن پر زور دے کر سوچا۔ اس برسوں پرانے، خوابیدہ منظر کو دیکھ کر وہ بے طرح اداس ہو گئی۔ اپنے گھر میں داخل ہو کر اس نے بوڑھے رکھوالے کا حال پوچھا۔ بڈھا چابیوں کے گچھے کو ٹٹولتا ہوا اس کی غیر متوقع آمد پر خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات کے مارے

رونے لگا۔ نوکروں کو مکان کھولنے کا حکم دے کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھی۔ مکان میں سے دروازوں' کھڑکیوں کے کھلنے اور جھاڑنے پھٹکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فرنیچر گھسیٹا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ شیشہ ٹوٹتا اور نوکروں کے باتیں کرنے کی آوازیں آتیں۔ یہ موسم خزاں کا ایک شفاف دن تھا اور باورچی خانے میں دھوپ بھری ہوئی تھی۔ عذرا کھڑکی میں کھڑی گرد و غبار کے اس چھوٹے سے بادل کو دیکھتی رہی جو کمروں میں سے نکل کر دھوپ میں آ گیا تھا' وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی' اب جبکہ وہ یہاں پہنچ چکی تھی یہاں سے باہر قدم رکھتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

''اب؟'' اجاڑ باغ کے ٹوٹے پھوٹے راستوں پر چلتے ہوئے اس نے ہزارویں بار دل میں سوار کیا۔ وہی ژولیدگی' وہی بے اطمینانی ہر جگہ اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

جب اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو وہ چوروں کی طرح نعیم کے گھر میں داخل ہوئی۔ مویشیوں کے احاطے میں نعیم کی ماں لکڑی کی بالٹی میں دودھ دوہ کر اندر لے جا رہی تھی اور کچی منڈیر پر شام کا ستارہ جھلملا رہا تھا۔ وہ اس گھر میں پہلی بار داخل ہو رہی تھی۔ وہ یہاں کبھی نہ آئی تھی۔ اس نے نعیم کی ماں کو صرف ایک بار دور سے دیکھا تھا۔ یہ گھر اس کے خوابوں کے جزیرے پر کہیں بھی واقع نہ تھا۔ یہاں آنے کے بارے میں اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ آج اجنبیوں کی طرح اس گھر میں قدم دھرتے ہوئے اس کے دل میں علیحدگی' اس قدیم بیگانگی کا احساس تک پیدا نہ ہوا کہ لاشعوری قوتیں اس قدر طاقت ور ہوتی ہیں۔ بے آواز قدموں سے احاطہ پار کر کے اس نے اندر جھانکا۔ کھاتے پیتے کسانوں کے گھروں کی طرح ایک مکان تھا۔ باورچی خانے میں بڑھیا کام کر رہی تھی۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزرتی تو اس کا سایہ صحن میں پڑتا۔ کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا اور چارپائی پر لیٹے ہوئے مرد کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔

''نعیم......'' عذرا نے کپکپا کر سوچا۔ وہ انگور کی بیل کے نیچے اندھیرے میں دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی جیسے نادار لوگ خوراک کی امید میں سرِشام متمول کسانوں کے دروازوں پر چپ چاپ آ کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر اس نے بلی کی طرح چل کر صحن پار کیا۔ نعیم چہرے کے آگے کتاب رکھے لیمپ کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ آہٹ سن کر بچوں کی طرح بولا۔

''ماں مجھے بھوک لگی ہے۔ مالش پھر کراؤں گا۔''

کوئی جواب نہ پا کر اس نے کتاب ہٹائی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور کتاب نیچے گر پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کہنی کے بل صرف آدھا اٹھ سکا۔ اس کا ماتھا آدھے سر تک جا چکا تھا اور کنپٹیوں پر سفید بالوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ عذرا دروازے کو تھامے کھڑی رہی۔ اس نے دیکھا کہ نعیم کی آنکھوں میں بے پناہ مظلومیت تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ اس کی چارپائی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''عذرا......'' آخرکار نعیم بڑبڑایا اور دھم سے تکیے پر گر پڑا۔ کچھ دیر تک وہ سیدھا لیٹا آنکھ جھپکے بغیر خلا میں

دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک اس نے کروٹ بدلی اور بازو عذرا کی گردن میں ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ محبوب آنکھوں میں بیکراں مظلومیت کی جھلک اور ایک لمحے کے لمس نے برسوں کے غرور کو حقیر بنا دیا تھا۔

نعیم نے اسے ماتھے پر چوما اور آنکھوں پر اور گالوں پر اور ہونٹوں پر ایک ایک لفظ کہے بغیر وہ بیتابی اور گرمجوشی سے اسے ساری جگہوں پر چومتا رہا حتیٰ کہ آنسوؤں کا نمکین مزہ اسے اپنی زبان پر محسوس ہوا۔

''مت روؤ۔'' وہ کوشش کر کے بولا۔ اس کی آواز خشک اور کمزور تھی۔ عذرا جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم بیمار ہو۔'' اس نے دکھ سے پوچھا۔

''اب ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا اور اسے چھاتیوں کے اوپر چوما جہاں سے گلا کھلا ہوا تھا۔ ایک عمر گزر جانے پر بھی اس کے سینے کی جلد مضبوط اور صحت مند تھی۔ عذرا نے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر پہلی بار اسے چوما اور جذبے کی شدت سے دوبارہ رونے لگی۔

''مت روؤ۔'' نعیم نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دہرایا۔

بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ نعیم کی ماں ہاتھ میں سرخ رنگ کے تیل کا برتن لئے دروازے میں کھڑی حیرت سے اجنبی، جوان عورت کو دیکھ رہی تھی۔ پھر یکا یک اس نے اسے پہچان لیا اور سادہ، پُرمعنی ہنسی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ احتیاط سے آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور بیٹے کی ٹانگ پر مالش کرنے لگی۔ اس کی آمد کو کسی نے محسوس نہ کیا۔

''تم پھر جیل گئے تھے؟'' عذرا نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کتنی دیر؟''

''بہت دیر۔'' وہ محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ ''کئی سال۔''

''تمہارے بال گر رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

عذرا ہولے سے ہنسی۔ نعیم بھی اس کے ساتھ ہنسا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ رہا تھا۔ وہ محض اس برسوں کی گم شدہ محبوب آواز کو سننے میں محو تھا جو آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ اسے واپس مل رہی تھی جیسے آدھی رات کے ملاحوں کا گیت جو ابھی قریب آتا ہے اور ابھی دور چلا جاتا ہے اور کہیں نظر نہیں آتا لیکن مسافروں کی ہمت بڑھاتا ہے اور طوفانی راتوں میں انہیں زندگی کی محنت اور خوشی کا یقین دلاتا ہے۔

پھر عذرا نے نعیم کی ماں کو دیکھا اور گہری طرح جھینپ گئی۔ ''میں تیل ملتی ہوں۔''

''نہیں۔'' نعیم نے اسے پکڑ رکھا۔ ''تم باتیں کرو۔''

''باتیں بھی کریں گے۔'' وہ ہنسی اور اٹھ کر پائنتی بیٹھ گئی۔

''اچھا اچھا۔'' نعیم کی ماں بے فن، معنی خیز انداز میں ہنستی ہوئی باہر نکل گئی، پھر صحن میں سے لوٹی اور آ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس کا سفید سر تیزی سے ہل رہا تھا۔

عذرا اس کی پنڈلی پر تیل ملتی اور ہولے ہولے باتیں کرتی رہی۔ اپنی باتیں، اس کی باتیں، اس کی بائیں ٹانگ کی باتیں جس پر فالج کا اثر تھا۔ نعیم گہری محویت سے سنتا اور اس کے کہنے پر اپنے جسم کے نیم مردہ حصے کو ہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ اس سحر میں سے نکل آیا۔

کمرے کے وسط میں بجھتی ہوئی آگ کا آخری شعلہ کمزوری سے بھڑک رہا تھا۔

''اور لکڑیاں ڈال دو۔'' اس نے کہا۔

عذرا نے اٹھ کر خشک لکڑی آگ پر پھینکی۔ لکڑی نے دھواں چھوڑا اور بھڑاک سے جل اٹھی۔ عذرا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ کمرے میں لکڑی کے جلنے اور مالش کے تیل کی ملی جلی بو پھیل رہی تھی اور دیوار پر عذرا کا سایہ ناچ رہا تھا۔

''چچا مر گئے۔'' نعیم نے بھاری آواز میں کہا۔

''ایں...... چچا؟''

''ہاں۔''

دونوں خاموش ہو گئے۔

''میں جیل میں تھا جب مجھے اطلاع ملی۔ وہ میرے جیل جانے پر سخت خفا تھے۔ کئی بار میں نے پیغام بھیجا کہ آ کر مل جائیں لیکن نہ آئے۔ انہوں نے کہا: ''نعیم سے جا کر کہہ دو میرا اس کا کوئی تعلق نہیں رہا' میں اس کے بغیر آسانی سے رہ سکتا ہوں' مجھے اس بات کا دکھ ہوا۔ اس کے بعد میں نے کوئی پیغام نہ بھیجا۔ پھر وہ بیمار پڑ گئے۔ مجھے لوگوں نے آ کر بتایا کہ ان کا علاج ہوتا رہا' شدید تکلیف کے باوجود وہ بیماری کو صبر سے برداشت کرتے رہے۔ انہوں نے کسی کا نام نہ لیا' کسی سے ملنے کی خواہش ظاہر نہ کی۔ پھر ایک روز اچانک انہوں نے ملازم کو اپنے پاس بلایا اور بولے: 'تم سمجھتے ہو مجھے کسی شے کی حاجت نہیں رہی؟ تم غلط سمجھتے ہو۔ کل ہم المونڑے جا رہے ہیں۔' پھر انہوں نے تاسف سے کہا: 'مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ موت ہمارے بس میں نہیں ہے۔ زندگی میں اتنی کم مہلت ملتی ہے اور ہم اتنی غلطیاں کرتے ہیں۔ نعیم بھی اور میں بھی۔ عمر بھر ہم ایک دوسرے سے بچوں کا سا سلوک کرتے رہے ہیں۔ ضدی اور جاہل بچوں کا سا۔'

''لیکن اس رات وہ مر گئے۔'' نعیم نے سر اٹھایا۔ ''سنو۔ اس کے چند روز بعد میں نے خواب دیکھا کہ میں دریا کے کنارے کنارے جا رہا ہوں اور میں چلتا گیا چلتا گیا کہ ایک جگہ پر وہ دریا کی سطح پر ابھرے اور بولے:

'آگے جاؤ۔' میں پھر چلنے لگا۔ وہ ڈبکی لگا کر غائب ہو گئے۔ پھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر وہ پانی میں سے باہر نکلتے اور مجھے آگے جانے کا اشارہ کرتے رہے۔ پھر دریا ختم ہو گیا اور وہاں پر وہ ریت پر کھڑے تھے۔ دھوپ بڑی چمکیلی تھی اور ان کے سفید بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ اپنا دلپسند سفید سوٹ پہنے ہوئے چھڑی ہاتھ میں لئے جیسے میرا انتظار کر رہے تھے۔ کہنے لگے۔''میں اکیلا چل رہا تھا' اچھا ہوا تم آ گئے۔ ہم ریت پر چلنے لگے اور ہمیں راستے میں آبی پرندوں کے غول کے غول ملے جو اڑتے ہوئے سمندر کی جانب جا رہے تھے۔ چلتے چلتے ہم ایک مکان میں داخل ہوئے۔ وہ جگہ' گو کہ میں کبھی وہاں نہیں گیا ہوں' مجھے بے حد مانوس معلوم ہوئی۔ ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے اور چڑھتے گئے چڑھتے گئے حتیٰ کہ میں ہانپنے لگا۔ وہ بیشمار تھیں۔ آخر میں ایک زینہ آیا اور ایک لوہے کا جنگلا جو مکان کے گرداگرد چلا گیا تھا۔ وہاں ریلنگ کے سہارے ایک مفلس اور شکستہ حال شخص بیٹھا تھا۔ اس نے خاموشی سے ہماری طرف دیکھا۔ چچا نے اپنی چاندی کی چھڑی میرے ہاتھ میں پکڑائی اور کہنے لگے: 'اُسے دو' اس نے چھڑی میرے ہاتھ سے لے لی اور اس کے اداس چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ خاموشی اور احسان مندی سے ہمیں دیکھ کر ہنستا رہا پھر چھڑی کے سہارے اٹھا اور ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے ہنستے ہوئے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اب تک یاد ہے کہ میرے دل کی بے چینی اچانک ختم ہو گئی تھی۔ چچا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہم واپس لوٹے۔ میرے دل میں مکمل اطمینان تھا اور خوشی جو اطمینان سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن سیڑھیاں اترتے اترتے وہ کہیں غائب ہو گئے۔ میں نے پرواہ نہ کی اور اکیلا اترتا رہا۔ پھر ایک جگہ رک کر جھروکے سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر ہر طرف زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ریت پر اور سمندر پر اور آسمان پر زرد' بہت زرد۔'' اس نے بولتے بولتے عذرا کا ہاتھ دبایا۔''اور سنو' اب جو میں بتانے والا ہوں بے حد عجیب ہے۔ اس وقت جھروکے سے باہر دیکھتے ہوئے میرے دل میں عجیب سی اداسی پیدا ہوئی' بڑی گہری اور خاموش غمناک اداسی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس سے میری پہلی خوشی اور طمانیت کو کوئی زک نہ پہنچی۔ میرے دل میں وہ بیمار کر دینے والی بے چینی پیدا نہ ہوئی۔ یہ کوئی اندوہناک جذبہ نہ تھا بلکہ ایک دھیما اور چھا جانے والا غم تھا' جیسے میں۔ جیسے۔ پتا نہیں۔ لیکن آج تک میں نے خواب میں کوئی جذبہ اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ چچا سے مجھے کتنی گہری محبت تھی' کہ ان سے میں اپنے باپ کی نسبت کہیں زیادہ وابستہ تھا' کہ زندگی میں اطمینان حاصل کر لینے کے بعد ہمارے لئے کچھ بھی نہیں رہ جاتا سوائے غم کے...... تمہیں علم ہے عذرا کہ چچا دنیا میں کس قدر تنہا تھے' کس قدر محنتی' کس قدر دکھی اور کس قدر نیک دل تھے۔ انہوں نے اتنے پیار سے مجھے پالا۔ زندگی میں اتنی لمبی تنہائی کا دکھ اٹھایا.....'' ایک سانس بولتے رہنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور ماتھے کی رگ ابھر آئی تھی۔ عذرا نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں بڑی عجیب وغریب تھیں۔

''خالہ بھی فوت ہو گئیں۔'' اس نے چپکے سے کہا۔

''ہاں۔ سنا تھا۔''

''ایسا ہوا نعیم کہ...... اوہ...... اس رات میں دیر تک جاگتی رہی تھی۔ میری ذہنی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ آدھی رات گزر جانے پر وہ میرے کمرے میں آئیں اور مجھے دیر تک جاگنے اور بارش میں بیٹھے رہنے پر ملامت کرنے لگیں۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے انہیں واپس چلے جانے کو کہا۔ اس بات کا انہیں بہت رنج ہوا۔ وہ رونے لگیں' پھر اپنی بلی کو اٹھا کر باہر نکل گئیں۔ صبح جب ہم جاگے تو وہ مر چکی تھیں۔ آج تین سال سے اوپر ہو گئے۔''

نعیم کے چہرے پر تکدر کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ کافی دیر تک کشمکش کے بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور آہستہ سے بولا: ''لیکن اب وہ مر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف کرے۔''

عذرا نے محسوس کیا کہ خالہ کے متعلق نعیم کے دل میں کوئی شدید غلط فہمی موجود تھی۔ پھر اس نے چپکے سے دل میں کہا: ''کیا فرق پڑتا ہے۔''

آگ پھر بجھ رہی تھی۔ عذرا نے اٹھ کر چند خشک لکڑیاں آگ پر ڈالیں اور دروازہ کھول دیا۔ جب سارا دھواں نکل گیا اور کمرہ تازہ' خنک ہوا سے بھر گیا تو اس نے دروازہ بند کر دیا اور دونوں ہاتھ نعیم کے سینے پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی اور حرارت آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور دو ایک جلتی ہوئی چکنی لڑکیاں سوں سوں کی آواز پیدا کرنے لگیں۔

''تم مجھے یاد کرتے تھے؟''

''بہت۔'' نعیم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے بغیر دنیا کی مشکل ترین شے جو آئی وہ رات تھی۔ جیل میں بھی' باہر بھی۔ دن بھر تو میں کام میں مصروف رہتا لیکن رات کے وقت جب میں اکیلا اور تھکا ہوا ہوتا تو نیند کہیں غائب ہو جاتی۔ اس وقت بڑی خطرناک باتیں میرے ذہن میں آتیں اور مجھے خیال ہوتا کہ دل و دماغ کے تمام عارضے مجھ کو لاحق ہو گئے ہیں۔ میری آنکھوں میں سے آگ نکلنے لگتی اور جسم پرانے بیماروں کی طرح گھلنے لگتا۔ ایسی ہزاروں راتیں میں نے گزاری ہیں۔ کئی بار یہ سوچ کر میں خوفزدہ ہو جاتا تھا کہ تمہارے بغیر شاید میں مر جاؤں گا۔'' وہ ہنسا۔

عذرا نے بے تابی سے اس کا گلا کھول کر بھیڑ کی طرح منہ اس کے سینے پر رگڑا۔ ''تم اتنا یاد کرتے ہو گے۔ میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔'' وہ دوبارہ رونے لگی۔

''چپ رہو۔'' نعیم غرایا۔

اس نے نعیم کے کندھے پر رگڑ کر آنکھیں خشک کیں۔ ''دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ سب کچھ گزرا ہے۔ تم نے یہ سب جھیلا ہے۔ تم نے مجھے یاد رکھا ہے۔ تمہاری آنکھیں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ مجھے معاف کر دو۔''

وہ رنج سے مسکرایا۔

عذرا پھر بولی: ''پر اس کے باوجود تمہاری آنکھیں خوبصورت رہی ہیں۔ یہ ایسا عجب لگتا ہے نعیم' تمہاری آنکھیں۔ بوڑھی اور نرم و نازک۔''

''یہ اس لئے ہے۔'' نعیم نے بیتابی سے کہنا شروع کیا۔ ''کہ جب میں اس بے پایاں رنج میں گھرا ہوا تھا

تو مجھے پتا چلا کہ دنیا میں اتنی اچھی اچھی چیزیں بھی ہیں۔ بڑی بڑی مسرتوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی ہیں جن کو ہم اپنی مصروفیتوں میں بھول جاتے ہیں لیکن جو رنج میں ہمارے کام آتی ہیں۔ جو ہر دم ہمارے آس پاس رہتی ہیں' اتنی قریب کہ ہم ہاتھ بڑھا کر انہیں پکڑ سکتے ہیں۔ پرانی پرانی باتیں۔ مثلاً وہ ذہن سے مٹتا ہوا بعید چہرہ جو اس بوڑھی عورت کا تھا جس نے بچپن میں میری نگہداشت کی تھی اور پہاڑ کی ڈھلان پر ہمارا گھر تھا جس کی ٹین کی چھت پر بارش شور مچاتی تھی اور لکڑی کے برآمدے میں بلی نے بچے دے رکھے تھے۔ اور میرا پرانا جوتا جو ایک دفعہ میں نے چلتی گاڑی میں سے باہر پھینک دیا تھا اور پھر اس کے کرم خوردہ خشک چمڑے پر آخری نظر ڈالنے کے لئے بے تاب ہو کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگا تھا۔ اور جنگلی کبوتر جو ہمارے گھر میں رہا کرتے تھے اور وہ بوڑھا قلاش آدمی جس کو میں نے اپنی پرانی اونی جرابیں دے دی تھیں اور جب وہ شکریے کے الفاظ بڑبڑا رہا تھا تو رال بہہ کر اس کی داڑھی پر اٹک گئی تھی اور دھوپ میں چمکنے لگی تھی۔ اور راستے کے کنارے اگا ہوا وہ اکلوتا پھول جس کے پاس سے گزر جانے کے بعد میں دور سے واپس لوٹا تھا جیسے ہاتھ لگاتے ہی ساری پتیاں خاموشی سے جھڑ گئی تھیں۔ یہ اور کتنی ہی ایسی باتیں دنیا میں اتنی حسین جگہیں ہیں۔ دارجلنگ میں مَیں نے طلوعِ سحر کا منظر دیکھا تھا۔ جب ٹائیگر ہل پر سے سورج نکلتا ہے۔''

''ارے ہاں اتنا بڑا توے کا توا' میں نے دیکھا ہے۔'' عذرا نے کہا۔ ''تم نے بھی دیکھا ہے؟''

''نارنجی رنگ کا کبھی زرد رنگ کا کبھی سرخ رنگ کا چمچماتا ہوا اتنا بڑا' ایسی شان' ایسے وقار کے ساتھ کہ انسان کے دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور کوئی حسرت باقی نہیں رہتی۔'' وہ رکا۔ ''اور پھر میدان جنگ کی وہ رات تھی۔ وہ پرستان کی رات ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے جب مسلسل برف باری کے بعد چاند نکل آیا تھا اور ہم خندقوں میں بیٹھے تھے۔ برف تمام رات ترپالوں پر گرتی رہی تھی جو ہم نے اپنے بچاؤ کے لئے خندقوں پر پھیلا رکھی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی ایک اٹھ کر باہر دیکھتا اور دوسرے اس سے پوچھتے۔ 'برفباری رک گئی؟' اور وہ مایوسی سے سر ہلاتا ہوا آگ کے قریب آ کر بیٹھ جاتا جو ہم نے اکڑ کر مر جانے کے ڈر سے جلا رکھی تھی۔ حتیٰ کہ سب ایک ایک کر کے سو گئے پر میں ترپال اٹھا کر خندق کی دیوار کے ساتھ کھڑا رہا۔ برف ننھے ننھے پھوہوں میں گر رہی تھی اور بادلوں میں چھپے ہوئے چاند کا مدھم اجالا اور سناٹا رات میں پھیلا ہوا تھا اور برف نے دشمن انسانوں کے اس وسیع سمندر کو ڈھک دیا تھا کہ دفعتاً چاند نکل آیا۔ برفباری تھم گئی۔ دشمن کے مورچوں میں کوئی گٹار بجانے لگا اور میں نے دیکھا کہ رات اس قدر سفید' اس قدر حسین تھی۔ دائیں بازو کا سارا جنگل برف پوش تھا اور اونچی نیچی زمین پر اور دور دور پہاڑیوں پر چاروں طرف برف تھی اور وہ اس قدر پُرامن اور آسمانی رات تھی کہ جنگ کا شبہ تک نہ گزرتا تھا۔ ساز کی آواز سن کر مجھے خیال آیا کہ وہاں پر بھی ایک شخص جاگ رہا ہے اور میری طرح بچپن کی باتیں' اپنا گھر اور اپنا گاؤں یاد کر رہا ہے اور مجھ سے بدظن اور پوشیدہ ہونے کے باوجود اس وقت جنگ کا خیال اس کے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ یہ اس قدر سحر آلود منظر تھا کہ زمانہ حال کا حصہ ہونے کی بجائے بھولا بسرا واقعہ معلوم ہوتا

تھا۔ میرے دل پر وہ رات نقش ہو کر رہ گئی اور گو کہ اس وقت میں غلیظ اور تھکا ماندہ اور مصیبت زدہ تھا اور میرے بالوں میں کیڑے تھے اور گو کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں ساری دنیا سے بدظن ہو گیا تھا لیکن اس سمے میں معصوم تھا اور حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ سناٹے میں ساز کے ایک ہی تار کے مسلسل بجنے کی آواز آ رہی تھی جیسے وہ بار بار اپنے بچپن کو یاد کر رہا ہے اور گاؤں کی برف کو یاد کر رہا ہے۔'' اس نے کھینچ کر عذرا کو اپنے ساتھ لگالیا۔ ''اور ایک وہ نظارہ تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ چچا ریت پر کھڑے ہیں۔ ان کا مرغوب سفید لباس زیب تن ہے' موسم اس قدر صاف اور شان دار ہے' آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہے' آبی پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہیں' چچا کے برف کی طرح سفید بال ہوا میں اڑ رہے ہیں اور وہاں پر میرے انتظار میں کھڑے ہوئے وہ اتنے حلیم الطبع ' اتنے خوبصورت نظر آ رہے ہیں۔ یہ میری زندگی کا دلفریب ترین منظر ہے۔ اور ...... اور دنیا میں کیا کچھ نہیں ہے۔ بہار کا موسم ہے اور خزاں کی سہ پہریں ہیں اور شہد کی مکھیوں کے چھتے ہیں اور میرا گھر ہے جہاں میری ماں ساری دنیا میں صرف میرا انتظار کرتی ہے۔ اور تم ہو۔ تمہاری آواز ہے' جو تمہاری غیر موجودگی میں میرے کانوں میں محفوظ رہی ہے۔ تمہاری آواز کا یہ جادو جو زندگی اور زندگی کی ساری طوفان خیزیوں کا احساس پیدا کرتا ہے۔ قریب آؤ عذرا۔ میرے ساتھ لگ کر میری باتیں سنو۔ میرے دوست ہیں۔ تمہیں پتا ہے ان میں سے کئی ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں اور بڑ ہانکتے ہیں اور جب میں گہری توجہ کے ساتھ ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہوں تو سارا وقت مجھے علم ہوتا ہے کہ وہ شیخی کر رہے ہیں' اور دوسرے ہیں جو شرابی ہیں اور اپنے بیوی بچوں کی پرواہ نہیں کرتے اور دوسرے ہیں جو اس سے بھی برے ہیں۔ اگر کوئی دنیا کا اخلاقی جائزہ لینے نکلے تو ان کی برائیوں کی فہرست بنا ڈالے' لیکن انہوں نے میرے ساتھ ہمدردی کی ہے اور مجھے پیارے ہیں۔ دنیا کے سارے اچھے لوگ تو ہمارے دوست نہیں ہو سکتے نا۔''

عذرا جو اس کے ساتھ لگی محویت سے سنتی رہی تھی سر اٹھا کر بولی: ''ایک بات بتاؤں نعیم۔ جب میں دلّی میں تھی تو سوچتی کہ یہاں کیسے آؤں گی؟ وہ سب کچھ جو گزرا ایسا خوفناک تھا۔ حتیٰ کہ آج صبح میں یہاں پہنچی جب بھی' بلکہ انگور کی بیل کے نیچے کھڑی جب میں تمہارے پاؤں دیکھ رہی تھی اس وقت بھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پر اب ...... میں یہاں بیٹھی ہوں تو محسوس کرتی ہوں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ وہ بچوں کی سی ضد اور خوف جس نے اتنا عرصہ ہمیں روکے رکھا کچھ بھی نہ تھا۔ یہ ایسی معمولی' آسان اور قدرتی بات تھی۔ یہ ساری بات۔ یہاں آنا۔''

''عذرا ہم کچھ بھی نہیں۔ ہم بہت چھوٹے چھوٹے اور معمولی لوگ ہیں۔ قدرت کے ہاتھوں میں ہماری زندگیاں بے بس اور کمزور ہیں۔ صرف ہماری مشقت انہیں مضبوط بناتی ہے اور ہماری قوت برداشت انہیں مضبوط بناتی ہے اور ہماری دوستی اور رفاقت انہیں مضبوط بناتی ہے اور محبت ...... اس کے بغیر ہم کمزور اور نادر ہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''تم نے بہت سوچنا شروع کر دیا ہے۔'' عذرا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

خزاں کی خنک رات آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور نعیم کی ماں کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ بار بار صحن پار

کر کے دروازے تک جاتی، درزوں میں سے جھانک کر دیکھتی اور اطمینان سے سر ہلاتی ہوئی واپس آ جاتی حتیٰ کہ اس کا بیٹا اور بہو اسی طرح باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ وہ دیر تک جاگتی رہی۔

چند روز کے بعد عذرا اسے دلّی لے آئی اور روشن محل میں اس کا باقاعدہ علاج ہونے لگا۔

عذرا نے ٹھیک کہا تھا۔ نعیم نے واقعی سوچنا شروع کر دیا تھا، گو اس میں اس کی شعوری کوشش کا دخل کم ہی تھا۔ یہ زیادہ تر اس کی بیماری اور طبعی حرکت کے رک جانے کا قدرتی نتیجہ تھا۔ اس نے کبھی اتنی بے عمل زندگی نہ گزاری تھی۔ جیل کے طویل سالوں میں بھی نہیں۔ جسمانی معذوری اور دل کی غمخواری کے باعث اس کے پاس زندگی کا ایک راضی بہ رضا نظریہ تھا۔ اس نے کبھی سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ زندگی میں واقعات اتنی تیزی سے اور اس قدر بے اختیاری طور پر رونما ہوئے تھے اور انہوں نے اس طرح اسے آگے آگے چلایا تھا کہ نظریہ قائم کرنے کی اس کو مہلت ہی نہ ملی تھی۔ لاشعوری طور پر اس نے زندگی کے خارجی اثرات کو، اتفاقات اور حادثات کو قدرت کی برتر طاقتیں تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔ ذہنی بیچارگی کے اس عالم کو اس نے محسوس ہی نہ کیا تھا۔ اس نے تو ذہن کے باہر رہ کر عمر گزاری اور دنیا دیکھی تھی اور یہ عمل اسے خاصا دلچسپ اور سہل لگا تھا۔ سوچ سے وہ ہمیشہ گھبراتا رہا تھا۔ وہ اس زندگی کا، جس کے آگے آگے وہ بھاگا جا رہا تھا، عادی ہو چکا تھا اور اس کو بدلنا نہ چاہتا تھا۔ نامعلوم کے خوف نے اس کو زندگی کے دھارے کا رخ بدلنے سے روکے رکھا تھا۔ گو یہ مادی، بلکہ جبلی زندگی، جو وہ بسر کر رہا تھا، اسے کچھ راس نہ آئی تھی۔ اس نے اسے عظیم جسمانی اور دلی روگ دیئے تھے اور شدید غمخواری نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا، لیکن اتنی ستم گیری کے بعد نامعلوم کا خوف انتہا کو پہنچ چکا تھا اور وہ کسی بھی صورت کوئی نیا راستہ تلاش کرنے کی ہمت اپنے میں نہ پاتا تھا۔ چند ایک بار واقعات کی زد میں آ کر جو وہ سوچنے پر مجبور ہوا تھا تو اس نے ایک عجیب سی ذہنی کوفت محسوس کی تھی جس نے اس کے لاشعور میں سوچ کا اور تغیر و تبدل کا خوف بٹھا دیا تھا۔ ایک سخت کوش جسم کے سہارے، اپنی لاعلمی میں وہ یہی سمجھے گیا کہ یہ زندگی جو وہ بسر کر رہا تھا اصل آرام دہ اور پُرسکون زندگی تھی اور یہ کہ کبھی کبھار آفتیں تو آیا ہی کرتی ہیں۔ اور اصل آفت وہ ہے جو ذہن و روح پر آتی ہے اور جس سے دل کا سکون غائب ہو جاتا ہے اور ڈر کے مارے آدمی نیند میں اٹھ بیٹھتا ہے۔

لیکن جس طرح چلتے ہوئے انجن کے دفعتاً روک دیئے جانے پر زائد بھاپ کے اخراج کے لئے 'سیفٹی والو' کھل جاتا ہے۔ اسی طرح چارپائی کے ساتھ لگ جانے سے اس کے ذہن کی کھڑکی، جو نامعلوم پر کھلتی تھی، وا ہو گئی۔ پہلے اس نے کھڑکی کے اندھیرے میں دیکھنے سے احتراز کیا، پھر جب کوئی چارہ نہ ملا تو سٹپٹا کر آنکھیں ملائیں۔ جیسے ایک بچے کو لا کر اندھیرے میں چھوڑ دیا جائے تو آنکھیں بند کر کے رونے لگتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ چپ ہو جاتا ہے اور ہچکچاتا ہوا آنکھیں کھولتا ہے۔ بند کر لیتا ہے کھولتا ہے بند کر لیتا ہے، آخر جب اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو مٹی میں ہاتھ مار کر کھیلنے لگتا ہے۔ پھر جب اس کو اپنی موجودگی اور اپنے آس پاس کی

دنیا کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے تو اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دوستی کے انداز میں ہاتھ بڑھا کر چلنے لگتا ہے۔ اسی طرح سوچنے کے عمل نے نعیم کے ذہن پر کام کیا تھا۔ جب اس نے پہلی بار اعتماد کے ساتھ اس کے اندر جھانکا تو یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ اس کا ذہن کنواری زمین کی طرح تھا' ان غیر آباد جزیروں کی طرح تھا جہاں صرف خودرو پھول اور پودے اگتے ہیں' ان اجنبی سمندروں کی طرح تھا جن میں کبھی جہاز رانی نہ کی گئی تھی۔ جب وہ پورے یقین کے ساتھ سوچنے لگا تو ذہنی کوفت کے ساتھ ساتھ اسے اطمینان بھی نصیب ہوا۔ اندھیرے میں جگہ جگہ روشنیاں پھوٹنے لگیں۔ اس اجالے میں اس نے بہت سی چھوٹی چھوٹی خوش کن باتیں دیکھیں۔ اس کی حالت بلی کے اس نومولود بچے کی مانند تھی جو کئی روز تک آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے اجالے کو جذب کرتا رہتا ہے اور جب اس کی آنکھیں کھلتی ہیں تو بہت خوش ہوتا ہے۔

اس کے باوجود چند ہٹیلی شکلیں تھیں جو اس کھڑکی کے اندھیرے اجالے میں دور دور بکھری ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ خوفناک حد تک قریب آ جاتیں۔ ایک وہ ڈھلکی ہوئی مونچھوں والا غلیظ' ستا ہوا مردہ چہرہ تھا جس پر مدھم چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک وہ بوڑھے بیل کی طرح جھول کر چلتا ہوا ہیولا تھا جو تاریک قبرستان میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جب کہ خوبانی کے سفید شگوفے ان کے سروں پر گر رہے تھے اور اسے عجیب سا احساس ہوا تھا کہ وہ مرے ہوئے آدمی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ایک اس غیر ملکی کا چہرہ تھا جس کی سادہ' بے فن آنکھیں تھیں جو ایک چھوٹے سے جرمن گاؤں میں لکڑی کا کام کرتا تھا اور جس نے اپنی معصومیت میں اس پر دوستی اور رفاقت کا احسان عظیم کیا تھا اور اسے احساس ہوا تھا کہ اگر وہ اجنبی سب کچھ جانتا ہوتا تو بھی یہی کرتا کہ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے ...... اور ایک عذرا تھی جس کے لئے محبت کا جذبہ قریب قریب ناپید تھا لیکن جس نے اسے احساسِ شکست بخشا تھا۔ یہ عذرا کا نیا روپ تھا۔

(۳۴)

اپنے ہفتہ وار سرسری معائنے کے بعد ڈاکٹر انصاری نے حسب معمول سٹیتھوسکوپ بیگ میں رکھا اور شیشے کے جگ میں سے پانی انڈیلنے لگے۔ دو گھونٹ پانی پینے کے بعد گزشتہ ہفتے کی طبی رپورٹ دینے کی بجائے وہ گلاس کو ہاتھ میں پھراتے رہے۔ پھر گہری نظروں سے نعیم کو دیکھ کر بولے:

''تمہیں مذہب پر یقین ہے؟''

نعیم کے چہرے پر ہلکا سا تغیر بکھر گیا۔ وہ اداسی سے ہنسا۔

''یہ آپ نے کیوں پوچھا؟''

گلاس کو ہاتھوں میں پھراتے ہوئے وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئے اور بولے: ''مذہب آج بھی ہماری مدد کر

سکتا ہے۔ سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے اس دور میں بھی مذہب اعلیٰ ترین قوت ہے۔ ایک ڈاکٹر کی زبان سے یہ سن کر تمہیں تعجب ہوگا لیکن یہ حقیقت ہے کہ روحانی طمانیت 'بلڈ پریشر' کو معمول پر لانے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔''

نعیم دوبارہ بے چینی سے ہنسا۔

''بیماری ایک ناگہانی آفت ہے۔ یہ کبھی منصوبہ بنا کر نہیں آتی۔ یہ کسی منصوبہ بندی کے ساتھ اس کا مقابلہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہوتا۔ جیسے ایکا ایکی یہ آتی ہے اسی طرح ایکا ایکی اپنی قوت مدافعت کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ یہ قوت کسی بیرونی ادارے یا ڈاکٹر یا ہسپتال سے نہیں آتی' ہمارے اور آپ کے اندر موجود ہوتی ہے۔ ہم میں سے بعض اس سے آشنا ہوتے ہیں اور بعض ناآشنا۔ آج تک کوئی آلہ جراحی یا کوئی دوا ایسی ایجاد نہیں کی گئی جس میں عبادت سے بڑھ کر Healing Power ہو۔ مذہب......''

''آپ کی مراد کون سے مذہب سے ہے؟'' نعیم نے بات کاٹ کر پوچھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ڈاکٹر انصاری ہاتھ ہلا کر بولے۔ ''گو ہمارے ماں باپ کا مذہب ہمیں عزیز ہوتا ہے اور ہم میں سے اکثر تندہی سے اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں اور دوسرے کے متعلق سوچنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن مذہب کسی کے لئے برائی کا باعث نہیں بنتا۔ مذہب ایک بھی اور دوسرا بھی اور تیسرا بھی سب ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک کے ماں باپ کا مذہب اور دوسرے کے ماں باپ کا مذہب دونوں ان کی بھلائی کے لئے بنائے گئے ہیں اور ان کے بچوں کی بھلائی کے لئے' اور یہی قدر مشترک سارے مذہبوں میں موجود ہے۔ بہتری کی طرف جانے کا ایک ہی راستہ ہے جو سارے دینوں میں موجود ہے۔ عبادت۔ جو روح کی رہنمائی کرتی ہے۔ جو انسان کی سب سے بڑی ایجاد' سب سے بڑی قوت ہے۔ میں کیا مسیحائی کرسکتا ہوں۔ میری قلعی اس وقت کھلتی ہے جب میں بیمار پڑتا ہوں۔ اس وقت اگر تم مجھے دیکھ لو تو مجھ پر لعنت بھیجو......''

نعیم لیٹا لیٹا کسمسایا۔ ''مذہب پر ایمان لانے کے لئے ڈاکٹر صاحب میں ذرا بوڑھا نہیں ہو چکا ہوں؟'' اس نے اپنے مخاطب کو' جو بیچ میں بولنا چاہتا تھا' ہاتھ سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ''جو کچھ میں نے کھویا ہے اسے حاصل کرسکتا ہوں؟''

''تم اس طور پر نہیں سوچ سکتے۔ تم نے کیا کھویا ہے؟ اس بیماری پر تم یقیناً قابو پاسکتے ہو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

نعیم نے ایک پھسلتی ہوئی نگاہ اپنے بازو پر ڈالی۔ ڈاکٹر اس کے سوال کی نوعیت کو محسوس کر کے ایک لحظے کو دل میں کانپ گیا۔ لیکن نعیم نے گہرا سانس چھوڑ کر سر ہلایا۔

''ساری عمر...... زندگی میں مَیں نے کیا پایا ہے؟ ساری عمر۔ میں نئے سرے سے زندگی بسر کرسکتا ہوں؟''

''یقیناً۔ صرف تم یہ نہیں کر سکتے کہ 1910ء میں واپس چلے جاؤ یا دنیا میں جو واقعات پیش آئے ان کو بدل دو۔ لیکن تم اس سال بلکہ اس دن اور اس لمحے کو نیا لمحہ بنا سکتے ہو۔ ایک نئے انسان۔''

''دنیا کے واقعات؟ ہنہہ۔ میں اپنی زندگی کے واقعات کی بات کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر انصاری نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ہاتھ کو خفیف سی جنبش دی۔ ’’تم وقت کی بہر طور تسخیر نہیں کر سکتے۔ یہ ایک مابعد الطبیعاتی عمل ہے۔ مذہب جادو یا ایسی کوئی چیز نہیں۔ یہ تو ایک سیدھی صاف اور مثبت قوت ہے جو ہمیشہ آگے کی طرف بڑھاتی ہے۔ بناتی اور سنوارتی ہے۔ بگاڑنے یا نفی کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں، تم اپنی زندگی کو آج ہی سے ایک نئے ڈھب سے شروع کر سکتے ہو۔ اگر تم ماضی کو بھلا دینے پر اپنے آپ کو آمادہ کر سکو تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے تم ابھی پیدا ہوئے ہو۔ تمہارا دل و دماغ اور تخیل جوان ہو سکتے ہیں اور زندگی......‘‘

’’تو پھر مذہب کی کیا ضرورت ہے؟‘‘ نعیم نے چڑ کر پوچھا۔

’’مذہب؟ فوہ...... نیا انسان بننے کے لئے ایک نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں وہ نظریہ مہیا کرتا ہے۔ ٹھہرو، مجھے بتاؤ۔ اب تمہارے پاس کیا ہے؟‘‘ وہ رکے۔ ’’تاسف ور احساس جرم اور پشیمانی؟ اس اثاثے کے بل پر تم کیا کر سکتے ہو، کہاں تک جا سکتے ہو؟ اس بیماری ہی کا مقابلہ کر سکتے ہو؟ تم اپنی گزشتہ زندگی کے متعلق سوچتے ہو اور اسے تلف کرنے کی فکر میں ہو حالانکہ یہ تمہارے بس سے باہر ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے جو تم اپنا ذہن کھو دو۔ تم یہ سب جانتے ہو اور مافوق الفطرت باتیں سوچتے ہو اور خطرناک حد تک تخیل پرست ہوتے جا رہے ہو۔ تم قطعی لاحاصل طور پر، آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ختم کر رہے ہو، اپنے وجود کو بے مصرف بنا رہے ہو، اپنے لئے اور دوسروں کے لئے۔ اس وقت تمہیں ایک مثبت نظریے کی ضرورت ہے، ایسی قوت جو تمہیں اتنی تیزی سے آگے کی طرف چلائے کہ تم پشیمانی اور احساس زیاں اور سارے غیر ضروری جذبات پیچھے رہ جائیں، جو تمہیں گزرے ہوئے وقت سے آزاد کر دے، جو تمہارے مصیبت زدہ ذہن کو جھٹک دے۔ میں جانتا ہوں، تمہارے دماغ میں کسک ہے جو نقصان عظیم کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح تم زیادہ دیر تک نہیں جا سکتے۔‘‘

’’اپنے آپ کو دھوکا ہی دینا ہے، ڈاکٹر۔‘‘ نعیم نے بے حد اکتا کر کہا۔ ’’تو مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں۔ اگر اپنے آپ کو یہی کچھ بتلانا ہے کہ 'دیکھو بھائی اب تک جو کچھ ہوا اسے تو بھول جاؤ اور نئے سرے سے پروگرام شروع کرو۔ زندگی صحت مند نظریے کی مدد سے ہی خوشگوار بن سکتی ہے چنانچہ سب سے پہلے تو نظریہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔‘‘ تو جناب اس میں مذہب کہاں سے آ گیا۔ یہ تو ہم محض تخیل کے بل پر یا تھوڑے سے فلسفے کی مدد سے بھی کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ چند مادی فوائد کے لئے مذہب کو استعمال کرنا تو میرے خیال میں......‘‘

ڈاکٹر انصاری خاموش بیٹھے سرخ ہوتے رہے مگر بولنے سے پہلے انہوں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

’’میں مذہب کی اس زاویے سے تشریح کر رہا تھا جس زاویے سے تم نے اسے دیکھا۔ یہ مذہب کی ہمہ گیری ہے کہ ہم اس سے مادی فوائد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ورنہ مذہب تو ہمیں اس دنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کا تصور بھی محال ہے۔ یوں مادی فوائد سے کوئی مذہب کسی کو منع نہیں کرتا۔ لیکن اگر آپ اسے محض روحانی رہنمائی کی خاطر استعمال کرنا چاہیں تو آپ کی خوش بختی ہے۔ مذہب کا سب سے بڑا آلہ عبادت ہے۔ عبادت، جو انسان کی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک جذبہ بن جاتی ہے، جو انسان کو اپنے اندر جھانکنے کی استطاعت بخشتی ہے۔ آج تک

جس کسی نے اپنے آپ کو جانا اور پہچانا ہے اس کی بساط عبادت نے اس میں پیدا کی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چلتا ہوا آدمی ساری دنیا میں گھوم گھام کر پھر اپنے آپ تک آ پہنچتا ہے۔ وہ خفیہ اور تنگ راستہ جو انسان کی اپنی ذات پر آ کر ختم ہوتا ہے اور پھر اندر اتر جاتا ہے اور جب آدمی ڈرتا ہوا جھجکتا ہوا اپنی ذات میں داخل ہوتا ہے تو راستہ روشن اور کشادہ ہوتا جاتا ہے اور اس مقدس روشنی تک پہنچنے کا جذبہ جو راستے کے اختتام پر نظر آتی ہے' اسے پالینے کی دیوانی خواہش انسان کو آگے چلاتی جاتی ہے اور اسے ایک مقصد عطا کرتی ہے اور جب وہ مقصد شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو انسان اپنی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ پہلے شعور کے پردے اٹھتے ہیں' پھر آہستہ آہستہ لاشعور کے در وا ہوتے ہیں اور جب وہ آفاقی سطح پر پہنچ جاتا ہے تو ماوراء میں دیکھنے اور اسے جاننے لگتا ہے۔ پھر وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر بازاروں میں پھرتا ہے' دنیا کے ہنگاموں میں منزل منزل گھومتا ہے اور لوگ صرف ایک گمنام اور قناعت پسند آدمی کو جانتے ہیں' کیونکہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اور کوئی نہیں دیکھتا اور جو کچھ وہ جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس طرح چپکے چپکے وہ زندگی کی بنیادی سچائی اور اصلیت کی کھوج میں لگا رہتا ہے اور اسی کھوج میں اسے سکون مل جاتا ہے۔ سکون' جو دنیا کی تمام آفتوں کے مقابلے میں ڈھال ہے۔

''تخیل اور فلسفے کے متعلق تم کیا کہہ رہے تھے؟ تم تخیل کی بنیاد کس پر رکھتے ہو؟ تخیل کو تم بغیر کسی وجہ کے عمل میں نہیں لا سکتے۔ ذہن کو اور خیالات کو مرنے سے بچانے کے لئے تمہارے پاس کوئی وجہ' کوئی دلیل ہونی چاہیے اور تبھی اس کے جواز کے طور پر تم سوچ سکتے ہو اور اپنے دماغ کو تباہی سے بچا سکتے ہو۔ خیالات کی بنیاد تم Nothingness پر نہیں رکھ سکتے۔ ایسا اگر کبھی کرو گے تو کسی خاص سمت میں بڑھنے کی بجائے تمہارے خیالات تیزی سے اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے اور دماغ کو پاش پاش کر دیں گے۔ سمت جو خیالات کو ملتی ہے اسی تلاش سے آتی ہے جو آدمی اپنے وجود کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے جاری کرتا ہے۔ اس کے بغیر تخیل بیکار ہے۔ یہی حال فلسفے کا ہے۔ فلسفیوں کو آج تک معلوم نہیں ہوسکا کہ مادے کی اصل ماہیت کیا ہے' اور اس کا کوئی اپنا' الگ وجود بھی ہے یا محض ہمارے دماغ کی اختراع ہے۔ دنیا کے تمام فلسفوں میں سے اگر خدا کے تصور کو نکال لیا جائے یا اس قوت کو' جو کہ کائنات اور انسانی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے' تو یہ سب کے سب ایک دوسرے کی نفی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور سوچنے والے کو پاگل کر دیتے ہیں۔''

آواز کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے بولنا چاہا جیسے اپنی بات کو جاری رکھنا چاہتے ہوں' پھر اس ارادے کو ملتوی کر دیا اور گلاس میں بچے ہوئے پانی کو گلے میں انڈیل کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ نعیم آرام سے لیٹا ڈاکٹر کو دیکھے جا رہا تھا۔ صرف اس کے ہلکے سے تمتمائے ہوئے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اندر سے ہل چکا تھا۔ عذرا نے بے دھیانی سے سب کچھ سنا تھا لیکن اب جو بھاری پُراسرار فضا کمرے پر طاری ہوگئی تھی اسے منتشر کرنے کے خدشے سے ہلتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ وہ بے چینی سے آنکھیں اِدھر اُدھر گھماتی ہوئی دونوں

ردوں کو دیکھ رہی تھی اور ان کے جذبات کی ہلچل سے خوفزدہ تھی۔

ڈاکٹر انصاری اُٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے اور ہاتھ بڑھا کر یوکلپٹس کے پتوں کو آہستہ سے چُھوا۔ ''یہ صبح دیکھ رہے ہو؟'' وہ باہر دیکھتے ہوئے خوشی سے بولے۔ ''اللہ تعالیٰ کی دنیا پر ہر ایک صبح بے حد دلکشی اور انوکھے پن کے ساتھ طلوع ہوتی ہے۔''

انہوں نے مسکرا کر نعیم کو دیکھا' پھر قریب آ کر آہستہ سے اس کا کندھا تھپتھپایا اور بیگ اُٹھا کر باہر نکل گئے۔ برآمدے میں وہ شفقت سے عذرا کے' جو ان کے پیچھے پیچھے نکل آئی تھی' کندھے پر جھک کر بولے: ''اسے اکیلا چھوڑ دو۔''

اندر وہ ایک بے زبان' صابر بچے کی طرح بظاہر سکون سے لیٹا تھا' اس کے ہونٹوں پر ابھی تک وہ اداس' الوداعی مسکراہٹ تھی جو ڈاکٹر کو جاتے ہوئے دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اس کی بڑی بڑی' کاہلی سے حرکت کرتی ہوئی متلاشی آنکھوں میں سے دھیما' سلگتا ہوا' مستقل کرب عیاں تھا۔ دھوپ ہر روز کی طرح اس کے بستر کو چھونے کے بعد اب واپس جا رہی تی۔ کبھی کبھی ہوا کا جھونکا آتا تو یوکلپٹس کی بُو اس کی ناک میں داخل ہوتی جس سے وہ تنگ آ چکا تھا۔ شاخ پر ایک ننھی سی بے آواز چڑیا آ کر بیٹھ گئی تھی۔ بالآخر یہ خدائے لامقام کی ایک خوبصورت اور انوکھی صبح تھی جو ہر روز کی طرح دنیا پر طلوع ہوئی تھی۔ اس صبح کی تلاش میں ہم کہیں نہیں جا سکتے ؟ کیا ہم یہیں اپنے چھوٹے چھوٹے حقیر گھروں میں بیٹھ کر باہر طلوع ہوتے ہوئے دن کو دیکھتے رہیں گے؟ کیا ہم اسے کبھی نہیں چھو سکتے۔ کیوں؟ کیوں؟

رہبری کے لئے وہ ایک بے نظیر شے ہے۔ یا جیسے ایک عقلمند دوست مفید مشورہ دیتا ہے۔ یا کیا اس کی جگہ اس سے بھی اہم ہے؟ اچھا رکو' پہلے یہ بتاؤ کہ مذہب کے بغیر ہم کیا نہیں کر سکتے ؟

کھانا کھا سکتے ہیں' سو سکتے ہیں' ہل چلا سکتے ہیں' پھول اُگا سکتے ہیں' سفر کر سکتے ہیں' اررر...... یہ تو بکواس ہے۔ اچھا تو لو' مذہب کے بغیر بارش بھی ہوتی ہے۔ سیلاب بھی آتے ہیں' وبا بھی پھیلتی ہے' یہ بھی فضول ہے۔ البتہ شادی نہیں کر سکتے۔ مردے کو نہیں دفنا سکتے اور کچھ بھی ہو بھائی' کچھ بھی ہو' دو باتیں تو نہیں ہو سکتیں۔ ایک ساتھ تو بہرحال نہیں ہو سکتیں۔ یعنی ایک بات سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی' یہ تو قطعی ناممکن ہے۔ یا آپ خدا پرست ہو سکتے ہیں یا دہریے ہو سکتے ہیں یا گنوار ہو سکتے ہیں پر سب ایک ساتھ تو نہیں ہو سکتے۔ ایک بات سچ ہے اور دوسری بات جھوٹ' صفا جھوٹ۔ لیکن سچ۔ سچ کیا ہے؟ کچھ تو ہے جس کا پتہ نہیں چلتا' کچھ' کچھ نہ کچھ! لعنت ہے۔ کیوں میں نے اتنی دیر تلک احمقوں کی طرح کچھ سوچا ہی نہیں؟ کبھی سوچ ہی نہیں آئی' حد ہے بھئی' کیسے کیسے نالائق لوگ بھرے پڑے ہیں دنیا میں' یعنی سچ کو جاننے کے لئے لوگوں نے عمریں گنوا دیں اور میں کیا کچھ دیر کے لئے اطمینان سے لیٹ کر سوچ بھی نہ سکتا تھا؟ سخت افسوس کی بات ہے۔ اب مجھے اور ڈاکٹر کو ہی لے لیجئے۔ مجھے

روحانیت کی کوئی سوجھ بوجھ ہی نہیں اور وہ ہوا کٹر مذہبی آدمی۔ ہم دونوں کا اسلوب خیال' نقطہ نظر اور زندگی بسر کرنے کا نمونہ ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور ہم کیسی شائستگی اور اطمینان سے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کئے رہے۔ بظاہر ایک ہی سمت میں بڑھتے رہے' صحت اور کامیابی کی طرف' ایک دوسرے کی روحانی زندگی جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی' سوائے آج کے۔ تو...... وہ کیا ہے جو اس مخالفانہ رویے کے باوجود محض دو انسانوں کی حیثیت میں ہمیں ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ جو ہمیں محض سوجھ بوجھ کی بناء پر یہ سمجھنے کی طاقت دیتا ہے کہ یہ دوسرا شخص بھی اتنا ہی سادہ دل اور محبت اور دوستی کا اہل ہے جتنے کہ ہم ہیں۔ کیا یہ خدا ہے؟

مگر سوال یہ ہے بھائی کہ فائدہ کیا ہوا۔ جب تک ہمیں اس کا علم نہ تھا کیا ہو گیا تھا؟ ڈاکٹر اور مریض یا میاں اور بیوی کے تعلقات میں خدا کہاں آتا ہے۔ اس سہانی صبح کے حسن کو محسوس کرنے اور اس کی تعریف کرنے میں کسی اور چیز کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کیوں خواہ مخواہ ساتھی انسانوں کی قدرتی زندگیوں کے نیچے دیکھنے کی کوشش کریں جب کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں؟ کیوں عذرا؟ ابھی تک کیا کر رہی ہے؟ میں اس سے بات کروں گا۔ وہ نیچے والے برآمدے میں ڈاکٹر سے بحث کر رہی ہوگی۔ وہ یقیناً کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر کو قائل کر لے گی۔ وہ بیحد عقلمند ہے۔ وہ اپنے بے بس مگر پُر اثر انداز میں اپنا نظریہ اس کی رائے پر ثبت کر دے گی۔ اس کا نظریہ؟ اس کا نظریہ ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ جو کچھ میں نے کھویا ہے۔ جو کچھ میں نے ......ابھی ابھی نجمی ہلکے پھلکے قدموں سے چلتی ہوئی گزری ہے۔ کاش یہی کچھ دیر رک کر مجھ سے بات کرے۔ لیکن وہ تو مجھے یوں دیکھتی ہے جیسے مونٹ ایورسٹ کو دیکھتے ہیں' یا بدھ کے مندر کو (وہ ہنسا)۔ ابھی ابھی جو گاڑی سڑک پر سے گزری ہے میں بتا سکتا ہوں کہ رائے بہادر کیدار ناتھ کی اوپل ہے۔ اسی طرح بغیر دیکھے ہوئے میں سب کی گاڑیاں الگ الگ بتا سکتا ہوں۔ کہ یہ ٹھاکر بلبیر سنگھ کی فورڈ ہے اور یہ ڈاج ہے اور یہ فلاں۔ یہاں پر لیٹے لیٹے میں ان کے انجنوں سے اسی طرح واقف ہو چکا ہوں جیسے گھوڑا اپنے تانگے سے ہو جاتا ہے۔ میں ان سے تنگ آ چکا ہوں۔ صرف میں ایسی چمکدار شفاف صبحوں کو پسند کرتا ہوں' اور ننھے بے آواز پرندوں کو جو کچھ دیر بیٹھ کر اڑ جاتے ہیں۔ لیکن سچ بالآخر سچ ہے اور اس کے بغیر۔ مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے۔ کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

باوجود ان سب چیزوں کے۔ لیکن سچ کی تلاش میں جو وقت ہم ضائع کرتے ہیں' جو قوت اور دلچسپی ہم کھوتے ہیں اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟ آج اگر میں مان لوں کہ کائنات کے تمام ظواہر کو چلانے والی ایک برتر ہستی ہے جو سب کی خالق بھی ہے تو کیا فرق پڑے گا؟ یہ بھی مان لیا کہ مذہب ہی ایک رستہ ہے جس کے ذریعے ہم اس ہستی کو محسوس اور تسلیم کرتے ہیں' پھر؟ پھر کیا ہے' کچھ بھی نہیں۔ میں اسی طرح لیٹا ہوا ہوں اور ایک مکھی مجھے تنگ کر رہی ہے۔ ابھی عذرا آئے گی اور پاس بیٹھ کر محبت سے مجھے دیکھے گی یا کتاب پڑھنے لگے گی اور مجھے جانے کیوں ندامت سی ہوگی۔ اور ڈاکٹر ہر روز آئے گا اور اس وقت تک جب تک کہ پھر باتیں کرنے کی خواہش اس پر غلبہ نہیں پالیتی دوا دے کر چلا جایا کرے گا اور اس کا نظریہ اور میرا نظریہ کہیں بیچ میں نہ آئے گا۔ میں ہل بھی نہیں سکتا۔ میں

یوکلپٹس کی پتوں کی اس بُو سے بھی نجات حاصل نہیں کرسکتا جس سے میں تنگ آچکا ہوں۔ پھر کیا فائدہ! کیا یہ ایسا ہے کہ خدا واقعی ہے اور مجھ سے ناراض ہے کہ اب تک میں نا سمجھ رہا۔ ہنہ۔ میں تو نا سمجھ ہی پیدا ہوا تھا۔ میری تو سمجھ میں آتا ہے کہ مذہب کے راستے پر چل کر ہم پہلے نظریہ بنا لیتے ہیں، پھر عقیدہ آپ سے آپ آجاتا ہے، سچ پر آئے چاہے جھوٹ پر۔ ہمیں بہرحال اطمینان کے ساتھ مرنے کا آسان نسخہ ہاتھ لگ جاتا ہے۔ (وہ دوبارہ ہنسا)

کھڑکی میں چند چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ نعیم نے کاہلی سے سیدھے ہاتھ کی مدد سے انہیں اڑایا اور اداسی سے باہر دیکھتا رہا۔ طبعی لحاظ سے وہ مسکین تھا، روحانی طور پر پُرنخوت! خدائے لا مقام کی اس نکھری ہوئی خوشگوار صبح کو دیر تک اس کا ذہن اس تکلیف دہ جستجو میں کھویا رہا اور اس کے سر پر مصیبت اور دکھ کے سائے منڈلاتے رہے۔

(۳۵)

اس صبح کو سب سے پہلی آواز جو نجمی نے سنی راج ہنس کے جوڑے کی تھی جو برآمدے کے آگے سے گزر رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے کیے بستر میں کسمسائی۔ رات بھر بادل گرجتا رہا تھا اور بارش دریچے کے شیشوں پر برستی رہی تھی۔ گہری غنودگی کی حالت میں اس نے رات بھر کی بے آرامی کے متعلق سوچا اور دوبارہ سونے کی کوشش کی۔ لیکن دونوں پُروقار اور کم گو راج ہنس آج خلافِ معمولی بولے جا رہے تھے۔ وہ اسی طرح نیند اور نقاہت بھرا سر نرم تکیوں پر رکھے راج ہنسوں کی بولی اور اس سے پرے شروع ہوتے ہوئے دن کی دھیمی، خوابناک آوازوں کو سنتی رہی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے لیے وہ گہری نیند میں جاتی اور چھوٹے بڑے اوٹ پٹانگ خواب دیکھتی رہی۔ چائے کی پیالی تپائی پر رکھی رکھی سرد ہوگئی۔

آخر جب دھوپ شیشوں میں سے چھن کر اس کے منہ پر پڑنے لگی تو وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی، بیٹھے بیٹھے نقاہت سے دو جمائیاں لیں اور اٹھ کر دریچے کے پٹ کھول دیئے۔ انگڑائی کے لیے اٹھے ہوئے اس کے بازو ہوا میں ہی رک گئے اور وہ ٹھٹک کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

سامنے بے حد خوبصورت دن تھا۔ زمین اور آسمان جیسے ابھی ابھی دھو کر پھیلائے گئے تھے۔ فضا میں کوئی غبار، کوئی دھند نہ تھی، بادل کا ہلکا سا سایہ بھی نہ تھا۔ آسمان گہرا نیلا اور زمین سرسبز تھی اور فضا میں دھوپ کے رنگ تھے۔ سبزے پر سے نمی کی بھاپ آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھی۔ درختوں کے پتوں پر رکا ہوا بارش کا پانی ہوا کے ساتھ قطرہ قطرہ گر رہا تھا۔ چمکدار دھوپ سارے دن میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور درختوں کے بیچ بیچ پرندے ایک دوسرے کے تعاقب میں اڑ رہے تھے۔ پرندے ہر قسم کے تھے اور ایک ساتھ بول رہے تھے اور پتا نہیں چلتا تھا کہ کون کون سی آواز کس کس کی تھی۔ مگر آوازوں کا وہ سیلاب سننے والے پر یکبارگی ایک بے حد واضح تاثر چھوڑتا تھا، مسرت کا تاثر، کہ وہ مسرور تھے اور خوشی میں بول رہے تھے۔ دھوپ لحظہ بہ لحظہ تیز تر ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور

زمین کے مختلف رنگ ابھر رہے تھے: گیلے سرخ راستے' نیلگوں سڑک' مٹیالی پگڈنڈیاں' ایک سرخ گھوڑا اور اس کی رنگین گاڑی' براؤن سپینیل کتا جو مسخروں کی طرح تتلیوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا' اور سینکڑوں رنگوں کی تتلیاں جو مسرور شرابیوں کی مانند لڑکھڑاتی ہوئی اڑ رہی تھیں۔ اور چمکتا ہوا سفید آنکھوں کو چندھیا دینے والا راج ہنسوں کا جوڑا جو شاہانہ وقار سے چلا جا رہا تھا' جن کے پروں پر پانی کے قطرے رکے ہوئے تھے جن میں دھوپ کے رنگ جھلملا رہے تھے۔ نجمی نے اس چمکدار روشن دن کے حسن کو دم بخود ہو کر دیکھا اور دو چار لمبے لمبے سانس لئے۔

''یہ ایسا دن ہے۔ یہ ایسا دن ہے۔'' اس نے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ''میں دیکھ سکتی ہوں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ ٹھیک ہے۔'' اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا اور میز پر سے برش اور رنگ اٹھا کر بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

یہ نجمی تھی جو حال ہی میں انٹر کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی اور آج کل بقول عمران کے عیش کر رہی تھی لیکن عمران کی ذہنی سطح سے ذرا اوپر اٹھ کر دیکھا جاتا تو نجمی ایسے لوگوں میں سے تھی جن کے لیے عیش کا لفظ بے معنی اور گھٹیا ہوتا ہے۔ وہ احساس کی اوپری سطح پر زندہ تھی۔ عمران اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کے لیے اس کے دل میں محض ایک دائمی خاموش حقارت کا جذبہ تھا۔ وہ ان سب کو ایسے لوگوں میں شمار کرتی تھی جو مستقل زندگی کی نچلی سطح پر کمینے پن کے سکون اور قناعت کے ساتھ رہے چلے جاتے ہیں۔ جو چھوٹی بڑی آسائشوں کے حصول کی خاطر لا تعداد اندیشے دل میں اکٹھا کر لیتے ہیں اور اسے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ جو ذہن اور روح سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور بالآخر فقط عمومی پن کے سوا کسی چیز کے قابل نہیں رہتے۔ جو دائمی' گمنام عمرمیت کو زندگی کی تمام کاوشوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

وہ خود مختلف طور پر سوچتی اور محسوس کرتی تھی۔ اب وہ چند سال پہلے کی چھوٹی سی لڑکی نہ تھی جو اپنے اردگرد کی تقریباً ہر جاندار اور بے جان شے کو محسوس کر کے حیرت زدہ ہو جایا کرتی تھی اور جس کی متغیر طبیعت کے ہاتھوں سارے گھر والے نالاں تھے۔ اب بھی کبھی کبھی کوئی دلفریب منظر یا انوکھا واقعہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وہی کنواری' اچھوتی حیرت جھلکنے لگتی تھی لیکن یہ محض اس کا احساس تھا جس میں سے کہ اب لاعلمی اور صدمے کا تاثر خارج ہو چکا تھا۔ اس کا انتہائی حساس ذہن بار بار جھٹکے کھا کھا کر اب ٹھہر چکا تھا اور آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ اب اس نے اپنے آس پاس کی ہر جاندار اور بے جان شے کے ردعمل کو دیکھ کر اور جان کر قبول کر لیا تھا اور محض اسی کی بنا پر اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگی تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ اور کم گو تھی۔

اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ یہ سب جانتی تھی۔ یہ اس قدر واضح طور پر اس کے علم میں تھا کہ وہ ان سب سے مختلف ہے' کہ اس کی زندگی ان سب کی زندگیوں سے الگ ہے' کہ اس کی دنیا ان کی دنیاؤں سے مختلف سطح پر آباد ہے۔ اور یہ سب کچھ اس نے اتنی مایوسی' اتنی دل شکنی کے بعد جانا تھا۔ وہ ساری دوستیاں جو اس نے لگائیں اور ختم ہو گئیں' وہ تمام اچھے اور پیارے لوگ جنہوں نے اسے سخت مایوس کیا' جو اس قدر معمولی اور نالائق نکلے اور اسے

چھوڑ گئے۔ اس کے ذہن کے آس پاس دور دور تک انسانی آبادی یا کسی ہمسائیگی کا نشان تک نہ تھا۔ گو وہ اب بھی ان سب سے بغیر کسی تعصب کے ملتی جلتی تھی کہ فی الحقیقت وہ کسی طاقتور منفی جذبے کی اہل نہ تھی' لیکن وہ جانتی تھی کہ ان کے ساتھ کبھی نہ رہ سکتی تھی' کہ وہ دو مختلف اکائیاں تھیں جو مختلف سطح پر تخلیق کی گئی تھیں۔ اپنی غیر آباد ذہنی بلندی پر سے وہ ان کو حسرت' پیار' شفقت اور حقارت سے دیکھتی ہوئی شدید احساس تنہائی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کو تنہا اور خاموش دیکھ کر اداسی کا نہیں' بزرگی کا احساس ہوتا تھا' اور اس کے بعد اس کا بڑا سا سر' نوعمر آنکھیں اور نازک خوبصورت جسم دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ روشن آغا اس سے ویسی ہی محبت کرتے تھے جیسی عذرا سے' اس کی ماں اس سے اتنا ہی دور تھی جتنا اپنے دوسرے بچوں سے۔ گھر بھر میں بس عذرا ہی ایک تھی جس سے وہ مکمل ذہنی اطمینان اور فطری پن کے ساتھ ملتی تھی کیونکہ اس نے کبھی اس سے ان تمام غیر معمولی صفات کی امید نہ رکھی تھی جن کی وہ دوسرے سب لوگوں سے متوقع تھی۔ وہ اس کے لیے شفقت اور مہربانی کا ایسا دریا تھی جو گدلا اور کٹا پھٹا ہونے کے باوجود ماہی گیروں' مچھلیوں اور لاکھوں فصلوں کی زندگی کا سبب بنتا ہے۔ کبھی کبھی جب اچانک اس کا جی مر جانے کو چاہتا تو وہ عذرا کی گود میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگتی تھی۔

کالج میں وہ تاریخ اور معاشیات کے علاوہ موسیقی اور آرٹ پڑھتی تھی۔ تصویر کشی ایک جذبے کی طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ روشن محل میں ہر تیسرے مہینے وہ کمرہ تبدیل کرتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اچانک ایک روز اسے خیال آتا کہ اب وہ اس کمرے میں نہیں رہ سکتی' کہ وہ اس منظر سے تنگ آ چکی ہے' اور بغیر کوئی چیز چھوئے وہ صرف اپنے کینوس اٹھا کر برآمدے میں نکل آتی اور روشن محل کا سارا عملہ اس کے لیے نیا کمرہ سجانے میں مصروف ہو جاتا۔

اس خوبصورت صبح کو وہ برآمدے کے کونے میں سٹول پر بیٹھی بے حد انہماک سے منظر کشی میں مصروف تھی کہ اس کی اکلوتی عزیز دوست نفے بھاگتی ہوئی آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

''اوہ۔ ہاہ' کس قدر گرمی ہے۔'' اس نے دوپٹے کے پلو سے ہوا کرتے ہوئے کہا اور اپنے کیچڑ سے لت پت جوتے اتارنے لگی۔

''اوہو ہو۔ کیا حبس ہو رہا ہے۔'' اس نے دوبارہ کنکھیوں سے نجمی کو دیکھا جو تصویر میں غرق تھی۔ ''فوہ۔فوہ۔''

نجمی نے کوئی دھیان نہ دیا۔

''اللہ توبہ کیا چکر میں ہمیں یہ لڑکیاں۔'' نفے جل کر بولی' ''ارر کماری نجمی بیگم چٹو پادھیائے صاحب' اگر آپ نے میری طرف توجہ نہ دی تو میں جوتے لے کر اوپر آ جاؤں گی اور آپ کے آرٹ میں حرج واقع......''

نجمی بوکھلا گئی۔ ''ارر اوہ۔ ارے ہائے نفے تم کب سے۔''

''ٹھیک ٹھیک تو یاد نہیں کم و بیش بیس سال سے ہوں۔''

نجمی بے خیالی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اور اس وقت کچھ موسم کے بارے میں عرض کر رہی تھی۔''

''اوہ۔ ہاؤ سلی ڈیئر۔'' نجمی نے کہا۔ ''اچھا معاف کر دو۔'' ''تم نے کوئی نظم لکھی؟''

''اس گرمی میں''

نجمی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''گرمی پر ہی لکھ دو' ایسا خوبصورت دن ہے۔''

''اچھا تو سنو۔''

''اررر جوتا جوتا۔'' نجمی چلائی۔ فے نے جلدی سے جا کر ایک جوتا' جو پاؤں میں ہی رہ گیا تھا' اتار دیا۔

''سنو۔'' پھر اس کے پاس فرش پر بیٹھ کر اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا:

''ہوا' جو درختوں کی سانس تھی، گزشتہ رات کی بارش میں گھل گئی۔

اب درخت قبرستان کے کتبوں کی طرح ساکت کھڑے ہیں۔

اور میں اپنی سانسوں سے انہیں زندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

میں اپنی تمام سانسوں سے ایک پتا بھی نہیں ہلا سکتی۔

کیونکہ میں دل شکستہ ہوں اور میری زندگی کا زور ٹوٹ چکا ہے۔''

''چ چ چپ کر۔'' نجمی بے اختیار ہنستے ہوئے بولی۔ ''یہ تو صفا نثر ہے۔''

''یہ تو خیالات ہیں۔'' فے گرم ہو کر بولی۔ ''اور کیا ابھی سے شاعری ہو گئی؟ یہ نقاشی تھوڑا ئی ہے کہ ایزل اور برش لیے اور تصویر بنا کے رکھ دی۔ شاعری کی بڑی منزلیں ہمیں کماری جی۔''

''اچھا بھائی مانا کہ تم بڑی منزل میں ہو۔'' نجمی نے کہا۔ ''یہ تصویر دیکھو۔''

فے نے آنکھیں سکیڑ کر' ہاتھ کا سایہ کر کے کئی بار تمسخر سے اوپر نیچے دیکھا اور کندھے اچکا کر بولی: ''معمولی ہے۔''

''سامنے والا منظر ہے۔'' نجمی نے بتایا۔

''اچھا؟'' فے نے بے حد اچنبھے سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ ''بھئی مسخرہ پن مت کرو۔'' نجمی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آج سویرے سویرے مجھے ایسا لگا کہ یہ دنیا کا حسین ترین دن ہے جو طلوع ہوا ہے۔ پتا نہیں فے پہلے بھی دن ایسے ہی نکلتا ہو گا لیکن آج رات بھر بارش کا شور سن سن کر میں ایسے دن کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ سویرے سویرے راج ہنسوں نے بول بول کر مجھے جگا دیا اور جب میں نے کھڑکی کھولی تو کیا بتاؤں فے ڈیئر کہ درختوں پر سارے پرندے بول رہے تھے اور ان کی آوازیں اور سامنے کا سارا منظر میری آنکھوں میں کھب گیا۔ پتا ہے برمن جی کہتے ہیں کہ اگر آپ آنکھیں بند کر کے منظر کی ایک ایک چیز کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہوں تو جان لیں کہ وہ تصویر بنانے کے قابل ہے۔ اور فے ڈیئر مانو کہ جب میں نے آنکھیں بند کیں تو سبزے پر سے بھاپ کو اٹھتے ہوئے دیکھا' اور پتوں پر رکے ہوئے قطروں کو ہوا کے ساتھ نیچے گرتے ہوئے اور پرندوں کو ایک دوسرے

کے پیچھے اڑتے ہوئے اور...... ہائے فے اب بھی حالانکہ صبح گزر چکی ہے۔ اب بھی۔''

''اچھا؟'' فے نے سچ مچ حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ''تب تو جلدی سے اسے بنا ڈالو۔''

''ہاں، اور تم نظم لکھو۔ یہ تخلیق کا دن ہے۔''

''مجھے بھوک لگی ہے۔'' فے نے منہ لٹکا کر کہا۔

گیلی بجری پر قدموں کی آواز سن کر وہ چونک پڑیں۔ عمران ڈریسنگ گون پہنے جمائیاں لے رہا تھا اور اس کے ساتھ خالد حسب معمول فے کو تنگ کرنے کے منصوبے بناتا ہوا چلا آرہا تھا۔ ''مجھے جاپانی ناموں سے عشق ہے'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''مثلاً فے گی ماشایا فے می گوشایا فے۔ ارے باپ رے یہاں تو فے اور نجمی تشریف رکھتی ہیں۔ صبح بخیر بیبیو، ہم آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوئے؟''

فے نے جھگڑے سے ڈرتے ہوئے بڑے اخلاق سے سلام کا جواب دیا۔

''خیر کوئی حرج نہیں۔ میں امی کو یہی بتا رہا تھا'' خالد نے کہا۔ ''کہ مجھے جاپانی ناموں سے بے حد عقیدت ہے۔ اور جاپانی شاعر سے۔''

''یہاں کوئی جاپانی شاعری نہیں کرتا۔''

''کئی اصحاب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ۔''

''میں قطعی جاپانی شاعری نہیں کرتی۔'' فے نے کہا۔

''آپ یقیناً کرتی ہیں۔''

وہ سٹپٹا گئی۔ ''ارے ہائے نجمی میں کب جاپانی شاعری کرتی ہوں۔''

''بھئی خالد اب فے کو تنگ مت کرو۔'' نجمی نے کہا۔

''لیکن یہ حقیقت ہے نجمی کہ مجھے جاپانی شاعری سے عشق ہے۔ مثلاً وہی والی نظم جو خزاں کے بارے میں فے نے لکھی تھی ایک دم جاپانی تھی۔''

''کب جاپانی تھی۔'' فے جوش میں آکر بولی۔ ''وہ تو برمن جی کی بھی رائے ہے کہ بے حد اوریجنل تھی۔''

''جاپانی شاعری بھی اوریجنل ہے بلکہ اورینٹل ہے۔'' خالد نے کہا۔

''بس یہی پتا ہے آپ کو۔'' فے نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''چینی شاعری اورینٹل ہے اور چینی سے زیادہ ہندوستانی۔''

''نہیں فے ڈیئر ہندوستانی سینز یادہ چینی۔'' نجمی نے کہا۔

''ہیں؟ یعنی ہندوستانی شاعری۔'' وہ لڑائی پر آمادہ تھی۔

''بھئی میرا مطلب ہے کہ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے چینی شاعری زیادہ قدیم ہے۔ ویسے خیال

تمہاری نظم کا بھی اورینٹل ہو سکتا ہے۔''

''وہ تو ہئی۔'' فے نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال جاپانی شاعری قطعی اورینٹل نہیں بلکہ بکواس ہے۔''

''ارے رے دیکھو بھئی فے، تمہاری نظم اورینٹل تھی چاہے کونٹی نینٹل تھی۔'' خالد نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ''پر جاپانی شاعری کے متعلق کچھ کہا تو لڑائی ہو جائے گی۔''

''تو ہو جائے لڑائی۔''

''تھ تھ تھ یعنی کس قدر ان لیڈی لائک رویہ ہے آپ کا فہمیدہ بیگم، تھ تھ تھ حد ہے بھئی۔''

''درست ہے بالکل۔ آپ کو شاعری کا کیا پتا۔''

جمائیاں لیتے لیتے اکتا کر عمران نے پوچھا۔ ''آپ ناشتے پر نہیں آئیں بی بی۔ پپا پوچھ رہے تھے۔''

''ارے کیا بتاؤں ایمی یہ تصویر سویرے سے میرے اوپر سوار ہے۔ کچھ بھی نہیں کیا۔ روشن آغا بھی تھے؟''

''ہاں۔''

آخر جب لڑائی شدت اختیار کر گئی تو نجمی اور عمران نے ڈپٹ کر خالد سے چپ رہنے کو کہا۔

''آپ بیچ میں مت آئیں۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔'' خالد نے کہا۔

''کوئی ذاتی معاملہ کسی کا نہیں ہے۔'' فے چیخ کر بولی۔ ''صریحاً مسخرہ پن ہے۔''

لے دے کر دونوں میں صلح صفائی کروائی گئی۔ دوپہر کے کھانے تک وہ چاروں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے کاہلی سے باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی خالد کوئی لطیفہ سنا کر ان کو ہنسا دیتا یا فے کو منانے کی کوشش میں سنجیدہ اور دردناک لہجے میں اس کی کوئی نظم گنگنانے لگتا۔ کھانے کی میز پر پرویز نے فے کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر پوچھا: ''آج پھر فہمیدہ بیگم اور خالد میں لڑائی ہو گئی۔'' وہ ہمیشہ فے کا پورا نام لیا کرتا تھا۔

''ہاں پپا۔'' عمران نے پلیٹ میں چاول اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔

خالد بوکھلا گیا: ''نہیں انکل میں تو کہہ رہا تھا کہ جاپانی شاعری میں قنوطیت ذرا بھی نہیں ہے' اس لیے مجھے پسند ہے اور فے کی شاعری میں اس قدر..........''

''پھر تم ایسی دردناک آواز میں اس کی نظم کیوں گا رہے تھے؟'' نجمی نے جلدی سے کہا۔

وہ اور زیادہ بوکھلا گیا: ''ارر میرا مطلب ہے کہ فے کی شاعری میں بھی نہیں ہے۔ یعنی مجھے پسند ہے۔'' سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

کھانے کے بعد جانے کیسے مذہب اور کلچر پر بحث چل نکلی جو کہ خالد کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس کا پرانا نظریہ تھا کہ مذہب اور کلچر کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں' جس نظریے سے کہ باقی سب کو اختلاف رائے تھا۔ فے' جو

اس کی مخالفت کا ٹھیکہ لیے بیٹھی تھی، بڑھ چڑھ کر بحث میں حصہ لے رہی تھی۔
خالد نے محض کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنے نظریات بنا لیے ہیں حالانکہ یہ ایسا موضوع ہے جس کے لیے قوموں بلکہ طبقوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔''
''جھگڑو نہیں بھئی۔'' پرویز نے سوچ سوچ کر کہنا شروع کیا۔ ''آپ دونوں کا ذاتی اختلاف ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے خالد کہ قوموں کی تہذیب ان کے مذاہب سے براہ راست اثر لیتی ہے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی تہذیبیں بڑے بڑے مذاہب پر قائم ہیں۔ یورپ میں دیکھو......''
''جی ہاں یورپ کو ہی لے لیجیے۔'' خالد نے بات کاٹ کر کہا۔ ''یورپ کے عیسائی کیا اسی طرح رہتے ہیں جیسے ہندوستان یا چین کے؟ یہاں پر زیادہ تر عیسائی گلیاں صاف کرتے ہیں۔ کیا ان کی تہذیب وہی ہے جو انگلستان کے بادشاہ کی ہے؟''
''اس کا مطلب ہے کہ آپ کی تہذیب کا دارومدار محض طبقاتی تقسیم پر ہے۔'' فے نے کہا۔
''محض طبقاتی تقسیم پر نہیں ہے، لیکن تہذیب کی تشکیل میں کسی جماعت کے معاشی حالات اور وسائل کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔''
''یہ درست ہے۔'' عذرا نے، جو نعیم کے ساتھ کھانا کھا کر ان کے پاس آ بیٹھی تھی، کہا۔ ''ہر ایک معاشرے کا قیام سوسائٹی پر ہوتا ہے، کہ وہاں کہ لوگ کیسے آپس میں ملتے ہیں اور کب ملتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مذہب ایک دائمی شے ہے اور تہذیب جو ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہے اس پر قائم نہیں کی جا سکتی۔''
نجمی نے پرویز کی حمایت میں بولنا چاہا لیکن عذرا کے خیال سے سر کو خفیف سی غیر یقینی جنبش دے کر رہ گئی۔ اس پر فے تیز ہو کر بولی: ''کیا آپ مذہب کو ایک مکمل ضابطہ حیات نہیں مانتے؟ بتایئے جب اول اول انسانوں کی گروہ بندی ہوئی تھی تو مذہب کی بنا پر نہیں ہوئی تھی؟ اور پھر آپ تہذیب اور تمدن اور سب چیز کو ملا جلا کر سراسر کنفیوژن پھیلا رہے ہیں۔ آپ کے پاس کوئی واضح تصور ہی نہیں ہے۔ کلچر بالکل دوسری بات ہے۔''
''جی نہیں۔'' خالد نے کہا۔ ''نوع انسانی کی گروہ بندی علاقائی حدود کی بنا پر ہوئی تھی۔''
''وہ تو جب تھی جب لوگ غاروں میں رہا کرتے تھے۔ جب تہذیب کی روشنی پھیلی تو منظم گروہ بندی محض مذہب کی بنیاد پر ہوئی، جب علاقائی حد بندی کا تصور ختم ہوگیا، جب دو مختلف گاؤں میں رہنے والے دو شخص بھائی بھائی تھے محض اس وجہ سے کہ ایک مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔''
''یہی تو فرق ہے بھئی کہ آپ کے پاس کلچر کا بڑا غلط تصور ہے۔'' عذرا نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دو آدمی، جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، جب ملیں تو ایک دوسرے کے رہن سہن کے طریقے کو پسند نہ کریں، یا ایک دوسرے کی خوراک اور پوشاک کو اہمیت نہ دیں، یا ایک دوسرے کی موسیقی کو محض خوش خلقی کی

بناء پر برداشت کریں۔''

''اور یہ سراسر علاقائی حدود پر منحصر ہے۔'' خالد نے کہا۔ ''ہندوستان ہی کو لیجیے۔ شمال کے لوگ بلند و بالا اور گورے چٹے ہیں' ان کی سوسائٹی میں بہادری اور جوانمردی کا بول بالا ہے' ان کے مشاغل شہسواری اور نشانہ بازی ہیں اور خوراک گوشت ہے۔ جوں جوں آپ جنوب کی طرف آتے ہیں لوگوں کے قد چھوٹے اور جلد سانولی ہوتی جاتی ہے' ان کی خوراک مرچوں کا سالن اور سبزیاں ہوتی ہیں اور وہ مزاج کے تیز' بزدل اور ذہین ہوتے جاتے ہیں۔ شمال مغربی صوبوں کا ایک مسلمان بمبئی کے مسلمان کے گھر جا کر اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے۔ کیوں؟ انگلستان کو دیکھیں۔ انہوں نے ریاست کو مذہب سے الگ کر دیا ہے' کیوں؟ کہ ریاست میں ان کا کلچر ہے۔''

''وہ مادہ پرستی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔'' فے نے کہا۔

''چارہ کیوں نہیں.......... ہاں کیوں نہیں۔''

پرویز نے بولنا چاہا لیکن اس کی آواز تین چار آوازوں میں دب کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اور اس کی بیوی اکتا کر اٹھ گئے۔ عذرا نے جب دیکھا کہ بحث وحث کوئی کرنا نہیں چاہتا' سب دھاندلی کر رہے ہیں تو وہ بھی اٹھ کر نعیم کے پاس چلی گئی۔ اس کے بعد جو بحث کا ستیا ناس ہوا اور جو غدر مچا تو کسی کو ہوش نہ رہا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کیا کہہ رہا ہے اور خوش خلقی کس بلا کا نام ہے۔ ایک دوسرے پر کند ذہنی اور مسخرے پن کے الزامات لگانے کے بعد جو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو کلچر سے معاشیات اور فلسفہ اور تاریخ اور آرٹ اور موسیقی اور فلمی گانے اور فلمیں اور ایکٹر ایکٹرسیں اور ان کی ذاتی زندگی کے واقعات پر جا کر ختم ہوا۔ جب سہ پہر کی چائے کے لیے سب اکٹھے ہوئے تو باتیں کر کر کے تھک چکے تھے۔ خاموشی سے اونگھتے ہوئے انہوں نے چائے ختم کی۔ پھر خالد اور عمران اٹھ کر باہر جانے کی تیاری کرنے لگے اور نجمی اور فے نامکمل تصویر کی طرف بڑھیں۔

''فے تم کو گھر جانا ہو تو ہم اسی طرف جا رہے ہیں۔'' خالد نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بھئی شکریہ۔ میں بعد میں جاؤں گی۔'' فے نے اخلاق سے جواب دیا۔

''آج آپ سارے دن کے لیے روشن محل میں مدعو ہیں؟''

فے نے سنی ان سنی کر دی۔ دونوں لڑکے بجری کی گیلی سڑک پر گیٹ کی طرف بڑھے۔

''خالد اس فال میں ہم دارجلنگ جا رہے ہیں۔'' نجمی نے برآمدے میں سے چلا کر بتایا۔

''کیوں امی......''

''اماں گولی مارو یار فال کو......'' عمران نے جھلا کر کہا۔

''مبارک ہو۔'' خالد گیٹ پر سے ہاتھ ہلا کر چلایا۔ ''اب کہاں چلیں؟''

''بلیرڈ۔''

دونوں لمبے لمبے قدم رکھتے یونیورسٹی کلب کی طرف چلے گئے۔

جب نے اس کے آپس سے اٹھ کر گئی تو وہ ابھی تصوری بنا رہی تھی۔ کینوس پر کام کرتے کرتے دفعتاً اس کو پرانے جانے پہچانے احساسِ تنہائی نے گھیر لیا۔ اس نے سوچا کہ صبح سے لے کر شام تک وہ اجنبی لوگوں میں گھری رہی تھی، کہ وہ بیکار ان کے ساتھ سر کھپاتی رہی تھی، وہ ان میں سے نہیں تھی۔ اس نے برش ایک طرف رکھ کر مشرق کی سمت دیکھا جہاں پر رات شروع ہو رہی تھی۔ پھر اس نے انتہائی مایوسی سے تصویر کو دیکھا اور اس کا جی چاہا کہ زور زور سے روئے۔ سارے دن میں اس نے محض چند لکیریں کھینچیں تھیں۔ روشن محل کے تمام نوکر ایک ایک دفعہ آ کر اس کو دیکھ گئے۔ وہ دیر تک لوہے کی ریلنگ پر جھکی رہی اور تنہائی اور یاس کے سائے اس کے اردگرد پھیلتے گئے۔

(۳۶)

وہ ایک غیر معمولی گرم شام تھی جب وہ سب گھاس پر کرسیاں بچھائے تاش کھیل رہے تھے۔ برج کا محور پرویز تھا جو دو ماہ کی تعطیل پر تھا۔ جس روز اس کی بیوی اسے کلب نہ جانے دیتی وہ روشن محل میں ہر ایک برج کھیلنے والے کو اکٹھا کر کے رات تک کھیلتا رہتا۔ صرف برج ہی ایک ایسی سازش تھی جس میں وہ اپنے سے کم عمر والوں کو شامل کرتا، روشن آغا سے چھپا کر ہارے ہوئے کھلاڑیوں سے پیسے وصول کرتا اور پھر انہیں کلب لے جا کر آئس کریم کھلاتا یا پکچرز لے جاتا۔

دن کی آخری زرد دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر پڑ رہی تھی جب خالد نے کھیلتے کھیلتے تھک کر انگڑائی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ریاض جو اس کے پیچھے بیٹھا تھا لپک کر اس کی جگہ پر جا بیٹھا۔

''حساب چکا کے جاؤ میاں۔'' پرویز نے کہا۔ ''لیلیٰ ذرا سکور بورڈ دکھانا۔''

''جا کب رہا ہوں انکل۔'' خالد نے اکتا کر کہا اور میز پر سے شربت کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ ایک سانس میں شربت ختم کر کے اس نے ہاتھ کی پشت سے منہ پونچھا اور سبزے میں سے اٹھتے ہوئے گرم، مرطوب بخارات کو ٹانگوں پر محسوس کیا۔ وہاں کھڑے کھڑے خالی گلاس کو انگلی سے گھماتے ہوئے دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ نجمی وہاں نہیں تھی۔

''نجمی! نجمی!!'' اس نے مڑ کر سب پر نظر ڈالی اور سبزے کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

وہ روشن محل کے پچھواڑے یوکلپٹس کے چھوٹے سے مصنوعی جنگل میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، خالد کو دیکھ کر چونک پڑی۔

''غروب آفتاب دیکھا جا رہا ہے۔'' خالد نے کہا۔

اس نے ایک لمحہ خالد کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا اور مسکرا پڑی۔ شام کا انتظار کر رہی ہوں۔ بعض دفعہ

گرمیوں کی شامیں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔

وہ خاموش رہا۔

''کھیل ختم ہوگیا؟''

''نہیں''

''تم آج مستقل ہارے۔'' وہ ہنسی۔

''ہاں۔''

اس نے تردّد سے خالد کے خاموش، پُر اشتیاق چہرے کو دیکھا۔ ''بیٹھو۔''

وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر انگلیاں بجانے لگا۔ اس کو اس قدر خاموش پا کر وہ دفعتاً پریشان ہوگئی۔

''کس قدر گرمی ہے۔'' اس نے سکارف سے پیشانی کا پسینہ جذب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم پہاڑ پر کیوں نہیں گئے خالد؟''

''آپ لوگ جو نہیں گئے۔''

''ارے ہاں چند برس ہوئے ایک فال میں مَیں روشن آغا کے ساتھ دارجلنگ سے گزری تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں خالد کہ وہاں پر خزاں کا موسم کیسا دلکش ہوتا ہے۔ اس قدر رنگین۔ میں نے دیکھا کہ سینکڑوں قسم کے درخت ہیں اور ہر ایک درخت پر مختلف رنگ کے پتے ہیں، کہیں سرخ کہیں زرد اور کہیں ہرے۔ ایک جھنڈ میں تو آگ لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پتوں کا رنگ قرمزی تھا اور ان پر شام کی دھوپ پڑ رہی تھی اور وہ متواتر گر رہے تھے اور زمین پتوں میں چھپی ہوئی تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے رنگ تبدیل ہوتے گئے۔ رنگ ہی رنگ۔ میں تصویریں بنانا چاہتی تھی لیکن ہم شیلانگ جا رہے تھے جہاں روشن آغا کو ایک کانفرنس میں شرکت کرنا تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ ہم کئی سال تک جا ہی نہ سکے۔ اب کے روشن آغا نے کہا کہ یا آپ گرمیوں میں مسوری جایئے یا فال میں دارجلنگ، سارا وقت آپ دلّی سے باہر نہیں رہ سکتیں۔ اب سوچتی ہوں کہ غلطی کی، یہاں گرمی میں مر رہے ہیں۔

وہ خاموش بیٹھا پتھر پر انگلیاں بجاتا رہا۔

''ارے تم منہ پھلائے کیوں بیٹھے ہو۔'' نجمی نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

خالد نے ایک لمبا سوالیہ 'ہوں؟' کیا۔

''سگریٹ کے لیے پیسے نہیں ہیں؟''

''ہیں۔'' اس نے غرا کر کہا اور سگریٹ نکال کر جلانے لگا۔ نجمی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس نے پھر اپنا اینچیوں والا رویہ جاری رکھنا چاہا مگر نجمی کو ابرو اٹھائے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر گھبرا گیا۔

''اوہ۔ نہیں تو...... میں ......'' اس نے کوشش کر کے اپنے آپ پر قابو پایا۔ ''میں سمجھا اب آپ مصوری پر ایک لیکچر دیں گی۔''

نجمی کے ابرو کانپے۔ ''میں تو خود اس موضوع سے احتراز کرتی ہوں جس کے متعلق لوگ کچھ نہ جانتے ہوں۔''

خالد اسی طرح بیٹھا خاموش پُراشتیاق چہرے سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ خاموش ہوگئی تھی اور رنجیدہ جذبات اس کے دل کو زخمی کر رہے تھے۔ شام کی گرم مرطوب ہوا ان کے سروں پر ٹھہری ہوئی تھی جس میں گیلی مٹی اور یوکلپٹس کے پتوں کی بُو تھی۔

آخر اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور جھک کر بیٹھ گیا۔ ''یہ سچ ہے نجمی کہ میں مصوری کے متعلق کچھ نہیں جانتا لیکن۔ میں محض تمہاری وجہ سے پہاڑ پر نہیں گیا۔''

''میری وجہ سے؟'' نجمی نے سانس روک کر پوچھا۔

''ہاں۔ تم جو نہیں گئیں۔'' اس نے اسی اداس قطعی لہجے میں کہا۔

نجمی آنکھیں پھیلائے اسے دیکھتی رہی۔ خالد کی آنکھوں میں بے پایاں نرمی اور اداسی دیکھ کر ایک لحظے کے لیے اس کے دل میں نوعمری کے جذبات مچلے جنہوں نے اسے پریشان کر دیا۔ نوعمر' کنوارے جذبات جو محبت کرنے والے انسان کے خلوص اور سچائی کا یقین دلاتے ہیں' جو محبت کے خالص تصوراتی جذبے کو پہلی دفعہ اپنے سامنے پا کر ٹھٹک جاتے ہیں اور روئیں روئیں میں بے ساختگی پیدا کر دیتے ہیں۔ نجمی نے گھبرا کر نظریں اس پر سے ہٹا لیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ خالد اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''کیا یہ کافی نہیں ہے نجمی؟'' اس نے جذبات سے ابلتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ''بیٹھ جاؤ۔ تم مجھے پریشان کر رہے ہو؟''

اس کے قریب زمین پر بیٹھ کر وہ پتوں کو مٹھی میں لے کر مسلنے لگا۔

''تم...... کیا کہنا چاہتے ہو؟'' نجمی نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اگلے لمحے وہ دل میں سوال کے کمینے پن پر ہنسی۔

''میں شاعری نہیں کر سکتا' نجمی تصویریں نہیں بنا سکتا۔ لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟''

''محبت؟'' نجمی نے ٹھٹک کر دہرایا۔ مغرب کی سرخی' جہاں سورج غروب ہو چکا تھا' ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی اور وہ طوفان میں گھرے ہوئے دو پرندوں کی مانند پاس پاس بیٹھے تھے۔ بڑی دیر کے بعد ہوا کا ایک جھونکا کہیں سے آیا اور ان کے سروں پر ٹھہری ہوئی بھاری ہوا کو اڑا کر لے گیا۔ ایک گلہری دونوں اگلے پنجے اٹھائے غور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ یوکلپٹس کا ایک پتا اس کے سر پر گرا اور وہ چھلانگ لگا کر بھاگ گئی۔

نجمی نے ایک لمبا سانس لیا اور سادگی سے ہنسی۔ اس کی بے راز ہنسی اور پرانی بے تکلف آنکھیں دیکھ کر خالد کا دل سرد پڑ گیا۔

''تم محبت کو کیا سمجھتے ہو؟'' آخر اس نے پوچھا۔

''میں کچھ نہیں سمجھتا۔ مجھے کچھ علم نہیں نجمی' صرف اتنا پتا ہے کہ تم مجھے بے چین کر دیتی ہو۔ تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ میں...... کہ جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا یا کیا......''

''تو اس کا علاج ہے کہ دیکھنا ہی بند کر دو۔''

''دیکھنا ہی؟'' خالد نے سانس روک کر پوچھا۔

''ارے ہائے خالد۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟''

''کیا ہوگیا ہے۔ کیا ہوگیا ہے؟'' وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چیخا۔ ''تمہیں پتا نہیں؟ تم کچھ محسوس نہیں کرتیں؟ تم اتنی لاعلم ہو؟۔ اتنی 'مین' ۔'' ہوا تیزی سے درختوں میں چلنے لگی: سائیں۔ سائیں۔ سائیں!

دفعتاً وہ اپنی آواز اور جذبے کی شدت سے خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے اس کے کندھے چھوڑ دیے اور ششدر دیکھنے لگا۔ نجمی پشت اور دونوں بازو درخت سے چمٹائے پنجوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ ہوا کا جھونکا بھی آیا تو چیخ مار کر رونے لگے گی۔

''اوہ نو...... نو......'' خالد بے حد غیر حاضر اور خشک آواز میں پکارا۔

ہوا پھر درختوں میں رک گئی تھی اور یوکلپٹس کے جنگل پر شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ رات کا ایک سیاہ' خاموش پرندہ آکر درخت پر بیٹھ گیا۔ ایک گلہری دوڑتی ہوئی نیچے اتری۔ نجمی آواز پیدا کیے بغیر درخت کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

''جاؤ۔'' وہ بھرائی ہوئی دہشت زندہ آواز میں بولی۔

خالد نے اندھیرے میں اس کی طرف دیکھا اور خاموش بیٹھا رہا۔ وہ احتیاط سے چلتی ہوئی جا کر پتھر پر بیٹھ گئی۔ بڑی دیر کے بعد اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

''خالد۔ اب تم جاؤ۔'' اس نے پرسکون آواز میں کہا۔

''میں کبھی اتنا بے قابو نہیں ہوا۔ تم جانتی ہو نجمی۔''

وہ خاموش بیٹھی اندھیرے میں چلتی ہوئی ہوا کے ہلکے شور کو سنتی رہی۔ ایک لمحے کو اسے خیال ہوا کہ وہ پہلی دفعہ اس جنگل میں آئی ہے' لیکن وہ آرام سے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے وہیں بیٹھی رہی کیونکہ وہ ایک طوفان خیز جذبے میں سے گزری تھی اور اس کے دل میں شدید اداسی تھی اور تنہائی اور بے چینی! اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس سیاہ کپڑے ہیولے پر اسے ترس آنے لگا اور اس نے وہ سب کچھ کہہ دینا چاہا جو کہ اس نے محسوس کیا تھا۔

''تم محبت کا ذکر کر رہے تھے خالد۔ میں تمہیں بتاؤں کہ محبت کے بارے میں کیا محسوس کرتی ہوں۔'' وہ رُکی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک ایسی شے ہے جو اکثر انسانوں کو دھوکا دیتی ہے۔ اکثر انسان محبت کا مطلب سمجھ لیتے ہیں، بہت کم درحقیقت اسے پاتے ہیں۔ محبت ہمارے سمجھدار ہو جانے کے ساتھ ہی ساتھ نہیں آ جاتی، یہ کسی وقت بھی آ سکتی ہے اور ایک جذبے کی صورت میں آتی ہے۔ ہم لوگوں سے ملتے ہیں اور ملتے رہتے ہیں اور کئی ایک کو پسند بھی کرتے ہیں مگر یہ محبت نہیں ہوتی۔ محض ہمارا دماغ، جو محبت کے نام سے واقف ہے اور اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس کمزور سی کشش کا باعث ہوتا ہے۔ جب وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں تو ہم بھول جاتے ہیں۔ ہم ہر کسی سے محبت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ محبت جو سادگی اور سچائی کا جذبہ ہے جب آتا ہے تو ہمیں دنیا سے اوپر لے جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو ہم کسی ذہنی یا جسمانی قوت کی مدد سے حاصل نہیں کر سکتے، جو روح کی تمام تر قوتیں لے کر آتا ہے، جس میں سے مذہبی راہنما گزرتے ہیں۔ یہ ہمارے مخلص ترین جذبوں میں سے ہے۔ میں جذبے کا انتظار کرتی ہوں۔'' اپنی آواز کے علاوہ اس نے صاف طور پر اپنے سر پر ہوا کے ہلکے شور کو سنا اور خاموش ہو گئی۔ ان کے گرد گھپ اندھیرا تھا اور سیاہ گرم ہوائیں کبھی آہستگی کبھی تیزی سے چل رہی تھیں۔ روشن محل کی روشنیاں دیر ہوئی جل چکی تھیں اور اندر چلتے پھرتے ہوئے لوگوں کا عکس شیشوں پر پڑ رہا تھا۔ بوڑھا مالی ربڑ کا پائپ اٹھائے سائے کی طرح جنگل کے کنارے کنارے گزر گیا۔

''تم پچاس برس تک جذبے کا انتظار کرتی رہو گی۔'' خالد نے کہا۔

''بیوقوف مت بنو، میں سچی بات کرتی ہوں۔ ہم اس کے اہل نہیں ہیں۔ ہمیں اس قدر سچائی، اس قدر خلوص کے ہم اہل نہیں ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں خالد میری کئی ایک دوست ہیں جو اس طمانیت سے زندگی بسر کر رہی ہیں جیسے سچ مچ خوش ہیں۔ انہوں نے خوبصورت تندرست نوجوانوں کو دیکھا اور ان سے شادیاں کر لیں۔ اب وہ اگر تصویریں بنانے کے لیے بیٹھتی ہیں تو وہ الگ بیٹھ کر تمبا کو پیتے ہیں اور دل میں اپنی بیوی کو کوستے ہیں۔ وہ اگر پیانو پر بیٹھتی ہیں تو وہ خوابگاہ کا دروازہ بند کر کے سو جاتے ہیں یا اوولٹین کے لیے چلاتے ہیں۔ وہ اپنی نظم سناتی ہیں تو وہ الوؤں کی طرح منہ دیکھتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر ہنستے ہیں۔ وہ اصل زندگی کو آہستہ آہستہ بھول جاتی ہیں اور پھر کمتر راحتوں کے لیے اپنے خاوندوں کی طرف راغب ہوتی ہیں۔ وہ ان سے محبت کرتی ہیں کیونکہ وہ انہیں عمدہ عمدہ لباس خرید کر دیتے ہیں یا دور دراز مقامات پر تفریح کے لیے لے جاتے ہیں یا ہر سال نئی کار خریدتے ہیں یا ہل اسٹیشنوں پر مکانات تعمیر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی مسرتیں اور آسائشیں ہیں جو ان کے شوہر ان کے لیے خرید سکتے ہیں اور جن کی وہ ان سے توقع رکھتی ہیں۔ وہ خوش ہیں کہ ان کے بچے ہیں اور ایک شخص ہے جو ان کے بچوں کا باپ ہے اور ان کا ایک مکمل، مطمئن خاندان ہے۔ وہ خوش ہیں کیونکہ وہ جانتی ہی نہیں کہ کسی اور کے ساتھ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر زندگی گزار سکتی تھیں۔ وہ ان بلیوں اور خرگوشوں اور دوسرے پالتو جانوروں کی طرح ہیں جو ہر اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں جو ان کو کھانا کھلاتا اور نہلاتا ہے۔ تم نے دیکھا

محبت کیسے دھوکا دیتی ہے۔'' اس نے اپنی آواز کے لفظوں کو اندھیرے میں غائب ہوتے ہوئے سنا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس شخص سے جس سے ہم محبت کرسکیں ہم کبھی ملیں ہی نہیں۔'' خالد نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

''نہیں' یہ محض بے صبری کے خیالات ہیں۔ بے صبری اور بے یقینی کے۔ ایک نہ ایک انسان ضرور آتا ہے' ہمیشہ' ہر جگہ' جو ہمیں محبت کی سچائی کا یقین دلاتا ہے۔ جس کو دیکھتے ہی ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہی ہے' جس کو پہچان کر ہم دل میں کہتے ہیں: ''مجھے پتا تھا تم آؤ گے۔ مجھے تمہارا انتظار تھا' دیکھو' یہ میں ہوں۔ مجھے جانتے ہو؟' اور ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پرانی شناسائی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہنستا ہے اور اس کی ہنسی ہمیں زندگی کی معصومیت کا یقین دلاتی ہے' وہ کبھی نہیں کہتا کہ وہ محبت کرتا ہے لیکن اپنی آنکھوں میں محبت کے دیوٹ لیے پھرتا ہے' ہمارے آگے' ہمارے پیچھے' ہمیشہ ہمیشہ! وہ ہمارے لیے دنیا کا سب سے مہربان اور نرم دل انسان ہوتا ہے۔ اس کے جسم سے ہمیں محبت کی بُو آتی ہے۔ محبت جو ہمیں زندگی کی نیکی اور اچھائی کا یقین دلاتی ہے' جو اس وقت جب ہم طوفانوں میں گھرے ہوتے ہیں ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص ہمارے لیے زندہ ہے' جو ہمارے زندہ رہنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ کم از کم زندگی میں ایک دفعہ محبت ہمیں دھوکا نہیں دیتی' کم از کم ایک دفعہ وہ ہمیں زندہ رہنے کا جذبہ عطا کرتی ہے۔'' خود اعتمادی کی مسرت سے سرشار ہو کر اس نے مٹھیاں ہوا میں ہلائیں۔ عمیق اندھیرے میں اسے احساس ہوا کہ وہ وہاں اکیلی بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی ہے۔

پھر خشک پتوں کے چرچرانے کی آواز آئی اور خالد اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ہاں شاید۔ چلو چلیں......''

وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ پتھروں پر ان کے قدموں کی آواز سن کر رات کا پرندہ پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔

''ستارے بھی نہیں نکلے۔'' تاریکی سے گھبرا کر وہ اپنے آپ سے بولی۔

''جانے کس احمق نے کہا تھا ہم اتنی رات تک وہاں بیٹھے رہیں'' خالد پتھروں کو پھلانگتے ہوئے غرایا۔

''خالد......'' اس کے پیچھے پیچھے پتھر پھلانگتے ہوئے وہ ہلکے سے پریشان لہجے میں بولی۔ ''میں نے ایسی حماقت کی باتیں کی ہیں' ہیں نا؟''

جواب میں خالد نے صرف گلے سے ناراض بلے کی سی آواز نکالی۔

برآمدے کے پاس نجمی نے اسے کھانے کی دعوت دینا چاہی لیکن وہ الوادع کہے بغیر' سر جھکائے' ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونسے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ست' مستقل قدموں کے نیچے بجری کی چرچراہٹ دور ہوتی گئی۔ وہ سیڑھیوں پر کھڑی پیار اور رنج سے اسے گیٹ سے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اندر وہ سب کھانے کی میز کے گرد جمع اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ عذرا نعیم کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف لے جا رہی تھی۔ ''اب روز بروز وہ اچھے ہو رہے

ہیں۔'' اس نے خوشی سے سوچا' پھر اس نے کئی دن سے اس کو دیکھنے کے لیے نہ جا سکنے پر اپنے آپ کو ملامت کی اور فیصلہ کیا کہ صبح سویرے وہ اس کی خیرت پوچھنے جائے گی۔

روشن آغا کے بعد شاید نعیم ہی ایک ایسا شخص تھا جس سے وہ اس درجہ مرعوب' کسی حد تک خوفزدہ تھی۔ اس کے بارے میں اس کا فیصلہ تھا کہ وہ کبھی اس کے قریب نہ ہو سکتی تھی' کہ وہ بے حد مختلف قسم کا پُراسرار انسان تھا۔ لیکن اس اسرار نے نجمی کے دل میں اس کے لیے عقیدت اور احترام پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس کے لیے پُرکشش اور رنگین ماضی لیے' خوبصورت اور ذہین' کسی حد تک لاوارث عزیز تھا۔ عجیب بات تھی کہ آج تک نجمی نے نعیم کے بارے میں عذرا کے واسطے سے کبھی نہ سوچا تھا۔ عذرا کی اپنی الگ' بیحد مختلف' تنہا شخصیت تھی۔

تیز ہوا کے ساتھ بارش کے پہلے قطرے اس کے ماتھے پر گرے اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اندر پرویز کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ باہر خالد کے ساتھ گپیں مار رہی تھی۔

''گپیں یا گپ بازی۔ تفصیل کے ساتھ بتاؤں۔'' لیلیٰ نے کانٹا لہرا کر کہا۔

''خالد۔ خالد۔'' کئی لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔ خالد کو بلانے کے لیے کئی آدمی دوڑائے گئے لیکن وہ نہ ملا۔ پھر اس کی خودسری اور نالائقی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے انہوں نے کھانا شروع کیا۔

(۳۷)

وہ ایک غیر معمولی گرم شام تھی جب وہ نعیم کو لے کر سبزے پر اتر آئی اور آہستہ آہستہ اسے چلانے لگی۔ برابر کے لان میں وہ سب تاش کے کھیل سے اکتا کر اب کاہلی سے ٹانگیں میزوں پر رکھے گپیں مار رہے تھے اور بیچ بیچ میں زور زور سے ہنسے جاتے تھے۔ ہوا تھم گئی تھی اور ان کے اردگرد گھاس کی گرم' مرطوب خوشبو رکی ہوئی تھی۔

کئی بار کہا ہے نچلی منزل میں آ جائیں۔ ہر بار سیڑھیاں طے کرنا پڑتی ہیں۔'' نعیم نے ہانپتے ہوئے جھک کر عذرا کا سہارا لیا۔

''اب تم جلد اچھے ہو جاؤ گے۔'' عذرا نے کہا۔

لان کے وسط میں رک کر نعیم نے پسینہ خشک کیا اور ہاتھ اٹھا کر پرویز کو جواب دیا جو کرسی پر لیٹا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ عذرا نے منہ پھیر لیا۔

''پرویز خوش اخلاق ہوتا جا رہا ہے۔'' اس نے حقارت سے کہا۔

اب وہ سب ان کی طرف متوجہ ہو کر زور زور سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ نعیم نے چھڑی والا ہاتھ اٹھا کر سب کو جواب دیا۔ ''نہیں عذرا' اچھے لوگ ہیں۔'' اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے اس کو سہارا دیئے چلتی رہی۔

''پرویز کل میرے پاس بیٹھا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا جنگ پھر چھڑ گئی ہے۔ ہندوستان پر مصیبت آئے گی۔''
''کب آیا تھا؟ پار سال؟'' عذرا نے طنز سے پوچھا۔

''بیوقوف مت بنو۔ جنگ چھڑے ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے۔ مجھے پوچھنے آیا تھا۔''

''میرے سامنے کیوں نہیں آتا۔'' عذرا نے غرا کر کہا۔ ''وہ عورت۔ اس کی بیوی!''

نعیم نے اس بازو سے' جو عذرا کے شانوں پر تھا' اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور مڑ کر چلنے لگا۔ عذرا نے ذلت کے آنسو چھپانے کے لیے اس کے مصنوعی بازو کو ہاتھوں میں لے کر دبایا' یہاں تک کہ اسے ڈر محسوس ہونے لگا کہ وہ ٹوٹ جائے گا۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے سیڑھیاں چڑھنے کی ورزش تمہارے لیے مفید ہے۔''

نعیم نے بے حد اکتا کر ایک لمبا سا 'اوہ' کیا۔ ''ڈاکٹر ڈاکٹر ڈاکٹر۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔'' اس نے رک کر عذرا کو پیار اور اداسی سے دیکھا۔ ''مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔''

''پتا نہیں نعیم' پر یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے مجھے۔ ایک دفعہ جب تم نہیں تھے تو میں نے کمرہ تبدیل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب انہوں نے میرا سامان باہر نکالا تو مجھے یوں لگا جیسے میں باہر جا رہی ہوں۔ اس گھر سے باہر' ہمیشہ کی جلاوطنی پہ یا کہاں۔ مجھے عجیب سا غریب الوطنی کا احساس ہوا۔ اپنے سامان کو باہر پڑا دیکھ کر میرا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر روؤں۔ میں آخری بار خالی کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے قدموں کی چاپ سنی جو دیواروں میں سے آرہی تھی جہاں سے ساری تصویریں اتار لی گئی تھیں۔ اور آتشدان ننگا تھا' سرد اور ٹھوس اور بے حس' میں نے اسے چھوا۔ اور دریچہ! صرف دریچہ تھا جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا۔ پتا ہے نعیم' کمرہ خالی ہو چکا تھا' اجنبی اور ویران' لیکن دریچے میں یوکلپٹس کے پتے جھوم رہے تھے' سبز اور خوشبودار' جن کے ساتھ میں ہمیشہ سے رہتی آئی تھی' جن سے میں اتنی اچھی طرح واقف تھی' جن کو میں نے غصے میں آکر نوچا بھی تھا اور پیار سے تھپکا بھی تھا' وہ بے جان نہیں تھے۔ اس نے بے یقینی سے نعیم کی طرف دیکھا۔ ''وہ بے جان نہیں تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر انہیں چھوا اور مجھے پرانی دوستی اور اپنائیت کا احساس ہوا وہ زور زور سے ہلنے لگے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کوئی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتا' میں یہیں رہوں گی' ہمیشہ ہمیشہ...... ہم یہیں رہیں گے نعیم' ایں؟''

''ہاں ہاں۔'' وہ ہنسا۔ ''ہم یہیں رہیں گے' گو میں یوکلپٹس کی بُو سے تنگ آچکا ہوں۔''

ہوا اچانک تیزی سے چلنے لگی اور فوارے کی پھوار سے بچنے کے لیے وہ وہاں سے ہٹ آئے۔ دوسرے لان میں وہ سب شور مچا مچا کر اڑتے ہوئے تاش کے پتوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ دن ختم ہو چکا تھا اور آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔

''آج پھر بارش آئے گی۔'' نعیم نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بارش کے لیے ہمارا کمرہ اچھا نہیں ہے۔''

''بارشوں سے تنگ آ کر ہی میں نے بدلنے کا ارادہ کیا تھا۔''

دن کی گھٹتی ہوئی روشنی میں سبزے کے کنارے چلتے ہوئے عذرا کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑی جس سے وہ نعیم کو سہارا دیئے ہوئے تھی۔ اس کے ہاتھ پر بے شمار جھریاں پڑ چکی تھی اور جلد جگہ جگہ سے اکٹھی ہو کر لٹکنے لگی تھی۔ دفعتاً بے حد خوفزدہ ہو کر اس نے سوچا کہ وہ بوڑھی ہو رہی ہے۔ اس نے مشکوک نظروں سے اپنی خاوند کو دیکھا۔ نعیم کا تندرست ہاتھ اسی طرح مضبوط اور پھولا ہوا تھا۔ اس کا جسم بیمار تھا لیکن اس کی آنکھوں میں جوانی تھی اور بلا کی کشش تھی اور وہ اسی طرح سر اونچا اٹھا کر چلتا تھا۔ اس نے عذرا کی اجنبی نظروں کو محسوس کر کے آہستہ سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ لیکن اس بدبخت لمحے میں عذرا کے دل پر سے ایک بے نام حسد کا سایہ گزر گیا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نعیم لڑکھڑا کر سنبھلا۔ سہارے کے لیے اس نے دو ایک بار ہوا میں ہاتھ پھیلایا۔ عذرا اس سے الگ دونوں بازو لٹکائے دم بخود کھڑی رہی۔

آخر وہ چھڑی کے سہارے اچھل کر اس کے قریب آیا۔ ''کیا بات ہے عذرا؟''

عذرا نے، جو خوفزدہ نظروں سے اندھیرے میں دیکھ رہی تھی، چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بڑے سے اداس متفکر چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے اس محبوب انسان کی بے پناہ بیکسی کا احساس ہوا۔ ایک بیدرد ترحم نے اس کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکی اور رونے لگی۔

''میں سوچ رہی تھی۔'' اس نے رنج سے بیتاب ہو کر کہا۔

''مت سوچو۔ مت سوچو۔'' نعیم نے جلدی سے اسے بازو میں سمیٹ لیا۔ ''سوچ ہمیں ختم کر دیتی ہے۔ ہم سوچے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔

پھر وہ ایک ہاتھ اس کا سہارا لیے اور اسے بازو میں سمیٹے چلنے لگا۔ اس کی پیشانی پر ابھی تک تیوری تھی۔

''میں سوچ رہی تھی وہ کس قدر خوش ہو رہے ہیں۔'' دیر کے بعد عذرا نے زہریلے جذبات کا رخ موڑا۔ نعیم نے سر اٹھا کر سامنے والے گروہ کو دیکھا۔ وہ اب ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے اندر کی طرف جا رہے تھے۔

''چلو ہم بھی وہاں چلیں۔'' نعیم نے ہنس کر کہا۔

عذرا نے دہل کر اس کی طرف دیکھا۔ ''نہیں نہیں۔'' اس نے بے خیالی سے سر ہلایا۔ ''وہ اس قدر کمینے ہیں، پرویز اور اس کی بیوی اور اس کا لڑکا اور ممی اور سب۔ سب۔'' اس نے چیخ کر کہا اور نعیم کی بغل میں منہ چھپا کر سسکی لی۔

''مت سوچو...... مت سوچ۔'' نعیم نے ناراضگی سے دہرایا۔

''تم نہیں سمجھتے، وہ ہمیں اپنے آپ میں سے نہیں جانتے۔ وہ جب تمہیں دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ تم پر ترس کھا رہے ہیں، کہ وہ کسی بات پر پچھتا رہے ہیں۔ وہ ہمیں ناپسند کرتے ہیں۔ تم نے

دیکھا ہے وہ کس قدر احتیاط کے ساتھ' کس قدر اخلاق سے تمہاری خیریت پوچھتے ہیں۔ کیسے کمینے پن کے احساس برتری کے ساتھ غیر معمولی نرمی کے ساتھ' جیسے ان کو سکھایا گیا ہے۔'' اس نے وحشت سے نعیم کی طرف دیکھا۔ ''جیسے ہم سب کو سکھایا گیا تھا۔ چھوٹے موٹے زمیندار' سرکاری اہل کار' منشی' مزارعے۔ 'بابا ہم اس کا گھوڑا بنائیں گے'۔ 'نہیں بی بی پہلے ان کو بابا بولو پھر یہ گھوڑا بنیں گے۔' 'ہی ہی ہی رانی بی بی۔' 'آیئے ہم آپ کا گھوڑا بنیں۔' یہ ہماری تربیت تھی۔ وہ اپنی تربیت کو نہیں بھول سکتے۔ میں بھول گئی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ محبت میں آن کر ہماری تربیت کے وہ سارے سال کچھ بھی نہیں رہ جاتے' لیکن وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ وہ محض اپنے اپنے غرور کو سنبھالے زندگی گزار رہے ہیں اور مجھے ان ساری چیزوں کی یاد دلاتے ہیں جو تکلیف دہ ہیں۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ نعیم' میں اپنے گھر میں کیسی جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ تمہیں پتا ہے؟'' وہ رو کر بولی۔

''پاگل ہوئی ہو؟'' نعیم نے صرف اتنا کہا۔ ''پاگل ہوئی ہو؟'' اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود کسی لاشعوری خوف کے اثر سے عذرا نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اسے نعیم کے ہاتھ میں چھپانے کی کوشش کی۔ ایک بے وجہ رنج نے اس کی آنکھوں کو دھندلا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

''میں روؤں گی نہیں' فکر مت کر۔ میں رو سکتی ہی نہیں' صرف رونے کی نقل کر سکتی ہوں۔ نعیم مجھے خیال ہوتا ہے کہ رونے کے لیے جوانی چاہیے اور دل میں زور ہونا چاہیے اور سچائی! ایک بوڑھا ہوتا ہوا پشیمان شخص محض اذیت سہتا ہے' مظلومیت اور خاموشی کے ساتھ۔ بالآخر زندگی میں اس قدر کڑی پشیمانی ہے۔'' اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔ نعیم کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

کھٹے کی باڑ کے پیچھے سڑک پر سے خانہ بدوشوں کا ایک کارواں گزر رہا تھا۔ ان کی بیل گاڑیاں اور ان کے اونٹ اور ان کی عورتیں اور مرد ست رفتاری اور آزادی سے اندھیرے میں سفر طے کر رہے تھے۔ کہیں کہیں مدھم لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ ایک نوعمر لڑکا اونٹ کی پشت پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ بارش سے پہلے کی تیز ہوا میں بے فن بانسری کی آواز کبھی دور چلی جاتی کبھی پاس آجاتی اور موسیقی کا اثر پیدا کرتی۔ ''ہوا نے اسے فنکار بنا دیا ہے۔'' بہت سے گڈمڈ خیالات کے درمیان نعیم نے سوچا۔ ''ہوا نے اور آزادی نے۔'' اور اس میں شامل بیلوں کے قدموں کی آواز' اور بیل گاڑیوں کے پہیوں کی اور اِکا دُکا مردوں اور عورتوں کی باتوں کی آواز ہے' اور اس میں شامل رات ہے۔'' اس کے ذہن میں وہ مخصوص کنفیوژن تھا جو کسی تیز احساس کا پیش خیمہ ہوتا ہے' جس سے پیشتر ہزاروں چھوٹے چھوٹے بے تکے خیالات تیزی سے آئے چلے جاتے ہیں۔ رات ''جو ہمارے اور تمہارے درمیان آزادی اور سفر اور ہزیمت لے کر آتی ہے۔ کتنے فاصلے لے کر آتی ہے۔'' اس نے سوچا اور ماتھے پر بارش کے پہلے قطرے محسوس کر کے برآمدے کی طرف مڑا۔ ''تم سورج کی تپش سے بچنے کے لیے رات کو سفر کرتے ہو اور پھر بارش آجاتی ہے۔ خدا حافظ! تمہارا گھر کہاں ہے؟ اب تم اپنے لیے بارش کا ایک گھر بناؤ۔'' اس نے سوچا

کہ شاید اب وہ ہنسے گا' لیکن دراصل وہ بیحد سنجیدہ اور اداس تھا۔ ''یہ کون ہے؟ یہ اندھیرے میں سیڑھیوں پر کون کھڑا ہے؟''

''یہ کون ہے؟'' اس نے بے خیالی سے اونچی آواز میں پوچھا۔

''نجمی۔'' عذرا حقارت سے بولی۔ ''جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔''

برآمدے میں سے گزرتے ہوئے عذرا رک گئی۔ روشن آغا اپنی سٹڈی میں بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور جسم بوڑھا ہو چکا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں وہ بے حس و حرکت کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ ''نعیم' بابا دنیا کے بہترین انسانوں میں سے ہیں۔'' وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے نعیم کو دیکھتی ہوئی بولی۔ ''وہ دنیا کی تمام اچھی باتوں کے اہل ہیں۔ میں صرف ان سے محبت کرتی ہوں۔'' نعیم چل پڑا۔ ''یہ واحد شخص ہے جس سے مجھے نفرت ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ اس نے سوچا۔

اگلے کمرے میں وہ سب کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور نجمی ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی بات سنا رہی تھی۔

''اور نجمی بے حد نفیس لڑکی ہے۔'' بید کی آرام کرسی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

باہر بارش شروع ہو چکی تھی مگر کمرے میں دن بھر کی گرم ہوا رکی ہوئی تھی۔ جب عذرا نے کھڑکی کھولی تو بارش کی نمدار ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہوئی۔ وہ نعیم کی طرف پیٹھ کیے کھڑکی میں کھڑی رہی۔ نچلی منزل میں ان کے ہنسنے اور پلیٹوں اور چمچوں کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اکتا کر کھڑکی میں سے ہٹ آئی۔ چلتے چلتے رک کر اس نے نعیم کا اور اپنا بستر ٹھیک کیا اور دوائی کی بوتلوں اور گلاسوں کو ترتیب سے رکھا۔ باہر طوفان تیز ہوتا جا رہا تھا۔ بجلی کی کڑک سے سہم کر جب وہ کھڑکی بند کرنے کے لیے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ یہ عجیب قسم کا طوفان تھا جس کے ساتھ ہوا کا نام و نشان نہ تھا اور بارش پتھروں کے سے وزنی پن کے ساتھ سیدھی گر رہی تھی۔ اس نے دہل کر کھڑکی بند کر دی۔ بجلی کے خوفناک دھماکے کے ساتھ شیشوں کے کڑکڑانے کی آواز آئی۔ وہ بستر کی چادر کو پھر سے پھیلانے لگی۔

''تم ان کو یہ کام کیوں نہیں کرنے دیتیں۔'' نعیم نے روشن محل کے اتنے سارے نوکروں کے متعلق سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ ہمارے نوکر نہیں ہیں۔'' عذرا نے مختصراً کہا اور سرہانے کو اٹھا کر پھر سے رکھا اور دوائیوں والی میز کو کھسکایا اور قالین کے کونے کو پاؤں سے پہلے الٹا پھر سیدھا کیا اور ٹھٹک کر نعیم کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔ اس طویل' سست رفتار لمحے میں اس کی پریشانی خفیف سی ندامت میں تبدیل ہو گئی۔

''یعنی ہم تو چلنے ہی جائیں گے۔ ان سے ہمارا تعلق کیا۔ کیوں؟'' اس نے کہا۔ اس کوشش میں ناکام رہ کر وہ پھر پریشان ہو گئی اور پہلے سے زیادہ بے تکے پن کے ساتھ کمرے میں پھرنے لگی۔

''ہم کب جائیں گے۔ اگلے مہینے؟ شاید تم ٹھیک ہو جاؤ'' اس نے اعصابی لہجے میں جلد جلد کہا۔

اب وہ سب آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے اوپر آ رہے تھے۔ بادل کی گرج کے ساتھ ان کی آواز دب جاتی اور پھر آنے لگتی۔ وہ پُرشکم اور مسرور گھریلو انسانوں کی آوازیں تھیں جو زندگی سے مکمل طور پر مطمئن اور محفوظ تھے۔ انہیں طوفانی رات کی کوئی خبر نہ تھی۔ ان کی بات چیت میں گہری بے تکلف اپنائیت تھی جو قطعی طور پر رچے بچے ہوئے مانوس گھریلو تعلقات سے پیدا ہوتی ہے۔ ان میں کوئی کھچاؤ' کوئی رکھ رکھاؤ نہ تھا۔ بجلی کی کڑک کے ساتھ ساتھ وہ ہنس رہے تھے۔ دفعتاً نعیم کو اپنے اور عذرا کے غیر فطری' تکلیف دہ تعلق کا احساس ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ ان دونوں کے آس پاس ایک بے نام' بے وجہ خون رینگ رہا تھا جس نے ان کی زندگیوں کو کمزور اور ناتواں بنا دیا تھا' کہ وہ دو ایک دوسرے سے الگ' تنہا اور بے حقیقت وجود تھے جو ایک مکمل' صحت مند جسم سے ٹوٹ کر جدا ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ مر رہے تھے' دنیا کی تمام برائیوں کو ایک ایک کر کے جمع کر رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''کھڑکی کھول دو۔'' اس نے بھاری خشک گلے سے کہا۔

عذرا وہیں کھڑی شیشوں پر مسلسل چمکتی ہوئی بجلی کو دیکھتی رہی۔ نعیم نے اسے تیز چیرتی ہوئی نظروں سے دیکھا جنہیں ترحم اور بے بسی نے آہستہ آہستہ نرم بنا دیا۔ گیلری میں سے ہنسنے کی آواز آئی۔ یہ لاپروا' بے تکلف ہنسی تھی جس میں آوارگی اور ساری دنیا کے لیے حقارت کا تاثر تھا۔ یہ ایک قابلِ نفرت ہنسی تھی۔

''تم نے سنا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح ہنستی ہے۔ وہ عورت۔'' عذرا نے کہا۔

پرویز اور اس کی بیوی کی آواز آہستہ آہستہ دور چلی گئی۔ وہ ابھی تک ہنس رہے تھے۔ نجمی نے رات کا ننھا سا بلب کمرے میں جلتا ہوا دیکھا اور دبے پاؤں دروازے کے آگے سے گزر گئی۔

''آؤ...... یہاں آؤ۔'' نعیم نے تیزی سے کہا۔ عذرا نے دیکھا کہ وہ بے حد گھبرا گیا ہے۔ وہ جا کر کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ نعیم نے اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا' کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' نعیم نے لمبا سانس لے کر دوسری طرف دیکھا۔ ''میں نے سوچا شاید تم اس سے خوفزدہ ہو۔''

''خوفزدہ......'' عذرا پھنکاری۔ ''اس سے۔ اس سے......''

''نہیں عذرا...... عذرا۔'' وہ اس کی چھاتی پر سر رگڑ کر پکارا۔ ''تم بس یہاں بیٹھی رہو۔ خاموش۔ کچھ مت کہو' کچھ مت سوچو۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ خوشی سے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں کمزور محسوس کر رہا ہوں' یہاں۔'' اس نے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

''نعیم ہاں میں یہاں بیٹھی ہوں۔'' عذرا نے پریشان ہو کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں خاموشی سے

بیٹھی ہوں۔ ہم یہاں سے چلے۔''

''اوہ نہیں نہیں۔'' نعیم نے اس کی کمر سے ہاتھ نکال کر ماتھے پر رکھ لیا۔ ''نہیں نہیں۔ تم نہیں سمجھتیں۔ تم خاموش رہو۔ ہم یہیں رہیں گے۔ وہ ہمارے دوست ہیں' رشتہ دار ہیں' ہمدرد ہیں۔ میں مرنا نہیں چاہتا' کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں سرکاری ملازمت کرلوں گا یا جو تم کہو گی کروں گا۔ جو روشن آغا کہیں گے کروں گا۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ میں تنگ آچکا ہوں۔''

عذرا گھبرا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اس پریشانی کی دھند میں سے باہر نکل آئی۔ اس نے کئی بار دل میں نعیم کے الفاظ دہرائے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار نعیم کے منہ سے موافقت کی باتیں سن کر وہ بھونچکی رہ گئی کیونکہ وہ خود نعیم کے ساتھ چلنے کی کوشش میں ان خیالات کو دفن کر چکی تھی' بھول چکی تھی' معاف کر چکی تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے' کیا کرے۔

''اچھا...... اچھا؟'' نعیم کے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے زیر لب دہرایا۔ برسوں کی مدفون' زنگ آلود خواہشات زندہ ہو رہی تھیں اور نعیم کے الفاظ اس کے ذہن میں شور مچا رہے تھے۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکی کہ اب وہ کیا کرنے والی ہے' قہقہہ لگا کر ہنسنے والی ہے یا چیخ چیخ کر رونے والی ہے۔ وہ دونوں باتیں ایک سی آسانی اور خوشی کے ساتھ کرسکتی تھی۔ لیکن جذبات کے تہلکے میں اس نے یہ بھی سوچا کہ ان باتوں کے لیے اب وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔ کہیں قریب ہی خوفناک دھماکے کے ساتھ بجلی گری۔ نعیم چونک کر اٹھ بیٹھا' لیکن عذرا کے خوابوں اور خواہشوں کے جزیرے میں موسم بے حد چمکدار اور خاموش اور سمندر پُرسکون تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ کیا' محض نعیم کو کھو دینے کے ڈر سے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے بیٹھی رہی۔ جس تیزی کے ساتھ اس کے نقطہ نظر میں تبدیلی واقع ہوئی وہ حیرت انگیز تھی۔

''میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے۔ تمہیں اپنے بہن بھائیوں کا' ماں باپ کا' سارے گھر کا دشمن بنا دیا ہے۔ اوہ۔'' اس نے عذرا کا ہاتھ مضبوطی اور رنج سے دبایا۔ ''میں نے تمہارے دل میں نفرت اور خوف کا بیج بویا ہے۔ میں نے تمہیں ذلیل کیا ہے' سب کے سامنے۔ میں نے تمہیں ایک ہزیمت خوردہ زندگی دی ہے۔ تم ایک عظیم عورت ہو۔ میں نے تمہیں تباہ کر دیا ہے' محبت کے بدلے میں' اب خود تباہ ہو رہا ہوں۔ میں کیا کرسکتا ہوں' تم نے کہا تھا بالآخر زندگی میں اس قدر کڑی پشیمانی ہے۔ عذرا میں تنگ آچکا ہوں۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں' کام کرنا چاہتا ہوں' کوئی بھی' کچھ بھی' کیا فرق پڑتا ہے جب میں مر رہا ہوں۔ میں اب لیٹ نہیں سکتا۔ اوہ۔'' اس نے اپنا گلا بند ہوتا ہوا محسوس کیا۔ وہ زور سے کھانسا اور دیر تک کھانستا رہا۔ پرانے ناتواں مریض کی طرح اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ ''عذرا ڈاکٹر کو مت آنے دو۔ میں اپنے آپ کو ہلاک کرلوں گا۔ میں اور نہیں لیٹ سکتا۔'' قریب آؤ...... میں کمزور...... اوہ...... عذرا میں رونا نہیں چاہتا......''

بالآخر کچھ بھی نہ کرسکا اور برسوں کی جسمانی اور روحانی اذیت سے ٹوٹ کر رونے لگا' ایک مغرور اور

لاچار بڈھے کی طرح جو رونہیں سکتا لیکن زندگی کی انتہائی بے بسی پر پہنچ کر آنسو بھونڈے پن سے، بند ہوتے ہوئے حلق میں سے نکلتی ہوئی مختصر جھٹکے دار آواز کے ہمراہ آنے لگتے ہیں اور چہرے کی ہیئت انتہائی مسخرے پن کا نمونہ پیش کرتی ہے جیسے دیکھ کر چھوٹی عمر کے نادان لوگ ہنسنے لگتے ہیں۔

عذرا نے اطمینان کے ساتھ اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ دیر کے بعد جب نعیم اشتہا کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا وہ آہستہ سے مسکرائی۔ اس رات وہ لپٹ کر اس کے ساتھ سوئی رہی اور اپنی گرم خشک ہتھیلیاں اس کے نیم مردہ جسم پر پھیرتی رہی اور باہر کے طوفان سے اتنی ہی بے خبر رہی جتنے کہ دوسرے لوگ، حالانکہ وہ بے حد طوفانی رات تھی۔

☆......☆......☆

(۳)

بٹوارہ

واذا قیل لهم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون (۱۱:۲)

(جب ان سے کہا گیا کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو وہ کہنے لگے کہ ہم ایمان والوں میں سے ہیں)

☆......☆......☆

(۳۸)

منا لال سیمنٹ فیکٹری میں دوپہر کا گھنٹہ ہوا تو وہ سب کھانے کی پوٹلیاں کھول کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ان کو ایک جگہ پر جمع ہو کر کھانے کی اجازت نہ تھی کیونکہ فیکٹری چوبیس گھنٹے چلتی تھی اور مزدور اور کاریگر آٹھ آٹھ گھنٹے کی تین شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو آٹھ گھنٹے مسلسل کام کرنا پڑتا تھا۔ جہاں تک کھانے کا تعلق تھا قانون میں کوئی ایسی شق نہ تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ یہ لوگ کھانے کی اہلیت بھی رکھتے تھے۔ یہ 'فیکٹری ایکٹ' تھا جس کے بنانے والے' کہ جانتے تھے کہ مشینری کے بغیر دنیا بھر کے آدمی مل کر بھی سیمنٹ نہیں بنا سکے' مشینری کی اہمیت کا خوب علم رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب 'ایکٹ' مرتب کیا جارہا تھا تو ایک آدھ مرتبہ کھانے کا ذکر آنے پر کسی طرف سے مذاقاً کہا گیا کہ ہر قسم کے کھانے کا ذکر ہماری مذہبی اور آسمانی کتابوں میں بہت پہلے ہی آچکا ہے البتہ سیمنٹ کی اہمیت کو وہاں پر خوفناک حد تک نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ 'فیکٹری ایکٹ' میں کھانے کا عدم ذکر!

لیکن کھانے پر چونکہ عام لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے اس لئے جب افسران کے لئے دوپہر کے وقفے کا گھنٹہ بجتا تو وہ لوگ بھی مشینوں پر نظر رکھے ہوئے' اپنے اپنے کام پر چوکس بیٹھے جلدی جلدی کھانا کھا لیا کرتے اور ان کے فورمین' کہ خود بھی کھانا کھاتے تھے' ان کی ان چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے۔ وہ سب اپنا کھانا ساتھ لے کر آتے اور کام پر پہنچ کر اپنی اپنی پوٹلیوں کو تختوں پر یا مشینوں کے غیر متحرک پرزوں پر رکھ دیتے۔ اس طرح کھانے کے وقفے تک وہ پوٹلی مشین کا ایک ساکن حصہ بن جاتی لیکن اس کے اندر کوئی پرزہ' دوسرے پوشیدہ پرزوں کی طرح' مستقل چلتا رہتا اور اپنے اندر کوئی پرزہ' دوسرے پوشیدہ پرزوں کی طرح' مستقل چلتا رہتا اور اپنے ساتھ ایک انسان کو بھی مستقل چلائے رکھتا۔ کھانے کے بعد وہ اس چھوٹے سے کپڑے کو جھاڑتے' اس میں رچی ہوئی پرانی' سیاہ چکنائی سے اپنے خشک چہروں اور گردنوں کو چکنا کرتے اور کس کر سروں پر باندھ لیتے۔ پھر وہ دیوار کے سہارے بیٹھ کر ایک ایک سگریٹ پیتے اور مشینری کی بھاری' نیند آور' مستقل تال کے نیچے جاگتے رہنے کی کوشش کرتے ہوئے چھٹی کے وقت کا انتظار کرتے رہتے۔ دوسرے پرزوں سے انہیں کبھی بھی دلچسپی

نہ ہوئی تھی۔

اس کے باوجود کبھی کبھی وہ اپنی جگہ سے کھسکنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس سلسلے میں رفع حاجت کا بہانہ سب سے زیادہ کامیاب رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ دن میں کئی کئی بار بیماری کا بہانہ کر کے جاتے اور ٹین کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی ٹٹیوں میں دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر سگریٹ پیتے' اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے اور اکیلے ہوتے تو دیوار پر فورمین کے خلاف بری بری باتیں لکھتے اور نفرت سے لب سکیڑ کر مسکراتے۔ پھر سگریٹ کو غلاظت میں پھینک کر انتہائی سست رفتاری کے ساتھ واپس اپنی جگہ تک آتے۔ ایسے میں اگر کوئی فورمین انہیں دیکھ لیتا تو گالیوں سے بھرپور زبان میں انہیں کام پر پہنچنے کی تلقین کرتا۔ جواب میں وہ ڈھٹائی سے ہنستے اور زیرلب گالیاں بڑبڑاتے ہوئے چال کو ہلکا سا تیز کر دیتے۔ مشینری نے انہیں بالکل نکما کر دیا تھا۔

باتیں کرنے کا انہیں یوں بھی موقع کم ہی ملتا۔ مشینوں کا شور اتنا زیادہ تھا کہ جب کبھی وہ خاموش بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے تو ساتھ والے سے بات کرنے کے لئے انہیں پوری آواز سے چیخنا پڑتا۔ چنانچہ دو ایک باتوں میں ہی ان کے گلے کی تسکین ہو جاتی۔ وہ ان گونگے' کند ذہن اور سدا تھکے ماندے گدھوں کی طرح تھے جنہیں چلانے کے لئے قدم قدم پر ڈنڈے مارنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

وہ ماہ مئی کا ایک بے حد گرم دن تھا اور باہر لو چل رہی تھی۔ اندر وہ اپنی اپنی پوٹلیاں کھولے کھانے میں مصروف تھے۔ صرف علی حسب معمول خاموش بیٹھا خالی خالی نظروں سے مشین کو تکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی بیمار رہتے رہتے اب چارپائی سے جا لگی تھی اور وہ دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتا تھا۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے اس کی آنکھ ذرا سویرے کھل جاتی تو وہ جلد جلد روٹی پکا کر کھا لیتا۔ لیکن وہ شروع شروع کی بات تھی۔ اب وہ اس سارے جھمیلے سے اتنا بیزار اور لاپرواہ ہو گیا تھا کہ سونے جاگنے' کھانے پینے اور کام پر جانے سے بہت کم دلچسپی اس کو رہ گئی تھی اور وہ بھوکا رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ علی الصبح جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ خاموشی سے بستر پر پڑا عائشہ کی گہری سانسوں' منہ اندھیرے کے پرندوں اور صبح سویرے کی خواب آلود آوازوں کو سنتا رہتا۔ پھر وقت مقررہ پر اٹھ کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتا' چند گھونٹ پیتا اور عائشہ پر ایک آخری نظر ڈال کر کام پر چلا جاتا۔ شام کو آ کر آگ جلاتا اور پانی میں سبزیاں ابالتا' گیہوں یا مکئی کی موٹی موٹی روٹیاں پکاتا اور پہلے عائشہ کو کھلاتا' پھر خود کھاتا۔ عائشہ زیادہ تر ابلی ہوئی سبزی کھاتی۔ کبھی کبھار وہ چاول اور گوشت بھی کھاتے۔ خاموشی سے کھانا کھا کر وہ اپنی اپنی جگہ پر لیٹ جاتے اور تھوڑی دیر کے بعد آوارہ بلیاں آ کر جھوٹے برتن چاٹنے لگتیں۔ باتیں کرنے کی ہفتوں نوبت نہ آتی۔

ہر تین ماہ کے بعد جب اس کے پاس کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو وہ ڈاکٹر کو لے کر آتا جو اس کی بیوی کے لئے کئی قسم کی دوائیاں تجویز کر کے چلا جاتا۔ ان میں جتنی وہ خرید کر لا سکتا لے آتا اور باقاعدگی سے عائشہ کو پلانے لگتا۔ صرف ایک باقاعدگی اور ایک قانون جو اس کی زندگی میں رہ گیا تھا عائشہ کی دوا کا تھا۔ جتنا وقت وہ اس کے پاس رہتا ایک ڈاکٹر کی سی سختی کے ساتھ وقت پر دوا پلاتا رہتا' بغیر کسی جذبے کے' جیسے مشین کو تیل دیتے ہیں۔ بیوی

کے ساتھ اس کی وفاداری، بھوکے پیٹ کام کرنے کی اہلیت اور دوسرے دنیاوی کاموں سے اس کے استغنا کو دیکھ کر اس کے ساتھی اسے ''علی سائیں'' یا محض ''سائیں'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

اس کے باوجود یہ دوپہر کا وقت اس کے لئے مشکل ترین ہوتا۔ پہلے پہل اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی اُسے کھانے کی دعوت دے دیتا اور وہ کچھ نہ کچھ کھا لیا کرتا، لیکن کوئی کسی کو کب تک کھلا سکتا تھا۔ اب اس کو کوئی بھی نہ پوچھتا۔ سب جانتے تھے کہ یہ اس کا معمول ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ ان میں سے ہر ایک اپنے دل میں مطمئن تھا کہ اپنی دوستی کی حد تک وہ کافی عرصے تک اس کو کھلا چکا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ علی سخت بھوک محسوس کیا کرتا بلکہ اس کے برعکس اس کی کھانے کی خواہش ہی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ دوپہر کے وقت جب وہ سب اپنے اپنے کھانے کی جانب دیکھتے جاتے تھے (گو اس میں زیادہ تر اس کا تصور شامل تھا)۔ اس سارے دوران میں وہ خالی خالی نظریں مشین پر جمائے بیٹھا رہتا تھا۔

صرف ایک بشن تھا جو باقاعدگی کے ساتھ دوستی نبھائے جا رہا تھا۔ وہ بے حد خوش مزاج نوجوان آدمی تھا جو ابھی کام سیکھ رہا تھا اور اپنی ماں کے ساتھ اکیلا ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ اس کی ماں ساتھ والی کپڑے کی مل میں کام کرتی تھی۔ کسی نے کبھی اس کو غمگین نہ دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ہنستا اور ہنساتا رہتا۔ اپنے ساتھیوں میں وہ ''کماری'' کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے بازو پر اس نے ایک حسین عورت کی شبیہہ کھدوا رکھی تھی اور جب وہ اپنی کلائی اور انگلیوں کو گھماتا پھراتا تو بازو کے پٹھوں کی مختلف حرکات کے باعث دیکھنے والوں کو کھدی ہوئی عورت ناچتی ہوئی نظر آنے لگتی۔ ہر پہلے آدمی کی خواہش پر وہ اسے نچانے لگتا کیونکہ اس پر اس کا کچھ بھی خرچ نہ ہوتا تھا۔ صرف اپنی ماں کے سامنے وہ کبھی بازو ننگا نہ کیا کرتا۔

وہ بارہ مہینے جَو کی روٹی لے کر آتا جس کو وہ کچے پکے بیروں کے ساتھ، جنہیں وہ راستے میں اگی ہوئی جنگلی بیریوں سے پتھر مار مار کر گراتا، کھایا کرتا۔ بیروں کی خاطر اس کو منہ اندھیرے گھر سے چلنا پڑتا تھا۔ کسی نے اس کو کبھی کچھ اور کھاتے ہوئے نہ دیکھا تھا حالانکہ اس کا کہنا تھا کہ دیوالی کے موقع پر گھر میں وہ چاول اور گوشت اور گیہوں کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے ہر دوسرے تیسرے دن علی کو بیر دیا کرتا اور کبھی کبھار روٹی کا ایک ٹکڑا بھی دے دیتا۔ علی بغیر شکریہ ادا کئے اس سے کھانے کی چیزیں قبول کر لیا کرتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بشن اپنی ضرورت سے زیادہ بیر لے کر آتا تھا اور روٹی وہ اس کو صرف اسی حالت میں دیتا جب کہ وہ خود سیر ہو چکتا۔ لیکن یہ وضع داری اور دوستی سب دیکھنے والوں کی باتیں تھیں۔ ان دونوں کے درمیان ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ ان دو گنوار بھائیوں کی طرح تھے جو ایک مدت تک ساتھ ساتھ رہنے کے بعد اس عمر کو پہنچ جاتے ہیں جب ان میں بغیر شکریہ کے ایک دوسرے کا احسان اٹھانے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے اور جن کو ایک دوسرے کی خوشی سے بظاہر کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یا پھر ان دو بوڑھے جانوروں کی طرح جو ایک جنگل میں تنہا رہتے ہیں اور جن کے دل میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی، ترحم اور غیر شعوری رفاقت کے جذبے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جو ایک دوسرے کی کمی کو محسوس بھی

کرتے ہیں اور مستقل نظر انداز بھی کرتے رہتے ہیں۔

ادھر کچھ روز سے جب سے مزدور یونین نے ہڑتال کا نوٹس دیا تھا' علی پر بہت لوگوں کی نظر کرم تھی۔ ہر کوئی دوپہر کے وقت اسے کھانے کی دعوت دیتا اور اس کے انکار کرنے پر اطمینان کا سانس لیتا' کیونکہ دل سے کوئی بھی نہ چاہتا تھا کہ وہ ان کی درخواست پر عمل کرے۔ علی کو بھی علم تھا کہ نوٹس چونکہ بھوک ہڑتال کا تھا چنانچہ یونین کی نظر میں وہ چوٹی کا آدمی تھا۔ لیکن اسے اس سے دلچسپی نہ تھی۔ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی اور وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

وہ نوٹس کا آخری دن تھا۔ اس دن بھی علی نے بش سے چند بیر لئے اور سب کی طرف پیٹھ کر کے کھانے لگا۔ وہ ایک ایک بیر کو آہستہ آہستہ چبا چبا کر کھا رہا تھا جب رحیم دوسری دفعہ اس کے پاس آیا۔

''کچھ روٹی بچ گئی ہے۔ کھا لو......'' اس نے روٹی بڑھاتے ہوئے کہا۔

علی نے خالی خالی نظریں اس پر جمائیں اور بیر کی گٹھلی کو بار بار چبانے لگا۔

''یہاں بیٹھو۔'' آخر اس نے کہا۔ ''میں ذرا دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں۔''

رحیم نے خوشی سے اس کی جگہ بیٹھنا منظور کر لیا اور وہ اٹھ کر باہر نکل آیا۔ باہر لو چل رہی تھی۔

کچھ دیر تک وہ دروازے پر رکا' آنکھیں سکیڑے' دھوپ کی سفید' جلتی ہوئی چادر کو دیکھتا رہا جو میدان میں بچھی تھی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ میدان پار کیا اور 'ورکشاپ' کے سامنے جا رکا۔ اندر خرادیے اور ترکھان اور پینٹر اور سارے ہیلپر کھانا ختم کر کے دائرے میں کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ آنے والا طوفان سب کے اعصاب پر سوار تھا لیکن صبح سے کسی نے اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ چند مہینوں سے وہ اس کے لئے تیاری کرتے آئے تھے اور پچھلے بیس دن میں یہ موضوع اور اس سے متعلق تمام سرگرمی ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی لیکن آج جب کہ وقت سر پر آن پہنچا تھا وہ اس سے کترا رہے تھے' اسے بھلانے کے لئے اِدھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہے تھے اور بلاوجہ زور زور سے ہنس رہے تھے۔ علی کو دیکھ کر بیک وقت سب کے ذہن میں وہ شدید خیال ابھر آیا۔ وہ فیکٹری بھر میں بھوک ہڑتال کے لئے موزوں ترین شخص تھا اور بہت غریب۔ اس کے باوجود کسی کو اس کے ہڑتال میں بیٹھنے کے متعلق یقین نہ تھا کسی کو کسی کے متعلق یقین نہ تھا۔ یہ اس فیکٹری کی پہلی ہڑتال تھی۔

علی ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ہیڈ فٹر نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی:

''تم نہیں جانتے سائیں' پر یہ سب جانتے ہیں۔ یہ یہاں کام کرتے ہیں۔ یہ سارا اس گنجے کا قصور تھا (اس نے فورمین کی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا) سراسر۔ اس کے گوروں کی ماں...... کہتا ہے گوروں سے کام سیکھ کر آیا ہے۔ کیوں اوئے بولتے کیوں نہیں؟''

''سراسر استاد سراسر۔'' ایک فٹر نے ہاتھ پھیلا کر یقین دلایا۔ ''یہ تو سب مانتے ہیں۔ بیچارا کریم۔ کیا جی دار مرد تھا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ ہائے......''

''اور آخیر دم تک کہتا رہا کہ اس کو کچھ بھی نہیں ہوا۔'' ایک خرادیے نے کہا۔

''اس وقت اللہ گواہ ہے کہ میں نے گنجے کو ایک طرف لے جا کر کان میں کہا کہ یہ گانٹھ جو وہ دے رہا ہے پکی نہیں ہے۔ ایک ٹن سے زیادہ وزن کے لئے یہ گانٹھ کام دے ہی نہیں سکتی۔ پر اِس نے اس کان سے سنا اُس سے اڑا دیا' اور تڑاخ ...... سب نے تو دیکھا ہی کہ کیا ہوا۔ اب؟''

''اس کی بھی ٹانگ توڑ دینی چاہیے۔'' کسی نے تجویز کیا۔ سب ہنسنے لگے۔

''سئور۔'' ہیڈ فٹر غرایا۔ ''اس کو جیل میں پھینکا جا سکتا تھا۔ لیکن افسر؟ جس کو چاہیں بچا لیں' جس کو چاہیں بھوکا مار دیں۔ کون سنتا ہے۔''

'الیکٹرک شاپ' سے چند الیکٹریشن نکل کر آ کھڑے ہوئے اور سگریٹ پینے لگے۔ اب ہیڈ فٹر اپنا اور گنجے فورمین کا مقابلہ کر رہا تھا اور کام میں اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فورمین کے خلاف تو سب خوشی سے سنتے رہے لیکن اب ان کی دلچسپی ختم ہوگئی کیونکہ ان میں زیادہ تر کاریگر تھے اور ہیڈ فٹر کی برتری ماننے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ سب آپس میں باتیں کرنے لگے جس سے ہیڈ فٹر مشتعل ہوگیا اور چلا چلا کر بولنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اگر کوئی وہاں سے گزرتا تو دیکھتا کہ مقرر اور سامعین میں گلا پھاڑنے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ جلد ہی دوپہر کے وقفے کے خاتمے کا بھونپو ہوا اور وہ وہاں سے تتر بتر ہونے لگے۔ علی کو جاتے ہوئے دیکھ کر ہیڈ فٹر نے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''سائیں تم دل سے غریب ہو مگر اب زیادہ عرصے غریب نہیں رہ سکتے۔ بیٹھو گے؟ (ہڑتال میں)۔''

''پتا نہیں۔'' علی نے کندھے اچکا کر کہا اور باہر نکل آیا۔ باہر ابھی تک لُو چل رہی تھی۔

اس نے اس مہیب عمارت پر' جہاں وہ کام کرتا تھا' ایک نظر ڈالی اور دوسری طرف چل پڑا۔ ایک اور کھلی جگہ پار کرنے کے بعد وہ 'موٹر شاپ' میں نکل آیا۔ وہاں پر چند مکینک ایک ٹرک کے کھلے ہوئے انجن پر جھکے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے گریس اور تیل لگے چہروں پر سے سیاہ پسینے کے قطرے انجن میں ٹپک رہے تھے اور وہ بلا وجہ انجن میں ہاتھ مار رہے تھے۔ دو فٹر انجن کے نیچے سیدھے لیٹے گا رہے تھے اور اوپر والوں سے باتیں کر رہے تھے۔ مشین ان کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ ڈال رہی تھی۔ اوپر والوں نے خاموشی سے سر اٹھا کر علی کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ لوگ جو محض اس انجن کی وجہ سے وہاں پر موجود تھے' دراصل اس سے اس قدر مختلف تھے کہ ان کو اس سرد' بد صورت بگڑی ہوئی مشین سے کوئی سروکار نہ تھا اور وہ ایک دوسرے کے لئے بے حقیقت تھے اور اس کے باوجود وہ محض اس مشین کی خاطر جمع تھے۔ اپنے خیال کے بے تکے پن پر وہ دل میں ہنسا اور تھکی ہوئی' کڑی' مستقل چال سے وہاں سے گزر گیا۔ آگے ریل کی پٹڑیاں تھیں جن پر مال گاڑی کے چند خالی ڈبے اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ ایک ڈبے کے سائے میں رک کر چند منٹ تک اس پر انگلیاں بجانے کے بعد وہ آگے چل پڑا۔ ''لوڈنگ پلیٹ فارم'' پر لمبی مال گاڑی کھڑی تھی اور اس میں چیختے چلاتے ہوئے مزدور بوریاں لاد رہے تھے۔ اس کے پیچھے بوریاں بھرنے کی مشینوں کی عمارت تھی اور سیمنٹ کے اونچے اونچے گودام تھے۔ ساری عمارت اور پلیٹ فارم سیمنٹ کی دھواں

دھار گرد میں لپٹے ہوئے تھے جو گرمی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عمارت کے عقب میں علی کے دو ہمسائے بجلی کی زمین دوز لائن کی، مرمت کرنے کی خاطر، کھدائی کر رہے تھے۔ جب علی ان کے پاس رکا تو وہ کمر تک گہرے، تازہ کھدے ہوئے گڑھے میں کھڑے، کہنیاں زمین پر ٹکائے ایک دوسرے کی کلائی موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک زور لگانے کے بعد انہوں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ یونس، علی کو دیکھ کر ہنسا:

''کہتا ہے چھوٹے سر والے مرد کو عورتیں زیادہ پسند نہیں کرتیں۔ اس میں مردمی کم ہوتی ہے۔ میں نے کہا آؤ تمہیں مردمی دکھاؤں، مردوں کے یہ طریقے ہیں۔'' اس نے پنجہ پھیلایا۔ ''تمہارے سر پر تو دو من بال اور دو من پگڑی ہے، اور جوئیں الگ ......'' اس نے کرم سنگھ کی پگڑی میں انگلی چبھوتے ہوئے کہا۔ علی منہ کھول کر ہنسا اور آگے چل پڑا۔ ذرا دور پر چند بجلی والے سائے میں بیٹھے کھدائی ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ آگے کوئلے کا گودام تھا جہاں کوئلہ مال گاڑیوں پر سے اتارا جا رہا تھا۔ سیاہ کالے مزدور اور گدھے کوئلہ ڈھو رہے تھے۔ علی نے ایک نوعمر لڑکے کو دیکھا جو ایک موٹی سی مولی کھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گدھے کو ہانک رہا تھا۔ ہر چند قدم پر جب اس کا گدھا رک جاتا تو وہ ایک ہاتھ سے اس کی پونچھ اٹھاتا اور مولی منہ سے نکال کر اس کی دم کے نیچے دے دیتا۔ گدھا اچھل کر چلنے لگتا۔ آگے وہ نالی تھی جس کے ذریعے فیکٹری کا فالتو پانی باہر جاتا تھا۔ نالی کے کنارے کنارے کوئلہ ڈھونے والے وہ مزدور، جنہوں نے ابھی ابھی چھٹی کی تھی، ننگ دھڑنگ نہا رہے تھے۔ ان کے جسم کوئلے کے بنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور وہ سفید سفید آنکھیں اور دانت نکالے باتیں کر رہے تھے، ہنس رہے تھے، کھڑے ہو کر پیشاب کر رہے تھے اور بے شرمی سے بڑے بڑے بالوں میں انگلیاں ڈالے کھجا رہے تھے۔ علی نے ہوا میں گالی دی اور نظر چرا کر وہاں سے گزر گیا۔

(۳۹)

چار بجے جب دن والی شفٹ ختم ہوئی تو سب مزدور کام چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ اگلی شفٹ والوں کو دروازے پر ہی روک لیا گیا۔ مشینیں بہرحال چلتی رہیں، فورمینوں اور سپروائزروں کے سہارے جنہوں نے بھاگ دوڑ کر کام سنبھال لیا تھا۔ یا چند ایک مزدور تھے جو ٹوڈی بن کر منتظمین کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئے تھے۔

گیٹ کے باہر لکڑی کے دو کریٹوں پر چڑھ کر یونین کے پریزیڈنٹ نے جو شہر کا ایک معمولی وکیل تھا، تقریر شروع کی:

''محنت کشو! آخر وہ وقت آن پہنچا ہے جب اپنی محنتوں کا پورا پورا صلہ حاصل کرنے کے لئے تمہیں قربانی دینی ہوگی۔ آج تمہاری اپنی محنت، تمہاری مشقت تمہارا خون مانگتی ہے۔ آج تک تم نے اپنی محنت کو اپنا پسینہ دیا ہے، آج تک تمہارے پٹھوں سے نچڑے ہوئے ہزاروں قطرے اس زمین میں جذب ہوتے رہے ہیں، آج اگر یہ زمین

بول سکتی تو تمہارے نام پر اور تمہاری محنت کی سیرابی پر آفرین بھیجتی، لیکن محنت کے ان سارے سالوں میں نہ زمین بولی اور نہ ہمارے مالک سیراب ہوئے، اور اس کے باوجود یہ مہیب عمارتیں اور یہ بھاری مشینری ہزاروں مزدوروں اور ہزاروں گدھوں نے دیکھتے دیکھتے کھڑی کر دی۔ مزدوروں اور گدھوں کا پسینہ ایک جگہ گرا اور ہمارے مالکوں نے سمجھا کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور آج تک یہی سمجھتے آ رہے ہیں۔ آج تک، میرے مزدور ہموطنو! اس زمین کی طرح جس میں تم رہتے ہو، جس میں تم سوتے جاگتے اور کام کرتے ہو، جس کی مٹی سے تم اٹھے ہو اور جس کی خوشبو سے تم اتنی اچھی طرح واقف ہو، آج تک اس زمین کی طرح تم بے زبان اور مصیبت زدہ رہے اور اپنے بہترین ساتھی گدھے کی طرح بدھو رہے اور اس کے باوجود تم نے بڑے بڑے کام کئے۔ تم نے ہزاروں من وزنی لوہے کی مشینری کہاں سے کہاں پہنچا دی اور ایک نیا شہر آباد کیا۔ اِدھر سے تم نے خشک بیکار پتھر ڈالے اور اُدھر سے سیمنٹ نکالا۔ تم نے بنجر، بے پھل پتھر میں سے سونا پیدا کیا۔ پھر......" وہ رخ پھیر کر دوسرے گروہ سے مخاطب ہوا۔ "تم نے اِدھر سے محنت کش کسانوں کی اگائی ہوئی کپاس ڈالی اور اُدھر سے کپڑا نکالا۔ وہ خوبصورت ملائم اور مضبوط کپڑا جس نے منڈیوں میں بہار لگا دی ہے، جس نے مالکوں کے جسموں کو خوشنما بنا دیا ہے اور تمہارے بچے آج تک گلیوں میں ننگے پھرتے ہیں اور تمہاری بیویوں نے برسوں سے نیا لباس نہیں دیکھا۔ کیا تمہارے بغیر یہ سب کچھ کیا جا سکتا تھا؟ کیا اپنی ساری دولت کے باوجود وہ کپاس کے ایک تار کو بھی کپڑے میں تبدیل کر سکتے تھے؟ اگر کپاس کے ایک ڈھیر کو روپیوں کے ایک ڈھیر کے ساتھ ملا دیا جائے تو صرف اس کا وزن بڑھ جاتا ہے اور کچھ نہیں بنتا۔"

مجمع میں سے کوئی ہنسا جس پر مقرر نے غضبناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کہاں سے آئے ہو؟ اپنی زمینیں اور مکان اور مویشی چھوڑ کر یہاں جمع ہوئے ہو، تم نے اپنے پسینے، اپنی مشقت اور اپنی کاریگری کی بنا پر ایک دوسرے کو جانا اور ایک دوسرے کے درد کو پہچانا ہے۔ کس لئے؟ اس لئے کہ تمہارے ساتھ اور تمہارے باربردار جانوروں کے ساتھ ایک سا سلوک کیا جائے؟ نہیں۔ آج وہ لازوال وقت آ گیا ہے جب برسوں کی اندھی اور گونگی محنت کے بعد بالآخر تم نے محسوس کیا ہے کہ تم انسان ہو، کہ تم زمین پر بسنے والی ساری جاندار مخلوق میں سے برتر ہو، کہ تم بہتر سلوک کے مستحق ہو، تم سوچتے اور سمجھتے ہو، تمہیں گیہوں اور چنے کی روٹی کا فرق معلوم ہے، تمہارے جسم نرم اور سخت کپڑے کو الگ الگ محسوس کرتے ہیں، کہ تمہاری آنکھیں صفائی اور گندگی میں تمیز کرنے کی اہل ہیں، کہ تم خوشبوؤں اور خوبصورت چیزوں کو پسند کرتے ہو، کہ تم میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو تمہیں جانوروں سے الگ اور افضل بناتی ہیں۔ لیکن اس قدیم حقیقت اور نئی آگاہی کو ان تک پہنچانے کے لئے تمہارے خون کی ضرورت ہے کیونکہ اب تمہارا پسینہ ختم ہو چکا ہے، ان مردہ انسانی روحوں کو حرکت میں لانے کے لئے تمہارا خون درکار ہے، اور جب یہ بھی ختم ہو گیا تو تمہاری ہڈیوں پر اس آگاہی کو قائم رکھا جائے گا۔"

مزدوروں کے مجمع میں سے بلبلاہٹ اٹھی جو آہستہ آہستہ نعروں میں تبدیل ہو گئی۔ پھر انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی قومی اور مذہبی قسم کے نعرے لگائے جن کا موضوع سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس موقع پر کپڑے کی مل سے

عورتوں کا جلوس آ کر ان کے قریب رک گیا۔ یہ سب مزدور عورتیں تھیں جو کپاس سے بنولہ الگ کرنے کا کام کرتی تھیں۔ ان کی رہنمائی ایک گندمی رنگ کی ڈھلتی ہوئی عمر والی عورت کر رہی تھی جو نزدیک سے دیکھنے پر تقریباً خوبصورت نظر آتی تھی۔ انہوں نے سونٹیوں پر رنگ برنگے کپڑوں کے ٹکڑے ٹانگ کر جھنڈے بنا رکھے تھے جن سے کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ جب وہ نعرے لگاتی لگاتی ان کے قریب آ کر رک گئیں تو مزدوروں میں نمایاں طور پر جوش پھیلنے لگا۔ ایک چھوٹا سا کمزور مزدور' جس کو کم لوگ فیکٹری میں جانتے تھے' چھلانگ لگا کر کریٹ پر چڑھا۔ پریزیڈنٹ کچھ دیر تک سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا پھر نیچے کود گیا۔ لوگوں نے اس نوجوان کے کمزور جسم میں سے نکلتی ہوئی طاقتور آواز کو حیرت سے سنا۔

''بھائیو! ہم غریب اور ان پڑھ لوگ ہیں لیکن ہم کام کرتے ہیں اور حق حلال کی روزی کماتے ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر کند ذہن بھی ہوں گے لیکن ہم کاہل الوجود نہیں ہیں۔ پچھلے برس ہم نے پانچ لاکھ گز کپڑا بنا ہے' کیا ہمیں ایک کی بجائے دو ڈانگریاں نہیں دی جا سکتیں؟ سب جانتے ہیں کہ چھ ماہ میں ایک ڈانگری کا تار تار الگ ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دولت کے ساتھ عقل بھی آ جاتی ہے' کیا وہ نہیں جانتے کہ چھ مہینے میں ڈانگری کا پھٹ جانا ہماری محنت کی نشانی ہے۔ اگر ہم کام نہ کریں تو یہ دو برس تک بھی چل سکتی ہے۔ وہ ہمارے ننگے جسموں کو کیوں ناپسند نہیں کرتے؟ وہ لوگ جو خوبصورت گھروں میں رہتے ہیں اور خوبصورت تصویریں دیواروں پر لٹکاتے ہیں' ہمارے سیاہ بدنما جسموں کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پچھلے سال میں ہم نے ساٹھ ہزار ٹن سیمنٹ بنایا ہے جس سے کمپنی کو دس لاکھ روپے کا فائدہ ہوا ہے' کیا ہماری مزدوری آٹھ آنے روز کے حساب سے بھی نہیں بڑھائی جا سکتی؟ ہم لاکھوں میں دیتے اور صرف سینکڑوں میں اپنا حق مانگتے ہیں۔ ہمیں رہنے کے لئے مکان چاہئیں' ہمارے مکانوں میں پانی ہونا چاہیے کیونکہ پانی کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے' صحن میں ایک آدھ پیڑ ہونا چاہیے جس کی چھاؤں میں ہم بیٹھ سکیں۔ ہمارے بیوی بچوں کو سستے داموں کپڑا ملنا چاہیے تاکہ وہ صاف ستھرے رہ سکیں۔ کیا انہیں علم نہیں کہ ہم میلے کپڑوں کو اسی طرح ناپسند کرتے ہیں جیسے وہ کرتے ہیں؟ ہماری تنخواہوں میں اضافہ ہونا چاہیے تاکہ ہم ذرا زیادہ آسانی کے ساتھ رہ سکیں۔ ہمارے گھروں میں بجلی لگنی چاہیے۔ کارخانے میں ہم دن بھر بجلی پیدا کرتے رہتے ہیں اور جب گھروں کو لوٹتے ہیں تو ہماری دیواریں اندھیرے میں کھڑی ہوتی ہیں اور تیل کا دھواں آنکھوں میں بھر جاتا ہے۔ کیسی شرم کی بات ہے۔ ہمیں اور ہمارے بچوں کو مل کے دواخانے سے مفت مشورہ اور دوا ملنی چاہیے۔ ہماری چھٹیوں میں اضافہ ہونا چاہیے۔ مشینوں کو بھی تیل کی ضرورت ہوتی ہے' کیا ہمیں آرام کی ضرورت نہیں؟ کیا ہم اس تھوڑی سی سہولت کے حقدار نہیں ہیں؟ کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ ہم نے اٹھائیس دن تک نوٹس کے جواب کا انتظار کیا ہے' اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔ آج تک ہم نے مالکوں کے پیٹ کے لئے محنت کی ہے' آج ہم اپنے بچوں کے پیٹ کے لئے کام شروع کرتے ہیں۔''

ہر طرف سے نعرے بلند ہونے لگے۔

''وہ...... وہ۔'' بشن نے علی کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ ''میری ماں ہے۔''

علی نے کچھ نہ سنا۔ وہ خلا میں اس جگہ کو گھور رہا تھا جہاں سے کمزور نوجوان چھلانگ لگا کر غائب ہو چکا تھا۔ یونین پریزیڈنٹ کی تیار شدہ بلند آہنگ تقریر کے مقابلے میں اس نوجوان کے سیدھے سادے الفاظ تیر کی طرح اس کے دل کو لگے تھے۔ جب وہ بول رہا تھا تو علی نے محسوس کیا تھا کہ پریزیڈنٹ کی تقریر کے مقابلے میں، جو کہ اس کے عالم فاضل دماغ سے نکلی تھی، یہ الفاظ سیدھے اس نوجوان کے دل سے، سیدھے اس کی زندگی سے نکل کر چلے آرہے تھے، کہ یہ نوجوان مزدور ان کا بھائی تھا اور سب کچھ جانتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی نعرے لگانے والوں میں شامل ہو گیا۔

پھر جانے کیسے ہوا کہ آناً فاناً علی نے اپنے آپ کو فیکٹری کی حدود کے اندر پایا۔ اسے اتنا یاد رہا کہ مالکان کے چند نمائندے آئے اور گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے مزدوروں کو ورغلانے لگے اور وہ کہ پہلے ہی ڈھلمل یقین تھا ان کے آگے لگ کر اندر چلا گیا۔ جلسے والوں کو جب پتا چلا تو گیٹ بند ہو چکا تھا۔ وہ سب پلٹ کر گیٹ پر جمع ہو گئے اور غضبناک آوازوں سے انہیں واپس بلانے لگے۔ چند ایک نے ''ٹوڈی...... ٹوڈی'' کی آوازیں بھی لگائیں۔ بشن، جو اندر چلا آیا تھا، علی کے پاس سے نکل بھاگا اور دیکھتے دیکھتے لپک کر گیٹ پر جا چڑھا اور باہر کود گیا۔ باہر والے مزدوروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ باقیوں کو اندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر وہ گالیاں دینے لگے۔ علی نے عورتوں کے جلوس والی لیڈر کو دیکھا جو گیٹ کی سلاخوں میں سے ناک نکالے اس کا منہ چڑا رہی تھی اور ''ٹوڈی ٹوڈی'' کی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ علی نے اونچی آواز سے گالی دی اور مُکا ہوا میں لہرایا۔ وہ اس عورت کو جانتا تھا۔ وہ شیلا ماتھر نام کی ہندو عورت تھی اور اب ایک مسلمان کے ساتھ رہتی تھی جس نے اس کا نام بانو رکھ دیا تھا۔

رات ہونے تک کئی بار اس نے گھر جانے کی اجازت چاہی لیکن اسے بتایا گیا کہ جو لوگ اندر آ چکے تھے اب ہڑتال ختم ہونے تک باہر نہیں جا سکتے تھے اور ان کے کھانے پینے اور سونے جاگنے کا بندوبست اندر ہی کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کو یقین دلایا گیا کہ وہ، جو ہڑتال میں شامل نہیں تھے، مالکان کی نظر میں اونچی حیثیت رکھتے تھے چنانچہ ان کے گھر والوں کی دیکھ بھال کا ذمہ مالکان کے سر تھا اور اس کا خاطر خواہ انتظام کر دیا گیا تھا۔ لیکن عائشہ بیمار تھی اور وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا کیونکہ دو روز پہلے وہ ڈاکٹر سے اس کی دوائی لے کر آیا تھا جو وہ خود بخود کبھی نہ پیتی تھی اور علاوہ اور سب باتوں کے اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ دو ایک بار اس نے آپ سے آپ باہر جانے کی کوشش کی لیکن گیٹ بند تھا اور اس پر پولیس کے سپاہی تعینات کئے گئے تھے جنہوں نے اسے واپس بھیج دیا۔ اب رات پڑ رہی تھی اور وہ مایوس ہو چکا تھا اور اپنی کم عقلی پر پچھتا رہا تھا۔ اس کے برعکس اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ اگر اس وقت وہ باہر رہ جاتا تو اسے زبردستی پکڑ کر بھوک ہڑتال کرنے والوں کی ٹولی میں بٹھا دیا جاتا اور وہ دو ایک روز میں ہی مر جاتا۔ فیکٹری کو بہرحال ہڑتالیوں کی ہمت پست کرنے کی خاطر چلتے رہنا تھا۔

اب رات پڑ چکی تھی اور کل سترہ آدمی فیکٹری کو جا رہے تھے۔ تین انجینئر، پانچ فورمین، چار سپروائزر، دو فٹر اور تین مزدور۔ انجینئر اور فورمین تو مزدور یونین میں شامل نہ تھے چنانچہ بڑے صاف ضمیر کے ساتھ کام کر رہے تھے کہ یہ ان کی ڈیوٹی تھی۔ باقی سپروائزر اور فٹر اور مزدور ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی مرضی سے یونین کا ساتھ چھوڑ کر فیکٹری میں کام کرنے کو چنا تھا۔

علی کی ڈیوٹی مل ہاؤس میں تھی۔ یہاں پر دو ملیں تھیں۔ ایک مل میں پتھر پیسا جاتا تھا۔ دوسری مل میں وہی پسا ہوا پتھر جلائے جانے کے بعد جب 'کلنکر' بنتا تھا تو پیس کر سیمنٹ بنایا جاتا تھا۔ دونوں ملیں صرف پیسنے کا کام کرتی تھیں۔ جلانے کے لئے ایک الگ پلانٹ تھا جو 'کلن' کہلاتا تھا۔ مل ہاؤس میں عموماً پانچ آدمی ایک وقت میں کام کرتے تھے مگر اس وقت صرف دو آدمی تھے۔ ایک فورمین تھا جو بھاگ دوڑ کر ملوں کو چلا رہا تھا اور علی تھا جو ان کے بیئرنگ (Bearing) کا تیل وغیرہ دیکھ رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے پمپوں کو، جن کے ذریعے پسا ہوا مال اگلی منزل تک پمپ کیا جاتا تھا چلا رہا تھا۔ کام برائے نام ہی تھا کیونکہ تقریباً ساری مشینری خود بخود چلنے والی تھی، صرف نگرانی کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ فورمین کا کام بھی اکثر علی کو ہی کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ فورمین کے پاس چند ایک دوسرے پلانٹوں کا چھوٹا موٹا کام بھی تھا۔ علی اس کام سے بخوبی واقف تھا اور آسانی سے سرانجام دے رہا تھا۔

ایک گھنٹے سے اس کا فورمین غائب تھا اور وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات آدھی کے قریب ہو چلی تھی لیکن لو ابھی تک چلنی بند نہ ہوئی تھی اور پسینہ پانی کی طرح نکل رہا تھا۔ ملیں مستقل چل رہی تھیں اور ان کی گڑگڑاہٹ میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، بھاری مشینری کی گڑگڑاہٹ جو پہلے پہل آنے والے کے دل میں جوش اور بدن میں چستی پیدا کرتی ہے، وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بھاری نیند اور اداس اور کڑی یکسانیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جاگنے کی کوشش میں وہ سر اٹھا کر بجلی کی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

اس کے سامنے دور و نزدیک اِکا دُکا جانے پہچانے لوگ مصنوعی جوش اور پھرتی کے ساتھ اِدھر اُدھر گزر رہے تھے۔ ان سب کے چہرے زیادہ دیر تک کام کرتے رہنے کی وجہ سے تمتمائے ہوئے تھے اور وہ اونچی اعصابی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ برسوں کی پرانی جانی پہچانی فیکٹری آج ایک عجیب وغریب انوکھی دنیا میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک نوجوان انجینئر کرین کو چلا رہا تھا۔ کرین جس کو عموماً علی کا ایک ساتھی چلایا کرتا تھا جس کو وہ اکثر وسل مار مار کر ملوں میں مال ڈالنے کی ہدایات دیا کرتا تھا۔ نوجوان انجینئر کو کرین چلانے کا معمولی تجربہ تھا چنانچہ اسے اس میں کافی دقت پیش آ رہی تھی اور علی، کہ اسے ناپسند کرتا تھا، یہ دیکھ کر عجیب سی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ اسی طمانیت کے احساس کو مکمل کرنے کے لئے علی اب تک تین بار جا کر منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجا بجا کر اور بازو ہوا میں لہرا لہرا کر اس کو ملوں میں مال ڈالنے کی ہدایات دے چکا تھا۔ ایک بار کرین کے شیشے میں سے انجینئر کا غضب ناک چہرہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا اور بھاگتا ہوا اپنی جگہ پر آ کر ہنسی کے مارے دہرا ہو گیا۔ ایک انجینئر اور دو فورمین کلن (بھٹی) کو چلا رہے تھے۔ کوئلہ جو کہ کلن میں جلایا جاتا تھا، کہیں سے باہر نکل نکل کر اڑ رہا تھا اور تینوں

کلن چلانے والے سر سے پاؤں تک کالے ہو رہے تھے۔ دو گھنٹے ہوئے اسی کلن کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ان سب نے رات کا کھانا کھایا تھا جو کینٹین سے پک کر آیا تھا اور سوجی کے تر بتر حلوے اور بھنے ہوئے گوشت پر مشتمل تھا۔ اس کھانے میں سارے سپروائزر، فورمین، انجینئر اور علی کے علاوہ چیف انجینئر اور مل کا مالک بھی آ کر شامل ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ایسی باتیں کر رہے تھے جیسے پرانے دوستوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ دو چار لقمے لینے کے بعد مل کے مالک نے بے تکلفی سے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا: ''شاباش نوجوان، تم ہیڈ فٹر کی آسامی کے قابل ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟'' زندگی میں پہلی بار علی سے مل کے مالک نے بات کی تھی۔ اس کے سارے بدن میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی اور اگلے چند گھنٹوں کے لئے وہ اپنی بیوی کو قطعی طور پر بھول گیا۔ اس کے بعد مالک نے دبلے پتلے مدقوق چہرے والے سپروائزر سلیم سے اس کا نام پوچھا اور اسے بتایا کہ اس نے آج سب سے زیادہ کام کیا تھا اور یہ کہ اسے تو جنرل فورمین ہونا چاہیے تھا۔ مالک کی طرف سے اتنا صاف اشارہ ترقی ملنے کے سلسلے میں کافی سے زیادہ تھا۔ خوش آئند خیالات کے اچانک رش کی وجہ سے سلیم شرما کر ہنسا اور جلدی جلدی حلوہ کھانے لگا اور جنرل فورمین کا منہ لٹک گیا اور اس کی زبان پر پڑا ہوا حلوہ سب کو نظر آنے لگا جس پر انگریز انجینئر نے نظریں پھیر کر برا سا منہ بنایا۔ اس کے بعد جلد ہی مالک اور چیف انجینئر نے بڑی اپنائیت کے ساتھ انہیں بتایا کہ وہ یونین کے لیڈروں کے ساتھ گفت وشنید کر رہے ہیں اور امید ہے کہ جلد ہی کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ جاتے جاتے مالک نے رک کر پچاسویں بار دہرایا: ''دھواں نکلتا رہے۔ شاباش، دھواں بند نہ ہو۔''

ان کے جانے کے بعد باقیوں نے آپس میں بالکل پرانے ساتھیوں کی طرح باتیں کیں، ایک دوسرے کو کام کے متعلق ہدایات دیں اور اپنی جگہ واپس جانے سے پیشتر ہنسی مذاق بھی کیا۔ جب وہ مل ہاؤس کی طرف واپس آ رہا تھا تو علی کا دل ان سب فورمینوں اور انجینئروں کی طرف سے، جن سے وہ ہمیشہ نفرت کرتا آیا تھا، مکمل طور پر صاف ہو چکا تھا اور مل کے مالک کے لئے تو اس کے دل میں ایسے محبت کے جذبات موجزن تھے کہ اگر موقع ہوتا تو وہ بے سوچے سمجھے اس پر فدا ہو جاتا۔ اپنی جگہ پر پہنچ کر اس نے ساری ملوں کا چکر لگایا اور دل میں ہڑتالیوں کو کوستا اور ان کی ناکامی کی دعائیں مانگتا رہا۔

لیکن اب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور وہ اس سارے قصے سے اکتاتا جا رہا تھا۔ سامنے وہی سماں تھا: پھرتی سے آتے جاتے ہوئے اِکّا دُکّا لوگ، جو ایک پلانٹ سے دوسرے پلانٹ کو جا رہے تھے، بیچ بیچ میں پولیس کے سپاہی، جو منہ اٹھائے گشت کر رہے تھے، تیزی سے کار پر گزرتا ہوا چیف انجینئر، وہ لوگ، جنہوں نے کبھی یہ چھوٹے چھوٹے (مگر بہت اہم) ہاتھ سے کرنے والے کام نہ کئے تھے، اب کر رہے تھے، بالکل اسی طرح جیسے وہ کر رہا تھا، کرتا آیا تھا۔ وہ لوگ جو کبھی راتوں کو فیکٹری میں نہ آئے تھے، جو اتنے بعید، اتنے اونچے، اتنے عظیم نظر آتے تھے اب اس کے ساتھ مل جل کر کام کر رہے تھے، گپیں مار رہے تھے، کھانا کھا رہے تھے۔ اس کی سیٹی کی آواز پر چونک اٹھتے تھے اور اس کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ شروع رات میں یہ سب باتیں اسے بڑی سنسنی خیز معلوم

ہوئی تھیں۔ یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ فیکٹری پر ایک بے حد انوکھا' عجیب وغریب' تہلکہ خیز سماں طاری تھا' جیسے میلوں پر جانے والی رات ہوا کرتا ہے' مصنوعی' فی الوقتی خوشی اور جوش وخروش کا' مل جل کر اٹھنے بیٹھنے کا' شادی بیاہوں والی راتوں کا' ایک عظیم اور وسیع بھائی چارے کا (گو وہ کل تیرہ آدمی تھے)۔ شروع میں جن مشینوں کے درمیان اکیلے پھرتے ہوئے اسے عظیم ملکیت' خودمختاری اور قوت کا احساس ہوا تھا رات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انہیں دیوہیکل گڑگڑاتی ہوئی مشینوں کے درمیان کھڑے کھڑے اسی شدت کے ساتھ وہ احساس خوفناک کھوکھلی تنہائی اور بے چینی میں تبدیل ہوگیا۔ چلتی ہوئی مشینوں اور انسانوں کی باہمی رفاقت کی عجیب کہانی ہے۔ جب وہ پہلے پہل ان کے درمیان پہنچتا ہے تو اس کی ساری قوتیں کہیں دب جاتی ہیں سوائے قوت سماعت کے جو اکیلی ان کی مہیب گڑگڑاہٹ کو جذب کرتی ہے اور انسان کی اپنی آواز کو کہیں دور گم کردیتی ہے۔ اس چیلنج کو قبول کر کے انسان جبلی طور پر مشینوں کے مقابلے میں اپنی برتری کو ثابت کرنے کے لئے (یا کم از کم ان کی برابری کرنے کے لئے) جوش وخروش سے کام شروع کردیتا ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اسے مشینوں کی مادی برتری کا احساس ہونے لگتا ہے' ان کی مادی برتری کا اور ان کی سرد بے حسی اور ان کی پاگل کردینے والی یکسانیت کا اور ان کی پابندی وقت کا اور ان کی انسان دشمنی کا اور ان کی پیداواری قوت کا اور ان کی لاتعلقی اور ان کی کمینگی کا' اور ان سارے انکشافات میں سے مشینیں ایک بوتر دشمن کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ اس نئی یاسیت میں سے ایک نیا احساس شکست' ایک نیا احساس تنہائی جنم لیتا ہے اور انسان کی اپنی اندرونی گم شدہ آواز ابھرنا شروع ہوتی ہے اور اٹھتی اٹھتی اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ ساری مشینوں کی آواز کو دبا دیتی ہے اور انسان کو یکلخت خوفزدہ کردیتی ہے۔

دروازے کے ساتھ کھڑے کھڑے علی نے آنکھیں بند کر کے سوچا کہ اس ساری دنیا میں اس کا کوئی پرسان حال نہیں رہا کہ وہ دور دور تک بھلا دیا گیا ہے۔

''سب ٹھیک ہے؟''

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ''سب ٹھیک ہے۔'' اس نے میکانکی طور پر دہرایا۔

''شاباش۔'' فورمین نے کہا۔

''استاد میں ذرا...... تھوڑی دیر کے لئے کینٹین چائے پی آؤں؟''

فورمین نے اسے بخوشی جانے کی اجازت دے دی۔ مل ہاؤس سے نکل کر وہ چار سو فٹ لمبی کلن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میدان کے وسط میں بجلی کا فورمین ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا احمقوں کی طرح منہ اٹھا کر بجلی کی روشنیوں کو تک رہا تھا۔ ایک سپروائزر بھاگتا ہوا اس کے پاس سے گزرا۔ ایک کتا آگے بڑھ کر علی کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ پھر وہ دم بخود کھڑا رہ گیا۔

چاروں طرف بھاگ دوڑ مچ گئی۔ کلن رک گیا تھا۔ چمنی سے دھواں نکلنا بند ہو چکا تھا۔ دھواں' جو باہر والوں کے لئے فیکٹری کی زندگی کا واحد نشان تھا۔ اس ایک دھویں کو جاری رکھنے کے لئے یہ ساری کوششیں کی گئی

تھیں اور وہ اب تھم چکا تھا۔

کلن کے گرم ترین حصے کے عین نیچے بجلی کی موٹر، جو کلن کو گھماتی تھی، رک گئی تھی۔ دو فورمین اور دو سپروائزر اوزار اٹھائے بھاگتے ہوئے موٹر کے پلیٹ فارم پر چڑھے اور پچھلے پاؤں نیچے اتر آئے۔ وہاں پر کھڑا نہ ہوا جاسکتا تھا۔ اس جگہ پر کلن کے اندر چودہ سو ڈگری سینٹی گریڈ ٹمپریچر تھا۔ باہر...... آخر مئی کے دن تھے...... چند سیکنڈ تک وہ چاروں نیچے کھڑے خالی خالی نظروں سے مردہ کلن کو دیکھتے رہے۔ پھر چیف انجینئر کی کار آندھی کی طرح آکر ان کے پاس رکی۔ اس میں سے کار کے مالک کے ساتھ ساتھ مل کا مالک بھی نمودار ہوا۔ چیف انجینئر نے ایک لمحے کے لئے رک کر غصیلی نظروں سے چاروں کاریگروں کو دیکھا اور موٹر کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے چاروں کاریگر سیڑھیاں چڑھ گئے۔ جلد جلد معائنہ کر کے چیف انجینئر اپنی زبان میں گالیاں بڑبڑاتا ہوا نیچے اتر آیا۔ معمولی سا نقص تھا۔ اس نے مالک کو بتایا۔ چند منٹوں کا کام تھا لیکن وہاں پر قیامت کی گرمی تھی۔ دونوں نے کار کے پاس کھڑے ہو کر چاروں کاریگروں پر نظر دوڑائی۔ چیف انجینئر نے زیر لب گالی دی۔ جب مالک کی نگاہ سلیم پر سے گزری تو اس نے جھپٹ کر فورمین سے اوزار لئے اور موٹر کے پاس جا پہنچا۔ اس کے پیچھے پیچھے تینوں آدمی بھی وہاں پہنچ گئے۔

اب سلیم تیز تیز اوزار چلا رہا تھا اور فیکٹری کا مالک پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا بار بار چمنی کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ سلیم کے سر پر بلا کی تپش تھی اور اس کی جلد جل رہی تھی، پسینہ نکلنا بند ہو چکا تھا۔ فورمین اس کے سر پر کھڑے اسے مختلف ہدایتیں دیتے اور ایک ایک کر کے اوزار پکڑاتے جا رہے تھے۔ مالک کی نظروں اور کلن کی تپش کے نیچے سلیم کے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح رواں تھا۔ مالک سوچ رہا تھا کہ کلن کا دھواں بند ہوتے دیکھ کر یونین والوں نے صلح کی گفت وشنید منقطع کر دی تھی۔ دوبارہ دھواں نکلنے لگے تو شاید ان کی ہمتیں پست ہو جائیں اور وہ پھر سے اسے جاری کر دیں۔ اس نے ایک سپروائزر کو سن کی بوری بھگو کر لانے کے لئے دوڑا دیا تھا تاکہ وہ کام کرنے والے شخص کے سر پر رکھ دی جائے جس سے کچھ بچاؤ ہو سکے۔ جب وہ سپروائزر گیلی بوری لے کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو سلیم نے اچانک رک کر پیٹ پر ہاتھ رکھا اور زمین سے جا لگا۔

اسے اٹھا کر نیچے لایا گیا اور چیف انجینئر مستقل گالیاں بڑبڑاتا ہوا اپنی کار میں ڈال کر اسے فیکٹری کی ڈسپنسری کی طرف لے گیا۔ اس کی جگہ ایک فورمین نے لے لی اور چند منٹ کے اندر اندر کام ختم کر کے کلن چلا دیا گیا۔ مالک نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ان تینوں کے کندھوں پر خوشی کے دھپ رسید کئے اور انہیں مبارک باد دیتا اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

کلن کے Pier کی اوٹ میں کھڑے کھڑے علی نے سلیم کو، جب وہ اسے کار میں لاد رہے تھے، صاف طور پر مرتے ہوئے دیکھا اور کینٹین کی طرف چل پڑا۔ کینٹین میں وہ دیر تک آگے رکھی ہوئی چائے کو پینے کا ارادہ کرتا رہا۔ پھر اسے اسی طرح چھوڑ کر چلا آیا۔ گیٹ کی جانب سے ہڑتالیوں کے ہلکے ہلکے نعروں کی آوازیں آرہی

تیں۔ مٹی کا آسمان صاف اور روشن تھا اور چمنی کا دھواں چاند کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نے چیف انجینئر کی کار کو آ کر رکتے، فیکٹری کے مالک کو نکل کر کلن پلیٹ فارم پر چڑھتے، کلن چلاتے ہوئے فورمینوں اور انجینئروں سے دو منٹ تک باتیں کرتے اور پھر ان کی پیٹھ ٹھونک کر قہقہہ لگاتے اور جاتے ہوئے دیکھا اور وہیں کھڑا رہا۔ سامنے کلن کی موٹر تھی جس کو بطریق احسن ٹھیک کر دیا گیا تھا اور جو اب بخوبی چل رہی تھی۔ اسے ٹھیک کرنے والے فورمین فخر سے اکڑ اکڑ کر مالک سے باتیں کر رہے تھے اور مالک ان کی کامیابی پر طمانیت سے مسکرا رہا تھا اور دھوئیں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باقی سارے فورمین اور انجینئر بھی دھوئیں کی طرف دیکھ رہے تھے اور اپنی مجموعی کامیابی پر مکمل طور پر خوش تھے۔ گیٹ کے باہر ہڑتالی بھی دھوئیں کی طرف دیکھ رہے تھے اور مایوسی سے نعرے لگا رہے تھے۔ صرف سلیم وہاں نہیں تھا۔ اسے بھلا دیا گیا تھا، وہ جو مدقوق ہونے کے باوجود بڑا عمدہ کاریگر تھا۔

دفعتاً وہاں کھڑے کھڑے علی کے گنوار ذہن نے عجیب و غریب پاگل طریقے سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ایسا خیالی منظر دیکھا جو اس طرح کے غیر تربیت یافتہ ذہن عمر بھر میں ایک آدھ مرتبہ ہی دیکھتے ہیں۔ اس منظر میں یہ سب کچھ شامل تھا۔ بخیر و خوبی چلتی ہوئی بجلی کی موٹر، بڑی خاموشی اور صفائی کے ساتھ گھومتی ہوئی کلن، شور مچا کر چلتی ہوئی ملیں، چاند کے سامنے سے گزرتا ہوا چمنی کا دھواں، بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھتا اور فتح مندی کے قہقہے لگاتا ہوا سیاہ فام آدمی، غیر زبان میں کوسنے دیتا ہوا سفید فام آدمی، فخر سے اکڑ اکڑ کر باتیں کرتے اور سفید سفید دانت نکال کر ہنستے ہوئے کئی آدمی...... سرد، ٹھوس، لائق اور لاتعلق مشینیں، سرد، ٹھوس، لائق اور لاتعلق انسان......

اس نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کہاں تھا؟ وہ خود؟ بڑے واضح طور پر اس نے دیکھا کہ وہ خود اس منظر میں شامل نہ تھا۔ اس سارے نقشے میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ میں اس میں کہاں ہوں؟ اس نے سوچا۔ ''میں اس میں کہاں آتا ہوں؟'' اس نے بلند آواز سے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ باہر سے شور اٹھا۔ پھر یکلخت گیٹ کھل گیا اور ہڑتالی نعرے لگاتے ہوئے اندر داخل ہونا شروع ہوئے۔ جلوس کے آگے آگے فیکٹری کے مالک، چیف انجینئر اور یونین کا پریزیڈنٹ چل رہے تھے۔ تینوں کے گلوں میں ہار پڑے ہوئے تھے اور مزدور تینوں کا نام لے لے کر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ علی اپنی مخصوص تھکی ہوئی مستقل چال سے ان کے پاس سے گزرتا گیا۔ جلوس کے وسط میں کسی نے طعن بھرے لہجے میں کہا: ''سائیں ٹوڈی۔'' ایک نفرت آلود قہقہہ بلند ہوا۔ جلوس کے آخیر میں کسی نے رک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا:

''سائیں تم دل سے غریب ہو پر اب زیادہ دیر تک غریب نہیں رہ سکتے۔ ہماری چند شرائط مان لی گئی ہیں۔ ہمارے ساتھ آؤ۔ ہم جانتے ہیں وہ تمہیں کھینچ کر اندر لے گئے تھے۔ تمہارا کوئی قصور نہ تھا۔'' اس نے اجنبی، لاعلم نظروں سے مخاطب کو دیکھ کر زیر لب کہا۔

''میں اس میں کہاں آتا ہوں؟'' اور آگے چل پڑا۔

اپنے گھر کے دروازے پر اس نے مڑ کر ایک تھکی ہوئی نگاہ فیکٹری پر ڈالی۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ چکے تھے۔ چمنی کا دھواں روشن آسمان پر لمبی سفید لکیر بناتا ہوا مغرب کی سمت جا رہا تھا۔ آخر مئی کی رات گرم اور پُرسکوت تھی۔

(۴۰)

عام سطح پر زندگی جس تیزی اور شدت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے، اسی تیزی اور شدت کے ساتھ مایوس بھی کرتی ہے۔ زندگی ایک عظیم اور مسلسل حرص ہے اور ہر چھوٹی بڑی حرص کی طرح انسانوں پر خوفناک پابندیاں عائد کرتی ہے اور پھر یک دم اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جس آسانی اور تیزی سے اس کی طرف مائل ہوتے ہیں، اسی آسانی کے ساتھ اسے برا بھلا کہنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض لوگ اپنی کوشش سے ایک بیکار تجربے میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی کوشش سے ہی مایوس ہو کر یا محض اکتا کر باہر نکل آتے ہیں۔ (محض ایک دوسرے بیکار تجربے میں داخل ہونے کے لئے) اور بعض، جن کی بہت بڑی اکثریت ہے، خاموش رضامندی کے ساتھ روز بروز، لحہ بہ لحہ رہے چلے جاتے ہیں، اور کبھی کبھار جب شدید ذہنی اور روحانی کرب کی وجہ سے ٹھٹک جاتے ہیں تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مختلف قسم کے تجربات کی بدولت انہوں نے اپنی عقل و دانش میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم کبھی اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ گونگی رضامندی کا رویہ ایک بیماری ہے جس نے ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور کہ اس بیماری کا نام ہے ''کاہلیت''۔ دوسرے لفظوں میں اسے صاف صاف انسانی بے عقلی بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہمارے دوسرے لاحاصل جذبوں کی طرح دنیاوی عقل و دانش بھی بے حد تھکا دینے والی شے ہے۔

روشن محل کا مشرقی حصہ، جس میں کمرہ نشست، خوابگاہ اور ایک سٹڈی شامل تھی، نعیم اور عذرا کی تحویل میں تھا۔ روشن محل کے نوکر چاکر ہی اُن کی خدمت پر مامور تھے۔ پارلیمنٹ ہاؤس سے آنے کے بعد نعیم زیادہ تر وقت سٹڈی میں گزارتا۔ عذرا اس کے پروگرام میں کبھی مخل نہ ہوتی تھی۔ پچھلے چند برس سے وہ انتہائی سکون اور قناعت کے ساتھ زندہ تھی اور نعیم کے علاوہ روشن محل اور اپنے اردگرد زندگی کی ہر بات میں بے حد انہماک اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لے رہی تھی۔ اس دوران میں اسے دیکھنے پر آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ درمیانی عمر کی یہ خوبصورت صحت مند عورت اپنے طبقے کی خاص الخاص نمائندہ تھی اور زندگی میں اس نے محبت، نیکی اور مہربانی کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا۔ اس قدر حیرت انگیز صلاحیت اس میں وقت کے صدموں کو برداشت اور نظر انداز کر دینے کی تھی۔

نعیم وزارتِ تعلیم میں انڈر پارلیمنٹری سیکرٹری تھا۔ اس عہدے پر وہ کیونکر مامور تھا، ٹھیک طور پر اس کا کسی

کو علم نہ تھا۔ بہرحال یہ سب جانتے تھے کہ اس میں روشن آغا کے ذاتی سیاسی رسوخ کا بڑا حصہ تھا۔ دفتری کام کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا چنانچہ شروع میں کافی محنت سے اسے کام سیکھنا پڑا یہاں تک کہ آہستہ آہستہ وہ اس قابل ہوگیا کہ دن بھر کا کام وقت مقررہ کے اندر ختم کر لیتا۔ اس سے بہرحال اسے کوئی طمانیت حاصل نہ ہوئی اور اس کام میں وہ اپنے لئے کوئی دلچسپی پیدا نہ کر سکا۔ سب سے زیادہ احساس ناکامی اسے یہ تھا کہ باوجود ہزار کوشش کے اپنی شخصیت میں وہ بھاری بھرکم پن' قناعت' شائستگی' مکاری' خودغرضی اور بے غرضی کا ملا جلا انداز پیدا نہ کر سکا جو عموماً پہلے اور دوسرے درجے کے سرکاری اہلکاروں میں پایا جاتا ہے۔ اب آ کے پہلی مرتبہ شدت کے ساتھ اسے احساس ہوا تھا کہ اول اور آخر وہ کسان تھا اور کسان کا بیٹا تھا اور اپنے گاؤں اور زمینوں کی طرف لوٹ جانے کی خواہش نے اس کے اندر مستقل خلش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نئی شخصیت کو اپنانے کی کوشش میں اس نے اپنی قدرتی شخصیت بھی کھودی تھی اور عجیب مضحکہ خیز کردار بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ سادہ لوح دیہاتیوں کی طرح بے تاثر اور صحت مند تھا اور آنکھوں سے سوائے بے کسی اور حماقت کے کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا' جیسے عام مویشیوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں تیزی سے سفید ہوتے ہوئے سر اور سیدھے' مضبوط جسم والے اس شخص کا عمدہ لباس' غیر متوازن چال ڈھال' حماقت زدہ چہرہ اور کام کرنے کا گونگا' بے اثر رویہ دیکھنے والے کے دل میں ترحم کے جذبات پیدا کرتا تھا۔ یوں اس کی حالت کچھ ایسی قابل رحم نہ تھی۔

گھر میں سوائے مطالعے کے اسے کوئی کام نہ تھا۔ عمر بھر کا باغبانی کا شوق آہستہ آہستہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔ گو عذرا اب بھی اسی جوش و خروش سے اسے اپنے لگائے ہوئے پودے دکھاتی' اور کیاریاں جو اس نے تیار کی ہوتیں' اور وہ اس کے ساتھ اسی بے کسی اور وفاداری کے ساتھ پھرتا جس طرح دفتر میں کام کیا کرتا تھا' لیکن سارے دن میں اصل فراغت اور آسودگی وہ اس وقت محسوس کرتا جب اپنے مطالعے کے کمرے میں بند ہو کر کتابیں ٹٹولنا شروع کرتا۔ اس کی لائبریری اردو اور انگریزی زبان کی کئی سو کتابوں پر مشتمل تھی جس کے بنانے میں اس سے زیادہ عذرا نے دلچسپی لی تھی۔ خود عذرا کو پڑھنے کی نہ فرصت تھی (کہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں وہ اس درجہ غرق رہتی تھی) نہ دلچسپی' لیکن نعیم کی خاطر اس نے اپنے مقررہ وظیفے کی مدد سے' جو اسے روشن آغا کی طرف سے ملتا تھا' ہر قسم کی کتابیں فراہم کی تھیں۔ لمبی بیماری کے دوران نعیم کو جو بہت زیادہ سونے کی عادت پڑ چکی تھی اس سے چھٹکارا پانے میں اسے کافی دقت ہوئی۔ اب وہ بہت کم سوتا تھا۔ سرِشام کمرے میں بند ہو کر جو وہ پڑھنا اور تمبا کو پینا شروع کرتا تو رات کا کھانا بھی اکثر وہیں کھاتا اور آدھی رات گزرنے پر سونے کے لئے جاتا۔ اس کو اپنے قریب لیٹتا ہوا محسوس کر کے بہت تھوڑی دیر کے لئے عذرا کی آنکھ کھلتی اور ایک خفیف سی باسی خوشی کی لہر اس کے بدن میں دوڑ جاتی لیکن جلد ہی وہ سو جاتی کیونکہ جس شخص سے اسے گہری محبت تھی اس کی طرف سے اب وہ مطمئن اور لاپرواہ ہوتی جا رہی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ رات کے اس سمے اس کی نیند اڑ جاتی اور پھر وہ سو نہ سکتی۔ تھوڑی دیر تک تاریکی میں انتظار کرتے رہنے کے بعد وہ ایک سکی لے کر اس کے ساتھ لپٹ جاتی اور دیر تک جاگتی رہتی۔ کبھی کبھی

ایسا بھی ہوتا کہ سویرے جب عذرا اٹھتی تو نعیم کو مطالعے کی کرسی پر سویا ہوا پاتی۔ جگانے سے پیشتر وہ دیر تک دروازے میں کھڑی محبت' آزردگی اور ہلکے سے غصے اور نفرت کے ساتھ اسے دیکھتی رہتی۔ لیکن نعیم کے لئے جو ڈاکٹر کی طرف سے صبح سویرے لمبی سیر اور خاص قسم کی ورزش کی ہدایات تھیں ان پر وہ سختی سے عمل کرتی۔

علی الصبح سیر پر جانے والوں کو سڑک کے کنارے کنارے نعیم چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ لنگڑا کر چلتا ہوا ملتا۔ اس کا بازو تھامے ساتھ ساتھ اس کی بیوی چل رہی ہوتی اور نیچی آواز میں کوئی بات کرتی جاتی۔ پھر جب روشن محل والوں کے جاگنے کا وقت ہوتا تو وہ اکثر جو منظر سب سے پہلے دیکھتے وہ نعیم کا ہوتا جو عذرا کی مدد سے مختلف قسم کی ورزشیں بھونڈے پن کے ساتھ کر رہا ہوتا۔ سوائے نجمی کے یہ نظارہ ان میں سے کسی کے لئے کچھ زیادہ خوش کن نہ تھا۔ ان میں سے بعض نے تو اب ارادتاً صبح سویرے مشرقی لان کی طرف دیکھنے سے گریز کرنا شروع کر دیا تھا۔

مطالعے کا شوق نعیم کو ان دنوں ہوا جب وہ بیمار تھا اور کرنے کو اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ سب سے پہلے اس نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ قرآن کے علاوہ اس نے بائبل اور گیتا بھی پڑھی۔ پھر وہ تاریخ کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ تبدیلی کسی طے شدہ پروگرام کے تحت نہ ہوئی بلکہ بالکل لاشعوری طور پر عمل میں آئی۔ ایک روز لیٹے لیٹے یوں ہی اس کا جی چاہا کہ تاریخ کی کوئی کتاب پڑھے۔ ساتھ ہی اس نے سوچا کہ وہ جو مذہب کا مطالعہ اتنے روز سے کر رہا تھا اس سے اس کو کیا حاصل ہوا تھا۔ اس کا ذہن اور روح جس دکھ میں مبتلا تھے اس میں ذرہ برابر کمی تو واقع نہ ہوئی تھی اور اتنا سارا وقت اس نے محض بوڑھا ہونے میں ضائع کر دیا تھا۔ نقصانِ عظیم کا احساس' جو مستقل اس کے ساتھ لگا ہوا تھا' شدید ہو گیا اور اس نے پچھلی تمام کتابوں کو یکسر محو کر دیا۔ اسی طرح تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ ایک موضوع سے مایوس ہو کر دوسرے کی طرف جاتا رہا اور پوری طرح سے کچھ بھی نہ پڑھ سکا۔ ہندوستان اور باقی دنیا کی تاریخ پڑھنے کے بعد اسے سائنس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس میں اسے حساب' طبیعات اور سائنس کی تازہ ترین ایجادات نے بہت متاثر کیا۔ کچھ عرصے تک وہ انتہائی انہماک سے آسان زبان میں لکھی ہوئی انگریزی کی کتابیں پڑھتا رہا۔ لیکن سائنس کا مضمون دلچسپ اور حیرت انگیز ہونے کے باوجود اسے کھوکھلا سا لگا۔ جتنا زیادہ وہ اسے پڑھتا گیا اتنا ہی زیادہ الجھتا گیا۔ سائنس کے مطالعے نے اس میں احساس کمتری پیدا کیا اور ہر نئی چیز پڑھنے پر اسے لگتا کہ جیسے اب تک وہ کچھ بھی نہ جانتا تھا اور محض اس ایک شے کے جاننے پر اب وہ سب کچھ جان گیا ہے۔ اس کے دوسرے دن ہی وہ نئے سرے سے خلا میں بھٹکنا شروع کر دیتا۔ ہر نئے باب کے ساتھ اس کی بے چینی اور ذہنی اور روحانی ناداری کا احساس بڑھتا گیا اور ساتھ ہی سائنس کے مضمون سے اس کی گہری بیزاری میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے باوجود کتنے ہی عرصے تک وہ اسے ترک کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہ کر سکا کیونکہ اس مضمون میں ایک وقتی دلچسپی اور آن بان کا احساس تھا جس سے وہ نجات حاصل نہ کر سکا۔ ہر انسان نہ چاہنے کے باوجود کئی ایک چیزوں میں ان کی خالصتاً خوش کن خصوصیات کے باعث پھنس کر رہ جاتا ہے۔ آخر ایک روز' غیر شعوری طور پر' جیسا کہ اکثر ہوتا ہے' بے حد اکتا کر اس نے اس مضمون کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ اس کے کافی عرصے بعد اس نے ایک

روز سوچا کہ جو کچھ اس نے کیا' یا ہوا' عین مناسب تھا' کیونکہ اسے کسی بات کا بھی جواب نہ مل سکا تھا کہ جو سوالات اور الجھنیں اس کے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھیں ان کا جواب وہاں پر تھا ہی نہیں' کہ سائنس کسی بنیادی سوال کا جواب نہیں دیتی' کہ اس تمام عرصے میں جو ایک دھیمی اور مسلسل آواز ضدی لہجے میں پکارتی رہی تھی: کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟' اس کا جواب وہاں نہیں تھا۔ کسی حد تک اس کا جواب اسے فلسفے میں مل گیا جس کی طرف اب اس نے رجوع کیا تھا' یا کم از کم اس نے یہ سمجھا کہ فلسفہ اس کا جواب ہے۔ فلسفے کی دنیا نے اسے تیزی سے مسحور کیا اور وہ ابتدائی آسان فلسفہ پڑھتے پڑھتے حقیقی دقیق جدید فلسفے تک آ پہنچا۔ فلسفہ سائنس کی طرح دلچسپ اور حیرت انگیز نہ تھا لیکن یہ گہرا' دیرپا اور سکون بخش موضوع تھا۔ سائنس کے مطالعے کے دوران اس میں جو عجلت کا انداز پیدا ہوگیا تھا اب جاتا رہا تھا۔ فلسفے کا ایک صفحہ پڑھ کر اسے کوئی خواہش باقی نہ رہتی اور اس کی طبیعت کی اداسی اور ٹھہراؤ کو تقویت پہنچتی۔ سائنس کے طلسم میں جو جکڑے جانے کا احساس تھا اس سے اب وہ آزاد ہوگیا تھا۔ بعض دفعہ وہ کتاب کھول کر ایک سطر پڑھتا اور آنکھیں بند کر کے تمباکو پینے لگتا۔ وقتی طور پر اسے گہری طمانیت کا احساس ہوتا اور اس کے دل میں کچھ بھی کرنے کی خواہش باقی نہ رہتی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ آنکھیں کھولتا اور بند کر لیتا اور اسے محسوس ہوتا کہ زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے' کوئی کام' کوئی جذبہ' کوئی مصروفیت' کوئی انتظار' کچھ بھی نہیں۔ صرف 'وہ' ہے اور اس کا تمباکو کا پائپ ہے اور لمبی آرام دہ کرسی ہے اور کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں ہیں اور گہری آسودگی' عمیق امن کا احساس ہے۔ بالآخر اس جگہ' اس کمرے میں ہر چیز کا خاتمہ ہے اور آزادی ہے اور وہ خوشی سے ساری عمر بتا سکتا ہے۔ کبھی کبھی وہ چھڑی کے سہارے چلتا ہوا نشست کے کمرے میں جا کر عذرا کے سامنے' جو بیٹھی موزے بُن رہی ہوتی' دیوار کی طرح کھڑا ہو جاتا۔ عذرا کو محسوس ہوتا کہ وہ اس کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے کہ وہ کوئی احمق ہو' یا کوئی بے جان شے ہو جیسے میز یا کرسی' یا شاید کہیں بھی نہیں دیکھ رہا بلکہ سوتے میں چل رہا ہے...... کافی دیر کے بعد وہ چند بار آہستہ آہستہ دہراتا: ''تم جانتی ہو؟ تم جانتی ہو؟'' اس کا لہجہ حیرت ناک طور پر اداس' سرد اور پُرسکون ہوتا۔ عذرا' جو اس کے ساتھ رہنے کی عادی ہو چکی تھی' معمولی انداز میں ہنستی اور کوئی بات کرنے لگتی جس پر وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا یا اس کی بات ادھوری چھوڑ کر واپس چلا جاتا۔

آہستہ آہستہ فلسفے کا اثر بھی زائل ہوگیا جیسے کہ تمام دنیاوی علوم کا اثر انسان کی زندگی میں جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی ضرور زائل ہو جاتا ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ ورق گردانی کرتا اور خاموشی سے' بغیر جانے ہوئے' دل و دماغ کے خالی ہو جانے کا ماتم کرتا رہتا۔ لیکن تمباکو کے دھوئیں اور کتابوں سے بھرے ہوئے اس کمرے سے نکلنا اب اس کے لئے بہت دشوار ہو چکا تھا۔ یہاں آن کر اس کو محسوس ہوتا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔ ان کتابوں کی' لیمپ کی' میز اور کرسی کی' تمباکو کے ڈبے کی' کسی بھی شے کی نہیں۔ یہاں پر وہ اپنے حقیقی ننگے وجود میں آ جاتا اور اپنے آس پاس کی ہر شے کے ساتھ پرانے سادہ دل دوستوں کی طرح ملتا جن کے ساتھ آپ مکمل بے نیاز اور بے زار طور پر رہ سکتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اس کے لئے ہر قسم کی آزادی کی' ہر چیز کے خاتمے کی ایک نئی علامت بن چکا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ گھر سے باہر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی سہارے کی تلاش میں رہتا۔ مگر چونکہ وہ ایک بوڑھے ہوتے ہوئے' اُکتائے ہوئے آدمی کی طرح روحانی طور پر منکسر لیکن ذہنی طور پر پُرتکبر تھا اس لئے بہت کم لوگوں سے مرعوب ہوتا' اور جو لوگ اسے مرعوب کرتے ایک حاسدانہ جذبے کے زیر اثر وہ شاذ و نادر ہی ان کے قریب ہو سکتا۔ ان دنوں اس تنہا صورت انسان پر ابتلا کا یہ دور آیا تھا۔

صرف پارلیمنٹری سیکرٹری انیس الرحمان ایک ایسا شخص تھا دفتر بھر میں جس کے ساتھ نعیم کو دلچسپی تھی۔ وہ عمر میں نعیم سے چند برس بڑا چھوٹے قد کا تنومند آدمی تھا۔ اس کے گال اگر اتنے پھولے ہوئے' گردن اتنی موٹی اور بال ماتھے پر بہت نیچے تک اگے ہوئے نہ ہوتے تو خوبصورت کہلایا جاسکتا تھا۔ پچاس برس کے لگ بھگ ہونے کے باوجود اس کے بال بے حد سیاہ اور کھردرے تھے اور تیز ذہین آنکھیں گوشت کی فراوانی کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جن پر وہ سنہرے فریم کا نازک سا چشمہ لگائے رکھتا تھا۔ وہ جنگلی بھینسے کی سی پھرتی اور قوت کے ساتھ چلتا پھرتا تھا اور جب جوش میں ہوتا تو اس کے بازوؤں اور گردن کے بال کھڑے ہو جایا کرتے۔ کسی نے اسے کبھی سست یا بیکار بیٹھے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ دفتر کا کام وہ پلک جھپکنے میں ختم کر لیتا اور پھر اپنے دوستوں کو خط لکھتا یا فون پر اپنی بیوی سے باتیں کرتا رہتا۔ جب کوئی کام نہ ہوتا تو اٹھ کر دفتر میں چکر لگانے لگتا اور ہر ایک سے ایک ساتھ باتیں کرتا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کو کسی سے شخصی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کسی کی خیریت دریافت کرتا یا کسی سے ہمدردی کی باتیں کرتا تو محض اپنے آپ کو مصروف رکھنے یا فالتو قوت کو صرف کرنے کی خاطر کرتا۔ ضروری نہیں کہ یہ بات صحیح ہو لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے دوسروں کو ایسا خیال ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے اس سے ڈرتے ضرور تھے' شاید حاسدانہ عزت بھی کرتے تھے' پر محبت نہ کر سکتے تھے۔ اس کا سب کو علم تھا۔ اس کے باوجود' نمایاں طور پر کوشش کئے بغیر وہ شخص جس حلقے میں گھومتا' جس محفل میں موجود ہوتا سب پر غلبہ کئے رہتا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے پاس ہر بات کا' ہر واقعے کا نہایت دانشمندانہ اور صحیح جواب موجود تھا۔ اس کے انداز کے غیر شخصی پن کے باوجود ایک عجیب طرح کی گرمی اور مٹھاس تھی جو لوگوں کو اس سے ڈرنے' اس کی عزت کرنے اور اس سے مرعوب ہونے پر مجبور کرتی تھی۔ جب وہ باتیں کر رہا ہوتا تو اس کی تیز آنکھوں اور ہاتھوں کی جنبش سے ایک سحر سا پیدا ہو جاتا جو وقتی طور پر بہت طاقتور ہوتا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جن کے جانے کے بعد دیر تک آپ ان کے متعلق سوچتے رہتے ہیں' مگر وہ جتنا عرصہ موجود رہتا آپ اس کے سحر میں مبتلا رہتے تھے اور اس کے مقابلے میں اپنی کم تر حیثیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

دو ایک بار نعیم اس کے گھر پر بھی گیا جہاں اس کی بیوی اس کی پہلی بیویوں کے دو بچوں کی نگہداشت کرتی تھی۔ بلقیس بمشکل پچیس برس کی صحت مند اور خوش مزاج لڑکی تھی اور اس کی تیسری بیوی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی نعیم کو علم ہو گیا کہ وہ معمولی پڑھی لکھی خوش شکل لڑکی عمر کے تفاوت کے باوجود اپنے خاوند سے مکمل طور پر خوش تھی اور بہت سلیقے سے گھر اور بچوں کو صاف ستھرا رکھتی تھی۔ زندگی کی طرف اس کا ایک صحت مند' عامیانہ رویہ تھا۔ وہ بہرحال

ایسی عورت نہ تھی جس سے نعیم متاثر ہو سکتا چنانچہ اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بلقیس نے بھی اس سفید بالوں والے' ادھ گنجے اور چھڑی کے سہارے لنگڑا کر چلتے ہوئے غیر دلچسپ آدمی کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔

(۴۱)

شروع جاڑوں کے دن تھے جب نعیم انیس الرحمان اور اس کے گھر والوں کے ساتھ مچھلی کے شکار کو گیا۔ انیس الرحمان باقاعدگی کے ساتھ ہر دوسرے ہفتے بیوی بچوں کو لے کر شہر سے بیس میل دور مچھلی کے شکار کو جاتا جہاں دریا کے کنارے اس کی ایک مختصر سی کوٹھی اور ایک موٹر بوٹ تھی۔ آموں کے باغ میں گھری ہوئی وہ چھوٹی سی مغربی وضع کی کوٹھی ٹھنڈی اور پُرسکون تھی۔ یہاں پہنچ کر نعیم کے دل میں ہلکی سی بے چینی پیدا ہوئی۔ وہ بے نام سی کسک جو کھوئے ہوئے سکون کی نشان دہی کرتی ہے اور جس کے مٹے ہوئے نقوش کبھی کبھار دل پر ابھر کر انسانی تلاش کی علامت بن جاتے ہیں۔ اس کا گاؤں اور بڑے بڑے گھنے پیڑوں والا باغ اور نمدار سیاہ زمین جس کی ٹھنڈک میں متلاشی آنکھوں اور تھکے ہوئے دلوں کے سارے جذبے پھلتے پھولتے اور پرورش پاتے ہیں' جیسے پھول اور پودے اور سرسبز گھاس' اور جہاں پر ہر انتظار اور ہر تلاش ختم ہو جاتی ہے...... ہفتے کی شام کو جب وہ وہاں پہنچے تو کھانا کھانے سے پیشتر انیس الرحمان نعیم کو کوٹھی دکھانے کی غرض سے باہر لے گیا۔ آموں کے پیڑوں کے علاوہ وہ گھاس کے ایک قطعے میں' جو بیٹھنے کے لئے مخصوص تھا' سرو کے درخت کھڑے تھے۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ یوکلپٹس کا درخت بھی نظر آ جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی روشیں نہایت سیدھی اور صاف تھیں اور کہیں کہیں گملے رکھے ہوئے تھے۔ پچھواڑے کی طرف اونچا سا کھجور کا درخت اکیلا کھڑا تھا جس کے نیچے کوٹھی کے رکھوالے کا گھر تھا۔ درخت کے ساتھ انیس الرحمان کا گھوڑا بندھا تھا جو انہیں دیکھ کر ہنہنایا۔ نعیم نے پسندیدگی سے اصیل النسل جانور کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس کی تعریف کی۔ واپس آتے ہوئے وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا: ''مجھے یقین تھا یہاں آ کر مجھے خوشی ہوگی' اسی لئے ...... میں اسی لئے......'' اس نے چونک کر انیس کی طرف دیکھا' پھر ہاتھ اٹھا کر ہتھیلی پر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''اکیلا ہی آیا۔''

انیس الرحمان اپنے تندہی کے انداز میں ہنسا جس سے اس کی نازک سنہری عینک ناک سے اوپر اٹھ گئی۔

''یہاں آ کر مجھے سکون ملتا ہے۔ میں جب پہلی بار سر لارنس کے ساتھ یہاں آیا تو اسی روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک نہ ایک روز میں اس جگہ کو ضرور خریدوں گا۔ مجھے علم تھا تم یہاں آ کر خوش ہو گے۔ تم شہر کے باسی نہیں ہو۔ میں جانتا ہوں۔''

''ہاں۔'' نعیم نے کہا۔

صبح سویرے وہ اور اس کا میزبان مچھلی کے شکار کا سامان اٹھا کر دریا کی سمت روانہ ہوئے۔ خزاں کا موسم تھا اور صبح کی ہوا میں شیشم کے درختوں کے خشک پتے کھڑ کھڑا کر گر رہے تھے۔ رستے میں انہیں ساتھ والے گاؤں

کے کچھ لوگ صبح کی سیر اور رفع حاجت کے لئے جاتے ہوئے ملے۔ آگے چند جھونپڑیاں آئیں جن میں قحط زدہ بنگالی کنبے، جو روٹی کی تلاش میں وطن سے ہجرت کر آئے تھے، پناہ گزین تھے۔ اِکا دُکا کسان بیلوں کی جوڑیاں لئے ہل چلانے کے واسطے جا رہے تھے۔ دونوں شکاری مقررہ جگہ پر پہنچ کر رک گئے۔ اس جگہ شیشم کے درختوں کا بہت بڑا جھنڈ تھا اور نیچے دریا کے کنارے کے پتھر زرد اور قرمزی رنگ کے پتوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے شانوں پر سے تھیلے اتار کر نیچے رکھے اور ڈوریاں اور چھڑیاں تیار کرنے لگے۔

''مچھلی کا شکار تمہارے لئے بہت موزوں ہے۔'' انیس الرحمان نے کہا اور اس کو اس جگہ کی خصوصیت بتانے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس جگہ پر درخت اس طور سے اگے تھے کہ سارا دن ان پر دھوپ نہ پڑ سکتی تھی اور کنارے کے مخصوص کٹاؤ کی وجہ سے اس جگہ دریا ایک چھوٹے سے تالاب کی شکل اختیار کر گیا تھا جس میں مچھلیاں کثرت سے ملتی تھیں۔ پھر جب انہوں نے چھڑیاں اور ڈوریاں تیار کرلیں تو وہ دیر تک نعیم کو ڈوری پھینکنے اور کھینچنے کا صحیح طریقہ سمجھاتا اور مشق کراتا رہا۔ جب سورج ایک نیزہ پر آ گیا تو وہ اپنی اپنی ڈوریاں پھینک کر سکون سے بیٹھ چکے تھے اور انیس نعیم کو ایک فالتو کنڈی پر کیڑا پھنسا کر صحیح Bait لگانے کا طریقہ بتا رہا تھا۔ جب یہ موضوع بھی ختم ہو گیا تو وہ نیچی آواز میں، جو کہ مچھلیوں تک نہ پہنچ سکتی تھی، اسے اس دریا میں پائی جانے والی مختلف اقسام کی مچھلیوں کی بابت بتانے لگا۔

اب دریا کی سطح پر دھوپ ان کے قریب آ رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی چمکیلی مچھلی ہوا میں چھوٹی سی چھلانگ لگا کر غائب ہو جاتی۔ دریائی ہوا کے زور سے شیشم کے پتے ان کے سروں پر اور آس پاس ساری جگہوں پر گر رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ملا ہوا دریا کے بہنے کا اور آبی پرندوں کا شور تھا۔ دونوں مردوں کی ڈوریوں کے ناڑ پانی کی سطح پر ڈول رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی شرارتی مچھلی راستہ گزرتی ہوئی کنڈی پر منہ مار جاتی۔ بڑی مچھلی ابھی تک کوئی نہ لگی تھی۔

نعیم نے پائپ ہونٹوں سے جدا کیا اور سطح آب پر سے نظر اٹھا کر پہلی بار بات کی:

''تم نے انہیں دیکھا۔ وہاں۔'' اس نے سر سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

انیس نے غور سے اسے دیکھا اور کندھے اچکا کر بولا: ''اوہ...... بنگال۔ تمہیں پتا ہے۔ بنگال۔''

نعیم پھر سطحِ آب پر دیکھ رہا تھا۔ انیس ایڑیاں اٹھا کر اپنے بیوی بچوں کی راہ دیکھنے لگا جو ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ پھر وہ نعیم کو دوسری ڈوری کا خیال رکھنے کے لئے کہہ کر کنارے کنارے چلتا ہوا دور تک چلا گیا۔

جب وہ واپس آیا تو نعیم اسی طرح بیٹھا تھا اور ایک کوا کیڑوں کے ڈبے میں چونچ مار رہا تھا۔ انیس کو اپنے قریب کھڑا پا کر نظر اٹھائے بغیر وہ بولا:

''انیس، مصیبتیں کیوں نازل ہوتی ہیں؟''

انیس اداسی سے مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

''انسانوں پر ظلم کیوں ہوتے ہیں؟'' نعیم تیزی سے بول اٹھا۔ ''انصاف کیوں نہیں ہوتا؟ انصاف کدھر گیا؟''
چند لمحے تک ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ نظریں پھیر لیں۔ نعیم کا ناڑ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے ڈوری کھینچ کر مچھلی کو باہر نکالا۔ یہ ایک فٹ لمبی پتلی سی راکھ کے رنگ کی مچھلی تھی۔ نعیم کو ایک ہاتھ کی مدد سے کنڈی سے مچھلی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر انیس الرحمان نے ڈوری اس کے ہاتھ سے لے لی اور آہستہ سے مچھلی کو الگ کر دیا' پھر کنڈی پر نیا کیکڑا لگا کر اسے پانی میں پھینکتے ہوئے وہ لاتعلق انداز میں بنگال کے قحط کی باتیں کرنے لگا۔

نعیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کیا: ''مصیبتیں کیوں نازل ہوتی ہیں؟'' اس نے ضدی لہجے میں کہا۔
ایک لمحہ رکنے کے بعد انیس الرحمان تیزی سے' انہماک سے' جذبے سے بولنے لگا:

''میں بھی اسی طرح سوچتا ہوں۔ اسی طرح ایک وقت تھا جب میرا خیال تھا کہ مصیبتیں برے آدمیوں کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں اور ایک سادہ سے اصول کے مطابق گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مگر اصول؟ اصول کیا چیز ہیں؟ مجھے پتا چلا کہ وہ عقلمندی کی باتیں جو میں نے لڑکپن اور جوانی میں سیکھیں' وہ سارے زریں اقوال ...... کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر ہمیں بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق ہی زندگی بسر کرنا ہے تو پھر خدا بیچ میں کہاں آتا ہے؟ پھر اس میں 'وہ' کہاں آتا ہے۔'' وہ رُکا۔ ''نعیم تم وہاں نہیں تھے۔ تم نے صرف ان کو دیکھا ہے جو زندہ ہیں' ان کو نہیں دیکھا جو مر رہے ہیں۔ میں ابھی وہاں سے لوٹا ہوں۔ تمہیں پتا ہے وہاں کیا ہو رہا ہے! جوان اور بوڑھے اور بچے' چھوٹے اور بڑے' بھیک مانگ رہے ہیں۔ اچھے اور برے سب بھکاری ہو گئے ہیں۔ ہر کوئی خوراک کے لئے زندہ ہے یا خوراک کے لئے مر رہا ہے۔ مٹھی بھر چاولوں کے لئے یا چاولوں کے پانی کے لئے۔ وہ اتنے سے چاولوں کے باعث مر رہے ہیں یا امیر ہو رہے ہیں۔ یہ وہ وقت آیا ہے جب شدید انسانی کیفیات زندگی میں داخل ہو کر عام حالات کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر تمہارے پاس کچھ نہیں ہے تو بھیک مانگو گے' اگر کچھ ہے تو اسے بیچ کر امیر بن جاؤ گے۔ زندگی بہر حال تھوڑے سے اناج پر منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔ اب یہاں سے ایک سادہ سا اصول بنا لینا نہایت آسان ہے۔ کہ 'زندگی مختلف اور متضاد حالات کے پیش نظر بے حد عزیز اور بامعنی اور پھر بے حد سستی اور بے معنی ہو سکتی ہے۔' اللہ اللہ خیر سلا۔ آپ نے اصول بنا لیا اور مطمئن ہو گئے۔ پر میں نہیں۔ میں پوچھتا ہوں انصاف کہاں گیا؟ انصاف' جو ہم نے صدیوں کے الٹ پھیر سے سیکھا ہے۔ جنگوں اور وباؤں اور قحطوں اور زلزلوں اور دوسری آسمانی بلاؤں کے بعد سیکھا ہے۔ کیا آپ اس سے کوئی خاص اصول وضع کر سکتے ہیں؟ کوئی ضابطہ؟ کوئی ''پیٹرن'' یا گزشتہ زمانوں سے حاصل کئے ہوئے تمام انسانی علم' تمام انسانی دکھ کا کوئی 'پیٹرن؟' ہیں آج اس بات کا علم ہے کہ یہ لمبی چوڑی اور انتہائی متضاد اور منتشر آفتیں تھیں جو ہم پر اور ہمارے آباؤ اجداد پر نازل ہوئیں۔ ہم نے ان سے سوائے زریں اقوال کے کیا حاصل کیا ہے۔ سنہری اصول۔'' وہ طنز سے ہنسا۔ ''جو انسانی مشاہدے کی ایک بے حد سطحی کاوش ہیں' کسی چیز سے بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ دودھ کے گلاسوں سے' یا ٹوٹی پھوٹی موٹر گاڑیوں سے یا

آدمی اور بھینس کی باہم لڑائی سے بھی...... مثلاً یہ کہ ''اے انسانو' بھینسوں سے مت لڑو۔' دوسرے لفظوں میں سنہری اصول انتہائی متضاد واقعات سے بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں' لیکن کیا ہم اتضاد سے انصاف حاصل کر سکتے ہیں؟ یا انصاف کی کوئی صورت ہی؟ جب کہ اصول' جو کہ ایک سطحی اور بے بس مشاہدے کا نتیجہ ہیں' متضاد اور منتشر ہونے کے باوجود ایک ہی عنوان کے تحت ترتیب دیئے جا سکتے ہیں' انصاف کے ساتھ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اثر براہ راست اور گہرا ہے۔ اصول ایک بے بسی کا علم ہیں جن کا ہماری زندگیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک کتاب کی طرح۔ آپ کے اختیار میں ہے کہ پڑھ کر اس سے مستفید ہوں' یا اسے اٹھا کر شروع سے آخر تک پڑھیں اور بھول جائیں' یا پھر اسے ہاتھ تک نہ لگائیں اور میز پر محض گرد کے نیچے دبنے اور گلنے سڑنے کے لئے چھوڑ دیں...... انصاف کے ساتھ بھی آپ ایسا برتاؤ کر سکتے ہیں؟ نہیں۔ یہ میرے یا آپ کے انتخاب کی بات نہیں ہے' یہ میری یا آپ کی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ انصاف دوسری آسمانی آفتوں کی طرح ہم پر عائد کیا جاتا ہے اور ہمارا مقدر بن جاتا ہے۔ یہ تمام انسانی تاریخ' تمام انسانی دکھ پر حاوی ہے۔ پھر کیوں' میں پوچھتا ہوں کیوں' جبکہ آسمانی انصاف کا کوئی 'پیٹرن' نہیں ہے تو کیوں ہم انسانوں کے انصاف کی تائید کریں؟ جنگوں اور قحطوں اور وباؤں میں انصاف کہاں تھا؟ ہم کیسے انسانوں کی 'زندگیوں' پر حکومت کرنے کے لئے اصول وضع کر سکتے ہیں جبکہ انسانوں کے 'مقدر' کے لئے کوئی اصول نہیں ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ چند بے روح' مردہ دل' یاسیت پرست اور بیمار پڑے لکھے لوگوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی زندگیوں کا فیصلہ کرنے بیٹھ جائے جبکہ وہ خود اپنے مستقبل اور اپنے انجام کے متعلق بے خبر اور بے بس ہیں اور ان قوتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے جن کے ہاتھ میں ان کا خاتمہ ہے۔ تم نے ان لوگوں کی بے بسی دیکھی ہے جب وہ جنگ یا قحط کے دوران اپنے قانون چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک شخص کو بھی مرنے سے' ختم ہونے سے نہیں بچا سکتے مگر اپنی بدنما شان وشوکت کے ساتھ' چہروں پر مصنوعی سکون طاری کئے' کاغذوں اور دفتر کی میزوں کے ساتھ اپنا پیشہ جاری رکھتے ہیں۔ جب وہ معصوم انسانوں کو موت سے نہیں بچا سکتے تو اپنے قلم' کاغذ اور دفتر کے فرنیچر کو بچانے کی جان توڑ کوشش کرنے لگتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ نالائق ہیں؟ نہیں۔ اس سار وقت میں انہیں مستقل اپنے کام کی بے اثر اور نفرت انگیز نوعیت کا علم رہتا ہے۔ وہ نالائق نہیں ہیں' نا اہل ہیں۔ صاف صاف نا اہل۔''

وہ چشمہ اتار کر شیشے صاف کرنے لگا۔ بلقیس اس دوران میں اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ انیس عجیب سی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے اس طرح اپنی طرف تکتے ہوئے پا کر وہ خاموشی سے مڑ کر اس طرف کو چلی گئی جدھر اس کے دونوں بچے پایاب پانی میں کھڑے ململ کا دوپٹہ ڈبو ڈبو کر مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ جب دوبارہ چشمہ چڑھا کر وہ بولا تو اس کی آواز گہری اور اداس تھی۔

''یا شاید نا اہل بھی نہیں ہیں' صرف احمق ہیں۔ احمق۔ کیونکہ پھر میں نے انہی آدمیوں کو مضحکہ خیز طور پر مرتے ہوئے دیکھا۔ وباؤں میں اور۔ وہ اپنے انصاف کے قوانین یہیں پر چھوڑ کر بے بس' بے کس لوگوں کی طرح مر گئے' اس قوت کے زیر اثر جو ان کے انصاف کے قوانین کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ اس کا اپنا انصاف ہے۔ یہ وہی

بے معنی موت تھی جو ہر کسی کو آتی ہے۔ وہی بے کسی کی موت جو کتے کو آتی ہے۔ قوانین دو بار مرتے ہیں۔ بہتر موت ان کے لئے وہ ہے جب وہ غلط ثابت ہوتے ہیں اور بدل دیئے جاتے ہیں' ہر زمانے میں۔ اور بدتر موت ان کے لئے وہ ہوتی ہے جب کہ وہ ابھی لاگو ہوتے ہیں اور ان کی نفی کی جاتی ہے' زلزلوں وباؤں جنگوں کی مدد سے۔ جب آفتیں نازل ہو کر مکمل طور پر ان کی نفی کرتی اور تمام انسانی زندگی کو ابدی طور پر بے معنی ثابت کرتی ہیں۔ وبا کے بعد اگر ایک شہر میں سو یا دو سو آدمی بچ جاتے ہیں تو کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ زندگی کی نشانی ہے؟ یہ موت ہے۔ ایک انسان کی موت سب کی موت ہے کیونکہ زندگی یکساں ہے اور موت بہرحال موجود ہے' تمہاری یا میری یا میرے بچوں کی' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میں تمہیں قتل کرتا ہوں تو پھانسی پر چڑھوں گا' نہیں کرتا تو قحط میں مروں گا یا جنگ میں یا کسی گلی یا ہسپتال میں ہی مر جاؤں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے؟''

نعیم نے بے خود ہو کر نفی میں سر ہلایا۔ انیس الرحمان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور وہ نعیم کی طرف جھک کر بولا: ''یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ اگر کوئی فرق نہیں پڑتا تو انصاف کہاں گیا؟ یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ تم نے انصاف کے متعلق پوچھا تھا نا۔ یہی تو میں بھی پوچھتا ہوں۔ یہی تو......''

وہ شور سن کر رک گیا۔ بلقیس اور بچوں نے جو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے تھے' کپڑے کی مدد سے ایک خاصی بڑی مچھلی پکڑ لی تھی۔ بلقیس پونچھ کی طرف سے تڑپتی ہوئی مچھلی کو پکڑے کھڑی تھی اور بچے تالیاں بجا رہے تھے۔ اس نے جب دونوں مردوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسی اور مچھلی انہیں دکھا کر تالیاں بجانے لگی۔ انیس الرحمان اٹھا اور نعیم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے کشتی کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ انیس کی ڈوری کے ساتھ مچھلی لگی لیکن وہاں اب کوئی نہ تھا۔ بلقیس کمر پر ہاتھ رکھے غصے سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

کشتی میں بیٹھ کر انیس نے انجن چلایا اور رخ بہاؤ کی مخالف سمت کا کر لیا۔ انجن کی آواز سے دریا میں بیٹھے ہوئے پتلی پتلی ٹانگوں والے ہلکے پھلکے سفید پرندے مچھلیوں کا ناشتہ چھوڑ کر اڑے اور آبی آوازوں میں شور مچانے لگے۔ پانی بارشوں کی وجہ سے گدلا ہو رہا تھا اور اس پر دھوپ پھیل چکی تھی۔ سطح آب کو کاٹتے اور چھینٹے اڑاتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ چند دوسری کشتیوں کے قریب سے گزرے جن میں سیاہ بدن مچھیرے کھڑے خاموشی سے جال پھینک رہے تھے۔ دور سے کشتی کے انجن کی آواز سن کر انہوں نے خفگی سے سر اٹھایا لیکن جب وہ قریب سے گزرے تو انیس الرحمان کو پہچان کر جھک کر سلام کرنے لگے جسے اس نے نہ دیکھا' صرف نعیم نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ ان کی مچھلیاں بھاگ گئی تھیں مگر وہ مرعوب ہو چکے تھے۔ سالہا سال کی افتاد نے اسی صورت میں انہیں زندہ رہنے کے اہل بنا دیا تھا۔

چند میل اوپر جا کر اس نے انجن بند کر دیا اور کشتی کو دھارے کے ساتھ بہنے کے لئے چھوڑ دیا۔ پھر وہ اٹھ کر نعیم کے قریب آ بیٹھا۔

''دراصل 'وہ' کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ صرف ہمارے یہاں پر ہے۔'' اس نے چاروں انگلیوں سے اپنے سر کو ٹھونکا۔ ''یہاں...... اور یہاں پر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہاں عقل کو ہونا چاہیے۔''

نعیم حیرت اور افسردگی سے اسے دیکھتا رہا۔

''جانتے ہو ہم نے خدا کو کیوں ایجاد کیا ہے؟ اپنے آرام کی خاطر۔ کیونکہ ہم سوچنا نہیں چاہتے' اور سچائی کی تلاش میں سوچنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے' فصل کاٹنے اور بچہ جننے سے بھی زیادہ مشکل۔ ہم سہل پسند ہیں کیونکہ ہم اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہے۔ ہم احمق ہیں۔ احمق دنیا بھر کی کتابیں پڑھ کے تم سمجھتے ہو کہ عالم بن گئے ہو۔ ٹھیک ہے کہ تم نے افلاطون کے برابر علم حاصل کیا اور جاہل نہیں رہے۔ لیکن کیا یہ کافی ہے؟ دنیا کے زیادہ تر عالموں نے کتابیں پڑھتے اور لکھتے ہوئے زندگیاں گزاریں۔ ان میں اور اس طوطے میں جو 'میاں مٹھو' 'میاں مٹھو' کہہ کر زندگی بسر کرتا ہے کوئی فرق نہیں کیونکہ عام طوطوں میں وہ بھی عالم طوطا ہوتا ہے۔ مجھے طوطوں کے متعلق زیادہ علم نہیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ کچھ لوگ آئیں گے' آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں' جو ان سب لوگوں کا بیزاری اور حقارت کے ساتھ ذکر کریں گے اور اپنے زمانے کے لوگوں کو محض سوچنے کی تلقین کریں گے۔ محض سمجھنے کی۔ تم کچھ بھی نہیں 'سمجھ' سکتے اس لیے کہ تم عالم ہو' کہ تم جاہل نہیں ہو' کہ تم احمق ہو۔ ہم میں ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہی ہے۔ تم بھی اور میں بھی۔'' وہ اٹھ کر انجن کے پاس گیا اور جھک کر اسے سٹارٹ کرنے لگا۔ پھر گیئر میں ڈالے بغیر اسے چلتا رہنے دیا۔ ایک آبی پرندہ پتھر کی طرح پانی کی سطح پر گرا اور مچھلی دبوچ کر اس طرح بھاگا جیسے کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہو۔

''اس کی آواز سن رہے ہو؟'' انیس نے انجن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''کیا تمہیں کسی اور شخص کی ضرورت ہے جو آکر یہ بتائے کہ انجن چل رہا ہے۔ یا اس کشتی کے پیندے میں چھید ہو جائے اور پانی اندر آنے لگے تو کیا تم بیٹھ کر انتظار کرتے رہو گے کہ کوئی دوسرا تمہیں آکر بتائے کہ تم ڈوب رہے ہو؟'' وہ رکا۔ ''نہیں؟ ٹھیک۔ تو پھر 'اس' کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے جو مدرسہ جاری کیا ہے مذہب' اس سے کیا حاصل؟ دنیا کے تمام مذہب محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ ہنہہ! پر ہوتا کیا ہے۔ جونہی آپ ایک مذہب کو اپنا لیتے ہیں آپ کے دل میں نفرت کا' تعصب کا بیج بویا جاتا ہے' دوسرے مذہب کے خلاف' دوسرے تمام مذاہب کے خلاف' ان تمام ان گنت فرقوں کے خلاف جن میں آپ شامل نہیں ہیں۔ محبت کے تمام پرچار کے باوجود اس وقت خود بخود ہماری عقل سلب ہو جاتی ہے اور ہم دنیا کے سب سے مطمئن انسان بن جاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے زندگی کا سب سے تسکین بخش جذبہ کون سا ہے؟ حماقت کا! احمق بن کر' زندگی کی بنیادی ضرورت کے متعلق سوچنا چھوڑ کر ہم اتنی تسکین حاصل کرتے ہیں جتنی مالکونس راگ سن کر بھی نہیں کرتے۔ مگر اطمینان کہاں ہے؟ اسے کون جانتا ہے؟ ذہن انسانی کے سب سے بڑے کرب آلود سوال کا جواب ہم اپنے بڑے بوڑھوں سے حاصل کر لیتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ ہم سب سے زیادہ عمر رسیدہ ہیں؟ ہاں' محض اس لیے! 'محض' اس لئے!! ہم بڑے بوڑھوں کو اپنا رہنما بنا لیتے ہیں اور ان کے

نقش قدم پر چلتے ہیں، محض اس لئے کہ وہ بڑے بوڑھے ہیں، یا اس لئے کہ وہ ہمیں عقل کے استعمال سے نجات دلاتے ہیں۔ ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ کیا ہیں۔ وہ ہم سے بڑے احمق ہیں کیونکہ انہوں نے زندگی بھر حماقت کی ہے اور اس کا علم رکھتے ہیں اور اسے ماننے پر تیار نہیں ہیں، کیونکہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور بڑھاپا ہمیں مایوس کر دیتا ہے اور مایوس انسان پُر تعصب اور نادار ہوتا ہے۔ میں نے موت کی آمد کو محسوس کیا ہے، اور میں سچ کہتا ہوں نعیم، اپنے آپ کو موت کی طرف پابجولاں بڑھتے ہوئے پا کر انسان اپنے آپ کو از حد احمق اور بدھو محسوس کرتا ہے کیونکہ موت اس کی شکست ہے اور اس سے پیشتر وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے لیکن تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کبھی تسلیم نہیں کرتا۔'' اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''کیا صرف محبت کافی نہیں ہے، نعیم؟ اس گروہ بندی کے بغیر۔ صرف محبت، جو ایک آفاقی جذبہ ہے، کیا ہماری روح کو اس کے علاوہ کسی اور شے کی بھی ضرورت ہے؟ ہم جو سینکڑوں برسوں سے ایک دوسرے کے مذہب کو کوستے آئے ہیں، ایک دوسرے کے خداؤں کو نالائق کہتے آئے ہیں اور اسی سانس میں محبت کا پرچار کرتے رہے ہیں، کیا یہ ہماری کم عقلی ہے؟ نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں۔ یہ ہماری وہ مایوسی ہے جو انسان کو ضدی اور کج بحث بنا دیتی ہے۔ ہم کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ ہم میں سے ہر ایک قحطوں اور وباؤں میں عدالت لگانے والے ان ججوں کی طرح ہے جو جانتے ہیں کہ وہ بوڑھے اور ناکارہ اور بے اثر ہو چکے ہیں لیکن اپنی غلطیوں کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں، کیونکہ ہم نے ایک زندگی گزاری ہے اور اس کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے، اور جب اسے اسی طرح اپنے بچوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں تو ہماری آخری شکست میں بھی تسکین کی اچھی خاصی صورت نکل آتی ہے۔'' وہ پھر خاموشی سے جال پھینکتے ہوئے ملاحوں کے قریب سے گزر رہے تھے۔ چند لمحے تک رکنے کے بعد انیس الرحمان نے پھر اپنے مخصوص انداز میں تیزی اور جوش کے ساتھ بولنا شروع کر دیا: ''تمہیں پتا ہے جب سے منظم مذہب کی بنیاد پڑی ہے اسے کتنی بار ناجائز طور پر استعمال کیا گیا ہے؟ مذہب ہماری عقل کے راستے سے دل تک پہنچتا ہے اور وہاں اپنا قبضہ جمالیتا ہے۔ اسے کتنی آسانی کے ساتھ بھڑکایا جا سکتا ہے۔ آج تک کتنی جنگیں مذہب کے نام پر ہوئی ہیں، کتنے قحط پڑے ہیں؟ کیا صرف اس لئے کہ مذہب ہمیں محبت کرنا سکھاتا ہے۔ ہنہہ۔'' وہ نعیم کی طرف جھکا۔ ''ایک شئے ہے عقل سلیم۔ کیا اسے بھی بھڑکایا جا سکتا ہے؟ کیا ہم ایسی سوسائٹی نہیں بنا سکتے جس کی بنیاد عقل سلیم پر رکھی گئی ہو، جس میں ہم اپنے ہر اچھے برے فعل کے لئے سوچیں اور فیصلہ کریں اور اس کے ذمہ دار ہوں؟ اچھائی اور برائی، غلط اور صحیح کا ایک عالمی معیار ہے جو انسانی عقل کے مطابق ایک سا ہے۔ ایک فعل، ایک قدم، ایک بات اگر اچھی ہے تو وہ مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب میں ہر جگہ اچھی اور درست ہے کیونکہ عقل سلیم نے اس کا فیصلہ کیا ہے اور عقل سلیم ہم سب میں ایک سی ہے۔ ضرورت مند کی مدد کرنا درست ہے، میرے لئے اور تمہارے لئے اور سب کے لئے، تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟ میرے مذہب میں ہمسائے سے محبت کرنا درست ہے، میرے ہمسائے کے مذہب میں ایسا کرنا غلط ہے۔ لیکن میری اور تمہاری اور میرے ہمسائے کی عقل سلیم کے مطابق یہ درست ہے اور بالکل درست ہے۔ جب ہر کوئی اپنے لئے سوچے گا

تو درست درست ہوگا اور غلط غلط ۔ 'ہم سب' اور 'ہم سب' یہ جانتے ہیں کہ باغبانی کرنا درست ہے اور کاہلی اور آرام طلبی نادرست۔ کیا صحیح فعل کے لئے ہمیں کسی اور شے کی ضرورت ہے؟ کیا ہم سب کے لئے میٹھا میٹھا اور کڑوا کڑوا نہیں ہے؟ ہے تو کیوں؟ اس لئے کہ ہماری حس پر کوئی بندش نہیں ہے۔ جب ہماری عقل صحیح سالم ہوگی اور اسے کام میں لایا جائے گا تو ایک فعل کی نوعیت ہم سب کے لئے یکساں ہوگی' اس میں کوئی تضاد نہ ہوگا اور اس سے کبھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جاسکے گا۔ اس پر کوئی جنگ نہ ہوگی۔ آج ہماری سوسائٹی میں یہی خلا کافی ہے کہ ہم سوچنے سے معذور ہیں۔ جب ہر کوئی اپنے لئے سوچے گا تو مجلس بھرپور ہوگی' تب کوئی حماقت باقی نہ رہے گی' کوئی شکست باقی نہ رہے گی تب ......'' وہ الفاظ کی تلاش سے ہار کر خاموش ہوگیا۔

''لیکن اس سے ...... فائدہ کیا ہوگا؟'' نعیم نے بغور سنتے ہوئے سوال کیا۔

انیس الرحمان کی آنکھوں میں قدیم' قدرتی ذہانت کی چمک عود کر آئی: ''یہی تو ہماری شکست ہے عزیز دوست۔ برسوں بلکہ صدیوں کی ناکارہ تربیت نے ہمارے اندر نفع و نقصان کا ایک تباہ کن احساس پیدا کردیا ہے اور اس سے بھی زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ یہ احساس انجانے طور پر ہمارے خدا کے ساتھ اور قدرت اور قسمت کے ساتھ وابستہ ہے۔ مجھے تم سے اس سوال کی توقع تھی۔ میں بھی یہی سوال کرتا ہوں۔ میں تم میں سے ہی ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں جواب دینے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ سنو۔ صحیح فعل اپنا فائدہ آپ ہے۔ صحیح اقدام سے ہم ماضی اور مستقبل دونوں کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں اور اس آزادی سے ہمیں وہ طمانیت ملتی ہے جو بڑے سے بڑے فائدے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اور سب سے خوشگوار بات یہ ہے کہ ہم انصاف کی توقع سے بھی رہائی پالیتے ہیں۔ انصاف ہمارے یہاں پر ہے۔'' اس نے پھر دو انگلیوں سے سر کو ٹھونکا۔ ''اور ہمارا خدا بھی یہاں پر ہے اور سب کچھ یہیں پر ہے اور یہی کچھ ہے۔ اس کے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ صحیح فیصلہ۔ صحیح قدم۔ صرف اسی فعل میں ہماری نجات ہے۔ یہ لمحہ جس میں ہم زندہ ہیں' اس سے ہم تسکین حاصل کرتے ہیں اور مکمل آزادی سے زندہ رہتے ہیں۔ مستقبل' انصاف' فائدہ' نقصان' یہ سب ایک طویل انتظار میں شامل ہیں جو ہم پہ ایک عظیم اور لاحاصل خوف طاری کرکے ہمیں احمق اور ناکارہ بنا دیتا ہے۔ جب کوئی انتظار نہیں رہتا کوئی شکست بھی نہیں رہتی۔ کوئی بھی۔''

دونوں کافی دیر تک غیر یقینی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر انیس نے انجن کو گیئر میں ڈالا اور کنارے کی طرف رخ کرلیا۔

جب وہ خاموشی سے پتھروں پر چلتے ہوئے اس جگہ پر پہنچے جہاں سے اٹھ کر گئے تھے تو دونوں بچے بھاگ کر انیس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے اور بلقیس جلدی جلدی اسے بتانے لگی کہ کس طرح ان کے جانے کے بعد دونوں کنڈیوں کو ایک ساتھ مچھلیاں لگ گئی تھیں اور نوکر کو آواز دیتے دیتے نعیم کی چھڑی کو مچھلی کھینچ کر لے گئی اور وہ صرف انیس کی چھڑی کو بچا سکی تھی۔

(۴۲)

''ہم دور دراز کے سفر کرتے ہیں اور ہزاروں لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے تبادلہ خیالات کرتے ہیں اور ہر ایک سے کرتے ہیں اور کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دن دفعتاً ہمیں احساس ہوتا ہے یہ سب اس قدر بے سود ہے۔'' انیس الرحمان نے تھکی ہوئی آواز میں بات ختم کی اور حقے کی نے منہ میں رکھی جسے اس نے ادھر کچھ عرصے سے شروع کر رکھا تھا۔ نعیم نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور دیوار پر لٹکی ہوئی پرانی پینٹنگ کو گھورتا رہا۔

یہ جمنا کے کنارے وہی آموں کے باغ میں گھری ہوئی ٹھنڈی پُرسکون کوٹھی تھی جس کے ایک آرام دہ روشن کمرے میں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ باہر رات پڑ چکی تھی لیکن دریا کے رخ چلنے والی ہوا ابھی تک گرم تھی۔ کوٹھی کی حدود سے پرے فصلیں کئی روز ہوئے کاٹی جا چکی تھیں اور کھیتوں میں تازہ تازہ ہل چلا ہوا تھا۔ ایک دو بارشیں بھی ہو چکی تھیں جن سے کھیتوں کی مٹی سیاہ اور چکنی ہوگئی تھی اور اساڑھ کی دھوپ میں ان میں سے زمین کی مخصوص مرطوب بُو لیے ہوئے بھاری، گرم بخارات نکلتے رہتے تھے۔ کوٹھی کے باغ میں آم پک کر ایک ایک کر کے رات بھر گرتے رہتے تھے اور صبح سویرے ٹپکے کے خوشبودار شہد ایسے میٹھے آموں کا برآمدے میں ڈھیر لگایا جاتا تھا جس پر انیس اور نعیم نے کبھی شوق سے نگاہ بھی نہ ڈالی تھی۔ وہ دو اکتائے ہوئے چہروں اور متجسس آنکھوں والے بڈھے، جو عمر کے ایک عجیب اتفاق سے دوست بن گئے تھے، ان جسمانی لذتوں سے آگے چلے آئے تھے اور اب خاموشی سے ایک دوسرے کے سہارے پر بیٹھے زندگی کو اپنے قریب سے بڑی آزادی اور لاپروائی کے ساتھ گزرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ زندگی کی بے وقعتی اور انسان کے لاحاصل جذبوں کا جتنا تکلیف دہ احساس ان دو مردوں کو تھا، اور عمر نے اپنے پیچھے جو خلا چھوڑا تھا اس کی وسعت کا جو اندازہ ان کو تھا، گئے گزرے زمانوں میں، جب پیغمبر آتے تھے، شاید کسی کو رہا ہو۔ ان میں سے کوئی ایک جب زندگی کا ٹھٹھہ برداشت نہ کر سکتا تو کوئی بے معنی سی بات کرنے لگتا، پھر اس کے غیر ضروری پن کو محسوس کر کے خود ہی خاموش ہو جاتا۔ زندگی ایک کم عقل اور اوباش نوجوان کی طرح تھی جو بڈھے ناتواں لوگوں کے پاس سے لاپروائی اور حقارت کا قہقہہ لگاتا ہوا گزر جاتا ہے۔

اسی طرح انیس الرحمان نے پھر کوئی بات کرنے کو نے الگ کی، لیکن بولے بغیر منہ میں رکھ لی۔

پہلی بار جب نعیم یہاں آیا تھا اس واقعے کو کئی برس گزر چکے تھے۔ اب وہ اس باغ کے چپے چپے سے واقف اور کوٹھی کے کمروں سے مانوس ہو چکا تھا۔ دیواروں پر لٹکی ہوئی قدیم انگلستان کی تصویریں جن میں رنگ برنگے کپڑے پہنے گھڑسوار درجنوں شکاری کتوں کے ہمراہ لومڑ کے شکار کو جاتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ اور قدیم گرجا گھر اور ہندوستانی راجاؤں کی تصویریں، جو اپنے انگریز مہمانوں کے ہمراہ ہاتھی پر سوار ہو کر شیر کے شکار کو جا رہے تھے، اور الماریوں میں رکھی ہوئی شیر، لومڑ اور مچھلی کے شکار کے متعلق بیسیوں کتابیں جنہیں اب کوئی نہ پڑھتا

تھا اور آتشدان پر رکھے ہوئے پتھر اور چینی کے پرانے مجسمے اور ایک تانبے کا مہاتما بدھ...... ان تمام چیزوں کے درمیان وہ پرانے باسیوں کی طرح پھرتا تھا اور انیس الرحمان کا گھوڑا اسے دیکھ کر خوشی سے ہنہناتا تھا۔ ان تمام برسوں میں روحانی طور پر وہ شاید انیس الرحمان سے اتنا ہی دور رہا تھا جتنا پہلے روز تھا لیکن اس دوران میں آہستہ آہستہ انیس اس کے لئے ایک قسم کا مادی سہارا بن چکا تھا۔ جو عمر کے اس دور میں تھوڑی بہت طمانیت کا باعث ضرور تھا۔ وہ اس کے لئے عقل، عقلِ اصل اور عقلِ محض کی علامت بن چکا تھا جس کے ساتھ نعیم اپنی مایوسی میں بے طرح چمٹا ہوا تھا۔ اس سے مرعوب اور کسی حد تک خوفزدہ ہو کر چپ رہنا اس درجہ نعیم کی عادت میں داخل ہو چکا تھا کہ اب اس نے اس کی باتوں کو دھیان سے سننا بھی چھوڑ دیا تھا۔ روحانی ابتری کے اس دور میں اسے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ جہاں ڈرنے اور مرعوب ہونے کی اہلیت ہو وہاں محبت کرنے کی اہلیت نہیں رہتی، سچائی کو جاننے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وہ اب محض اس علامت کے سہارے پر رہ رہا تھا جس کا کہ انیس الرحمان حامل تھا۔

انیس الرحمان میں ان چند برسوں نے بنیادی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس میں ایک دم بڑھاپے کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے بال زیادہ تر سفید ہو چکے تھے اور اس کی مخصوص اعصابی قوت، جس نے اتنا عرصہ اسے جوان بنائے رکھا تھا، تیزی سے زوال پذیر تھی۔ اب اس نے باتیں کرنا کم کر دی تھیں اور زیادہ سے زیادہ وقت اپنے گھر والوں سے الگ اس کوٹھی میں اکیلا بسر کرنے لگا تھا۔ پہلے اس کے بیوی بچے ہر دوسرے ہفتے باقاعدگی کے ساتھ اس کے ہمراہ آیا کرتے، پھر مہینے دو مہینے کے وقفے پڑنے لگے، اب کئی کئی مہینے گزر جاتے اور وہ اکیلا یا صرف نعیم کی معیت میں آکر پڑا رہتا۔ اس کے باوجود دفتر میں اور گھر کے اندر اس کی کارگزاری میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اسی مشین کی سی پھرتی اور باقاعدگی کے ساتھ دفتر کے کام کرتا اور گھر کی صفائی، بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوی کی ضروریات کے سلسلے میں اسی احتیاط اور شد و مد سے حصہ لیتا۔ اس کی زندگی میں جو مایوسانہ رنگ آگیا تھا اسے کبھی نعیم نے شدت سے محسوس نہ کیا تھا کیونکہ اس کے نظریات اس کے لئے مضبوط عادت بن چکے تھے جن کے ساتھ چمٹا رہنا اس کے لئے آسان اور قدرتی عمل تھا۔ یہ اس کی روزمرہ زندگی سے اسی طرح ظاہر ہوتا تھا جیسے کولہو کے گرد مستقل گھومتے رہنے کے نظریہ سے بیلوں کی عقیدت ظاہر ہوتی ہے، جو کہ فی الحقیقت محض ایک عادت ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ نعیم نے اپنی اور اس کی طبیعتوں کے تضاد کو کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ وہ اپنی روح کی انکساری اور ذہن کے تکبر کے مقابلے میں انیس الرحمان کے ذہن اور روح، دونوں کی رعونت کو کبھی نہ پہچان سکا تھا۔ حتیٰ کہ ایک بار جب انیس نے بیٹھے بیٹھے چونک کر کہا تھا: ''نعیم، زندگی ہمیں کس بے دردی سے ضائع کر دیتی ہے!'' تو بھی نعیم کی سوچ حرکت میں نہ آسکی اور اس نے اسے محض انیس کی دانائی کی ایک بات کے طور پر لیا تھا۔ کہ وہ عادات جن سے ہم زندگی کی تشکیل کرتے ہیں، اور علامتیں، جن سے اسے قائم رکھنے کی سعی کرتے ہیں، اس قدر پُرفریب اور بے حقیقت ہوتی ہیں۔

جب بادلوں کی آمد کے ساتھ ہوا تیز ہوگئی اور کھڑکیوں کے پردے اڑنے لگے تو انیس نے حقے کی نَے

ایک طرف رکھ دی۔

''ہم باتیں کرتے ہیں اور باتیں اور باتیں حتیٰ کہ ایک روز بیٹھے بٹھائے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ اس قدر بے سود ہے اور یہ احساس بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ تمہیں کبھی ہوا ہے؟ اس کے باوجود ہم چلتے جاتے ہیں۔ منزل سے منزل کی طرف' چہرے سے چہرے کی طرف' بات سے بات کی طرف' حتیٰ کہ ہم تھک جاتے ہیں اور اداس ہو جاتے ہیں اور ہمارے دل سے امن غائب ہو جاتا ہے۔ پھر خاموش جنگلوں کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ تمہیں پتا ہے دل میں کسی آرزو کا پیدا ہونا سکون کے کھو جانے کی نشانی ہے؟ آرزو جو کبھی نہ کبھی حسرت بن جاتی ہے۔ خاموش جنگل اور ساتھی کے طور پر ایک گھوڑا یا کتا' اور چمکدار موسم' اور خیال آرائی' تا کہ ہم چلے جائیں چلے جائیں اور بڑی بڑی عظیم مقدس باتوں کے بارے میں سوچیں۔ اس وقت ان بے شمار چھوٹی چھوٹی غیر ضروری باتوں کے لئے ہمارے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہے جن میں ہم عمر بھر مصروف رہے اور ہم عظیم فکر کے لئے تڑپتے ہیں جو کبھی ہمارے ذہن میں پیدا نہ ہوئی۔ ایک وقت آتا ہے جب ماضی کی چھوٹی سے چھوٹی بات ہمیں اداس کر دیتی ہے۔ کوئی چہرہ' کوئی نام' کوئی لفظ' کوئی نظر' کوئی پرانی دھن جو ہم نے کسی غیر آباد گلی میں سے گزرتے ہوئے دور سے سنی تھی۔ ہم اس بچے کی طرح محسوس کرتے ہیں جو ہر وقت رونے کے لئے تیار رہتا ہے۔

''دراصل ہم تھک چکے ہوتے ہیں' اس مستقل عجلت سے جو ہماری زندگی میں راہ پا جاتی ہے' جو مسلسل ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر مجبور کرتی ہے' ان جگہوں پر لے جاتی ہے جہاں جا کر ہم کبھی خوش نہیں ہوتے۔ دراصل ہم محض اکتا چکے ہوتے ہیں' عمر بھر سے جو ہم نے جہالت میں بسر کی' وہ گئے گزرے زمانے جو ہم نے ضائع کر دیئے' ہمارے خوف' ہمارے جذبے' ہماری اپنی جوانی اور بڑھاپا جو ہم نے بچوں کی طرح گزارا' یا احمقوں کی طرح۔ اس وقت سڑک پر جاتی ہوئی ایک بس بھی ہمیں سارا وقت یاد دلا دیتی ہے کہ ہم ایک گاڑی کی طرح سرگرداں رہے جو اپنی لائنوں پر چلے جاتی ہے' چلے جاتی ہے' لائنیں جو اسے لئے جاتی ہیں' پوچھے بغیر' جانے بغیر' پہچانے بغیر' ہمیں ہانکا جاتا ہے' ہم ہنکے جاتے ہیں۔ اپنی خوراک' اپنی باتوں اور اپنے جذبوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ ہماری کتابیں' ڈگریاں' بہترین درزیوں کے ہاں کے سلے ہوئے سوٹ جن کا ذکر کرنے سے ہم کبھی نہیں چوکتے' خوشنما رنگوں کی ٹائیاں' ٹوپیاں اور خوشبوئیں جو ہم نے اعلیٰ درجے کی دکانوں سے خریدیں' سب کو کندھے پر لادے' اپنی ساری امارت کو اٹھائے' ہر قسم کے خیال کو قبول کرتے ہوئے...... خیال جو پڑاؤ سے پڑاؤ تک غائب ہو جاتا ہے...... کھاتے' کھاتے اور کھاتے ہوئے' اور باتیں کرتے ہوئے۔ باتیں؟ ان جگہوں کی جو ہم نے دیکھیں' ان چیزوں کی جو ہماری ملکیت ہیں' ہماری رائیں اور قیاس آرائیاں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا' جو کسی کے لئے اہمیت نہیں رکھتیں' ہمارے اپنے لئے بھی نہیں۔ اس کے باوجود انہیں اخلاق اور توجہ کے ساتھ سنا جاتا ہے اور جواب میں جو کچھ کہا جاتا ہے اسے ہم توجہ اور اخلاق کے ساتھ نوٹ کرتے ہیں' انہیں اہمیت دیئے بغیر' ان کی پرواہ کئے بغیر۔ تمہیں پتا ہے دنیا میں ہم کتنی نرمی' کتنے اخلاق' کتنی مکاری سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ہم دنیا بھر

کا سفر کرتے ہیں اور رائیں قائم کرلیتے ہیں اور پھر انہیں وقت گزارنے یا ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کے لئے ہتھیاروں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور ہماری رائیں کیا ہوتی ہیں؟ یہی کہ روضہ تاج محل خوبصورت عمارت ہے اور چین کے مجلسی حالات بہتر ہو رہے ہیں یا نہیں ہو رہے اور دنیا میں اچھے شاعر پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں۔ ہم انہیں بار بار دہراتے ہیں حتیٰ کہ اپنی تقریر میں ماہر ہو جاتے ہیں' ٹورسٹ گائیڈ کی طرح۔ پھر ہم اس کا استعمال شروع کرتے ہیں۔ ہر ایک کے پاس اپنا اپنا سکہ بند طریقہ ہے' برسوں کے تجربے اور مشق کے بعد اپنایا ہوا رویہ' غیر شخصی سرسری پن' یا محتاط' شخصی اور منہمک رویہ۔ ہم بہرحال ہر منزل پر' ہر طریقے سے اپنے آس پاس کے لوگوں کو ہم خیال بنانے کی' دوسرے لفظوں میں انہیں مرعوب کرنے کی انتہائی جدوجہد کرتے ہیں' ان کی کوئی پرواہ کئے بغیر' اور مستقل یہ جانتے ہوئے کہ ہماری ذرہ برابر پروا ان کو نہیں ہے۔ ہم اپنی زندگی کے خلا کو چھوٹی موٹی باتوں سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں' گفتگو جو تسکین بخش بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ گمراہ کن۔ اور پھر وہ وقت آتا ہے' وہ جب ہم تھک جاتے ہیں اور پیچھے رہ جاتے ہیں اور بس کا تیل ختم ہو جاتا ہے اور ہمارا سارا بوجھ سڑک کے کنارے بکھر جاتا ہے' کچھ مردہ کچھ نیم مردہ' اور دفعتاً حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے' کہ یہ سب اس قدر بے سود تھا' سب! کہ بالآخر ہم وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں سکون نہیں ہے اور ہم واپس نہیں جا سکتے' کہ جہاں پر محض نقصانِ عظیم کا احساس ہے' کہ ہم پرانی بس کی طرح بدصورت اور بیکار ہیں اور ان چاہے' ان جانے سڑک کے کنارے کھڑے ہیں' بختاور ہیں تو توڑ پھوڑ کر دوبارہ ڈھالے جائیں گے' بدبخت ہیں تو محض نظر انداز کر دیئے جائیں گے۔

''اب ہم پریشان ہیں' تنہائی کے خوف سے ہراساں ہیں' تنہا ہیں' بے حد تنہا ہیں۔ کیوں؟ کیا ہم صرف اس دن کے لی اتنی مدت سے رہتے آرہے تھے؟ ہمارا نصب العین' ہمارے الفاظ' احساسات' جذبات' وہ کام برسہا برس کی مشق سے جن میں ہم نے مہارت حاصل کی' دور دراز کے سفر' دوست' فہم جو ہم نے تقریر اور میل جول کے ذریعے تیز کیا' ہماری ہر دلعزیزی جو ہمارے اردگرد اور ساتھ ساتھ چلتی تھی' سب ختم ہو گیا؟ کیوں؟ کیوں؟ اب ہم سوچنے سے قاصر ہیں کہ کبھی سوچ ہی نہیں پائے۔ پر ہم جانتے ہیں' جیسا کہ ہم کئی اور باتیں جانتے ہیں' کہ ہم نے جس چیز کی تلاش کی اسے پایا اور جس کے لئے اب حیران و پریشان کھڑے ہیں اس کی تلاش ہی میں کبھی نہ نکلے' صاف سیدھی بات ہے۔ چنانچہ اب تم چین کی بنسری بجاؤ اور قناعت سے بیٹھ کر خاتمہ بالخیر کا انتظار کرو' انتظار کرو اور نچلے بیٹھو' نچلے بیٹھو کہ یہی اصل مقام ہے۔ پر چین کی بنسری بجائے نہیں بجتی اور ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ جتنے بھی انہاک اور لاپروائی اور صبر کے ساتھ انتظار کریں جب موت آئے گی تو ہمیں پریشان کر دے گی' جیسے کہ یہ ہر کسی کو کر دیتی ہے۔ باوجود ساری باتوں کے' جب یہ آتی ہے تو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ...... ایک چمکیلی خوشگوار صبح کو میں اپنے بائیں باغ میں کھڑا خرگوشوں اور مرغیوں کو ناشتہ کھلا رہا ہوں۔ پرانا کڑوا تمباکو پی رہا ہوں اور اپنے پوتے پوتیوں کو سبزے پر کھیلتے کودتے دیکھ رہا ہوں۔ میری طبیعت میں ٹھہراؤ اور ربودگی آچکی ہے اور میں سنبھل سنبھل کر اطمینان سے چلتا پھرتا ہوں۔ نوجوان آدمی کام پر

جاتے ہوئے پاس سے گزرتے ہیں اور جھک کر سلام کرتے ہیں ...... '' قابل عزت بزرگ۔ سلیقے سے بسر کی ہوئی زندگی'' وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ پھر سامنے سے ایک اور چلا آتا ہے۔ ایک سفید سر والا دانا شخص' چھڑی کے سہارے اپنے آپ کو سنبھالے' وقار اور اطمینان کے ساتھ چلتا ہوا۔ نوجوان آدمی جھک کر سلام کرتے ہیں اور پہلی والی بات آپس میں دہراتے ہیں۔ وہ اخلاق سے مسکرا کر جواب دیتا ہے اور میرے سامنے آ کر چند منٹ کے لئے رک جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں اور موسم کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی صحت کے متعلق پوچھ گچھ کرتے ہیں' پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اب کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ ساری باتیں اتنی غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ خرگوشوں کا ناشتہ اور چمکدار موسم اور دو خوشنما' سجے سجائے بڈھے' خالی الذہن اور مطمئن' ایک دوسرے کے ڈھونگ کو جانتے ہوئے اور چھپائے ہوئے' بلاوجہ نادم اور خوش مزاج...... پھر وہ بات کرنے کے انداز میں کھنکارتا ہے اور محض ہاتھ سے سلام کر کے چلا جاتا ہے۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا لیکن میں جانتا ہوں اور ذہن کی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ نہایت سلیقے سے خالی کی ہوئی ایک زندگی' بے وجہ' بے جواز۔ جانتا ہوں کہ وہ بھی مجھے دیکھ رہا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے ہیں پر کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ اس طرح ہم بھگتتے ہیں۔ اس طرح......''

باہر بارش تیزی سے شروع ہو چکی تھی اور ہوا کے زور سے اندر آ رہی تھی۔ نعیم اٹھا اور ایک ایک کر کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ اس نے اب چھڑی کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور چال کی لغزش سے تقریباً آزاد ہو چکا تھا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر بال گھنے اور برف کی طرح سفید تھے اور اس کے گالوں کی کھال لٹکتی جا رہی تھی۔ آخری کھڑکی بند کرنے سے پہلے وہ کئی لمحے تک باہر باغ کی تاریکی میں دیکھتا رہا جہاں بار بار بجلی چمک رہی تھی۔

''آج بہت سارے کچے آم گریں گے۔'' اس نے کہا۔

بجلی کی چمک بے حد صاف تھی اور اس میں سارا باغ' طوفان میں جھولتے ہوئے درخت اور بارش کے قطرے ایک لمحے کے لئے جاگ اٹھتے تھے۔ سار بانوں کا ایک چھوٹا سا خاندان ابھی ابھی کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ انہوں نے برآمدے کے ستونوں سے اپنے اونٹ باندھ دیئے تھے اور اب کونے میں دبک کر آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے ان کے سروں پر پرندے' جو درختوں پر سے جان بچا کر بھاگ آئے تھے' چوں چوں کر رہے تھے۔ نعیم کو ایک بہت پرانی بات' جو ایک مرتبہ اس کے ذہن میں سے گزری تھی' یاد آئی اور وہ آہستہ سے مسکرایا۔ ''تم سورج کی تپش سے بچنے کے لئے راتوں کو سفر کرتے ہو اور پھر بارش آ جاتی ہے۔ خدا حافظ' رات کے آباد کارو! تمہارا گھر کہاں ہے؟ اب تم اپنے لئے بارش کا ایک گھر بناؤ۔'' وہ دوبارہ مسکرایا۔ ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی درزوں میں داخل ہو رہی تھی اور بارش کے قطرے شیشوں پر سر مار رہے تھے۔ ''رات کے باشندو' اب تم اپنے لئے ......'' اس نے دہرایا۔

دیوار پر نشاۃ ثانیہ کی یادگار رنگین میڈونا جو بڑی دیر سے ایک کیل کے سہارے جھول رہی تھی کھٹاک سے گری اور ٹوٹ گئی۔ شیشوں پر بارش زیادہ زور سے ہونے لگی۔ انیس الرحمان نے پھر بولنا شروع کر دیا:

''وہ عظیم شخصیت جو جنم نہ لے سکیں۔ جنہیں گھر باہر کے' روز مرہ کے چھوڑے بڑے کام کرنے پڑے' جن کا وقت اسی طرح ضائع ہو گیا۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ ضابطہ جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر لیا ہے اور جس کے تحت ہم زندگی بسر کرتے ہیں کس کام کا ہے۔ حصول مسرت کا یہ معیار جو ہم نے قائم کیا ہے یا جو قائم کیا کرایا ہمیں ملا ہے کس حد تک صحیح ہے۔ ہم جو اتنا دکھ سہتے ہیں' اتنی محنت کرتے ہیں' اتنے جھوٹ بولتے ہیں' اتنی چاہتیں اتنی حسرتیں دل میں دبائے رکھتے ہیں' اتنی طاقتور خواہشیں پوری نہیں کر سکتے کہ دل و دماغ کے روگی ہو جاتے ہیں' اتنی اخلاقی قدروں کو سمیٹتے ہیں' اتنی اخلاقی قدروں کو قربان کرتے ہیں ...... وقت کی کمی کی وجہ سے ان لوگوں سے نہیں مل سکتے جن سے بہت ملنا چاہتے ہیں' دوستی کرنا چاہتے ہیں یا ہمدردی کی توقع رکھتے ہیں یا ایسے لوگوں کو نہیں مل پاتے جن کو ہم نہیں جانتے لیکن جن سے مل لیتے تو بہت خوش ہوتے۔ ان جگہوں پر نہیں جا سکتے جن کا صرف نام سن رکھا ہے' جو کچھ سوچتے ہیں کہہ نہیں سکتے' جو کہتے ہیں کر نہیں سکتے' قطعی طور پر برے آدمی سے قطع تعلق اور اچھے آدمی سے دوستی نہیں کر سکتے' غرضیکہ کسی ڈھنگ سے بھی زندگی کو بہتر طور پر بسر نہیں کر سکتے حالانکہ ہم میں سے کتنے ہی ہیں جو وہ سب کرنا چاہتے ہیں جو نہیں کر سکتے اور وہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتے جو کر رہے ہیں' تو چاہنے اور کرنے میں یہ تضاد' یہ بُعد کیوں ہے؟ اور اس سے کیا حاصل ہے اور یہ مصنوعی ہے یا حقیقی؟ کیا یہ سب کچھ جو ہم بھگتتے ہیں محض اس لئے ہے کہ ہم اپنے گھر کو' جو چند دیواروں اور کھڑکیوں کا مجموعہ ہوتا ہے' سلامت رکھنا چاہتے ہیں' یا اپنے خاندان کو جو چند افراد پر مشتمل ہوتا ہے' یکجا رکھنا چاہتے ہیں یا اپنی جائداد کو جس میں کھانا پکانے کے برتن' کپڑے اور چند آسائش کی اشیاء ہوتی ہیں' قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم اپنی شخصیت کو محض اس لئے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکیں' اپنی علیحدگی' اپنی انفرادیت کو محض اس لئے ضائع کر دیتے ہیں کہ کمتر انسانی جذبوں کی تسکین کر سکیں۔ کیا ہمیں ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق معلوم ہے؟ کیا ہم مسرت کا مطلب جانتے ہیں' علم اور جہالت میں کیا ہم تمیز کر سکتے ہیں؟ کیا ہم محض اس لئے اس قدیم' انسان کش ضابطے کو برقرار رکھے ہوئے ہیں کہ اس سے شخصی غرور کو جلا ملتی ہے؟ کہ ہم اپنے حقیر گھروں اور خاندانوں میں ایک کھوکھلی' مغرور اور محتاط زندگی بسر کرتے رہیں۔ یا وہ نوجوان' جو ابھی زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں' اپنے مکان کو گرنے سے بچانے اور کنبے کو خوراک مہیا کرنے کی خاطر روزانہ زندگی کے چھوٹے موٹے کام کرتے رہیں اور خوشی کے بجائے غرور اور تنفر حاصل کریں۔ اور پھر ہم میں سے چند ایک ان کاموں میں کمال حاصل کر لیں اور نمایاں مقام پر پہنچیں اور حاسدانہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور اس طرح زیادہ مغرور اور زیادہ ناخوش ہو جائیں اور اپنے ساتھی لوگوں میں گھلنے ملنے کی بجائے انہیں مرعوب کرنے کی طرف مائل ہوں اور بدلے میں ان سے حقارت حاصل کریں۔ عوامی زندگی کے یہ نمایاں لوگ' سیاست دان اور تعلیمی اداروں کے سربراہ اور بڑی عدالتوں کے منصف' ان کی زندگی بھر کی کمائی کیا ہے؟ حقارت اور عمومیت! کیا وہ بس ان دو چیزوں کے لئے ایک انتہائی مردہ دل اور پُر کوفت زندگی بسر کرتے ہیں؟

''اگر ہم ایک اونچی چٹان پر اکیلے بیٹھ کر سوچیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ خوشی تو ایک معمولی شے ہے۔ اور اسے

حاصل کرنا تو بڑا آسان ہے، یعنی آپ اسے محض چٹان پر چڑھ کر بھی حاصل کر سکتے ہیں جب کہ آپ تنہا ہیں اور آپ کے ساتھ آپ کی ساری شخصیت ہے ساری انفرادیت ہے، آپ کی عظمت اور نیکی اور عقل ہے اور آپ ہر لحاظ سے مکمل ہیں اور قطعی طور پر مطمئن اور خوش قسمت ہیں اور آپ کو بھوک نہیں لگ رہی چنانچہ آپ ابھی کچھ دیر اور یہاں رک سکتے ہیں اور زندگی کے عظیم مقدس مسائل پر، محبت اور موت پر غور کر سکتے ہیں اور دیانت داری سے اپنی رائے وضع کر سکتے ہیں۔ اس وقت آپ کے پاس وہ بیش بہا آزادی کا احساس ہوتا ہے جس کے لئے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہم پیدا کئے گئے ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں نیچے جائیں گے اور فلاں فلاں کام کریں گے یا نہیں کریں گے کہ ان کا کرنا نہ کرنا ہمارے اختیار میں ہے .... مگر خوفناک بات یہ ہے کہ جب ہم نیچے جاتے ہیں تو ایک ایک کر کے ساری چیزیں ساتھ چھوڑ جاتی ہیں اور آخیر میں ہماری وہی پرانی، کمزور، گمنام شخصیت رہ جاتی ہے جس کے سامنے روزانہ معمول کے ایسے کام ہوتے ہیں جو ہر حالت میں کرنا ہوتے ہیں اور جو اپنے معمولی پن کے باوجود ہمارے اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم آناً فاناً عمومیت کے اس سمندر میں گم ہو جاتے ہیں اور ہجوم سے الگ ہماری کوئی شخصیت، کوئی آزادی نہیں رہتی۔ ہم خوشی کے اس معیار کو بھی بھول جاتے ہیں جو کچھ دیر قبل ہم نے قائم کیا تھا، اور ایک دوسری قسم کی مسرت، جو تقابل اور کبر نفس سے پھوٹتی ہے، ہم پر قبضہ کر لیتی ہے۔ یہ زندگی کی سفا کی کا ایک منظر ہے کہ ہم جانے بوجھے اور محسوس کیے بغیر، تیزی کے ساتھ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف سفر کرتے ہیں۔

''تو کیا طمانیت اور عقل و دانش کی یہ قربانی جو دی جاتی ہے حق بجانب ہے؟ وہ بے پناہ جور و ستم جو ہم جھیلتے ہیں، کیا ہماری زندگی، ساری انسانی زندگی اس قابل ہے کہ اس کے لئے اتنی دل شکنی قبول کی جائے، بتاؤ کیا ساری انسانی زندگی کی کوئی وجہ ہے؟''

وہ دیر تک یونہی باتیں کرتا رہا اور بارش رات بھر دریچوں اور روشندانوں کے شیشوں پر سر مارتی رہی۔

(۴۳)

اس اتوار کو انیس اور نعیم شہر لوٹ آئے۔ نعیم کو روشن محل کے پرانے دروازے پر اتارتے وقت انیس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور اس کی طرف جھک کر ہنسا۔ نعیم نے اس کی آنکھوں کی قدیم حیوانیت اور تند ہنسی کو ہلکی سی بے چینی کے ساتھ محسوس کیا، لیکن اب وہ اس کی طبیعت کے میلان سے تقریباً واقف ہو چکا تھا۔ اس نے ہاتھ ملائے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندھیرے میں دور تک اس کی گاڑی کو بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ شام پڑ چکی تھی۔ گیٹ کے اندر داخل ہو کر نعیم نے دیکھا کہ بڑے لان میں نجمی کے احباب کا ہجوم میزوں، کرسیوں اور سبزے پر بیٹھا تھا۔ یوکلپٹس کی شاخوں میں سبز رنگ کا بلب جل رہا تھا اور سبزے پر حسب معمول کئی جگہ پر ایک ساتھ باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک طرف دو لڑکیاں تیز روشنیاں جلائے بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ لان کے کونے میں رکھوالے نے گرے

ہوئے پتوں کو اکٹھا کر کے جو ڈھیر لگایا تھا رات کی بارش میں بھیگ گیا تھا اور اس پر چڑھا بادامی رنگ کا ایک چھوٹا سا نفیس کتا بیٹھا تھا۔ اس وقت وہاں سے گزرتے ہوئے برمن جی کی نگاہ اس تنہائی پسند کتے پر پڑی اور وہ جھک کر اس سے باتیں کرنے لگے۔ خلیق جانور شائستگی اور اکتاہٹ سے منہ اٹھا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے نعیم کو کسی نے نہ دیکھا اور وہ خالد‘ فے‘ برمن جی اور کیپٹن مسعود کو پہچانتا ہوا اپنے کمروں کی طرف چلا گیا۔ اس کے برآمدوں میں کسی نے روشنی نہ جلائی تھی۔ چند لمحوں تک بجلی کے بٹن پر ہاتھ رکھے کھڑے رہنے کے بعد وہ اندھیرے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے سامنے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نوجوان لوگ تھے‘ زندگی اور حسن سے بھرپور‘ سارے وقتوں‘ سارے جذبوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کے اہل‘ اس نے بیٹھے بیٹھے سوچا‘ امید اور انتظار کے حامل‘ اندیشوں سے پاک ...... ابھی اندیشے آئیں گے‘ کہ ان کا بھی وقت مقرر ہے۔ اس نے جھنجھلا کر خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ پھر اسے وہ مردہ پرندے یاد آئے جو اس نے انیس کے باغ میں دیکھے تھے جو رات کے طوفان میں مرے تھے جنہیں رکھوالے نے چھوٹے سے ڈھیر میں اکٹھا کر دیا تھا۔ اس نے اس خیال کو بھی ذہن سے نکال دیا۔ موسم میں برسات کا مخصوص حبس تھا اور سامنے وہ سب آم کھا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ باتیں! صرف نجمی خاموشی سے اپنا کینوس سنبھال رہی تھی۔

نجمی! نجمی! اس نے چپکے سے دہرایا۔ دفعتاً سناٹا چاروں طرف پھیل گیا اور فضا میں خاموشی گونجنے لگی اور بے آواز خیالی پرندے اِدھر سے اُدھر آنے جانے لگے۔ اِدھر سے اُدھر۔

اس نے سُر بالا کے ادھ بنے پورٹریٹ کو ایزل پر سے اتارا اور لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر وہ میز سے اتر کر خالد اور فے کے پاس گھاس پر بیٹھ گئی جو پچھلے دو گھنٹے سے الجھ رہے تھے۔ دنیا بھر کی شاعری زیر بحث تھی۔

’’ایلیٹ ...... ایلیٹ ......ایلیٹ۔‘‘ فے نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ’’دیوانہ تشبیہ نگار۔ وہ تو نقاد کچھ کچھ ڈھنگ کا ہے شاعر واعر کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس کا وہ دوست‘ کیا نام ہے اس کا بھلا سا......‘‘

’’پاؤنڈ؟ ایذرا پاؤنڈ؟‘‘

’’ہاں وہ۔ ارے بھئی واہ‘ کیا ایک سے ایک بڑھیا آدمیوں کو شاعر بنا کے رکھا ہے اللہ میاں نے۔ جنے بیٹھے بیٹھے کیا لکھتے رہتے ہیں۔‘‘

’’شاید ایک دوسرے کو خط لکھتے ہیں۔‘‘ نجمی نے تجویز پیش کی۔

’’ارے ہاں‘ اور بعد میں ان کی ذاتی خط و کتابت کو شائع کر دیا جاتا ہے اور شاعری سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔ اجی واللہ کیا دقیق سمبلزم ہے اعلیٰ درجے کی ان دونوں حضرات کی جس پر خالد صاحب سر دھنتے ہیں۔‘‘

فے اور نجمی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

’’یہ تو نتیجہ نکلتا ہے سنجیدہ موضوعات پر لڑکیوں کے ساتھ بحث کرنے کا۔‘‘ خالد نے کہا۔ ’’پھبتی پہ اتر آتی ہیں۔ یہ تو اوقات ہے۔‘‘

''دراصل خالد کو شاعری واعری کا کیا پتا نفے ڈیئر۔'' نجمی نے رازدارانہ طور پر کہا۔ ''یہ شرارت ساری سپاہی شاعر کی ہے۔ وہ جس شاعر کو گرو مانتا ہے خالد صاحب بھی کمال سعادت مندی سے اس کے چیلے بن جاتے ہیں۔''

''بھئی واہ' کیا روحانیت ہے۔ سپاہی شاعر کہتا ہے۔'' نفے نے بات جاری رکھی۔

لیکن نجمی نے دیکھا کہ سپاہی شاعر ان سے دور سبزے کے کنارے کنارے اکیلا چل رہا تھا' اپنے مغرور سر کو اونچا کیے' اوپر اوپر دیکھتے ہوئے' اپنے اس مخصوص انداز میں جس کی وجہ سے وہ اس سے اتنا جلتی تھی۔ پھر اس نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے' باتیں کرتے ہوئے خوش باش لوگوں پر نگاہ ڈالی اور اسے کسی شے کا تکلیف دہ احساس ہوا' کسی ایسی چیز کا جو آج ہی ان کے درمیان پیدا ہوئی تھی' کہ وہ درحقیقت خوش نہیں تھے کہ وہ گہری مانوسیت اور گھلاوٹ جو پرانے دوستوں میں ہوتی ہے ان کے درمیان سے اٹھ چکی تھی اور اس کی جگہ دبی دبی بے اعتمادی تھی' اندیشہ تھا کہ وہ اس پُرخطر احساس کو جو آپ سے آپ پیدا ہوگیا تھا' چھپانے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے اور جان بوجھ کر چہروں پر شگفتگی پیدا کیے بیٹھے تھے۔ دفعتاً وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے آپ کو بے حد غیر محفوظ خیال کیا اور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی طرف بڑھتے ہوئے نجمی نے سوچا: باوجود اس کے' جنے کیسی ......دلکشی ہے اس شخص میں۔

''ہلو کپتان صاحب۔'' اس نے کہا۔

''ہوں؟'' وہ چونک پڑا۔

''ہلو۔'' نجمی نے مری ہوئی آواز میں دہرایا۔

''اوہ...... ہلو۔'' اس نے جھینپ کر کہا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''ٹیلی فون کا انتظار کر رہا تھا۔''

''روز ٹیلی فون کا انتظار کرتے ہیں؟'' نجمی نے اکتا کر سوال کیا۔

''ہوں؟ ہاں۔ مجھے یونٹ چھوڑنے کا حکم نہیں ہے۔ لیکن میں یہاں آ جاتا ہوں اور انتظار کرتا رہتا ہوں۔ انہی دنوں میں شاید فساد ہو جائے' حالات کا تمہیں پتا ہی ہے۔ میرے اردلی کو معلوم ہے۔ نمبر......''

برسات کی گرم' مرطوب ہوا ان کے بال اڑاتی رہی۔

''اس کے باوجود یہاں سبزہ خنک ہے اور خاموش!...... یہاں پرسکون ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''سکون سکون سکون۔ سکون کہاں پر ہے؟'' نجمی نے آزردگی سے سوچا۔ پھر اس نے شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھی: ''کچھ نئے شعر ہوئے؟''

وہ خاموش رہا۔

''کچھ بھی نہیں؟'' اس نے بشاشت سے پوچھا ''کوئی اوٹ پٹانگ نظم؟ یا بیت یا دوہا یا......''

وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بھی نہیں سن رہا' شاید کچھ بھی نہیں دیکھ رہا۔ محض آنکھیں

کھولے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اس نے رنج کے مارے منہ پھیر لیا۔

''میں ناشتہ کرتا ہوں، پریڈ دیکھتا ہوں، دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں، سو جاتا ہوں۔ سہ پہر کی چائے پیتا ہوں، اخبار پڑھتا ہوں، یہاں آ جاتا ہوں اور ٹیلی فون کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ میں ان سب سے واقف ہوں۔ پچھلی بہت سی زندگی ایسا ہوتا آیا ہے۔ کل بھی ٹھیک ایسا ہی ہوگا اور پرسوں اور اترسوں...... میں ان سب سے پہلے ہی واقف ہوں، اپنے سارے روزنامچے، سارے اوقات سے اتنی اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ لوگ ایلیٹ کی بات کر رہے تھے؟''

''میں نے اپنی زندگی کافی کے چمچوں سے ماپ کے رکھی ہے۔''

''ہاہا۔ تم میرے دل کی بات کیسی آسانی سے جان لیتی ہوں۔''

''برمن جی کہہ رہے تھے کہ وہ جو بڑے آرٹسٹوں میں سچائی کو جاننے کی جبلی قوت ہوتی ہے نا مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔'' نجمی نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''برمن جی؟'' مسعود بے خیالی سے ہاتھ اٹھا کر اس کی پشت پر دیکھنے لگا۔ ''یہ میں ہوں۔ میں حقیقت ہوں۔'' وہ زیرِ لب گنگنایا۔ پھر وہ چلتا چلتا رک گیا۔

''تم تصویروں میں دلچسپی کیوں لیتی ہو؟'' اس نے تقریباً درشتی سے پوچھا۔

''کیوں لیتی ہوں؟''

''ہاں، انسانوں سے زیادہ۔ بتاؤ انسانوں سے زیادہ کیوں لیتی ہو۔ تم تصویروں میں دلچسپی...... ایں؟''

وہ سراسیمگی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ ذرا نرم پڑ گیا۔

''دنیا میں اور کچھ بھی نہیں ہے جیسے۔ کیوں۔ کچھ ہے؟''

''مثلاً''

''مثلاً میں۔'' وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ اس کے لمبے ٹرنگے سائے میں چھپ گئے۔

''تم؟''

''ہاں میں۔ اور میں ایک حقیقت ہوں۔ میں کوئی کہانی یا رومانس نہیں ہوں۔ تم نے کبھی میری موجودگی کو محسوس کیا ہے؟ تم نے کبھی سوچا کہ میں یہاں محض تمہارے لئے آتا ہوں اور ٹیلی فون کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ تم جو تصویریں بناتی رہتی ہو اور......'' اس نے غصے سے ہاتھ ہلایا۔

چند طویل لمحے سکتے میں گزر گئے۔

''اوہ......'' پھر نجمی نے گہرا سانس چھوڑا۔ ''بس یہ بات ہے؟ اتنی بار بتا چکے ہو، پھر پھر کیا ضرورت؟''

''تو پھر؟'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔

''ارے بھئی کوئی اور بات کرو۔'' نجمی نے اکتا کر کندھے ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ ''تم تو اتنے دلچسپ آدمی

ہو سکتے ہو اگر چاہو تو...... مسعود۔"

اس نے جیبوں سے ہاتھ نکال کر پیچھے باندھ لئے اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ برآمدے تک جا کر وہ پلٹ آئے۔ مسعود تیز، لیکن معمولی لہجے میں، جس میں ہلکا سا تاسف کا رنگ تھا، باتیں کرنے لگا۔

"یہ سب بکواس ہے نجمی۔ یہ سارا آرٹ اور ادب تمہاری دنیا میں فیشن کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ نہ تم آرٹسٹ ہو نہ میں شاعر ہوں۔ تمہارا وہ بڈھا استاد بھی محض پیشہ ور کاریگر ہے جو ایسے گھرانوں میں ڈرائنگ کے اصول پڑھا کر روزی کماتا ہے۔ ہم سب چھوٹے چھوٹے معمولی آدمی ہیں جو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ لطیف جذبات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور محبت؟ ہنہ، ہم محض اپنے آپ کو سنبھالے احتیاط سے زندگی بسر کر رہے ہیں...... محض......"

نجمی نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت، نہ چاہنے کے باوجود اس کے دل میں مسعود کے خلاف پرانا تعصب بیدار ہوا۔ کہ وہ ان میں سے نہیں تھا، کہ سارے لوگوں، ساری چیزوں کے بارے میں اس کا رویہ، اس کی ساری تربیت قطعی مختلف تھی۔ کہ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔

"میرا جی چاہتا ہے نجمی کہ ایک کتاب لکھوں جس میں کردار اپنی بات چیت کے دوران پرانے آرٹسٹوں، پرانے ادیبوں کا تذکرہ کریں، جیسے، جیسے...... مثلاً دوستووسکی کے کردار گوگول کا ذکر کرتے ہیں یا...... لیکن ہم کن کا ذکر کریں گے؟" اس نے غور سے ہتھیلی میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس کیا ہے؟"

"چلو وہاں چلیں۔" نجمی نے کہا۔ پھر وہ اسے سبزے کے کنارے ٹہلتا ہوا چھوڑ کر باقی سب لوگوں کے پاس لوٹ آئی۔

برمن جی نے اس کا کینوس لپیٹ کر اپنی جگہ واپس رکھ دیا۔ "سر نہیں آئی۔" انہوں نے آہستہ سے سوال کیا۔

یہ سوال سب کے سروں پر ایک دم پھٹ پڑا اور وہ خاموش ہو گئے۔ انہیں خیال ہوا کہ وہ اس وقت کا سر شام سے انتظار کر رہے تھے کہ جب وہ اپنی لاتعلقی اور بشاشت قائم رکھنے کی ساری کوشش چھوڑ کر اطمینان سے بیٹھ جائیں گے۔ چند ایک نے گہری طمانیت محسوس کی، چند ایک بے چین ہو گئے۔ مسعود آ کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ جانتے ہی ہیں حالات خراب ہو رہے ہیں۔ بٹوارہ ہونے والا ہے۔ شاید فساد بھی ہو جائے۔" اس نے معمولی انداز میں برمن جی سے کہا۔

وہ ششدر کھڑے سب کا منہ دیکھتے رہے۔

"دو اور سٹنگز میں مکمل ہو جاتی۔" نجمی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"بالا سسٹرز کا تو مسوری میں انتظار ہو رہا تھا۔" دوسرے کونے سے فرحت نے، جو ابھی ابھی پہاڑ سے لوٹی تھی، بات کرنے کی کوشش کی۔

لیکن سب خاموش تھے۔ دھماکے سے پھٹنے والی خاموشی کے درمیان ہر ایک اپنے آپ کو بے حد مضحکہ خیز محسوس کر رہا تھا۔ جب کوئی خاموشی کو توڑنے کی کوشش میں کوئی غیر ضروری سی بات کرتا تو سب چپ چاپ اس کی

طرف دیکھنے لگتے' جو کہ عام طور پر ان کے درمیان سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

''آپ بھی تو ہندو ہیں۔'' مسعود نے کہا۔

''میں ...... آں؟'' برمن جی بوکھلا گئے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کے عمر رسیدہ چہرے پر اداسی پھیل گئی۔ ہاتھ ہوا میں اٹھا کر وہ آہستہ آہستہ بولے: ''میں اگر تمہارے گھرانے میں پیدا ہوا ہوتا تو یقین کرو کہ اسی جوش و خروش' تعصب اور ایمان کے ساتھ تمہارے مذہب کی پیروی کرتا اور اس کی خاطر مرنے مارنے پر تیار ہو جاتا۔ تم بتاؤ اگر میرے گھر میں پیدا ہوئے ہوتے تو کیا میرے ماں باپ کے مذہب کے لئے وہ سب کچھ نہ کرتے جو اب اپنے مذہب کے لئے کر رہے ہو۔ ہمارے مذہب کی بنیاد کیا ہے؟ اتفاق؟''

''ہنہہ ہنہہ ......'' مسعود صرف طنز سے ہنسا۔

وہ پھر خاموش ہو گئے۔ صرف ہوا درختوں میں چل رہی تھی اور سبز بلب آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ طشتریوں میں آم کی قاشیں پڑی تھیں۔ کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر جانے کی اجازت ہی لیتا۔ کبھی کبھی کوئی ایک کہیں سے بے سروپا سی بات کر دیتا اور بس۔

پھر اچانک مسعود اپنے تیز' معمولی لہجے میں بولنے لگا:

''دکھ اہم نہیں ہیں۔ زندگی میں ہم جو بھگتتے ہیں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہم صرف یہ ہے کہ ہم اپنے ''آئیڈیلز'' کے لئے لڑتے ہیں یا نہیں' اور کتنی دیر تک۔ ہم 'ڈس الوژن منٹ' کو کتنی دیر تک ٹال سکتے ہیں؟ تکلیفیں ہم میں کوئی تبدیلی نہیں لاتیں' وہ گزر جاتی ہیں۔ وہ نہ ہمیں بہتر انسان بناتی ہیں نہ بدتر۔ کیونکہ جب ہم خوش ہوتے ہیں تو گزشتہ دکھوں کو بھول جاتے ہیں۔ اس وقت ہم محض خوش ہوتے ہیں۔ اس لمحے میں صرف ایک جذبہ ہمارے پاس ہوتا ہے' مسرت کا' اور ہم پوری فتح مندی' پوری لاپروائی کے ساتھ زندہ ہوتے ہیں۔ خیالات۔ 'یہ' ہے جو کہ اہم ہے' کہ تم کیا 'سوچتے' ہو' صرف یہی تم کو اور سوسائٹی کو تبدیل کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ تکلیفیں تم نے اتنی برداشت کیں' ٹھیک۔ پھر؟ وہ تو میں نے بھی کیں جناب' آپ نے کون سا تیر مارا۔ یہ تو کوئی ایسی مشترکہ قدر نہ ہوئی جس کی بنا پر تعلقات استوار کئے جا سکیں۔ ہمارا آپس کا رشتہ تو 'خیال' پر ہے' کہ ہم 'سوچ' کیا رہے ہیں؟ کس چیز کی تلاش میں ہیں؟ کیا ڈھونڈ رہے ہیں یا...... اوہ شاید خیالات بھی اہم نہیں ہیں۔''

''میرے نزدیک سوچ کی مقدار کی بجائے غم کی مقدار پر کسی بشر کی وقعت کا اندازہ کیا جانا چاہیے۔'' اس کے خاموش ہو جانے پر برمن جی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تم ...... تم کیا جانتے ہو؟ ڈرائنگ ماسٹر۔'' مسعود نے اسی تیز' معمولی لہجے میں کہا جس سے کسی رنجش کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ غصے اور رنج کے مارے نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''لیکن دکھ' ٹھہرو' ان کے بارے میں شاید میں کچھ بتا سکتا ہوں۔'' مسعود نے کہا۔ ''دکھ ہمارے ماضی میں ہے اور مستقبل میں ہے۔ نہیں' بلکہ موت ہے۔ ہمارا ماضی اور مستقبل مردہ ہے۔ اور جب ہم موت کو بہت قریب

سے دیکھنا چاہتے ہیں تو اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ موت کے منہ میں چلے جانا ایک بات ہے اور موت میں مبتلا ہو جانا بالکل دوسری بات ہے اور یہ ہے جو تکلیف دہ ہے۔ وہ لمحہ جو گزر گیا زمانہ ماضی ہے' جو آنے والا ہے مستقبل میں شامل ہے۔ یہ دونوں ہمارے وجود کے حصے ہیں اور مردہ ہیں۔ جب ہم ان کو حال کے گزرتے ہوئے لمحے میں کھینچ کر لانا چاہتے ہیں تو موت کو زندگی پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ موت کبھی ساری زندگی پر مسلط نہیں کی جا سکتی' لیکن ان کی باہمی شرکت سے ایک نیم مردنی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو زندگی پر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ابتلائے مرگ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ہم سب ماضی اور مستقبل میں رہ رہے ہیں۔ حال میں کوئی رہنا نہیں چاہتا۔ ہم ایک عظیم موت میں مبتلا ہیں جو ذہن اور روح کی موت ہے۔ مکمل' ثابت و سالم موت تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ ہم تکلیف اس لئے سہتے ہیں کہ ہر وقت اپنے مردہ حصے کو زندہ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور وہ' جو کہ درحقیقت زندہ ہے' اس کی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ جو زندہ ہے وہ صرف حال کا گزرتا ہوا لمحہ ہے۔ ہم زندہ ہیں اور یہاں پر موجود ہیں محض اس واسطے سے کہ ہم باتیں کر رہے ہیں' کھا رہے ہیں' سو رہے ہیں یا کام کر رہے ہیں' مکمل طور پر حال کے گزرتے ہوئے لمحے میں کھوئے ہوئے' مجذوب! بعض کے لئے یہ اہم نہیں ہے اور بہت سوں کو اس کا علم ہی نہیں ہے۔ ہم اس قدر غیر یقینی طور پر دنیا میں رہتے ہیں کہ اپنے لئے دکھوں کا ایک عظیم سبب پیدا کر لیتے ہیں۔ ہم میں سے بہت سوں کے نزدیک ہم زندہ ہیں اس واسطے سے کہ ہمارا ایک ماضی ہے اور مستقبل ہے' محض اس واسطے سے! ہم آگے اور پیچھے دیکھتے ہیں پر سامنے نہیں دیکھتے۔ لیکن جو زندہ ہے' جو حقیقی ہے وہ صرف ہمارے سامنے ہے' اور بس! ہمارا ماضی اور مستقبل ایک بہت بڑا وسوسہ ہے جو مردہ ہے' ہمارا غیر حقیقی وجود ہے' اور غیر وجود سے وجود کی طرف آنے میں جو محنت درکار ہوتی ہے وہ ہمارے لئے ایک عظیم اور لاحاصل دکھ کا باعث بنتی ہے۔ ہم اکتا چکے ہیں' بے چین ہیں' ذہنی اور روحانی ابتری کی حالت میں ہیں' محض اس لئے کہ ہم زندہ نہیں ہیں' نیم زندہ ہیں۔ ساری بات یہ ہے۔

''ٹھیک ہے۔ موت بہر حال موجود ہے' میں جانتا ہوں۔ لیکن یہ اہم نہیں ہے۔ مکمل' ثابت و سالم موت ایک بے حد قدرتی ار آسان عمل ہے اور اسی طرح آتی ہے جیسے نیند یا محبت یا بھوک۔ صرف ایک منقسم موت تکلیف دہ ہے۔ منقسم لمحہ! حال کا مکمل لمحہ مکمل زندگی اور مکمل موت پر محیط ہے۔ یہ زندہ ہے اور تم اس کے ساتھ زندہ ہو' یہ مرتا ہے اور تم اس کے ساتھ مر جاتے ہو۔ اگلا لمحہ پیدا ہوتا ہے اور تم اس کے ساتھ نئے سرے سے پیدا ہوتے ہو' نئی زندگی میں' نئی موت کے لئے۔ ہر نئے لمحے کی پیدائش پر تم زندگی کے پُر امید اور روشن نومولود ہو' اس لئے کہ تم آگے اور پیچھے نہیں دیکھتے صرف سامنے دیکھتے ہو۔ تمہیں کچھ یاد نہیں ہے...... دنیا نے تمہارے ساتھ کتنی بدعہدی کی' لوگوں نے تمہیں کتنا سراہا' کتنی دور اندیشی کتنی خود غرضی سے کام لیا...... تمہارے پاس کوئی فہرست نہیں ہے۔ تم کچھ یاد نہیں رکھتے' کچھ فراموش نہیں کرتے۔ محض یہاں موجود ہو' زندگی کی ساری مسرت' سارے درد کو جانتے ہوئے زندہ ہو۔ یہ لمحہ' تم اور میں۔ دوسرا لمحہ' دوسرے 'تم' اور دوسرا 'میں'۔ اور پھر موت آتی ہے۔ لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں' اب یہ محض ایک اور لمحہ ہے جس کا سامنا کرنے کے لئے تمہارے پاس وہی پرانا رویہ ہے جو ہمیشہ سے

تمہارے پاس تھا۔ انتظار' انتظار کے دھڑکے کے سوا۔ ادراک' ادراک کی اذیت کے سوا۔ تم نے بیشمار بار اس کا سامنا کیا ہے۔ تم اس کو پہلے سے ہی جانتے ہو۔ تم اسے گزر جانے دیتے ہو' پیچھے کوئی نشان' کوئی یادداشت چھوڑے بغیر۔ ایک مکمل تجربہ۔ غیر منقسم لمحہ۔ مکمل موت۔ مکمل محبت۔ اگلا لمحہ؟ تمہارے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ آتا ہے یا نہیں۔ کبھی نہ تھی۔ یہ اصل زندگی ہے' سنا تم نے؟ کیا تمہارے دکھ کا دوسرا نام حماقت ہے؟ بتاؤ......

''تمہیں پتا ہے انسانوں کے درمیان کتنی بیزاری' کتنی کلبیت ہے۔ کتنا درد' ابتری' زندگی کے خالی اور لاحاصل ہونے کا احساس! ہم چھوٹے چھوٹے لوگ ہیں لیکن ہمارے اتنے بڑے بڑے غرور ہیں' بڑی بڑی خود پرستیاں اور خوش فہمیاں ہیں۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ اگر ہم ایک پل کو اپنے تکبر کو پرے رکھ دیں تو کتنی محبت کر سکتے ہیں۔ میں اپنی چھوٹی سی بے مقصد زندگی اسی فراغت اور دور اندیشی کے ساتھ گزار دوں گا جس طرح دنیا میں اور کروڑوں انسان روزانہ پُرقناعت اور بے فائدہ زندگیاں گزار رہے ہیں' اسی میکانکی' بے معنی طور پر جیسے کہ مکھی یا مچھر گزارتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ بتاؤ'' وہ اٹھ کر برمن جی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''بتاؤ۔ اس ڈھونگ کا کیا مطلب ہے۔ آخر کیا مطلب ہے؟ بتاؤ۔

''میں بتاؤں؟ سنو۔ ہم اپنی اپنی شخصی کوٹھریوں میں رہتے ہیں جن کے دروازوں کی درزیں اور روشن دانوں اور کھڑکیوں کے سوراخ ہم نے احتیاط سے بند کردیئے ہیں اور ان میں محصور ہو کر اپنی عقل' اپنے ایمان' اپنے تعصب' اپنی خود پرستی اور اپنی اہمیت کی حفاظت کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ ان قلعوں کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔ لیکن...... تم جانتے ہی ہو کہ دیواروں کی کیا وقعت ہے۔ ہم بھیڑوں کے گلے کی طرح ایک مشترکہ حماقت میں بندھے ہوئے ہیں۔ مشترکہ بدبختی میں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس لئے کہ میں 'سوچتا' ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں سارے لوگوں سے محبت نہیں کرتا اس لئے کہ میں 'سوچتا' ہوں کہ سارے لوگوں سے محبت نہیں کر سکتا۔ نتیجہ: میں کسی سے محبت نہیں کرتا۔ میں اپنے نظریات سے' اپنی عادات و خصائل سے' کبر نفس سے' اپنے ضدی پن سے' اپنی ساری تربیت سے' اپنے آپ سے محبت کرتا ہوں۔ تم......'' وہ کرسی میں بیٹھی ہوئی حیرت زدہ نجمی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''تم ایک خوبصورت لڑکی ہو۔ تم ایک شاندار اور دلکش شے ہو۔ ہر دفعہ جب میں تمہارے ایسی کسی لڑکی کو دیکھتا ہوں مجھ پر ایک مہیب حرص غلبہ پا لیتی ہے' حاصل کرنے کی' قبضے میں کرنے کی' Invest کرنے کی' جیسے نفع بخش کاروبار میں روپیہ لگایا جاتا ہے' طمانیت کی نہایت سطحی خوشی حاصل کرنے کی حرص۔ اور اسی لمحے' جانتی ہو' تم میرے لئے 'تم' نہیں رہتیں' پھر تم فلاں بنت فلاں نہیں رہتیں' پھر تم کیا بن جاتی ہو؟ کچھ بھی نہیں۔ پھر کچھ بھی نہیں رہتا' صرف میں رہ جاتا ہوں اور میری پرانی حرص' میری خود پرستی' میرا گھمنڈ' میری ضد رہ جاتی ہے۔ پھر وہی رہ جاتا ہے جو ہمیشہ سے تھا۔ میں اور میرے مختلف جذبے۔ اب تم اہم نہیں ہو' کچھ بھی نہیں ہو' زیادہ سے زیادہ ایک بدصورت لڑکی ہو جس سے میں نفرت کرتا ہوں۔ اب نفرت اوپر آجاتی ہے اور حیوانی جذبے۔ اب محبت کہیں نہیں ہے۔ صرف میری گزشتہ اور آنے والی زندگی کا عکس ہے جو میرے سامنے ہے' تم نہیں ہو۔ دفعتاً...... لیکن یوں محسوس

ہوتا ہے کہ ایک گزشتہ دھیمی اور لمبی تیاری کے بعد ...... میں محبت کرنے کی تمام اہلیت کھو دیتا ہوں۔ درحقیقت میں کہیں رہتا ہی نہیں ہوں۔ جو رہ جاتا ہے وہ صرف یہ ہے: میرا سارا پس منظر اور میری خواہشوں اور تمناؤں کی فہرست۔ ہر ایک حرص کے گزر جانے پر میری ضد' میری خواہشیں مضبوط تر ہو جاتی ہیں۔ اب وہ وقت آتا ہے جب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب میں کسی لڑکی سے' وہ کوئی سی بھی ہو' شادی کرلوں گا اور ایک قانع' مطمئن اور احمق شخص کی طرح زندگی بسر کرنے لگوں گا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ صرف اغراض و مقاصد رہ جائیں گے۔ اب 'میں' اور 'تم' اہم نہیں ہیں۔ جو اہم ہے وہ یہ ہے: روزگار مہیا کرنا' اور نیا فرنیچر اور فالتو وقت میں سوشل کام۔ دعوتوں پر جانا اور بدلے میں دوستوں کو مدعو کرنا' غرضیکہ شادی کے نتائج کو خالصتاً مادی فوائد کی شکل میں حاصل کرنے کی توقع کرنا۔ جاڑے کی طویل شامیں ایک دوسرے کی معیت میں پڑھتے ہوئے یا موسیقی سنتے ہوئے گزارنے' اور نئے لباس خریدنے' یا باورچی خانے کی نگہداشت کرنے اور سالگرہوں پر ایک دوسرے کو تحفے دینے کی نہایت معمولی خوشیوں کو اب ہم ایک مجوزہ پروگرام کے تحت سمیٹنے لگتے ہیں' جیسے روپیہ پیسہ یا دوسری جائداد اکٹھی کی جاتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ جو ہم بچوں میں اتنے انہماک سے دلچسپی لے رہے ہیں یہ بھی اپنی گم شدہ شخصیت کے نقصان کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے' محبت میں ہماری ناکامی کے سبب سے ہے' ہماری 'ڈس الوژن منٹ' ہے۔ ہم اپنی سطحیت کو طمانیت میں' اپنے احمق پن کو قناعت میں اور اپنی روحانی ناداری کو تن آسان زندگی کی گوناگوں مسرتوں میں غرق کرنے کی بے طرح کوشش کر رہے ہیں' بے طرح۔ سنا تم نے نجمہ بیگم' پھر ایسا ہوتا ہے۔'' اس نے ایک لمبا سانس لیا اور کندھے اچکا کر کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر وہ تیز' زہریلے طنز کے ساتھ ہنسا۔

''اب ہماری زندگی منظم ہے۔ اس کے بعد سے ہم ایک نظام کی پیروی کرنے لگتے ہیں' اس نظام کی خاطر زندہ رہتے ہیں۔ گھر کا نظام ...... دن بھر کے چار کھانے اور ان کے اوقات' بچوں کے لئے کھانے کی میز کا سلیقہ' سونے اور جاگنے کے اوقات ...... گھر کا نظام۔ اور سوسائٹی کا نظام اور ملک کا نظام اور مذہب کا نظام۔ یہ ہمارے لئے از حد اہم ہے کہ کسی نہ کسی ذریعے اپنی شخصیت کا اظہار کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ جب ناظم اعلیٰ پکارتا ہے: ''آؤ' ادھر آؤ' یہ ملک ہے۔ یہ سوسائٹی ہے' یہ ایک عظیم تر شے ہے۔'' تو ہم اس سے ایک عظیم روحانی تقویت حاصل کرتے ہیں اور اپنی سطحیت کے کچل دینے والے احساس سے بچ نکلنے کا بہترین راستہ۔ پھر 'نظام' اہم ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی کو اور تعزیرات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے' تم کو اور مجھ کو نہیں۔ پھر سوسائٹی 'مجھ' کو اور 'تم' کو بناتی ہے' میں یا تم سوسائٹی کو نہیں بناتے۔ ہم خود اپنی فراغت کے لئے اپنی شخصیت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتے ہیں۔ اور پتا ہے اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟ خودغرضی! میرا منہ کیا دیکھتے ہو۔ اب تم اتنے کند ذہن ہو چکے ہو کہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟ جب انسان' مرد اور عورت' اپنی انفرادیت کو کھو دیتے ہیں تو پھر جماعت اوپر آ جاتی ہے۔ اور سوسائٹی۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ سوسائٹی میں اس وقت سب سے بڑی طاقت لوگ نہیں ہیں' اغراض و مقاصد ہیں۔ اس نظام کے بنانے میں سب چیزیں مدد کرتی ہیں۔ ہمارے اصول' ہماری 'ڈس الوژن منٹ' ہماری سطحیت اور ازلی حماقت کا احساس' سب! جانتے

ہو اس وقت انسانوں کی سوسائٹی میں سب سے جاندار قوت امارت یا غربت یا قومیت یا مذہب یا کمیونزم نہیں ہے' خود غرضی ہے۔ منظم و منور خود غرضی۔ مستقبل انسانی کو ہم اپنا آپ محض چند مخصوص قوموں یا جماعتوں یا نسلوں یا سوشل ورکر گروپوں کی صورت میں پیش کر دیں گے جن میں تمیز کرنے کے لئے ان پر مختلف قومیتوں یا مذہبوں کے عنوان لگے ہوں گے۔ اب وہ وقت آیا ہے کہ ہمارے لئے اس دہشت ناک جنگل میں اپنی حفاظت کی خاطر جتھے اور غول بنانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔ اس طرف۔'' اس نے بازو سے اشارہ کیا۔ سب نے اچانک مشرق کی سمت میں دیکھا جہاں اندھیرا تھا اور شہر کی روشنیاں تھیں۔ ''ایک غول دوسرے غول پر جھپٹ رہا ہے' یا جھپٹنے والا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف ہم واپس جا رہے ہیں۔ اس طرف ......'' اس نے دوبارہ موہوم سا اشارہ کیا جس سے کسی سمت کا تعین نہ کیا جا سکتا تھا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔ صرف بادامی رنگ کا کتا پتوں کے ڈھیر پر سے انگڑائی لے کر اٹھا اور گھاس پر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا ان کے قریب آ کر جمائیاں لینے اور مسخروں کی طرح برساتی پتنگوں کا پیچھا کرنے لگا۔ ان کے چاروں طرف رات کی پُراسرار خاموش آوازیں پھیل رہی تھیں۔ ہوا درختوں میں اسی طرح مدھم اور مسلسل چلے جا رہی تھی۔

''آج جو کہیں بھی نہیں ہے ہمارا ضمیر یا مذہب یا احساس ذمہ داری نہیں' ہماری شخصیت ہے۔ ہم جو کھو چکے ہیں ضائع کر چکے ہیں ہماری انفرادیت ہے۔ آج فرد کہیں نہیں ہے' محض غول ہیں۔ تم جانتے ہو آج جو خوفناک احساس تنہائی ہم سب پہ طاری ہے کس لئے ہے؟ تم جانتے ہو' خوب جانتے ہو......''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ تم کوٹھری میں رہنے والوں اور غول بنانے والوں کو ایک ساتھ ناپسند کرتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں تم محض زہر اگل رہے ہو۔'' برمن جی نے اکتا کر کہا۔

''دونوں احساس تنہائی کے شکار ہیں' کھو چکے ہیں۔ گمشدہ ہیں۔ جو گمشدہ نہیں ہیں وہ کھڑکیاں اور روشن دان کھول دیتے ہیں تاکہ روشنی اور ہوا اندر آ سکے۔ اور کھڑکی میں سے جھک کر راہ چلتوں کو سلام کرتے ہیں اور ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور جب بلائے جاتے ہیں تو دروازے کھول کر باہر نکل آتے ہیں۔ وہ لوگوں کی باتیں سمجھتے ہیں اس لئے بے خوف ہیں اور آزادی سے گھومنے پھرنے کے بعد واپس چلے جاتے ہیں۔'' مسعود نے کہا۔

لیکن برمن جی کے بات کرنے سے کافی سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ اٹھ رہے تھے اور جلد جلد خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو رہے تھے۔ آخر میں صرف نے' خالد' نجمی اور مسعود رہ گئے۔ نجمی اٹھ کر سبزے پر احتیاط سے چلتی ہوئی پتوں کے ڈھیر کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اس پر پاؤں پھیرنے لگی۔ وہ مسعود کی بے ربط اور بظاہر بے معنی تقریر سے مرعوب نہ ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس کے ذہن میں مسعود کی گھٹیا تربیت اور اس کے طبقے کا احساس تیز ہو گیا تھا۔ اب وہ وہاں کھڑی اسے یکسر بھلا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے سوچا کہ وہ اس شخص سے مل کر کبھی بہت زیادہ خوش نہیں ہوئی' نجانے کیسے وہ ان کے حلقے میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے ناگواری کے ساتھ چند ماہ پہلے کی وہ شام یاد کی جب وہ پہلی بار عُزر کی بڑی بہن اندر کے ساتھ روشن محل آیا تھا اور گو اس کے پس

منظر کے متعلق کسی کو علم نہ تھا اور گو یہ معمول کے مطابق نہ تھا پھر بھی اس کی سنجیدگی اور صاف ستھرے مذاق کو دیکھ کر اسے اس خاص الخاص حلقے میں قبول کرلیا گیا تھا۔ وہ سردیوں کی بارش آلود شام تھی اور اندر نے اپنی سریلی آواز میں بھجن سنائے تھے۔ میں تو گردھر آگے ناچوں گی...... اور' اے ری میں تو پریم دیوانی......اور نجمی نے پیانو پر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اندر بالا۔ جانے اب کہاں ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ جنوبی ہندوستان میں کسی جگہ۔ اتنے اچھے اچھے دوست چلے جاتے ہیں۔ کیوں؟

اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی پشت پر کھڑا ہے اور وہ دفعتاً خوفزدہ ہوگئی۔ تیزی سے چند خیالات اس کے ذہن میں سے گزرے۔ جانے کس قسم کا آدمی ہے۔ اب کیا کرے گا۔ مجھے قتل کردے گا؟ خدایا' یہ کمبخت لوگ......اسے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا لیکن وہ کھڑی رہی۔ صرف اس کا پاؤں رک گیا اور پتوں کے ڈھیر پر پڑا آہستہ آہستہ کپکپانے لگا۔

ذرا بدلے ہوئے انداز میں مسعود بولنے لگا: ''نجمی تم میرے لئے انتہائی پُرکشش ہو۔ مگر جانتی ہو یہ کشش محض اس وجہ سے ہی نہیں کہ تم ایک خوبصورت لڑکی ہو' اس لئے بھی ہے کہ تم روشن محل میں پیدا ہوئی ہو۔'' وہ رکا۔ ''میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ہمارا ایک ایسا گھر ہوتا' قدیم وضع کا' لمبے لمبے ستونوں اور ہال کمروں والا' روغنی تصویریں جن میں نفیس داڑھیوں والے بڈھے مرصع لباس پہنے تلوار لگائے وائسرائے یا گورنر کے ہمراہ کھڑے ہوتے ہیں اور قدیم فرنیچر اور برسوں پرانے پیپل' برگد اور سفیدے کے درخت' دیرینہ جاہ وحشمت کے نشانات جو اس گھر میں پیدا ہونے والے ہر بچے میں شروع دن سے اعلیٰ اور نفیس قسم کا احساس برتری پیدا کردیتے ہیں۔ تین پشتوں سے سینہ بہ سینہ چلتا ہوا احساس برتری۔ میرے آباؤ اجداد؟ ہنہہ۔ کہاں سے آئے' کون تھے' کہاں گئے' کچھ پتا نہیں۔ آج میں اپنے لئے ایک مکان بنا سکتا ہوں مگر دیو قامت کہنہ سال دیودار اور برآمدوں پر لدی ہوئی بیلیں اور روغنی تصویریں' یہ سب جو تمہارے طبقے کے نشانات ہیں کہاں سے آئیں گے؟ اوں ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ان باتوں سے بہلنے والا نہیں جناب۔ میں تو ایسے گھر میں 'پیدا' ہونا چاہتا تھا' 'تیسری نسل' ہونا چاہتا تھا۔ میں وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا جو تم نے ورثے میں پایا ہے۔ تمہاری نفاست' تمہارا دماغ' تمہارا اخلاق' تمہاری تعلیم اور تربیت' ارسٹوکریسی کی تمام مرکب نعمتیں' سب ...... میں تم سے حسد کرتا ہوں۔ میرے دل میں تمہارے لئے دھیمی' سلگتی ہوئی رقابت ہے' اور بس۔ آخر میں اپنے ماضی سے بچ کر کہاں جاسکتا ہوں۔''

ٹھنڈے دل سے سوچا جاتا تو مسعود کی باتوں پر شاید کسی کو غصہ نہ آتا۔ لیکن نجمی کے پاس اس کے لئے محض حقارت تھی' وہ جذبہ جو انسان کے دل میں ایک چھوٹے سے جانور کو اپنے مقابلے پر کھڑا ہوتے دیکھ کر پیدا ہوتا ہے' جس میں غصہ' حقارت' خوف' سب ہی کچھ ہوتا ہے۔

وہ مڑی اور سیدھا اس کے چہرے پر دیکھ کر بولی: ''مسعود تم اب ...... اب جاؤ...... ابھی۔''

وہ چند لمحے تک خالی خالی نظروں سے نجمی کو دیکھتا رہا جو اب اس کی طرف پشت کرکے کھڑی ہوگئی تھی۔

پھر اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف، تقریباً بے نام اداس مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے کندھے اچکائے اور الوداع کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کا بدامی رنگ کا کتا چھوٹے چھوٹے مستعد اور وفادار قدم رکھتا ہوا ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

نجمی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر رفی اور خالد، جنہوں نے حیرت کے ساتھ یہ سب دیکھا تھا، سبزے پر سے اٹھے اور بے تکے، ہشاش بشاش چہرے اس کی طرف موڑ دیئے۔ پھر جلدی سے الوداع کہہ کر وہ بھی رخصت ہوئے۔

جب وہ اکیلی میز پر بیٹھی آہستہ آہستہ پاؤں ہلا رہی تھی تو کسی نے جلدی سے آ کر اطلاع دی کہ مسعود میاں کا فون آیا ہے۔

''وہ جا چکے ہیں۔'' اس نے میکانکی انداز میں کہا۔

پھر اس نے دہل کر مشرق کی طرف دیکھا جہاں اندھیرا تھا اور شہر کی روشنیاں تھیں اور رات کی پُراسرار آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

(۴۴)

نعیم اٹھ کر سیڑھیوں کے اوپر آ کھڑا ہوا۔ اس کے ماتھے اور آنکھوں پر روشنی پڑ رہی تھی اور نچلا چہرہ سائے میں تھا۔ خون کے دباؤ کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس پہ گہرے انہماک کی لکیریں تھیں۔ نجمی اس کی طرف پشت کئے، دونوں ہاتھ گود میں رکھے بے ترتیب کرسیوں، میزوں، بیڈمنٹن کے ریکٹوں، اخباروں، شربت کے گلاسوں اور آم کی قاشوں اور چھلکوں کے درمیان اکیلی میز پر بیٹھی تھی۔ اس کے بڑے سے سر اور تنگ، نازک پشت میں کوئی حرکت نہ تھی۔ ہوا تھم چکی تھی اور رات میں غیر معمولی بے چینی اور دور کا ہلکا ہلکا شور تھا۔ نعیم نے ستون پر سے ہاتھ اٹھایا اور سیڑھیاں اتر کر آہستہ آہستہ لان کی طرف بڑھا۔

نوکروں کے جھرمٹ میں رہنے کی عادی نجمی نے اسے اپنے پیچھے چلتے ہوئے سنا اور نظر انداز کر دیا۔ نعیم بکھرے ہوئے سامان کے درمیان چلتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس وقت نجمی اسے دیکھ کر چونک پڑی۔ وہ ذرا سی پشت موڑے، کرسی کے بازو کا سہارا لئے اُسی انہماک سے سبزے پر دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح نجمی کو دور کی خوشی کا احساس ہوا۔ اس کا یہ رشتے کا بھائی جسے وہ مدت سے جانتی تھی اور چاہنے کے باوجود جس کے بہت زیادہ نزدیک وہ کبھی نہ ہو سکی تھی، اس کے لئے ایک پُراسرار پُرکشش دوری کا حامل تھا۔ اس سے جب بھی وہ ملی اسے محسوس ہوا کہ اپنے نرمی اور خوش خلقی کے رویے کے باوجود وہ ایک بالکل الگ، بیگانہ ہستی تھی جس کے ساتھ بے تکلفی کی نوبت کبھی نہ آ سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ واحد شخص تھا جس کے بارے میں وہ ہمیشہ اپنے قدرتی طبقاتی تاثرات سے آزاد ہو کر سوچتی تھی۔ اس بات کا بھی اسے علم تھا کہ اس ادھیڑ عمر خوبصورت شخص سے جو اس کا نزدیکی رشتہ دار تھا، مل کر وہ ہمیشہ خوش ہوتی تھی اور اس کو خوش کرنے کی بھی ناقابل بیان خواہش محسوس کرتی تھی۔

نعیم نے جھک کر لپٹا ہوا کینوس اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔

''سر کا پورٹریٹ ہے۔'' وہ چھلانگ لگا کر میز سے اتری اور بچوں کی طرح تیز تیز آنکھیں اس کی طرف اٹھا کر بولی۔ ''آپ سر کو جانتے ہیں نعیم بھائی؟ سر بالا۔''

''سر بالا؟ ہاں۔''

''وہ آج نہیں آئی۔'' نجمی نے اداس ہو کر کہا۔

''وہ آج نہیں آئی۔ اچھا؟''

نعیم نے دہرایا۔ پھر وہ بلا وجہ آہستہ سے ہنسا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ نجمی اس کے سامنے میز پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور شکایتی لہجے میں بولی۔

''اتنی بار کہا آپ کا پورٹریٹ بنائیں گے' سٹنگ ہی نہیں دیتے۔''

''پورٹریٹ؟ ہاں دیں گے۔ دیں گے آپ کے دوست سارے چلے گئے؟''

''سارے چلے گئے۔'' نجمی نے دہرایا۔ ''مچھلی کا شکار؟''

''خوب رہا۔ خوب'' وہ ہنسا۔ ''ہمیشہ پوچھتی ہو۔''

''اور آپ ہمیشہ لے کر نہیں جاتے۔ اتنی بار کہا ہمیں بھی کبھی لے جائیں۔''

''آپ اپنی چھڑی اور ڈوری تو منگواتی نہیں۔''

''ارے مچھلی پکڑنے کون جا رہا ہے نعیم بھائی۔ آپ تو یاد ہی نہیں رکھتے۔ آپ کا پورٹریٹ بنائیں گے دریا کے کنارے پر اور...... ارے اتنا عمدہ رہے گا بھئی وہ جہاں دوسرے کنارے پہ چھوٹا سا جنگل ہے نہیں؟ وہیں پہ اس کنارے آپ دریا میں ڈوری پھینک کر ایک بڑے سے پتھر پر چڑھ کر اپنے خیال میں بیٹھے ہوں گے جیسے بیٹھا کرتے ہیں اور کندھے پر ایک کوا بیٹھا ہوگا اور...... اتنا کیریکٹر ہے آپ کے چہرے پر' پتا ہے آپ کو؟''

نعیم خاموشی سے ہنسا۔

''پھر وعدہ کیجئے اب کی بار ہمیں اور عذرا آپا کو لے کے جائیں گے۔''

''ہاں۔' ضرور لے جائیں گے۔''

اسے ایک عجیب انہماک سے اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر نجمی گھبرا کر چپ ہوگئی۔ وہ اس کی انوکھی طبیعت سے مرعوب بھی تھی اور خائف بھی' لیکن اس طرح سے وہ بہت کم اسے دیکھا کرتا تھا۔ دور کی آوازیں اٹھ رہی تھیں اور گر رہی تھی۔ کہیں پر شاید آگ لگا دی گئی تھی جس کی نارنجی روشنی آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی۔ برآمدے کا ٹیلی فون زور زور سے بجنا شروع ہوگیا۔

''عذرا نہیں۔ صرف تم۔'' نعیم نے کہا۔

''عذرا آپا نہیں؟''

نعیم نے کوئی جواب نہ دیا' صرف اسے دیکھتا رہا۔ ٹیلی فون تھوڑے تھوڑے وقفے پر مسلسل بجے جا رہا تھا۔ سارے نوکر کوٹھی کے پچھواڑے خوفزدہ بھیڑوں کی طرح جمع ہو کر شہر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ صرف ایک مہری برآمدے میں سہمی ہوئی ٹیلی فون کو اور نجمی کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ یہ آلہ قطعی طور پر اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ پل بھر میں نجمی پسینے میں بھیگ گئی۔

''انیس ٹھیک کہتا ہے۔ وہاں پر جا کر مجھے سکون ملتا ہے اور سکون ...... مجھے تم سے مل کر بھی ملتا ہے۔'' وہ اسی انہماک سے بول رہا تھا۔ ''تم مجھ سے کبھی نہیں ملتیں' بات نہیں کرتیں۔ کیوں؟''

''اوہ ...... اچھا؟ نہیں نعیم بھائی۔'' وہ کوشش کر کے ہنسی۔ ''لیکن عذرا آپا......''

نعیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ''تمہیں پتا ہے میری کیسی کوفت کی زندگی ہے؟ اس سے بچنے کے لئے میں ہر جگہ مارا مارا پھرتا ہوں۔ میری بیوی ...... اس کے ساتھ ایک مدت گزر گئی' مجھے کچھ نہیں دے سکی۔ اور تم ...... اتنی ذہین ہو۔ تمہارا دماغ ...... میں اس کے ساتھ حیوانوں کی طرح رہتا ہوں۔ اور تم۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی اور گال اور ہونٹوں کو چھوا۔ ''تمہارا ذہن ...... میں نے ہمیشہ تمہارے ایسی لڑکی کی تمنا......''

نجمی' جو ششدر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی' میز پر سے ذرا سی اٹھی' پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

نعیم حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس بلاخیز' طوفانی جذبے میں سے نکل آیا۔ آہستہ آہستہ وہ کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ صدمے اور دہشت کے ایک شفاف لمحے نے سارے واقعے کی نوعیت اس پر عیاں کر دی۔ اسی لمحے میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گا۔ تقریباً بھاگتا ہوا' میزوں کرسیوں سے ٹکراتا وہ اپنے کمروں کی طرف بڑھا۔ نجمی نے پانی کے جگ کے گر کر ٹوٹنے کی آواز سنی اور ہاتھ ہٹا کر جھلملاتی آنکھوں سے اسے لنگڑا کر چلتی ہوئی شبیہہ کو' جو زندگی کی ناقابل تسخیر علامت تھی' غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ عذرا حسب معمول نعیم سے اس کے اتوار کے شکار کے متعلق پوچھ پاچھ کر اور اس کی خاموشی سے تنگ آ کر سو چکی تھی لیکن اس کا ایک بازو ابھی تک نعیم کی چھاتی پر بے سدھ پڑا تھا۔ نعیم بازو سر کے نیچے رکھے بے خواب آنکھوں سے اندھیرے میں چھت پر اور اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ گرمی اور حبس کی وجہ سے اس کا جسم پسینے سے تر تھا لیکن اس کے دل میں ہر جذبہ سرد ہو چکا تھا اور ذہن خالی تھا۔ اس نے کئی بار چوڑے' آرام دہ بستر پر اپنے آپ کو پھیلا کر سونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ کھلی کھڑکی میں یوکلپٹس کے پتے سیاہ پتھروں کی طرح ساکن تھے اور ان کے پیچھے مٹیالا بے جان سا چاند ابھی ابھی اوپر آیا تھا۔ شہر کی جانب سے آوازیں مسلسل آ رہی تھیں' کبھی دور' کبھی نزدیک۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت لیٹا ان کے زیر و بم کو محسوس کرتا رہا حتیٰ کہ اس کا بازو سر کے نیچے رکھا رکھا سو گیا۔ کمرے میں صرف پنکھے کے چلنے اور عذرا کے خراٹوں کی ہلکی ہلکی مانوس آواز تھی۔ رات کی کمزور روشنی میں اس نے اپنے سینے پر پڑے ہوئے عذرا کے ہاتھ کو دیکھا جس کی انگلیاں نیند میں

آپ سے آپ ہل رہی تھیں۔ کیسی سکون کی نیند ہے تمہاری' اس نے دل میں کہا۔ اور اس کے اندر حسد کا تیز احساس پیدا ہوا۔ لیکن اس کے دل میں اب اتنا زور نہیں رہا تھا کہ اس طاقتور جذبے کو سہار سکتا۔ اندھیرے میں بے حس و حرکت تکلیف سہتے ہوئے اب ایک عجیب سرد مہری اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ اس نے سر موڑ کر دیکھا۔ گوشت پوست کا یہ ڈھونگ' یہ کیا ہے؟ یہ عورت' کیا سمجھتی ہے' کیا سوچتی ہے' کتنی بے حس اور لاپروا ہے۔ اسے مجھ سے کیا غرض ہے' کیا تعلق ہے؟ اتنا پھسپھسا رشتہ اتنی مدت سے قائم ہے! دفعتاً اس نے اس عورت سے' جو ربع صدی سے اس کی بیوی تھی' شدید بیزاری اور لاتعلقی محسوس کی۔ اس کے بازو کو جھٹکے سے ہٹا کر وہ اٹھا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ چاند اوپر آ گیا تھا اور رات میں جان پڑ رہی تھی۔ آگ کی روشنی اب سارے آسمان پر پھیل چکی تھی اور دور کی موسیقی کی طرح آوازیں کبھی مدھم کبھی تیز آ رہی تھیں۔

عذرا کی آنکھ کھلی اور اپنے آپ کو اکیلے پا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر آنکھیں مل کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور نعیم کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''نعیم'' اس نے سہم کر کہا۔ ''شہر میں شاید فساد ہو گیا۔ گیٹ پر چوکیدار......''

نعیم نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر یکساں' سپاٹ آواز میں بولا۔

''نکل جاؤ یہاں سے۔''

عذرا کی آنکھوں کے آگے سے اندھیرے کا ایک ریلا تیزی سے گزر گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی پرانی خُو بیدار ہوئی' لیکن اب عمر کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ وہ چکرا کر سٹول پر بیٹھ گئی۔ نعیم نے پلنگ پر سے ڈریسنگ گاؤن اٹھایا اور اسے پہنتا ہوا باہر نکل گیا۔

گیٹ پر چوکیداروں نے اسے باہر نکلتے ہوئے حیرت سے دیکھا۔ سڑک لمبی اور سنسان تھی اور بجلی کے کھمبوں پر روشنیاں سستی اور یکسانیت سے جل رہی تھیں۔ جب کبھی وہ کھمبے کے نیچے سے گزرتا تو دو چار برساتی پتنگے اس کے بالوں پر گرتے' یا کسی کوٹھی کا کتا اس پر بھونکتا۔ اس کے علاوہ اسے اپنی تنہا مسافرت میں کوئی نہ ملا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا گیا حتیٰ' سڑک داہنی طرف مڑ کر شہر کی حدود میں داخل ہو گئی۔

وہ ایک بازار میں سے گزر رہا تھا جہاں اندھیرا تھا اور تمام دکانیں بند تھیں۔ دکانوں کے تختوں پر جگہ جگہ چارپائیاں بچھی تھیں جن پر سے سوتے ہوئے لوگ اٹھ کر جانے کہاں جا چکے تھے۔ کئی ایک چارپائیوں پر آوارہ کتے چڑھ کر بیٹھے اونگھ رہے تھے یا مکروہ آوازوں میں رو رہے تھے۔ پھر ایک چھوٹی سی گلی آئی جسے پار کرنے پر دوسرا لمبا بازار شروع ہوا جس میں بجلی کے کھمبوں پر روشنیاں تھیں اور پتنگے تھے۔ چارپائیاں اسی طرح خالی پڑی تھیں اور کتے اسے دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگے تھے۔ یہ بازار بہت گندا تھا اور کھانے پینے کی اشیاء بکھری پڑی تھیں۔ بازار کے وسط میں نعیم کا پاؤں کسی پھل کے چھلکے پر سے پھسلا اور وہ پیٹھ کے بل زمین پر آ رہا۔ اس نے اٹھ کر ایک سلیپر' جو اتر گیا تھا' پہنا اور پھر چل پڑا۔ اس کے بعد ایک اور اسی قسم کا بازار آیا جس میں آم اور خربوزوں کے چھلکوں اور کتوں سے بچتا

بچاتا وہ گزرتا رہا۔ کتے آوارہ اور کاہل تھے اور صرف بھونکنے یا رونے پر مصر تھے۔ کتے کا ایک پلا سامنے سے گزرتا ہوا اس کی ٹانگوں میں الجھ گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ پلے نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا لیکن اس کی ماں' جو ایک خالی چارپائی پر نیم دراز تھی' قناعت سے پڑی روتی رہی۔ اسی طرح اس نے کئی اندھیری اور نیم اندھیری بدبودار گلیاں پار کیں۔ کوئی انسان اس کو نظر نہ آیا۔ صرف ملی جلی آوازوں کا شور اور آگ کی لہک قریب آتی گئی۔ آخری گلی میں اتنا شور تھا کہ اس نے محسوس کیا جیسے وہ اس کے درمیان کھڑا ہے۔ گلی سنسان تھی اور وہ اکیلا وہاں کھڑا تھا۔ دونوں جانب اونچے اونچے مکان اندھیرے میں پتھریلی بے حسی کے ساتھ کھڑے تھے اور ان کے دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند تھے۔ چلتے چلتے نعیم کا پاؤں پھسل کر گلی کے درمیان بہتی ہوئی نالی میں جا پڑا اور گندے پانی کے چھینٹے اڑ کر اس کے پاجامے پر پھیل گئے۔ اس نے جھک کر سلیپر نالی سے نکالا اور اسے پہنتے ہوئے ایک لمحے کو اس نے اس جگہ پر اپنے آپ کو بے حد اجنبی اور تنہا اور مضحکہ خیز محسوس کیا۔ لیکن جلتی ہوئی لکڑی کی بُو اب اس کی ناک میں داخل ہو رہی تھی اور دھواں گلی میں پھیل رہا تھا۔ گلی کا موڑ مڑنے پر اچانک وہ اس ساری تڑ پھلاہٹ کے درمیان پہنچ گیا۔

یہ ایک کھلا سا احاطہ تھا جیسا کہ پرانے محلوں میں کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا ہے۔ نعیم کے عین سامنے تین چار اونچے اونچے مکان دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ ہوا کی کمی کی وجہ سے دھواں وہیں پر بھر گیا تھا اور چاروں طرف لوگ' جو تماشہ دیکھنے کے لیے اپنے اپنے مکانوں کے دروازوں پر اکٹھے ہو گئے تھے' آنسو بھری آنکھوں کو بار بار پونچھ رہے تھے اور ناک صاف کر رہے تھے۔ آگ بجھانے کی کوشش کوئی نہ کر رہا تھا۔ صرف ایک فائر بریگیڈ کا انجن' جو اندر نہ آ سکتا تھا' باہر سڑک پر کھڑا تھا اور ند فائر مین اس کے پتلے سے پائپ کے ذریعے سے' جو اتنی بڑی آگ کے لئے نہایت ناکافی تھا' پانی پھینک رہے تھے۔ جلتے ہوئے مکانوں کے آس پاس کے گھروں میں سے سامان نکالا جا رہا تھا اور ڈرے ہوئے جسموں اور شدید خطرے کی وجہ سے خالی چہروں والے لوگ چیخ چیخ کر اندر باہر بھاگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر پسینے کی لکیریں چل رہی تھیں اور وہ آگ میں چمک رہے تھے۔ چند ایک پولیس کے سپاہی بلا وجہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ مخالف سمت میں گلی کے فرش پر چند کنبے اپنے مختصر سامان کے اوپر بیٹھے تھے اور مکمل طور پر خالی الذہن دکھائی دے رہے تھے۔ یہ شاید وہ لوگ تھے جو جلتے ہوئے مکانوں میں سے جان بچا کر نکلے تھے اور جن کی عورتیں اور بچے رو رہے تھے اور مرد سراسیمہ کھڑے تھے۔ ایک جوان مرد' جو چیخ چیخ کر اپنے کنبے کو چپ رہنے کی تلقین کر رہا تھا' آخر برداشت نہ کر سکا اور کود کود کر اپنی بیوی اور بچوں کو پیٹنے لگا۔ وہیں کھڑے کھڑے نعیم نے اس سارے منظر کے شدید الم اور مضحکے کو محسوس کیا اور چل پڑا۔ اس سارے ہجوم میں کسی نے بھی اس اکلوتے' جسم چرا کر نکلتے ہوئے انسان کی افتاد کو نہ پہچانا کہ اجتماعی انسانی افتاد اس قدر جاذب نگاہ ہوتی ہے۔

فائر انجن کے پاس پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ بلوائیوں کا ایک گروہ ایک اندھیری گلی میں سے نمودار ہو کر آناً فاناً دوسری اندھیری گلی میں غائب ہو گیا۔ انہوں نے لنگوٹ اور منڈا سے باندھ رکھے تھے اور پسینے میں نہائے ہوئے سیاہ جسم آگ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ چند پولیس کے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ ایک ثانیہ لیکن

اس ایک ثانیے میں نجمی نے اس گروہ میں ایک بے حد مانوس اور عزیز چہرہ پہچان لیا۔ بلوائیوں کے گروہ میں سے ہونے کے باوجود وہ چہرہ نعیم کے لئے محض ایک ڈر کر بھاگتے ہوئے بچے کا تھا۔ اس کے سرد مہر دل میں اس کے لئے ایسی گھمبیر محبت کی لہر اٹھی جو باپ کے دل میں گمشدہ بچے کے لئے پیدا ہوتی ہے اور پہلی دفعہ اس نے اس سارے منظر میں اپنے آپ کو جذباتی طور پر شریک محسوس کیا۔

''وہ یہاں ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

وہ سڑک پار کر رہا تھا جب ایک سپاہی نے بازو سے پکڑ کر اسے روکا۔

''کون ہو تم؟'' پھر بازو کی غیر معمولی سختی کو محسوس کر کے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

نعیم نے جلد جلد آستین چڑھا کر ننگا بازو آگے بڑھا دیا۔ سپاہی نے ٹارچ کی روشنی میں حیرت سے اسے اپنے ڈنڈے کی مدد سے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ پھر اس کے لبوں پر ایک نفرت انگیز تمسخر کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کون ہو تم؟''

''میں؟''

''تو کیا میں؟'' سپاہی نے کڑک کر کہا۔

''نعیم احمد خان۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''میں؟ کہیں نہیں۔''

''میں میں میں ...... حرامزادہ' بیٹھ جاؤ وہاں پر۔''

نعیم سڑک کے کنارے ایک دکان کے تختے پر بیٹھ گیا۔ سپاہی اِدھر اُدھر گھوم کر اندھیری گلیوں میں جھانکتا رہا۔ پھر ایک گلی میں سے دو اور سپاہی نمودار ہوئے۔ تینوں نے جلد جلد آپس میں باتیں کیں اور اسی گلی میں غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرنے کے بعد نعیم اٹھ کر چل پڑا۔

کئی سنسان بازار اور گلیاں عبور کرنے کے بعد وہ ایک کھلی سڑک پر نکل آیا۔ یہ سڑک کوئنز روڈ کی طرح سیدھی اور خالی تھی اور دونوں طرف روشنیاں اکتاہٹ کے ساتھ جل رہی تھیں۔ اس سڑک پر پھر پتنگے اس کے بالوں پر گرنے اور اکا دُکا رکھوالا کتے اس پر بھونکنے شروع ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر وہ ایک کوٹھی میں داخل ہوا۔ پورچ میں ایک مدھم سی بتی جل رہی تھی۔ آس پاس کوئی کتا یا چوکیدار نہ تھا۔ اسی عجلت سے برآمدے میں چڑھ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ ایک بار دو بار تین بار۔ زندگی کے کوئی آثار نہ پا کر اس نے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھی اور ایک منٹ تک اسے دبائے رکھا۔ ایک بوڑھا ملازم کوٹھی کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ کچھ دیر تک وہ حیرت سے منہ کھولے نعیم کو دیکھتا رہا' پھر الٹے پاؤں بھاگتا ہوا غائب ہو گیا۔

''روشن محل کے نعیم میاں۔'' اس نے پھولے ہوئے سانس سے ایک ماما کو اطلاع دی۔

تھوڑی دیر کے بعد اندر بتی جلی اور انیس نے دروازہ کھولا۔

''نعیم۔'' اس نے سر سے لے کر پاؤں تک دو تین بار اسے دیکھا پھر بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''گھر سے۔''

بازو سے پکڑے پکڑے راستے کے کمروں کی بتیاں جلاتا ہوا وہ اسے اپنی سٹڈی میں لے گیا۔

''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' نعیم نے معمولی لہجے میں کہا۔

چند لمحے تک اسے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد انیس گال پھلا کر جھلاہٹ اور طنز سے ہنسا: ''تین بجے ہیں۔'' جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ماما کو چلمچی میں گرم پانی لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ پانی لے کر آ گئی اور اس کے پاؤں دھونے لگی۔ اس وقت نعیم نے دیکھا کہ اس کے پاؤں میں صرف ایک سلیپر تھا۔ اتنی دیر میں انیس نے ایک صاف پاجامہ اور سلیپر لا کر رکھ دیئے۔ جب ماما چلی گئی تو نعیم تولیے سے پاؤں خشک کرنے لگا۔

''شہر میں فساد ہو رہا ہے۔'' انیس نے کہا۔

''ہاں۔'' نعیم نے جواب دیا۔ پھر انیس کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ جھینپ کر ہنسا۔ ''نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں یہاں چلا آیا۔ شکریہ۔''

''چائے پیو گے؟''

''نہیں انیس۔'' نعیم نے کہا۔ ''مجھے ...... بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''تو نیند آور دوا کھا لی ہوتی۔''

''اوہ نہیں ...... انیس۔ تم نہیں سمجھتے۔'' اس نے کرسی کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کئی لمحے تک وہ اسی طرح پڑا تیز تیز سانس لیتا رہا۔ پھر سانس ہلکا ہوتا ہوتا بالکل غائب ہو گیا۔ دفعتاً انیس کو ایک عجیب بے چینی نے گھیر لیا۔ نعیم کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور اس کے ماتھے پر چند پتنگے آرام سے چل پھر رہے تھے۔ اس کے بڑے سے بے رنگ اور تھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر انیس کو محسوس ہوا کہ یہ ایک مرے ہوئے آدمی کا چہرہ تھا۔ اس نے اس کے قدیم اندرونی دکھ کو صاف طور پر اس کے بے حس چہرے پر دیکھا اور اسے خیال ہوا کہ یہ صدیوں کا تنہا' مصیبت زدہ نسان آج اس کے گھر میں آ کر مر گیا ہے۔ وہ گھبرا کر جلد جلد فساد کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ نعیم نے آنکھیں کھولیں اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔

''نہیں انیس میں ...... تکلیف میں ہوں۔ میری بات سنو۔ میں اس لڑکی کے ساتھ سویا اور پھر اسے چھوڑ کر چلا آیا۔ طویل عرصہ گزر گیا ہے' وہ آج بھی میرے دل پر ہے۔ آج بھی۔''

''کون؟ کب؟''

''ایک لڑکی تھی۔ بہت پہلے۔''

''کون سی ایسی بات ہے۔'' کچھ دیر کے بعد انیس نے کہا۔ ''عمر میں کئی بار انسان کو محبت ہو جاتی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ چند مذہبی رسوم......''

''نہیں یہ بات نہیں۔ محبت میں سب کچھ آ جاتا ہے' رسوم اور رواج اور سب۔ میں ان باتوں میں یقین نہیں رکھتا۔ لیکن محبت کہاں تھی۔ میں محبت کے بغیر اس کے ساتھ سو گیا' حیوانیت کی خاطر' اپنی بدبختی اور افتاد کا بدلہ لینے کی خاطر۔ کمزور اور معصوم لڑکی۔ میں نے اسے تباہ کر دیا' محبت کے بغیر۔ اور اس کے بعد سے وہ میرے دل پر ہے۔ میں کسی بھی عورت سے محبت نہیں کر سکا' اپنی بیوی سے بھی نہیں۔ اتنی مدت ہوئی میں کبھی دل میں امن لے کر اس کے ساتھ نہیں سو سکا۔ یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔ وہ ہمیشہ میرے دل پر سوار رہی...... اور میرے دل پر وہ بھی سوار رہا۔'' نعیم نے سستی سے آنکھیں اٹھا کر انیس کی طرف دیکھا۔ ''وہ شخص جسے میں نے قتل کیا۔''

''قتل؟''

''نہیں میں نے اسے کوئی ضرب نہیں لگائی۔ صرف میں نے اسے...... قتل کر دیا۔ میدان جنگ میں وہ ایک بہادر اور خوش بخت شخص تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کی باتیں کیں اور میں نے اپنی بدبختی میں خواہش کی کہ وہ مارا جائے۔ میں بارود لا رہا تھا کہ میں نے انہیں دیکھا۔ بندوقیں سیدھی کئے ان کی سیاہ لمبی قطار بڑھتی آ رہی تھی۔ خندق میں سے اس نے پوچھا۔ ''نعیم تم زخمی ہو؟'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دلیر آدمی تھا۔ مجھے بچانے کے لئے باہر نکل آیا اور انہوں نے اسے چھلنی کر دیا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔'' وہ دیر تک رکا رہا۔ ''لیکن اس کا ڈھلکی ہوئی مونچھوں والا زرد چہرہ چاند کی روشنی میں ابھی تک وہیں پڑا ہے۔ وہ کبھی میرے سامنے سے نہیں ہٹا۔ کبھی نہیں۔ اس کے بعد ایک مدت گزر گئی ہے میں کسی شخص سے قدرتی تعلقات قائم نہیں کر سکا۔ کوئی دوست نہیں بنا سکا۔ میں ہمیشہ لوگوں کی موجودگی میں بے چینی محسوس کرتا رہا' کبھی کسی پر اعتماد نہیں کر سکا۔ بتاؤ انیس میں کب تک زندگی کے جرائم کو ساتھ لئے لئے پھرتا رہوں گا۔ یا میں محض تمہارے سامنے ان کا اعتراف کر کے سرخرو ہو سکتا ہوں؟ بتاؤ۔''

انیس خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پہلی دفعہ وہ اس شخص کے لئے گہری ہمدردی اور رنج محسوس کر رہا تھا۔ شاید پہلی بار اس پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ شخص' جسے وہ اتنے عرصے تک احمق سمجھتا رہا تھا آخر اتنا احمق نہ تھا۔ کہ وہ بہت کچھ جانتا تھا مگر صرف سزا بھگت رہا تھا' کہ اس میں اتنا ضمیر' اتنی ذہانت موجود تھی کہ ایک طویل عرصے تک بے زبانی اور مظلومیت کے ساتھ ایک مسلسل موت کی اذیت برداشت کرتا رہا تھا۔

''میں اپنے ضمیر کے ستم اٹھاتا رہا ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں اسے ختم نہیں کر سکا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم قابل رشک ہو۔ تم نے اسے ختم کر دیا ہے۔ مگر کیسے؟ کیسے؟ خدارا بتاؤ......''

''پچھتاوے...... ہمارے سب سے لاحاصل جذبے ہیں۔'' انیس الرحمان نے کہا لیکن یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو بے حد کمینہ اور احمق محسوس کیا۔

''اور آج میں نے علی کو بھی دیکھا ہے۔'' نعیم بولا۔ ''میرا بھائی' جسے میں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ یہیں پر ہے۔ وہ میرا خون ہے پر میں نہیں جانتا کہاں پر ہے۔ اور میں نے ایک دفعہ ایک دوست سے باتیں کی تھیں جو مر چکا تھا۔ کیا دیکھتے ہو' یہ سچ ہے۔ میں نے صاف طور پر' جیسے تم میرے سامنے بیٹھے ہو' دیکھا کہ وہ شخص مر چکا ہے۔ اور وہ میرا دوست تھا اور مجھ سے ہمکلام تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد کسی نے مجھے بتایا کہ وہ میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ لیکن موت تو ایک ہی ہوتی ہے اور میں نے اسے دیکھا ہے۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس کی موت کا ذمہ دار بھی میں ہوں۔''

''خیال ہوتا ہے خیال ہوتا ہے۔'' انیس خفا ہو کر بولا۔ ''تمہاری سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ اوٹ پٹانگ خیال دوڑاتے رہتے ہو۔ مت سوچو۔''

''اور آج شام نجمی کو میں نے دیکھا۔'' نعیم اسی طرح دیر تک باتیں کرتا رہا۔ انیس نے پھر اسے نہیں ٹوکا' بولنے دیا۔ وہ دنیا میں مستقل چھوٹے بڑے دکھ سہتا ہوا قدیمی شریف انسان تھا' جس کے دل پر سے' سارے وجود پر سے ایک عظیم بوجھ آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا' بوجھ' جسے وہ بے زبان' بار بردار جانور کی طرح ایک مدت تک اٹھائے اٹھائے پھرا تھا۔

آخر کار وہ تھک کر چپ ہو گیا اور کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر اونگھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ وہیں پڑا پڑا سو گیا۔ باہر ایک نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔

اسی روز کوئی وجہ بتائے بغیر وہ عذرا کو لے کر ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گیا۔ روشن محل کے ملازم کئی روز تک اس کا سامان وہاں پہنچاتے رہے۔

پارلیمنٹ ہاؤس میں عجیب گہما گہمی تھی۔ ہند کی مکمل آزادی کے لئے آخری گفت وشنید ہو رہی تھی۔ لارڈ مونٹ بیٹن اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پارلیمنٹ میں اور گورنر جنرل ہاؤس میں کانفرنسیں بلاتے رہتے تھے اور ملک بھر سے سول نافرمانی کی تحریک کی وحشت ناک خبریں وصول ہوتی رہتی تھیں۔ ملک کی دونوں بڑی پارٹیوں' کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈر دلی میں جمع تھے اور وائسرائے مونٹ بیٹن سے ملنے میں مصروف تھے۔ ہر طرف عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ملک کے مستقبل کے متعلق ہر کوئی اپنی سی پیش گوئی کر رہا تھا لیکن ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مکمل بے یقینی اور بے اعتمادی کی حالت میں تھا۔ روزانہ زندگی کا ہر کاروبار معطل ہو چکا تھا۔ ملک کے بٹوارے کی خبریں گرم تھیں اور لوگ ایک جاں گسل درمیانی وقفے سے گزر رہے تھے۔ چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر ابتری کا وہ دور تھا کہ پہلے کبھی نہ آیا تھا۔

وزارت داخلہ کے پارلیمنٹری سیکرٹری کے دفتر میں بھی ایک خاموش ہنگامہ تھا جس میں سب شریک تھے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ' کلرک' چپڑاسی اور تمام چھوٹے بڑے اہلکار انیس کی سربراہی میں اپنے کام میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ کانفرنس روم کی طرف اور پارلیمنٹ کی عمارت کے باہر مظاہرہ کرنے والے ہجوم کی

طرف بھی متوجہ تھے۔ صرف نعیم تھا جو بیکار پھر رہا تھا۔ دفتر آتے ہی اس نے کام میں مصروف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر میں اسے سخت نیند آنے لگی اور وہ قلم رکھ کر کرسی پر ہی سو گیا۔ چند منٹ کے بعد جب وہ جاگا تو حیرت انگیز طور پر پُرسکون تھا اور ہر چیز اجنبی اجنبی اور خوشگوار لگ رہی تھی۔ وہ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے آگے جا کھڑا ہوا۔ باہر ایک نہایت چمکدار اور گرم صبح تھی اور دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ پارلیمنٹ کی عمارت جہاں ختم ہوتی تھی ایک کھلا سا صاف ستھرا میدان تھا جس میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ سایہ دار درخت لگے تھے۔ اس سے پرے چوڑی سڑک تھی جس پر پولیس کا پہرہ تھا۔ پھر ایک لمبا چوڑا ریلتا پیلتا ہوا ہجوم تھا جو نعرے لگا رہا تھا اور پولیس کے پہرے کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کا ہلکا ہلکا شور تقریباً شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح نعیم تک پہنچ رہا تھا۔ وہ آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑکی میں کھڑا اس گرد کے بادل کو دیکھتا رہا جو ہزاروں پاؤں پٹکتے اور کودتے ہوئے لوگوں میں سے اٹھ اٹھ کر ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ اس وقت وہاں کھڑے کھڑے نعیم نے محسوس کیا کہ وہ ان سب سے الگ تھلگ' اوپر کہیں' تنہا کھڑا ہے' اس شور مچاتے ہوئے ہجوم اور مشین کی طرح کام کرتے ہوئے اہلکاروں سے اوپر' اس تنہا مقام پہ جہاں وہ کھڑا ہے۔ فضا خاموش اور خوبصورت ہے اور روشنی سارے میں پھیلی ہوئی ہے اور زندگی صاف' نیلے آسمان کی طرح پُرامن اور وسیع ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے مسرور سانس لئے اور انیس الرحمان کی موجودگی کو' جو اس دوران میں آ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا' قطعی محسوس نہ کیا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو انیس باہر دیکھتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔

''غول۔غول ...... شور مچاتے ہوئے' اچھلتے کودتے دھکیلتے ہوئے' بے ترتیب اور غلیظ۔'' ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ ''سؤروں کے گلے کی طرح۔''

نعیم بے خیالی سے اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ دوبارہ جا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تو نعیم برآمدوں میں ٹہلتا ہوا کانفرنس روم کی طرف نکل آیا۔ اس وقت وہ تمام اس کے سامنے سے گزر کر اندر داخل ہوئے: نہرو' راجگوپال اچاریہ' پٹیل' کرپلانی' جناح' لیاقت' بلدیو سنگھ۔ ایک ایک کر کے سب۔ پھر دروازے بند کر دیئے گئے۔ وہ ٹہلتا ہوا واپس کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ پھر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

دور کے ہجوم میں اسے دوبارہ وہ گمشدہ' عزیز چہرہ نظر آیا۔

''علی! علی'' گرم دھات کی طرح پگھل کر اس نے دہرایا اور آپ سے آپ اس کا تندرست بازو اس سمت میں اٹھ گیا۔ وہ پسینے اور گرد میں اٹا ہوا' بازو بلند کر کے اچھلتا ہوا سیاہ محبوب جسم ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ نعیم کا بازو آپ سے آپ نیچے گر گیا اور حیران پریشان نگاہیں ہزاروں انسانی سروں اور بازوؤں کے اوپر اوپر بھٹکنے لگیں۔ اب؟

اب اس کے سامنے علی نہ تھا' ہجوم بھی نہ تھا۔ اس کے سامنے اس کی گم شدہ جوانی تھی' اس کی ساری گزشتہ جدوجہد تھی' اس کی زندگی تھی۔ وہ تمام ارادے' امنگیں' ولولے' وہ ساری جدوجہد محض اس دن کے لئے کی گئی

تھی۔ اس نے سوچا: ''محض اس دن کے لئے؟'' اس نے سوال کیا: ''کہ آخر کار ہم بھلا دیئے جائیں' کہ ایک طویل اور تکلیف دہ زندگی بسر کرنے کے بعد بوڑھے اور صرف بوڑھے ہونے کے لئے اس قدر اکیلے رہ جائیں؟ یہ کیا ہے؟ میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ ساری زندگی' سارے دکھ کے معنی تلاش کرتا ہوا میں کہاں آ پہنچا ہوں؟ اپنی ساری جدجہد کا جواز ڈھونڈنے میں کہاں آیا ہوں؟ آخر کہاں؟ محض یہاں؟......'' اس وقت اس جوش سے چلاّتے ہوئے ضدی اور گستاخ اور گرد آلود ہجوم کو دیکھ کر وزنی اور کند احساس کا ایک ریلا آیا' اور جیسے سمندر کی تہہ میں بیٹھا ہوا پتھر گہرے طوفان میں اک دم اٹھ آتا ہے' نعیم کے دل میں بھاری اور کند درد پیدا ہوا۔ بچھڑ جانے کا' پیچھے رہ جانے کا' بھٹک جانے کا' ضائع ہو جانے کا! چند منٹ کے لئے وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا۔

پھر اس خلا میں سے اس کا موجودہ دکھ ابھرا۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اس نے تصور کیا اور صاف طور پر دیکھا کہ انیس اپنی تمامتر حیوانی قوت کے ساتھ اٹھ رہا ہے' بیٹھ رہا ہے' مڑ رہا ہے' کام میں مصروف ہے اور باتیں کر رہا ہے' تندہی سے فائلوں کے ڈھیر میں گم ہے اور انہیں پڑھ رہا ہے اور اٹھا اٹھا کر پرنسپل سیکرٹری کے دفتر میں لئے جا رہا ہے اور کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہے اور ساری دنیا سے نفرت کر رہا ہے' دوسرے تمام لوگوں کو اور تمام واقعات کو اپنے طنز' اپنی دنیا داری اور اپنی ہوشیاری میں غرق کر رہا ہے' ایک بے حد باضمیر اور ہنس مکھ اور دانا مشین ہے جو اپنے زور پر چلے جا رہی ہے' ایک حیوان ہے جو محض عادتاً زندہ ہے' کام کر رہا ہے۔ اور یہ شخص' اس نے سوچا' یہ شخص اتنا کچھ جانتا ہے' سب کچھ جانتا ہے' اس کے باوجود...... دفعتاً اس سیاہ وسفید خلا میں سے ایک خوفناک' ٹھوس حقیقت نمایاں ہوئی۔ کہ یہ شخص خود غرضی' ذہنی بددیانتی اور انسانی کمزوری کی ایک عظیم علامت ہے۔

وہ مڑا اور دیوار کے ساتھ پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اندر کے سارے منظر کو بظاہر کاہلی کے ساتھ دیکھتا ہوا وہ دھیرے دھیرے' لیکن حیرت انگیز سرعت اور صفائی کے ساتھ' بالآخر عقل کے اس عظیم جنگل میں سے نکل آیا جس میں ایک طویل عرصے سے گرفتار تھا۔ اس نے آہستہ سے جھک کر اپنی چھڑی اور ٹوپی اٹھائی اور چل دیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' انیس الرحمان اٹھ کھڑا ہوا۔

''باہر۔''

''لیکن کانفرنس جاری ہے۔ اور مشتعل ہجوم۔''

''یہ صبح دیکھ رہے ہو۔'' نعیم نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک دفعہ کسی نے' پتا نہیں کون تھا' مجھ سے کہا تھا کہ خداوند تعالیٰ کی دنیا پر ہر صبح نئی دلکشی اور آزادی لے کر طلوع ہوتی ہے۔'' اس نے سیدھا انیس کے چہرے پر دیکھا۔ ''خدا حافظ۔''

پارلیمنٹ کی عمارت کی بیرونی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے آزادی اور مسرت کا لمبا سانس لیا۔

پھر وہ مظاہرین کے ہجوم میں گھس گیا۔ اسے ہر طرف سے دھکے پڑ رہے تھے اور سیاہ' غلیظ بدنوں سے پسینے کی تیز بُو آ رہی تھی۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ ہجوم کے دوسرے کنارے پر نکل آیا۔

''انقلاب زندہ باد۔'' کئی ہزار لوگ چلائے۔ وہ مڑ کر کھڑا ہوگیا۔ مختلف قسم کے نعروں کا شور اس کے کانوں میں آ رہا تھا۔ انقلاب زندہ باد۔ اکھنڈ ہندوستان زندہ باد۔ حکومت برطانیہ مردہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔ سول نافرمانی' آزادی' آزادی......

اس نے اپنی ٹوپی اتاری' اسے چھڑی کی نوک پر چڑھا کر بلند کیا اور پوری طاقت سے چیخا: ''آزادی...... زندہ باد۔''

اس کی آواز ایک چھوٹے سے دائرے میں گھٹ کر رہ گئی۔ چند لوگوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی اس کی آزادی کے معنی سے بے خبر رہے۔

آپ سے آپ مسکراتا ہوا وہ مختلف سڑکوں پر چلتا رہا۔ پھر ایک جگہ دور سے روشن محل کی عمارت نظر پڑنے پر رک گیا۔

''نجمی آج میں نے رہائی پالی ہے۔ اس شے سے جس نے مجھے تمہارا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ تمہیں پتا چلتا تو ضرور خوش ہوتیں۔ تم میری بیٹی ہو۔'' اس نے زیر لب کہا۔ پھر اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔

چند روز کے بعد فسادات زور پکڑ گئے اور لوگ شہر چھوڑنے لگے۔ ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں تو جان بچا کر بھاگنے والوں کے قافلے پیدل چل پڑے۔ ملک کے تمام حصوں سے فسادات اور لوگوں کے بھاگنے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ گو ابھی تک سیاسی گفت و شنید کا کوئی آخری فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن ملک کے بٹوارے کے متعلق ایک عام یقین پھیل رہا تھا۔ وہ جسے اب تک ملک کی عام آبادی نے محض خیال آرائی سمجھ رکھا تھا حقیقت بنتی ہوئی نظر آئی تو لوگ دفعتاً خالی الذہن ہوگئے۔ فسادات کی حیوانیت سر پر سوار ہوئی تو بالکل بوکھلا گئے اور گھر بار چھوڑ چھاڑ' منزل کا تعین کئے بغیر بھاگ اٹھے۔

روشن محل کے وسیع ہال میں کنبے کے سبھی افراد جمع تھے' سوائے نعیم کے۔ عذرا جو ابھی ابھی آئی تھی' بظاہر سکون کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ لگی زرد رو نجمی سہمی ہوئی سیدھی بیٹھی تھی۔ آگے دو کرسیوں پر پرویز کی بیوی اور لڑکا آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دوسرے بڑے صوفے میں روشن آغا اور ان کی بیوی دھنسے ہوئے تھے۔ صرف پرویز ہاتھ پشت پر باندھے' سر جھکائے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ کمرے کی فضا پر عجیب گھٹن اور اداسی طاری تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔

پرویز دو گھنٹے سے متواتر بول بول کر اب خاموش ہو چکا تھا۔ صبح سے وہ روشن آغا کو سب کے ساتھ پاکستان جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے دلی سے لاہور جانے والے ہوائی جہاز پر سب کی سیٹیں بک کرالی تھیں اور سامان روشن آغا کو خبر کئے بغیر باندھا جا چکا تھا۔

''یہ میرا گھر ہے۔ اس کی بنیاد میرے بزرگوں نے رکھی تھی اور یہیں ہم سب پیدا ہوئے۔ کوئی کیا کہے

گا؟'' وہ سارا وقت صرف یہی کہتے رہے اور پرویز کے اور دوسرے گھر والوں کے تمام دلائل بیکار ثابت ہوئے۔

اب سب بیکار تھا۔ کبھی کبھی پرویز ناامیدی کے عالم میں چلا اٹھتا۔ ''روشن پور روشن پور یہاں بیٹھ کے آپ کہتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ روشن پور کے لوگ ابھی تک آپ کے وفادار ہیں؟ آج آپ روشن پور میں داخل نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے منشی کو اور ہمارے سب کارندوں کو قتل کر دیا ہے۔ آج ہمیں وہاں کوئی نہیں جانتا۔''

''پاگل پن کی باتیں مت کرو۔'' وہ جواب دیتے۔

آخر پرویز جیبوں میں ہاتھ ڈال کر، ٹانگیں پھیلا کر ان کے درمیان آ کھڑا ہوا: ''تو پھر ہم سب جا رہے ہیں۔'' اس نے دھیمے، قطعی لہجے میں کہا۔

روشن آغا نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو نظریں چرائے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر انہوں نے سوالیہ نظروں سے عذرا کو دیکھا۔

''نعیم نے عمر بھر بھلا کسی کی بات مانی ہے؟'' پرویز غصے سے بولا۔ ''عذرا ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔ وہ جائے نہ جائے۔''

روشن آغا نے دوبارہ اپنی بیوی کو دیکھا۔ یکلخت بے حد اکتا کر انہوں نے کہا: ''تو پھر شوق سے جایئے۔'' اور منہ پھیر کر بیٹھ گئے۔ پرویز تھوڑی دیر گھبراہٹ میں چکر لگانے کے بعد ٹوپی اور برساتی اٹھا کر بغیر کچھ کہے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

سہ پہر کے وقت وہ سب ایئرپورٹ کو روانہ ہوئے۔ روشن آغا اپنے کمرے کے دروازے پر سب روتے ہوئے گھر والوں کو الوداع کرنے کے لئے آئے۔ جاتے جاتے سب نے ان سے وعدہ کیا کہ حالات بہتر ہونے پر واپس آ جائیں گے اور اگر خدانخواستہ حالات خراب ہو گئے تو روشن آغا یقیناً ان سے آن ملیں گے۔

شام تک روشن محل کے تمام نوکر غائب ہو گئے۔ چوکیدار اور خاکروب تک۔ صرف روشن آغا کا ملازم خصوصی، حسین، وفاداری سے ان کے بند دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہا۔ رات سے پہلے پہلے روشن محل کو آگ لگا دی گئی۔ بارش رک گئی تھی اور بلوائیوں کے تین گروہ یکے بعد دیگرے جانے کہاں سے وارد ہوئے اور نہایت خاموشی سے اس مہیب، دومنزلہ عمارت کا مشرقی حصہ جلنے لگا۔ نعیم اور عذرا کے جانے کے بعد سے یہ حصہ خالی پڑا تھا۔ روشن آغا اور حسین پچھلے دروازوں سے جان بچا کر بھاگے۔ جاتے جاتے انہوں نے بلوائیوں کی جھلک دیکھی۔ وہ لمبے تڑنگے سکھ کسان اور چھوٹی ذاتوں کے کالے کالے لوگ تھے جو ان کا سامان نکال نکال کر لان میں جمع کر رہے تھے اور اسے آگ لگا کر بھتنوں کی طرح شور مچا رہے تھے۔

کئی ایک کوٹھیاں جل رہی تھیں۔ پرانے، وسیع اور جانے پہچانے گھر جن میں عمر بھر آنا جانا رہا تھا۔ اور ان کے باسی، پرانے وقتوں کے نجیب الطرفین تعلقہ دار اور سرکاری افسر جو ایسے اچھے دوست تھے۔ سڑک پر جانے سے احتراز کرتے ہوئے روشن آغا اور حسین مکانوں کے پیچھے پیچھے کھیتوں اور غیر آباد زمینوں میں سے بھاگتے ہوئے

گزر رہے تھے۔ رات پڑ چکی تھی۔ گڑھوں میں بارش کا پانی رکا ہوا تھا۔ وقفے وقفے پر وہ دونوں تاریکی میں تیز تیز چلتے ہوئے ایک دم پھسل کر کسی گڑھے میں گر پڑتے۔ حسین اپنے آقا کو کمر سے پکڑ کر باہر نکالتا اور وہ اپنے خاص انداز میں کوستے ہوئے پھر بھاگنے لگتے۔ دونوں سر سے پاؤں تک کیچڑ آلود تھے۔ ایک جگہ پر تھک کر روشن آغا رک گئے اور ہانپنے لگے۔ دائیں جانب ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی جس میں روشنیاں جل رہی تھیں اور پردے سکون کے ساتھ پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''حسین۔'' روشن آغا نے اداسی سے پوچھا۔ ''تم کبھی ایسی راتوں میں باہر سے گزرے ہو جبکہ اندر لوگ اپنے پردوں کے پیچھے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہوں۔''

''ہاں سرکار......''

''بیشک بیشک ...... پر کیسا عجیب لگتا ہے۔''

وہ پھر چل پڑے۔ حسین آگے نکلتے ہوئے بولا: ''مجھے آگے جانے دیں حضور۔ گڑھوں کا پتہ چلتا رہے گا۔ آپ بچ جائیں گے۔''

لیکن اندھیرے اور عجلت کے باعث وہ ایک دوسرے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ دے سکے اور جب حسین تاریکی میں ہاتھ پھیلا کر کسی پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں گرتا تو پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے آواز نکلتی روشن آغا اسی انداز میں' اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے ہوا میں ہاتھ چلاتے ہوئے دھڑام سے اس کے اوپر گر پڑتے۔ انہیں عجیب سا احساس ہوا۔

آخر ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ ہوائی اڈے کو جانے والی سڑک پر نکل آئے۔ سڑک پکی تھی اور ذرا فاصلے پر ایک چھوٹا سا پل تھا جس کے نیچے برساتی نالہ شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اس سے پرے ایئرپورٹ کی عمارت کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ روشن آغا نڈھال ہو کر پل پر بیٹھ گئے۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ وہ وہیں پر بیٹھے رہے اور بارش ان کے جسموں سے گڑھوں کا کیچڑ دھوتی رہی۔

''حسین ...... ہم اتنے اچھے دوست ہو سکتے تھے۔'' اچانک روشن آغا نے کہا۔

''ایں؟ ہی ہی ہی ...... میں آپ کا خادم سرکار......''

''یہ سب بیکار ہے۔'' انہوں نے ہاتھ کی ہلکی سی جنبش سے کہا۔

''کوئی کچھ بھی نہیں ہے۔ آج جہاں پر تم ہو وہیں پر میں ...... تم نے دیکھا؟ یہ زندگی کی آخری سطح ہے۔ آخری اور یقینی۔''

پھر ان کی نظر اندھیرے میں چمکتی ہوئی کلائی کی گھڑی پر پڑی۔ نو بجے تھے۔ جہاز چھوٹنے میں ابھی دو گھنٹے ہیں' انہوں نے سوچا' وہ کچھ دیر ابھی اور ستا سکتے ہیں اور زندگی کے اس مضحکے پر غور کر سکتے ہیں اور یہ بارش کتنی سکون بخش ہے گو ایئرپورٹ پہنچتے ہی انہیں پرویز سے لے کر خشک کپڑے پہن لینے چاہئیں۔

(۴۵)

جب وہ دلّی سے چلے تو پچاس مردوں عورتوں بچوں اور چند بیل گاڑیوں کا مختصر سا صاف ستھرا قافلہ تھے۔ تین روز کی مسافت کے بعد وہ قافلہ ڈیڑھ ہزار انسانوں اور اتنے ہی جانوروں کے ایک لمبے چوڑے جلوس کی شکل اختیار کر چکا تھا اور ابھی وہ انبالے سے دس میل دور تھے۔ اس جلوس کی تشکیل میں کسی تجویز یا ترتیب کا لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ اگر ڈھنگ سے چلایا جاتا تو وہ دو فرلانگ مربع میں بہ آسانی سما سکتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ جو لوگ درمیان میں چل رہے تھے انہیں دور دور تک قافلے کی حدود کا پتہ نہ تھا۔ اگر ہوائی جہاز پر چڑھ کر دیکھا جاتا تو ایک بڑا سا کنکھجورا' ہزاروں چھوٹی بڑی ٹانگوں والا' زمین پر چلتا ہوا دکھائی دیتا۔

وہ پچاس' جو ابتدا میں ساتھ چلے تھے' ابھی تک یکجا تھے۔ وہ قافلے کے عین درمیان میں چل رہے تھے اور یہی ایک ترتیب تھی جو قائم رہ سکی تھی۔ یعنی قافلے کا حجم' ان کو مرکز قرار دے کر' چاروں طرف بڑھنا شروع ہوا تھا اور ایک سا بڑھتا چلا گیا تھا' جیسے کنکھجورے کا بچہ تیزی کے ساتھ جوان ہو جائے' یا ساحلی سمندروں پر جب کوئی کچھوا مر کر تیرنے لگے تو جیسے جھاگ اس کے چاروں طرف اکٹھا ہونا شروع ہو جائے۔ گو ان کی دوستی چند روزہ تھی پھر بھی ان میں ایک عجیب غیر معروف قسم کا احساس رفاقت پیدا ہو چلا تھا' جیسے چند ناواقف ٹورسٹ کسی شہر میں جا نکلیں اور وہاں بغاوت شروع ہو جائے۔ پھر دوسروں کے مقابلے میں انہیں احساس برتری کچھ یوں بھی تھا کہ ایک تو وہ تعداد میں کم اور خوش پوش تھے' دوسرے ان کی آپس کی شناسائی کی مدت نسبتاً کئی گھنٹے زیادہ کی تھی۔ اس لحاظ سے یہ جماعت اس غریب الوطن قافلے کی گویا ارسٹوکریسی تھی۔ دلّی پولیس کے چند سپاہی' جو ان کے ساتھ ہوئے تھے' زیادہ تر ان کے ساتھ ہی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ یہ بات بھی انہیں دوسروں سے ممیز کرتی تھی' گو ان کی زیادہ تر باتیں اسی قسم کی ہوتیں کہ مثلاً نئے آنے والوں کی فوج گندی اور بدبو دار تھی اور کہ وہ اپنے ہمراہ گھوڑوں اور بیلوں کے علاوہ گدھے' خچر' کتے' بلیاں اور مرغیاں تک لے آئے تھے۔ اس موضوع پر منفرد طبقے کے پچاسوں افراد کے سر شرم سے جھک جاتے جیسے کہ اس کی ذمہ داری براہ راست ان پر آتی تھی۔

جنہوں نے کبھی تھکے ماندے' بے گھر اور دہشت زدہ لوگوں کے درمیان سفر کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے قافلوں میں سب سے بڑی وبا افواہوں کی ہوتی ہے۔ ایک سے ایک بے بنیاد افواہ منٹوں میں قافلے کے ایک سرے سے دوسرے تک پھیلتی جا رہی تھی اور نئی سے نئی پھیلتی تھی' یعنی کہ کسی افواہ کی عمر چند گھنٹے سے زیادہ کی نہ ہوتی تھی۔ لوگ اتنے خالی الذہن ہو چکے تھے کہ محض چلتے جاتے اور افواہیں پھیلانے کے سوا لگتا تھا کہ ان کو کوئی کام ہی نہ تھا۔ یہ نہیں کہ وہ جان بوجھ کر افواہیں پھیلاتے تھے یا یہ کہ ان کے درمیان کوئی کنبہ افواہیں پھیلانے کے ماہروں کا موجود تھا' بلکہ یوں ہوتا کہ بات چیت کے دوران کسی کے منہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ کسی دوسرے کے سر پر سارے وقتوں کی

تھکن، بھوک پیاس اور دہشت بن کر سوار ہو جاتا اور قافلے کی تمامتر بے ترتیبی کے باوجود برقی رو کی طرح آناً فاناً ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیل جاتا۔ زیادہ افواہیں دو قسم کی تھیں اور دونوں انتہائی متضاد قسم کی تھیں۔ یا تو وہ انتہائی دہشت پسند تھیں، مثلاً یہ کہ اگلے پڑاؤ پر قافلے پر حملہ ہوگا یا انتہائی پُر امید، کہ اگلے شہر میں حکومت نے ان کے لئے نئے لباس اور تازہ کھانے مہیا کرنے کا انتظام کر رکھا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہی دو قسم کی افواہیں بار بار الفاظ کا مختلف جامہ پہن کر لہروں کی طرح آ رہی تھیں اور کسی کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے رک کر اس شدید مضحکہ خیز صورتحال کو محسوس کر سکتا۔ لوگ افواہوں میں باتیں کرتے، عام روزمرہ کی کوئی بات نہ کرتا۔ تازہ ترین خبر یہ تھی کہ انبالے کے سٹیشن پر ان کے لئے ایک خالی ریل گاڑی تیار کھڑی تھی جس کے ساتھ ایک بہت بڑا باورچی خانہ لگا ہوا تھا اور پولیس کی بھاری جمعیت ان کی حفاظت کے لئے موجود تھی۔

ان پچاس میں نعیم بھی تھا۔ اس نے تین روز سے کسی سے بات نہ کی تھی۔ اس کا بڑھی ہوئی داڑھی والا چہرہ غلیظ اور لباس گندا ہو چکا تھا۔ ایک موقع پر رات کے اندھیرے میں جب قافلے میں بلا وجہ بھگدڑ مچی تو اس کا ایک جوتا گم ہوگیا تھا۔ دوسرا اس نے خود اتار کر پھینک دیا۔ اس کی جیبیں خالی تھیں اور کوئی سامان ساتھ نہ تھا۔ اپنے آپ میں مگن چلتا ہوا کبھی کبھی وہ خود بخود مسکرانے لگتا، پھر سنجیدہ ہو جاتا، پھر پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا اور چلتا جاتا۔ اس نے ایک دفعہ بھی یہ یاد کرنے کی کوشش نہ کی تھی کہ عذرا سے اس کی کیا باتیں ہوئیں، کن حالات میں وہ اس سے جدا ہوا اور کیوں کر گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر باہر نکل آیا اور اس قافلے میں شریک ہوا تھا۔ سب کچھ آپ سے آپ ہوتا چلا آیا تھا۔ کبھی کبھار اسے صرف اتنا محسوس ہوتا کہ وہ ایک ان دیکھی، ان جانی منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا جہاں پہنچنے سے پہلے ...... یا جہاں پہنچنے پر، یا پہنچنے کے بعد ...... ایک بہت بڑی قوت، خوبصورت اور جاندار اور لازوال اس میں پیدا ہوگی، پتا نہیں کیسی اور کیونکر، لیکن اس کے نتیجے کے طور پر وہ اڑنے لگے گا یا ہوا میں تحلیل ہو جائے گا یا زمین کے اندر چلا جائے گا یا جانے کیا، پر کچھ نہ کچھ ضرور ایسا ہوگا جو زبردست اور معرکہ خیز ہوگا۔ اس عظیم قوت کی ہلکی ہلکی لہریں وہ ابھی سے اپنے اندر پھوٹتی ہوئی محسوس کر رہا تھا اور اس سرشاری میں ان سب کے ساتھ چل رہا تھا، بھاگ رہا تھا، رک رہا تھا اور کھا رہا تھا۔ اپنے گرد و نواح سے اس کی بے خبری اور لاپروائی اور اس کی بے سروسامانی اور عجیب و غریب ہیئت دیکھ کر چند عورتیں، جو ایسے موقعوں پر خصوصاً توہم پرست ہو جاتی ہیں، مجذوب سمجھ کر اس کی نگہداشت کر رہی تھیں۔ وہ کچھ نہ کچھ کھانے کو اسے دیتی رہتیں اور مستقبل کے متعلق بے سروپا سوالات کرتی جاتیں جن کا جواب دیئے بغیر ادا شکریہ ادا کیے بغیر وہ ان سے خوراک قبول کرتا اور بھاگتا جا رہا تھا۔ عورتیں خاموشی کو معنی خیز سمجھ کر اور بھی مرعوب ہوگئی تھیں اور ہر وقت اس پر نگاہ رکھنے لگی تھیں۔ مردوں میں سے زیادہ تر نے اسے محض مخبوط الحواس سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ انبالہ پہنچنے سے پہلے پہلے انہیں طوفان خیز بارش نے آ لیا۔

بارش کی تیز بوچھاڑ سہتے ہوئے متواتر پانچ گھنٹے تک انبالہ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر، اور باہر سڑک پر کھڑے رہے۔ اس دوران میں دو گاڑیاں دتی کی جانب سے آئیں اور رکے بغیر سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر گئیں۔ ان

کی ننگی ڈھلوان چھتوں پر بھی اتنے ہی لوگ بیٹھے تھے جتنے کے ان کے اندر' اور تیز ہوا میں اڑنے اور گیلی چھت پر سے پھسلنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے عجیب وغریب ہیئت میں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ نعیم کو یاد آیا کہ جب وہ بچپن میں سفر کیا کرتا تھا تو شیڈ میں کھڑی یا پانی لیتی ہوئی کسی خالی گاڑی کی چھت پر نیلی وردی والے آدمی کو خطرناک انداز میں چلتے تعجب سے دیکھا کرتا اور اسے سرکس کے کرتب سیکھا ہوا کوئی آدمی خیال کیا کرتا تھا۔ آج وہ ہزاروں سیدھے سادھے لوگوں کو کرتب دکھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا...... ''اور ایسے خراب موسم میں......'' اس نے افسوس کے ساتھ سوچا۔

آخر جب سٹیشن کے عملے کے لوگ انہیں باہر نکالنے کی کوشش میں ناکام ہو کر اندر جا چکے تھے تو طوفانی بارش اور خالی یک رنگ لائنوں کے نظارے سے یکلخت مایوس ہو کر وہ پلیٹ فارم چھوڑنے لگے۔ باہر نکلتے ہوئے' جیسا کہ معمول ہو چکا تھا' کسی نامعلوم وجہ سے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس بھاگ دوڑ میں اچانک نعیم اور علی آمنے سامنے آ گئے۔

''تم نے کہا: 'نکل جاؤ' اور میں نکل گیا۔ اپنے باپ کے گھر میں میرے لئے جگہ نہ تھی۔ کیوں نہ تھی؟ محض اس لئے کہ تم مجھ سے پندرہ برس پہلے پیدا ہوئے تھے اور لڑائی میں تم نے بہادری کا تمغہ حاصل کیا تھا اور جاگیرداروں کے گھر بیاہ کیا تھا اور سرکار کے خلاف جلوس نکالے تھے' محض اس لئے؟ اب میں کہاں جاؤں؟ میں نے سوچا۔ پر میں کیا سوچتا' مجھے سخت بھوک لگی تھی۔ اوہ' یہ بارش کمبخت سالی' جب فصلیں سوکھ رہی ہوتی ہیں تو کہیں دکھائی نہیں دیتی اور آج ماں کی...... ہمیں سیراب کر رہی ہے۔ لو یہ بوری' اس کی ٹوپی بنا کر اوڑھ لو' میری خیر ہے۔ لاؤ میں بنا دوں' تمہارا ایک ہاتھ تو کام سے گیا۔ گیلی ہے پر کچھ نہ کچھ بچاؤ تو کرے گی۔ میں سینکڑوں بار پردیس میں بھوکا سویا ہوں لیکن اس رات کی بھوک' اور اپنے گھر پر پردیس کا وہ احساس مجھے آج تک یاد ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن بڑی ماں نے ...... بڑی ماں بھی مر گئی' اللہ رحم کرے ...... اس دن بڑی ماں نے بھنی ہوئی فاختہ اور گوبھی کا شوربہ آگے رکھا تھا اور مجھے زور کی بھوک لگی تھی اور تم نے کہا تھا نکل جاؤ۔ تم کیا جانتے ہو۔ تمہیں اس طرح کھانے کے آگے سے اٹھا کر کبھی گھر سے باہر نہیں نکالا گیا۔ تمہیں کیا پتا۔ تم تو روشن محل میں جا کر جاگیردار بن گئے' ہمارے خدا بن گئے۔ کاش یہ سارے سؤر کچھ دیر کے لئے رک جائیں تو ہم گاڑی کے نیچے گھس کر بارش سے تو بچ سکتے ہیں۔ مگر یہ تو بس بھاگ رہے ہیں جیسے ماں کی بارات میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ عائشہ تو رستے میں ہی مر جائے گی۔ یقیناً۔ دیکھو کیسے بندریا کی طرح چارے میں سے منہ نکالے دیکھ رہی ہے۔ یہ اسی طرح پچھلے دس برس سے چپ چاپ دیکھ رہی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ چالتی ہے' بس کام کئے جاتی ہے اور گھلتی جاتی ہے۔ بڑی محنت سے گاڑی پر سائبان کھڑا کیا تھا' کل رات کی بارش میں اڑ گیا۔ اب پانی چارے میں سے رس رس کر اس کے جسم پر اکٹھا ہو رہا ہے۔ یہ کبھی سفر کے خاتمے تک نہیں بچ سکتی۔ لیکن سفر کا خاتمہ؟ ہونہہ' تمہیں پتا ہے کہاں ہوگا۔ ان سارے برسوں جو تم بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے سسرال والوں کے پاس رہتے رہے' پھر تم نے وائسرائے کی

نوکری کرلی اور بڑے آدمی بن گئے، تمہیں کبھی خیال آیا کہ دنیا میں کوئی اور بھی ہے جس میں تمہارے باپ کا خون ہے اور وہ کہاں پر ہے، بھوکا ہے یا سیر ہے، اور اس کی بیوی اور بچے، یہ چھوٹی چھوٹی باتیں جن کا بھائیوں میں خیال رکھا جاتا ہے۔ اور کیا تم میری زندگی تو نہیں گزار سکتے تھے۔ تھ تھ تھ۔ یہ بارش اور ہوا کا زور دیکھو، بالکل طوفان ہے طوفان۔ تم حیران ہو رہے ہو؟ مجھے سب پتا چلتا رہا۔ میں پردیس میں رہا پر ایک ایک پل کی مجھ کو خبر رہی۔ کہ تم کئی برس بیمار بھی رہے اور روشن محل میں ایک سے ایک بڑا ڈاکٹر آ کر تمہارا علاج کرتا رہا۔ پھر تم تندرست ہو گئے اور ہر روز موٹر میں بیٹھ کر وائسرائے کے دفتر کام پر جانے لگے۔ تم کبھی روشن پور نہ گئے۔ لیکن میں بھی بیمار رہا اور میری بیوی بھی اور ہمارا علاج کرنے کے لئے کون تھا۔ جلا وطنی؟

''لیکن تم تو سدا عیش میں رہے۔ جب باپ جیل چلا گیا تو تم چچا کے ساتھ کلکتہ چلے گئے اور انگریزی سکولوں میں پڑھتے رہے اور گرمیوں میں پہاڑ پر جاتے رہے۔ اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتا تو کیا جاگیرداروں کی لڑکی کے ساتھ شادی نہ کر سکتا تھا؟ حیرانگی سے کیا دیکھتے ہو۔ مجھے ان سب باتوں کا کسی نہ کسی طرح سے پتا چل ہی گیا۔ پھر ایک بات جو میری سمجھ میں نہیں آتی ...... کہ اب وہ سب کیا ہوا؟ وہ محلات، اور بڑے بڑے بارسوخ لوگ جو تمہارے رشتہ دار تھے اب کہاں گئے؟ ان کا کیا فائدہ ہوا۔ بتاؤ؟ اب تم پھر ہمارے ساتھ اکیلے ٹھوکریں کھا رہے ہو۔ سب نے تمہیں چھوڑ دیا؟ تھ تھ تھ۔ وہ تمہیں چھوڑ ہی دیتے، جلد یا بدیر، میں جانتا تھا۔ ذرا دیکھو کیا حالت بنا رکھی ہے، فقیروں سے بدتر، پاؤں میں جوتا بھی نہیں۔ تمہارے پاؤں میں ضرور درد ہو رہا ہوگا۔ میری ٹانگوں میں پہلے دو دن سخت درد اٹھا تھا، پھر کل رات بارش پڑنے سے سوج گئیں اور درد ختم ہو گیا۔ اب یوں لگتا ہے جیسے لکڑیوں پر چل رہا ہوں۔ یہ دیکھو، چھوٹے کیکر کے تنے برابر موٹی ہو رہی ہیں ماں کی...... ٹانگیں۔ پر شکر ہے کہ درد تو ختم ہوا، میری جان لے رہا تھا۔ تم عائشہ کے جوتے پہن لو، ابھی نکال کر دیتا ہوں۔ یہ لو، گھبراؤ نہیں ربڑ کے سیدھے تلے والے جوتے ہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں ایڑی والے جوتے نہیں پہن سکتے۔ اور تمہاری بیوی، اس نے بھی تمہیں چھوڑ دیا......''

نعیم کو اس بات کی حیرت نہ تھی کہ علی کو ان ساری باتوں کا علم کیسے ہوا۔ اس کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ تو یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی، کل کا گنوار کسان لونڈا آج ایک دم بڑا ہو گیا تھا اور بدلی ہوئی آواز میں، بدلے ہوئے لہجے میں، بالکل بدلی ہوئی باتیں کر رہا تھا۔ اپنی حیرت میں اسے یہ خیال نہ رہا کہ وہ اس سے کم و بیش بارہ برس کے عرصے کے بعد مل رہا تھا۔

علی کے لہجے کا زہریلا پن آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ آخر نعیم محض اس کا بھائی تھا جو اتنا عرصہ بھٹکنے کے بعد اس خستہ حالت میں لوٹا تھا اور اس کی دیکھ بھال کرنا اس کا فرض تھا۔ کسانوں کی سی صاف دلی کے ساتھ اس نے سب کچھ معاف کر دیا، بھلا دیا، اور دھیمے ہمدرد اور رنجیدہ لہجے میں نعیم کو بتانے لگا۔

''میں پنجاب چلا گیا۔ لاہور میں ان دنوں حالات اچھے نہیں تھے پھر بھی میں دو سال تک وہاں رہا اور کوئی آدھی درجن ورکشاپوں میں کام کیا۔ ان دو برسوں میں چھ مہینے جیل میں کاٹے۔ جہاں میں رہتا تھا وہاں چوری ہو گئی

اور انہوں نے شبے میں پکڑ کر مجھے قید کروا دیا۔ چھ مہینے انہوں نے مجھ پر ظلم کیا۔ پہلی بار میری ٹانگیں جیل میں سوجی تھیں جب میں دو دن تک متواتر ایک ہی جگہ پر کھڑا رہا تھا۔ یہ دوسری بار ہے۔ پر لاہور کی لسی مجھے نہیں بھولتی۔ کیا جاڑے کیا گرمی وہاں پر لسی پیتے ہیں اور سارا دن اس کے بعد نہ آپ کو بھوک لگتی ہے نہ پیاس۔ لیکن میرے پاؤں میں چکر تھا۔ عائشہ کو لینے آیا تو پھر لاہور نہ گیا۔ جالندھر میں ایک سیمنٹ فیکٹری تھی وہاں نوکری کی' پھر جنگ چھڑ گئی۔ اب میں فوج میں جانے کے لئے سر مارنے لگا۔ ان دنوں پہلی بار عائشہ بولی اور کہنے لگی: ''باؤلے ہوئے ہو؟ مت جاؤ۔ لڑائی پہ مت جاؤ مت جاؤ۔'' پھر وہ رونے لگی۔ اس کے بعد وہ زیادہ ہی چپ چاپ ہوگئی۔ کبھی روئی بھی نہیں۔ دیکھو کیسے چارے میں سے منہ نکالے بیٹھی ہے اور تکلیف سہہ رہی ہے' جیسے گائے نے تازہ تازہ بچہ دیا ہو۔ تمہارا خیال ہے اس نے تمہیں پہچانا نہیں؟ شرط لگاتے ہو؟ اس نے تمہیں سولہ آنے پہچان لیا ہے اور سولہ آنے پہچان لیا ہے' پر وہ کبھی نہیں ہنستی' نہیں شرماتی۔ یا اللہ' میری ٹانگیں پھٹ جائیں گی۔ اگر یہ سور اتنا شور نہ مچائیں تو تم میری ٹانگوں پر بارش کے قطروں کی آواز سن سکتے ہو۔ ڈھول کی طرح بج رہی ہیں۔ لیکن میں جنگ میں ہر قیمت پر جانا چاہتا تھا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری نقالی میں میں ایسا کرنا چاہتا تھا تو غلط سمجھتے ہو۔ نہ ہی مجھے اپنی ٹانگوں یا بازوؤں سے کوئی بیر تھا یا تمغوں کی حرص تھی' بس میں بالکل اکتا چکا تھا۔ ان دنوں میں معمولی سی بات پر قتل کر سکتا تھا۔ بس میرے سر میں یہ بات سما گئی تھی کہ جنگ ہی ایک کام ہے جو کہ مرد کے لائق ہے۔ لیکن ہوا کیا؟ وہ یہیں پر ادھر اُدھر ہمیں پریڈ کرواتے رہے اور جنگ کا زمانہ نکلتا گیا۔ جب کلکتے میں رہتے ہوئے ہمیں تین مہینے گزر گئے اور برما کے محاذ پر جانے کا ذکر سنتے سنتے کان پک گئے تو ایک دن میں نے حوالدار میجر سے کہا: 'جس روز تو پیدا ہوا تھا اسی دن تیری ماں کا دودھ پھٹ گیا اور تو بزدل ہوگیا تھا' رات بھر میں کوارٹر گارڈ میں رہا۔ صبح کرنل کے پیشی ہوئی۔ میں پاگل ہو رہا تھا' اس کو بھی سنائیں۔ کورٹ مارشل ہوا اور میں قید کر دیا گیا۔ شکر ہے گولی سے بچ گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ ایک سال تک کلکتے میں ہی مزدوری کرتا رہا۔ پھر وہاں سے یہ مصیبت شروع ہوئی۔ ہڑتالیں' اور جلوس اور دہشت پسندی۔ تم یقین نہیں کرو گے۔ مگر یہ سچ ہے کہ میں ان میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ پر جانے یہ کیسے ہوا ...... کیسے ہوا کہ میں آہستہ آہستہ ان کا پکا معتبر آدمی بن گیا۔ ایک قسم کا لیڈر۔ آپ سے آپ ہی یہ سب کچھ ہوگیا۔ میں دلی آ گیا۔ اب بارش تھمتی جا رہی ہے۔ دیکھو اُدھر سے بادل پھٹ گئے ہیں۔ تمہیں بوجھ لگ رہا ہے تو بوری اتار کر گاڑی میں رکھ دو۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اور اگر چاہو تو جوتوں کے لئے عائشہ کا شکریہ ادا کردو۔ خوش ہو جائے گی۔ ابھی نہیں' بعد میں ایک دفعہ ہڑتالیوں کے گروہ کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے سوچا کہ اسی وجہ سے میں اپنے گھر سے' گاؤں سے نکالا گیا اور آج وہی کام کر رہا ہوں۔ آخر کیا فرق پڑا۔ کیا فرق پڑتا ہے' ہیں نعیم؟ ......''

علی کی گاڑی پر ہاتھ رکھے ایک لمبے قد کا بڈھا' جس کا پھٹا ہوا لباس اور غلیظ داڑھی تھی' چل رہا تھا۔ نعیم نے کئی بار اس پہ نظر ڈالی اور ہر بار اسے غیر معمولی سا احساس ہوا۔ اس خستہ حالت کے باوجود بڈھے کی آنکھوں میں گہری ذہانت' گہری دردمندی اور گہرے رنج کی جھلک تھی۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔

نعیم تھکن کے مارے بڑے سے درخت کی طرح جھولتا ہوا اس کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ علی نے اس کی آستین کھینچی۔

''چلو چلو۔ پتا نہیں کون ہے۔''

''اسے بٹھالو۔ یہاں مر جائے گا۔''

''واہ وا۔ اگر اسی طرح کرنے لگے تو...... اب اگر یہ چلنے بھی لگے تو اسے ہاتھ رکھنے کو جگہ نہ ملے گی۔ دیکھو۔''

نعیم نے دیکھا۔ کچھ دیر پہلے جس جگہ پر بڈھے کا ہاتھ تھا اسے حاصل کرنے کے لئے کئی ایک بڈھے اور نوجوان ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ گاڑی کے دونوں طرف اسی طرح کے لوگوں کی قطاریں تھیں: فاقہ زدہ، نیم مردہ بھیڑیوں کی طرح کے لوگ جو سر جھکائے ڈنڈوں کا سہارا لئے چل رہے تھے۔

نعیم اوندھے منہ گرے ہوئے بڈھے کے اوپر کھڑا جھولتا رہا۔ ناچار علی نے اس کی مدد سے بڈھے کو اٹھا کر گاڑی پر لادا اور پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

(۴۶)

اس رات قافلے میں پہلی موت واقع ہوئی۔ وہ ایک کمزور سا نوجوان تھا جو نمونیے سے مرا تھا۔ اس کی بیماری کا کسی کو پتا نہ چلا کیونکہ وہ اکیلا سفر کر رہا تھا۔ صبح سویرے گاڑی کا سہارا لے کر چلنے والوں نے اسے گاڑی میں مرا ہو پایا اور کود کر اوپر چڑھ گئے۔ چند ایک تو بیٹھتے ہی اونگھنے لگے، دو بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لیکن چونکہ گاڑی لاوارث تھی اس پر سوار ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جنہیں اندر جگہ نہ ملی وہ باہر ڈنڈوں پر بیٹھنے لگے۔ نتیجتاً دونوں طرف کے بانس کے ڈنڈے بوجھ کے نیچے ٹوٹ گئے۔ آخر بیل کھینچنے سے معذور ہو کر رک گئے۔ اب پیچھے رہ جانے کا عام خوف ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور خوفناک جدوجہد کی ابتدا ہوئی، طاقت ور اور کمزور کی ازلی، حیوانی رقابت۔ اس دھکم پیل میں گاڑی کے مالک کی لاش نیچے گر پڑی۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد جب چند زور آوروں نے گاڑی پر قبضہ کر لیا اور بیل دوبارہ چلنے لگے تو وہ اپنے پیچھے آنے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو بظاہر ان سے مخاطب تھے۔ اس قیامت کے شور میں وہ کچھ سن تو نہ سکے لیکن لوگوں کے تشویشناک اشاروں سے انہیں لاش کی غیر موجودگی کا احساس ہو گیا۔ گاڑی رکی، دو آدمی اتر کر گئے، مردے کو کندھوں پر اٹھا کر لائے اور گاڑی میں لاد کر روانہ ہوئے۔

لیکن موت کی خبر آناً فاناً سارے میں پھیل گئی اور ایک جگہ پہنچ کر سارے کا سارا قافلہ یک دم رک گیا۔ بہت سے لوگوں نے آ کر لاش کو گھیر لیا اور اسے ٹھکانے لگانے کی تجویزوں پر غور کرنے لگے۔ اب وہ لوگ، جو گاڑی پر قابض تھے، چوکنے ہوئے اور چالاکی کے ساتھ اتر کر ہجوم میں مل گئے۔ پھر انہیں میں سے دو نے اوپر چڑھ کر مرنے والے کا ایک بڑا سا صندوق خالی کیا اور لاش کو کپڑے میں لپیٹ کر اس میں رکھا۔ پھر نماز جنازہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

نماز کے بعد امام نے بیل گاڑی پر چڑھ کر ایک مختصر لیکن جوشیلی تقریر کے دوران کہا:

''ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ ہم اپنے مردوں کی حرمت کے پاسبان ہیں۔ آج ہمارے اس گمنام بھائی کو' جس کا نام بھی بعض ضرورتوں کے تحت ہمیں خود ہی ایجاد کرنا پڑا' وہ عظیم الشان جنازہ میسر ہوا ہے جو دنیا میں بڑے بڑے آدمیوں کو نہیں ملتا۔ دس ہزار روحیں...... دس ہزار مومن۔''

تقریر کے دوران اور تقریر کے بعد دیر تک لوگ ٹولیوں میں جنازے کے پاس سے گزرتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک حتی الوسع اس اجنبی انسان کا مردہ چہرہ دیکھنے کا خواہش مند تھا جو محض مر کر یکلخت ان سب کے لئے دردمندی' خدا ترسی اور مستقبل کے خوف کی عظیم علامت بن گیا تھا۔ چند ادھیڑ عمر کسان عورتیں اونچی آواز میں بین کرنے لگیں۔ ان پر آج پہلی بار موت کی عالمگیر حیثیت کا انکشاف ہوا تھا اور غیر شعوری طور پر انہوں نے محسوس کیا تھا کہ اس ایک انسان کی موت ان سب کی موت تھی کہ مستقبل کے اندھیرے کی مشترکہ موت میں وہ سب شامل تھے۔

آخر اسے قبر میں اتار کر کم از کم پانچ ہزار افراد نے اپنے حصے کی مٹی اس پر ڈالی اور ایسی قبر بنائی کہ ان میں سے آج تک کسی نے اتنی بڑی قبر نہ دیکھی تھی۔

''زندگی کی ایک عظیم فورم (Form) ہے۔ یہ جنازہ۔'' لمبے بڈھے نے مٹی پھینکتے ہوئے کہا۔ نعیم نے خاموشی سے اسے دیکھا اور اپنے حصے کی مٹی پھینک کر آگے روانہ ہو گیا۔ میلوں تک انہیں وہ قبر نظر آتی رہی۔

اسی روز قافلے پر پہلی بار حملہ ہوا۔ حملہ آور ہندو اور سکھ تھے جو کلہاڑیوں' بلموں' تلواروں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ قافلے والے بہت سے مردہ اور زخمی چھوڑ کر آندھی کی طرح بھاگے۔ اب وہ موت سے واقف ہو چکے تھے۔

''تم کیا کہہ رہے تھے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''جنازے کی بات کر رہا تھا' کہ یہ زندگی کیسی منظم ہے۔ ہنسو مت' میں فلسفہ نہیں بگھار رہا۔ اس زندگی سے مراد یہ خصوصی زندگی ہے۔ یہ جس میں قواعد وضوابط ہیں اور ہمسائے کے ساتھ محبت کرنے کے احکام' اور نماز کے اوقات' رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے طریقے' نیکی کے بدلے ثواب اور گناہ کے بدلے عذاب ہے۔ کتنی بڑی تنظیم ہے' تم نے کبھی سوچا ہے؟ میں بھی کیا پوچھ رہا ہوں' ہر کوئی تھوڑا ہی سوچتا ہے۔ پر سنو' میں نے سوچا ہے۔ وہ دیکھو اگلی بیل گاڑی پر ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ میں جب بھی ایسے شخص کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ ابھی چند منٹ میں یہ اپنے ضمیر کا سارا بوجھ اللہ تعالٰی کے حوالے کر کے اطمینان سے بیٹھ جائے گا۔ اس کی زندگی کی ایک مخصوص شکل' ایک Form ہے جس کے مطابق کہ یہ رہتا ہے' اور اس کا Content ہے جو کچھ کہ یہ کرتا ہے اور اس کے نیک و بد ہونے کا علم رکھتا ہے۔ پھر اس کی اجتماعی شکل ہے۔ نماز جنازہ جس کی عظیم Form ہے اور جس کے Content میں تمام انسان شامل ہو جاتے ہیں۔ اس سارے سلسلے میں ایک رکھ رکھاؤ ہے' صاف ستھرا پن ہے جیسے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر باورچی خانے کو جھاڑا پونچھا جائے' برتنوں کو مانجھ کر قرینے سے رکھا جائے اور

فرش کو دھو دھلا کر کھلا چھوڑ دیا جائے۔ اس میں فراغت کا احساس ہے۔ میری بھی کوئی زندگی رہی ہے۔ پریشان خیالی، ابتری، دھما چوکڑی، ایک دم دھما چوکڑی۔ Form کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس زمرے میں کچھ تھا بھی تو مجبوری، محض مجبوری اور لاچاری۔ اور Content؟ ہنہہ، کیا بات کرتے ہو میاں، کبھی کسی چیز کا تعین ہی نہیں ہو پایا...... لیکن اب میں تمہیں سب سے اہم بات بتانے والا ہوں سنو۔ اس کے باوجود ان سب باتوں کے باوجود میں نے کبھی ایسے لوگوں کے لئے، ایسی زندگی کے لئے رشک یا حسد محسوس نہیں کیا۔ کبھی احساس کمتری مجھ کو نہیں ہوا۔ ہمیشہ میں نے اس نظام کے لئے اپنے دل میں ایک عجیب سی حقارت محسوس کی ہے، کہ ہم اپنے ضمیر کو زبردستی دھو دھا کر نئے گناہوں کے لئے تازہ دم ہو بیٹھتے ہیں، نئی امنگ، نئی حرص کے ساتھ۔ اور نماز جنازہ کے بعد کیا ہوتا ہے؟...... تم نے دیکھا ہی ہے۔ شکست اور بے حرمتی ہمیں عین آنکھوں میں آ کر لگتی ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی ہے۔''

''تم کون ہوں؟''

''میں دلی یونیورسٹی میں تاریخ پڑھاتا تھا۔''

''اس سے پہلے؟''

''ٹاٹا سٹیل مل میں کام کرتا تھا۔''

''اس سے پہلے؟''

بڈھا گہری نظروں سے نعیم کو دیکھ کر ہنسا: ''آوارہ تھا، کھوج میں تھا، گمشدہ تھا جو بھی سمجھ لو۔''

لیکن نعیم کی آنکھوں کے سامنے صاف طور پر مدتوں پہلے کی ایک دھویں سے بھری ہوئی کوٹھری آ گئی جس میں ایک جوشیلا نوجوان بیٹھا ضلع کے سارے انگریز افسران کو بموں سے اڑا دینے کی تجویزوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔

بڈھے نے نعیم کے چہرے پر اچانک پھیلتی ہوئی پرانی آشنائی کی مسکراہٹ کو نہ دیکھا اور پھر بولنے لگا:

اس سے پہلے آئیڈیلز تھے اور آوارگی تھی۔ اگر میں تفصیل سے بیان کروں تو تم کہو گے کہ وہ آوارہ گردی کی زندگی تھی۔ مگر نہیں، وہ محض آوارگی تھی۔ یہ مجھے بہت بعد میں پتا چلا۔ آئیڈیل...... اصل اور صحیح آئیڈیل تو مکمل نارمل حالات میں بنتے ہیں۔ ایسے ذہنوں میں جو پُرشکم ہوتے ہیں، عظیم اور بے ہوس ہوتے ہیں، جن کے پاس صرف تخیل ہوتا ہے اور بلندی اور مایوسی ہوتی ہے۔ ایسے انسان جن پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا، کوئی ناکامی کوئی زہر نہیں ہوتا، بس زندگی کی روح ہوتی ہے جو جوان اور خوبصورت اور افسردہ ہوتی ہے، جوان کو آس پاس کی گرتی ہوئی، لاچار ہوتی ہوئی دنیا سے صرف مایوس کر دیتی ہے اور انہیں اپنے آپ سے الگ ہو کر اوپر اٹھ کر سوچنے کے قابل بناتی ہے، آرٹسٹ اور شاعر کے پاس اپنے تجربے ہوتے ہیں، آئیڈیلسٹ کے پاس بنی نوع انسان کی ساری تاریخ، سارے تجربے اور سارے دکھ ہوتے ہیں، چنانچہ وہ ان سے بڑا ہوتا ہے۔ ہم اور تم روزمرہ کا حساب رکھنے کے لئے تھے۔ ہمارے پاس کیا تھا؟ غم وغصہ اور آئیڈیلز کی بگڑی ہوئی شکل، گالیاں اور برافروختگی، مصیبتیں اور دباؤ اور نوجوانی اور خفت اور تنگ نظری اور زندگی کا سارا زہر، سب کچھ تھا۔ سنو ایک بات بیچ میں آ گئی ہے۔ آئیڈیل اور سیاست میں

فرق ہے۔ سیاست میں ہوس کا مقام بہت اونچا ہے۔ سیاست دان محض اپنی ناک کے آگے سے گزرنے والے نفع و نقصان سے متعلق ہوتا ہے، اس کا ذہن بھدا اور تاریخ سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ آئیڈیل جس شے کی لطیف اور اعلیٰ شکل ہے سیاست میں وہی چیز بھدی اور خام بن کر نمودار ہوتی ہے...... جس طرح ہر شے بالآخر بھدی اور خام بن جاتی ہے...... پھر بھی سیاست کی ہر ترکیب چونکہ سوسائٹی کے لئے نفع کی امید دلاتی ہے اس لئے اس کا وجود لوگوں میں گرمی اور زندگی پیدا کرتا ہے۔ ہمارے پاس نہ آئیڈیل تھے نہ سیاست، صرف بگڑی ہوئی زندگیاں تھیں اور زہریلے دماغ، جس کا نتیجہ اس بگڑی ہوئی تاریخ میں ظاہر ہوا ہے، یہ سب ......'' اس نے چاروں طرف ہاتھ پھیلایا۔ ''تم تو دیکھ ہی رہے ہو۔ یہ تاریخ کی کون سی شکل ہے؟ یہ وہ نسل ہے جو ایک ملک کی تاریخ میں عرصے عرصے کے بعد پیدا ہوتی رہتی ہے، جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا، کوئی خیالات کوئی نصب العین نہیں ہوتا جو پیدائش کے دن سے اداس ہوتی ہے اور اِدھر سے اُدھر سفر کرتی رہتی ہے۔ ہم ہندوستان کی اس بدقسمت نسل کے بیٹے ہیں......''

تھوڑی دیر کے بعد جب اس کا پہلا جوش ختم ہوگیا تو وہ دھیمے، اداس لہجے میں اپنے متعلق بتانے لگا:

''میں نے یونیورسٹی میں تاریخ پڑھی۔ لیکن میں اس دنیا میں رہتا تھا جہاں آپ یا تعلقہ دار تھے یا کچھ بھی نہ تھے۔ جو لوگ اعلیٰ دماغ ہوتے تھے سرکار کی ملازمت میں چلے جاتے تھے اور حکومت برطانیہ انہیں اس طور تربیت دیتی تھی کہ ان کی تمام ذہانت، تمام اچھوتا پن ختم ہو جاتا تھا۔ وہ نہ تعلقہ دار بن سکتے تھے نہ آرٹسٹ، محض سرکاری افسر بن کر رہ جاتے تھے۔ نہ سرکار نہ رعایا، محض معمولی کارندے یہ عجیب مضحکہ خیز طبقہ تھا۔ یہ ان کا خاتمہ تھا۔ آئیڈیل کہاں سے آتے؟ دوسری طرف ہماری دنیا تھی۔ اس میں مشقت کرتے ہوئے مزارعے تے اور چھوٹے چھوٹے خودغرض، خوشامدی اور پیٹو اہلکار تھے۔ قرض تھے اور سود لینے والے مہاجن تھے اور جائدادوں کی قرقیاں تھیں، اور اس سب کے اوپر ان خداؤں کے ساتھ گونگی، کتوں کی سی وفاداری تھی۔ یہاں آئیڈیل بن ہی نہ سکتے تھے، یہاں صرف گری ہوئی زندگی تھی اور بے بس برافروختگی تھی، جیسے کتے بھونکتے ہیں۔ تاریخ کی پڑھائی سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ محض کنفیوژن پیدا ہوا خوفناک کنفیوژن۔ اگر میں سرکاری ملازمت کرتا تو آج تک اپنی تعلیم کا قرض اتارتا رہتا۔ چنانچہ میں بھاگ گیا۔ لیکن وہ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ سمجھتے ہو؟ ہم تم ہم عمر ہیں، ایک دوسرے کو سب کچھ بتا سکتے ہیں، تم ضرور سمجھ جاؤ گے۔ وہ زمانہ تھا جب اس سب کچھ کے باوجود آدمی اپنے خیالات کے ساتھ نوجوانی کی اولیں محبت کرتا ہے، جس کے ختم ہونے کا غم انسان عمر بھر ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔ جس سے دل خالی ہو جاتے ہیں اور دماغ ناکارہ۔ اس وقت معمولی سے معمولی اور بیکار چیزوں میں نصب العین نظر آتا ہے اور انتہائی بے خیالی سے ہم زندگی کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ حقیقت سامنے آجاتی ہے......''

''پھر؟ پھر تم بھی......''

''نہیں۔ میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں اس کے بعد کارندہ نہیں بنا، مگر میں نے وہ کیا جو مجھ کو کرنا چاہیے تھا، جو ہر کسی کو کرنا چاہیے تھا۔ میں محنت کر کے روزی کمانے لگا۔ یہ تاریخ کا وہ زمانہ ہے جس میں میں

کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑا کام جو میں کر سکتا ہوں وہ خاموشی اور دیانت داری کے ساتھ رہنے کا ہے۔ یہ سب سے قدرتی طریقہ ہے جو انسان اختیار کر سکتا ہے کیونکہ دیانت داری اور شرافت کے ساتھ مسلسل دکھ سہتا ہوا انسان ہی دنیا کی واحد حقیقت ہے۔ میں نے کافی آرام کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے اب میں بارہ گھنٹے تک چل سکتا ہوں۔ تم میری جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ آؤ آؤ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں کہہ رہا تھا' اوہ...... میں بار بار دہرا رہا ہوں' لیکن یہی دنیا کی واحد حقیقت ہے۔ سن رہے ہو؟ تم شاید سن بھی نہیں رہے' کیا فائدہ......''

انہیں چلتے ہوئے نو روز ہو چکے تھے۔ اب وہ جالندھر کے قریب پہنچ رہے تھے اور حالانکہ آدھے سے زیادہ نئے لوگ اس میں شامل ہو چکے تھے لیکن قافلے کا حجم حیرت انگیز طور پر گھٹتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوں جوں وہ پنجاب میں اندر آتے گئے حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ پچھلے پانچ روز سے دن میں کئی کئی بار حملے ہو رہے تھے اور وہ ایک پل کے لئے بھی بے خبر ہو کر نہ چل سکتے تھے۔ یہ حملے مسلح اور نیم مسلح دستوں کی طرف سے ہو رہے تھے جو کہ زیادہ تر دیہات میں سے آتے۔ پہلے پہل تو قافلے والے کچھ نہ کچھ ان کا مقابلہ کرتے رہے' اب وہ اس قدر تھک چکے تھے کہ حملہ آوروں کے ہتھیاروں کے سامنے خاموشی سے مر جاتے یا بھاگنے لگتے۔ ہر حملے کے بعد مردوں اور زخمیوں کو پھلانگتے ہوئے' روندتے ہوئے قافلے والے آگے نکل جاتے' کئی ایک سمت کا احساس کھو کر قافلے سے بچھڑ جاتے اور نوجوان عورتیں اغوا کر لی جاتیں۔ اس طرح سے گو ہر پڑاؤ پر مہاجرین کی تازہ جماعت ان سے آملتی مگر کم ہونے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی اور قافلہ گھٹتا جاتا۔ پچھلے پچاس میل سے اچانک انہیں اپنے راستے میں مردہ اور نیم مردہ انسانی جسم ملنا شروع ہو گئے تھے جو سڑک پر اور آس پاس کے کھیتوں میں بکھرے پڑے تھے اور پتا دیتے تھے کہ ان سے آگے آگے ایک اور قافلہ رواں تھا' ایک مہیب' زخمی جانور کی طرح جو خون کی لکیر چھوڑتا ہوا آگے آگے بھاگ رہا ہو۔ گو وہ اسی عجلت اور لاپروائی کے ساتھ ان اجنبی مردہ جسموں کو پھلانگتے ہوئے گزر رہے تھے مگر اس خیال سے کہ ان سے آگے' ان سے پہلے کچھ اور لوگ' دوسرے ناواقف لوگ موت کا سامنا کر رہے تھے' انہیں عجیب سے طمانیت کا احساس ہوا۔ موت جو مشترکہ تھی اور راستے میں بکھری ہوئی تھی اور جس کے اوپر سے ہزاروں انسانی پاؤں بظاہر بیگانگی اور بے نیازی کے ساتھ بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے' آخر کار اسے دھوکہ دیا جا سکتا تھا' ٹالا جا سکتا تھا' دوسرے کے سر تھوپا جا سکتا تھا۔

اس خیال کو یوں بھی تقویت ملتی کہ بعض دفعہ اگلے قافلے کے حملہ آور انہیں بغیر کچھ کہے گزر جانے دیتے۔ وہ مار مار کر اس قدر اکتا چکے ہوتے کہ محض سڑک کے کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش' خوفزدہ کوچ سے ہی محظوظ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ مردوں اور زخمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیتے اور نیا قافلہ چپ سادھے' بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گزر جاتا۔ کبھی کبھار' ان کی زد سے باہر نکل کر' ایک آدھ پرانا آدمی رک کر دور سے جلتے ہوئے انسانی جسموں کا نظارہ کرتا اور اس کے ذہن میں قافلے کی پہلی لاش کی یاد تازہ ہو جاتی۔ زیادہ تر

لوگ نئے ساتھیوں اور نئے حملوں کی توقع میں اپنا سفر جاری رکھتے۔

نعیم اس افراتفری میں کئی بار علی سے بچھڑ گیا۔ مگر علی ہر دفعہ اسے تلاش کر لیتا۔ وہ گاڑی کے اوپر ایڑیاں اٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور چاروں طرف نظر دوڑاتا' پھر ایک طرف کو نظریں جما کر گاڑی سے اترتا' ہجوم کو چیرتا ہوا سیدھا جاتا اور سر جھکا کر چلتے ہوئے نعیم کو بازو سے پکڑ کر برا بھلا کہتا ہوا واپس لے آتا۔ ''اپنی گاڑی کو مت چھوڑو مت چھوڑو تین ہزار بار کہا ہے۔ مگر تم تو بالکل کام سے گئے۔ وہ پکڑ لیں گے اور مار دیں گے اور چلے جائیں گے۔ بس۔ پھر؟'' وہ کہتا۔ لیکن نعیم سارے کاموں سے جا چکا تھا۔ بوڑھا پروفیسر بھی اب اس سے باتیں کرنے کی ناکام کوشش کر کر کے تھک چکا تھا اور آخر اس نے علی سے کہا تھا۔ ''تمہارا بھائی...... اس کے دماغ پر اثر ہے۔ خیال رکھنا پڑے گا۔'' اور علی' جو شروع سے بڈھے پروفیسر کی طرف سے لاپرواہ تھا' یہ سوچ کر خوش ہوا کہ اب وہ جب چاہے اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔

وہ سب کچھ دیکھتا بھالتا کھاتا اور کبھی کبھی اونگھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کی صورت اپنے دوسرے ہم عمروں سے قطعی مختلف نہ تھی۔ سب کی داڑھیاں اور چہرے غلیظ' لباس پھٹے ہوئے اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ سب ننگے پاؤں تھے کہ سارے جوتے تنگ ہو چکے تھے۔ سب کی نظریں گونگی اور آوارہ تھیں اور ان سے طویل' بے منزل مسافرت کی تکلیف ٹپکتی تھی۔ سب کے نزدیک اہم ترین کام چلتے جانا اور اکٹھے رہنا تھا اور وہ ان سب میں گھلا ملا ہوا' کھویا ہوا' محض ایک اور گمنام' بے حیثیت مسافر تھا۔ اس کے سامنے وقفے وقفے پر حملے ہو رہے تھے' لوگ مر رہے تھے' جو مارے جانے سے بچ رہتے وہ تھک کر گر رہے تھے' سامان کو آگ لگائی جا رہی تھی اور لوگ خوراک کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ سڑک پر اور سڑک کے کنارے لاشوں کا طویل سلسلہ تھا۔ کوئی پلیا کے پتھر کے سہارے بیٹھا اور کوئی درخت کے ساتھ کھڑا کھڑا مر گیا۔ عورتوں کے ننگے مردہ جسم بے شرمی سے پھیلے ہوئے تھے اور جنگلی جانور اور پرندے ان پر پل رہے تھے۔ جو زندہ تھے وہ مستقل چل رہے تھے اور میاں بیوی' بہن بھائی اور ماں اور بچے کے رشتے ختم ہو رہے تھے اور وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو دنیا کی تاریخ میں ایسے قافلوں کے ساتھ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ لیکن یہ سب اہم نہیں تھا' کیونکہ وہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود خاموش اور لاتعلق تھا۔

''تم بولتے کیوں نہیں؟'' آخر جھنجھلا کر علی نے کہا۔ ''تھ تھ تھ یعنی پانچ روز ہو گئے...... پورے پانچ' اور بات تک کر کے نہیں دی اس شخص نے۔ تھ تھ تھ......''

''دماغ پر اثر......'' پروفیسر نے کہنا چاہا۔

''چپ رہو تم۔ نیچے اترو...... چلو۔'' علی نے اس کی پشت پر دھپ جما کر گاڑی سے اتار دیا۔

نعیم نے تیز روشن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور چالاکی سے مسکرایا۔ پھر اس نے عائشہ پر نظر ڈالی جو گاڑی میں لیٹی تھی اور چارے کا ڈھیر' جس میں اپنے آپ کو چھپانے کے لئے اس نے گھر بنا رکھا تھا' ختم ہو چکا تھا۔ وہ بہرحال اتنی سوکھ چکی تھی کہ کسی نے اسے مارنے یا اغوا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ نعیم آہستہ سے

ہنسا۔ پھر وہ تیز تیز چل کر بیلوں کے پاس پہنچا اور ان کی پسلیوں پر، جو باہر نکلی ہوئی تھیں، ہاتھ پھیرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ پروفیسر اور علی گم سم، ترحم خیز تعجب کے ساتھ اسے دیکھتے رہے، پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مایوسی سے سر ہلانے لگے۔

ایک نشہ تھا، ایک بدمستی تھی جس میں سب کچھ ڈوب چکا تھا، غرق ہو چکا تھا، جس کا منبع کسی کے علم میں نہ تھا۔ ایک بے خودی، جو زندگی کی سفا کی کے اس سارے منظر کو بہا کر لے گئی تھی، پار کر گئی تھی، جس نے ہر انسانی اور حیوانی جذبے کو، تجربے کو فتح کر کے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی، کیونکر پیدا ہوئی تھی اور کدھر لئے جا رہی تھی، اس سے وہ قطعی ناآشنا تھا۔ صرف ایک غبار تھا، روشن اور لطیف اور بے ہیئت، جیسے خزاں کی شفاف راتوں کی کہکشاں، یا جاڑوں کی صبحوں کی دھند جو چھوئی نہیں جاتی مگر کپڑوں میں گھس کر سارے جسم کو گیلا کر دیتی ہے اور خوبصورت اور خنک ہوتی ہے، جس میں آپ چلتے جاتے ہیں چلتے جاتے ہیں اور نئی نئی چیزیں نمودار ہوتی جاتی ہیں، مرد اور عورتیں، گھوڑا گاڑیاں، بچے، روزمرہ کی مانوس شکلیں، مگر دھند میں سے نکلتی ہوئی وہ انوکھی اور خنک اور خوبصورتی ہوتی ہیں، خواب کی طرح۔ بس ایسا غبار تھا جو شروع دن سے بلند ہو رہا تھا، جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جسے اس نے واضح طور پر محسوس کیا تھا، موت اور بھوک اور بے کسی اور خوف اور لالچ کے ساتھ ساتھ، جسم کی بڑھتی ہوئی تھکن کے پہلو بہ پہلو...... اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

درد کرتا ہوا جسم جو اس کا خیال تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی اذیت تھی، اور مایوسی کا نقطہ عروج، جہاں پہنچ کر اب نہ وہ بھاگتے تھے نہ پروا کرتے تھے، حملہ آور ان میں سے چند ایک کو ہانک کر لے جاتے تھے اور سڑک کے کنارے کھڑا کر کے گولی مار دیتے تھے، سب ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ جسے اس نے محسوس کیا تھا آخر ان سب سے زیادہ طاقتور اور روشن اور جاندار تھا اور اسے مکمل طور پر لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔ یہاں بالآخر خاموشی تھی، اور وجد۔

قافلے والوں کا کاروبار بہرحال چل رہا تھا۔ شہر کے باہر وہ پناہ گزین کیمپ میں پہنچ کر رک گئے۔ یہاں ان کو رات بسر کرنا تھی۔ کیمپ چند کچی پکی بارکوں اور پھٹے ہوئے خیموں پر مشتمل تھا۔ بارش کا پانی جگہ جگہ رکا ہوا تھا۔ پرانے اور نئے پناہ گزینوں نے ایک دوسرے کو شک و شبے کی نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ بیٹھ گئے اور پتھروں کے چولہوں پر روٹیاں پکانے لگے۔ جن کے پاس توے نہیں تھے وہ گول گول پتھروں پر آٹا لپیٹ کر آگ پر گرم کرنے لگے۔ جن کے پاس آٹا نہ تھا وہ بھاری رقمیں دے کر پڑوسیوں سے آٹا خریدنے لگے۔ جن کے پاس پیسے نہ تھے وہ رات کا انتظار کرنے لگے جب اندھیرے میں چوری کی جاسکتی تھی یا گھر کی عورتوں میں سے کسی جوان اور خوش شکل کو تھوڑی دیر کے لئے کسی دوسرے کے حوالے کر کے، کہ حیوانی جذبے اور ان کے پالنے والے ہر حالت میں زندہ رہتے ہیں، معاوضے میں اشیائے خوردنی حاصل کی جاسکتی تھیں۔ کچھ لوگ بہرحال اتنے تھک چکے تھے کہ آتے ہی غش کھا کر گر پڑے اور ہوش میں آنے پر گڑھوں میں رکا ہوا پانی پی کر دوبارہ گہری نیند سو گئے اور مکھیاں ان کے منہ پر جمع ہونے لگیں اور جنگلی پرندے انہیں مردہ سمجھ کر چونچیں مارنے لگے۔ پھر چند ایک ایسے بھی تھے جو محض ہونقوں کی

طرح منہ کھولے بیٹھے تھے اور خلا میں دیکھ رہے تھے گویا موسم کا جائزہ لیتے ہوں۔ ان دنوں سارے دن ایک سے تھے۔ یا بارش ہوتی یا سورج نکل آتا۔ دھوپ بھورے رنگ کی جھلس دینے والی ہوتی' آسمان گرد آلود اور بدرنگ ہوتا جس پر ہر وقت فربہ مردار خور پرندوں کے غول کے غول اڑا کرتے اور فضا میں ایک عجیب قسم کی متلی آور بُو پھیلی رہتی۔

وہ رات اسی مدہوشی میں گزری۔ ٹوٹی ہوئی چھت والی بارک میں دیوار سے ٹیک لگائے وہ بیٹھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بارش ہو رہی تھی۔ پانی کی زد میں جو لوگ آتے ان میں کھلبلی مچ جاتی اور اٹھ اٹھ کر ان لوگوں پر گرنے لگتے جو چھت کے نیچے سو رہے ہوتے' گالیوں اور کوسنوں کا طوفان اٹھتا اور آپ سے آپ ختم ہو جاتا۔ بارہ فٹ مربع کی کوٹھڑی میں سو سے زیادہ بدبودار' غلیظ انسان بند تھے۔ نعیم آہستہ آہستہ واپس آ رہا تھا۔ وہ سرِ شام سے آنکھیں کھولے دیوار کے سہارے بیٹھا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر اس پر غنودگی طاری ہو جاتی اور عجیب و غریب خواب دکھائی دیتے لیکن اس کی آنکھیں کبھی پورے طور پر بند نہ ہوتیں' بس غنودگی کی حالت میں آدھی مچ جاتی۔ ان نیم وا آنکھوں میں اگر کوئی دیکھتا تو یقیناً خوفزدہ ہو جاتا کیونکہ اسے وہاں پر ایک مردہ آدمی کی گدلی' بے حرکت آنکھیں دکھائی دیتیں' وہ جن میں سے ساری نظر غائب ہو چکی ہوتی ہے۔ اور خواب۔ ایسے مختصر' بے ہیئت خواب جو جاگنے پر یکسر ذہن سے نکل جاتے لیکن جن کے بعد ایک عجیب قسم کی تازگی اور توانائی سارے وجود میں محسوس ہوتی۔ جاگنے پر وہ اِدھر اُدھر دیکھتا اور کسی جگہ پر باتیں کرتے ہوئے لوگوں کے چند جملے اس کے کان میں پڑتے اور انسانی بدبو سے اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے حواس دوبارہ اصل کر رہا تھا۔ جسمانی درد کے بعد' جو اسے مسلسل چلنے سے ہوا تھا' اس کا خیال تھا کہ اس کمرے کی بو زندگی کی سب سے بڑی اذیت تھی جو وہ سہہ رہا تھا۔

صبح کاذب کے وقت وہ پوری طرح آنکھیں کھولے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب چند کسان آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ وہ سننے لگا۔

''پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی ایک ایک نیکی باری باری یاد کر کے دہرائی اور جب ایک اپنی بات ختم کر چکا تو دہانے کا پتھر ایک تہائی ہٹ گیا' اور دوسرے کی بات ختم ہونے پر پتھر دو تہائی ہٹ گیا' اور جب تیسرے نے اپنی نیکی گنائی تو غار کا منہ صاف کھل گیا اور وہ بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے۔''

''تین نہیں چار تھے۔''

''نہیں تین تھے۔''

''مجھ کو کیا پتا نہیں؟''

''اچھا جھگڑا مت کرو' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مطلب یہ کہ اپنی ایک ایک نیکی یاد کرو۔ سب۔''

''پہلے تم کرو۔''

''پہلے میں؟ اررر اچھا سنو۔ اررر......''

سب ہنسنے لگے۔

''دانت مت نکالو۔ سنو۔ میں نے ایک دفعہ...... ایک دفعہ میں نے' میری گائے کو' موکھر' ہوگیا تھا اور میں رات بھر اسے ٹکور کرتا رہا تھا۔''

وہ پھر ہنسنے لگے۔ ''گائے کی نیکی سے کیا ہوتا ہے' کوئی اور۔'' کسی نے کہا۔

''کیوں نہیں ہوتا۔ بے زبان کے ساتھ نیکی کرنے سے...... نہیں ہوتا کچھ؟''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ اب تم بولو۔''

دوسرا بولا: ''پار سال کے جاڑے کی بات ہے میں کھلیان پر بیٹھا تھا کہ ایک سوار آیا اور دروازے پر گر پڑا۔ اس نے بتایا کہ پولس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور اس کے پیٹ میں تین گولیاں ہیں۔ میں نے اس کو بھوسے کے ڈھیر میں چھپا دیا اور خون کے نشانوں پر بھی بھوسہ ڈال دیا اور گھوڑے کو بھگا دیا۔ پھر پولس ساری رات مجھے عذاب دیتی رہی پر میرے منہ سے اس کا بول نہ نکلا۔''

''یہ تو گائے سے بھی بدتر ہے۔ ہوسکتا ہے وہ قاتل ہو۔'' سب پھر ہنسے۔

''مجھے کیا پتا۔ میں نے تو نیکی کا کام کیا۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے' اب تم بتاؤ۔''

تیسرے نے کوئی مختصر سی بات کی نقاہت کی وجہ سے جس کی آواز نعیم تک نہ پہنچ سکی۔

''بس۔ تین کافی ہیں۔''

''نہیں چار......''

''بس بس۔ تین۔''

ان کی سادہ' بے خطر آوازیں تھیں اور وقت کے اندیشوں کو انہوں نے فتح کرلیا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے نعیم کے ذہن میں ایک نظم کے مصرعے آنے لگے۔ وہ کچھ اس طرح تھے:

''ننگی شاخوں پر پرندے خوراک کی امید میں بیٹھے ہیں
اور ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے ہیں
نیچے ان کے خداؤں کے کارواں اپنی حمد وثناء گاتے ہوئے گزر رہے ہیں
پر پیڑ کہاں ہیں؟
میں دنیا کے چوراہوں میں بیٹھ کر بھیک مانگتا ہوں۔
اور دنیا میں پیغمبر آنا بند ہو چکے ہیں۔
اب لوگ صرف کہانیاں سنا کر چلے جاتے ہیں۔
پر لوگ کہاں ہیں؟''

اس نے دو تین بار نظم کو زیرلب دہرایا۔ اس نے شاعری بہت کم پڑھی تھی لیکن آج یہ نظم آپ سے آپ

تیار ہوگئی تھی۔ کیونکر؟ کیونکر؟؟ حیرت و استعجاب کے جذبات نے چند لمحوں تک اسے ششدر کر دیا' پھر یکلخت اس کے اندر قوت اور توانائی کی ایک لہر پیدا ہوئی جس نے اس کو میکانکی طور پر اٹھا کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ سوتے اور جاگتے ہوئے جسموں کو پھلانگتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

ایک تازہ ہل چلے ہوئے کھیت کے کنارے کنارے بھاگتا ہوا وہ یکلخت رک گیا۔ سورج نکل رہا تھا۔ اوّلیں کونوں کے ساتھ کبوتروں کی ایک ڈار کھیت میں آ کر اتری اور خوراک کی تلاش میں اِدھر اُدھر بکھر گئی۔ پھر چڑیوں کی ایک ڈار آئی اور کھیت کے دوسرے کنارے پر اتری۔ صبح سویرے کی آہستہ خرام تازہ ہوا اس کے چہرے سے ٹکراتی گزر رہی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ چند منٹوں میں مشرقی آسمان نے کئی رنگ بدلے۔ پھر زردی مائل گلابی رنگ کی کمزور دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر پڑی' اور اڑتے ہوئے پرندوں پر' پھر اس کا رنگ سفید اور سنہری ہوتا گیا اور وہ درختوں کی شاخوں پر پڑی اور بارکوں کی چھتوں اور خیموں کی چوٹیوں پر' پھر تنوں پر اور بیدار ہوتے ہوئے انسانوں کے چہروں پر' پھر زمین کے چاک سینے پر اور پیٹ بھرتے ہوئے کبوتروں پر اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین و آسمان کا وہ گنبد نما اور اس میں محیط ہر شے اس عظیم الشان سنہری روشنی سے بھر گئی' حتیٰ کہ بالوں کو اڑانے والی آہستہ خرام ہوا بھی سنہری تھی اور اس میں تازہ سنہری مٹی اور سنہرے ہرے پتوں کی خوشبو تھی۔ وہ کئی لمحوں تک دم بخود کھڑا چاروں طرف پھیلتے ہوئے طلسم کو دیکھتا اور محسوس کرتا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بڑھا اور کھیت کے درمیان پڑے ہوئے پتھر پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا اور سورج میں نظر جما کر دیکھنے لگا اور دیکھتا رہا اور اس کی روح میں وہ عجیب و غریب لہر بڑھتی رہی اور گھٹتی رہی' بڑھتی رہی اور گھٹتی رہی۔ پھر پہلی دفعہ اس نے آنکھیں بند کیں۔

یکا یک وہ گرا اور دونوں بازو پھیلا کر پتھر سے لپٹ گیا اور اسے چومنے لگا حتیٰ کہ وہ جگہ جگہ سے گیلا ہو گیا۔ پھر اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں میں سے مٹی اٹھائی اور چہرہ اس میں دبا دیا اور خوشی سے دیوانہ وار قہقہہ لگایا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جب وہ واپس بارک کے دروازے پر پہنچا تو لوگ اٹھ رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے یکا یک رات کی خوفناک بُو کا راز اس پر کھلا۔ ایک کونے میں' ایک خاموش معاہدے کے تحت' لوگوں نے ذرا سی جگہ خالی چھوڑ رکھی تھی جہاں پر رات بھر مائیں اپنے بچوں کی اور اپنی حاجت رفع کرتی رہی تھیں۔ پاس ہی گندگی میں لتھڑی ہوئی ایک انسانی لاش پڑی سڑ رہی تھی۔

''یہ'' ایک کسان نے لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''کوئی کہہ رہا تھا دو ہفتے سے یہاں پڑی ہے۔''

''یعنی ہم ...... رات بھر۔'' خوف اور کراہت کے مارے اس کے ساتھی کی آواز بند ہو گئی۔

لوگ ڈرے ہوئے مویشیوں کی طرح بارک چھوڑنے لگے۔

(۴۷)

جب قافلہ روانہ ہوا تو وہ بے اختیار بولنے لگا:

''تم نے کبھی مونٹ ایورسٹ کی طرف دیکھا ہے؟ جب سے نسل انسانی کا آغاز ہوا ہے لوگ اسے حیرت و استعجاب سے دیکھتے آئے ہیں۔ آج ہزاروں برس کے بعد بھی وہ اسی طرح شاندار اور عظیم ہے۔ اور تمہیں کبھی ساحل سمندر پر جانے کا اتفاق ہوا ہے؟ تھ تھ تھ تم تو صرف تاریخ پڑھاتے رہے اور اس سے پہلے ...... خیر بہرحال، سمندر اور آسمان اور طلوع سحر کا منظر اور تاج محل اور شیکسپیئر' ان سب میں' ساری چیزیں میں ایک حسن ہے جو لازوال ہے' اور وہ تخلیق کا حسن ہے۔ خدا کی تخلیق اور انسان کی تخلیق۔ حسن اپنی اعلیٰ ترین شکل میں صرف تخلیق میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ لافانی ہوتا ہے' اور وہ صرف بہترین تخلیق میں پایا جاتا ہے۔ جب وہ کسی ادنیٰ تخلیق میں نمودار ہوتا ہے تو محض اصل کی تصویر ہوتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے' اپنی ساری دلکشی کے ساتھ' اپنی ساری دلکشی کے باوجود' جیسے انسانی ہستی جو بالآخر مٹ جاتی ہے۔ مگر اعلیٰ ترین سطح پر خدا انسانی روح کی تخلیق کرتا ہے اور آسمانوں اور سمندروں اور پہاڑوں کی روح کی طرح وہ لافانی ہوتی ہے اور اس کی دلکشی بھی' اور پھر یہ حسن کی تخلیق کرتی ہے' ایک اور حسن کی۔ خدا کی بنائی ہوئی تمام چیزوں میں صرف انسانی روح ہے جسے تخلیق کی قوت ورثے میں ملتی ہے' اور اس طرح کائنات کا حسن قائم رہتا ہے' خدا سے آدمی کی طرف اور پھر خدا کی طرف۔ خدا اور انسان روح تخلیق کے عمل کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں' اور یہ ایک ہی شے ہے...... حسن! یہ اتنی ہی زبردست اور بے پایاں قوت ہے جتنے اس کے دونوں خالق' اور یہ بہت بڑی قوت ہے' محبت اور مذہب اور موت سے بھی بڑی' زندگی سے بھی بڑی۔ کیونکہ یہ چیزیں ادنیٰ تخلیق ہیں' محض وہ قوتیں ہیں جو اعلیٰ تخلیق کی طرف ابھارنے میں مددگار کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

''مثلاً زندگی! میں تم کو بتاتا ہوں۔ زندگی جو نام ہے ہر قسم کی تکلیف اور راحت میں عمر بسر کرنے کا' کس طرف کو سفر کرتی ہے؟ دانائی کی طرف۔ کیا کنفیوشس اور افلاطون کی دانائی کبھی ضائع ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ کبھی دوبارہ زندہ نہ ہوں گے' مگر جو کچھ انہوں نے دیکھا اور جانا اور محسوس کیا وہ آج ہزاروں سال کے بعد بھی ایک طاقت ور اور جاندار قوت ہے اور جب تک زندگی باقی رہے گی یہ قوت انسانوں کے درمیان زندہ اور محرک رہے گی۔ کیونکہ یہ زندگی ہے جو ہر ایک کو بسر کرنا ہے اور یہ ایک ہی طرف کو سفر کرتی ہے۔ دانائی حسین ہے کیونکہ تخلیق ہے' اور تخلیق حسین ہے کیونکہ دانائی ہے۔ تم دونوں کو جدا نہیں کر سکتے۔

''اور محبت؟ کیا عہد قدیم کے انسانوں کی محبت کی داستانوں کو تم بھلا سکتے ہو؟ دنیا میں سب سے بڑی محبت پیغمبروں نے کی ہے' اور محبت ایک ایسی قوت تھی جس نے انہیں ایک اعلیٰ ترین تخلیق کی طرف ابھارا۔ لیکن اب پیغمبر آنا بند ہو چکے ہیں۔ اب محبت صرف فنکار کرتے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے موسیقی ایجاد کی' جنہوں نے شعر لکھے'

جنہوں نے سنگتراشی کی‘ وہ جنہوں نے زندہ رہتے ہوئے زندگی کو خیر باد کہا‘ وہ جو فراغت اور جسمانی راحت کی زندگی ہوتی ہے جس کے لئے ہر کوئی کاوش کرتا ہے‘ جسے چھوڑ کر وہ الگ ہو گئے اور تنہائی میں چپکے چپکے کام کرتے رہے‘ ختم ہوتے رہے‘ غیر فانی ہوتے رہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا‘ اور کیوں ہوا؟ سنو۔ یہ وہی محبت تھی جو پیغمبروں نے خدا سے پائی اور جب ہمارے پاس پہنچی تو اس کا رتبہ لگن کا ٹھہرا‘ اور لگن کی روشنی میں کچھ لوگوں نے تخلیق کی اور ہمیں زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کیا۔ ہم سب محبت نہیں کر سکتے‘ ظاہر ہے‘ لیکن پیغمبروں کے خاتمے سے ہم پر بدقسمتی وارد نہ ہوئی کیونکہ محبت کے چراغ سے چند اور چراغ جلے اور آنے والے عہد میں جلتے رہے اور اس طرح وہ شعلہ قائم رہا اور اس کی روشنی اور حرارت کی مدد سے انہوں نے زندہ رہنے کا ایک عظیم الشان قرینہ ایجاد کیا‘ اس کی لو میں انہوں نے زندگی کی کثیف اور غلیظ بے ترتیبی اور بے ڈھنگے پن میں سے ایک لطیف اور شاندار تنظیم برآمد کی جو ہمیں ورثے میں ملی اور اب ہماری جائداد ہے اور جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ تو دیکھا تم نے‘ اس ساری بات کی تہہ میں محض ایک قوت تھی‘ جہاں ساری قوتیں جا کر ملتی ہیں‘ تخلیق کی قوت! محبت تو محض راستہ ہے۔ تم بیٹھے رہو۔ میں تھکا ہوا نہیں ہوں۔ رات بھر آرام کیا ہے۔

''اور مذہب؟ سچ ہے کہ تخلیق کی نہایت اعلیٰ شکل ہے‘ اور نہایت دلکش۔ یہ واحد مظہر ہے جہاں خدا‘ انسان اور روح آپس میں یوں مدغم ہو گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تخلیق در تخلیق اس سرعت کے ساتھ عمل میں آتی ہے کہ ہم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں یہ وہ حیرت نہیں جو سرکس میں کسی کھلاڑی کا کمال دیکھ کر ہوتی ہے۔ یہ وہ بلاخیز ذاتی تجربہ ہے جو ہمیں ...... مثلاً کسی تباہ کن زلزلے سے زندہ بچ کر نکل آنے سے ہوتا ہے یا اس سے بھی کچھ بڑا جیسے یہ‘ یہ اب‘ یہاں ......'' وہ چاروں طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔ ''یہ اب‘ یہ اب ...... ہاں مذہب‘ بلند ترین تخیل ہے۔ یہ بے مثال مظہر ہے‘ جہاں خیال فوراً ہی عمل کے سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے اور پھر وہ‘ محض اپنے زور پر‘ ایک پوری زندگی اور اس کی منزل کا تعین کرتا ہے‘ تمام نوع انسانی کو بنیادوں تک ہلا دیتا ہے‘ لاکھوں انسانوں کی روح میں حرکت اور گرمی پیدا کرتا ہے۔ آج بھی انسانوں کی سوسائٹی میں مذہب سب سے بڑی واحد قوت ہے ...... تو اس کا اسرار کیا ہے؟ اس کا راز؟ بتاؤ۔ ہنہہ ہنہہ ہنہہ۔'' وہ چالاکی سے مسکرایا۔ ''ایمان۔ یہ ایمان کی تخلیق کرتا ہے اور سینہ در سینہ‘ نسل در نسل‘ عہد در عہد اسے منتقل کرتا جاتا ہے۔ ہم ایک مذہب کے حق میں اور دوسرے مذہب کے خلاف بہترین دلائل دے سکتے ہیں لیکن ہم ایمان سے یقین نہیں اٹھا سکتے جو کہ سارے مذاہب کی روح ہے۔ یہ مشترکہ جائداد ہے۔ یہ لاعلم اور بے بہرہ لوگوں کو زندہ رہنے کا اور مرنے کا غیر متزلزل ارادہ عطا کرتا ہے ایک آئیڈیل‘ ایک خواب! وہ شخص جو اپنے دروازے سے باہر کسی شے کا علم نہیں رکھتا اور جس کی ملکیت میں ایک صحن اور ایک چولہے کے علاوہ کچھ نہیں‘ ایمان کی ہمراہی میں دفعتاً تمام زندگی ...... اور تمام موت ...... کے معنی سمجھ جاتا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ مذہب ہی ایک ایسا علم ہے جس نے کسی حد تک زندگی اور موت کے اسرار کو سمجھا اور بیان کیا ہے؟ مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس سے آگے دلائل ختم ہو جاتے ہیں۔ ہر عہد میں بہتر مدلل

قوتوں کے مالک انسان پیدا ہوئے ہیں اور مذہب سے بدل ہوتے رہے ہیں' کیونکہ جہاں دلائل ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے ایمان شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ پوشیدہ رو ہے جو تمام مذاہب کی تہہ میں رواں ہے۔ ایمان' یہ تجریدی اور تقریباً غیر دلچسپ لفظ' جس میں انسانیت اور خدائیت کے وسیع ترین معنی پوشیدہ ہیں' پُر اسرار اور غیر مشروط طور پر بے علم لوگوں کے دلوں میں اتر جاتا ہے اور انہیں اطمینان اور وقار کے ساتھ ہر آفت کا' جس میں موت بھی شامل ہے' سامنا کرنے کا اہل بنا دیتا ہے۔ پھر ہر چیز اس قدر آسان اور قدرتی دکھائی دیتی ہے۔ کوئی آج تک نہیں سمجھ سکا کہ کس طرح کمتر ذہانت رکھنے والے لوگ اس Phenomenon کو قبول کر کے ایک عظیم جرأت کی اہلیت اختیار کر لیتے ہیں' لیکن تم بتاؤ' تخلیق کے عمل آج تک کون سمجھ سکا ہے۔ سائنس دان؟ ہنہہ! جب نسانی دماغ ''کیسے؟'' کے بعد ''کیوں؟'' پر غور کرنے لگتا ہے تو سارا علم ختم ہو جاتا ہے۔

''تو دیکھا تم نے' کس طرح منظم مذہب' اپنی عظمت کے باوجود' ایمان کے مقابلے میں دوسرا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایمان' جو مذہب کی تخلیق ہے' اس کا سارا مقصد' سارا حسن ہے۔ ذہین لوگ جو اس حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے مذہب سے بدل ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ میں بھی ان میں شامل تھا' لیکن کل رات' وہاں ان کے ساتھ ...... وہ چند بے علم گنوار دہقان تھے ...... ان کے ساتھ بیٹھے بیٹھے دفعتاً مجھے ان کی طاقت' ان کی دانائی اور ان کے وقار کا علم ہوا جبکہ موت ان کے سامنے کھڑی تھی' ان کے درمیان چل پھر رہی تھی۔ زندگی کے اس عظیم جری لمحے میں انہوں نے اسے مکمل طور پر قبول کر لیا تھا' نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ تمام بنی نوع انسان کی دانائی اور اس کا وقار تھا۔ یہ اس قدر سادہ اور آسان تھا۔

''تو تم نے دیکھا۔ تم ذہین آدمی ہو۔ میں جانتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ ''تخلیق ...... سب سے اوپر ہے۔ سب سے میں نے دیکھا ہے۔ آج۔'' وہ دوبارہ شرما کر ہنسا۔ ''آج میں نے ایک نظم' تم جانتے ہو میں شاعر نہیں ہوں' پھر بھی آج' لیکن اب میں اسے بھول گیا ہوں۔ خیر چھوڑو اسے' یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ یہ اس قدر سادہ اور آسان ہونے کے باوجود اس قدر مشکل بھی ہو سکتا ہے۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو اپنے تمام علم اور عقل کے باوصف افلاطون یا کوئی پیغمبر ہو سکتا تھا' لیکن اس کے پاس خدا نہیں تھا ...... چنانچہ وہ دنیا میں پیدا ہونے والی کمترین اجناس میں سے تھا۔''

بوڑھا پروفیسر ہنسا: ''چلو اچھا ہوا۔ شاعری نے تمہیں زبان تو دے دی۔''

''اول تو مردہ بولے ہی ناں' اور بولے تو کفن پھاڑے۔'' علی نے بھی ہنس کر لاہور کا سیکھا ہوا ایک مذاق کیا۔

ان دونوں کو نعیم کی اس پُر اسرار چپ کے ٹوٹنے سے نمایاں خوشی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے نعیم کی لمبی تقریر کے دوران بوڑھا پروفیسر علی کی طرف جھک کر اس کے کان میں کہہ چکا تھا۔ ''اب تمہارے بھائی کی حالت پہلے سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ شکر ہے۔''

چلتے چلتے شام ہو گئی مگر نعیم متواتر باتیں کرتا رہا۔ پروفیسر تھکاوٹ کے باعث اسی خستہ حالت کو پہنچ چکا تھا

کہ نعیم کی باتوں سے اسے قطعی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پھر بھی جب اس کے خیال میں نعیم زیادہ اوٹ پٹانگ کہنے لگتا تو وہ ہمیشہ گاڑی سے نیچے اترنے کی کوشش کرتا اور اسے بیٹھنے کے لئے کہتا۔ نعیم ایک بار بھی اُسے ہلنے نہ دیا۔ اس پر پروفیسر نہایت خفیف ہوتا اور چور نگاہوں سے علی کو دیکھنے لگتا۔ اس کے خیال میں علی، جو کہ گاڑی کا مالک تھا، یہ سمجھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس کا بھائی بھوک اور تھکان کی وجہ سے اس غیر حالت کو پہنچا تھا اور واہی تباہی بک رہا تھا جب کہ پروفیسر اس کی جگہ پر غاصبانہ قبضہ کئے بیٹھا تھا۔

آخر جب اندھیرا بڑھا تو پروفیسر نعیم کی آنکھ بچا کر نیچے کود پڑا اور پھر علی کی مدد سے اس کو اٹھا کر گاڑی میں پھینک دیا۔ پھر جلدی سے علی نے تھوڑی سے گیلی روٹی اس کے ہاتھ میں تھمائی جسے وہ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اشتہا کے ساتھ کھانے لگا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ پہلی دفعہ عائشہ کی طرف متوجہ ہوا:

''تم نے روٹی کھالی ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔

''بولتی کیوں نہیں؟ تم بھی کچھ بولو۔'' اس نے بڈھے مسخروں کی طرح ہنستے ہوئے لڑکی کے پیٹ میں گدگدی کی۔ وہ شرما کر مسکرائی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ علی کو اتنے دنوں میں پہلی بار مسکراتی اور سرخ ہوتی ہوئی اپنی بیوی بڑی پیاری لگی۔ وہ خوش ہو کر ہنسا:

''میرے بھائی کی طرف زیادہ توجہ مت دو۔'' اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ''سنا ہے جوانی میں لڑکیوں پر ظلم ڈھایا کرتا تھا۔''

عائشہ اور بھی سرخ ہو گئی۔

''ہمارے گھر تم کیوں نہیں آتے تھے؟'' تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

''تمہارے گھر؟ دراصل مجھے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ گھر میں تم نے مجھے یاد رکھا تھا؟''

''ہاں۔''

''سب نے؟ ...... یعنی گاؤں میں؟''

''ہاں۔ بہت۔ گھر میں ہم سب تم کو یاد کرتے تھے اور باہر کھیتوں میں تمہارا ذکر ہوتا تھا۔ وہ جو تمہارے دوست تھے بڑے شوق سے بات کرتے تھے، دوسرے کہانیوں کی طرح تمہاری باتیں سنتے تھے۔ علی گاؤں نہیں جاتا تھا پر میں جاتی تھی۔ تمہارے پکے مکان کے باغ کو اجاڑ دیکھ کر جی بیٹھ جاتا تھا۔ اور جی بیٹھ جاتا تھا جب گاؤں والے تمہیں پوچھتے تھے ان کے خیال میں ہم تم سے ملتے جلتے تھے۔ تم کبھی گاؤں کیوں نہیں آتے تھے؟''

''جی تو چاہتا تھا۔'' وہ یکلخت ماند پڑ گیا اور روٹی کے گرے ہوئے ریزے چن چن کر منہ میں ڈالنے اور جبڑے چلانے لگا۔ پھر تیزی سے اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ ''بہرحال۔ یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ تم کس طرح رہیں، اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اچھی طرح سے نہیں رہیں۔ تم ایسی خوبصورت لڑکی تھیں ...... تھ تھ تھ ......

پتا ہے تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لئے علی میلوں تک میری گھوڑی کے ساتھ بھاگتا رہا تھا اور تم نے اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے۔ بہر حال گھر میں تم نے مجھے یاد رکھا۔ شکریہ۔ میری تو لمبی جلاوطنی تھی۔ ہنہہ' وہ تو ہم سب کی تھی' یہ کیا اہم ہے......''

دیر تک اسی طرح لڑکی کے ساتھ باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ وہیں پر لیٹ کر سو گیا۔

منہ اندھیرے وہ جاگ گیا اور اٹھتے ہی بلا تمہید باتیں کرنے لگا' یوں جیسے کبھی سویا ہی نہ تھا۔ کچھ دیر تک وہ عائشہ سے باتیں کرتا اور اسے گدگداتا رہا۔ پھر کم عمر لونڈوں کی طرح چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا اور علی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''یہ امرتسر کے گرد و نواح کا علاقہ ہے۔ میں سن انیس میں یہاں آیا تھا۔ سن انیس۔ ہم سب تھے۔ عذرا بھی ہمراہ تھی۔ عذرا؟ اوہ......تم وہاں پہنچ کر کیا کرو گے؟''

''امرتسر؟''

''لاہور۔''

''پتا نہیں۔''

''میں نے صرف سٹیشن دیکھا ہے۔ سنا ہے اچھا شہر ہے۔ تم تو وہاں تھے۔''

''ہاں۔ جلاوطنی میں سب جگہیں ایک سی ہوتی ہیں۔ تم بھی تو ساتھ ہو' کچھ بتاؤ۔'' علی نے کہا۔

''ہاں' ظاہر ہے۔ مجھے سوچنے دو۔ مگر اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ سنو۔ اب میں تمہیں کسی کارخانے میں نہیں جانے دوں گا۔ وہاں مردہ خراب ہو جاتا ہے آدمی کا۔ اب ہم گاؤں میں چل کر رہیں گے۔''

''کس گاؤں میں؟''

''تمہارے تو سوال ہی ختم نہیں ہوتے۔ کہاں؟ کیوں؟ بھائی کسی بھی گاؤں میں چلے جائیں گے۔ یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں گے' اور وہ یہ ہے۔ اب ہم کھیتی باڑی کریں گے۔'' وہ رکا۔ ''اور اگر تم سوچ رہے ہو کہ اپنا کام بھول جاؤ گے تو پھر۔ کتنا ہی کام ہے۔ ہل' کدال' پھاوڑا' درانتی' ٹوکا' پھر کنویں کا سامان اور جانوروں کی نعل بندی' رسے اور زنجیریں' ناندیں اور مچانیں' پھر گاڑیاں اور ان کا سامان اور گھر باہر کی کھڑکیاں دروازے اور طاق طاقچے' اتنا بہت سا کام ہے جو تم کر سکتے ہو' اپنے گھر میں' اپنے گاؤں میں' اپنا اور دوسروں کا' نہ منت نہ محتاجی' بولو......''

''ہوں۔ مگر زمین۔''

''اگر مگر اگر مگر۔ تم تو ضدی ہو چکے ہو بس۔ سب بیکار ہے۔ زمین کے قصے کا بھی کچھ نہ کچھ کریں گے۔ مگر اس کے بعد؟ اول تو یہ کہ سیدھے گاؤں جائیں گے۔''

''دوم یہ کہ سیدھے گاؤں جائیں گے اور سوم یہ کہ سیدھے گاؤں ......'' علی نے چڑ کر کہا۔

نعیم بولتا رہا: ''کہ گاؤں کی زندگی صاف' سیدھی اور حقیقی ہوتی ہے۔ اس کے بعد گھر بنانے کا مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں تم نے کچھ سوچا ہے۔ خیر تم سے تو یہ امید بیکار ہے۔ سنو۔ اس سلسلے میں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ چند دن آرام اور بہتر غذا کے بعد ہم کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے ہم سب۔ ٹھہرو۔'' وہ چلتے چلتے پروفیسر کی طرف جھکا۔ ''تمہارا کوئی گھر ہے؟''

''نہیں۔''

''بس ٹھیک ہے۔ ہم تین آدمی ہیں اور کام کرنے والے ہیں۔ ابھی تو ٹانگیں سوج کر بیکار ہو چکی ہیں۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ چند روز تک تو ہم گاڑی پر چھت ڈال کر ہی کام چلا سکتے ہیں بہرحال' پھر مکان کھڑا کرنا شروع کریں گے۔ تمہیں مکان بنانے کا تجربہ نہیں اس لئے ڈر رہے ہو۔ مجھے بھی نہیں' مگر اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ بس محنت درکار ہوتی ہے' اور کچھ نہیں۔ اینٹوں کی ضرورت نہیں۔ پتھر اور گارے سے لوہے کی طرح مضبوط دیواریں بنتی ہیں' اور چھت کے لئے کیکر کی لکڑی مفید ہے' یا نیم کی جس کو دیمک نہیں لگتی۔ یہاں پنجاب میں کیکر اور نیم کے جنگل کے جنگل ہیں۔ یہ سارا ایک ہی علاقہ ہے۔ یہ بٹوارے کا قصہ سب بیکار ہے' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عائشہ چولہے بنالیتی ہے؟''

''پتا نہیں۔''

''تمہیں کچھ پتا نہیں۔ پر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ضرور بنالیتی ہوگی۔ ہمیں صرف تین کمروں کی ضرورت ہے۔ پہلے پہل تو ایک ہی دالان سے کام چل سکتا ہے۔ ایک طرف بھوسہ آجائے گا جو سردی کا بھی بچاؤ کرے گا' دوسری دیوار کے ساتھ سب سو سکتے ہیں۔ ہم بوڑھے آدمی ہیں' تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔ تم مزے سے سونا۔ اور باہر جانور ہوں گے جن کے گرد دیوار بھی بنانا ہوگی' مگر یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ چکنی مٹی اور بھوسے سے ساری دنیا دیواریں بناتی ہے۔ کواڑ اور کھڑکیاں اور طاقچے ' یہ تمہارا کام ہے۔ روشندان بھی بنا لیتے ہو؟''

''ہاں۔''

''شکر ہے۔ پروفیسر تو کچھ نہیں کر سکتا۔ صرف مٹی ڈھو سکتا ہے۔ اگر اسے پڑھنے پڑھانے کا شوق چڑھا تو کام ختم ہونے کے بعد جانے دیں گے' اس سے پہلے نہیں۔ ابھی طے کر لیتے ہیں۔ اور تم اسے گاڑی پر بیٹھنے سے منع نہیں کر سکتے۔ تم کسی کو گاڑی پر بیٹھنے سے منع نہیں کر سکتے۔ سب بیکار ہے' اس کا کوئی مطلب نہیں۔ کام شروع کرنے کے لئے ہمیں بس یہ چیزیں چاہییں: دو بالٹیاں پانی کے لئے' دو لکڑی کے تختے' اور ایک کلہاڑی' بس اتنی تیز کہ کیکر کو کاٹ لے۔ زیادہ تیز ہو تو دھار ٹوٹ جاتی ہے۔ بس۔'' اس نے چٹکی بجائی۔ ''بس۔ آن کی آن میں ہم تمہیں دیوار کھڑی کر دیں گے۔ گاؤں کے لوگ سیدھے سادے اور خدا ترس ہوتے ہیں۔ یہ بھی بھلا بتلانے کی بات ہے۔ عمر بھر تو ہم لوگ گاؤں میں رہے۔ تم دیکھ لینا ہر روز کوئی نہ کوئی' ایک یا دو یا کبھی کبھی چار گاؤں والے ہماری مدد کو

آ موجود ہوں گے' آتے رہیں گے۔ دیہات میں بڑی خدا ترسی اور اصلیت ہوتی ہے۔ دنوں میں مکان تیار ہو جائیگا۔گائے نہلانے سے لے کر فصل کاٹنے تک وہ برابر ہماری مدد کریں گے'اور ہم ان کی۔ انہیں رہنے کا سلیقہ آتا ہے یہ ساری بات ہے...... یہ بھادوں کی دھوپ نامراد کیسی سخت ہوتی ہے۔ وہ پرندے والا کیا قصہ ہے' علی؟''

علی ایک پرانی بات کے حوالے کے لئے پوچھے جانے پر خوش ہوا۔''اس کا نام ارر...... سرسوتی ہوتا ہے یا کیا' بالا جوتی۔ وہ گیارہ مہینے دھوپ میں بیٹھتا ہے مگر بھادوں کی دھوپ سہہ نہیں سکتا اور سائے میں چلا جاتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا...... یہی قصہ تھا نا؟''

''میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا۔'' پروفیسر نے کہا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بھادوں کی دھوپ بہرحال کڑی ہوتی ہے۔ کڑی؟ کڑی کیا؟'' اس نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ''اوہ...... ! بارشوں سے ایسے مکانوں کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ ہمیں مستقل کام کرنا ہوگا۔ چھپر' گھاس پھونس' لپائی' تم جانتے ہی ہو۔ تالے لگانے کی ضرورت نہیں' ہمارے پاس فالتو کچھ ہوگا' ہی نہیں مگر جانوروں کے لئے چھپر چاہیے' برسات میں بھیگنے سے دودھ سوکھ جاتا ہے اور بری بری بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ اور برسات کے موقع پر......''

وہ بے تکان بولتا گیا۔ چھوٹی چھوٹی غیر ضروری باتیں جو اصل زندگی میں اتنی اہم ہوتی ہیں اس نے اتنی تفصیل اور محنت سے بیان کیں کہ علی نے سننا ہی چھوڑ دیا۔

جب سورج ڈھلنے لگا تو دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ پروفیسر اور علی غائب ہو چکے تھے۔ وہ اس کا عادی تھا۔ اچک کر گاڑی پر بیٹھ گیا اور بے دھیانی سے حملہ آوروں کی اس ٹولی کو دیکھنے لگا جو ٹٹول ٹٹول کر جوان عورتوں اور چند مردوں کو ہنکائے لئے جارہی تھی۔ نعیم کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ صرف آنکھوں کی چمک تھی جو یکلخت ماند پڑ گئی تھی۔ پھر وہ لاپروائی سے ان کے سروں کے اوپر اوپر دیکھنے لگا۔ بھورے رنگ کی گرد آلود فضا میں مخصوص' مکروہ' متلی آور بُو اور گھٹی گھٹی چیخوں کی آوازیں تھیں۔ کچھ دیر بعد قریب ہی چند فائروں کی آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ بُو بدستور قائم رہی۔

''کھیتی باڑی شروع کرنے کے لئے بھی زیادہ چیزوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' جب پروفیسر اور علی گاڑی کی اوٹ سے نکل آئے تو اس نے کہنا شروع کیا۔

''نہیں پڑے گی نہیں پڑے گی۔'' علی جل کر بولا۔''ان کے سامنے ٹانگیں پسار کر بیٹھ جاتے ہو۔ یاد رکھو کبھی نہ کبھی وہ تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے۔''

''بیچ میں مت بولو۔'' نعیم نے خفگی سے کہا۔''کوئی پکڑ کر نہیں لے جائے گا۔ بس ایک ہل اور دو بیل۔ ہل تو تم بنا ہی لو گے۔ دودھ کے لئے جانور بعد میں آجائیں گے اور پہلی بیائی کے لئے بیج ادھار لے لیں گے۔ پنجاب کی زمین بڑی لائق ہے جتنی محنت کرو اتنا پھل دیتی ہے۔ پنجاب کی زمین کا آخر کسی نے نہیں دیکھا۔ ہاڑی

اور ساوَنی کے علاوہ میں تم کو بتاؤں۔'' وہ رازدارانہ طور پر علی کی طرف جھکا۔ ''سبزیوں میں بڑی کمائی ہے۔ یہاں کے اچھی ذات کے کسان سبزیاں اگانے کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ ارائیوں کا کام ہے جو کہ جاٹوں سے نیچی ذات ہے۔ مگر یہ سب بیکار ہے۔ سبزیوں میں کمائی ہی کمائی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارائیں سبزیاں اگا اگا کر جاٹوں کی ساری زمین خرید لیتے ہیں اور اونچی ذات والے کسان آپس میں لڑتے مرتے اور مقدمے بازی کرتے رہتے ہیں۔ ہم سبزیاں بوئیں گے۔ یہ سب بیکار ہے۔ اونچی ذات' نیچی ذات' ہنہہ۔ آدمی کی ذات کا اور سبزیوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں......''

''سبزیاں؟ کیا سبزیاں؟'' علی نے پوچھا۔

''یہی مٹر' مونگرے' کریلے' کدو' ترئی وغیرہ......''

''اوہ......اچھا۔'' اب اس نے باقاعدہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔

''سبزیاں......''

''ہاں سبزیاں۔ اب رہے بیل۔ ارررر بیلوں کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟''

''بیل؟'' علی بالکل خالی الذہن تھا' مگر کوشش کر کے اس نے سوچا۔ ''بیل بھی کہیں نہ کہیں سے......''

''مجھے پتا تھا تم نے کچھ نہیں سوچا۔ بیل ہم پہلی بیائی کے لئے ادھار بھی لے لیں گے۔ بس بات کرنے کا طور آنا چاہیے۔ جب ان کو علم ہو گیا کہ بھلے مانس آدمی ہیں اور بیل لے کر کہیں بھاگیں گے نہیں تو وہ خوشی سے ہفتے دس دن کے لئے دے دیں گے۔ مگر دوسرے کے جانور کو بڑی احتیاط سے برتنا پڑتا ہے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے۔ گھر میں جب کوئی بیل مانگ کر لے جاتا تھا تو ہمارا باپ احمد دین کے لونڈے کو جاسوسی کرنے کے لئے بھیجا کرتا تھا اور وہ شیطان پہر پہر کی آ کر خبر دیتا تھا کہ آج انہوں نے یہ کھانے کو دیا ہے جانوروں کو اور اتنا دیا ہے اور اتنا کام لیا ہے۔ تم سے کوئی بات چھپی ہوئی تھوڑی ہے۔'' تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟''

''کچھ ہے۔ عائشہ کے پاس۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم ایک جوڑی خرید بھی سکتے ہیں۔ فصل کے فصل پیسے چکاتے رہیں گے۔ جب ان کو علم ہو گیا کہ ہم ایماندار اور محنتی آدمی ہیں تو وہ اعتبار کر لیں گے۔ آخر ہم ٹھگ تھوڑے ہی ہیں۔ سچے کسان ہیں اور کاہلی سے دور بھاگتے ہیں۔ لیکن سبزیوں کے علاوہ اناج بھی اشد ضروری ہے۔ تم اناج کی بیائی بھول تو نہیں گئے؟''

''نہیں۔''

''شکر ہے۔ گیہوں کی بیائی اگلے مہینے شروع ہو جائے گی۔ یہ بہرحال بارشوں پر منحصر ہے۔ اگر برسات دیر تک چلتی رہے تو بیائی پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فصل کے تیار ہونے اور اترنے میں بیائی کا بڑا اہم مقام ہے۔ کس وقت میں ہو اور کیسی ہو۔ گیلی زمین میں' جب تک مٹی پیر سے چمٹتی رہے' کچھ بھی نہیں بونا چاہیے۔ تمہیں اپنے باپ کی باتیں یاد ہیں؟ ضرور ہوں گی۔ مجھے اس کے دیئے ہوئے سارے سبق آج تک یاد ہیں؟ گیلی زمین میں

مینڈک بھی مر جاتے ہیں' بیج تو بڑی نازک شے ہے' وہ کہا کرتا تھا۔ اور جوار باجرہ بھی بڑا ضروری ہے۔ کسان اگر ترقی کرنا چاہتا ہے تو وہ بارہ مہینے گیہوں نہیں کھا سکتا۔ اور پھر جانور ہیں جن کی گزر اوقات مکئی پر ہوتی ہے۔ مکئی کے بیری گیدڑ بہت ہوتے ہیں۔ بچاؤ کے واسطے کیا کرو گے؟''

''کتے رکھ لیں گے۔''

''کتے رکھ لیں گے۔'' نعیم نے غصے سے ہاتھ نچا کر نقل اتاری۔''اور جو کتوں کو کھلانا پڑے گا وہ کدھر سے آئے گا۔ تم نے اتنے برس تک کیا کام سیکھا ہے جو گیدڑ پھانسنے کا ایک پنجرہ بھی نہیں بنا سکتے۔ ہیں؟ کتے رکھ لیں گے۔'' اس نے دوبارہ نقل اتاری۔'' تاروں کا ایک پنجرہ بنا لینا' بس۔ گیدڑ تو تمہیں پتا ہے ہوتے ہی ہیں۔ اپنے ہاں بھی ہوتے تھے۔ سب جگہ ہوتے ہیں۔ یہ یہاں وہاں اور اِدھر اُدھر کا قصہ سب بیکار ہے۔ گیدڑ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اور ساونی کی فصلوں میں گنا بڑا بار آور ہوتا ہے۔ جاڑوں کی راتوں کو گڑ ضرور بنانا' سردی سے محفوظ رکھتا ہے اور طاقت بھی آتی ہے' اور کڑاہ چڑھا ہو تو آتا جاتا ہر کوئی چکھتا ہے اور فیض بڑھتا ہے' گڑ بنانے کا طریقہ تمہیں یاد ہے؟''

''بھنڈی کے ڈنٹھل۔''

''ہاں ہاں بھنڈی کے ڈنٹھل میل کو کاٹ کر لٹھے کی طرح سفید گڑ بناتے ہیں۔ مگر گنے کی حفاظت کرنا بڑا جان جوکھم کا کام ہے۔ ماگھ کی راتوں میں کھیت کا ایک چکر لگاؤ تو ہاتھوں میں خون جم جاتا ہے۔ اور جنگلی سؤر جو کھیت کے کھیت کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ میں نے ایک بار زخمی سؤر مارا تھا آمنے سامنے ہو کر۔ بڑا شریف جانور تھا کوئی' پر بھئی کیا نادانی کی عمر تھی......''

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ قافلہ اسی طرح تھکی تھکی مستقل چال سے رواں تھا۔ نعیم دیر تک گاڑی کے ڈنڈے پر جھک کر بیٹھا تیزی سے باتیں کرتا رہا' جیسے وقت کے مقابل بھاگ رہا ہو۔ روزمرہ زندگی کی ان گنت باتیں' چھوٹے چھوٹے پروگرام' کتنی ہی باتیں اس نے عجلت اور مستعدی سے علی کے ذہن نشین کرائیں۔ برسات کی ہوا میں گلے سڑے پتوں اور تازہ جلے ہوئے بارود کی بُو کہیں سے اڑتی ہوئی آئی۔

پھر اچانک رک کر اس نے لمبا سانس لیا اور پروفیسر کی طرف مڑ کر دھیمے لہجے میں بولا: ''سنو۔ میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ شاید پھر بھول جاؤں ...... زندگی ...... زندگی کا ست' زندگی کا نچوڑ...... قربانی کا جذبہ ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ میں نے جانا ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔''

پروفیسر تھکے ہوئے اداس انداز میں مسکرایا۔

''نہیں۔ تم ہنس نہیں سکتے۔ میں بڑ نہیں مار رہا۔ میں جانتا ہوں۔ دل پر اتنے مرحلے' اتنی محتاجی آتی ہے' اس کے بعد ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے

کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ اسے صرف اتنی آواز سنائی دی:

''اس کے بعد ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔''

جب وہ دوبارہ بولا تو رات کی تاریکی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ وہ یکلخت علی کی طرف مڑ کر خفگی سے بولا: ''اس کے بعد ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔ تمہیں کیا علم ہے؟''

''کیا علم ہے کیا علم ہے۔'' علی نے چڑ کر کہا۔ ''جاننے کے لئے ہی کیا۔ اوٹ پٹانگ بولے جاتے ہو۔ خاموش رہو۔ تھک جاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے۔ جاننے کے لئے بہت کچھ نہیں ہے۔ دو ایک باتیں ہیں وہ بھی مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں۔ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے: اگر ہم ہر سطح پر' ہر وقت میں' ہر چیز کی قربانی دے سکتے ہیں تو زندہ ہیں' ورنہ نہیں ہیں ...... اور تم کسی کو گاڑی پر بیٹھنے سے نہیں روک سکتے۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔''

علی حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بولا:

''اس سے قطع نظر ...... سنو۔ ایک بات اور بتاتا ہوں۔ عذرا' میری بیوی ایک عظیم عورت ہے۔ اس کے پاس کوئی اندیشہ' کوئی الجھن' کوئی ریاکاری نہیں۔ وہ جو کچھ چاہتی ہے بلا جھجک اس کے لئے تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ انسان کی ساری شرافت' سارے کرب اور ساری قربانی کے ساتھ خاموشی اور رضا مندی سے زندہ ہے۔ خدا انسان کو اپنی شبیہہ میں بناتا ہے نا۔ وہ عذرا ہے۔ اب اس کا ذکر نہ کرنا۔''

پھر وہ پروفیسر کی طرف مڑا: ''اور خدا بھی ہے۔'' اس نے کہا۔

پھر انہوں نے اسے تھوڑی سی گیلی روٹی دی جسے کھا کر وہ سو گیا۔

وہ بہت گہری نیند سو کر اٹھا۔ اجالا پھیل رہا تھا۔ قافلہ مستقل چلے جا رہا تھا۔ اٹھتے ہی اس نے خوش دلی سے عائشہ سے باتیں چھیڑ دیں:

''وہاں پہنچ کر تم چند روز میں تندرست ہو جاؤ گی۔ خالص ہوا اور خالص غذا' صحت کے لئے اس سے مفید اور کوئی چیز نہیں۔ تمہیں زیادہ کام کرنے کی ضرورت نہیں' سارا کام ہم کریں گے۔ تم صرف کھانا پکا دیا کرنا۔ گاؤں والے کہیں گے' یہ نیا خاندان کیسا اچھا اور شریف ہے' تین جوان اور محنتی مرد (پروفیسر ہنسا) اور ایک جوان اور خوبصورت لڑکی۔ تم چولہے بنا لیتی ہو؟''

''ہاں۔''

پھر وہ چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ ''تم رات بھر چلتے رہے ہو۔ علی جوان آدمی ہے چل سکتا ہے۔ تم اب آرام کرو۔'' اس نے ایک بازو سے دھکیل کر پروفیسر کو گاڑی پر بٹھا دیا۔

''تم گیدڑوں کی بات کر رہے تھے۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ اگر مکئی کے کھیت کے گرداگرد تم سنبل کی

گھاس بودو تو وہ کبھی پاس بھی نہ پھٹکیں گے۔ سنبل جانتے ہو کیسی خوشبودار شے ہے' پر گیدڑ اس سے کوسوں بھاگتا ہے۔ عجیب بات ہے۔ لیکن گیدڑ گیدڑ ہوتا ہے اور اس کی قوت شامہ ٹھیک نہیں ہوتی......"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ علی اور پروفیسر دونوں غائب ہو چکے تھے۔ گاڑی کی اوٹ سے علی کی آواز آئی:

"باتیں بند کرو۔ اِدھر آؤ۔ اِدھر آ جاؤ۔ اوٹ میں...... وہ اس طرف آ رہے ہیں اوہ...... کمبخت۔"

اس نے جھنجھلا کر بات جاری رکھی: "اوہ۔ لیکن یہ اہم نہیں ہے۔ گیدڑوں کو بھگانے کے لئے سنبل گھاس مفید ہوتی ہے اور دودھ دینے والے جانوروں کے لئے اس کا چارہ بھی عمدہ بنتا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ اور کٹائی سے پہلے ایک اور بات کا خیال رکھنا۔"

لیکن اب وقت نہیں رہا تھا۔ وہ سیدھے اس کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے اس نے بس ایک کام کیا۔ نہایت صفائی سے اس نے لکڑی کا بازو الگ کیا اور نظر بچا کر اسے گاڑی میں پڑی دُلائی کے نیچے چھپا دیا۔ "اس کا خیال رکھنا۔" وہ کہنے والا تھا' لیکن انہوں نے دیسی بنی ہوئی بندوقوں کے دستے مار مار کر اسے آگے لگالیا۔

"سئور...... کتے۔" گاڑی کے ڈنڈوں کے ساتھ چمٹ کر چلتے ہوئے علی نے رو کر کہا۔ پروفیسر نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ آخری دفعہ انہیں ہجوم میں غائب ہوتی ہوئی نعیم کی پشت نظر آئی جس پر قمیض تار تار ہو کر لٹک رہی تھی۔ وہ سر جھکائے چل رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

کچھ دیر بعد کہیں قریب سے چند فائروں کی آواز آئی لیکن کچھ لوگوں نے سنا کچھ نہ سنا کیونکہ اب وہ پوری رفتار سے بھاگ رہے تھے۔ حملہ آوروں کا ایک لشکر ان کے تعاقب میں تھا' اور امرتسر کا سٹیشن ایک میل کے فاصلے پر تھا جہاں سے خبر آئی تھی کہ گاڑی لاہور جانے کے لئے تیار کھڑی ہے۔ گاڑیوں والے اب بیلوں کو پیٹنا بند کر کے' بوجھ ہلکا کرنے کو' فالتو سامان اٹھا اٹھا کر نیچے پھینک رہے تھے:

مٹی کی صراحیاں' پتیلے' روغنی پائے' ٹرنک' صندوق' دُلائی' لکڑی کا ایک ٹکڑا' دیگچی' توا' برتن۔

"میں اتر جاؤں؟" پروفیسر نے آہستہ سے پوچھا۔

"تم یہیں بیٹھو۔" علی نے خفگی سے کہا اور ایک ہاتھ سے اسے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے سامان نیچے پھینکتا رہا۔

اسٹیشن پر اس نے عائشہ کو اٹھا کر چلنے کی سعی کی لیکن کمزوری اور بھیڑ کی وجہ سے گر گیا۔ پھر اٹھا اور بے دھیانی سے اکیلا چل پڑا' دروازے تک جا کر لوٹ آیا اور دوبارہ ادھ موئی عائشہ کو اٹھانا چاہا' پھر اسے زمین پر گھسیٹنے لگا' لیکن گھمسان کے رن میں ایک دفعہ پھر اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ دھکے کھاتا ہوا اندر کی طرف بڑھنے لگا۔

جب گاڑی آہستہ آہستہ چلنی شروع ہوئی تو وہ لپک کر اس پر سوار ہوا۔

☆......☆......☆

I am moved by the fancies that are curled
Around these images and cling;
The notion of some infinitely gentle
Infinitely suffering thing.

Wipe your hand across your mouth, and laugh;
The worlds revolve like ancient women
Gathering fuel in vacant lots.

T.S. ELIOT

(۴۸)

علی لاہور کے سٹیشن پر پڑا تھا۔ سارے پلیٹ فارم بے گھر لوگوں سے اٹے پڑے تھے جو اپنے پھٹے پرانے بستر بچھائے اندر اور باہر ہر جگہ لیٹے تھے' بیٹھے تھے' سو رہے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ جو ہمت والے تھے' پیٹ بھرنے کے۔لئے مزدوری کرتے' بھیک مانگتے یا چوری کرتے' باقی کبھی کبھار اٹھ کر ریلوے کے نل سے پانی پی لیتے اور سارا وقت پڑے رہتے۔ سب کے چہرے بہر حال بھوکے' غلیظ اور بے تاثر تھے۔ ایک منزل جو نظر میں تھی اس پہ وہ پہنچ چکے تھے' اس سے آگے انہیں کچھ پتا نہ تھا۔ اب اس سارے اژدہام پر خوفناک آلکس اور بے اعتنائی طاری ہو چکی تھی۔

دن میں ایک آدھ گاڑی ان کے بھائی بندوں کی ہندوستان سے وارد ہو جاتی اور تقریباً اتنے ہی لوگ ہندوستان جانے کے لئے یہاں سے گاڑیوں پر سوار ہوتے' یا شمال کی طرف سے گاڑیوں میں بھر کر آتے اور واہگے کی سرحد کی طرف نکل جاتے۔ یہ سب آنے والے اور جانے والے ایک ہی قبیلے کے افراد تھے۔ اس انسانی آبادی پر وہ وقت آیا تھا جب چہروں اور عقیدوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔

علی صرف اس وقت اٹھتا جب ہندوستان سے کوئی گاڑی آتی۔ کمزور ٹانگوں پر چلتا ہوا وہ گاڑی کی ساری لمبائی طے کرتا' ہر ایک ڈبے میں گردن ڈال کر' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور دوسرے سرے پر پہنچ کر وہیں بیٹھ جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی خالی ہو جاتی اور بدبودار' بدحال ہجوم چیختا پکارتا ہوا پھٹ پڑتا اور لاوے کی طرح ہر طرف پھیل جاتا۔ ہر دفعہ ایسا ہوتا کہ گاڑی کے سامنے سے گزرتا ہوا علی ہجوم کے دھکے کھا کر گر پڑتا اور چند لمحوں میں ان گنت قدموں کے نیچے روندا جاتا۔ ہر دفعہ وہ چیختا چلاّتا اور گالیاں دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنی بیکار تلاش کو جاری رکھتا۔ دو روز سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا لیکن یہ سوچنے کی اس میں قوت نہ تھی کہ وہ اب تک کیونکر زندہ تھا اور چل پھر اور لڑ بھڑ رہا تھا۔ جو عام انسانوں میں ہمہ وقت زندگی کی ہزاروں چھوٹی بڑی چیزوں پر متعجب ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے اس میں ختم ہو چکی تھی۔ اس کے پاس اس کا بھی کوئی واضح تصور موجود نہ تھا کہ وہ کس کی تلاش میں تھا اور کس کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ بھی غالباً زندگی کے ارتقاء کی' اس کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش محض تھی۔

دوسرے دن وہ آہنی جنگلے سے ٹیک لگائے اونگھتا تھا کہ گرجتی ہوئی ایک گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رکی۔ وہ چونک کر اٹھا' مگر اس گاڑی میں سے کوئی نہ اترا کیونکہ وہ شمال کی طرف سے بھری ہوئی آئی تھی اور ہندوستان جا رہی

تھی۔ وہ پھر جنگلے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے اور چند ایک کھلی کھڑکیوں میں سے بچوں کے ایسے زرد اور خوفزدہ چہرے جھانک رہے تھے۔ گاڑی معمول سے زیادہ عرصے تک رکی رہی' پھر اس کا انجن الگ ہو کر چھک چھک کرتا ہوا تازہ دم ہونے کے لئے چلا گیا۔ چاروں طرف کشیدگی کا عارضی سناٹا پھیل گیا اور غیر معمولی طور پر بڑھتا گیا۔

پھر باہر ایک شور اٹھا اور واویلا کرتے ہوئے لوگوں کا چھوٹا سا ہجوم سٹیشن میں داخل ہوا۔ سامنے آتے ہی ان بظاہر غیر مسلح لوگوں میں سے ایک نے جیب سے پستول نکال کر ہوا میں دو فیر کئے۔ دوسرے نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین کر کھڑکی کے شیشے سے منہ لگا کر باہر دیکھتے ہوئے ایک زرد رُو بچے کا نشانہ لیا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار...... پھر پلیٹ فارم پر سے تمام مردہ اور نیم مردہ لوگ حیرت انگیز جوش اور پھرتی کے ساتھ اٹھ کر گاڑی پر ٹوٹ پڑے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے ٹوٹنے کی آواز اِکا دُکا ہوتے ہوئے فیروں کی خشک' پٹاخے دار آوازوں سے رل مل گئی۔ ان میں شامل مرنے والوں اور بھاگنے والوں کی چیخوں کی آواز اور حملہ آوروں کی ہاہاکار تھی۔ بہت سے لوگ کود کر گاڑی سے نکل بھاگے اور ہر طرف سے گھر گئے' کچھ اندر ہی رہے۔ فضا میں تازہ انسانی خون کی بُو پھیل گئی۔ علی کاہلی سے اس سارے منظر کو دیکھتا رہا' پھر اکتا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر جنگلے پر ٹیک دیا۔ ''ان کے ساتھ والے فوجی کہاں گئے۔'' اس نے سوچا۔

پھر اس نے آنکھیں کھول کر دہنی طرف دیکھا۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی جو بہت قریب سے آئی تھی۔ واویلا کرتی ہوئی وہ ایک ادھیڑ عمر کی موٹی سی عورت تھی جو اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اچانک رک گئی۔ اس کے ہونٹ برابر چل رہے تھے: ''ظالم۔ قاتل۔ میرے خاوند کو میرے بچے کو مار دیا' مجھے بھی مار دو' مجھے کیوں چھوڑ دیا' کیوں چھوڑ دیا' کیوں۔''

عورت کی آنکھیں احمقوں کی طرح کوری تھیں اور اس کے چہرے پر بھی خوف کے علاوہ' شدید حماقت برس رہی تھی۔ کسی حماقت زدہ چہرے کو اپنے سے مخاطب دیکھ کر بعض دفعہ جو بلاوجہ غصہ آ جاتا ہے اس سے علی جھنجھلا گیا۔ پھر دفعتاً ایک قطعی بے وجہ اور غیر ضروری جذبے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس عورت کو مار گرانے' اس کا خون بہانے کی طاقتور' پاگل خواہش نے اسے پلک جھپکنے میں اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

عورت بولتے بولتے رک گئی۔ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور وقت ضائع کئے بغیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چھاتی پر سے اپنا ململ کا کرتہ دامن تک پھاڑ ڈالا۔ نیچے اس کی جلد صاف گندمی رنگ کی تھی اور دو بھاری بھاری پھولے ہوئے تھن منکوں کی طرح پیٹ پر لٹک رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مشکل کے ساتھ انہیں اوپر اٹھایا اور آگے بڑھی۔

''مجھے مت مارو۔ خدا کے لئے۔ یہ دیکھو' یہ'' اس نے تھن علی کی ٹھوڑی کے نیچے ٹھوس دیئے۔ ''رحم کرو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔''

علی نے کراہت سے منہ پھیر لیا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر پھر سے امن ہو گیا۔ صرف راستہ گزرنے والے لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع اندر باہر بکھری ہوئی لاشوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ اس واقعے کے بعد علی کی رہی سہی بھوک بھی غائب ہو گئی۔

تیسرے دن کسی نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ بانو تھی۔

''میں نے تمہیں انبالے کے سٹیشن پر دیکھا تھا۔'' وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''تمہارے ساتھ ایک لنگڑا سا بڈھا تھا۔ ہماری گاڑی وہاں سے گزری تھی۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''تم کو گاڑی کہاں سے ملی؟ اور تمہاری بیوی...... '' بانو نے متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھا۔

علی نے بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں چاروں طرف نظر دوڑائی' پھر نقاہت کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔

''میں ہر روز یہاں آتی ہوں' اپنے لڑکے کی تلاش میں...... میں نے پہلے تو تمہیں نہیں دیکھا۔''

''تمہارا بیٹا...... بھی ہے؟'' علی نے آنکھیں کھول کر پہلی دفعہ بات کی۔

''ہاں' کمال۔ میرا بچہ۔''

سورج غروب ہو رہا تھا۔ لاشوں کی موجودگی کی وجہ سے ایک خوفناک متلی آور بُو پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھی علی کو دیکھتی رہی۔ اس وقت اچانک اس کے دل میں' اپاہجوں کی طرح جنگلے کے ساتھ آنکھیں موند کر بیٹھے ہوئے اس شخص کے لئے وہ جذبہ پیدا ہوا جس کی صرف عورتیں اہل ہوتی ہیں۔

''چلو...... میرے ساتھ۔'' اس نے علی کا کندھا ہلایا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''تمہارا اسباب کہاں ہے؟''

''نہیں ہے۔''

وہ خاموشی سے چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ پھر بانو نے اس کی طرف دیکھا۔

''تم چل نہیں سکتے۔'' اس نے کہا۔ ''میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔''

مشکل سے علی کو تانگے کی پچھلی سیٹ پر سوار کرا کے وہ اس کے برابر بیٹھ گئی اور بتانے لگی۔

''یہاں مجھے کپڑے کے کارخانے میں کام مل گیا ہے۔ وہیں نور دین بھی مل گیا۔ نور دین کو تم جانتے ہو؟ فٹر جو وہاں ہمارے ساتھ تھا۔ ہم جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ اس نے میری جھونپڑی بنانے میں مدد کی۔ کمال گاڑی میں مجھ سے بچھڑ گیا تھا' مگر وہ ضرور بچ نکلا ہوگا۔ بارہ برس کا ہے پر بڑا ہوشیار ہے' اپنے باپ کی طرح۔ اس کا باپ...... سؤر۔ تمہاری حالت بالکل بگڑ چکی ہے' ایں؟''

تانگہ اب ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ہچکولے کھاتا ہوا جا رہا تھا جھٹپٹے کا وقت تھا اور چاروں طرف پھیلا ہوا اپلوں کا دھواں آنکھوں کو لگ رہا تھا۔ علی نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا اور اندھیرے میں اسے پہچاننے کی کوشش کی۔

''میں سویا بھی نہیں۔'' پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر تھوڑی دیر میں گہری نیند سو گیا۔ بانو اسے گرنے سے بچانے کے لئے دونوں بازوؤں میں بچے کی طرح سمیٹے بیٹھی رہی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ تازہ پھونس کی بنی ہوئی نیچی سی چھت والی جھونپڑی میں کھاٹ

پر پڑا تھا۔ جھونپڑی صاف ستھری اور تازہ لپی ہوئی تھی اور صبح کی نرم دھوپ دروازے کے راستے اندر آ رہی تھی۔ اس نے دماغ پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی' پھر کہنیوں کے بل اٹھا اور دوبارہ غش کھا گیا۔

دوسری بار جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ ڈھل رہی تھی اور بانو جھونپڑی میں کوئی کام کرتی ہوئی چل پھر رہی تھی۔ اسے ہوش میں پا کر وہ پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''اب تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے ابھی ابھی تمہیں دودھ پلایا ہے۔''

''دودھ؟''

''شکر ہے تمہاری جان بچ گئی۔ پہلے تین روز تک کوئی امید نہ تھی۔''

''کیا ہوا تھا؟'' بات کرنے کے لئے اسے جو طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی اس سے اسے اپنی نقاہت کا اندازہ ہوا۔

''بخار۔''

''کے روز؟''

''آج چھٹا دن ہے۔''

''اتنے دن تم؟''

''ہاں۔'' بانو ہنسی۔ ''پہلے تین روز کام پر نہیں گئی۔ اب کام پر بھی جاتی ہوں۔ نور دین بھی آتا ہے۔ صرف سٹیشن نہیں جا سکی۔ آج میں نے صفائی کی ہے' فرش لیپا ہے۔''

علی نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی طاقت پھر ختم ہوگئی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی۔ پہلے چند روز وہ صرف اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا' پھر کھاٹ کو پکڑ کر کھڑا ہونے لگا۔ پھر اس نے دیواروں کا سہارا لے کر چلنا شروع کیا۔ بانو اس کا کھانا تیار کر کے کام پر جاتی' شام کو واپس آ کر پھر کھانا بناتی اور جھونپڑی کی صفائی کرتی اور اسے فرش پہ چیزیں بکھیرنے پر بچوں کی طرح جھڑکتی' پھر اسے لٹا کر زمین پر بیٹھ جاتی اور خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ کبھی کبھی نور دین بھی آ جاتا تو وہ باتیں کرنے لگتے۔ بانو ہمیشہ زمین پر سوتی۔

جب وہ پہلی بار بغیر سہارے کے چل کر کوٹھری سے باہر نکلا تو خوشی سے بازو پھیلا کر اس نے ہوا میں لمبا سانس لیا۔ شام پڑ رہی تھی۔ جھونپڑی کی دیوار سے پشت لگا کر ساتھ ساتھ بیٹھے وہ اور بانو دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اب ہر طرف سناٹا بڑھ رہا تھا۔ آس پاس کی جھونپڑیوں میں کہیں کہیں دیئے جل رہے تھے۔ ان سے پرے ایک کتا لگاتار بھونک رہا تھا۔ یہ موسم خزاں کی شفاف اور خنک رات تھی۔ چاند کے گرد آسمان سبز رنگ کا تھا اور ہوا لحظہ بہ لحظہ لطیف تر ہوتی جا رہی تھی۔

''مجھے اپنی کہانی سناؤ۔'' علی نے کہا۔

بانو اٹھی اور اندر سے ایک موٹا کپڑا لے آئی جسے اس نے علی کی ٹانگوں پر ڈال دیا۔ پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ رات کے سیاہ اور خاموش پرندے چاند کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ یکساں' اداس آواز میں اس نے اپنی کہانی بیان کی:

''میری سیدھی سادی کہانی ہے۔ تمہیں کیا ملے گا۔ ناگپور کے پاس ایک گاؤں میں' جس کا نام کلیان پور تھا'

میں پیدا ہوئی۔ اس نام کا پنجاب میں ایک شہر بھی ہے۔ میرا نام شیلا تھا۔ ہم گاؤں کے اچھوت تھے۔ مذہب عیسائی۔ انگریز جو سب کے حاکم تھے وہ بھی عیسائی تھے' پتا نہیں ہم اچھوت کیوں تھے۔ یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن ہم ان کے نزدیک بھی نہ جاسکتے تھے۔ انگریزوں کے نہیں' گاؤں والوں کے چھوٹے بڑے سب کے نزدیک بس ہم جا ہی نہ سکتے تھے۔ اگر ہم غلطی سے کسی کے ساتھ چھو جاتے تو ہمیں اس کی سزا ملتی۔ لیکن سزا اسے بھی ملتی' یہ کہ جب تک وہ نہا دھو نہ لیتا گھر نہ جاسکتا اور جس کو چھو لیتا وہ بھرشٹ ہو جاتا۔ چنانچہ ہماری ناپاکی متعدی بیماری کی طرح تھی۔ مزا اس وقت آتا جب ہم سردیوں کی صبحوں کو لالو کے انتظار میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور دبے پاؤں نکل کر اسے چھو لیتے اور شور مچاتے ہوئے بھاگ جاتے۔ وہ گاؤں کا مسلمان دکاندار تھا اور نرا احمق تھا اور لنگڑا ہونے کی وجہ سے بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ اب سارے گاؤں کو پتا چل جاتا کہ لالو بھرشٹ ہوگیا۔ پھر کیا تھا جناب' اب کوئی ہندو گاہک اس کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ وہ ہمیں گالیاں دیتا ہوا ندی کی طرف چلا جاتا اور کانپتا ہوا واپس آتا۔ ہم دور کھڑے ہو کر دیکھتے اور خوشی سے تالیاں بجاتے۔ ہمیں پتا تھا کہ یہ بات مستقل مذاق بن چکی تھی چنانچہ ہمیں اس کی سزا نہ ملے گی۔ کبھی کبھی بھرشٹ ہو جانے پر لالو خاموشی سے ہاتھ باندھ کر گلی کے درمیان کھڑا ہو جاتا: 'خدا کے لئے شور نہ کرو' کتو۔ آج بڑی سردی ہے' میں مر جاؤں گا۔' وہ کہتا' پھر دکان کھول کر ہمیں تھوڑا تھوڑا گڑ دیتا۔ 'اب اچھے لوگوں کی طرح چپ چاپ چلے جاؤ کتے کے بچو' شاباش'۔ وہ کہتا۔ ہم خاموشی سے چلے آتے۔ اس طرح سے وہ ہماری اوپر کی آمدنی کا مستقل ذریعہ بن گیا۔ ہم گلیوں کی صفائی کا کام کرتے تھے اور گاؤں والوں کی مشترکہ جائداد تھے۔ گھروں کے اندر ہم بس مویشیوں کے احاطے تک جاسکتے تھے' گوبر اٹھانے کے لیے۔ دودھ دینے والے جانوروں کو چھونے کی اجازت نہ تھی۔ ہمارے برتن الگ تھے جن میں ہمیں اناج اور دوسری اجناس دی جاتیں اور ہمارا گھر گاؤں کے باہر جوہڑ کے کنارے تھا۔ آس پاس اور کوئی گھر نہ تھا۔ کھیتی باڑی کرنے کی ہمیں اجازت نہ تھی۔ جونہی ہم لوگ ہوش سنبھالتے گلیوں کی صفائی کے کام پر لگا دیئے جاتے۔ میں ہوش سنبھالنے سے کچھ پہلے ہی کام پر لگ گئی۔ یہ بڑا عجیب واقعہ ہے۔

''میرا ایک بھائی تھا جو ماں باپ کے ساتھ کام پر جایا کرتا تھا۔ میں بہت چھوٹی تھی مگر میرا یہ بھائی بڑا عجیب تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی بات پر باپ کے ساتھ لڑتا رہتا تھا۔ شاید وہ کام چور تھا۔ ہر روز میرا باپ گھسیٹ کر اسے گھر سے نکالتا اور جھاڑو سے مارتا ہوا کام پر لے جاتا۔ لیکن وہ بڑا ذہین تھا۔ اسے سو تک کی گنتی فرفر یاد تھی جو میرے ماں باپ میں سے کسی کو نہ آتی تھی اور کھیتی باڑی ہمارا کام نہ تھا پر اسے ہر فصل کے بیجنے کاٹنے کے طریقے اور ان کے موسم یاد تھے' اور صرف سات دن کی بوئی ہوئی فصل کو دور سے دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ کون سی فصل کا کھیت ہے اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں تھیں جن میں وہ گاؤں کے لڑکوں میں سب سے ہوشیار تھا۔ خیر ایک دن کیا ہوا کہ میرے باپ نے اسے خوب پیٹا اور وہ روتا روتا اور گالیاں دیتا ہوا سو گیا۔ رات کا جانے کیا وقت جب اس نے اٹھ کر مجھے کمر پر لادا اور باہر نکل آیا۔ میں بہت نیند میں تھی' جب میری آنکھ کھلی میں نے اپنے آپ کو اس کی پشت پر پایا۔ وہ جوہڑ کے کنارے کنارے چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ رات بڑی سنسان تھی اور جوہڑ کے پانی میں ستاروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایک جگہ پر رک کر اس نے مجھے اتار دیا۔

'''اب میں نہاؤں گا۔' اس نے کہا اور کپڑے اتار کر پانی میں کود پڑا۔ دیر تک ڈبکیاں لگانے کے بعد وہ باہر نکل آیا اور ننگ دھڑنگ میرے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔ 'اب میں پاک ہوں؟ بتا۔' میری بالکل ناسمجھی کی عمر تھی' جو

میری سمجھ میں آیا میں نے کہہ دیا اور میں نے کہا: نہیں۔' وہ خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دوبارہ خاموشی سے پانی میں اتر گیا اور خوب مٹی مل مل کر نہایا' پھر اس نے باہر نکل کر اپنا سوال دہرایا۔'اب پاک ہوں؟ بتا۔' مجھے پتا تھا وہ پاک نہیں ہے۔ میرے دوبارہ نہیں کہنے پر اس نے زور کا چانٹا میرے گال پر رسید کیا۔ پھر دوسرا' پھر تیسرا' پھر چوتھا یہاں تک کہ میرے کان سنسنانے لگے اور مجھے لگا جیسے اب میں عمر بھر کے لئے بہری ہوگئی ہوں۔ مگر اس وقت خوف کے مارے چیخ بھی میرے حلق سے نہ نکلی۔ اس نے خاموشی سے کپڑے پہنے اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کے نزدیک پہنچ کر اس نے بڑے آدمیوں کی طرح سینے پر ہاتھ باندھے اور میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ''اب میں گنگا میں جاکر نہاؤں گا اور پڑھوں گا۔ مگر ایک نہ ایک دن میں ضرور واپس آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ میں بہت چھوٹی تھی لیکن اس رات اس نے جو کچھ کہا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں موجود ہے۔ اس رات بڑی سردی اور سناٹا تھا۔

''اب میں اس کی جگہ پر کام کرنے لگی۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے اور کوئی خاص واقعہ نہ ہوا۔ صرف میری ماں ایک سال ہیضے میں مرگئی۔ اب میں اور میرا باپ دونوں رہتے تھے اور میں سیانی ہو چلی تھی۔ ایک روز گاؤں کے زمیندار نے مجھے اپنے مہمان خانے میں بلایا اور باقی سب لوگوں کو باہر نکال دیا۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو کوئی گائے بھرشٹ ہوگئی ہے اور اب یہ مجھے جان سے مارنے والا ہے۔ لیکن اس نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور بولا: 'اری پگلی! عورتوں کے ساتھ سونے سے بھی کوئی بھرشٹ ہوتا ہے؟' میں اس وقت بارہ برس کی تھی۔ شام کو خوش خوش وہاں سے لوٹ آئی۔

''اب میں اس کے ساتھ رہنے لگی۔ مجھے پتا چلا کہ یہ ایک عام فہم' بلکہ بڑے قاعدے کی بات تھی۔ اور وہ شخص برا آدمی نہ تھا' موٹے جسم کا تندرست بڈھا تھا اور خوش مزاج تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مزدوری کیے بغیر مجھے اچھا کھانے کو اور پہننے کو مل جاتا تھا اور میں آرام میں تھی۔ صرف کبھی کبھی جب وہ میرے اوپر سوار ہو کر پاگلوں کی طرح کودنے لگتا تو مجھے خطرہ ہوتا کہ اب میں کچل کر مرجاؤں گی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ اس نے مجھے ایک اور شخص کے سپرد کردیا۔ یہ شخص بھی زمیندار تھا اور عمر میں ذرا کم تھا پر اسے بڑا گندہ پسینہ آتا تھا۔ بھئی کیا بدبودار شخص تھا۔ اس کے ساتھ لگنے سے میرا بدن بھی خراب ہو جاتا اور مجھے کئی کئی بار نہانا پڑتا۔ اس کے بعد جس آدمی کے پاس میں رہی وہ بڈھا اور بالکل نکما آدمی تھا اور کسی کام کے لائق نہ تھا۔ میں نے تیسرے ہی دن اس کی داڑھی نوچ ڈالی جس پر اس نے مجھے پکڑ کر خوب مارا۔ کافی دنوں تک ایسے ہی چلتا رہا۔

''اسی اثنا میں میرا باپ بڑھاپے سے مرگیا۔ اس کے چند روز بعد مدن کہیں سے آن وارد ہوا۔ یہ میرا بھائی تھا۔ اسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ ایک تو میں اکیلی تھی' دوسرے گاؤں کے لوگوں سے بالکل اکتا چکی تھی' اور پھر وہ میرا بھائی تھا۔ جب اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا تو میں خوشی خوشی اس کے ہمراہ جانے کو تیار ہوگئی۔ ایک روز شام کے وقت چپکے سے ہم نے گاؤں چھوڑ دیا۔ اس وقت جب ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے پرے جارہے تھے اور پیچھے گاؤں کی دیواریں اندھیرے میں غائب ہوتی جارہی تھیں تو ایک بار بھی میرے دل میں خیال نہ آیا کہ اب میں کبھی لوٹ کر یہاں نہ آؤں گی۔ کیسی عجیب بات ہے۔ اس گاؤں میں میں پیدا ہوئی تھی اور وہاں میرا گھر تھا۔

''راستے میں مدن نے بتایا کہ وہ چھ برس تک سکول میں پڑھتا رہا تھا اور اس کے علاوہ بھی اس نے کئی کتابیں پڑھی تھیں جو سکول میں نہیں پڑھائی جاتیں اور یہ کہ اب وہ ایک بے حد اہم کام میں مصروف تھا اور اس کے

ساتھ جو لوگ کام کرتے تھے جانتے تھے کہ وہ اچھوت ہے مگر کوئی اعتراض نہ کرتے تھے۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ دو روز تک ہم جنوب کی طرف سفر کرتے رہے' اس کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ وہاں میں نے اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ عجیب و غریب قسم کے لوگ تھے۔ نوجوان اور خطرناک۔ کافی دنوں کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہ دہشت پسندوں کا گروہ تھا جو زیادہ تر ریل گاڑیوں کو بارود سے اڑانے اور ڈاکخانوں کے تار کاٹنے کا کام کرتا تھا۔ یہ معلوم کر کے مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ مدن میرے لئے چھوٹے موٹے دیوتا کا درجہ رکھتا تھا' پر اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ یہ جگہ بہر حال گاؤں سے زیادہ دلچسپ تھی۔

''اب ہماری زندگی خانہ بدوشوں کی طرح تھی۔ چند روز یہاں چند روز وہاں۔ ہم مستقل گاؤں گاؤں گھومتے تھے اور رات کے اندھیرے میں سفر کرتے تھے۔ وہ لوگ دن بھر اپنے ہتھیار صاف کرتے رہتے' رات کے لئے سکیمیں بناتے یا سوئے رہتے۔ وہ بڑے خطرناک طریقے پر بات کرتے اور کبھی کبھی بحث کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے۔ اکثر وہ رات رات بھر باہر رہتے اور سحری کے وقت بھوکے اور بدحال ہو کر لوٹتے۔ پولیس ہر وقت ہمارے پیچھے لگی رہتی اور کبھی کبھی ہمیں نہایت عجلت میں کسی جگہ سے بھاگنا پڑتا۔ مجھ کو وہ کسی بات سے آگاہ نہ کرتے' صرف حکم دیتے۔ میں دل میں ان سے حسد کرنے لگی تھی اور میرا جی کرتا تھا کہ کسی روز میں بھی ان کے ساتھ جا کر وہ سب کچھ کر کے دکھاؤں جو وہ کرتے تھے اور مجھے علم تھا کہ میں وہ سب کر سکتی تھی مگر مجھے کبھی موقع نہ ملا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رات کی مہم کے بعد جب وہ لوٹتے تو ایک آدھ آدمی ان میں سے کم ہوتا۔ مجھ کو وہ کچھ نہ بتاتے مگر مجھے پتا چل جاتا کہ وہ پکڑا گیا ہے یا مارا جا چکا ہے۔ یہ کاروبار ہی ایسا تھا' تم جانتے ہو زندگی' موت' خطرہ' ان وقتوں میں یہ چیزیں معمول بن گئی تھیں۔ مجھے کبھی پتا نہ چل سکا کہ کن لوگوں کی خاطر یہ گروہ کام کر رہا تھا لیکن ہمیشہ ایسا ہوتا کہ چند روز کے بعد کم ہونے والے کی جگہ کوئی اور آ کر لے لیتا اور کوئی محسوس بھی نہ کرتا۔ مجھے مدن کا بڑا خطرہ رہتا۔

''اسی زمانے میں ایک شخص ہمارے ساتھ آ کر رہا۔ وہ بڑا عجیب شخص تھا۔ بہت کم وہ ان لوگوں کے ساتھ باہر کام پر جاتا' صرف بیٹھا ہوا بحث کیا کرتا۔ میری اس کی دوستی ہوگئی۔ وہ ان سب میں دلکش اور پُرامن تھا۔ وہ پہلا شخص تھا گاؤں چھوڑنے کے بعد میں جس کے ساتھ سوئی اور وہ پہلا ہی شخص تھا جس کے ساتھ مجھے دل سے محبت ہوئی تھی۔ گو چند روز بعد وہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن مجھے اب تک یاد ہے۔ پہلا شخص جسے ہم دل سے پیار کرتے ہیں ہم کبھی نہیں بھولتے' بعد میں آنے والے سب لوگوں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے...... تم بالکل اس کی طرح چلتے ہو۔

''اس کے جانے کے چند مہینے کے بعد ایک روز جب میں اکیلی اندھیرے میں بیٹھی تھی اور سب لوگ باہر جاچکے تھے تو اچانک مجھے ایک بڑا خوفناک خیال آیا' کہ اب میں ہمیشہ کے لئے بچہ جننے کے قابل نہیں رہی۔ اس رات میں بڑے زور سے' بڑے دکھ کے ساتھ روتی رہی اور پہلی بار گاؤں کے ان سب لوگوں کو کوسا جن کے ساتھ میں رہ چکی تھی۔ اس وقت میں پندرہ برس کی تھی۔ یوں سوچو تو ہنسی آتی ہے۔

''پھر وہ ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ ایک روز مدن واپس نہ آیا۔ وہ کبھی واپس نہ آیا۔ میں تھوڑا سا روئی پھر ٹھیک ہوگئی۔ کیا ہوسکتا تھا۔ اس حادثے کے لئے میں بڑے عرصے سے تیار تھی۔ چند مہینے اسی طرح گزر گئے۔ میں نے زیادہ مضبوطی سے اپنے آپ کو گروہ کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ پھر ایک شخص ٹھا کر ہمارے ساتھ آ کر رہا۔ اس نے ایک روز

مجھ سے کہا: 'تم ہندو ہو جاؤ تو میں تمہارے ساتھ شادی کرلوں۔'' کیا فرق پڑتا ہے؟ میں نے کہا۔ پھرانہوں نے خود ہی کسی طریقے سے' جواب مجھے یادنہیں رہا' مجھے ہندو کیا اور میری شادی کر دی۔ مجھ اس سے دلچسپی نہ تھی' مگر اس بات سے مجھے بڑی عجیب سی خوشی ہوئی کہ عمر میں پہلی بار باقاعدہ میری شادی ہو رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ بھی مارا گیا۔

''اب گروہ ٹوٹنا شروع ہوا۔ وہ لوگ اپنی جانوں سے کھیل رہے تھے۔ میری کون پروا کرتا تھا۔ کچھ مارے گئے' کچھ پکڑ لئے گئے حتیٰ کہ ایک روز میں اکیلی رہ گئی۔ شیلا ٹھاکر میرا نام تھا۔

''اس کے بعد...... کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ تمہیں پتا ہی ہے۔ میں وہاں آ گئی جہاں تم نے مجھے دیکھا۔ مگر میں تم سے کئی برس پیشتر وہاں پہنچی اور کپڑے کے کارخانے میں کام شروع کیا۔ وہیں پر میں لال سے ملی جو کارخانے میں 'ٹائم کیپر' تھا۔ وہ بڑا مہربان اور نرم دل آدمی تھا۔ مجھے کارخانے کے کام کی عادت نہ تھی اس لئے میں اکثر دیر سے پہنچتی لیکن وہ کبھی میرا 'ٹائم' نہ کاٹتا اور میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتا۔ چونکہ میں اکیلی تھی وہ کبھی کبھار میری خیریت پوچھنے کے لئے گھر کی طرف بھی آ نکلتا۔ رفتہ رفتہ ہم اکٹھے رہنے لگے۔ وہ بڑے اچھے دل کا آدمی تھا۔ یہ اس کی مہربانی تھی کہ ایک روز اس نے کہا: 'تم مسلمان ہو جاؤ اور میرے ساتھ نکاح کرلو۔ اس طرح ٹھیک نہیں۔' میں نے کہا: 'مجھے کچھ پتا نہیں۔ بس میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔' اس نے مجھے مسلمان کیا' میرا نام بانو رکھا اور ہمارا نکاح ہوگیا۔ اس کے بعد دو خاص واقعے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ مجھے اس سے واقعی محبت ہوگئی اور میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق سوچنا اور اس کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ دوسرا واقعہ یہ کہ کمال پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش سے کئی مہینے پیشتر جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں خوشی کے مارے بے حال ہوگئی اور میں نے لال کے اور ساری دنیا کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے۔ اس کی پیدائش کے دو سال بعد لال ایک دوسری عورت کے ساتھ جا کر رہنے لگا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی میرے پاس آتا تھا اور جب بھی وہ آتا میں خوشی سے اس کے ساتھ رہتی تھی کیونکہ میں نے اس سے مل کر بڑی راحت پائی تھی اور مجھے اس سے بڑی محبت تھی' اور پھر وہ ابھی تک اسی طرح معصوم اور صاف دل تھا' لیکن سوال مہربانی اور نرم دلی کا نہیں' سوال یہ ہے کہ مرد 'ایک' عورت کے ساتھ رہ سکتا ہے یا کہ نہیں' اور میرا خیال ہے کہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے مجھے بالکل چھوڑ دیا۔ اب میں نے پھر کام شروع کر دیا۔ ہر روز میری اس کی کارخانے کے دروازے پر ملاقات ہوتی اور وہ ہنس کر میرا حال پوچھتا اور میں بھی ہنس کر جواب دیتی' میں الگ رہتی تھی اور خود محنت کر کے کھاتی تھی' میں کیوں ناراض ہوتی۔

''جب تم آئے تو میں اکیلی رہ رہی تھی۔ ایک روز تمہیں پیچھے سے چلتے ہوئے دیکھ کر چونک پڑی۔ تمہاری چال...... ہزاروں آدمیوں میں میں اسے پہچان لیتی ہوں۔ پر چھوڑو یہ بیکار قصہ ہے۔ اس کے بعد یونین اور ہڑتالیں اور پتا نہیں کیا کیا ہوا تمہیں تو پتا ہی ہے۔ کئی بار مجھے نکالا گیا مگر میں کسی نہ کسی طرح اسی شہر میں رہی اور کام کرتی رہی۔ پھر یہ ہندو اور مسلمان کا قضیہ چل نکلا۔ مجھے اس سارے قصے سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر چونکہ میرا بچہ تھا اور وہ مسلمان تھا اسے لے کر ادھر آ جانا پڑا۔ رستے میں وہ بھی بچھڑ گیا۔ میری زندگی کی سیدھی سادی کہانی ہے' اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ تم ابھی کمزور ہو اتنی ٹھنڈک میں باہر مت بیٹھو۔ چلو اب اندر۔''

اندر جھونپڑی کے وسط میں کھڑے ہو کر علی نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔ وہ عورت جو اس سے دس برس بڑی تھی' اس کا شفیق اور بیباک چہرہ تھا اور روشن آنکھیں تھیں اور اس کا جسم ابھی ڈھلا نہیں تھا۔ وہ بلا کی عورت تھی۔

''تم وہاں جاؤ۔'' علی نے چارپائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ بانو نے پس و پیش کرنی چاہی لیکن اس کی بھاری نگاہوں کے سامنے خاموشی سے جا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ علی سینے پر ہاتھ باندھے خالی خالی نظروں سے دیئے کی لو کو دیکھتا رہا' پھر کونے میں سے ایک رسی اٹھا کر جھونپڑی کے آر پار باندھنے لگا۔ جب باندھ چکا تو ایک موٹا کپڑا اس پر پھیلا دیا جس نے کوٹھری کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

''یہ کیا کرتے ہو؟'' بانو کی آواز آئی۔

علی خاموشی سے زمین پر اپنے لئے چادر بچھاتا رہا۔ پھر اس نے کہا: ''کل سے میں نور دین کے ساتھ رہوں گا۔''

اس رات اسے دیر تک پردے کے دوسری طرف عورت کے آہستہ آہستہ رونے کی آوازیں آتی ہیں۔

(۴۹)

وہ لاہور کے نواحی علاقے کی ایک قدیم' دومنزلہ کوٹھی تھی جس کا ایک حصہ آتشزدگی کی نذر ہو چکا تھا۔ بجلی کا سلسلہ اسی زمانے سے منقطع تھا اور اس کے بڑے بڑے کمروں اور طویل برآمدوں میں سرشام تیل کے لیمپوں کی مدھم' اداس روشنی پھیل جاتی تھی۔ اندر دیواروں پر سے تمام تصویریں اتار لی گئی تھیں۔ جب تصویریں ابھی اتاری نہیں گئی تھیں تو وہ چاروں طرف دیواروں پر لگی تھیں اور ان میں قدیم اور معزز چہروں والے رائے بہادر اکیلے اور فیملی گروپوں میں نمایاں جگہ پر بیٹھے' اور انگریز کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے ساتھ غیر نمایاں جگہوں پر کھڑے تھے۔ (مزے کی بات یہ تھی کہ جن تصویروں میں وہ غیر نمایاں تھے انہیں دیواروں پر نمایاں جگہ دی گئی تھی' اس دلچسپ ترتیب کو دیکھ کر اس طبقے کی ساری سماجی زندگی کا اندازہ ہو سکتا تھا) پھر ہندوؤں کے ان گنت دیوتاؤں کی تصویروں کے رنگین پرنٹ تھے جنہیں بڑے سلیقے سے فریم کیا گیا تھا۔ یہ ساری بڑی پُرسکون اور بے ضرر تصویریں تھیں جیسی پرانی خاندانی تصویریں ہوتی ہیں۔ یہ پرانے مکینوں کی تصویریں تھیں جنہوں نے گھر بنایا تھا مگر پھر نئے مکین وارد ہوئے اور انہوں نے ساری تصویریں اتارتے ہوئے بڑے تمسخر کے ساتھ سوچا کہ بھائی مکان بنا لینے سے آپ کوئی سدا کے مکین تھوڑا ہی ہو جاتے ہیں۔ اب آپ تشریف لے جایئے۔

فرنیچر جو بچا کھچا رہ گیا تھا اسے چند کمروں میں ترتیب کے ساتھ لگا کر استعمال کے قابل بنا لیا گیا تھا' پھر بھی یہ عمدہ اور قیمتی فرنیچر تھا جس کی بناوٹ میں پرانے وقتوں کی رئیسی نفاست کی جھلک ملتی تھی۔ نشست کے کمرے میں کونے کی تپائی پر ٹیلی فون پڑا تھا جو عرصے سے خاموش تھا مگر کسی نہ کسی امید میں ہر روز جھاڑا پونچھا جاتا تھا۔ کمروں کی آرائش کی طرف اس کے علاوہ اور کوئی توجہ نہ دی گئی تھی۔

جسے اس سارے ہنگامے میں سب سے کم گزند پہنچا تھا کوٹھی کا باغ تھا۔ یہ شہتوت اور جامن کے اونچے اونچے پیڑوں والا وسیع و عریض باغ تھا جو نصف صدی پرانی آبیاری کی یاد دلاتا تھا۔ بڑے پیڑوں کے علاوہ بیسیوں چھوٹے بڑے پھلوں اور پھولوں کے پودے تھے جو چاروں طرف نہایت سلیقے اور ترتیب سے اگائے گئے تھے اور کوٹھی کو آرام دہ' خنک اور سایہ دار ماحول عطا کرتے تھے۔ سامنے دو وسیع لان تھے جن کی گھاس اعلیٰ قسم کی تھی اور نفاست سے کاٹی گئی تھی۔ اندر کی طرف لان کے کنارے کنارے گلاب کے پودے تھے۔ باہر کی طرف کھٹے کی

اونچی باڑ تھی جس میں جگہ جگہ چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے جس کے پیچھے سے سڑک گزرتی تھی۔ سڑک پر سے گزرنے والوں اور لان پر بیٹھنے والوں کو ہر وقت کھٹے کے پتوں کی ہلکی ترش خوشبو آتی رہتی۔ چند مہینے کی رکھوالی اور محنت کے بعد' جس میں نئے کنبے کے ہر فرد نے برابر کا حصہ لیا تھا' باغ نکھر آیا اور یہی ایک نظارہ تھا جو اس نئی جگہ پر ان لوگوں کے لئے سب سے زیادہ راحت بخش تھا۔

زمانہ ماضی میں باغبانوں کی ایک فوج تھی جو ہیڈ مالی کی نگرانی میں باغ کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی اور مالک لوگ صرف کنجوں میں بیٹھ کر پڑھتے تھے یا سوتے تھے یا گھاس پر پارٹیاں منعقد کرتے تھے یا محض ٹہلتے تھے۔ یہاں ایک بوڑھا بیکار سا مالی ہاتھ لگا تھا اور اس سے زیادہ کی ان میں طاقت بھی نہ تھی۔ اس بات کو انہوں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا چنانچہ خاموشی اور رضا مندی کے ساتھ اُن میں سے ہر ایک نے اٹھ کر باغ کو سنوارنے میں اپنی سی کوشش کی تھی اور جب گھاس سرسبز اگ آئی اور گلاب کے پودوں پر پھول آنے لگے اور باغ کے رستے سیدھے اور صاف نکل آئے اور درختوں کے سائے گہرے ہوگئے تو انہیں عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ ''مسرت کی کتنی مختلف کیفیتیں ہیں۔'' نجمی نے سوچا تھا۔

اسی عام رضا مندی اور خاموش کے ساتھ انہوں نے زندگی کی ہر چیز کو قبول کرلیا تھا۔ نجمی نے ایک کونونٹ میں آرٹ پڑھانا شروع کردیا تھا۔ مالی ضروریات کی وجہ سے کم اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر زیادہ' گو اس بات کا اس کے باپ روشن آغا کو علم نہ تھا۔ پرویز صوبائی حکومت میں اعلیٰ افسر تھا اور ایک پرانی اوپل گاڑی پر' جو اس نے سرکار سے پیشگی روپے لے کر خریدی تھی' سیکرٹریٹ جایا کرتا تھا۔ (جو کچھ جمع پونجی وہ لوگ ساتھ لے کر چلے تھے سرحد پار کرتے وقت کچھ افسروں نے' جو کہ دونوں حکومتوں میں سے کسی ایک کے تھے وہیں' رکھوالی تھی۔ جہاز آخر کار نہ مل سکا تھا اور انہوں نے گاڑی پر سفر کیا تھا) عرصے سے وہ راج منزل میں بجلی لگوانے کی کوشش کررہا تھا۔

راج منزل کوٹھی کا نام تھا۔ اس کا سارا جھگڑا تھا۔

خزاں کا موسم ابھی آیا نہیں تھا لیکن زمین و آسمان کے رنگ مدھم پڑنے شروع ہوگئے تھے۔ دنوں میں وہ شدید اداسی اور ٹھہراؤ آ گیا تھا جو پت جھڑ کے خاتمے پر آتا ہے۔ اور رات کو چاند نکلتا تھا۔ کاتک کی چاندنی سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ سردی کی وجہ سے زیادہ دیر باہر نہیں رک سکتے تھے اور باغ کے راستوں پر ٹہلتے ہوئے جگہ جگہ خشک پتوں کے ڈھیر ملتے تھے جنہیں باغبان دن بھر اکٹھا کرتا رہتا تھا۔ شوخ رنگوں کا اور دل کی بے چینی کا زمانہ ختم ہوا۔ اب یہ گہرے غم اور گہری خوشی کا موسم تھا۔ ابھی کچھ روز میں جاڑے شروع ہوں گے جب یہ تمام جذبے بھی ختم ہوجائیں گے اور صرف سردی اور حرارت کا احساس رہ جائے گا۔

بدلتے ہوئے موسم میں کیسا جادو ہوتا ہے۔ جیسے جوان عورت محبت کرتی ہے۔

پرویز دیر سے سامنے والے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ دفتر سے واپس آکر اس نے چائے پی تھی اور تھوڑی دیر کے لئے روشن آغا کے کمرے میں گیا تھا۔ اب اندھیرا بڑھ رہا تھا اور ہوا میں خنکی آچلی تھی۔ وہ چلتے چلتے دروازے کے پاس رکا اور اندر سے کوٹ اٹھا کر پھر برآمدے میں نکل آیا۔ اندر روشن آغا بستر مرگ پر تھے۔ آج ساتواں روز تھا۔

لمبا چکر کاٹ کر وہ عمارت کی پچھلی طرف جا نکلا۔ اس برآمدے میں چراغ نہیں جلا تھا۔ ''کئی دن سے صفائی بھی نہیں کی گئی۔'' اس نے کنکروں پر سے گزرتے ہوئے سوچا۔ اس طرف گھاس اور خود رو جھاڑیاں بے تحاشا آگ رہیں تھیں۔ باغ کے اس حصے کی دیکھ بھال کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی۔ اس چھوٹے سے بے ترتیب جنگل پر سرِ شام تاریکی اتر آتی تھی جو برآمدے تک پھیل جاتی تھی اور کسی کسی رات کو گیدڑ اِدھر اُدھر سے جمع ہو کر شور مچایا کرتے تھے۔ برآمدے کی ٹوٹی پھوٹی' سیاہ کائی جمی سیڑھیاں جو اس جنگل میں اترتی تھیں نجمی کی پسندیدہ جائے نشست تھیں۔

پرویز کو دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ ''بھیا...... کچھ ہوا؟'' اس نے پوچھا۔ ''پاگل پن کی باتیں مت کرو۔'' پرویز نے اعصابی لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ آگے کوٹھی کا جلا ہوا حصہ شروع ہوتا تھا۔ وہ وہاں سے ہوتا ہوا پھر سامنے والے حصے میں نکل آیا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے اوپر کی منزل میں روشن آغا کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ عذرا اس کی طرف پشت کئے کھڑی شال درست کر رہی تھی۔ روشن آغا نے کمزور آواز میں کچھ پوچھا۔ ''آئے تھے۔ آپ سو رہے تھے بابا۔'' عذرا نے کہا' جھک کر چادر درست کی اور باہر نکل آئی۔ ''روشن آغا تمہارا پوچھ رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے کو جارہی ہوں۔'' اس نے پرویز سے کہا اور اطمینان سے چلتی ہوئی گیلری میں غائب ہوگئی۔

پرویز نے جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا' رکا' پھر باہر نکل کر آہستہ سے دروازہ بند کردیا۔ نیچے آکر اس نے نجمی کے کمرے سے اس کا کوٹ اٹھایا اور اس کے پاس سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔

''کوٹ پہن لو۔ سردی ہو رہی ہے۔''

چاند کی روشنی برآمدے کے ایک حصے پر پڑ رہی تھی۔ ان کے سامنے لمبی گھاس تاریکی میں سرسرا رہی تھی۔ پرویز نے کوٹ کا کالر کھڑا کرلیا۔

''روشن آغا کو علم ہوگیا ہے' تمہارے کانونٹ جانے کا۔ عذرا بتا رہی تھی۔

نجمی نے سہم کر اپنے بھائی کو دیکھا۔

''نجمی۔''

''ہوں۔''

''روشن آغا تکلیف میں ہیں۔''

''بھیا۔''

''ابھی پھر انہوں نے میرے متعلق دریافت کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ ہر وقت انتظار میں ہیں۔ آج سات روز سے وہ جانکنی کی حالت میں ہیں مگر پورے ہوش وحواس میں ہیں اور انتظار کر رہے ہیں۔ آج آخری آرڈیننس جاری ہوا ہے۔ مکانوں کے نام قطعی نہیں بدلے جاسکتے۔ میں انہیں کیا بتاؤں۔ کیا فائدہ ہوگا آخر۔ عجیب ضد ہے۔''

''بس ان کی خواہش ہے۔''

''عجیب پاگل خواہش ہے۔'' پرویز نے چڑ کر کہا۔ آج تک اپنے باپ کے متعلق اس نے اس لہجے میں بات نہ کی تھی۔

نجمی نے دوبارہ اندھیرے میں اس کی طرف دیکھا۔
''نجمی۔''
''بھیا۔'' (اس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں ایک بے حد پُر ہول اور مصنوعی سطح پر ایک دوسرے سے مخاطب تھے)
''آخر اس میں...... فائدہ ہے۔ ہم کیوں نہ ان سے کہہ دیں۔''
''کیا؟''
''کہ نام بدل دیا گیا ہے۔'' وہ یکلخت خاموش ہوگیا۔ خاموشی کے اس مختصر وقفے کو دونوں نے جی کڑا کرکے برداشت کیا۔
''پھر؟ لیکن پھر؟''
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اتنا وقت کہاں ہے۔ وہ اسی خبر کے انتظار میں ہیں۔ کسی زبردست خواہش کے پورا ہونے کے انتظار میں انسان کچھ عرصے تک موت کو بھی ٹال سکتا ہے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں (نجمی نے لرز کر اسے دیکھا مگر اس نے بات جاری رکھی) اور پھر...... کب تک یوں چلے گا۔ تمہیں پتا ہے......''
''عذرا آپا مگر......''
''وہ اس وقت وہاں نہیں ہے۔ تم چاہو تو جاکر......''
''نہیں' نہیں بھیا۔ آپ۔'' نجمی نے کمزور آواز میں کہا۔ پرویز نے انتہائی بدمزگی سے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اوپر کی منزل میں وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ روشن آغا آنکھیں کھولے سیدھے لیٹے تھے۔ ان کا چہرہ بستر کی چادر کی طرح سفید تھا۔ انہوں نے پرویز کی طرف دیکھا اور رہی سہی جان ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔

پرویز نے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر ان کا مردہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا: ''بابا' عرضداشت منظور ہو کر آ گئی ہے...... یہ اب...... روشن محل ہے۔''

روشن آغا کے بے روح چہرے پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے کچھ کہا مگر صرف ہونٹ ہلے' پھر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ پرویز کا خیال ٹھیک نکلا۔ وہ جلدی سے ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے گہری نظروں سے مرتے ہوئے شخص کو دیکھا جو کہ اس کا باپ تھا اور جس کی آخری جدوجہد ختم ہو چکی تھی۔

اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے نجمی نے پرویز کے تیز تیز سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے کی طرف جانے کی آواز سنی اور گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب عذرا لوٹی تو روشن آغا مر چکے تھے۔ حسین نے' جو ہر لحظہ ان کی پٹی سے لگ کر بیٹھا رہتا تھا' اسے ساری بات بتائی۔ اس نے دیوانوں کی طرح مردہ جسم کو جھنجھوڑا اور چند بے سود آوازیں دینے کے بعد آندھی کی طرح پرویز کی تلاش میں نکلی۔

پرویز اسے کہیں بھی نہ ملا۔ صرف نجمی ملی جو پچھواڑے کی سیڑھیوں پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ واپس جانے سے پہلے عذرا نے صرف اتنا کہا: ''تم...... جو اتنے اعلیٰ دماغ ہو' اتنی کمینگی کے اہل ہو۔''

اب وہ سب نشست کے کمرے میں جمع تھے' سوائے عذرا کے جو لاش کے قریب بیٹھی قرآن مجید پڑھ رہی

تھی اور حسین جو اپنے مالک کی موت پر اونچے سُروں میں رو رہا تھا۔

نجمی سکول کے بچوں کو لے کر شہر کے ایک بڑے کلب میں گئی تھی جہاں بے گھر مہاجرین کی مدد کے سلسلے میں انہیں ایک ڈرامہ کرنا تھا۔ سکول کی سٹیج اس تقریب کے لئے بہت چھوٹی تھی۔ اصل پروگرام کے بعد Charity Ball منعقد کیا جانے والا تھا۔ جب وہ وہاں سے لوٹی تو پہلے عمران اور پھر دوسرے لوگوں نے تقریب کے سلسلے میں چند رسمی سوالات کئے جن کا اس نے عجیب اکھڑے اکھڑے لہجے میں جواب دیا۔ یہ دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے اور پرویز اور اس کی بیوی کا انتظار کرنے لگے جو اسی کلب میں مدعو تھے۔

اگلے روز صبح سویرے نجمی لباس تبدیل کر کے سیدھی ناشتے کی میز پر آئی اور بغیر بات کئے کھانے لگی۔ اس کا چہرہ بہت زرد تھا۔ سب پر غیر معمولی خاموشی طاری رہی۔ پھر آہستہ آہستہ باتیں شروع ہوئیں۔ عمران عذرا کو نئے ہمسایوں کے متعلق بتانے لگا۔ سامنے ان کی ماں بیٹھی تھی۔ ساتھ نجمی' جو اپنے آپ کو مشکل سے سنبھالے ہوئے تھی۔ پرویز ڈریسنگ گاؤن لپیٹتا ہوا ابھی آن کر بیٹھا تھا اور عذرا کو چائے بنانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ نجمی نے توس کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا اور ساتھ ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ لقمہ پلیٹ میں آن گرا۔

''ممی...... اس نے میری بے عزتی کی ہے۔'' وہ تقریباً رو کر بولی۔

''کس نے...... کس نے۔ کیا ہوا؟'' سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ کرسی پیچھے دھکیل کر معذرت کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

تین روز تک اس کا کھانا کمرے میں جاتا رہا۔ اس کی ماں اسے دیکھنے کو صرف ایک بار گئی۔ اس کے علاوہ گھر کا ہر فرد کئی کئی بار اس کی خیریت دریافت کرنے کو گیا۔ اس نے سب کو یقین دلانا چاہا کہ کوئی قیامت نہیں آ گئی' بس ذرا طبیعت اوب گئی ہے' خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ آخر تنگ آ کر اس نے سب کو آنے سے منع کر دیا۔ گھر بھر میں بہر حال سخت تشویش پھیلی ہوئی تھی' کیونکہ اس کے کمرے کا لیمپ بھی بہت شام پڑنے پر جلا کرتا تھا۔

ہوا کیا تھا؟ اس نے لیٹے لیٹے سوچا۔ یہی کہ اتنے عرصے بعد وہ ملا اور بڑے اخلاق سے کھڑا باتیں کرتا رہا۔ بڑے معمولی روزمرہ کے انداز میں ہاتھ میں گلاس تھامے اسی طرح دلکش اور پُراسرار۔ پھر اس نے بڑے ادب سے رخصت لی اور چلا گیا۔

لیکن اس نے جو کہا! اور اس کا وہ کمینے پن کا رویہ!

وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ کمرے میں تقریباً گھپ اندھیرا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے بستر پر سے شال اٹھا کر کندھوں پر ڈالی اور ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکا کر باغ کے اندھیرے میں دیکھنے لگی۔

''ہلو نجمی بیگم۔'' وہ یکلخت کہیں سے نکل کر اس کی طرف آ رہا تھا۔

''مسعود؟ ارے ہلو...... تم شہر میں ہو اور ہمیں خبر ہی نہیں۔''

''جی ہاں۔ کہیے کیسی گزر رہی ہے؟''

''مزے میں ہیں۔ مگر کم از کم تم ہی مل لیتے۔''

''وہ دراصل...... اِدھر کچھ عرصے سے کافی مصروفیت رہی'' وہ ہنسا۔''اررر۔''

''بھئی حد ہوگئی۔''

''کہیے آب و ہوا راس آئی نئی جگہ کی؟''

''ہاں بھئی، گزر رہی ہے۔''

''آپ کے سکول کا پروگرام بڑا دلچسپ رہا۔''

اسے دھچکا سا لگا، لیکن بشاشت سے بولی: ''اچھا؟ شکریہ۔ تم تو بڑے باخبر آدمی ہو نا!''

وہ دوبارہ ہنسا۔''پرویز صاحب نے بتایا تھا۔''

وہ خاموش رہی۔

''ان سے ایک آدھ بار یہیں پر ملاقات ہوئی۔ بجلی کے محکمے کے ہاتھوں خاصے نالاں تھے۔''

''ابھی ہم اندھیرے میں ہیں۔'' نجمی نے خوشدلی سے کہا۔

''اور...... وہ آپ کے ہاں ایک تقریب ہوا کرتی تھی، نجمی بیگم' سنا تھا۔ پرویز کب بن رہے ہیں روشن آغا؟ ہمیں مدعو کرنا مت بھولئے گا۔''

''ارے نہیں بھئی......'' آنسو اس کے گلے میں آ کر اٹک گئے۔ وہ خاموش کھڑا گلاس میں سے زرد رنگ کا مشروب پیتا رہا۔ پھر اس نے بڑے ادب سے جھک کر رخصت لی۔

''آپ سے تو اب ملاقات ہوتی رہے گی۔ ابھی ابھی ایک بہت پرانے دوست کی جھلک دکھائی دی ہے اس مجمعے میں، پیشتر اس کے کہ وہ پھر غائب ہو جائے...... گو آپ بھی بڑی پرانی دوست ہیں۔ خدا حافظ۔''

''آپ آپ آپ۔ لعنت ہو۔'' نجمی نے دل میں کہا۔

رقص شروع ہونے پر وہ اپنے کونے میں بڑے مطمئن، بڑے خوش فہم انداز میں کھڑی رہی، جیسے کہ اسے کسی بات کا، کسی واقعے کا انتظار نہ تھا۔ سامنے مسعود ایک نوجوان عورت کے ساتھ ناچ رہا تھا اور ہنس رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔

''اچھا ناچ لیتی ہے۔'' نجمی نے بے دھیانی سے سوچا۔

پھر وہ ناچتے ہوئے اس کے قریب سے گزرے۔ معاً مسعود نے ایک مختصر لمحے کے لیے بڑی گہرائی، بڑے طنز سے اس کی طرف دیکھا، جیسے یہ ساری تیاری اس نے اس ایک لمحے کے لئے کی تھی۔

"Bravo"...... اس نے سرگوشی میں کہا اور گزر گیا۔ نجمی نے دہل کر اِدھر اُدھر دیکھا۔''ہوسکتا ہے کہ اس کی وہ چھچھلتی ہوئی نگاہ اس کے لئے مخصوص نہ ہو، اور جو کچھ اس نے کہا محض اپنی رقص کی ساتھی سے کہا ہو۔'' اس نے سوچنا چاہا۔ لیکن وہ کسی کا انتظار کئے بغیر تیر کی طرح باہر نکل آئی۔

تین دن۔ اور یہ مختصر سا منظر اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا۔ خدایا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔

اب گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔''ستائیس برس۔'' اس نے دفعتاً سوچا۔''چند مہینے میں اٹھائیس برس ہو جائیں گے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ یہ سارا وقت سارا عظیم الشان وقت بیکار میں گزر گیا۔ میری ساری تعلیم، تربیت، زندگی کی اعلیٰ اقدار جن میں یقین کرنا مجھ کو سکھایا گیا، اعلیٰ دماغ، اعلیٰ زندگی، ان ساری باتوں

کے باوجود آج میں اس جگہ پر آ گئی ہوں جہاں ان سب سے لگ ہو کر اپنے متعلق سوچ رہی ہوں۔ شاید میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ آج سے اٹھائیس برس کے بعد میں کیسی لگوں گی؟ مجھے کیا غرض' کسی کو کیا غرض۔ خزاں کا موسم بھی گزر گیا' ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اب یہاں پر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے اور بہت سی زندگی میرے قریب سے تیزی کے ساتھ گزر گئی ہے۔ سارے گیت پرانے ہو گئے' ساری چیزیں اتنی قدیم' اتنی کہنہ سال ہیں' میرے سمیت۔ لیکن اگر میں سمجھوں کہ میں وقت سے الگ تھلگ' ایک مکمل اور خود مختار اکائی کی طرح سے بیٹھی رہی تو ...... یہ سراسر غلط ہے۔ زندگی میرے اندر سے گزری ہے۔ میرے سر میں سے' میرے سینے میں سے' میرے پیٹ میں سے' میری ٹانگوں میں سے' اور وقت کے نشان میرے اوپر موجود ہیں۔ آثار قدیمہ۔ میرے چہرے پر' چھاتی پر' پیٹ پر' ٹانگوں پر۔ میں نے دیکھا ہے۔ اب میں کیا کرنے والی ہوں؟ کیا؟''

اس نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار کر فرش پر گرا دیئے اور اندھیرے میں کرسی کا سہارا لئے کھڑی رہی۔ باہر تاریک گیلری میں سے کوئی گزرا۔ اندر اس نے صرف پاؤں کی چاپ سنی۔ کسی کی موجودگی کو محسوس نہ کیا۔ وہاں صرف وہ وجود تھی' اپنے سارے احساس' سارے ادراک' ساری عمر کے ساتھ۔ اس نے اندھیرے میں ہاتھ پھیلایا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی حتیٰ کہ اسے بجھائی دینے لگا۔ اس کی ٹانگیں' کمر' چھاتی' بازو' ایک مبہم اور بے تکا' بے ہیئت ہیولا' بے رنگ' بے بو' بے کار۔ ''یہ کرسی بھی زیادہ خوبصورت ہے۔'' اس نے بے تکے پن سے سوچا۔ اب وہ آہستہ آہستہ اپنے سارے جسم پر ہات پھیر رہی تھی۔ پہلے کئی بار اس نے اپنی ٹانگوں پر اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تھا لیکن آج تک کبھی اپنے جسم کو اس حالت میں نہ پایا تھا۔ اسے کراہت ہونے لگی اور گھبرا کر اس نے دونوں بازو لٹکا دیئے۔ اب وہ آہستہ آہستہ فرش پر چلنے لگی۔ کمرہ مانوس تھا اور وہ سارے راستوں' ساری چیزوں سے واقف تھی۔ ٹھوکر کھائے بغیر وہ سارے کمرے میں گھومتی اور اپنے آپ کو چلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ڈھیلے ڈھالے پھیلے ہوئے کولہے' بے ڈھنگے پن سے حرکت کرتے ہوئے کولہے' اور ٹانگیں جو خشک سیاہ اور جھری دار کھال والے ہزاروں سال پرانے درختوں کی مانند اندھیرے میں سے اگ رہی تھیں' اور لٹکتی ہوئی چھاتیاں' بکرے کے پھیپھڑے کی طرح کچے کچے خون کے رنگ کی' پلپلی اور پھولی ہوئی اور ہلکی' اور پیٹ ناریل کے بالوں کا سا' کھردرا اور بدبودار' پھر کولہے' بے ڈھنگے پن اور بے شرمی سے حرکت کرتے ہوئے کولہے' رکو' رک جاؤ...... بے آواز شور کے ساتھ کوئی چیخا۔ یکلخت وہ جہاں کی تہاں سرد پڑ گئی۔ پاگل بصیرت کے ایک لمحے میں اس نے ساری بات کو محسوس کر لیا تھا' کہ سارا وجود' سارا وقت ایسا بدہیئت ایسا کریہہ المنظر تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں ٹانگیں پھیلائے آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑی رہی۔ بڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ ایک خیال اس کے ذہن میں جاگا۔ ''یہ ہماری ساری میراث ہے۔ اس بارے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف فخر کر سکتے ہیں۔''

گیلری میں قدموں کی چاپ قریب آئی اور کسی نے دروازہ کھولا:

''بٹیا...... بٹیا کھانا۔''

''جاؤ۔ باہر جاؤ۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخی۔ خادمہ بدحواس ہو کر الٹے پاؤں بھاگ گئی۔

کچھ دیر تک سن رہنے کے بعد اس نے کپڑے پہنے اور لیمپ جلا کر آہستہ سنگار میز کے سٹول پر بیٹھ گئی۔ وہ کپکپا رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے بال' جو کافی عرصے سے گر رہے تھے بہت ہلکے ہو چکے تھے اور آنکھوں کے نیچے تھیلیاں بن گئی تھیں اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور جلد کا رنگ خاکستری ہو گیا تھا۔ افسوس یا نقصان

عظیم کے کسی جذبے کے بغیر وہ وہاں بیٹھی شیشے میں دیکھتی رہی۔ ''تمہارا رویہ کچھ غلط نہیں تھا۔'' اس نے دل میں کہا۔ ''تمہیں الزام نہیں دیا جاسکتا۔ تم پر بہرحال خدا کی لعنت ہو۔ مسعود!''

جب وہ وہاں سے اٹھی تو حیرت انگیز طور پر پُرسکون تھی۔ وہ سیدھی پرویز کے کمرے میں گئی جس نے اسے پاس بٹھا کر حال پوچھا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''بھیا۔ آپ کلب نہیں گئے۔''

''کل جاؤں گا۔''

''بھیا۔''

''کہیے بٹیا۔''

''ہم بھی آپ کے ساتھ جائیں گے۔''

''اچھا بٹیا۔''

وہ کلب کے ہال کمرے میں بیٹھی ایک انگریز عورت سے باتیں کرتی رہی۔ اس عورت کا خاوند سول کا بڑا عہدیدار تھا اور وہ لوگ مستقل طور پر پاکستان میں بسنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس نے نجمی کو مشورہ دیا کہ یہاں پر وقت ضائع کرنے کی بجائے اس کو انگلستان جاکر پڑھنا اور یورپ کا دورہ کرنا چاہیے کہ دنیا کا سارا آرٹ یورپ میں تھا۔ نجمی بڑی پُرسکون' متوازن آواز میں اس سے باتیں کرتی رہی' انتظار کرتی رہی' جب پرویز اٹھ کر اس کی طرف آیا: ''بٹیا نو بج رہے ہیں چلیے گا نہیں؟''

''ابھی ہمارا جی جانے کو نہیں کرتا ہے بھیا۔''

''اچھا تو میں سلیم الرحمان کے ساتھ جاتا ہوں' آپ جلد آجایئے گا۔ مسز میکفرسن' میں اپنی بہن کو آپ کی معیت میں چھوڑے جاتا ہوں۔ شب بخیر۔''

''شب بخیر۔'' مسز میکفرسن نے کہا۔ پرویز نے موٹر کی چابی اس کے حوالے کی اور احتیاط سے ڈرائیو کرنے کی پرانی ہدایت دے کر چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد مسعود اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک اور نوجوان فوجی افسر تھا۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے جھک کر سلام کیا اور دوسرے کونے میں جاکر بیٹھ گیا۔ ہال میں سے لوگ اٹھ اٹھ کر بغل کے کمروں میں جانا شروع ہوگئے تھے جہاں بلیئرڈ اور شطرنج ہو رہی تھی اور لائبریری تھی۔ نجمی نے اٹھتے ہوئے معمول سے اونچی آواز میں اپنی ساتھی سے معذرت کی اور باہر نکل آئی۔ برآمدے میں چاندنی تھی اور ستونوں کے سائے تھے اور ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ وہاں کھڑے کھڑے اس نے اپنی موٹر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ سامنے کلب کے وسیع تر لان پر خاموش' خواب آلود چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اندر سے ہلکے ہلکے قہقہوں اور باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اکیلی اکیلی برآمدوں میں گھومتی پھری۔ اسے اتنا عجیب لگا۔

پھر وہ مغربی برآمدے کی طرف لپکی۔ اندر وہ ہال کے فرش کو عبور کر کے مغربی دروازے کی جانب آرہا تھا۔ ہال میں ریڈیوگرام پر کوئی ریکارڈ بجانے لگا۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر نجمی کو کھڑا پا کر وہ ٹھٹک گیا۔ وہ بڑے معمولی' لاتعلق انداز میں کھڑی تھی اور بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔

''ہیلو نجمی۔''

''ہلو۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''راجی کھسی؟''

''راجی کھسی۔'' وہ ہنسا۔ ''پرانی باتیں ان جگہوں پہ عجیب لگتی ہیں۔ آیئے ٹہلیں۔''

''میں گھر جا رہی ہوں۔''

''لوگ اتنا تمباکو پیتے ہیں۔ تازہ ہوا کی محبت میں تڑپ کر باہر نکلا ہوں۔ اندر۔''

''لوگوں کے پاس ڈھیروں گاڑیاں ہیں۔ میری بیچاری اوپل...... جانے کہاں دبکی کھڑی ہے۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آیئے تلاش کریں۔''

تلاش کرنے کی بجائے وہ لان کے کنارے کنارے ٹہلتے رہے۔ مسعود سگریٹ جلانے کے لئے رکا' پھر اس نے سر اٹھا کر نیچے سے اوپر تک اسے دیکھا' وہ جو دھیمی' متوازن چال سے آگے آگے جا رہی تھی۔ اس نے سبز رنگ کی ساری پہن رکھی تھی جس میں ستارے ٹکے تھے اور اس کی چال میں' سارے جسم کی حرکت میں اتنی گریس' اتنا لہراؤ اور اتنی اٹھان تھی۔ اور اس کا جسم...... کمبخت برابر پہنچ کر اس نے سوچا کہ یہ بھرپور جوان عورت بڑی حسین' بڑی دلفریب تھی۔

''نجمی' ایک دفعہ میں نے کہا تھا کہ روشن محل میں صرف تمہاری خاطر آتا ہوں۔ یاد ہے؟''

نجمی نے نیم سنجیدگی' نیم تمسخر سے اسے دیکھا۔

اس کا یہ پرانا دلکش انداز۔ اور آنکھیں' سیاہ' پُراسرار' ذہین۔ اور اوپر اٹھا ہوا خوبصورت مغرور سر' اور کھڑی ناک' کلاسیکل۔ اور اس کی آواز' اتنی نرم' اتنی پُرسکون۔ کلاسیکل تہذیب' دماغ۔ اس میں کوئی عشوہ ادائی' کوئی عشوہ نمائی نہیں۔ مسعود نے سوچا' خدایا' یہ کیسی بلا کی پُرکشش عورت ہے۔

''ہوں۔ تو یاد ہے تمہیں؟'' اس نے کہا۔

نجمی کے قدم تیز ہو گئے اور عرصے کا رکا ہوا غصہ اس کے دماغ کو چڑھا۔ وہ بالکل بھول گئی کہ یہ ساری تیاری اس نے محض اس وقت کے لئے کی تھی۔

''رُکو نجمی' سنو' مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ از حد ضروری۔ بھئی حد ہے۔''

وہ اور تیز ہو گئی۔ مسعود نے دوبارہ اسے روکنے کی کوشش کی: ''ٹھہرو' ایک لحظہ۔ مجھے افسوس ہے' مگر سنو میں تمہارے گھر آ سکتا ہوں؟ تم بڑی خوبصورت لڑکی......''

''بھئی واہ...... کمال ہے۔'' اس نے خفگی سے کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

وہ دروازے پر جھکا رہا: ''تم جو کہو لیکن میں ضرور آؤں گا۔ تمہیں میری بات سننا پڑے گی۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں......''

وہ انجن سٹارٹ کرتے ہوئے سخت جھلا گئی۔ ساری گزشتہ خفت' شرمندگی' شکست اور کمینگی یکلخت غصے کی تند لہر بن کر اُٹھی اور اس پر چھا گئی۔

''شب بخیر...... شب بخیر۔'' اس نے تیزی سے کہا۔
مسعود ضدیوں کی طرح ٹانگیں پھیلائے' سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا دور تک موٹر کی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔
اگلی بہار کے موسم میں ان کی شادی ہوگئی۔

اس بات کو چند مہینے گزر چکے تھیں۔ مسعود کی تعیناتی ایک غیر آبادسی چھاؤنی میں ہوگئی تھی جہاں وہ پتھروں کے بنے ہوئے ایک مکان میں رہتے تھے۔ سمندر وہاں سے قریب تھا اور ان کی سب سے بڑی تفریح ساحل سمندر پر جا کر ٹہلنے میں تھی۔ بظاہر وہ بڑی محبت اور بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

لیکن کبھی کبھی شاموں کو جب انہیں گھر پر رہنا پڑتا تو دل کی بے چینی عود کر آتی اور وہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر' اپنی اپنی جگہ پر' مختلف طور پر سوچنے لگتے اور وہ بڑا عجیب محسوس کرتے...... کہ ایسا کیوں کر تھا کہ وہ اس طرح سے سوچنے پر مجبور تھے۔

ایسی ہی ایک شام کو جب اس کا خاوند سرد آتشدان کے قریب بیٹھا ایک کتاب میں مشغول تھا' نجمی نے اون کے گولے اور ادھ بنا سویٹر آہستہ سے ایک طرف رکھا اور اٹھ کر برآمدے میں آ بیٹھی۔ شام بڑی شفاف اور خوشگوار تھی اور فضا میں ہرے پتوں کی مہک تھی۔

''سمندر پر اس وقت چاند طلوع ہو رہا ہوگا۔'' اس نے سوچا۔ ''اور یہاں برآمدے میں بڑا سکون ہے۔ سکون؟ اوہ...... تم نے اس سامنے والے درخت کو نہیں دیکھا جو کبھی ہرا نہیں ہوتا؟ تو پھر! اور اندر تمہارا خاوند موجود ہے جو تم سے محبت کرتا ہے' لیکن پتا نہیں کیا سوچتا ہے۔ کیا تم کبھی اس کی سوچ کو جان سکتی ہو؟ باوجود ساری باتوں کے کبھی اس کے خوابوں میں شریک ہو سکتی ہو؟ ہم کس میں شریک ہیں؟ محض اپنے آپ میں۔ اپنے خواب ہم آپ ہی دیکھتے ہیں' اور تنہا ہیں۔ اور اگر سوچا جائے تو اس دوسرے شخص نے تمہارے اوپر کتنا ظلم کیا ہے۔ ایک معاہدے کی رُو سے تم نے (تم دونوں نے؟) اپنی خفت مٹانا چاہی ہے مگر خفت باقی ہے' اور کنوار پنے کی سہانی یاد جو اس بری طرح سے کھٹکتی ہے۔ جیسے دل ٹوٹ جاتا ہے۔ یادداشت؟ لعنت ہے۔'' اس کی سوچ جاری رہی۔

''کتنی ہی شامیں ہیں جو زندگی میں ہمیں تنہا اور سوگوار چھوڑ کر گزر جاتی ہیں۔ زندگی اس قدر غیر حقیقی ہے' اور پھر اس قدر تکلیف دہ طور پر حقیقی بھی...... کیونکہ ہم پھنس چکے ہیں۔ محض اگر ہم تلاش کو ترک کر دیں۔ چھوٹے بڑے سہارے جو ہمارے دل کی شکست ہیں۔ محض اگر ہم بھول جائیں۔

''ہم شاید زیادہ تر عرصہ خوش ہی رہتے ہیں' لیکن ہماری یادداشت ہے جو کچھ بھی جاننے نہیں دیتی۔ ہم چیزوں کا' باتوں کا فہم بھی رکھتے ہیں مگر شانتی' عمیق امن فہیم سے بالاتر ہے۔ یہ صرف ہمارے پاس 'ہے' یا 'نہیں ہے'۔ 'ہے' یا 'نہیں ہے'۔ صرف یہ!''

''خاموش رہو اور بھول جاؤ کہ اس میں بھی نجات ہے۔ (پر کہنے سے کیا ہوتا ہے بھائی' ذرا بھول کے تو دکھایئے۔)

''کل میں نے اتنا غل مچایا' نوکر پر برسی' اتنے قہقہے لگائے' برج کے کھیل میں اتنا جھگڑا کیا' گھنٹوں باتیں کیں اور بلاوجہ چائے پیتی گئی۔ کچھ کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا' دوسروں کی تعریف کی' کچھ کو دور سے دیکھ کر پسند کیا اور نزدیک جانے کی حسرت پالتی رہی' کچھ کے سامنے اپنی متعدد خواہشوں کا اظہار کیا۔ پھر شام کے وقت اکیلی

بیٹھی تھی کہ آپ سے آپ سوچ آئی، اس سارے وقت میں جو کچھ میں نے کیا اس کا کیا جواز پیش کر سکتی ہوں؟ نقصان عظیم کا احساس پیدا ہوا جو تھوڑی دیر میں زائل ہو گیا۔

''زندگی کی اونچ نیچ، چمک دمک، نیک و بد کو میں نے انگلیوں میں سے نکال دیا ہے۔ جیسے اس ٹنڈ منڈ درخت کی شاخوں میں سے ہوا گزر رہی ہے۔ میری انگلیوں میں سوراخ ہیں۔ ہم بھلا دیئے جائیں گے۔ جیسے وہ سب بھلا دیئے گئے جن میں سے بعض کے پاس ٹوٹے پھوٹے کتبے رہ گئے ہیں، باقی کے پاس یہ بھی نہیں۔ کیا فرق پڑا؟ کیا فرق پڑتا ہے۔ صرف اگر میرے دماغ میں بھی سوراخ ہوتے تو میں یادداشت کو باہر نکال دیتی۔ چلو نکلو، باہر جاؤ، ابھی فوراً......''

''دنیا میں جو انقلاب آئے، جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں وہ سب بخیر و عافیت ختم ہوئے۔ کچھ نوکروں نے اُٹھ کر مالکوں پر قبضہ کر لیا۔ کچھ مالکوں نے اُٹھ کر نوکروں پر قبضہ...... جاری رکھا۔ تاریخ اس طرح بنتی ہے۔ انسان اہم نہیں ہیں، واقعات ہیں۔

''کیا وہ خوبصورت اور ذہین اور بہادر لوگ نہ تھے؟ کیا انہوں نے ہماری طرح عظیم منصوبے نہ بنائے تھے؟ ان میں سے بعض نے بے پناہ دکھ نہ اٹھائے تھے؟ کیا انہوں نے یہ ساری تیاریاں اس لئے کی تھیں کہ ان کی اموات کی وجوہات کی فہرست بنا کر تاریخ مرتب کی جائے؟ کیا فرق پڑتا ہے۔ موت ابھی تک موجود ہے جو سب سے زیادہ اہم ہے۔ تاریخ سے بھی زیادہ۔

''سامنے والا درخت خاموش کھڑا ہے اور اپنے لکڑہارے کا انتظار کرتا ہے۔ ہم اپنے لکڑہارے کا بھی انتظار نہیں کرتے کیونکہ ہمارے پاس ہماری یادداشت ہے جو ہمیں مصروف رکھتی ہے۔ جب ہم مریں گے تو شاید بے حد حیران و پریشان ہوں گے۔

''رات، میں نے تیرے وجود کو، تیرے وجود کے اسرار کو محسوس کیا ہے۔ جیسے ان سب نے بھی کیا جو یہاں رہے ہوں گے۔ تیرا کیا خیال ہے کہ میں تجھے یاد رکھوں گی؟ سراسر غلط۔ میں تجھے بھول جانے کی ازحد کوشش کروں۔

''لیکن تو مجھے یاد آتی رہے گی، اور سب چیزوں کی طرح۔ یہ تیری اور سب چیزوں کی اکٹھی سازش ہے۔ کمینی۔''

پیچھے کھڑکی میں اس کے خاوند کا سر نمودار ہوا۔ ''اندر آ جاؤ نجمی۔ رات پڑ گئی ہے۔'' وہ خاموش بیٹھی رہی۔

''تم جو اتنے معتبر بنے بیٹھے ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ کرنل یا جنرل بن کر مرو گے؟ ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ بہر حال مرو گے۔ تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟ کون فائدے میں رہا، تم یا موت؟ میدان جنگ میں یا ملٹری ہسپتال میں یا کسی بھی ہسپتال میں، آخری فیصلے میں گھاٹے میں تم ہی رہو گے میرے عزیز، تم، جس نے زندگی میں اتنی محنت کی اور اس کا پھل پایا۔ اس وقت تم بڑے مسخرے لگو گے۔ تم نے میرے باپ کو مرتے ہوئے دیکھا تھا؟ اور حسین کو جو کتے کی طرح رو رہا تھا؟

''کتنے ہی دُکھ ہیں جنہیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اس لئے کہ وہ دوسروں کے ہوتے ہیں۔ لیکن دوسروں کی زندگیاں ہماری زندگیوں میں شامل ہیں، ان کے دُکھ ہمارے دُکھوں میں۔ نعیم کا کیا بنا؟ نعیم کا کیا بنا؟'' اس نے بلند آواز سے دہرایا۔

''شاید فسادات میں مارا گیا۔ کچھ ٹھیک پتا بھی نہیں۔'' قریب سے مسعود نے جواب دیا۔ وہ جانے کب کا

آ کر اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ نجمی نے اکتاہٹ سے اسے دیکھا۔

''تم کیا جانتے ہو۔ تم تو خود مبتلا ہو اور بھگت رہے ہو اور اس عظیم بھرم کو قائم رکھنے میں مصروف ہو۔ ہم دونوں ایک معاہدے میں شریک ہیں اور ہمارے مشترکہ دوست ہیں جن سے ہم روزانہ اتنی نرمی اتنے اخلاق اتنی مکاری اور چاپلوسی کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ ہم سب ایک بڑے معاہدے میں شریک ہیں۔ ہم کیا جانتے ہیں۔ محض یہ بھرم؟''

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مسعود اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو۔''

''کہاں؟''

جواب دیئے بغیر وہ اسے لئے لئے جیپ کی طرف آیا اور وہ سمندر کی جانب روانہ ہوئے۔

چاند اوپر آ چکا تھا اور ساحل کی ریت اور چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں لہروں کی ہلکی ہلکی گرج تھی۔ وہ ریت پر ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ ''سپین میں مَیں نے ایک رقص ...... نجمی۔''

وہ چونک پڑی۔

''میری بات سنو۔ سپین میں مَیں نے ایک عجیب سا رقص دیکھا تھا۔ میرا جی کرتا ہے ناچوں۔''

''ناچو۔''

اس نے ناچنا شروع کیا۔ یہ واقعی عجیب سا رقص تھا۔ ریت پر اس کا سایہ بڑی تیزی اور افراتفری کی حالت میں گھوم پھر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رک کر اس نے نجمی کا ہاتھ پکڑا۔

''تم بھی ناچو۔''

''نہیں مسعود میں...... تم جانتے ہو نہیں ناچ سکتی۔''

اس نے بڑی بدمزگی سے اپنی بیوی کے سراپا پر نظر ڈالی۔ پہلے پہل باپ بننے کی جو عام لوگوں کو خوشی ہوتی ہے اس سے وہ قطعی ناآشنا تھا۔ اس نے پھر ناچنا شروع کیا۔

وہ سہم کر ایک طرف کو ہٹ گئی۔ یہ وحشیوں کا رقص تھا۔ اس میں کوئی آہنگ' کوئی قاعدہ' کوئی نظم' کوئی ضبط نہ تھا۔ بس ٹانگیں' بازو' کولہے' کندھے' سر' سب ایک دوسرے سے الگ' نہایت بے قاعدگی اور بے ترتیبی کے ساتھ خوفناک' پاگل کر دینے والی حرکات میں چاروں طرف اڑ رہے تھے' گر رہے تھے اور چکر کاٹ رہے تھے۔ یہ بھوتوں کا ناچ تھا یا چڑیلوں کا جو میجر مسعود اس وقت بڑے انہماک اور بڑی محنت سے ناچ رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ آخر کار وہ تھک کر رُک گیا۔

''عجیب دیوانگی ہے۔'' نجمی نے آہستہ سے کہا۔

جب اس کا سانس برابر ہوا تو وہ ریت پر لیٹ گیا اور بولا: ''نجمی میرے پاس آؤ۔ تم نے دیکھا اس میں کسی سمت کا تعین نہیں ہو پاتا۔ بلکہ سمت کا احساس ہی سرے سے غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں جو بے ساختگی' جو بے راہ روی ہے اس سے بڑا سکون ملتا ہے۔ چلو چلیں۔''

جب وہ خوابگاہ کی بتی گل کر کے ساتھ ساتھ لیٹے تو کھڑکی میں سے چاند کی روشنی اندر آ رہی تھی اور بستر کی چادر بہت سفید دکھائی دے رہی تھی۔ یکساں آواز میں مسعود نے کہنا شروع کیا:

''میں سالہا سال سے اپنی شخصیت کو یکجا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں' کیونکہ میں اپنی ذات میں بٹ

چکا ہوں۔ ایک طرف میری خواہشیں ہیں' دوسری طرف میری زندگی ہے' ان کے درمیان ...... تم اسے نہیں سمجھ سکتیں کیونکہ تم تیسری نسل ہو۔ لیکن تمہارے پرکھوں میں سے کسی نہ کسی نے یہ سب کچھ بھگتا ہوگا۔ یاد رکھو۔''

نجمی نے شاید اس کی بات نہ سنی' اس لئے کہ تبھی وہ بول اٹھی: ''حصول مسرت کی خاطر ہم اتنی خفت اٹھاتے ہیں' پھر خفت مٹانے کی خاطر اتنا دکھ سہتے ہیں' اس کے بعد موت آتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ سوؤں گی پر اپنے خواب دیکھوں گی' اس لئے کہ میں بھول نہیں سکتی۔ زندہ رہنے کے لئے اتنی کمینگی پر اترنا پڑتا ہے۔

''مسعود سو گئے ہو؟ سنو' ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے بہرحال۔ روح میں بڑی طاقت ہے۔'' اتنا کہہ کر نجمی نے اس کے کندھے پر سر رکھا اور تھوڑی دیر میں گہری نیند سو گئی۔

مسعود نے بڑے رحم اور محبت سے اسے دیکھا۔ تم بڑے سکون کی نیند سو رہی ہو۔ اس نے سوچا۔ لیکن تم بھی اسی نسل سے تعلق رکھتی ہو۔ اور یہ نسل اپنی ذات میں بٹ چکی ہے۔ تم نے روح میں پناہ ڈھونڈی ہے' مگر میں نے تو بڑے بنیادی انسانی جذبوں سے زندگی کا سبق سیکھا ہے۔ محبت' نفرت' خوف' لالچ ...... میں روح میں یقین نہیں رکھتا۔

بڑی دیر تک وہ نجمی کو جگا دینے کے ڈر سے بے حس و حرکت پڑا جاگتا رہا پھر اسے بھی نیند آ گئی۔

(۵۰)

''میں نے دل کی بے چینی پر فتح پائی ہے۔ میرے اسرار کو کون جانتا ہے۔'' عذرا نے سلائیوں پر سے نظر اٹھا کر سوچا اور مانیت کے گہرے احساس کے ساتھ مسکرائی۔ وہ عمران کے لئے پُل اوور بن رہی تھی۔

دھوپ لان پر پھیل گئی تھی اور سبزے کے کنارے کنارے گلاب کے پھول مرجھاتے جا رہے تھے۔ چند روز پہلے نجمی کی شادی ہوئی تھی اور وہ وہاں سے جا چکی تھی۔ اب فضا میں چیلوں کے بولنے کی آواز تھی۔ بہار کا موسم بھی ختم ہوا۔ میرے اسرار کو کون جانتا ہے' اس نے دوبارہ سوچا۔

لیکن یہ سوچ ان معدودے چند خیالات میں سے ایک تھی جو کبھی کبھار آپ سے آپ اس کے دماغ میں آتے چلے جاتے تھے۔ عموماً وہ سوچ سے گھبراتی تھی کہ یہ اس کے لئے بڑا مشکل کام تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کا ذہن ایک کاہل آگاہی کی حالت میں کام کرتا رہتا تھا۔ لیکن ذہن کی اس چھٹی کے باوجود اس کے جینے کے احساس میں کبھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ جانتی اور محسوس کرتی تھی اور زندہ رہنے کے قدیم عمل کو اس نے مکمل طور پر اپنے آپ میں جذب کر لیا تھا اور اس سے اس کے وجود میں وہ توانائی پیدا ہوئی تھی جس کے سہارے وہ اور دنیا کے کروڑوں چھوٹے چھوٹے انسان روزانہ زندہ رہ رہے تھے۔ وہ دن رات کے سارے کام بڑے سکون' بڑی آگاہی اور نرم روی کے ساتھ کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں شکایتوں اور پچھتاووں کا وجود نہ تھا کہ یہ بھی اس کے لئے بڑا مشکل کام تھا۔

پرویز گھر کا اکلوتا فرد تھا جو یہ سارا سلسلہ چلا رہا تھا اور بڑی دریا دلی کے ساتھ اپنی ماں اور بہن کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ بڑی محنت سے کام کرتا اور سرکاری حلقوں میں ایک کامیاب اور دیانت دار افسر خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے فرائض میں روزانہ اپنی ماں اور بہن کے پاس الگ الگ بیٹھ کر' تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی' ان کی خیریت دریافت کرنا اور ہر دوسرے تیسرے دن اپنی بیوی کے ساتھ الجھنا اور اسے اس بات کا قائل کرنے کی

کوشش کرنا کہ دونوں دوسری عورتوں کا دنیا میں اور کوئی سہارا نہ تھا اور کہ اب ساری عمران کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا اور ان کا بوجھ اُٹھانا ان دونوں میاں بیوی کا اخلاقی فرض ہو چکا تھا' شامل تھا۔ اس کی بیوی کا عذرا کی طرف جو پرانا برتری کا رویہ قائم تھا اس میں اب اس کے لئے حقارت بھی شامل ہو چکی تھی' کہ پہلے ہجرت اور موروثی جائداد کی گم کردگی اور اس کے بعد اُس کے خاوند کی گم شدگی اور روشن آغا کی موت اس گھر میں اب اس کی حیثیت صفر کے برابر رہ گئی تھی اور زندگی کی کوئی شے اس کے حق میں نہ رہی تھی۔ عذرا کے لئے پرویز کی بیوی کا یہ رویہ معمول میں شامل ہو چکا تھا اور اس کی پروا کئے بغیر وہ اپنے آپ کو دن بھر کے چھوٹے بڑے کاموں میں مصروف رکھتی تھی۔ صبح سویرے سارے کمروں کی صفائی اپنی نگرانی میں کرانا اور نجمی کے جانے کے بعد سے باغ کی دیکھ بھال کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس کے بعد وہ لان میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر بڑے انہماک سے عمران کے لئے پُل اوور یا پرویز کے لئے موزے بنتی رہتی' اور کبھی کبھار اپنی بھاوج کے کہنے پر باورچی خانے میں جا کر خانساماں کی مدد کرتی۔ چند ایک بار ایسا بھی ہوا کہ سرکاری تقریبوں کے موقع پر پرویز اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے' اور اس کے اجازت دینے پر' اپنی بہن کو ہمراہ لے گیا اور اس نے بڑی خوش اسلوبی اور وقار کے ساتھ اپنے بھائی کے خاندانی اور سرکاری رتبے کے مطابق اپنے فرض کو انجام دیا۔ گھر کی مجلسوں میں البتہ اس کی حیثیت کمتر تھی۔ درجے میں اس کے بعد صرف ملازمین آتے تھے۔ اس کے باوجود آخری وقت پر کسی نہ کسی طرح تیار ہو کر وہ منظر پر آ جاتی اور اپنی بھاوج سے الگ الگ' اپنی پرانی گریس کے ساتھ مہمانوں میں گھومتی پھرتی اور ان کی خیریت دریافت کرتی۔

دن میں کم از کم دو بار وہ اپنی ماں کو دیکھنے کے لئے بھی جاتی جو اب بستر مرگ پر تھی۔ وہ بڑے سکون اور سبھاؤ کے ساتھ اس سے باتیں کرتی اور اس کی ضروریات کا خیال رکھتی۔ اس کی موت کا عذرا کو کبھی خیال نہ آیا تھا' جیسے کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی بھی اسے کسی کی موت کا خطرہ لاحق نہ ہوا تھا۔ مستقبل کے اندیشوں کا اس کی زندگی میں کہیں بھی دخل نہ تھا۔ وہ وجود کی ایک بڑی حقیقی' بڑی عام فہم اور بڑی دلکش سطح پر زندہ تھی۔ اس کی شخصیت یکجا اور پائدار تھی۔ اس لحاظ سے وہ اپنی مخصوص معاشرت اور پس منظر کے باوجود دنیا کے ان گنت چھوٹے چھوٹے لوگوں کی' جیسے کہ اس کے مالی یا بیرے یا خانساماں تھے' نمائندہ تھی۔ وہ لوگ جو زندگی کے تمام تر عدم تعاون کے باوجود' کچھ نہ جانتے ہوئے بھی' دنیا کے عظیم کاروبار کو چلانے کے چکر میں بڑی توانائی کے ساتھ ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

کبھی کبھی نعیم کا خیال آتا تو اس کے دل میں بے اختیار درد پیدا ہوتا' مگر اور باتوں کی طرح یہ بھی اب معمول بن چکا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ اس وقت یکے بعد دیگرے چند سوچیں اس کے ذہن میں ابھرتیں اور تھوڑی دیر کے لئے وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتی۔ ذہنی عیاشی کے ان موقعوں پر وہ اپنی قدرتی سطح سے کچھ اوپر اٹھ جاتی اور آخر میں ہمیشہ کچھ اس طرح سے سوچتی جیسے آج صبح اس نے سوچا تھا: ''میں نے دل کی بے چینی پر فتح پائی ہے۔ میرے اسرار کو......'' اور سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ دھوپ لان پر پھیل گئی ہے اور سبزے کے کنارے کنارے اُگے ہوئے گلاب کے پودوں پر پھول مرجھاتے جا رہے ہیں کہ یہ بہار کے آخری دن تھے۔

تقریباً اسی زمانے میں ایک روز علی نے نور دین سے، جس کے ساتھ اب وہ رہتا تھا، بانو کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔

''بانو بڑی اچھی عورت ہے۔''

''درست ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔'' نور دین نے کہا۔

اس پر علی نے ذرا جھجکتے ہوئے بانو کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نور دین پہلے ٹھٹکا، پھر ہنستے ہوئے بولا: ''اچھا اچھا، مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا۔'' ...... وہ دیر تک منہ ہی منہ میں ہنستا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کو سنجیدہ ہو کر بولا: ''لیکن یہ بالکل ٹھیک ہے علی۔ وہ بڑے کام کی عورت ہے۔ بڑی محنتی اور دیانتدار۔ اور پھر عورت کے بغیر مرد کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہوتا۔'' اس کے بعد پھر وہ ہنستا اور اسے چھیڑتا اور علی مصنوعی خفگی کا اظہار کرتا رہا، گو دونوں ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔

چند باتوں کے بعد یہ طے ہوا کہ نور دین اس بارے میں بانو سے دریافت کرے گا۔ اسی روز کام سے واپس آنے پر نور دین نے کہا: ''چلو۔''

''کہاں؟ بات ہوئی؟''

''ہاں۔''

سورج غروب ہو رہا تھا۔ جب وہ دونوں منہ ہاتھ دھو دھلا کر بانو کی جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ جھونپڑی کا فرش بڑی صفائی سے لیا ہوا تھا اور سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر احتیاط سے رکھی گئی تھیں۔ چھت میں سے گھاس پھونس، جو لٹکتا رہتا تھا، شہتیروں میں، جو لکڑی کے ٹیڑھے میڑھے ڈنڈے تھے، اڑس دیا گیا تھا۔ بانو نے دھلے ہوئے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ آج بڑی دیر تک وہ اپنے ہاتھوں کو، جو بڑے بڑے اور کھردرے تھے اور کام کرنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے تڑخے ہوئے تھے، رگڑ رگڑ کر دھوتی رہی تھی لیکن ان کی بدرنگی دور نہ کر سکی تھی، چنانچہ اس وقت وہ انہیں اوڑھنی میں چھپائے ہوئے تھی۔ جب دونوں مرد اندر آئے تو وہ بڑی تمیز سے ان کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی۔

کافی دیر تک تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ جب کبھی کسی دو کی نظریں اتفاقاً آپس میں ٹکرا جاتیں تو وہ کھسیانے سے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ تینوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے آپ کو نہایت بدھو خیال کر رہے تھے۔ کسی کو بھی بات شروع کرنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ جھونپڑی میں اندھیرا اتر آیا اور بانو چراغ جلانے کے لئے اٹھی۔

اس وقت اس کے اٹھ کر جانے، اور کچھ اندھیرے کے بڑھنے کی وجہ سے علی کی ہمت بڑھی اور وہ کھنکار کر یک دم بول اٹھا:

''میں نے نور سے کہا تھا۔ اس نے تم سے بات کی ہوگی۔ ظاہر ہے۔ میں ......'' وہ رکا۔ ''تمہیں پیار سے رکھوں گا۔ میں گھر بنانا چاہتا ہوں۔ تم بھی تو ...... ہاں، تم بھی ......'' اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

وہ زمین پر دیکھتی ہوئی خاموشی سے آ کر بیٹھ گئی۔

''ٹھیک ہے۔'' علی نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ پھر نور دین نے آہستہ آہستہ بات شروع کی اور سادہ الفاظ میں اسے بتایا کہ علی محنتی اور دیانتدار آدمی تھا اور کہ مرد کے بغیر عورت کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

''کمال ...... میرا بچہ؟'' اچانک اس نے سوال کیا۔

''اوہ ......'' علی جھنجلایا۔ ''ابھی تک تم نے اس کا خیال نہیں چھوڑا۔ اتنا عرصہ ہوگیا......''

''مگر وہ ضرور آئے گا۔ وہ......'' بانو ایک دم بھڑک اٹھی۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' علی گھبرا کر بولا۔ ''وہ بھی ہمارے ساتھ رہے گا۔ ہم اسے بھی پالیں گے۔ پہلے پہل تو...... تمہیں پتا ہی ہے میں اس کو جانتا بھی نہیں اور پھر وہ دوسرے مرد کا ......'' (بانو نے پھر کر اسے دیکھا) ''مگر ٹھیک ہے۔ رفتہ رفتہ میں اس کے ساتھ گھل مل جاؤں گا' جیسے ساتھ رہنے سے ہم سب کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ پھر وہ ہمارے گھر کا آدمی بن جائے گا' جیسے ہمارے اپنے بچے ہوں گے۔ میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کروں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اس کی مدد بھی کروں گا۔ مگر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔''

''کہاں جائیں گے؟''

''ہم گاؤں چلے جائیں گے۔''

اس موقعہ پر انہیں باتوں میں مشغول پا کر نودین آہستہ سے کھسک لیا۔ اسے جاتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا۔

''گاؤں کے لوگ سادہ دل اور دیانتدار ہوتے ہیں اور وہ ہماری مدد کریں گے۔ یہ میرے بھائی نے کہا تھا اور یہ سچ ہے۔ ہم بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہم وہاں کھیتی باڑی شروع کریں گے اور آہستہ آہستہ گھر بھی بنالیں گے۔ گاؤں میں گھر بنانا کوئی مشکل نہیں ہوتا' تم فکر نہ کرو۔ کھلی جگہ کی آب و ہوا بھی مفید ہوتی ہے۔ میرا بھائی......'' وہ کراہ کر چپ ہوگیا۔

''مجھے اپنے بھائی کے متعلق کچھ بتاؤ۔''

''ابھی وقت نہیں۔ پھر کبھی سہی۔''

دونوں خاموش ہو کر جھونپڑی میں لیمپ کی بتی کے بھڑک کر جلنے کی آواز سنتے رہے۔ ''تیل ختم ہو رہا ہے۔'' علی نے سوچا۔ دیر تک وہ بتی کے بھڑکنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ پھر بانو نے اُٹھ کر تیل ڈالا۔

''تم باتونی تو نہیں ہو؟'' اچانک علی نے پوچھا۔

''میں ......بس......'' بانو نظریں جھکا کر سادگی سے بولی۔ ''تم تو جانتے ہی ہو۔''

تھوڑی دیر کے بعد چراغ کی بتی پھر بھڑکنے لگی اور ان کے سیاہی مائل' بڑے بڑے' محنتی اور دیانتدار چہرے ایک ساتھ اُس کی طرف اُٹھ گئے۔ بانو نے اُٹھ کر دوبارہ تیل ڈالا اور دھیمے لہجے میں اسے کمال کے بارے میں بتانے لگی۔

داؤد خیل

مئی 1956ء...... جون 1961ء

☆......☆......☆

عبداللہ حسین
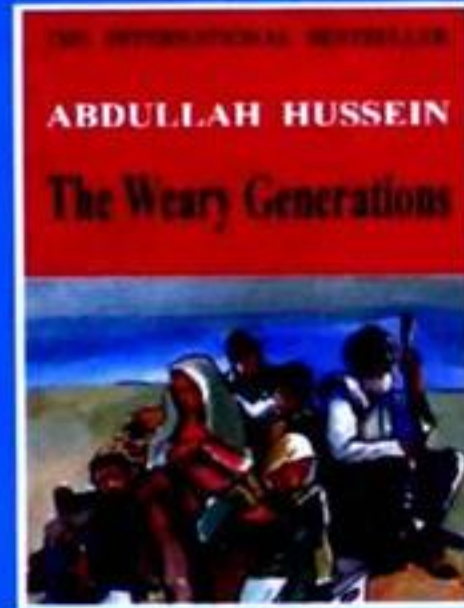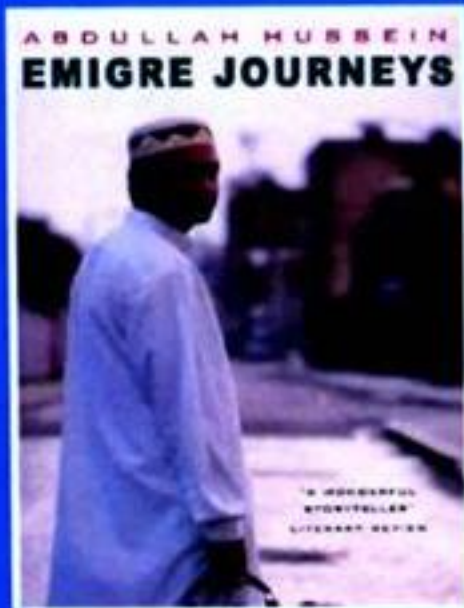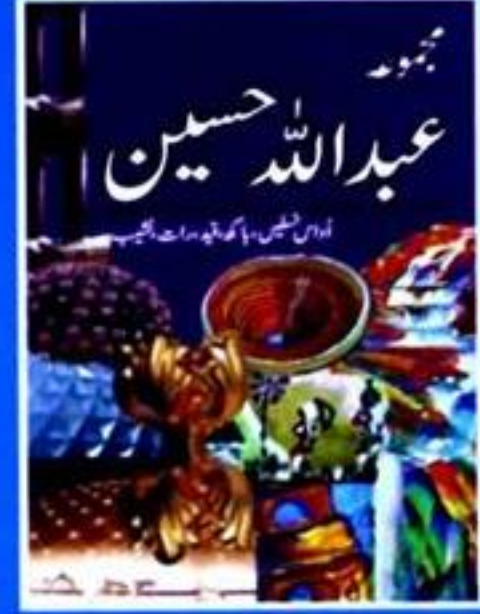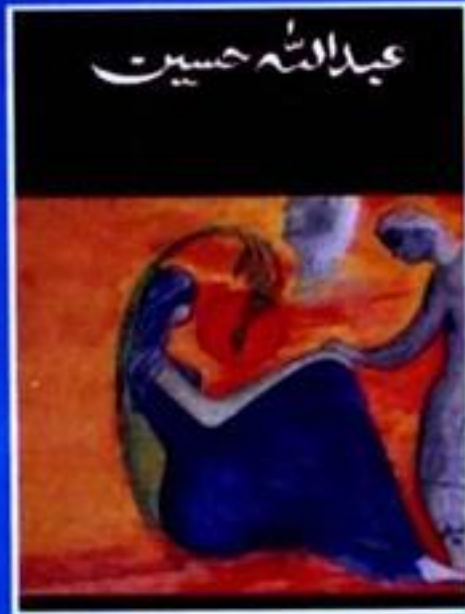
Rs. 900.00

www.sang-e-meel.com

ISBN-10: 969-35-0073-3
ISBN-13: 978-969-35-0073-8

9 789693 500738